کتب خانہ ادارہ ادبیہ دہلی

زندگی آمیز و زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش لاہور

دس سالہ نمبر

٦٧، ٦٨
جون ١٩٥٨ء

مرتب
محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو، لاہور

ترتیب

طلوع — محمد طفیل، ۴

رپورتاژ

۱ — ستمبر کا چاند — قرۃ العین حیدر، ۲۹

افسانے

۲ — کلو کی ماں — عصمت چغتائی، ۵
۳ — پرتو — کرشن چندر، ۱۱
۴ — الم — احمد ندیم قاسمی، ۱۹
۵ — ڈسپل — علی عباس حسینی، ۲۳
۶ — دھند — ممتاز مفتی، ۱۲۲
۷ — رات، چور اور چاند — بلونت سنگھ، ۱۳۸
۸ — دل کی پیاس — خدیجہ مستور، ۱۶۹
۹ — تاریک صلیب اور زرد چاند — اے حمید، ۱۷۸
۱۰ — جونکیں — مہندر ناتھ، ۱۹۲
۱۱ — رات کی آنکھیں — کشمیری لال ذاکر، ۲۰۰
۱۲ — ایمان کی سلامتی — جیلانی بانو، ۲۰۵
۱۳ انسان اور صلیب — صادق حسین، ۲۱۲

S702

۳۶۶

۱۴ — دو ہزار روپے کا چیک — دیوندر اسّر، ۲۲۲

۱۵ — انسان، اس کا گھوڑا اور خدا — احمد سعید، ۲۲۶

۱۶ — بجھتے چراغ — رام لعل، ۲۴۷

۱۷ — ایک رات — ڈاکٹر شفیق، ۲۵۵

ڈرامے

۱۸ — کھلی کھڑکیاں — ہاجرہ مسرور، ۲۶۱

۱۹ — تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سلام مچھلی شہری، ۲۹۳

طنز و مزاح

۱ — سائنس — کنہیا لال کپور، ۲۸۲

۲ — برائے وزنِ بیت — امجد حسین، ۲۸۷

نظمیں، غزلیں

۱ — خاکِ مسیح — جوش ملیح آبادی، ۳۱۰

۲ — محبت زندگی ہی زندگی ہے — جگر مرادآبادی، ۳۱۱

۳ — مشرق و مغرب — احمد ندیم قاسمی، ۳۱۲

۴ — فقط یہی نہیں حالِ بلاکشاں نہ کہو — اثر لکھنوی، ۳۱۵

۵ — ایک مفلوج دوست سے — تلوک چند محروم، ۳۱۶

۶ — خرد ہے مجبور، عقل حیراں، پتہ کہیں ہوش کا نہیں ہے — افقر موہانی، ۳۱۷

۷ — ہر داغِ دل عکسِ رُخِ گلبدن لیے — جذبی، ۳۱۸

۸ — قطعات — اختر انصاری، ۳۱۹

۹ — جس سمت بھی چمن میں وہ غنچہ دہن گیا — عدم، ۳۲۰

۱۰ — یہ دور — اختر الایمان، ۳۲۱

۱۱ — رسمِ شبستانِ طرب — قتیل شفائی، ۳۲۲

۱۲ — ہم اُن کے تغافل کو ادا جان رہے ہیں — قتیل شفائی، ۳۲۳

۱۳ — وہ جو دعویٰ کریں، وہ جو پردا کریں — شاد عارفی، ۳۲۴

۱۴ — جاروب کش — مجید امجد، ۳۲۵

۱۵ — ساقی کے حضور — پروفیسر شور، ۳۲۶

۱۶ — آنکھ تم ہو تو کس بہانے سے — پروفیسر شور، ۳۲۷

۱۷ — اک حادثۂ مشرق کہ دل بھول چلا تھا — غلام ربانی تاباں، ۳۲۸

۱۸ — ورائے قیاس و گمان جاری ہے — عبدالمجید حیرت، ۳۲۹

۱۹ — شراب — منیر نیازی، ۳۳۰

۲۰ — ایک ملاقات — ظہور نظر، ۳۳۱

۲۱ — محبت مجھ کو لے آئی کہاں تک — اقبال صفی پوری، ۳۳۲

۲۲ — روئے چمن پہ نکھار آج نہیں کل سہی — آغا صادق، ۳۳۳

۲۳ — ماضی، حال، مستقبل — فارغ بخاری، ۳۳۴

۲۴ — آنچل کی چھاؤں میں — خلیل الرحمٰن اعظمی، ۳۳۵

۲۵ — کون ترسے مذاقِ خوشی کے لیے — فضا ابن فیضی، ۳۳۶

۲۶ — مریم نغمہ — شاذ تمکنت، ۳۳۷

۲۷ — فریاد بھی ہے سوءِ ادب اپنے شہر میں — خاطر غزنوی، ۳۳۹

۲۴۶۹۴

۲۸ — ذکرِ ستم سے کیا ہوگا؟ احمد ریاض ، ۳۴۰
۲۹ — شعارِ فردا کے راز دانو! مظہر امام ، ۳۴۱
۳۰ — کب زمانے کی اداؤں کا گلہ کرتے ہیں کوثر نیازی ، ۳۴۲
۳۱ — فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے کوثر نیازی ، ۳۴۲
۳۲ — ہاتھوں میں خونِ دل سے چھلکنے لگا قلم جلیل حشمی ، ۳۴۳
۳۳ — ہم تو مرتے رہے بقا کے لئے جمیل ملک ، ۳۴۴
۳۴ — رات کے سینے میں یہ چاند کا جادو کیا ہے احمد ظفر ، ۳۴۵
۳۵ — دل میں جذبہ رضا آنکھوں سے ہویدا نہ ہوا ظفر اقبال ، ۳۴۶
۳۶ — آرزو کا صلہ ہے کیا کیا کچھ آتش لدھیانوی ، ۳۴۷
۳۷ — پانچ چینی نظمیں ابن انشا
  ۱ ۔ کیسے کیسے لوگ ۳۴۸
  ۲ ۔ جگنو سے ! ۳۴۹
  ۳ ۔ کوچ ۳۵۰
  ۴ ۔ سرخ رنگ دھوؤ نہیں ۳۵۱
  ۵ ۔ برف کا گالا ۳۵۲

مقالے

۱ — تنقیدِ شعر اور حالی عبد القادر سروری ، ۳۵۳
۲ — دارا شکوہ کا دیوان پروفیسر علم الدین سالک ، ۳۶۲
۳ — گل بکاؤلی محمد عبد اللہ قریشی ، ۳۷۰
۴ — حضرت سید احمد بریلوی کی داستانِ جہاد ڈاکٹر غلام جیلانی برق ، ۳۸۲
۵ — آگرہ کی ادبی شخصیتیں میکش اکبرآبادی ، ۳۸۷
۶ — غالب کی شاعری عطا محمد شعلہ ، ۳۹۵
۷ — واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط تمکین کاظمی ، ۴۱۱
۸ — قطب شاہی دور میں اردو ادب کی رفتار نصیر الدین ہاشمی ، ۴۲۸
۹ — شیوۂ جوانمردی کا آغاز سید علی عباس جلال پوری ، ۴۳۳
۱۰ — قرۃ العین طاہرہ منظور الٰہی ، ۴۴۶

تبصرے

۱ ۔ خونِ جگر ہونے تک م ۔ ط ،
۲ ۔ داغ داغ اجالا ع ۔ ق ،

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر نقوش ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

یوں تو بات کل کی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نقوش کی اشاعت کو، دس برس ہونے کو آئے ہیں۔ بلکہ اب قدم گیارھویں میں ہے۔ ان دس برسوں میں ہم نے جو کچھ پیش کیا وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ اس کا معیار بھی، اس کی اہمیت بھی۔

نقوش کا پہلا شمارہ ۱۹۴۸ء میں نکلا تھا۔ اس وقت اس کے لائق مدیر ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ کہی ہوئی بات کو پھر دہراتا ہوں کہ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے نقوش کو صفِ اوّل کا جریدہ بنایا ہی نہیں بلکہ منوایا بھی۔

۱۹۵۰ء میں سیّد وقار عظیم نے اس کی ادارت کے فرائض سنبھالے۔ جس حُسن و خوبی کے ساتھ انھوں نے نقوش کو متانت، اور میانہ روی کا انداز سکھایا، وہی انداز اب اس کی روایت ہے، اس کی جان ہے۔

اس کے بعد نقوش کی ادارت میرے حصّہ میں آئی۔ یقین کیجئے میں اس کا خواہاں نہ تھا بلکہ نقوش ہی نے مجھے اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ بھی آپ سے ڈھکا چھپا نہیں، عیاں ہے۔

ادبی رسالہ چھاپنا نہ پہلے خالہ جی کا گھر تھا نہ اب ہے۔ ایک امتحان پہلے بھی تھا ایک امتحان اب بھی ہے مگر اب، دن بہ دن مشکلیں بڑھ رہی ہیں۔ نہ لکھنے والوں میں وہ پہلا سا ذوق و شوق ہے نہ پڑھنے والوں میں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ادب کی موجودہ رفتار سے بڑی حد تک دل برداشتہ ہوں ـــــ پچھلے دنوں میں نے تمام ادیبوں کو اس مضمون کا خط لکھا تھا۔

> "اچھی تخلیقات کے حصول میں جتنی مشکلیں آج ہیں پہلے نہ تھیں۔ اہلِ قلم میں بھی وہ پہلی سی تخلیقی لگن نہیں رہی۔ قاری تازہ واردانِ ادب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسالے دم توڑ رہے ہیں۔ جو خال خال رہ گئے ہیں ہمیں انھیں تو کسی طرح زندہ رکھنا چاہیے۔ کیا ہم سب مل کر بھی چند اچھے پرچوں کو زندہ نہیں رکھ سکتے؟ میری بے انتہا خواہش رہی ہے کہ برابر معیاری اور نئی تخلیقات ہی کو پیش کرتا رہوں۔ مگر تازہ تخلیقات کو لاؤں کہاں سے؟ یونہی سا پرچہ چھاپنا مجھے پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں مجبوراً مستقل موضوعات پر کام کر کے نقوش کی زندگی کو کھینچ رہا ہوں۔ اگر اہلِ قلم کی بے توجہی کا یہی عالم رہا تو مجبوراً چند اہم موضوعات پر کام کر کے نقوش کو بند کرنا پڑے گا۔ بجائے اس کے کہ نقوش بھی دوسرے مشہور ادبی پرچوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرے، میں اسے پسند کروں گا کہ یہ اپنے عہدِ شباب ہی میں سب سے با ادب رخصت ہو جائے۔"

ایسے حالات[1] میں بھی ہم نے اردو ادب کو کچھ نہ کچھ دیا ضرور ہے۔ ان دس برسوں میں ہم نے ۵۱۵ مقالے، ۴۹۰ افسانے، ۲۱ ڈرامے، ۲ ناولٹ، ۳۴۶ نظمیں اور ۱۳۳۷[2] غزلیں دی ہیں۔ یہ بیشتر ایسے ادیبوں کی تخلیقات ہیں جو اپنے دور کے نمائندہ ادیب ہیں، جن کا نہ نام مٹے گا نہ کام۔

محمد طفیل

---

[1] حالات جیسے بھی ہیں، ان میں بھی یہ عہد کرتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ یہ پرچہ ہر دوسرے مہینے پوری باقاعدگی کے ساتھ پیش کرتا رہوں۔

[2] مجموعی طور پر ہم نے اب تک ۱۲۲۷۶ صفحات پیش کئے ہیں۔

نقوش میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ

(۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک)

زمانۂ ادارت : احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظمیں	غزلیں	کل تعداد نظم و نثر	تعداد صفحات طبع شدہ
۱	۱	۷	۵			۶	۹	۲۷	۸۴
۲	۲	۸	۴			۷	۶	۲۵	۸۰
۳	۳	۱۰	۵	۱		۹	۷	۳۲	۱۰۴
۴	۴ (آزادی نمبر)	۱۱	۷	۱		۱۳	۱۳	۴۵	۲۶۴
۵	۵	۱۷	۸	۱		۱۴	۹	۴۹	۱۹۸
۶	۶	۷	۵			۱۲	۸	۳۲	۱۲۰
۷	۷ (امن نمبر)	۱۲	۷			۱۴	۹	۴۲	۱۵۲
۸	۸ (آزادی نمبر)	۱۰	۱۰			۲۲	۲۰	۶۲	۲۴۰
۹	۹	۴	۵			۸	۷	۲۴	۸۰
۱۰	۱۰	۴	۴			۹	۶	۲۳	۷۲
	میزان	۹۰	۶۰	۳		۱۱۴	۹۴	۳۶۱	۱۳۹۴
زمانۂ ادارت : سید وقار عظیم									
۱۱	۱۱، ۱۲ (خاص نمبر)	۱۱	۱۲			۱۰	۱۷	۵۰	۲۰۰
۱۲	۱۳	۴	۴			۵	۱۴	۲۷	۷۲
۱۳	۱۴	۶	۵			۴	۱۲	۲۷	۷۲
۱۴	۱۵، ۱۶ (سالنامہ)	۱۸	۱۲			۱۰	۳۴	۷۴	۲۴۴
۱۵	۱۷ ڈرامہ و ناولٹ نمبر	۳	۲ منظوم	۱	۴			۱۰	۲۸۸
	میزان	۴۲	۳۵	۱	۴	۲۹	۷۷	۱۸۸	۸۷۶
زمانۂ ادارت : محمد طفیل									
۱۶	۱۹، ۲۰	۱۳	۲۰	۱		۱۵	۲۲	۷۱	۲۳۲
۱۷	۲۱، ۲۲	۱۵	۱۲			۱۶	۳۸	۸۱	۲۶۴

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظمیں	غزلیں	کل تعداد نظم و نثر	تعداد صفحات طبع شدہ
۱۸	۲۳، ۲۴	۹	۹		۱	۱۲	۲۶	۵۷	۲۴۰
۱۹	۲۵، ۲۶ (افسانہ نمبر)	۲	۳۸					۴۰	۴۰۰
۲۰	۲۷، ۲۸	۱۱	۹			۱۹	۲۰	۵۹	۲۴۰
۲۱	۲۹، ۳۰ (پنج سالہ نمبر)	۱۶	۱۵	۱		۲۰	۲۵	۷۷	۴۰۸
۲۲	۳۱، ۳۲	۱۰	۱۰	۱		۶	۲۰	۴۷	۲۰۸
۲۳	۳۳، ۳۴	۱۱	۷	۱		۵	۱۴	۳۸	۲۰۸
۲۴	۳۵، ۳۶	۱۳	۱۱			۱۱	۱۷	۵۲	۲۴۸
۲۵	۳۷، ۳۸ (افسانہ نمبر)	۱	۴۰					۴۱	۵۰۶
۲۶	۳۹، ۴۰	۸	۱۰			۱۲	۱۶	۴۶	۲۱۶
۲۷	۴۱، ۴۲ (غزل نمبر)						۸۱۵	۸۱۵	۴۸۰
۲۸	۴۳، ۴۴ (ضمیمہ غزل نمبر)	۵	۷	۲				۱۴	۲۵۶
۲۹	۴۵، ۴۶	۷	۸	۴		۸	۱۶	۴۳	۲۶۴
۳۰	۴۷، ۴۸ (شخصیات نمبر ۱)	۸۶							۷۰۰
۳۱	۴۹، ۵۰ (منٹو نمبر)	۱۵	۳۰					۳۵	۳۸۴
۳۲	۵۱، ۵۲	۵	۱۰	۱	۱	۹	۱۶	۴۲	۲۴۸
۳۳	۵۳، ۵۴ (افسانہ نمبر)	۵	۱۱۰					۱۱۵	۱۰۹۰
۳۴	۵۵، ۵۶	۹	۸			۱۱	۱۷	۴۵	۲۰۸
۳۵	۵۷، ۵۸	۱۰	۷	۲		۱۲	۲۱	۵۲	۲۴۴
۳۶	۵۹، ۶۰ (شخصیات نمبر ۲)	۸۸						۸۸	۸۱۴
۳۷	۶۱، ۶۲ سالنامہ	۲۱	۱۶			۱۴	۲۹	۸۰	۳۸۴
۳۸	۶۳، ۶۴	۹	۱۱	۲		۱۴	۳۲	۶۸	۳۱۲
۳۹	۶۵، ۶۶ (مکاتیب نمبر)	۴	۱۲۱۳ (خطوط)					۱۲۱۷	۱۰۴۸
۴۰	۶۷، ۶۸ (دہ سالہ نمبر)	۱۲	۱۷ (افسانے)	۲		۱۹	۲۲	۷۲	۴۵۶
	میزان	۳۸۵	۲۹۵ افسانے ۱۲۱۳ خطوط	۱۷	۲	۲۰۳	۱۱۶۶	۲۱۶۸	۱۰۰۰۶

ان تمام چیزوں کا انتخاب ادبِ عالیہ کے نام سے الگ پیش کیا جائے گا۔

ہاجرہ مسرور (مدیر نقوش)

زمانہ ادارت: مارچ ۱۹۴۸ سے دسمبر ۱۹۴۹ تک

احمد ندیم قاسمی (مدیر نقوش)

زمانہ ادارت: مارچ ۱۹۴۸ سے دسمبر ۱۹۴۹ تک

سید وقار عظیم (مدیر نقوش)

زمانہ ادارت: یکم مئی ۱۹۵۰ سے مارچ ۱۹۵۱ تک۔

(مدیر نقوش)

زمانہ ادارت: اپریل ۱۹۵۱ سے تا حال

کلو کی ماں

عصمت چغتائی

جمو بجیا کے چالے کا جوڑا دھوم دھڑکے سے سل رہا تھا۔ چچی بی اور اماں جی میں دھواں دھار بحث ہو رہی تھی۔ چچی بی مُصر تھیں کہ بیپا طرز کا زمانہ گیا۔ نئے فیشن کی رو سے نبت کے اوپر تلے اسٹنبولی بیل اور گنگا جمنی کرن خوب کھلے گی۔ اماں جی کہتی تھیں:

"کرن ہوئی لقلقی زرد گھڑی میں بٹ کر سلی ہو یا وسے سے بچا پرسوں تک ہی رہوے ہے۔"

بجیا اپنے جہیز سے دور بے تعلق سی بیٹھی بچوں کے سنگ گوٹ نہیں کھیل رہی تھیں مگر جی ان کا نبت اور گوکھرو میں الجھا تھا۔ وہ ان دیدے کا پانی ڈھلی کنواریوں میں سے نہ تھیں جو کھلے بندوں بیٹھ کر اپنا جہیز سیتی ہیں۔ کبھی ان سے کچھ ٹکوانا ہوتا تو چچی بی کہتیں "جمو بیٹی ذرا میرے کرتے پر گوکھرو کے پھول ٹانک دو۔" بجیا سمجھ جاتیں مگر پھول ٹانک دیتیں سب کے سامنے نہیں دالان میں جاکر۔ چچی بی نے پستئی کریپ کے دوپٹے پر چپا چپی کی نبت کے آس پاس اسٹنبولی بیل اور گنگا جمنی کرن جما کر پوچھا:

"کیوں جمو کیسا لگتا ہے؟"

بجیا شرم سے گلنار ہو گئیں اور بوکھلاہٹ میں اپنے اڑی کے اکٹے پہ ٹپ مار دیا۔ اماں جی نے کہا "ہے ہے دلہن خدا خیر کرے۔ تمہاری تو جانو مت ماری گئی ہے۔ اسے وہ بچاری کیا بولے گی۔"

مگر کہا چچی بی کا ماننا پڑا۔ چچی بی تھیں بھی تو فیشن ایبل۔ چوٹیوں کے بال کا فیشن وہ اپنے میکے سے لائیں جو سارے محلے میں وبا کی طرح پھیل گیا۔ کاشغاری سبندھناک بوتی تھیں۔ سرخ پتنگ کا کاغذ جس میں زیور بندھ کر آتے ہمیشہ ان کی پاندان کی ڈبیا میں اڑسا رہتا۔ سب کی آنکھ بچا کے پان کھاتے وقت ہونٹوں پر کاغذ تھوک سے تر کر کے گھسا مار لیتیں اور ان کے حسابوں لپ سٹک لگ جاتی۔ کرن کے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد جوڑا سلنے لگا۔ چندھی بوا نے ترنگ میں آکر اپنی لرزتی بلغم بھری آواز میں بنرے گانے شروع کر دیئے۔ ایک دم جیسے سب کے دلوں میں شہنائیاں بج اٹھیں۔ شادیوں کا موسم سا ٹوٹ پڑا، جوڑے پہ جوڑے لگائے جانے لگے۔ رفیق میاں کی رضیہ بی سے، فریدہ بی کی پپو میاں سے، رشید میاں کی صفو بی سے ڈوریاں باندھی جانے لگی۔

"تو کس سے بیاہ کرے گا رے؟" مذاق میں چچی بی نے جمو سے پوچھا۔

"تم سے!" دو برس کے چھبتو نے ماں کی گود میں مچل کر فیصلہ کیا اور سب ہنس پڑے۔ بات چلتی ہی گئی یہاں تک کہ کنواری [illegible] بڑکے یا لڑکی کا بھی جوڑا لگا دیا گیا۔ کلو کی ماں دہلیز پر بیٹھی دھنیا کی گری کوٹ رہی تھیں، ترنگ میں آکر بولیں "اے رے

کلوے تو کس سے بیاہ کرے گا؟"

"چھابہ بی بی سے۔" پانچ برس کے کلوے نے کپا گالوں والی زنابہ بی کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا اور چھابہ بی بی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ سب ہی ہنس پڑے مگر چچی بی کا شہابی رنگ تمتما کر قرمزی ہو گیا۔ اٹھا جوتی تڑاتڑ کلو کے ناک منہ اور سر پر جڑ دیں۔ ہنسی میں کھنسی ہو گئی۔ تاش کے پتے پھینک پھانک جھم جھار روتے ہوئے چھبو کو کوستے پٹکا کے جھٹکنے لگیں۔ اماں جی نے بسورتی ہوئی چھابہ کو گود میں سمیٹ لیا۔ کلو کی ناک سے جیتے جیتے خون کی نلی بہنے لگی۔ کلو کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر دھاڑی:

"اے ہے میرے پوت کو مار ڈالا۔ ہائے میرا بن باپ کا بچہ۔"

"کلوے کا بچہ خیرات کے ٹکڑوں پہ پلنے والا اور اس کے یہ پچھن۔ موری کا کیڑا اور دماغ آسمان پہ۔" چچی بی کا پٹھانی خون کھول کر لاوا بن گیا۔ "حرامزادے کو روٹیاں لگی ہیں۔"

"اے ہے دلہن، سید بچہ ہے۔" اماں جی نے سر پیٹ لیا۔ "اس کی بساط ہی کیا، تم کاہے کو اپنی عاقبت سنوارو۔"

"چولہے میں پڑے سید بچہ، اور بھاڑ میں جائے سیدانی۔ میری بچی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا تو دیدے نکال لوں گی۔" اماں جی روکتی رہیں پر چچی بی بپھر چکی تھیں۔ کلو کی ماں نے اوپر سے دو دھموکے کلو کی پیٹھ پر اور جمائے اور اس کی سات پشتوں کو کوسنے لگی۔

"اے تجھے ڈھائی گھڑی کی آوے۔ باوا کو کھا گیا اب جنم جلی کے سر چھپانے کی جگہ تھی سو بھی ملیامیٹ کر کے دم لے گا۔ خدائی خوار نامراد۔" وہ اسے گھسیٹتی ہوئی باورچی خانہ میں لے گئیں۔

کلو کی ماں ویسے ہماری دور کی خالہ لگتی تھیں۔ پڑوسنوں کو خالہ کہہ لینے پر انہیں خالہ کہتے عار سی آتی۔ امتیازی نوکر نہ کہتے پر کلو کی ماں ضرور کہتے۔ گرتے گرتے ان کی پوزیشن نوکروں ہی جیسی ہو گئی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتیں دو چار دن کی مہمانداری کے بعد لوگ دھیرے دھیرے انہیں ڈھب پر لے آتے۔ ماما کھسکا دی جاتی اور وہ بغیر تنخواہ کے صرف پھٹے پرانے کپڑے اور روٹی پہ ماما کا عہدہ سنبھال لیتیں۔ میاں لام پہ گئے سو نہ جانے کس کی گولی کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ امتیازی خالہ کا تو کسی لال منہ والے سے بیر بھی نہ تھا، پھر نہ جانے کس اللہ کے بندے نے ان کی مانگ اجاڑ دی ——

تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں بھلا اپنے رشتہ داروں کو تنخواہ دے کر کون ذلیل کر سکتا ہے۔ ہاں عید بقرعید پر "آپا سلام" اور "دولہا بھائی سلام" کے صلے میں اٹھنی اماں جی سے اور روپیہ ابا جی سے ضرور ملتا تھا اور دوسرے نوکروں کی طرح بیگم صاحب نہیں کہنا پڑتا تھا بلکہ "آپا" اور "دولہا بھائی" کہنے کا فخر حاصل تھا۔

کلو کی ماں جو یوں تیرے میرے در پر پانی بھرا کرتی تھیں اس کی بھی ایک وجہ تھی وہ چاہتی تھیں ان کا کلو پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائے اور وہ راج جو وہ میاں کے دم سے نہ کر سکیں کلو کے دم سے نصیب ہو — اتنے بچے پڑھتے ہیں ایک کلو بھی پڑھ جائے گا مگر کلو کے سپرد ہزاروں ڈیوٹیاں تھیں۔ چچی بی کی کمر دبانی، دوپہر کو پیر کے انگوٹھے میں رسی باندھ کر پنکھا کھینچنا، تجھے مجھے پانی پلانا، ایک دم سارے گھر کو ہی پیاس لگ جاتی۔ کلو کو ایک مشک پانی کٹورہ کٹورہ کر کے ڈھونا پڑتا۔ جھبو اور چھابہ کے ساتھ کھیلنا، ہزار بار جھنجھنا گرا لیتے تو اٹھانا، چھابہ بی کی گڑیا کو ایک منٹ میں چھبیس بار دوپٹہ اوڑھانا، مہترانی سے پوتڑے دھلوانے کے لئے پانی ڈالنا، اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا جو کلو علم و ادب کی طرف رجوع کرتا۔ ویسے مولوی صاحب منت کا تو پڑھانے کے قائل بھی نہ تھے۔ کلو کے کپڑے بھی تو اس قابل

رہتے تھے کہ وہ سب بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکے۔

ہمارے ہاں باورچی تھا اس لئے ماماگیری سے تو کلو کی ماں کو نجات مل چکی تھی۔ مگر گیہوں پھٹکنا، دالیں بینا، مصالحے کوٹنا، بچوں کو نہلانا دھلانا، جنس تلوانا، کسی کے بال بچہ ہو تو راتوں کو زچہ کے سرہانے جاگنا کہ کہیں بلی حرامخور نال کی بساند سے لگی چلی آئے اور بچہ کو چپاک نہ رکھ دے۔

کلو چند مہینے کا گود ہی ہو گا کہ سناؤنی آگئی۔ نہ میت اٹھی نہ جنازہ آیا نہ تربت بنی، بس ایک تار نے چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں۔ کانچ کی چوڑیوں اور دو روپیہ مہینہ کے گلابی فیروزی رنگ سے پیچھا چھوٹ گیا۔ جوان بیوہ کس کو بھاوے۔ جہاں گئیں نکلنا پڑا۔ لڑھکتی پڑھکتی ہمارے ہاں آکر دم لیا تھا تو کلو کی ختنہ بازی نے پیر اکھاڑ دیئے۔ دو چار پیغام بھی آئے تو شوقین مزاج چھوٹے چچا نے ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی مگر کلو کی ماں نے پچھلے پیر لحظہ نہ دھرنے دیا۔

”نہ میاں میرا پوت جوان ہو گا تو کیا کسی کو منہ دکھائے گا کہ میّا نے خصم کر لیا۔“ ویسے وہ چچا کی شادیوں کی لت سے بھی واقف تھیں۔ سال بھر ہوا بیوی پہنچ پڑیں لا بٹھائی، تنبولن یہ دیباطن، اس پہ دھوبن میراثن اور بھنگن کا نزول ہوا۔ غرض میاں نے کوئی ”بن“ یا ”تن“ نہ چھوڑی اور جب ان کی بیویوں میں جوتم پیزار بڑھتی وہ ایک نئی پھلجھڑی لاکر چھوڑ دیتے۔ ان کے حقہ کے دالان میں بالکل یتیم خانہ کھلا ہوا تھا۔ کلو کی ماں میں دم درود بھی نہیں تھا، پچیس برس کی عمر میں ٹھک کر ڈائن ہو کر رہ گئی تھیں۔ صورت پہ مکھیاں بھنکتی تھیں۔ ازلی ادبار برستا تھا۔ آئے دن نیم تلے کھٹیا پہ لحاف اوڑھے جوڑی بخار سے کشتی لڑا کرتیں۔ ویسے کوئی کام کی چیز کو کاہے کو بیاہے۔ مفت کی نوکرانی کسے بری لگتی ہے۔

اسی شام انہوں نے بخار میں بھلسے کلو کو کندھے سے لگایا اور پڑوس میں نواب مختار کے شاگرد پیشہ میں جا پڑیں۔

نواب صاحب کا بھرا پرا گھر تھا۔ پڑھے لکھے فیشن ایبل لڑکے، لڑکیاں، بہوئیں، کوٹھی کے شاندار احاطے میں آئے دن پارٹیاں ہوتیں اور اسی کوٹھی کے ایک گمنام سے کونے میں نواب صاحب پڑے زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ دو سال سے ان کی اب تب ہو رہی تھی۔ مگر جانو اللہ میاں سے پٹہ لکھا کے لائے تھے۔ اچھے بھلے جوان لڑھک جائیں پر بڈھا ٹس سے مس نہ ہو۔ ایک تو دنیا بھر کی بیماریاں جن میں پرانی پیچش اور گٹھیا پیش پیش، اوپر سے بڈھے کا دماغ تھا کہ ساتویں آسمان پہ۔ منہ پر وہ مغلظات کہ کوئی نوکر آٹھ دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔ کلو کی ماں کے بھاگوں ان کا نوکر بھاگا ہوا تھا لہٰذا سات روپیہ مہینہ کھانا اور سال میں دو جوڑ سی کے کپڑوں پر وہ نواب صاحب کی نرس کے طور پر رکھ لی گئیں۔ ہمارے خاندان کی تو ناک کٹ گئی۔ نواب صاحب کے ہاں سے پہلے ہی لین دین بند تھا۔ وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ اب تو اور بھی تن گئی۔

• نہ جانے کلو کی ماں کی تیمارداری نے رنگ دکھایا یا بڈھا ضد باندھ رہا تھا، بجائے سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے اور مضبوط ہو گئی۔ بڈھا بدمزاجی کا ٹھیکیدار تھا، بیچاری سر جھکا کر اس کی گالیاں کوسنے سنا کرتیں۔ کوٹھی میں قہقہے گونجا کرتے اور وہ بیٹھی بڈھے ل سے سمیٹا کرتیں۔

اور پھر بڑے میاں کی گالیوں میں کمی آنے لگی۔ گلاس رکابی مار پھینکنے کی عادت میں بھی کمی آگئی۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر سرہانے سے اکنی نکال کر کلو کو دیتے۔ ”کیوں بے کیا لے گا اکنی کا؟“ وہ اس سے مذاق میں پوچھتے۔

"جی روشنائی!"

"روشنائی؟ ابے گھاس کھا گیا ہے۔ گلاب کہیو۔ اچھا!"

"جی اچھا!" کلو سہمی آواز میں کہتا۔

ایک دن کلو کی ماں نے منہ دھلا کر سلاپچی اٹھائی تو بڑے میاں بڑی نرم آواز میں بولے:

"کلو کی ماں تم میری پوتیوں کے برابر ہو پر نامحرم سے یہ خدمت کرانے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔ اب بڑھاپے میں مرتے وقت عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو نکاح کر لو۔"

کلو کی ماں کے ہاتھ سے سلاپچی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کوٹھڑی میں چلی گئیں اور دیر تک بے سُدھ بیٹھی رہیں۔ پھر ایک دم جی بھر آیا اور خوب بھڑاس نکالی۔ ہائے مرنے والے یہ تم نے کس قصور کی سزا دی۔

شام کو جب وہ یخنی لے کر آئیں تو بڑے میاں تکیہ کے سہارے بیٹھے تھے۔

"مجھے حاجت نہیں ابھی کریم آیا تھا اس نے فراغت کرا دی۔" انہوں نے ذرا روکھی آواز میں کہا اور کلو کی ماں کا خون خشک ہو گیا۔ یا مولا اب اور کتنی گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں۔ سر جھکایا اور وہ دروازے سے ٹک گئیں۔

"سردے کی دو پھانکیں ذرا برف لگا کر لے آؤ۔" بڑے میاں اپنی روکھی کھردری آواز میں بولے۔ آنسو چھپا کر کلو کی ماں سردے کی قاشیں لے آئیں۔ ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف بڑے میاں کی ڈھیلی بتیسی کی چپڑ چپڑ سنائی دے رہی تھی۔ بڑے میاں کچھ نادم کچھ جھینپے سے سردے کے قتلے چبکتے رہے۔ کلو کی ماں کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

اتنے میں چق کے نیچے سے کلو کی آنکھیں چمکیں۔ ماں نے اشارے سے بھگانا چاہا مگر بڑے میاں بولے:

"آنے دو بچے کو۔" کلو باہر آیا اور گھبراہٹ چھپانے کو کبھی ایک پیر پر اور کبھی دوسرے پیر پر ڈگمگاتا رہا۔

"کچھ پڑھتا وڑھتا بھی ہے یا یوں ہی ڈنڈے بجاتا ہے۔" پاس بلا کر وہ کلو سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کلو کی ماں جب ان کی بتیسی دھو کر لائیں تو وہ بڑے میاں کو چھ کا پہاڑہ سنا رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے۔ ماں کے اشارے پر کلو باہر جانے لگا تو بڑے میاں غرائے:

"ہم سو نہیں رہے کلیم الدین!"

کلیم الدین! بڑے بڑے آنسو کلو کی ماں کی آنکھوں میں بھر آئے۔ کلیجہ سن سے ہو گیا۔ بس کلو کا باپ یوں کلیم الدین لکھا کرتا تھا۔ "کلیم الدین کو پیار!" اس کے آخری خط میں بھی تھا۔ پر اب تو وہ دنیا میں کلو ہی بن کر رہ گیا تھا اور وہ اس گمنام سے کلو کی ماں! منہ پھیر کر جب وہ خالی رکابی اٹھانے لگیں تو پھر گرجے:

"ہم پہاڑہ سن رہے ہیں۔ دیکھیں باجی کو کچھ یاد بھی ہے کہ نہیں۔ ہاں بھئی تو چھ ستے؟"

"بیالیس!" کلو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور کلو کی ماں کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

بڑے میاں نے پھر نکاح کی بات نہیں چھیڑی مگر کلو سے ان کی دوستی یارانے کی حد کو پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ ان کے بستر پر بیٹھنے لگا۔ دونوں ودھ نیپ کھیلتے تو بڑے میاں خوب بے ایمانی کرتے اور کلو ان سے جھگڑتا۔ ان کے بستر پر بیٹھنے کے لئے کلو کو کپڑے

بھی صاف پہننا پڑتے۔ ویسے اب اسے کام کاج نہیں کرنا پڑتا تھا اس لیے اتنا میلا بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن تاش کھیلتے کھیلتے ایکدم بولے "چودہ پنجے؟"

"اکیاسی!"

"ایں!" بڑے میاں غرائے "کیا کہا اکیاسی؟ کریم خاں۔ اس اُلو کے پٹھے مولوی کی داڑھی پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو۔"

جب مولوی صاحب آئے تو بڑے میاں ہنکارے:

"سنیئے مولوی صاحب! ہاں بھئی کلیم الدین چودہ پنجے؟"

"اکیاسی!" کلو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"سنا آپ نے مولوی صاحب؟ چودہ پنجے اکیاسی! یہ ہے کہ آپ اپنا سر پڑھاتے ہیں؟"

بڑے میاں نے مولوی صاحب کی گھنٹہ بھر تاتھک کھینچی پھر کلو کی ماں کی چار گھنٹے جان سولی پر کردی اور اس دن سے مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھ کر کلو کو سبق دینے لگے۔ سنک سوار ہو جاتی تو بڑے میاں مولوی صاحب اور کلو دونوں کا دھوبی گھاٹ کر دیتے۔

صاف ستھرے پوتوں نواسوں کو کہاں اتنی فرصت تھی جو اپنی نرسری اور کنڈر گارڈن سے پرانی حویلی میں سڑتے ہوئے دادا میاں کے پاس آتے۔ کئی کئی دن گزر جاتے کوئی پلٹ کر نہ پوچھتا۔ لوگ منتظر تھے کب بڑے میاں مریں اور ان کا دھوم دھام سے چالیسواں ہو۔ پر ننھا منا کلو بڑے میاں کی سنسان بوڑھی زندگی میں تر و تازہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ دو پیار کے ترستے ہوئے ایک چھوٹا ہزار جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ گھنٹوں دونوں میں ایسے گھل مل کر باتیں ہوتیں جیسے وہ ہم سن ہوں۔

"اے کلیم فاختہ نے دانہ کھایا؟"

"نہیں ابا جی چاول ویسے کے ویسے پڑے ہیں۔"

"اماں تمہاری ہو نرے۔ فاختہ چاول پر منہ نہیں ڈالے گی اسے کودوں دو" اور دونوں سر جوڑ کر فاختہ کو کودوں کھلاتے وہ ایک دانہ کھا لیتی تو بڑے میاں کا چلوؤں خون بڑھ جاتا۔

اور ایک دن بڑے میاں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب کلو کی ماں نے انہیں لاٹھی کے سہارے دوسرے ہاتھ سے کلو کا کندھا پکڑے صحن میں کیاریوں کے پاس دیکھا تو کلیجہ میں گولی سی لگی۔

کوٹھی میں بم پھٹ پڑا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رات کو دادا میاں نے کلو کی ماں سے نکاح پڑھوا لیا۔ بیس ہزار مہر نقد بنک میں اور مہر والی کوٹھی جس کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کرایا آتا تھا۔

"میں نہ کہتی تھی وہ ایک حرّافہ ہے۔" چچی بی نے کہا۔ حالانکہ یہ پیش گوئی انہوں نے اسی دم گھڑی تھی۔

ہفتوں کلو کی ماں اور دادا میاں کے چرچے محلے ٹولے نمک مرچ لگا کر کرتے رہے۔ ایک شاعر قسم کے نوجوان نے زبان پر نظم تک کہہ ڈالی۔ خاندان والوں کی بے ہودگی سے تنگ آ کر بڑے میاں نے اپنی طرف کے دروازے میں اینٹیں چنوا دیں۔ سب کی محبت پھر پھڑا کے جاگ اٹھی اور لاوارث بڈھا سب کا چہیتا بن گیا۔ مگر ضدی بڈھے کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں کلو کی ماں کے جادو میں آ کر رہی سہی جائیداد بھی نہ دے ڈالے اور مفت کے عیش میں چنگاری پڑ جائے۔

نکاح کی رات جب رفع حاجت کے بعد بتیسی دھو کر گلاس میں ڈال کر سرہانے رکھنے گئیں تو وہ اور کلّو دو معصوم بچوں کی طرح گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے۔ مچھردانی درست کر کے کلّو کی ماں برآمدے میں اپنی مخصوص پلنگڑی پر لیٹیں تو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک چھتنار برگد کی چھاؤں میں لیٹی ہیں۔ بے اختیار کانوں میں اپنی بارات کے تاشے تڑتڑانے لگے۔ انار، پھلجھڑیاں چھوٹ کر دماغ میں جگنوؤں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ مانجھہ، چوتھی، برہی، ایک ایک کر کے ذہن کی پگڈنڈی پر گزرنے لگیں۔ عمر ہی کیا تھی۔ رحیم بھی تو کم سن ہی تھا مہندی سے لال ہاتھ کئی دن یار دوستوں سے چھپائے پھرا تھا اور بھرے گھر کی اندھیری کوٹھریوں اور سنسان چھتوں پر وہ جوان ہوئے پھر کلّو نے ان کونوں کھدروں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ گھر بستے ہی دنیا اجڑ گئی۔

کلّو کی ماں کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ مرنے والے کی جوان چوڑی چکلی چھاتی سانس روکنے لگی۔ تھکے ہارے مسافر کی طرح کلّو کی ماں نے اس غریب مری چھاتی پہ ماتھا ٹکا دیا جو سنگ مرمر کی طرح سرد اور بے جان تھی۔ ایک انجانی گرمی اس چھاتی کو چیرتی ہوئی معصوم کلّو اور بدنصیب ماں کے وجود کو پاش پاش کر گئی تھی۔

پرتو

کرشن چندر

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے اس کی شخصیت بڑی پروقار، قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا، رنگ سرخ و سپید، براق نورانی داڑھی۔ اس نے کالی مرچ کے رنگ کا اونی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا متوازن قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ کر رکا۔ جھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دراز ہو گیا۔ سیٹ اسکے وزن سے پیچھے کو ہو گئی۔ اس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ پیچھے کو ہٹنے والی گدے دار نشستیں بہت عمدہ ہیں!" میں نے اپنا جلتا ہوا سگرٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا جلدی سے خاکدان میں بجھا دیا۔ بوڑھا سکھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس نے کہا۔ شکریہ! مجھے تمباکو کا دھواں واقعی بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ بیحد سپید اور مضبوط دانت جڑے جڑے اور ہم سطح۔

اس بوڑھے فوجی سکھ کی عمر ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسس پایا جاتا تھا اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک ہوگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے دائیں بائیں اس کے رخساروں پر تین چار لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی۔ اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی میں وی کا سا نشان بنائے تھے اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کے لیے ہاتھ اوپر کیئے تو میں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی کے لمبے چھوٹے چھوٹے بیسیوں نشان ہیں جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش ہو۔

جنگ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہلی جنگ عظیم کے محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ خوبصورت اور وجیہ انسان کی بانہہ یا ٹانگ نہیں گئی ورنہ کتنا برا معلوم ہوتا یہ آدمی!

مجھے اس معاملہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ریستوران کار کے بیرے نے آ کر کہا کہ اب آپ لوگ آ کے کھانا کھا لیں ہم لوگ دس بجے ریستوران بند کر دیتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بوڑھا سکھ میرے ساتھ اٹھ گیا۔

"حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا مگر اس وقت پھر بھوک محسوس کر رہا ہوں" بوڑھا سکھ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"شاید میں اسی لیے دیر میں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی!" میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں [illegible] بار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا، صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا اور لڑکا لڑکی [illegible] چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے اسے دبا دیتا تھا۔ ہاتھ کے دبانے سے لڑکی کے چہرے پر ایک گلنار مسکراہٹ کھل اٹھتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی سوئچ (SWITCH) ہے کہ جسے بار بار دبانے سے مسکراہٹ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھتی۔ لڑکی کے بال خوشنما طریق سے بنے ہوئے تھے اور وہ بڑی دلکشا صورت والی، موہنی اداؤں والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچن معلوم ہوتی تھی جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا، سانولے رنگ کا سیلر تھا۔ چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے سر کی حجامت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اس کے کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے اور اس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں لڑکی کا ایک ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح دباتا تھا جس طرح گویا وہ اس میں برقی رو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کی نیلی ساڑھی کا پلو برابر مسکے جا رہا تھا اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی لڑکی نہ ہو حسن کی ایک پلیٹ ہو۔ "محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے" میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا

جواب میں بڈھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جوڑا کافی پی کر اور بل ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گلنار مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اس لڑکی کی وہ گلنار مسکراہٹ اس کے تبسم کی ادا بے حد پسند آئی۔ جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی۔ کتنی چاہت اور سپردگی تھی اس کی نگاہ میں کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے ایسی ہی وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے۔ مسکرانے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ویسٹی بیول میں لے گیا تھا اور ان کے جانے کے بعد ریستوران کا ماحول بھی سونا سونا سا دکھائی دینے لگا اور کھڑکی پر ٹنگا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف انہیں کے لیے ٹنگایا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بڈھا سکھ میری حرکت پر مسکرایا۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بڈھے سکھ نے کافی منگائی اور میں سگرٹ پینے کے لیے باہر ویسٹی بیول میں آ گیا۔ ویسٹی بیول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اس لڑکی کو چوم رہا تھا۔ اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ آنسو کیسے؟"

"کچھ نہیں یونہی!" لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے چہرے پر وہ دلآویز تبسم

رہا۔ محبت میں ڈوبا ہوا۔ گلنار تبسّم!

لڑکے نے پھر اُسے ایک بار چوما۔

لڑکی کے شانے کانپے۔ اُس نے سُکڑ کے کہا۔ چلو ڈارلنگ اندر چلیں یہاں سردی ہے ..... اُس نے خاموشی سے اپنی وں سے میری طرف اشارہ کیا۔ میں جو دوسری کھڑکی میں کھڑا ابتک برابر پورنیما کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا مجھے ابھی پھر ابھرنے دے گا پھر اُس نے آہستہ سے گھوم کر لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اُسے ویسٹی بیول سے نکال کر اندر ڈبے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا سکھ بھی کافی پی کر ریستوران کار سے نکلا۔ میں نے بھی اتنے میں اپنا سگرٹ ختم کر لیا تھا۔ ہم دونوں واپس اپنے ڈبے میں آ کر اپنی سیٹوں پر دراز ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ڈبے میں آیا۔ اُس نے سب بتیاں بجھا دیں لیکن ڈبے کے باہر چاندنی مکمل طور پر کھل اٹھی تھی۔ اور اُس کی سپید مدھم روشنی میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا مجھے اس چاندنی میں نیند نہیں آتی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا دوں!

ذرا ٹھہرو۔ بوڑھے سکھ نے بہت ہی دھیمے لہجے میں، بیحد پرسوز آواز میں کہا: "یہ پُونم کی رات بہت بھیانک ہے، بہت خوبصورت بھی ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے مگر میں اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں"۔ چاند کو تو نوجوان لوگ دیکھتے ہیں، ہمارے تمہارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں۔ میں نے افسردہ تبسم کے ساتھ کہا۔ بوڑھا سکھ مسکرایا، اُس کا دایاں رخسار چاندنی میں تھا۔ اور سیب کا نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں رُخسار کی وہی تاریکی میں گم تھی۔

میں نے کہا۔ تمہارے رخساروں کے یہ زخم کیا تم نے جنگ میں حاصل کیے ہیں؟ جنگ؟ جنگ، بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

ہاں! جنگ ہی تو تھی۔ وہ رُک کر آہستہ سے بولا

کون سی جنگ! پہلی جنگ عظیم یا اُس سے پہلے کی کوئی جنگ! میں نے پوچھا۔

میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا۔ میرا قیاس بے بنیاد ثابت ہوا اس لیے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا پھر یہ زخم کیسے۔؟

بوڑھے سکھ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاند اپنی جگہ تھا۔ کھڑکی اپنی جگہ تھی۔ مسافر ڈبے میں خال خال ہی تھے، مگر جہاں تھے وہیں تھے وہیں اپنی اپنی آرام کرسیوں پر دراز سو رہے تھے، ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر آخیر میں تاریک کونے میں وہ لڑکا اور وہ لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبکے ہوئے تھے۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر۔ آنکھیں دونوں کی بند تھیں

بوڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا۔ یہ قصہ ضرور سنو گے؟ اگر تمہیں نیند نہ آ رہی ہو سنا دوں۔

نیند تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہیں آئے گی! بوڑھے سردار نے بڑے گداز لہجے میں کہا۔ پھر اُس نے اس طرح سے کہا جیسے وہ قصہ سنانے کے لیے تیار ہو چکا ہو اُس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ اچھا تو سن لو تم میرے لیے مکمل اجنبی ہو اس لیے تمہیں سنا دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ گاڑی کی کھڑکیوں میں دوہرے شیشے لگے ہوتے تھے۔ جن کی وجہ سے گاڑی کی چھک چھک بڑے میٹھے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز

سی نورانی معلوم ہوتی تھی اور گاڑی کے دو رویہ پھیلی ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹتے ہوئے، سر جھکائے ہوئے گناہ گار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے لاری میں سوئے ہوئے سِکھ نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جوانی میں میں بھی اسی طرح تھا بے فکر اور لاپروا اور خود سر، میرا باپ گجندر سنگھ ضلع جالندھر کا نمبردار تھا اور اس کے علاوہ چک نمبر ۳۷ بھی پورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گو باپ نے مجھے بی اے پاس کروا دیا تھا۔ لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشتاق تھے۔ جانے میں نے بی اے کیسے کر لیا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں، کرنیل بنوں مگر مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی۔ بھوری بھوری مٹی کی سوندھی مہک، شبنم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دور دور ان کے ٹیلے پر پانی بھرتی ہوئی ناریوں کی قطار اور میری سنہری گھوڑی کی دُلکی چال۔ کچے راستوں پہ ہلکی ہلکی دھول جگاتی ہوئی . . . . آہ!

میں نے کہا تم اپنے شباب میں بے حد حسین رہے ہو گے۔ عورتیں تم پر بہت مرتی ہوں گی۔

بڈھے سکھ نے حزیں مسکراہٹ سے کہا ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی ہو۔ ہاں میں نے ضرور ایک لڑکی سے محبت کی تھی

کون تھی وہ؟

میری بیوی تھی!

بیوی؟

جب میں بی اے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جھمراں کے نمبردار کی لڑکی پرتیو سے میرا بیاہ کر دیا۔ پرتیو بڑی خوبصورت لڑکی تھی لانبی اور دھان پان گوری اور سنہری پلکیں اور نرم جیسے کوار گندل مگر میں تو اس کی آنکھوں پر مرتا تھا۔

کیوں، ان آنکھوں میں کیا بات تھی؟ میں نے پوچھا

بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ!۔ مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، پھر کیا تھی؟

کہہ نہیں سکتا۔ اُن آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں رنگ نہیں، اُن آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

وہ آنکھیں بولتی تھیں؟

بولتی تو نہیں تھیں، لیکن بولنا چاہتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہتیں۔ ہر وقت سپنے سے دیکھتی رہتیں۔ کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ سپنا سا دیکھا کریں!

جوانی میں سبھی آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں میں نے کہا، ہاں! لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں!

بڈھے نے آہستہ سے کہا، میں تو اپنی پرتیو پر مرتا تھا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لیے ہوا کہ میری زندگی میں اُس سے پہلے کوئی عورت نہ آئی تھی۔ نہ اُس سے پہلے نہ اُس کے بعد . . . .

پرتیو تم نے نہیں دیکھی، ورنہ یوں نہ کہتے، وہ تو ایسی عورت تھی جس سے اُس کے بیوی ہونے کے بعد بھی اُس سے عشق کیا جا سکتا تھا اور پھر یوں ہی ہوا جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کسان بننے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فوراً میرا بیاہ کر دیا اور مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اُسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا تم جانتے ہو اگر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پرتیو سے محبت کر سکتا تھا۔ اب تک تو فرنگیوں کی کسی نہ کسی لڑائی میں اٹلی میں فرانس میں یا

میں ٹھہرا رہتا تو خیبر میں کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا بُرا ہوا

یکایک وہ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بولا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اپنی پرتو کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ اور ہم کبھی ایک دن کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے۔ لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سسر اپنے گاؤں میں سخت بیمار ہو گیا اور پرتو کو اپنے میکے جانا پڑا۔ اُس کا باپ بیمار تھا اس لیے میں بھی اُسے کیسے روک سکتا تھا۔ چنانچہ پرتو چلی گئی۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں، کھیتوں میں، اپنی گھڑسواری میں، کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے کاٹے لیکن چوتھے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کسی اور سرپٹ ہو لیا۔ اپنی سسرال کے گھر۔ چک جھمراں ہمارے گاؤں سے بیس کوس پر واقع ہے۔ لیکن میری گھوڑی بڑی تیز رفتار ہے میں شام ہوتے ہوتے چک جھمراں پہنچ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے بلکہ میں نے اُسے خاصہ ہشاش بشاش پایا۔ ساس اور سسر دونوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور جب اُنہیں یہ معلوم ہوا کہ داماد اپنے سسر کی صحت پوچھنے چلا آیا ہے تو وہ میری سعادت مندی پر بہت خوش ہوئے۔ دن بھر بیس کوس کا سفر کرنے سے میں بہت تھک گیا تھا۔ اس لیے جلدی کھانا کھا کے میں سو گیا مجھے معلوم تھا کہ اب جو سوؤں گا تو پھر صبح ہی اُٹھوں گا۔ میں نے پرتو سے کہا۔ مجھے صبح ضرور اٹھا دینا میں گھوڑی پر سوار ہو کر صبح سیر کر جاؤں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے تک سوتا ہی رہوں۔

لیکن ہوا یہ کہ اُس رات تیسرے پہر ہی میں میری آنکھ کھل گئی اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے بستر پر نہیں ہے۔ فوراً کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے ہلکے سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ اور ایک سایہ سا دروازے کے باہر گزرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھا۔ واہگورو یہ کیا ماجرا ہے؟ سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اُٹھا۔ کرپان کو تکیے کے نیچے سے نکال کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہو لیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوشبوؤں والی چاندنی رات تھی۔ سرس اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونسلوں میں کبھی کبھی چڑیاں غنودگی میں چوں چوں کرتیں مگر اُن کے چڑے فوراً اپنی مضبوط چونچ سے ٹھونگ کر انہیں اپنی گودیں دبا لیتے جن کے بازو شبنم میں بھیگ چکے تھے اور میرے چاروں طرف سرسوں کی ہری ہری کونپلیں لہرا رہی تھیں اور کھیتوں میں گزرتا ہوا اپنی پرتو کے تعاقب میں جا رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا وہ کھیتوں میں ضروری حوائج سے فارغ ہونے جا رہی ہے لیکن جب اُس نے ایک کھیت کو پار کر لیا۔ دوسرے کھیت کو پار کر لیا۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے گھوم پیچھے کے خشک نالے کو پار کر کے ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی تو مجھے عجیب طرح کی تشویش، حیرت اور کوفت سی ہونے لگی دل کو دھچکا سا لگا اور اب میں ہولے ہولے بہت ہی احتیاط سے اُس کے تعاقب میں چلنے لگا۔ تاکہ اُسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اُس کے تعاقب میں ہے۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے اُتر کر نالے کو پار کیا۔ پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو نظر دوڑائی۔

سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے قریب بیریوں کا ایک سایہ دار جھاڑ تھا۔

جھاڑ کے نزدیک ایک پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے قریب ایک ملحقہ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اس پلنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پرتیو۔ میری بیوی اُس سے بہت پیار کر رہی تھی۔ وہ بار بار اُس کی آنکھیں چومتی اور اُس کے رخسار اور کتنی شدت تھی اُس پیار میں۔ میری آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ گر میں چپکا بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا اُن دونوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہاں۔ ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد بچنا نے میری بیوی سے کہا۔ پرتیو! مجھے پیاس لگی ہے۔ اندر سے پانی لا دے!

پرتیو نے اپنا سر اُس کے سینے سے ہٹا لیا اور بولی نکھٹے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا۔ اُس نے میری بیوی کے ہونٹ چوم لیے۔ پرتیو آہستہ سے پلنگ سے اٹھی اور آدھ کھلے دروازے سے ناچتی مکان کے اندر گئی۔ بچنا اوندھے منہ لیٹ کر بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ میری بیوی بالکل ننگی تھی

یکایک میں نے کرپان نکالی اور اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کے اوپر اٹھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے بچنے پر وار کیا۔ بچنے کے منہ سے "ہک" کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے میں اُس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لیے رک کر اپنی کرپان کو مٹی سے اچھی طرح صاف کیا اور جب وہ بالکل صاف شفاف ہو کر آئینے کی طرح چمکنے لگی تو اُسے میان میں رکھ کر کھڑکی کے راستے اندر آ گیا اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد پرتیو میرے گھر میں دھیرے سے داخل ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پرتیو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا پھر اُس نے آہستہ سے میرے تکیے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اُسے کھول کر دیکھا اور جب اسے بالکل صاف پایا۔ تو گویا اُس کے دل کا شبہ دور ہو گیا اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی چپ چاپ پتھر کی سل! بڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

کچھ نہیں ہوا! اُس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا اس لیے میں پرتیو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا اور ہم دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگے۔

دن بیتے، مہینے بیتے، سال بیتے۔ میں نے کبھی اُس بات کا اُس سے تذکرہ نہیں کیا۔ نہ پرتیو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اُسے کسی بات کا بھی شبہ ہوا تھا یا اُسے کسی بات کا کوئی غم تھا۔ ہاں ایک بات میں نے ضرور دیکھی۔ اس واقعے کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی، میرے کہنے پر یا اپنے باپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقعے کو بھول سا گیا۔ کیونکہ اب میرے بچے ہو گئے تھے میرے اور پرتیو کے بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے خوبصورت بچے تھے۔ ہمارے پرتاپ اور دلیپ اور ہرنام کور۔ بڑھتے بڑھتے بچے بھی بڑے ہو گئے اور سکول جانے لگے، سکول سے کالج میں جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا ہرنس سنگھ۔ اب ہمارے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مفاہمت جو اچھے گھروں کی مثال بنتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ کے گھر کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ اور دلیپ کالج سے واپس آ گئے تھے گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لیے۔ ہرنام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہربنس لکڑی کے گھوڑے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرتیو گھر کے نیچے ایک کونے میں چولھے میں مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا۔ اور اس کی کٹ کھنی خوشبو میری بھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کرپان کھول کر الگ رکھ دی۔ اور ہاتھ منہ دھو کر پرتیو کے سامنے مونڈھا بچھا کر بیٹھ گیا اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

پرتیو جلدی سے کھانا دے دے!

پرتیو نے سب سے پہلے میرے لیے کھانا پروسا۔ پھر پرتاپ کے لیے، پھر دلیپ کے لیے، پھر ہرنام کے لیے۔ سب سے چھوٹا ہربنس نے مچل کر کہا "میں تو اماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا"

میں نے پرتیو سے کہا تو بھی بیٹھ جا اب!

میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟ پرتیو نے ذرا ناک سکیڑ کر کہا۔

اس وقت چولھے کی روشنی میں اس کے رخسار تمتما اٹھے تھے اور الجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آتی تھی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ماں! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے۔ دلیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

پرتیو نے ہانڈی میں سے ساگ کی کڑچھی بھر کر اسے دلیپ کی تھالی میں انڈیل دیا۔

میں نے کہا، ہربنس کی ماں! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مزا دوگنا ہو جائے۔

اچار تو اندر کوٹھڑی میں ہے! پرتیو نے رک رک کر کہا۔

تو کیا ہوا۔ اندر سے جا کے لا دے۔

پرتیو سہم کر بولی اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔

ڈر لگتا ہے؟ یکایک میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن اس رات کو کھیتوں کو پار کر کے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا۔ یکایک میں نے تنک کر کہا جانے کیسے کہہ دیا اتنے سالوں تک جس بات کو کبھی نہ کہا تھا کیسے وہ بات یوں ایک طعنہ بن کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

پرتیو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کرپان لیے میرے سر پر کھڑی ہو۔ پھر ایک بجلی سی تڑپی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ایک بار، دو بار، تین بار۔ کرپان میرے رخساروں کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ہاتھوں سے اسے روکنا چاہا۔ اور چلایا۔ پرتیو، پرتیو، رک جا۔ مگر پرتیو ایک بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر وار کرتی رہی۔ آخر غصے میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے میں کرپان اٹھا کر اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور دونوں ہاتھوں سے کرپان اٹھا کر اور اپنے جسم اور روح کی پوری طاقت سے پرتیو کی گردن پر پورے زور سے دے مارا۔ پرتیو کی گردن کٹ کر ہربنس کے گھٹنے کے قدموں میں جا گری اور وہاں سے لڑھک کر میری ہی تھالی میں آ گری؟

ہوگئی اور اُس کے سیاہ بال کھل کر میرے سامنے بکھر گئے۔"

بڈھا سکھ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشت ناک بھوت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور ستے ہوئے تھے جیسے وہ چہرے نہ ہوں، بہروپیوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اور چاند۔ مجبور اور بے کس تنہا اور اکیلا کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بڈھے سکھ نے دلگیر لہجے میں کہا۔

عورت کبھی نہیں بولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کر کے، ایک پلنگ پر لٹا کر۔ چار بچے پیدا کرا کے اُس کے دل کا سپنا اُس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔

عورت کبھی نہیں بولتی!

بڈھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اُس نے اپنے رُخسار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری اُس کے دل کے اندر ڈوب چکی ہے!

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے منہ کھول دو تین لمبے لمبے سانس اندر کو لیے پھر اچانک میری نظر کونے میں سوئے ہوئے جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کا ہات ابھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا، لڑکے کا بازو ابھی تک لڑکی کے شانے پر تھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ یکایک لڑکی نے لڑکے کے سینے سے سر اٹھایا، آہستہ سے اپنا ہات لڑکے کے نیچے سے نکالا اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے۔ تو لڑکی نے نوجوان کا بازو اپنے شانے سے الگ کیا اور اُس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا پھر ایسی حسرت آمیز نگاہ سے دیکھا جو اُس کی گلنار مسکراہٹ کی ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی میں بالکل بھونچکا رہ گیا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک کرپان سی لہلہاتی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں نیچی کر لیں!

دوسرے لمحے میں جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے اپنی کھڑکی پر پردہ گرا لیا تھا۔ اُس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

ماتم

احمد ندیم قاسمی

آسمان پر کفن کا سا یہ سفید بادل چھا رہا تھا اور ہوا میں کافور کی بُو بسی ہوئی تھی

میاں جی کا جنازہ ابھی ابھی اٹھا تھا۔ گو جنازہ اٹھنے پر گھروں میں جو قیامت بپا ہو جاتی ہے اس سے میاں جی کی چار دیواری محروم رہ گئی تھی۔ کھلے آنگن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عورتیں ایک دوسرے میں کچھ یوں پیوست ہو کر بیٹھی تھیں کہ اگر ایک اٹھتی تو سب کی سب اٹھ چلی جاتیں۔ مگر سب شدید حد تک خاموش تھیں۔ خاموشی اور شدید خاموشی کے درمیان سکوت سے سناٹے کا فاصلہ ہے اور موت والے اس گھر کے آنگن پر یہی مہیب سناٹا مسلط تھا۔ بچوں تک نے دم سادھ لیا تھا۔ منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا بھی جیسے لاؤڈ سپیکر پر کائیں کائیں کر رہا تھا۔

”تیر تیر تیر“ یکایک ایک عورت کوے کی طرف ہاتھ اٹھا کر پکاری۔ کوا اُڑ گیا اور وہ مجمعے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”ماتم کے گھروں میں بھی ہڈیاں ڈھونڈنے آ نکلتے ہیں موئے کلموہے زمانے بھر کے [illegible]“ ”ہائے“ کے ساتھ اس نے اپنا زانو سمیٹ لیا۔ مجمعے کو شاید اسی بات کا انتظار تھا کہ کوئی بولے تو ہم بھی بولیں۔ اس لئے سب بولنے لگیں اور سب نے جیسے ایک ساتھ پھاڑ دیے۔

”ہائے بے چاری بی بی۔“ کسی نے کہا۔

آنگن کے پرلے گوشے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔ ”بی بی روئی کہ نہیں؟“

”نہیں“ کوٹھے کے دروازے کے پاس سے جواب آیا۔ ”ویسے ہی بیٹھی ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی ہے۔“

وہی بڑھیا بولی۔ ”اسے رلانے کی کوئی تدبیر کرو کمبختو۔ ورنہ اس کا کلیجہ پٹاخے کی طرح چھر چھر سے پھٹ جائے گا۔ یہ سکتے کی بیماری ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا اور جان ہوا ہو جاتی ہے۔ نوراں اپنے بیٹے کے مرنے پر یوں ہی مر گئی تھی۔“

سب کی نظریں بی بی پر جم گئیں جس نے اپنے میاں کے مرنے پر اب تک ایک بھی آنسو نہیں ٹپکایا تھا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھ بھی لیتی تھی۔ ہوں ہاں سے باتوں کا بھی جواب دے دیتی تھی مگر روتی نہیں تھی۔

”رو بی بی۔ جی کھول کے رو۔“ پرلی طرف سے اُدھیڑ عمر کی جاگاں اپنے آپ کو کھینچ کر اٹھی اور [illegible] اور بین کرتی ہوئی دروازے کی طرف یوں بڑھی جیسے بی بی کو رلا کر ہی دم لے گی۔ علاقے بھر میں اس سے بہتر بین کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

انگشتِ شہادت کو آسمان کی طرف اٹھا کر اسے ماتمی دائروں میں گھماتے ہوئے وہ بولی: "تیرے سکھ کے پھول کو آج موت کا بگولا اڑا لے گیا، بی بی جون۔ تیرے دنوں پر اب سورج کبھی نہیں چمکے گا۔ میری مٹی پٹی سیلی۔ اتنے ڈراؤنے اندھیرے میں تو فرشتے بھی رو دیں بی بی اور تو ہے کہ ایک چیخ بھی نہیں مارتی۔ میاں جی کا جنازہ اٹھ گیا تو اب اپنی میت پر ہی رو لے"

"میں مر چکی ہوں بھاگاں"، بی بی نے آہستہ سے کہا۔ اور یہاں سے وہاں تک عورتیں یوں ٹوٹ کر رو دیں کہ ان کی گودوں میں دبکے ہوئے بچے بھی بلبلا اٹھے جن کے کانوں تک بی بی کی آواز نہ پہنچ سکی وہ اپنے آس پاس سے رونے کی وجہ پوچھ کر رو دیں۔ حتیٰ کہ یہ ماتمی لہر آنگن کے دوسرے سرے تک پھیل گئی۔ وہ بچے جو جنازے کے پیچھے نکل گئے تھے۔ ماتم کی یہ گونج سن کر بھاگتے ہوئے آئے اور آنگن میں جھانکنے لگے۔ جو بچے رہ گئے تھے، سہم کر ماؤں کے پاس ٹھنسے بیٹھے تھے، اٹھے، اور کوٹھے کے دروازے سے لگ کر بی بی کو گھورنے لگے۔

بی بی کا چہرہ فق تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا خالی پن تھا جیسے کوئی ان میں سے کچھ نکال کر لے گیا ہے۔ اس کے ہونٹ مٹی ہو رہے تھے۔ اور اس کی کلائی کے ایک زخم پر ایک مکھی بار بار آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ جب حافظ جی نے یکایک بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھ کر میاں جی کے دم توڑنے کا اعلان کیا تھا تو کوٹھے کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی بی بی نے اپنی ناک کی کیل نوچ کر پھینک دی تھی اور چھن چھن سے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ اور جب اُدھر میاں جی کا لاشہ بندھ رہا تھا تو اِدھر عورتیں سوئی کی مدد سے بی بی کی کلائی میں سے کانچ کا ایک ٹکڑا نکال رہی تھیں۔

بی بی کو پچاس برس کی عمر میں بھی چوڑیاں پہننے کا شوق تھا۔ میاں جی کو ساٹھ برس کی عمر میں بھی بی بی کی کلائیوں میں چوڑیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ سفید کلائی پر ویسے بھی ہر رنگ کی چوڑی سج جاتی ہے مگر میاں جی تو چوڑیوں کے انتخاب کے معاملے میں فن کار تھے۔ ایسے ایسے رنگوں کی چوڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ آج تک وہ رنگ نہ کسی نے دیکھے تھے نہ سنے تھے۔ ایک بار تو انہوں نے بی بی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جی چاہتا ہے تمہارے سارے جسم پر چوڑیاں چڑھا دوں۔

میاں جی کو قسم قسم کی پلیٹیں جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اسی لئے گول، چوکور، تکونی اور کناروں والی پلیٹوں کا انبار ان کے ہاں جمع ہو گیا تھا۔ اور وہ پلیٹ تو انہیں بہت عزیز تھی جو وہ پونا سے لائے تھے۔ ان دنوں وہ فوج میں جمعدار کلرک تھے۔ کوئی چینی پھیری والا پلیٹیں بیچتا پھر رہا تھا۔ اس پلیٹ کے وسط میں بھرے بھرے جسم کی ایک چینی لڑکی کی تصویر تھی جو انگور کی بیلوں کے حاشیے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میاں جی کہتے تھے کہ جب انہوں نے یہ تصویر دیکھی تو ان کے سامنے بی بی کی صورت گھوم گئی۔ سو انہوں نے چینی کو منہ مانگے دام دے کر یہ پلیٹ خرید لی تھی اور جب چھٹی پر آئے تھے تو بکس میں سے یہ پلیٹ نکال کر بی بی سے کہا تھا۔ "جس طرح کہانیوں کے جنوں بھوتوں کی جان طوطے میں ہوتی ہے اس طرح تمہارے اس جن کی جان اس پلیٹ میں ہے۔ اس لیے کہ پلیٹ میں تم ہو۔"

بی بی نے یہ پلیٹ برسوں تک اپنے کلیجے سے لگا کر رکھی تھی۔ دم توڑنے سے ذرا دیر پہلے میاں جی نے فرمائش کی تھی کہ انہیں دواء المسک اسی پلیٹ میں رکھ کر کھلائی جائے۔ اب بھی وہ پلیٹ کوٹھے کے اندر ایک الماری میں رکھی تھی اور بی بی بار بار اس کی طرف یوں دیکھ لیتی تھی جیسے ابھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے گی۔ مگر نہ جانے یکایک عین موقعے پر اسے رونا کیوں بھول جاتا تھا۔

رونا تو اس کا ایک ہتھیار تھا۔ وہ تو میاں جی کی ایسی باتوں پر بھی رو دی تھی کہ آج کے سالن میں کل والا مزا نہیں ہے اور اسے روتا دیکھ کر میاں جی کو صدق دل سے اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ مغلوں کے شاہی باورچیوں کو بھی اس مزے کا سالن تیار کرنے کا نسخہ معلوم نہ تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے دونوں کبھی کبھی خود ہی بچے بن جاتے تھے۔ خوب خوب روٹھتے اور روتے تھے۔ "تم مجھ سے ویسا پیار نہیں کرتیں جیسا میں کرتا ہوں" میاں جی کہتے۔ اور بی بی اپنی کنپٹیوں کی سفیدی کے باوجود بھول جاتی کہ میاں جی نے اس کے ایمان پر حملہ کیا ہے۔

اور آج میاں جی اس گھر میں سے ہمیشہ کے لیے اٹھ گئے تھے۔ اب وہ شام کی نماز پڑھ کر واپس آنے والے میاں جی کے قدموں کی چاپ کبھی نہیں سن سکے گی۔ اب کبھی یوں نہیں ہو گا کہ آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلے تو اس کا سر میاں جی کے زانو پر رکھا ہو اور میاں جی اس کے ہونٹوں کے خطوط پر اپنی ایک انگلی کی پور پھیر رہے ہوں۔ اب کچھ بھی تو نہیں ہو گا کچھ بھی تو نہیں ہو گا۔ بی بی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی مگر اسے ان سوچوں پر بھی تو رونا نہیں آ رہا تھا۔

اگر اس کے آنسوؤں کا رونا یکایک خشک ہو گیا تھا تو جب بھی کم سے کم دنیاداری کے لیے تو اس کا رونا ضروری تھا۔ میاں جی کی دور نزدیک کی رشتہ داریں جہاں جہاں روتی ہوئی آئیں اور بی بی کو گلے سے لگا کر ایسے ایسے بین کیے کہ دشمنوں کے کلیجے بھی پھٹ جائیں مگر جب وہ بی بی سے الگ ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں دھول اڑتی دیکھی تو بعض حیران رہ گئیں۔ بعضوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور بعضوں نے چپکے سے دوسری کے کان میں کہا۔ "دنیا میں یہ پہلی بیوی ہے جو اپنے میاں کی موت پر خوش ہوتی ہے۔" پھر یہ سرگوشیاں صحن میں دور و نزدیک پھیل گئیں۔ یہاں سے وہاں تک عورتیں رونے کے بجائے ناکوں اور ٹھوڑیوں پر انگلیاں رکھ کر کھسر پھسر کرنے لگیں، دروازے سے لگ کر کھڑے سہمے ہوئے بچے بھی بی بی سے مایوس ہو کر اندر کوٹھے میں کھیلنے لگے س ہجوم میں اکیلی رہ گئی۔

رونا کوشش سے نہیں آتا۔ یہ تو محبت کی طرح بڑی بے ساختہ چیز ہے۔ مگر بی بی رونے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے پچھلے تیس برسوں کا ایک ایک واقعہ یاد کر ڈالا۔ کئی بار اس نے محسوس کیا کہ برسات کی رات ہے۔ چھت پر بوندیں بج رہی ہیں۔ بادل کہیں دور جیسے نیند میں گرج رہا ہے۔ کوٹھے میں میلی میلی روشنی والا دیا جل رہا ہے۔ میاں جی کا سر اس کے بالوں میں ڈوب گیا ہے اور اس کے ہونٹوں کو میاں جی کے سینے کے بال چھو رہے ہیں۔ ان یادوں نے اسے جیسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھٹک ڈالا مگر اس کی آنکھوں میں اسی طرح ریت کھٹکتی رہی۔

کئی بار بی بی نے اس جگہ کو گھورا جہاں میاں جی کی میت جنازہ اٹھنے تک پڑی رہی تھی۔ وہ ان پر پچھاڑیں کھا کھا کر گری تھی۔ مگر لوگ پچھاڑوں کو نہیں دیکھتے۔ آنسوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تو بعض حیوان بھی پچھاڑیں کھا کر گر جاتے ہیں۔ انسان کی پہچان تو آنسو ہیں۔ انسان روئے نہیں تو کوئی کیسے مانے کہ اس کا دل دکھا ہے۔

آنگن کے ایک ایک چپے سے بی بی کی زندگی کے کتنے واقعے چپکے ہوئے تھے۔ ان دیواروں اور ان منڈیروں پر آج کتنی کہانیاں اتر آئی تھیں۔ بی بی نے رونے کی خاطر ایک ایک چیز کو گھورا۔ اس کی نظریں منڈیروں، دیواروں اور دروازے سے گھومتی ہوئی کوٹھے کے اندر داخل ہو گئیں۔

یکایک وہ تڑپ کر اٹھی۔ دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا اور پھر ایک بلند چیخ کے ساتھ سینے پر نہایت زور کا دوہتڑ مار کر وہیں ڈھیر ہو گئی۔

بھاگاں اٹھ کر اس کی طرف لپکی اور پھر آنگن کے پرلے سرے تک تمام عورتیں اٹھ چلی گئیں۔

"کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔

اور بھاگاں نے جیسے ایک مژدہ سناتے ہوئے کہا۔ "بی بی رو رہی ہے"۔

چند عورتوں نے ہچکتی اور سسکتی ہوئی بی بی کا بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر دوسری عورتوں کو دکھایا اور سب حیران ہو کر بولیں۔ "یہ تو زار زار رو رہی ہے بے چاری"

پھر اندر کے کمرے میں کسی عورت نے ایک بچے کے زور کا چانٹا مارا اور اسے بازو سے گھسیٹتی ہوئی، دہلیز پر آ کر پکاری۔ "نامراد نے بی بی کی پلیٹ کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔"

لوٹے پل

علی عباس حسینی

امرداد اُن تینوں درختوں پر جان دیتے تھے۔ لوگ کہتے کہ وہ انہیں اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ ان کے لیے وہ پیڑ نہ تھے بلکہ ان کے بزرگوں کی روحیں تھیں، اور تھے بھی وہ درخت خاندانی۔ املی کا پیڑ اُن کے دادا نے لگایا تھا، نیم کا درخت اُن کے پتا جی نے اور آم کا مولا تو خود انھوں نے بھوشن کی پیدائش کے دن اپنے ہاتھوں سے گھر کے صحن میں بٹھایا تھا۔ تینوں درختوں کے پھلوں کا ذائقہ بھی روایتی تھا۔ املی کی ترشی بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیتی تھی۔ نمکولیاں اپنے کڑوے پن میں چرائتے کو مات کر دیتی تھیں۔ اور آم کی کھٹاس کے سامنے لیمو کا اچار بھی پانی بھرتا تھا۔ پھر بھی امرداد اُن درختوں پر فدا تھا، جان چھڑکتے تھے۔ ہر روز صبح سویرے جب وہ "اشنان" کر کے سورج دیوتا کو "جل چڑھاتے" تو اُن درختوں کے تھالوں میں بھی پانی دیتے۔ نہ سورج کی پوجا ناغہ ہوتی اور نہ درختوں کی رکھوالی۔

بڈھا ہو کہ بالا، وہ کسی کو اُن درختوں پر چڑھنے نہ دیتے۔ اُن کی ایک پتی کھسوٹنے نہ دیتے۔ دتونیں اُن کے درخت سے دستیاب نہ ہو سکتی تھیں [illegible]۔ "برگِ نیم کوفتہ و بیختہ" کر کے زخموں پر ٹکیاں بنا کر رکھنے کو کہیں، یہ مرہم دادا کے پیڑ سے نہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ املی کی ایک کچی پکی یا آم کی کیری پر ڈھیلا مارنا خود اُن پر سنگ ساری کے برابر تھا۔ نمکولیاں زمین پر پڑی سڑتی رہیں لیکن جب تک دادا کا حکم نہ ہو، کوئی چمارن اُن سے تیل نکال لینے اور اپنی اندھیری جھونپڑی میں دیا جلانے کی غرض سے اُنہیں بٹورنے کی ہمت نہ کر سکتی تھی۔ البتہ جب املی پکنے لگتی اور آم کے پھل پورے رس پر آجاتے تو دادا خود اُن درختوں پر چڑھتے اور اپنے ہاتھ سے اُن کے پھل تھیلوں اور جالیوں میں توڑ کر زمین پر ڈھیر لگاتے تھے۔ اس وقت گاؤں کے سبلے لڑکے اور لڑکیوں کو اجازت تھی کہ وہ دادا کا اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ جب درختوں کی ایک ایک پور سے لد اتار دیا جاتا تو پھلوں کا پورا ڈھیر گاؤں بھر میں بانٹا جاتا۔ اگر کسی گھر کا نمائندہ بچہ نہ موجود ہوتا تو امرداد اُن درختوں کے پھل وہاں خود پہنچا دیتے۔ پورے گاؤں میں سوائے جگن ساہو کے کوئی گھر نہ بچتا جہاں اُمرداد کے کھٹّے آم آپس کی مٹھاس بڑھانے کا شیریں فرض ادا نہ کرتے تھے۔

رہی جگن ساہو تو وہ اس کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ جگن ساہو سے یہ جلن اس کی لڑکی لجیا کی ہم عمر تھی، ٹھیک دن تاریخ تو نہیں بتائی جا سکتی لیکن ۱۹۴۲ء کی فروری میں لجیا نے پہلی بار گاؤں کی فضا میں آنکھیں جھپکائی تھیں اور کے ہاں : کے ہاں کر کے فریاد کی تھی اور مارچ کا مہینہ اچھی طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ گاؤں میں چیچک کی وبا پھیلی تھی۔ جہاں بیس کے قریب بچے اور جوان "سُورگ باشی" ہوئے وہاں ننھی لجیا کے باپ کو بھی "ماتا مائی لے گئیں"۔ امرداد گاؤں بھر کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتے رہے تھے، اُن کے دونوں لڑکے بھوشن اور مہندر شہر میں تھے، بیوی پہلے ہی مر چکی تھیں۔ انہیں اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ ان کو ایک بار بڑی چیچک بھی نکل چکی تھی۔ وہ نڈری سے سب کی "سیوا" کرتے رہے جگن ساہو مر گیا تو انھوں نے اس کی بیوہ کو خاص طور پر سہارا دیا۔ کچھ دنوں تو وہ اس کے گھر کھانے پینے کی چیزیں پہنچاتے رہے پھر اس نے نہیں

سے گھبرانا شروع کیا۔ اور "رسوئی گھر" کا کام سنبھال لیا۔

دونوں ایک ہی ذات کے فرد تھے، مگر دو جنسوں کے تھے۔ عمروں میں بڑا فرق تھا۔ یہ تقریباً چالیس سال کے "گرگ باراں دیدہ" اور وہ صرف سترہ ساون دیکھے ہوئے۔ دادا کی صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ کا قد، رنگ خالص تانبے جیسا، پھر چیچک پر وہ خشونت جس نے اپنے سے بڑے عمر والوں کو بھی دادا بنا دیا تھا۔ اُدھر لاکھ جگنی بیوہ سہی پھر بھی جوان تھی۔ اور جوانی خود ہی حسن ہے جب دستور گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے ایک دوسرے کے کانوں میں کڑوی کسیلی باتیں کہنا شروع کیں۔ اور دادا کے ایک ہمسن نے خود ان کے منہ پر ایک گرم گرم فقرہ کسا۔ اُمر دادا جھلا کے بولے "تم لوگ کتنے بڑے بیہودہ ہو تو تیری پتری..... " مگر وہ پتری سے آگے کچھ نہ کہہ سکے جیسے کسی نے ان کی زبان پکڑ لی ہو۔ جیسے بات حلق میں اٹک کر رہ گئی ہو۔ اور اسی سکوت نے جگنی بہو اور ان کے تعلقات میں ایک گہرائی پیدا کر دی، ایک مضبوط کڑی بڑھا دی۔ اس لیے کہ قانون فطرت ہے کہ جب مختلف جنسوں کی دو آزاد شخصیتیں برابر چپ سادھے ملتی رہتی ہیں تو ان کی یگانگی دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بھوبھل میں دبی ہوئی آگ کی طرح محبت بھی سلگتی ہی رہتی ہے۔ یہاں بھی محض واحسان مند کے رشتے میں لگاؤ کی گرہ پڑ گئی۔

پھر بھی بات لبوں تک نہ آئی تھی۔ اور معاملات گومگو کی حالت ہی میں تھے کہ منوہر اور بھوشن اپنے اپنے امتحان دے کر واپس آ گئے۔ منوہر کوئی پندرہ برس کا تھا، اب کے نواں پاس کر کے دسویں میں پہنچا تھا۔ اس نے اپنی پرانی "بھوجی" جگنی بہو کو رسوئی گھر کی مالکن پایا اور جس کے ہاتھ میں ڈوئی اُس کا سب کوئی" سے زیادہ دلچسپی نہ لی۔ مگر بھوشن جوان تھا، اکیسویں میں قدم رکھ چکا تھا۔ بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ یونیورسٹی میں یونین کا سرگرم رکن تھا۔ سترہ برس کی بیوہ اور اس میں ہنسی کا رشتہ تھا، دونوں جلد ہی ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ بے تکلفی سے باتیں ہونے لگیں۔ انگریز سے نفرت، رومان سے زیادہ دلچسپ موضوع تھا۔ "دلی چلو" کا نعرہ جنس سے زیادہ خون میں گرمی پیدا کرتا تھا۔ وہ گاؤں کے ہر جوان مرد و عورت کی طرح چپکے چپکے سازشیں کرنے لگے۔ اسکیمیں بنانے لگے۔ مگر ایک دن امر دادا نے ان کو کھلکھلاتے ہنستے دیکھ لیا اور آگ بگولا ہو گئے۔ وہ ہنس رہے تھے کسی اور وجہ سے یہ سمجھے کچھ اور۔ بھوشن تو ان کا لال چہرہ دیکھتے ہی کھسک گیا۔ مگر جگنی بہو رسوئی گھر ہی میں کھڑی رہی۔ دادا نے دہلیز پر قدم رکھ کر اس کو اتنی صلواتیں سنائیں کہ وہ جل بھن کر کباب ہو گئی۔ اس نے جھپٹ کر ترکاری کاٹنے والا چاقو اٹھا لیا۔ جب وہ اس کے تیور سے کچھ گھبرا کر، کچھ ڈر کر رسوئی گھر سے باہر نکلنے لگے تو جگنی بہو نے پاس والی دیوار پر چاقو اس زور سے کھینچ مارا کہ وہ دیوار میں نصف دھنس گیا اور اُسی کی طرح کانپنے لگا۔ دادا نے کچھ اور سہم کر اس کو دیکھا اور ان کی چال میں کچھ اور تیزی آ گئی۔ مگر جگنی بہو کی اس وار سے تسکین نہ ہوئی۔ وہ چولھے پر رکھی ہانڈیاں چھوڑ چھاڑ، بچی کو گود میں اٹھا، روتی، بلبلاتی گھر چل دی۔ اس دن کا دن اور آج کا دن کہ امر دادا نے آنکھ بھر کے اس کی صورت نہ دیکھی تھی۔ انہیں برابر یہی محسوس ہوتا رہا کہ چاقو دیوار کی جگہ ان کے سینے میں ترازو ہے۔

صرف ایک بار دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور وہ بھی اس طرح کے حادثے کے سلسلے میں جس نے ان کے دل کو ہمیشہ کے لیے اس کی عداوت اور نفرت سے بھر دیا۔ اسی سنہ ۱۹۴۲ء کی اگست میں جب [illegible] کے [illegible] کی اطلاع ملی، غازی پور، اعظم گڑھ کے نوجوانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی اور مادر وطن کے دیوانے لاٹھیوں اور ڈھیلوں سے بندوقوں اور مشین گنوں کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، امر دادا کو ایک کالی اندھیری رات میں خبر ملی کہ گاؤں والے ندی کا ٹھ کا پل توڑنے والے ہیں۔ یہ پل [illegible] ندی پر پڑتا تھا۔ سرجو کا پاٹ بہت چوڑا نہ تھا لیکن سڑک کی آمد و رفت اس پل کے [illegible] وہ نہیں پاتا۔ [illegible] شہر سے جو اس پار [illegible] کے گاؤں کو

سڑک جاتی تھی وہ اسی پل پر سے ہو کر گذرتی تھی۔ اس لئے اگر پل توڑ دیا جاتا تو حکومت کے آدمی اس پار والے بیس گاؤں تک آسانی سے نہ پہنچ سکتے تھے۔ انگریزوں سے آزادی چھیننے والے سورماؤں نے اسی لئے اس رشتے کو کاٹ دینے کی ٹھان لی تھی۔ چند ہی دنوں کی آزادی سہی، مگر ہمیں تو بڑھ جائیں گی۔ دوسروں کے لئے راستہ تو کھل جائے گا۔ منزل کی ایک جھلک تو دکھائی دے گی۔ جانوں کی بھینٹ چڑھا کر ہی آزادی کی دیوی کے درشن ہو سکتے ہیں۔

امر دادا کو یہ لڑائی جھگڑے والی باتیں پسند نہ تھیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ اہنسا کے پجاری ہیں۔ وہ گاندھی جی کے چیلے ہیں اس لئے کسی نے ان کو اس سازش کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ وہ تو اتفاقاً انہیں اس وقت پتہ چل گیا جب سب پل کی طرف جا چکے تھے اور وہ نہ تو ان کو اکٹھا کر سکتے تھے نہ سمجھا بجھا سکتے تھے۔ مینہ پڑ رہا تھا، کالی اندھیری رات تھی۔ گاؤں میں عجیب طرح کا سناٹا تھا اور فضا اس طرح بوجھل تھی جیسے کہ وہ کسی کا ماتم کر رہی ہو۔ دادا اپنی بے بسی محسوس کر کے اپنے دالان میں ٹہلنے لگے۔ ہائے ان مورکھوں نے کیا بے وقوفی کی۔ اتنی جابر حکومت سے کہیں اس طرح لڑا جاتا ہے۔ سوائے خون خرابے کے اور کیا ہاتھ آئے گا؟ اس پریشانی میں بس اتنا اطمینان تھا کہ خود ان کے دونوں بیٹے بھوشن اور منوہر شہر میں تھے۔ وہ اس "ہنسا" میں شریک نہ تھے۔ گاؤں والوں پر جو آفت آئے گی اس سے وہ یقینی بچے رہیں گے۔ انہوں نے جھک کر لالٹین اٹھائی۔ اس کی لو بڑھا کر پانی کا اندازہ کیا۔ تاریکی کے پس منظر میں گرتا ہوا موسلا دھار پانی روشنی میں ایسا معلوم ہوا جیسے [illegible]ناش بادل کا لبادہ اوڑھے سامنے کھڑے ہیں۔ ان کا دل عجیب طرح کے خوف سے دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر لالٹین تپائی پر رکھ دی اور پھر جلدی جلدی ٹہلنے لگے۔ دفعتاً بارش کی آواز میں ملی جلی گولیوں کی تڑتڑ اور زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخیں سنائی دیں۔ دادا ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا دل تیزی سے چلنے لگا۔ انہوں نے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "ہائے! جہاں پڑتا ہے وہاں پولیس یا فوج پہلے سے چھپی بیٹھی تھی۔ نہ جانے کتنوں کی جان گئی، کتنے گھائل ہوئے!" انہوں نے جلدی جلدی دھوتی کے پھندے کو کمر میں کس کر لپیٹنا شروع کیا۔

ایک ہاتھ میں لالٹین، ایک میں چھتری لے کر وہ صحن میں اترے ہی تھے کہ کسی دوڑنے والے کی چاپ سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے دم کے تنے سے پکار کر کہا "دادا! دادا! بھوشن کے سینے پر گولی لگی ہے، وہ جگن بھو کے گھر میں دم توڑ رہا ہے۔" اور کہنے والا دوڑتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

امر دادا کے ہاتھ سے لالٹین گر پڑی اور چھتری بھی۔ وہ بے ساختہ چیختے ہوئے لپکے۔ دو ایک جگہ پھسلے اور گرے بھی، لیکن ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین بھوشن کی منادی سنتے ہی نکل چکی تھی۔ انہیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ یونہی گرتے پڑتے بدحواس جگن بھو کے گھر پہنچے۔ اندر والی کوٹھڑی میں جہاں مٹی کا ایک دیا جل رہا تھا، ان کا بھوشن لہو میں لت پت ایک پلنگ پر بے سدھ پڑا تھا اور پٹی پر سر رکھے جگن بھو سسک رہی تھی۔ "اہنسا" کے پجاری امر دادا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہوں نے بے قصور جگن بھو کو زور سے لات ماری۔ "ڈائن! کھا لیا نہ تو نے میرے بھوشن کو!" وہ دھاڑے اور بیٹے کی گردن اور ٹانگوں میں باہیں ڈال کر اسے گھر اٹھا لائے۔

بھوشن نے ان کی گود میں تڑپ تڑپ کر تھوڑی دیر میں جان دے دی۔ وہ اسے زمین پر ڈال کر رات بھر اس کے سرہانے بت بنے بیٹھے رہے۔ صبح کو اٹھ کر انہوں نے سورج کے ساتھ ساتھ اپنے درختوں پہ پانی چڑھایا اور پھر آ کر آزادئ وطن پر بھینٹ چڑھنے والے بیٹے کے پاس بیٹھ گئے۔ دن چڑھے پولیس آئی۔ بھوشن کی لاش کے ساتھ ساتھ انہیں بھی شہر لے گئی۔ ساری جائداد، مویشی، کھیت، کھلیان سب کچھ ضبط کر لیا گیا اور بوڑھے باپ کو باغی بیٹے کو مرتے وقت پناہ دینے کی سزا میں سات برس کی قید سخت کا حکم ملا۔ جب پانچ برس بعد ملک کو آزادی ملی

اور دادا کو قومی حکومت نے آزاد کیا تو منوہر نے جو اب نوکر ہو کر شہر میں رہنے لگا تھا اپنے ساتھ قیام پر ان سے اصرار کیا۔ مگر دادا بیٹے کی بات مانتے یا اپنے درختوں کی پکار؟ وہ اکیلا تھا ادھر تین زمین دادا کی یادگار بھی، باپ کی بھی اور خود ان کے بھوشن کی بھی ——

دادا گاؤں آتے اور اسی پل پر سے ہو کر آتے جس کے توڑنے کے لئے بھوشن نے جان دے دی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کا جی چاہنے لگا کہ کاش یہ پل اپنے آپ ٹوٹ جاتا اور پھر کبھی نہ بنتا۔ اسی طرح نہ بنتا جس طرح ان کا بنا بنایا گھر اس کے کارن بگڑ کر پھر نہ بنا، اور وہ کچھ درد سے کچھ غصے سے کانپتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوتے اور اپنے گاؤں کے سرے ہی پر دکھائی دیا وہی منحوس مکان، جگن بہو کا گھر، اور ان کا جی چاہنے لگا کہ کاش یہ مکان گر گیا ہوتا، ڈھہ گیا ہوتا! کاش جگن بہو اپنے میاں ہی کے ساتھ مر گئی ہوتی کہ اس نے اسی شام کو بھوشن اور اس کے ساتھیوں کو پل توڑنے سے پہلے اپنے یہاں بیٹھ کر سازش کرنے کا موقع نہ دیا ہوتا۔

اور اسی جلن میں پورے دس برس گزر گئے اور آج اسی اگست کے مہینے میں جب سارا گاؤں سات دن کی مسلسل بارش سے تباہ ہو رہا تھا، انہوں نے پہلی دفعہ خوشخبری سنی۔ ندی کی باڑھ نے کالا کا پل توڑ دیا۔ دادا نے خبر دینے والے رامو کا منہ خوشی سے بوکھلا کر دیکھا اور پوچھا ”ارے سچ!“ اور رامو کے سر ہلا کر حامی بھرنے پر وہ اپنے دالان سے برستے ہوئے پانی میں صحن کی کیچڑ میں پھاند پڑے۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر ”تیری لیلا ہے بھگوان!“ پھر دفعتہً انہوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی، پھر وہ ایکبارگی اچھل کر کھڑے ہو گئے اور ”تیری لیلا ہے بھگوان نیاری نیاری ہے بھگوان!“ کہہ کہہ کر آنگن میں ناچنے لگے۔ دالان میں کھڑا رامو گھبرایا ہوا منہ کھولے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دادا کو کیا ہو گیا ہے، کس بیماری کا دورہ پڑا ہے۔ سات دن سے پانی ایک منٹ کے لئے نہ رکا تھا، گاؤں کے آدھے سے زیادہ گھر گر گئے تھے، نہ جلانے کے لئے لکڑی رہ گئی تھی، نہ کھانے کو چاول، نہ ستو، نہ آٹا، نہ دالیں، نہ ترکاریاں، ہر ایک کا حال تباہ تھا۔ دن تو کسی طرح کاٹ بھی دیا جاتا تھا لیکن راتیں حد سے زیادہ ڈراؤنی بن گئی تھیں۔ مٹی کا تیل کب کا ختم ہو چکا تھا، لالٹین جلائی نہ جا سکتی تھی۔ سرسوں اور تلکوئیوں سے جلنے والے دیئے بھی بجھے پڑے تھے۔ سانپ، بچھو، کنکھجورے ہر طرف رینگتے پھرتے تھے، اندھیرے میں انہی کا راج تھا۔ ایسے میں سکھدیو شہر فریاد لے کر گیا تھا۔ لے دے کے یہی آسرا تھا کہ ضلع کے حاکم جلد سے جلد مدد بھیجیں گے۔ ٹرک پر لاد کر سارا سامان جلد سے جلد پہنچائیں گے۔ مگر اب تو پل ٹوٹ گیا تھا۔ اب گاڑیاں کیسے آئیں گی، امداد کیسے پہنچے گی۔ اب تو گاؤں کی تباہی یقینی ہو گئی تھی۔ اب تو گویا بربادی پر مہر لگ گئی تھی اور دادا ہیں کہ ہنس رہے ہیں، خوشی سے ناچ رہے ہیں، جیسے گاؤں کی تباہی اور بربادی ان کی دلی مراد تھی جو بر آئی ہے۔

رامو اٹک اٹک کر کہنے لگا، ”کیا کرتے ہو دادا؟ کیا کرتے ہو؟ گاؤں میں کہیں سوکھی لکڑی نہیں، مٹھی بھر کسی کے یہاں آٹا، چاول نہیں لالٹین جلانے کے لئے تولہ بھر تیل نہیں، شہر سے یہ سب سامان لانے سکھو گیا تھا، پر اب تو پل ہی ٹوٹ گیا ......“

اور دادا نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ رامو نے صحن میں پھاند کر انہیں پکڑنے کی کوشش کی۔ اسے غصہ آنے لگا تھا، وہ چیخا

”چپ رہو دادا! تمہیں ہنستے شرم نہیں آتی۔ ہم سب کی تو یہ حالت ہے اور کل گاؤں میں برات آ رہی ہے۔“

دادا نے رک کر پوچھا ”کیسی برات؟ کس کی برات؟“

”لجیا کی“ رامو بولا۔

”لجیا کون؟“ دادا نے پوچھا۔

رامو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا، ”ارے وہی جگن کی بیٹیا۔ آج صبح جگن بہو مرتے مرتے بچی، اس کا پورا مکان بیٹھ گیا۔ وہ دونوں“

ہمارے گھر تک ہیں۔"

امرداوا کے مسی رنگت گال ہوا سے چراغ کی لو کو گھیرا بنا کر بچانے والی ہتھیلیوں کی طرح لال ہو گئے اور ان کے منہ سے چھوٹتے ہوئے انار جیسی آواز نکلنے لگی۔ "قہہ، قہہ، قہہ! قہہ قہہ قہہ! اور وہ پھر کیچڑ اور پانی میں ناچنے، تھرکنے اور "یہ تیری لیلا ہے بھگوان! تیری مہیما ہے بھگوان!" کی رٹ لگانے لگے۔ ان کی یہ آتشبازی اسی طرح چھوٹ رہی تھی کہ دفعتاً کالے بادلوں نے بھی اپنی مہتابی داغی اور ایک تڑاخے کے ساتھ املی پر اس زور کی بجلی گری کہ رامو اور دادا منہ کے بل گرتے گرتے بچے، مگر املی کی ایک بڑی سوکھی ہوئی شاخ چرچرا کر زمین پر آ رہی اور دادا "جلنے میری املی" کہہ کر ادھر لپکے۔ مگر رامو نے جھپٹ کر انہیں پکڑ لیا۔ وہ "چھوڑ دو، چھوڑ دو! ارے میری املی جلی جاتی ہے۔" کہہ کر برابر دہاڑتے رہے مگر اس نے نہ چھوڑا۔ املی میں یقیناً آگ لگ جاتی مگر تیز گرتے ہوئے پانی نے اسے بڑھنے نہ دیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں چھن چھن کر کے بجھ گئی۔ امرداوا کا ابال بھی بیٹھ گیا۔ رامو نے ہاتھ ڈھیلے کرتے ہوئے کہا: "سچ کہتے ہو دادا! بھگوان کی لیلا۔ اس نے بدھوا کی ٹپری کے بیاد کے لئے سوکھی لکڑی کھد (خود)، توڑ کر بھیج دی!"

امرداوا نے پھنکاری ماری "میں لکڑی وکڑی نہیں دوں گا اس پاکھنڈی کی ٹپری کے لئے۔" رامو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گاؤں کے کئی گھروں سے لوگ "کیا ہوا، کیا ہوا دادا؟" چیختے ہوئے نکل پڑے۔ بجلی کی چمک، تڑاخے کی آواز اور دادا کی چیخ سے سب کو یقین آ گیا تھا کہ دادا ہی پہ بجلی گری۔ جو لوگ اس طرح دوڑ کر ان کی خیر سلا لینے آئے تھے انہی میں جگن بہو بھی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی دادا پر گویا ایک اور بجلی گری، وہ سارے جسم سے زخمی کبوتر کی طرح کانپے اور انہوں نے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ ویسے ہی پل کی طرف سے "رامو بھیا! رامو بھیا" سکھدیو کے پکارنے کی آواز سنائی دی ۔۔۔ اور رامو "کیا ہے سکھدیو؟ کیا ہے! آتے ہیں! آتے ہیں!" چیختا ادھر لپکا۔

چند ہی منٹ میں وہ سکھدیو کے ساتھ پلٹا۔ اکیس برس کا سکھدیو اس وقت صرف ایک جانگھیا پہنے تھا اور ایک ہاتھ میں کلھاڑی لئے وہ یوں کانپ رہا تھا جیسے وہ بہت دور سے دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے دادا سے جلدی جلدی کہنا شروع کیا: "دادا! دادا! دو بلی بلیاں چاہئیں دادا، دو بلیاں! شہر سے ٹرک پر لدا سب سامان اس پار کھڑا ہے۔ پل جیادہ (زیادہ) نہیں ٹوٹا ہے۔ بس دو بلی مل جائے سب کام بن جائے۔ آدمی بھی آئے ہیں، لوہا، سیمنٹ، اوجار (اوزار) بھی۔ بس دو بلی کا انتجام (انتظام) کر دو دادا! دو بلی کا۔"

امرداوا نے زچ ہو کر کہا: "تو ہم کیا کریں بھیا؟ بلی کہاں سے آوے؟"

رامو جان پر کھیل گیا۔ اس نے تاڑ جیسے لمبے آم کے پیڑ کی طرف انگلی اٹھا دی۔

امرداوا بپھر گئے: "کیا کہا؟ کیا کہا؟ تمہارا مطلب ہے ہم اپنے بھوشن کا پیڑ کاٹ دیں۔ بھوشن کا آم! یہ کبھی نہ ہو گا۔ کبھی نہیں! کبھی نہیں!" اور لپک کر اس کے تنے کو انہوں نے اپنے جسم سے اس طرح چھپا لینے کی کوشش کی جس طرح مرغی اپنے چوزوں کو کسی آفت سے بچانے کے لئے اپنے پروں سے ڈھک لیتی ہے۔

کئی فریادی آوازیں ایک ساتھ کئی گلوں سے نکلیں۔

سکھدیو چیخا: "مگر دادا پل!"

رامو نے فریاد کی: "اور گاؤں؟"

اور جگن بہو سسکی: "یہ بھیا کی برات؟"

امر دادا کو نہ اس وقت کچھ دکھائی دیتا تھا، نہ سنائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، البتہ ان میں گزرے ہوئے تئیس برسوں کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔ وہ بھوشن کی پیدائش کا دن، وہ ان کا خوش خوش اپنے ہاتھوں سے مولے کا لگانا، وہ بھوشن کا اسکول، کالج سے پلٹ پلٹ کر گھر آنا اور وہ اسی پل کے توڑنے کے لئے گولی کھا کر جگن بہو کے گھر میں خون میں نہایا ہوا پڑا ہونا اور وہ ان کا اپنے لعل کو گود میں اٹھا کر اپنے مکان کی طرف چلنا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے، اٹھائے نہ اٹھتے تھے اور انہیں دفعتہً محسوس ہوا جیسے اس وقت بھی زمین اسی طرح ان کے پاؤں تھامے ہے اور انہوں نے کچھ تعجب سے نیچے کی طرف دیکھا۔ جگن بہو ان کی ٹانگوں میں باہیں ڈالے ان کے قدموں پر سر جھکائے تھی۔ وہ جسم بھر سے کانپنے لگے۔ ان کا ایک ہاتھ خود بخود اس کی اُجڑی ہوئی مانگ کی طرف بڑھ گیا۔ انہوں نے بہو کے سر کو تھپتھپایا، اس کی باہوں کو اپنی ٹانگوں سے نرمی سے الگ کیا اور سکھدیو کی طرف بڑھ کر بولے:

"اچھا! اچھا! لاؤ کلہاڑا۔" اور وہ خود ہی آم کے تنے کو کاٹنے لگے۔ ان کے تیز چلتے ہوئے ہاتھوں کی مضبوط گرفت، ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اور ان کے چہرے پر دوڑتا ہوا رنگ صاف صاف بتلاتے تھے کہ دونوں ٹوٹے ٹکڑوں کی مرمت اب ایک یقینی بات ہے۔

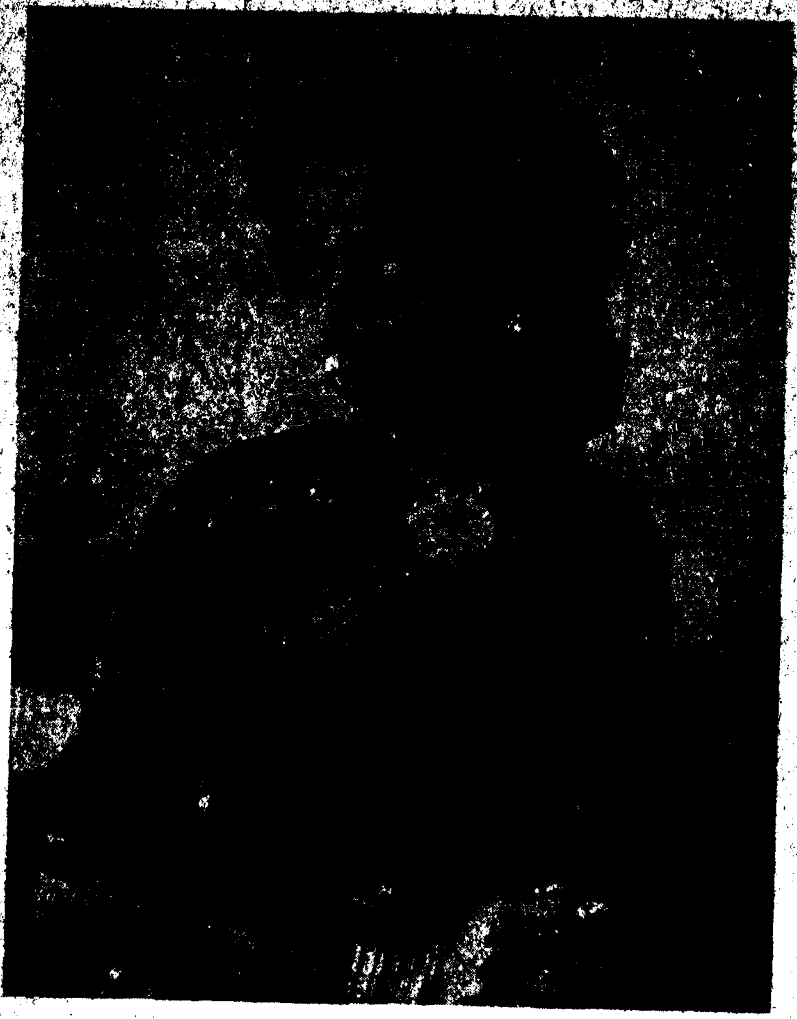

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر

رپورتاژ

ستمبر کا چاند

قرۃ العین حیدر

اور کُونگ نے کہا
مجھے اب تک وہ زمانہ یاد ہے
جب مورخوں نے ان باتوں کے لیے
تاریخ کے صفحات خالی چھوڑ دیے تھے
جنہیں وہ نہ جانتے تھے
خوبانی کے شگوفے ہواؤں کے ساتھ
مشرق سے مغرب کی طرف اُڑ رہے تھے
اور میں ان کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں

ایذرا پاؤنڈ (تیرھواں کینٹو)

"میں نے ایک روز ایک لڑکی کو دیکھا
جو ایک چٹان پر اگی ہوئی گھاس پر جھکی رو رہی تھی
خزاں کی ایک خاموش شام
وہ گھاس تنہائی میں چپکے سے مرجھا گئی"[1]

میں نے کتاب گھاس پر رکھ دی۔

"آنا دنیا کے یہ مصنفین —— " فرانسیسی ادیب نے کہنا شروع کیا۔

"ہم نے طے کیا تھا کہ کم از کم آج کی شام سیاست کی باتیں نہیں کریں گے۔ دیکھو یہ ادیبوں کا اجتماع ہے اور پولیٹیکل پلیٹ فارم بنتا جا رہا ہے۔" میں نے اکتا کر جواب دیا۔

"پولیٹیکل —— کل ہی تو میں نے بہت دیر تک جن تکامی سے جاپانی ناول میں وجودیت کی تحریک کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔" پھر دفعتاً وہ رک گیا۔ سامنے سے چیکوسلواکیہ والا ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ مصور بھی تھا اور ہر سمے خاموشی سے اسکیچ بنایا کرتا۔

"اچھا تو پھر اس شرمے کو بلاؤ۔ بیٹھ کر اس سے وجودیت پر گفتگو کریں۔" میں نے بشاشت سے کہا۔

ژاں خاموش رہا۔

میں اخبارات الٹنے پلٹنے لگی جن کے اوراق پر کانگریس کی خبریں، تصویریں، اداریے اور تعارفی نوٹ چھپے تھے۔ "آج کل یہاں کے اخباروں کو اور کوئی کام نہیں سوا اس کے ——" میں نے موضوع تبدیل کیا۔ "واقعی یہ سب اس قدر ناقابلِ یقین ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ اس قدر دھوم دھام سے ہماری خاطریں کریں گے۔ گویا اپنا کوئی قومی تہوار منا رہے ہوں۔ ہمارے شکست خوردہ قومیں کہیں ایسی ہوتی ہیں ——" ژاں نے کہا۔

قریب کی ایک لاؤنج میں سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شیشوں کے طویل برآمدے کے سامنے فوارے چل رہے تھے۔ دو امریکن مصنف بید مجنوں کے راستے پر سے گذر گئے۔

"اسٹین بک بے چارے اب تک زکام میں مبتلا اپنے کمرے میں بند پڑے ہیں۔" ژاں نے اظہارِ خیال کیا۔

"زکام وکام کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ نکلنا نہیں چاہتے، ورنہ یہ جاپانی مارے عقیدت کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ تم کو کچھ اندازہ ہوا انگریزی زبان کے ادیبوں کی مقبولیت کا یہاں کیا عالم ہے ——؟"

"واقعی ہر پڑھے لکھے جاپانی نے سارا مغربی ادب گھول کر پی رکھا ہے۔ تین تین یوروپین زبانیں جانتا ہے مگر انکسار کا یہ عالم کہ بس بچھے جا رہے ہیں۔"

عین اسی لمحے ایک جدید جاپانی ناول نگار آن موجود ہوئے۔ وہ سامنے کھڑے جھک جھک کر کہہ رہے تھے: "اگر آپ کو زحمت نہ ہو خاتون! تو اندر چلئے لاؤنج میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد میرے نہایت ادنیٰ جھونپڑے میں قدم رنجہ فرما کر چائے ——"

"رائٹی جب باہر جاتی ہے تو اس کی اسی طرح خاطریں ہوتی ہوں گی۔" ژاں بولا۔ ہم نے جلدی سے پروگرام کی کتاب پر پھر نظر ڈالی۔

---

[1] ماڈکاٹو کی ایک نظم

آج کتنی پارٹیاں ہیں کتنی دعوتیں، کونسا تھیٹر دیکھنا ہم پسند کریں گے۔

"خداوندا میں تو دیوانہ ہو جاؤں گا۔" ژاں نے کندھے اچکا کر خوش دلی سے کہا۔

میں نے کتاب گھاس پر سے اٹھالی۔ ارادہ یہ تھا کہ اگر چند منٹ کی مہلت ملے تو کسی کونے میں بیٹھ کر پڑھوں گی مگر یہ جاپان ہے جہاں ادیبوں کی بین الاقوامی کانگریس کا انتیسواں سالانہ اجلاس ہونے والا ہے اور ہر جاپانی کا فرض ہے کہ وہ خاطروں کے مارے مہمانوں کی جان نکال لے۔ صبح جان اسٹین بک سے جب تشکریے کے کوئی الفاظ نہ بن پڑے تو انہوں نے عاجز آ کر کہا کہ تہذیب کا سب سے خوبصورت طریقہ یہ ہے کہ اتنی تواضع کرو کہ مہمان ادھ مؤا ہو کر رہ جائے۔

امپیریل ہوٹل کی شترخ قالینوں والی فرلانگوں لمبی گیلریوں میں رپ رپ کرتی خادمائیں سفید فراکوں میں ملبوس سائے کی طرح گذر رہی ہیں، کسی ایک گیلری میں سے مادام صوفیہ واڈیا مدراسی ساری پہنے بالوں میں پھول لگائے باہر نکلتی ہیں اور کیمرہ مین ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں — گرل روم میں بیٹھے ہوئے ایلمر رائس یا آندرے شانزوں کوئی دلچسپ سا جملہ کہتے ہیں اور وہ شام کے سارے اخباروں میں چھپ جاتا ہے۔ کانگریس کے سکرٹریٹ میں رات رات بھر کام ہو رہا ہے۔ خداوندا! یہ تم نے ایک کانگریس اپنے ملک میں بلائی ہے یا اپنے شہنشاہ کی تاجپوشی منعقد کر رہے ہو۔ یہ جوش و خروش تو ہم نے ملکہ الزبتھ کے کارونیشن کے وقت انگلستان میں نہیں دیکھا تھا مگر جاپانی جو کام کریں گے اس میں تن من دھن سے لگ جائیں گے، جان دے کر اسے مکمل ترین بنا ڈالیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے شہنشاہ کو دیوتا سمجھ کر اس کی خاطر جنگ میں نہ کود پڑتے۔ خودکشی کے اسکواڈرن نہ بناتے اور پھر اپنی شکست کے بعد اسی ملک کی تعمیرِ نو چند سال میں ایسی نہ کرتے کہ آج وہ مغربی جرمنی کی طرح "فری ورلڈ" میں دوبارہ سب سے آگے نکل گیا ہے۔

یہ آدمیوں کی نہیں جناتوں کی قوم ہے۔

ہر ان دیکھے ملک کے متعلق ایک بے تکا سا تصور ذہن میں موجود ہوتا ہے (ہندوستان متعدد مغربیوں کے لئے آج بھی فقیروں، راجاؤں، ہیروں اور ہیرے جواہرات کا دیس ہے) اسی طرح جاپان کے متعلق بچپن میں مندرجہ ذیل تصورات تھے: ہیرا کیری، گیشا گرلز، چیری کے شگوفے، فیوجی یاما، کیمونو، سستا مال، یعنی یہ کہ علی گڑھ اور پنجاب کے میٹرک کو ہائی اسکول کے زمانے میں ہم لوگ جاپانی میٹرک کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر سستی چیز جاپانی کہلاتی تھی۔ پرل ہاربر کے بعد معلوم ہوا کہ یہ درختوں اور پھولوں کی عاشق قوم فاشسٹ درندوں میں تبدیل ہو گئی ہے جس کا قلع قمع کرنا برطانوی ہند کے ہر سپاہی کا فرض تھا۔ لاکھوں سپاہی ان پیلے وحشیوں سے لڑتے مشرقِ بعید اور برما کے محاذوں پر امر ہوئے۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ یہ لوگ تو دراصل ایشیائی حریت کے علمبردار ہیں اور ایشیا کو مغربی شہنشاہیت سے نجات دلانے کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ آئی۔ این۔ اے کے سورما سبھاش بوس کی قیادت میں ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ان ایشیائی جانبازوں سے جا ملے۔ نتیجہ بہرحال یہ رہا کہ سارا مشرقِ بعید [illegible] شرقِ ایشیائی [illegible] جنگ [illegible] میں ڈوب گیا۔

پھر ہیروشیما نے دفعتاً ہوا کا رخ بدل دیا۔ ساری مہذب دنیا کی ہمدردی جاپان کو حاصل ہو گئی۔ ہیروشیما ایک عظیم لرزہ خیز سمبل قرار پایا۔ امریکہ کا قبضہ ہوا۔ میک آرتھر آیا، جاپانی معاشرے کی کایا پلٹی۔ وہ فیوڈل جنگ پرست رومینٹک سماج خواب و خیال بنا۔ شہنشاہ نے سوٹ پہنا اور وہ سورج دیوی کی اولاد کے درجے سے اتر کر انسان بنا۔ جی آئی سپاہیوں نے جاپانی لڑکیوں سے شادیاں رچائیں۔ مارشل ایڈ آئی۔ جاپان امریکہ کا اتحادی بنا اور اس وقت وہ پھر ایک زبردست تجارتی اور صنعتی طاقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ دس سال کے ہیر پھیر میں کیا سے کیا ہو گیا دہشت سے

ملکوں میں دس سال کے ہیر پھیر میں کچھ بھی نہیں ہوتا)

صرف تیس دن قبل میں یہاں پہنچی تھی۔ اس سمے بحر الکاہل کی شمالی وسعتوں پر ہلکے پھلکے بادل تیر رہے تھے۔ افق کے قریب سمندر میں سے نکلے ہوئے پہاڑی سلسلے پر دھند جمع ہو رہی تھی۔ نیچے حد نظر تک سبز جزیرے تھے اور پائن کے درخت اور گاؤں اور ان پر تیرتے ہوئے بادلوں کو ہوائی جہاز کی کھڑکی میں سے دیکھ کر مجھے دفعتاً معلوم ہوا کہ جاپانی تصاویر کے ہلکے خطوط اور بے لطیف اور مدھم رنگوں کے کیا معنی ہیں۔

ہوائی جہاز سمندر پر اترتا دفعتاً رن وے پر آگیا جو پانی سے ملی ہوئی تھی۔ فوٹوگرافروں اور مووی کیمرہ مین کی ایک فوج کی فوج اپنے اپنے فلیش گن سنبھالے ہوائی جہاز کی طرف لپکی۔ میرے ساتھ مشہور امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس بھی ہانگ کانگ سے سوار ہوئے تھے جو جاپان میں بے حد مقبول ہیں۔ مختلف اوقات پر مختلف طیاروں سے اور دوسرے ملکوں کے ڈیلیگیشن ایرپورٹ پر اتر رہے تھے اور بڑی زبردست چہل پہل تھی۔ ٹوکیو کا عظیم الشان ایرپورٹ امریکنوں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر امریکن فوجی گاڑیوں اور طیاروں کی قطاریں کھڑی تھیں —— بے چارے جاپانی —— میں نے دل میں کہا۔

باہر آکر ہم ٹوکیو کی طرف روانہ ہوئے۔ "چند سال قبل یہ سارا شہر راکھ اور ملبے کا ڈھیر تھا۔ دو تہائی ٹوکیو امریکن بمباروں نے تباہ کر دیا تھا۔ اس وقت یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔" جاپانی منتظم نے کار کی اگلی سیٹ پر سے مڑ کر مجھے مخاطب کیا۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شام کا اندھیرا گہرا آ رہا تھا اور دور سے ٹوکیو کی اسکائی لائن جگمگا اٹھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی جگہ کا اولیں امپریشن سب سے حقیقی اور دیرپا ہوتا ہے۔ سڑکوں پر موٹروں اور بسوں کی ریل پیل تھی۔ مغربی لباس پہنے عورتیں اور مرد نہایت سکون سے ٹرام کاروں کے انتظار میں قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ ہڑبونگ نہیں تھا۔ خوانچے والے آوازیں نہیں لگا رہے تھے، لاؤڈ اسپیکر سے فلمی گانے نشر نہیں ہو رہے تھے۔ کوڑے کے ڈھیر نہیں تھے —— مگر —— پھر میں نے سوچا —— ویسٹ اینڈ تو دنیا کے ہر بڑے شہر کا مرعوب کن ہوتا ہے۔ یہاں سلمز بھی تو ہوں گے، فقیر، بھیک مانگتی عورتیں، ننگے پیر پھرنے والے آوارہ گرد بچے۔ میں ان سب کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ موٹر انتہائی شاندار عمارتوں کے سامنے سے بے حد چوڑی سڑکوں پر سے گزرتی ایک پگوڈا کی وضع کی عمارت کی برساتی میں داخل ہوئی جس کے سامنے تالاب میں بے شمار کنول کھلے تھے۔

"یہ امپیریل ہے۔ یہاں کا سب سے پرانا اور مشہور ہوٹل اور دنیا کی گراں ترین قیام گاہوں میں سے ایک۔ اسے مشہور امریکن معمار فرینک لائیڈ رائٹ نے بنایا تھا۔ یہ زلزلوں اور بمباری سے بچا رہا ہے۔ کلیرجز اور والڈراف آسٹوریا کی مانند اس کا ماحول ہے۔" اس وقت صدہا امریکن سیاح ہر طرف نظر آرہے ہیں۔ دنیا بھر کی کانگریس کے مندوبین آ آ کر اتر رہے ہیں۔

"ارے وہ البرٹو مراویا آئے۔"

"یہ اپنا بیگ سنبھالے جارج مکیش اترے۔"

"ارے ڈوس پیسوس بھی ہیں۔"

"اور یہ ڈاکٹر سری نواس آئنگر بھی آن پہنچے۔"

"اور رادھا کرشنن نہیں آئے؟"

"نہیں۔ بلایا تو مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی گیا تھا مگر حکومت کی مصروفیات کی وجہ سے دونوں صاحبان نہیں آسکے۔"

"ہاں! ہاں! اور وہ کون ہیں؟"

"ارے یہی تو جان اشٹین بک ہیں!"

"ارے وہ ساریاں ——— ساریاں تو دیکھو — انڈین اور پاکستانی خواتین ———"

"کس قدر خوبصورت لباس ہے ان لوگوں کا۔"

"کیا کہنے ہیں۔"

یہ بڑا زبردست اجتماع ہے۔ اٹھائیس ممالک سے دو سو کے قریب مصنفین نے دنیا کے چاروں کھونٹ سے شرکت کی ہے۔ نیوزی لینڈ اور [illegible] سے لے کر آسٹریلیا اور لبنان تک سبھی موجود ہیں۔ مشرقی یورپ سے بلغاریہ، چیکوسلوواکیہ، پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے کمیونسٹ ادباء آئے ہیں۔ مگر عوامی جمہوریہ چین یہاں موجود نہیں کیونکہ آج جاپان اس ملک کے وجود ہی سے منکر ہے جس سے اس نے اپنی تہذیب مستعار لی۔ یہ بعد از جنگ دنیا کی سیاست کا سب سے مضحکہ خیز پہلو ہے۔ جنوبی افریقہ کے سفید فام ادیبوں کی عدم موجودگی بھی بہت دلچسپ ہے۔ وہ بھلا ایک مشرقی ملک میں تشریف لا کر پیلے ٹھگنوں سے برابری سے کس طرح مل سکتے تھے۔

"سیاست تم ایشیائیوں کے اعصاب پر کیوں سوار رہتی ہے؟" مصنوعی چٹان پر بیٹھے بیٹھے ژاں نے چڑ کر مجھ سے کہا۔

"یہ سوال تو آپ اسٹیفن اسپنڈر سے کیجیے۔ آخر وہ شاعری پر اکتفا کیوں نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ مشہور ہوئے۔ سیاست تو میرے اعصاب پر اس لیے سوار ہے کہ اس کی وجہ سے ہم نے بڑے بھیانک دکھ اٹھائے ہیں اور اس وقت بھی اٹھا رہے ہیں۔"

"اب پھر تم نے وہی باتیں شروع کیں۔"

"اچھا تو زین فلسفہ پڑھیں۔ یہ جاپان ہے اور پائن کے درختوں پر خزاں کے بادل چھائے ہیں وغیرہ ———"

"ہاں یہ ٹھیک ہے ———"

"زین کا مطلب تمہیں معلوم بھی ہے؟" میں نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"زین سنسکرت کے لفظ 'دھیان' کی جاپانی شکل ہے اور چین سے یہ فلسفہ یہاں آیا — اب آگے پڑھو۔"

اس نے دوبارہ کتاب کھولی:

"بیل تو کبھی نہ گما تھا۔ پھر اسے ڈھونڈنے سے کیا فائدہ۔ چرواہا خود اپنے کو کھوئے بیٹھا ہے۔ جنگل کی تنہائی میں چرواہا اپنے بیل ڈھونڈ رہا ہے۔ چاروں اور پانی کے جھرنے ہیں اور پہاڑیاں اور پگڈنڈیاں۔ تھکا ہارا وہ نہیں جانتا کدھر جائے۔ اسے تو صرف میپل کے جنگلوں میں ٹڈوں کے گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

سامنے سے مسٹر اسپنڈر گزرے۔ وہ خاموشی سے باغ عبور کر کے اپنے کمرے کی اور جا رہے تھے۔

میں نے پھر کتاب اٹھائی:

ستراؤں کی مدد سے اسے بیل کے نقش پا تو مل گئے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ گو برتنوں کی شکلیں مختلف ہیں مگر سونا ایک ہی ہے اور خارجی دنیا دراصل پرم آتما کا مظہر ہے۔ لیکن ابھی تک وہ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر پایا۔ ندی کے کنارے درختوں کے نیچے بیل کے قدموں کے نشان بکھرے ہوئے ہیں مگر خوشبودار گھاس اتنی گھنی ہے کہ چرواہا اس میں اپنا راستہ تلاش نہیں کر پایا ———

جھیل کے کنارے ٹہلتے ہوئے چند فرانسیسیوں نے نیچی آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔ ایک جاپانی عاشق نواز درختوں کے جھنڈ میں بیٹھا بجا رہا تھا۔

فرانس نے سب سے بڑا وفد بھیجا ہے جس میں پچاس سے زیادہ خواتین اور حضرات شامل ہیں۔ فرانسیسی مقبوضہ الجزائر سے ایک مسلمان خاتون مادموزیل جمیلہ دیبیش بھی تشریف لائی ہیں مگر وہ غالباً خود کو مسلمان یا عرب کہلوانا پسند نہیں کرتیں لہٰذا میں عرصے تک انہیں فرنگن ہی سمجھا کی۔ اکادمی فرانسس کے رکن موسیو آندرے شامزوں جو تنظیم کے بین الاقوامی پریذیڈنٹ ہیں یہاں بھی صدارت کریں گے۔ مصر سے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد عوض تشریف لائے ہیں جو اسکندریہ یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں۔ انگلستان سے اسٹیون اسپنڈر، اینگس ولسن، ایلکس واہ اور مشہور ہنگرین نژاد مزاح نگار جارج مکیش کے علاوہ دس بارہ اور ملیکنگ بھی ہیں۔ ان میں سے ایک جے۔ اے۔ ایل کریمر بنگ کیمبرج کا تاریخ اور چینی ادب کا اسکالر ہے اور **Wisdom of the East** کے سلسلے کی کتابوں کا اڈیٹر اور پبلشر بھی۔ اسجل ہانگ کانگ یونیورسٹی میں مشرق بعید کی تاریخ کا استاد ہے۔ یہ اور امریکہ کا ڈونلڈ کین کیمبرج میں ہم جماعت تھے۔ ڈونلڈ کین جاپانی کا مشہور مترجم اور اسکالر ہے اور کولمبیا یونیورسٹی میں جاپانی پڑھاتا ہے۔

مشرقی جرمنی کے ناول نگار بوڈو اوزے سبط بھائی کے دوست ہیں۔ پچھلے دنوں سبط بھائی جب مشرقی جرمنی گئے تھے تو انہی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ ان کی پہلی امریکی بیوی موجودہ مسز ایم۔ این۔ رائے ہیں۔ دوسری بیوی بھی امریکن ہیں۔ یہ پچھلے سال ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں دلّی گئے تھے۔

مغربی جرمنی کے نمائندوں میں ایک بہت بوڑھے پچھوس انڈولوجسٹ اور مستشرق ڈاکٹر ہیلمتھ فان گلیسنیپ شامل ہیں۔ یہ مغربی جرمنی کی ٹیوبنگین یونیورسٹی میں انڈولوجی اور فلسفہ مذہب کے استاد ہیں۔ "کانٹ اور مشرق کے مذاہب" اور "غیر مسیحی مذاہب" ان کی تازہ ترین تصانیف ہیں۔ یہ علامہ اقبال کے دوست تھے۔

ہندوستان سے ڈاکٹر سری نواس آئنگر آئے ہیں جو آج کل آندھرا یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہیں۔ ترچناپلی کے تامل ادیب اور فلسفی بہت بوڑھے ایم۔ آر جمبوناتھن جن کے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور جو پہلی بار اپنے وطن سے دور اتنے طویل سفر پر آئے ہیں۔ مرہٹی ادیب ونائیک کرشنا گوکاک جو عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور آج کل کرناٹک کالج دھرواڑ کے پرنسپل ہیں اور انگریزی تنقید کی دو کتابوں کے مصنف ہیں۔ احمد آباد کے اسکول آف گجراتی لنگویج اینڈ لٹریچر کے ڈائریکٹر اوما شنکر جوشی، بنگال کے مشرا رائے، مرہٹی ادیب پربھاکر پدھیے، بمبئی کی فرانسیسی نژاد مادام صوفیہ وادیا جو پیرس میں پیدا ہوئیں۔ نیویارک، لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں انہوں نے سنسکرت پالی اور قدیم فارسی کی تعلیم حاصل کی اور پچھلے تیس سال سے بہت شدید قسم کی ہندوستانی ہیں اور بے انتہا خوبصورت۔ ان کے علاوہ شریمتی کملا ڈونگر کیری ہیں جو کوکنی اور انگریزی کی مصنفہ ہیں۔ ان کے میاں بمبئی یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں اور یہ خود انڈین وبنسز یونیورسٹی کی فیلو ہیں۔ الہ آباد کے شری واتسائن ہندی کے مشہور ادیب جن کو ہندوستان کی نیشنل اکیڈمی آف لیٹرز کی رکنیت کا اعزاز حاصل ہے اور جو آج کل انگریزی کے ادبی رسالے واک کے اڈیٹر ہیں۔

انڈونیشیا سے علی سجان سلطان تقدیر تشریف لائے ہیں۔ جدید انڈونیشی ادب کے پیش رو، فلسفی اور جکارتا کی قومی یونیورسٹی کے نائب صدر ہیں۔ ان کے ایک ناول کا نام "بتارن میگھ" ہے ـــ یعنی "بکھرے ہوئے بادل" ـــ ایک ٹرچ انڈونیشین ناولسٹ بھی آئی ہیں جو خود کو خالص انڈونیشین کہلانا پسند کرتی ہیں اور بڑی زبردست قوم پرست۔

جنوبی کوریا سے خواتین و حضرات کی ایک کھیپ کی کھیپ آئی ہے جن کو سیاسی پروپیگنڈا ہی سے فرصت نہیں۔ ان سب کو خاصا کومک سمجھا جاتا ہے۔

امریکہ نے اسٹین بک، ڈوس پیسس، ایلمر رائس، جان ہرسی، ایلزبتھ وائننگ (جو چند سال پہلے جاپانی شہزادوں کی اتالیق بھی تھیں) اور ڈونلڈ کین

کے علاوہ اور بھی بہت سے بڑے لیکھک بیٹھے ہیں۔ یونیسکو کی نمائندگی فرانس کا روجر کیلوا کر رہا ہے جو تنقید کی بہت سی کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ پابلو نیرودا کے مترجم کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ برازیل کا شاعر فاوستینو ناسیمنتو ہسپانیہ کی ادبیات کا پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ قانون دان بھی ہے اور برازیل کے سپریم کورٹ کا جج ہے۔ اسرائیل کا ادیب مصر والے سے نہیں بولتا۔ قوم پرست چینی کمیونسٹ ادیبوں سے کتراتے ہیں۔

ایک گروہ اور ہے۔ یہ لوگ "جلاوطن ادیب" کہلاتے ہیں۔ یہ مشرقی یورپ کے لوگ ہیں جو زیادہ تر لندن، پیرس اور نیویارک میں رہتے ہیں۔ پولش جلاوطن الگزنڈر جنتا جس کی ایک کتاب "مقدس کے طور" ۱۹۳۳ء میں مہاتما گاندھی کے لکھے ہوئے دیباچے کے ساتھ چھپی تھی۔ اس گروپ میں ہنگرین جلاوطن پال تبوری سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی بیوی مادام تبوری جو کیٹ بارلے کے نام سے لکھتی ہیں کسی زمانے میں پری رہی ہوں گی۔ چالیس کے پیٹے میں ہیں مگر اب بھی بے حد خوبصورت نظر آتی ہیں۔ یہ بھی ہنگرین نژاد ہیں۔

فرانسیسی بہت زندہ دل ہیں، انگریز بے حد خاموش۔ اسٹین بک اپنی کتابوں کی مانند نکلے۔ چہرے پر ایسا ایکسپریشن رہتا ہے جیسے بے حد محظوظ ہو رہے ہوں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مجھے لکھنے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ گھر کے سودا سلف کا حساب بھی بیوی کو نہیں لکھنے دیتا، خود ہی لکھتا ہوں۔ بلغاریہ کا ادیب معلوم ہوتا ہے کسی سنٹرل یوروپین جاسوسی فلم میں ایکٹنگ کر کے چلا آ رہا ہے۔ برازیل والا بھی جیسے مین شین ایکٹر معلوم ہوتا ہے۔ یوروپین اور جنوبی امریکن حسب عادت سخت شور کر رہے ہیں۔ اینگلو سیکسن ادیب اینگلو سیکسن ہیں۔

ایک عظیم الشان دس منزلہ عمارت میں جو ایرکنڈیشنڈ، ساؤنڈ پروف اور الٹرا موڈرن طرز تعمیر کا بہترین اعلیٰ نمونہ ہے (اور اس طرح کی عمارات بدرنگ ڈبکوں جیسی سینکڑوں کی تعداد میں تعمیر کر دی گئی ہیں) کانگریس کی انٹرنیشنل ایگزیکٹو کونسل کا پہلا اجلاس ہو رہا ہے۔ پانچویں منزل پر ایک ہال میں جہاں نشستوں کی ترتیب یو۔ این۔ او کے مانند بنائی گئی ہے، چھت میں چھپی ہوئی روشنیاں ستاروں کی طرح جھلملا رہی ہیں۔ چاروں اور ٹیلی ویژن کیمرے نصب ہیں۔ ایک دیوار پر کھڑکی کی لمبی چوڑی ساؤنڈ پروف بالکنی میں مترجم لڑکے اور لڑکیاں ہیڈ فون لگائے مائیکروفون کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ساری کارروائی کا بیک وقت انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور جاپانی میں فوری ترجمہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت کونسل کے سامنے ہنگرین ادیبوں کا مسئلہ ہے۔ بند کمرے کا اجلاس ہے۔ لوگوں پر سخت سنسنی طاری ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہنگری میں پچھلے دنوں لکھنے والوں پر جو ظلم توڑے گئے ہیں ان کی تحقیقات کون کرے اور کس طرح۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کون جائے۔ اور سوال یہ ہے کہ بلی کون ہے۔

چنانچہ زبردست کھچاؤ کی فضا پیدا ہو گئی۔ مشرقی یوروپ کے نمائندے جو انگریزی نہیں سمجھتے اپنے اپنے ہیڈ فون لگا کر کان سے فرانسیسی ترجمہ سننے میں مصروف ہو گئے ——

موسیو پال تبوری نے جوش و خروش سے بولنا شروع کیا۔ (یہ پچھلے بیس سال سے لندن میں رہتے ہیں) پھر دوسرے ہنگرین پال اگنوٹس نے کہا: میرے وطن کے بہت سے ادیب پاگل ہو گئے ہیں۔ جیلوں میں بند ہیں۔ ان کو تھرڈ ڈگری کیا گیا ——

کمیونسٹ ڈیلیگیٹ خاموشی سے بیٹھے سگرٹ پی رہے ہیں۔ پال تبوری کی تقریر کے بعد بڑے زور شور کی تالیاں بجیں۔ کمیونسٹ سگرٹ پیتے رہے۔ ہندوستانی اور مصری نمائندوں نے بھی کسی داد و تحسین کا اظہار نہیں کیا۔ ہندوستان نے حسب معمول مصالحت کی پیشکش کی۔ ہنگری کے مسئلے پر ووٹ لینے کے سلسلے میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔

تب صدر آندرے شانزوں نے ایک نہایت شاعرانہ تقریر کی۔

چونکہ یہ یو-این نہیں اور پیشہ ور سیاستدانوں کے بجائے ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ہے لہٰذا اس خالص سیاسی مباحثے میں بھی فصاحت و بلاغت تشبیہوں اور استعاروں کے ہر طرف سے دریا بہائے جا رہے ہیں۔

آندرے شاتروں نے کندھے اچکا کر بڑی بیکسی سے کہا: "میں اس وقت تنہا ہوں ——— میرے سامنے بڑا زبردست فیصلہ ہے۔ میں کیا کروں کدھر جاؤں ———؟"

جنوبی کوریا کے نمائندے نے چلا کر کہا: "ہنگری کو پی-ای-این کی تنظیم سے فوراً نکال باہر کیجئے۔ اصل ہنگرین ادیب وہ ہیں جو اس وقت جلاوطن ہیں۔ کمیونسٹ ہنگری کا کوئی وجود ہم مانتے ہی نہیں۔ جس طرح اصل چینی ادیب قوم پرست چینی ہیں۔ کمیونسٹ چین مجرم ملک ہے۔"

پولینڈ کا عظیم ترین شاعر بڈھا انطونی سلونی مسکی میرے برابر بیٹھا ہے کیونکہ حروف تہجی کی ترتیب سے پولینڈ اور پاکستان ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ حالانکہ دراصل پاکستان کو جنوبی کوریا کے برابر بیٹھنا چاہئے تھا۔ مگر خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ حروف تہجی کی ترتیب تھوڑا ہی بدل سکتے ہیں۔

اتنے میں کسی دل جلے نے ہال کے دوسرے کونے سے سوال اٹھایا: "کیا میں پوچھ سکتا ہوں عوامی چین یہاں کیوں نہیں ہے؟"

پھر ہنگامہ شروع ہوا۔

ہندوستان کی مادام واڈیا نے دوبارہ صلح صفائی کرانا چاہی۔

دوسری طرف ہنگرین جلاوطن بولتے چلے جا رہے تھے: "میں کہتا ہوں ادیبوں کو جیل بھیجنا غلط ہے۔" وہ گرجے۔

"ادیبوں کو برین واش کرنے کی کوشش کرنا بھی غلط ہے۔" کسی اور بزرگوار نے چپکے سے کہا۔

میرے برابر بیٹھے ہوئے پولش نمائندے آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔

انطونی سلونی مسکی کے پہلو میں بیٹھا ہوا دوسرا پولش ادیب اب باقاعدہ سو رہا ہے۔

ہال کی ایک اور سمت سے کسی نے کہنا شروع کیا ——— "یہ کیسا ماسٹرز کلب ہے جس میں عوامی چین، سوویت یونین اور شمالی کوریا موجود نہیں۔ یہ امپریلسٹوں کا کلب ہے۔"

پھر حملہ ہوا۔ ہر ایک نمائندے نے اپنے اپنے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون اپنی طرف کھینچے۔ انطونی سلونی مسکی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔ جانے یہ کیا سوچ رہے ہیں۔

جب بحثا بحثی ذرا کم ہوئی تو موسیو سلونی مسکی نے ہنگری کے مسئلے پر کچھ بولنا چاہا مگر امریکنوں نے زبردست احتجاج کیا۔ وہ خاموش ہو گئے۔

جنوبی کوریا والا پھر چلایا: "ہنگرین پی-ای-این سنٹر ختم کر دینا چاہئے۔"

مصر نے کہا: "اگر ایسا کیا گیا تو آپ کے لئے یہ تحقیقات کرنے کون جائے گا کہ وہاں ادیبوں پر کیا مظالم ہوئے۔ اس وقت تک تو وہاں کے ادیب اس سنٹر کے ذریعے بین الاقوامی تنظیم سے منسلک ہیں۔"

اس سلسلے میں پولینڈ نے جو تجویز پیش کی اس پر ہنگرین جلاوطن پھر برسے۔ موخرالذکر کی مصر نے پرزور مخالفت کی۔

آزاد دنیا اور آزادی کا لفظ بار بار ادھر سے ادھر لڑھکایا جا رہا تھا۔

آزادی کیا شے ہے۔ میں نے سوچا۔ یہ تو بڑا مابعد الطبیعاتی سوال بن جاتا ہے۔ لکھنے والوں کی آزادی، سیاسی آزادی، اخلاقی آزادی ———

"مغربی ورلڈ کے لکھنے والے آزاد ہیں ———" جنوبی کوریا والے نے کڑک کر کہا۔

"بھی تو ہر وقت سیاسی پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔" اس گوشے والے نے دوسرے سرے سے جواب دیا۔

"آزادی سے لکھنا میرا مقصد ہے۔" ایک چینی ادیب نے کہنا شروع کیا۔ "ہم کس طرح ہنگری کے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں؟" میں نے فوراً جواب دیا۔ "اس میں صرف ایک آدمی نے (اس نے ہال کی تہہ کی طرف اشارہ کر کے کہا) وہاں کے گواہ اور پراسیکیوٹر اور جج کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ہم محض اس کی یکطرفہ گواہی پر بھروسہ کر لیں گے؟ امریکی، فرانسیسی اور برطانوی انصاف کے تصورات سے یہ رویہ مطابقت نہیں رکھتا۔"

میں نے جھک کر دائیں طرف جہاں کچھ امریکی بیٹھے تھے۔ اب ایلریانس کے سننے کی باری تھی۔

ایک مشرقی جرمنی کا نمائندہ کہہ رہا تھا ——— "ہنگری پر معزز جلا وطن ادیب نے ہمیں جو کچھ بتلایا اس سے بالکل متضاد خبریں ہمیں بوڈاپسٹ سے موصول ہوئی ہیں۔"

دوسری طرف سے ویت نام کے نمائندے نے فرانسیسی میں کہا: "ہم امن کے نام پر یہاں جمع ہوتے ہیں اور ہم ویت نام کے ادیب چاہتے ہیں کہ امن کے لئے لکھیں ———"

امن ——— میں نے دل میں سوچا ——— آزادی کی طرح آجکل کی اصطلاحات میں یہ ایک اور عجیب و غریب لفظ ہے ———

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" شام کو میں نے مسٹر راتے سے کہا۔ ہم لوگ ایک شاہی محل کے ایسے عظیم الشان ایوان ضیافت میں ایک میز کے کنارے کھڑے کچی مچھلی نگلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "پچھلے سال دلی میں جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ تم اس میں کیوں نہیں آئیں ———؟"

"مجھے بلایا تو گیا تھا۔" میں نے مچھلی کے کانٹے نکالتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر میں اپنے آپ کو ایماندار سمجھتی ہوں اور ایمانداری کا تقاضا یہ تھا کہ میں پاکستان کی نمائندگی دلی میں نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ایک تیسرا ملک ہے ——— غیر جانبدار زمین ———"

"میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں ———" انہوں نے کہا ——— "مجھے ڈھاکے میں بنگالی ادبا کی کانفرنس کے لئے بلایا گیا تھا لیکن مجھ میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

ایک امریکن ادیب نے قریب آ کر کھانے پر اظہار خیال شروع کیا۔ "میں آپ لوگوں کی باتوں میں مخل تو نہیں ہوا ———؟" اس نے کہا۔

"نہیں تو ———" مسٹر راتے نے جواب دیا۔ "ہم لوگ اپنے خاندانی جھگڑے کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ایک خاندان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور دو سگے بھائی اپنے آبائی مکان کا بٹوارہ کر کے علیحدہ ہو جائیں تو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان میں دوبارہ اتفاق پیدا ہو سکے۔"

"صدیوں تک یہ دشمنی چلتی رہتی ہے۔ نفرت اور تلخی بڑھتی جاتی ہے گھٹتی کبھی نہیں۔" میں نے کہا۔

امریکن ادیب نے دوسری پلیٹ اٹھائی اور ٹہلتا ہوا دوسرے گروہ کی طرف چلا گیا۔

مسٹر راتے آئی سی ایس سے ریٹائر ہونے کے بعد شانتی نکیتن میں رہتے ہیں۔

"میری آخری پوسٹنگ مرشد آباد میں تھی۔" انہوں نے کہا۔ "درمیان میں گنگا ہے، دوسرے کنارے پر راج شاہی ہے۔ گنگا میں کشتی اگر چند لہریں ادھر ہو گئی تو پاکستان میں پہنچ جاتی ہے ——— وہاں خوب اسمگلنگ ہوتی تھی اور وہ واقعات جو ہند و پاکستان اصطلاح میں سرحد کے تنازعات کہلاتے ہیں۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتی تھیں اور لوگ مارے جاتے تھے۔ گنگا کے ہندوستانی کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھو تو راج شاہی کی سول لائنز کی کوٹھیاں نظر آتی ہیں جہاں

[illegible] سرحدوں کا حاکم رہتا تھا ـــ اور وہ بھی اسی طرح اسمگلنگ کی روک تھام اور بارڈر کے جھگڑوں کے سلسلے میں گولیاں چلواتا تھا ـــ راج شاہی بھی [illegible] میں میرا وطن تھا۔"

"اور ممکن ہے کہ راج شاہی کے اس حاکم ضلع کا وطن مرشد آباد رہا ہو ـــ"

"بالکل ـــ ایسا ہو سکتا ہے۔"

یہ ٹوکیو کے ایک عظیم الشان کلب کا جگمگاتا ہوا ہال نہیں تھا جس میں سینکڑوں اجنبی، غیر ملکی ڈنر سوٹ اور ایوننگ گاؤن پہنے ہاتھوں میں شمپین کے گلاس لیے کلچر اور سائنس کی باتیں کر رہے تھے۔ ہم تو اس وقت گنگا کے اندھیرے ساحل پر کھڑے تھے۔ دکھیاری گنگا جس کی لہروں پر کشتیاں چل رہی تھیں جن میں چراغ ٹمٹما رہے تھے اور ملاح بھٹیالی گاتے ہوئے سامنے سے گذر رہے تھے۔ اس اندھیرے میں دونوں ساحلوں پر آمنے سامنے بندوقیں تانے سپاہی ایک دوسرے کی طرف رخ کئے بیٹھے تھے۔ یہ بڑا ہولناک منظر تھا۔ یہ میرے لئے ہیروشیما کے تصور سے زیادہ لرزہ خیز تھا۔ میں نے جلدی سے پلکیں جھپکائیں اور قریب کھڑی ہوئی ایک خاتون کو پلیٹ اٹھا کر پیش کی۔

"ہاں!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے گنگا کا وہ ساحل دیکھا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا۔ سارا بنگال میرا جانا پہچانا ملک ہے۔ کلکتہ اور جل پائی گوڑی اور بردوان ـــ میرے والد کا ارادہ تھا کہ مجھے شانتی نکیتن بھیجیں گے لیکن جس سال مجھے شانتی نکیتن جانا تھا اسی سال میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ـــ فلاں فلاں اب بھی شانتی نکیتن میں ہیں ـــ؟"

"ہاں! اور تم فلاں فلاں کو جانتی ہو ـــ؟"

"جی! اور آپ ـــ"

ہال میں سینکڑوں کا مجمع ہے۔ مشہور نام دوسرے مشہور ناموں سے تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں۔ میں ہال کے دوسرے سرے پر آگئی جہاں ایک امریکن بڑھیا، ایک نامور امریکن شاعر کی بیوہ، ایک کونے میں تنہا کھڑی تھی۔

"کہیے کیا حال چال ہیں؟" میں نے اس سے کہا۔

اس نے پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھا۔ اس وقت غالباً وہ بھی کہیں اور سے دفعتاً واپس لوٹی تھی۔

[illegible] اور خوش پوش لوگ، دنیا کی اقوام کے منتخب افراد، سفارتی نمائندے اور وزراء اور چوٹی کے جاپانی فنکار ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ دعوت کے میزبان وزیر خارجہ مسٹر فیوجی یاما مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں مصروف تھے۔ ہال کی ٹیرس پر آرکسٹرا بج رہا تھا۔

"سنو!" امریکن بڑھیا نے اچانک اس طرح مجھے مخاطب کیا گویا کوئی بے حد اہم بات بتلانے والی ہو ـــ "سنو ـــ مدتیں گذریں" اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "جب میں ایک نوجوان لڑکی تھی اور پیرس میں پڑھتی تھی، ایک جاپانی طالب علم سے مجھے عشق ہو گیا جو وہاں آرٹ سیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے مگر کچھ ایسا ہوا کہ اس نے جاپان واپس آکر اپنی ہم وطن لڑکی سے شادی کر لی اور میں امریکہ لوٹی اور میری بھی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد سے میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ ابھی میں نے سنا کہ وہ زندہ ہے اور یہیں موجود ہے ـــ تمہارا کیا خیال ہے ـــ مجھے اس سے ملنا چاہیے یا میں خواب کو خواب ہی رہنے دوں؟"

"خواب کو ———" میں نے اس سے کہا۔ "خواب ہی رہنے دیجئے۔"

"تو گویا تمہارا خیال ہے کہ مجھے اس سے نہیں ملنا چاہئے؟"

"نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" وہ خاموش ہو گئی اور اُدھر دیکھنے لگی جدھر جوان آتشیں بکف چند جاپانی نوجوانوں کے مجمع میں گھرے کھڑے تھے۔ ہال کی سنہری اور روپہلی منقش چھت اور دیواروں پر ان گنت جھاڑ فانوس جھلملا رہے تھے۔ بالکنی میں آرکسٹرا اب ایک بہت پرانی دھن بجا رہا تھا۔ شاید یہی دھن اس بیچاری بڑھیا نے چالیس سال پہلے ۱۹۱۰ء کے پیرس میں سنی ہو جب وہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور ایک سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والے خوبصورت جاپانی مصور سے عشق کر رہی تھی۔ مگر وہ مصور آج اس سے ملے تو اسے ایک حسین امریکن بلونڈ کی جگہ ایک بوڑھی عورت نظر آئے گی، ڈھیروں موتیوں اور زیورات سے لدی پھندی، سیروں پوڈر اور سرخی منہ پر لگائے بھدے سے خشک بالوں پر مضحکہ خیز ہیٹ پہنے، موٹی بے ہنگم امریکن بڑھیا ——— اور وہ خود زرد، دبلا پتلا، عینک لگائے سفید بالوں، سوکھے مرجھائے چہرے اور اُداس چندھی آنکھوں والا ایک جاپانی بوڑھا ہوگا یا شاید وہ ناگاساکی میں ختم ہو چکا ہو اور اس بڑھیا کو غلط اطلاع ملی ہو کہ وہ زندہ ہے اور اس وقت اسی دعوت میں موجود ہے۔

خوبصورت لڑکیاں، یوروپین، امریکن اور جاپانی، خوبصورت خوش وضع نوجوانوں سے گفتگو میں مشغول ہیں۔ آرکسٹرا اب ایک نئی دھن بجا رہا ہے۔ مووی کیمرے گھر گھر کر رہے ہیں۔ ایک سیاہ آنکھوں والا جاپانی شاعر ایک حسین اطالوی لڑکی کو ایک نظم سنا رہا ہے۔

"نہیں ———" میں نے مڑ کر بڑھیا سے کہا۔ "اس سے کبھی نہ ملئے گا۔ خواب کو خواب ہی رہنے دیجئے۔"

دوسری صبح کانگریس کا کھلا افتتاحی اجلاس تھا جو ایک بہت بڑے ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس روز اٹھارہ سو ملکی اور غیر ملکی ادیبوں کا مجمع تھا۔ ٹیلی ویژن کیمرے، آرک لائٹس، مختلف اقوام کے جھنڈے، پریس کے نمائندے۔

اونچے پریزیڈیم پر مسٹر کواباٹا جاپان کے سب سے بڑے ناولسٹ نے استقبالیہ تقریر کی جس کو انہوں نے ایک چینی فلسفی کے مقولے پر ختم کیا: "بھائیو! کیا یہی کم خوشی کی بات ہے کہ اتنی دور دور سے دوست ملنے کے لئے آئے ہیں؟"

ان کے بعد جاپانی وزیر خارجہ بولے جو مصور بھی ہیں۔ آندرے شاں زوں نے ان کو جواب دیا: "پچھلی جنگ میں ہم میں سے بہت سے ایک دوسرے کے دشمن تھے یا دوست تھے۔ جنگ کی قبریں ہمارا انتظار کر رہی ہیں اور ان کے سامنے جھکے ہم پوچھ رہے ہیں کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا ——— جنگ کے بعد بہت سے جاپانی نوجوانوں کو وار ٹریبونل کی طرف سے سزائے موت ملی تھی۔ مرنے سے پہلے ان لڑکوں نے جو خط لکھے ان میں سے ایک بیس سالہ نوجوان نے ماں کو صرف اتنا لکھا تھا:

"میں نے لفظ 'کل' کاغذ پر لکھا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں ———"

یہ بیس سالہ لڑکا جو مرنے کے لئے جا رہا تھا انسانیت کے اس پورے ڈرامے کو اس نے اس مختصر سے جملے میں قلمبند کر دیا۔

دنیا کے ادیبو ——— کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم بیس سالہ لڑکوں کو موت کے سائے سے آزاد ہو کر زندگی کی روشنی میں "کل" کا نظارہ کرنے کا موقع دیں ———؟"

تالیوں کے شور میں مادام صوفیہ واڈیا نیلی ساری پہنے بڑے وقار سے چلتی ہوئی سامنے آئیں۔ ہاتھ اٹھا کر نمسکار کیا اور اونچی، پُراعتماد اور صاف

"بہنو اور بھائیو ——— سچ کی روشنی اور شانتی اور شکتی آپ لوگوں کے ساتھ رہے ——— میں ہندوستان کے عوام اور ہندوستان کے ادیبوں کا سلام اور محبت کے بول لے کے نکلتے سورج کے ملک میں آئی ہوں۔ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن جو انٹرنیشنل پی۔ای۔این کے نائب صدر بھی ہیں مصروفیتوں کی وجہ سے اس تاریخی اجتماع میں شریک نہ ہو سکے جو پہلی مرتبہ ایک ایشیائی ملک میں منعقد ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا ہے:

"یہ کانگریس دنیا کی تاریخ کے ایک بے حد نازک موڑ پر منعقد ہو رہی ہے۔ ہمارے سامنے فوری مسئلہ یہ ہے کہ ہم مشرق اور مغرب کے درمیان برابری اور باہم عزت کی بنیاد پر نیا رشتہ استوار کریں۔ ہمارے سامنے فوری مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہرگز ہرگز کسی حالت میں دنیا میں جنگ نہ چھڑنے دیں ——— انٹلیکچوئلز، شعرا، ڈرامہ نگار، مصنف اور ایڈیٹر معاشرے کا ضمیر ہیں۔"

اب جان اشٹین بک آئے اور رانی کو ایسا لگا جیسے سوتے سوتے جاگے ہوں اور انہوں نے انجیروں کی سی آواز میں کہا:

"خواتین و حضرات ——— میں بے حد خوش ہوں، اور بے حد میری عزت افزائی ہوئی لیکن یہاں میں بالکل بھونچکا کھڑا ہوں۔ مجھے آج صبح تک نہ معلوم تھا کہ مجھے بھی بولنا ہوگا۔ میں بہت مختصر تقریر کروں گا۔ میرا اس کانگریس سے بہت قریبی تعلق ہے۔ یہ ایشیا میں پہلی کانگریس ہے، اور اصلیت یہ ہے کہ میری بھی پہلی کانگریس ہے۔

جب میں نیویارک سے چل رہا تھا تو ایک دوست نے کہا تھا، فکر نہ کرنا۔ بس سنتے رہنا ———

میں جاپان پن کلب کا شکرگزار ہوں۔ یہاں آ کے مجھے معلوم ہوا کہ صرف سننا ہی کافی نہیں۔ غور سے سننا ضروری ہے۔ اب میں بیٹھ کر غور سے سنوں گا ———" اور وہ واپس جا کر بیٹھ گئے۔

"معذرت کر دی اشٹین بک نے ——— یہ کیا حرکت تھی ———"

"مسخرہ پن تھا اچھا خاصا ———"

"مادام صوفیا کی تقریر کمال کی تھی۔"

"مبارک ہو مسٹر جوشی! آپ کے وفد کی لیڈر نے بہترین تقریر کی۔"

"مگر بھئی اشٹین بک ———"

لوگ ہال سے باہر نکلنا شروع ہوئے ———

مادام صوفیا کو لوگوں نے گھیر لیا۔ مسز پنڈت کا سا اسٹائل، چاندی کے ایسے بال، بے حد خوبصورت ——— آج سے پندرہ سال قبل غضب قیامت کی حسین رہی ہوں گی۔

"یہ انڈیا ہمیشہ اسی طرح کے اسٹنٹ کرتا ہے ———" ایک پاکستانی ہال کے باہر لابی میں چند امریکنوں سے کہہ رہے تھے۔ "کیا ساری دنیا کی کلچر کا ٹھیکہ انہوں ہی نے لے رکھا ہے ——— امن اور تہذیب اور گاندھی اور بدھا کا ——— انڈیا نے بہت پر نکالے ہیں، دیکھ لینا بہت جلد منہ کے بل گرے گا ———"

"ہم لوگوں نے بھی ان کی تقریر کو پسند نہیں کیا ہے۔" امریکن نے کہا۔

"جی ہاں! وہ تو میں دیکھ رہا تھا۔ آپ لوگ سب ہنس رہے تھے ——"

ابوالمنصور احمد جو پاکستان کے اس وقت کے وزیر تجارت تھے، بنگالی کے صحافی اور طنز نگار کی حیثیت سے اس کانفرنس میں آنے والے تھے مگر کراچی سے روانہ ہونے سے ایک روز قبل مرکزی حکومت میں کرائسس آ گیا لہٰذا انہوں نے سفر منسوخ کر دیا۔ ان کی جگہ پاکستان کے سفیر ڈاکٹر عمر حیات ملک مہمان خصوصی کی حیثیت سے کانفرنس میں شامل ہوئے۔

وہ پرتکلف ڈنر ایک کلب میں تھا۔ یہ کلب بھی اس ملک کی صنعتی ترقی اور دولت کا مظہر تھا۔

ڈنر کے دوران میں میری ایک میز پر ایک مغربی پاکستان کے صاحب آن بیٹھے۔ ایک جاپانی نے جو برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا ان سے کہا —"میں اس قدر خوش قسمت ہوں کہ ٹیگور سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکا ہوں، عرصہ ہوا جب وہ جاپان آئے تھے۔"

پاکستانی مہمان نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جاپانی نے گھبرا کر ان کو دیکھا اور پھر خود بھی چپ ہو گیا۔ شاید اسے احساس ہوا کہ اس نے غلط بات کہہ دی ہے۔ اس کے برابر میں دوسری طرف مشرقی پاکستان کے ایک ادیب بیٹھے تھے اور شاید اب تک وہ دونوں ٹیگور ہی کی باتیں کر رہے تھے مشرقی پاکستان کے یہ ادیب بھی، ہر بنگالی کی مانند خواہ وہ پاکستانی ہو یا ہندوستانی، ٹیگور کے پرستار تھے۔ مغربی پاکستان کے مہمان کی معنی خیز خاموشی پر وہ بھی چپ ہو گئے۔ چند لمحوں بعد مقابل میں بیٹھے ہوئے ایک یورپین نے دوسرا موضوع چھیڑ کر موقع کو سنبھالا۔

میں نے مغربی پاکستان کے ان مہمان سے آہستہ سے کہا "ٹیگور کے مسئلے پر آپ کی کیا رائے ہے؟"

"جی ——؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ٹیگور بنگالی کا عظیم ترین شاعر ہے اور بنگالی پاکستان کی ایک سرکاری زبان ہے تو اس حساب سے ٹیگور بھی پاکستانی شاعر ہوا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آیا آپ کیا کہہ رہی ہیں ——"

"دیکھیے میں عرض کروں ——" میں نے گلا صاف کیا —— "آپ نذرالاسلام کو بڑا زبردست پاکستانی شاعر مانتے ہیں جس غریب کو پاکستان کے وجود کی بھی خبر نہیں اور وہ کلکتے میں پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا ہے، تو پھر ٹیگور کو آپ پاکستان کا شاعر کیوں نہیں مانتے جبکہ آپ کو مشرقی پاکستان کے ہر گھر میں قائداعظم کی تصویر کے ساتھ ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر بھی دیواروں پر آویزاں نظر آتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس بے چارے جاپانی نے مارے اخلاق کے ٹیگور کے متعلق آپ سے بات کی تو آپ خاموش ہو گئے اور وہ بے حد کھسیانا ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کلچر کی تقسیم کے بعد ٹیگور اور اقبال جیسی عظیم بین الاقوامی ہستیوں کو کس طرح تقسیم کیا جائے ——"

انہوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں ناچار پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کل بہت زیادہ جھگڑا رہا ہنگری کے معاملے پر ——" میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا کوئی کہہ رہا تھا ——

"میرا خیال ہے اب ہم لوگ ذرا لٹریچر کی طرف بھی توجہ کر لیں تو بہتر رہے گا۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ کانگریس ادبی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرنے کی غرض سے بلائی گئی تھی۔"

تیسرے روز کوکوسائی ہال میں پھر ایگزیکٹو کونسل کا بزنس سیشن تھا۔ اس میں ہنگری کے مسئلے پر مزید ہنگامہ رہا۔

—— لیکن اب لوگوں کا کھنچاؤ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب وہ اس سارے سلسلے سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ نئی نئی جان پہچان کے بعد اب دوستوں کے

گروہ بنتے جا رہے ہیں، نئے انسانی رشتے استوار ہو رہے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک ہیں، چاہے وہ آئس لینڈ کے ہوں چاہے ویت نام کے۔ ان کے جذبات ایک سے ہیں، ایک سے ردِ عمل۔ ان کو سیاسی آئیڈیالوجی کے تحت جُدا کر دو مگر یہ سب انسان رہیں گے اور جو ان کا یہ حقیقی ایکا برباد کرنا چاہے وہ سب سے بڑا مجرم ہے۔ دیکھو اپنے unguarded لمحات میں اسرائیل کے یہودی نے مصری عرب کے کسی لطیفے پر ہنس کر داد دی ہے۔ بلغاریہ کا ادیب جاپانی ہجوگی کے ساتھ مل کر کسی بات پر قہقہہ لگا رہا ہے۔ مغربی بنگال کے نمائندے نے مشرقی پاکستان کے نمائندے کے ساتھ بنگالی بول بول کر باقی سب کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔

شام کو ہم سب ٹوکیو سے باہر ایک پرستان کے ایسے باغ میں عصرانے کے لئے جاتے ہیں۔ یہاں سبزے پر لکڑی کے ٹی ہاؤس ہیں۔ کاغذی قندیلیں روشن ہیں۔ پائن کے درختوں کے پیچھے سے پورن ماشی کا چاند طلوع ہو رہا ہے جس کی روشنی میں باغ کے جھرنے جھلمل کر رہے ہیں۔ سبزے پر گڑیوں کی طرح سجی ہوئی گیشا لڑکیاں مہمانوں کی تواضع کر رہی ہیں۔ سامنے ان کا ایک اور گروہ اپنے کلاسیکل رقص دکھا رہا ہے (جو بے حد معمولی اور بے جان ہیں) ٹی ہاؤس کی سیڑھیوں پر جاپانی سازوں کا آرکسٹرا سخت بے تکی موسیقی بجا رہا ہے۔

ایک بے حد خوش شکل جرمن کیتھولک فادر جو یہاں کسی یونیورسٹی میں ادبیات کا استاد ہے (ٹوکیو میں ۹، یونیورسٹیاں ہیں علاوہ ڈگری کالجوں کے، یہ ناقابلِ یقین بات ہے لیکن صحیح ہے) کرسی قریب کھینچ کر مجھے اس رقص کے معنی سمجھا رہا ہے۔

فادر ”ایکس“ بیس سال سے جاپان میں ہے۔ رومن کیتھولک راہب ہے مگر خاصا رنگین مزاج معلوم ہوتا ہے۔ ”جانے اس کی کیا کم بختی آئی تھی کہ راہب بن گیا“ ایک فرنچ لڑکی مجھ سے چپکے سے کہہ رہی تھی۔ ”اب پچھتاتا ہوگا۔“

”عجیب بات ہے“ میں اس سے کہتی ہوں ”جاپانی اس قدر شاعرانہ مزاج کے مالک ہوتے ہوئے بھی میٹافزیکل بالکل نہیں۔“

”ہاں!“ فادر نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ زین فلسفہ——“

چاند اب تیرتا تیرتا ٹی ہاؤس کے اوپر پہنچ چکا ہے۔

”افسوس کہ یہ اگست کا نہیں ستمبر کا چاند ہے——“ فادر ”ایکس“ ہنس کر کہتا ہے۔

اسٹیون اسپنڈر قریب ایک مونڈھے پر بیٹھے سوچ میں ڈوبے گھاس کو دیکھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی گیشا لڑکیوں کے ناچ پر بھی ایک اچٹتی سی نظر ڈال دیتے ہیں۔ باغ میں جھرنوں کے گانے کی آواز دفعتاً تیز ہو گئی ہے۔ پائن کے درختوں کے پرے سے بانسری کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

چرواہے نے آواز سن کر رستے کا پتہ لگا لیا۔ اس کے ذریعے اس نے چیزوں کی ابتدا پر نظر ڈالی اور اس کے حواس میں سرگم کی سی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ جب انگلی کو صحیح اشارہ ملا تو اسے خود اپنا پتہ بھی مل جائے گا۔ شاخ پر کوئل گا رہی ہے۔ سہانی ہوائیں چل رہی ہیں اور ندی کے کنارے بید مجنوں سبز ہیں۔ بیل تو وہاں خود ہی موجود ہے۔ وہ کہاں چھپ سکتا ہے۔ اس کا خوبصورت سر شاندار سینگوں سے مزین ہے۔ کون مصور اس کی تصویر کھینچے گا——؟

لڑکے نے بیل کو مضبوطی سے پکڑ لیا مگر اسے لو! بیل تو رسہ تڑا کر پھر کہر آلود پہاڑیوں میں جا چھپا۔

چرواہے کو اپنا سونٹا اور رسہ کبھی نہ رکھنا چاہیئے تاکہ بیل دنیا کی ناپاکیوں میں گم نہ ہو جائے۔ لیکن اگر بیل کی رکھوالی کی گئی تو وہ خود ہی شستہ ہو جائے گا اور آپ سے آپ چرواہے کے پیچھے چلنے لگے گا——

کشمکش ختم ہوئی —— اب لڑکا اپنے بیل پر بیٹھا شام کے دھندلکے میں بانسری بجاتا گھر جا رہا ہے۔ اس کا دل خوشی سے معمور ہے۔

کیا اب یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اسے گیان مل گیا ہے؟

صبح ہوئی۔ مندوبین کے کارواں سانکی کائیکان جانے کے لئے امپیریل سے نکلے۔

صبح ——— ٹوکیو اپنے کام پر جا رہا ہے۔ یونیورسٹیاں، دفاتر اور کارخانے جاگ اٹھے ہیں۔ بسوں کے دروازوں کے نیچے کھڑی بے حد اسمارٹ نیفارم میں ملبوس جاپانی کنڈکٹر لڑکیاں جھک جھک کر فرانسیسی اور انگریزی میں مہمانوں کا استقبال کر رہی ہیں۔ شفاف چمکتی سڑکوں پر جن کے دونوں طرف ار درخت ہیں، ٹریفک کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ چوراہوں پر ٹریفک کے حادثات سے مارے جانے والوں کے اعداد و شمار کرکٹ کے اسکور ح بورڈ پہ بدلتے جا رہے ہیں ——— اس وقت تک پندرہ مارے گئے، ستائیس زخمی ہوئے۔ بائیس مارے گئے پچاس زخمی ہوئے تئیس مارے گئے۔

زندگی کے اس ہنگامے سے بے نیاز، امپیریل محلات کے گرداگرد خندق میں راج ہنس گردنیں اٹھائے سکون سے پانی کی نیلی لہروں پر تیر رہے ہ۔ اس قدر حسین منظر ہے جو دنیا کے اور کسی شہر میں نہ ملے گا۔

شہر کے وسط میں شاہی محلات ہیں جن کے چاروں اور کئی میل کی وسعت میں پائن کے جھنڈ پھیلے ہیں۔ ان باغوں کو فصیل نے گھیر رکھا ہے اور صیل کے گرداگرد بے حد خوبصورت پچاس فیٹ گہری خندق ہے جس کے کناروں پر بید مجنوں جھکے ہوئے ہیں۔

اس خندق کے چاروں اور ٹوکیو آباد ہے۔

محل کے صدر دروازے کے پل پر کھڑے ہو کر دیکھئے تو پارک کے ادھر وہ عمارت نظر آتی ہے جہاں مک آرتھر رہتا تھا۔

راج ہنس، تاریخ کے ان بھونچالوں سے بے نیاز، پانی پر تیر رہے ہیں۔ روز صبح، خندق کے کنارے کنارے چوڑے ایونیو پر سے گذرتے ہوئے ان راج ہنسوں کو دیکھتے ہیں۔

مغربی ادیب، ان جدید ترین وضع کی بسوں کے آرام دہ گدیلوں پر بیٹھے ان کے دریچوں میں سے جھانکتے ہوئے، جن کے گلدانوں میں پھول سجے ں قرونِ وسطیٰ کی علامت یہ خندق اور شاہی باغات کے ڈھلوان پر کھڑے پائن کے درختوں اور ساکورا کے پھولوں کو دیکھ کر جانے کیا سوچ رہے ہیں ———

بسیں آگے پیچھے سانکی کائیکان پہنچ گئیں۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی ہے۔ فل بوٹ اور برساتیوں میں ملبوس، ٹوکیو کے شہری، انگریزوں کی سی جیدہ شکلیں بنائے سڑک پر سے گذر رہے ہیں۔ ساتویں فلور کے ایک کمرے میں قدیم جاپانی خوشخطی کے نمونوں کی نمائش کی جا رہی ہے۔ جگہ جگہ دیواروں یں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکرز سے یورپین زبانوں میں مختلف اناؤنسمنٹ کئے جا رہے ہیں۔ کوکوسائی ہال کے اوپر لابی میں حسب معمول باتوں کی بھنبھناہٹ شروع ہو گئی ہے۔ پریس والوں کے گروہ ادھر ادھر انٹرویو لیتے پھر رہے ہیں۔ ایک کاؤنٹر پر قہوہ تیار ہو رہا ہے۔ مندوبین ہال کے باہر پکن ہول میں سے اپنے اپنے نام آئے ہوئے فافات اور لٹریچر نکال نکال کر دیکھ رہے ہیں۔ یہ مغربی دانشور جو پچھلے دو سو سال سے دنیا کی تہذیب کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان کو معلوم ہو کہ ان کا زمانہ رخصت ہوا۔

یہ مشرقی اقوام کے عروج کا زمانہ ہے۔

چاروں اور بے حد دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔

مغربی ادیب شرم سے پانی پانی ہے اور اپنے ماضی کے جرائم کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر بیشمار زین فلسفہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے یا دانتوں تلے انگلی بائے اس دنیا کے نظارے میں مصروف ہے۔ ٹیلی وژن اسٹیشن، ہائیکے، انڈرگراؤنڈ ٹرینیں، تھیٹر، فلم اسٹوڈیو، ڈپارٹمنٹ اسٹور، اداکار، مصور، ادیب، سائنسدان، مندروں کے راہب، یونیورسٹیوں کے پروفیسر ——— یہ کیسے عجیب و غریب لوگ ہیں۔ یہ کون انوکھی نسل ہے، کہاں سے آئی ہے، ایشیائی ماضی میں اس کی داستان کا پہلا باب کہاں سے شروع ہوتا ہے ———

لابی کے دریچوں کے باہر بارش شروع ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ دھند بڑھتی جا رہی ہے۔ سنہرا کرہ آسمانوں پر سے اتر رہا ہے۔ وہ سربفلک عمارتوں پر چھا گیا ہے۔ باغوں پر برس رہا ہے۔ لاؤنج کے ایک کونے میں اٹلی کا ایک کیتھولک دانشور خاموش بیٹھا ہے۔ اس کی روح اس دھندلکے کو چیر کر گیان پا گئی ہے؟ پتہ نہیں ہم میں سے کس کو یہ حق ہے کہ وہ دوسرے کے گیان کے متعلق فیصلہ کریں۔

پہاڑیوں پر چرواہا بانسری بجاتا اپنے گھر کی اور جا رہا ہے۔ باغوں میں ساکنی کے پھاٹکوں کے نیچے سے لڑکیاں پھول اٹھائے گزر رہی ہیں۔ شنتو معبدوں میں چراغ روشن کر دیئے گئے ہیں۔ دھند بڑھتی جا رہی ہے۔

اب سب چیزیں دھندلکے میں ڈوب گئیں۔ سوریہ دیوی کے بیٹے ہیروہیٹو کا محل اسی اودی کہرے میں چھپ گیا۔ خندق کا نیلگوں پانی آسمان کی سیال روشنی سے جا ملا۔ اب زمین اور آسمان ایک ہیں۔ وجود اس روشن خلا میں سما گیا۔ (یہ زین نروان کا احساس ہے؟)

وقت کا شنتو کاہن اپنی قندیل لئے راستے پر پیچھے کی اور پلٹا۔ قندیل کی لو اونچی کر کے، اسے تیز ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچاتا، پہاڑی پر چڑھا اور بانس اور پائن کے تاریک جنگلوں میں جا گھسا۔

جنگل میں جگہ جگہ سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے ستون تھے جن کی کھڑکیوں میں چراغ جل رہے تھے۔ جنگل کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا اور خالص وسعت کا احساس۔

شنتو کاہن نے قندیل اونچی کر کے کہا ——

ابتدا میں آسمان اور زمین ایک تھے اور محض انتشار تھا۔ اس انتشار میں سے لطیف حصہ اوپر اٹھا اور آسمان بنا۔ ٹھوس حصہ نیچے گرا اور زمین کی تشکیل ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان سے ایک شے برآمد ہوئی۔

جو خدا تھا۔

پھر چار دیوتا اور پیدا ہوئے اور انہوں نے سات مزید دیوتاؤں کو جنم دیا۔ ان کی آخری اولاد ازآنگی دیوتا اور ازآنامی دیوی تھے۔

ازآنگی اور ازآنامی کی اولاد —— جاپان ہے۔

جاپان دیوتاؤں کے حکم سے پیدا ہوا۔ سمندروں پر تیرتا ہوا ملک۔ ازآنگی اور ازآنامی آسمان و زمین کے درمیان معلق پل پر کھڑے تھے۔ انہوں نے دیوتاؤں کا دیا ہوا ہیرے جواہرات کا نیزہ سمندر میں ڈبویا اور سمندر کا جھاگ جو اس کی نوک پر لگا اس کے گرنے سے یاماٹو کے آٹھ جزیروں کی تخلیق ہوئی۔ اس کے بعد ازآنگی دیوتا اور ازآنامی دیوی کے یہاں جاپانی نسل پیدا ہوئی۔

ازآنگی اور ازآنامی کی پہلی اولاد سوریہ دیوی اور چاند دیوتا تھے۔ ان دونوں کے یہاں وہ سارے دیوتا پیدا ہوئے جو کائنات پر حکمرانی کرتے ہیں۔ آگنی دیوتا کو جنم دیتے وقت دیوی ازآنامی مر گئی اور اس کا آسمانی شوہر غم و غصے کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے موت کی دنیا تک جا پہنچا۔ لیکن ازآنامی اب پاتال کی دیوی بن چکی تھی۔ دیوتا واپس لوٹا اور سورج کے محل میں رہنے لگا۔ اس وقت زمین اور آسمان قریب قریب تھے۔ جب زمین آسمان سے دور چلی گئی تو سوریہ دیوی نے اپنے پوتے جموتینو کو جاپان کا پہلا شہنشاہ بنا کر دنیا میں بھیجا۔

جاپانی دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ جاپان کا شہنشاہ سوریہ دیوی کا بیٹا ہے۔ یہ جزیرے مقدس ہیں۔ ہماری قوم مقدس ہے۔ ہمارے آبا و اجداد مقدس ہیں۔

کاہن قندیل سمیت اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ہنشی۔

نکلتے سورج کی روشنی میں نظر آیا کہ ان جزیروں پر واقعی ایک عجیب و غریب دنیا آباد ہے۔ خوبصورت گاؤں، جھرنے، لکڑی کے پل، پھسلتی چوبی قدموں والی خوبصورت عورتیں سر پر سفید رومال باندھے چاول کے کھیتوں میں جھکی تھیں۔ ان جزیروں کے سلسلے میں ایک نسل بستی تھی جس کے ظہور کا کسی کو پتہ معلوم نہ تھا۔ ان کی زبان، ان کی دیومالا، ان کی روایات، ساری دنیا سے بالکل مختلف اور علیحدہ تھیں ——

یہ قدیم یاماٹو قوم ہے۔

ان کی زبان کا دنیا کی کسی دوسری زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ماہر لسانیات نے کہا۔

یہ لوگ بحرالکاہل کی دور افتادہ پرانی ترین نسل کی اولاد ہیں۔ ان میں سے بہت سے افریقہ کے سفید فام تورانی ہیں جو لاکھوں برس قبل جنوبی ہند، جنوبی ایشیا اور چین سے گذرتے یہاں پہنچے —— اینتھروپولوجسٹ نے کہا۔

عیسیٰ کی پیدائش کے پانچ سو سال بعد ہندوستان سے ایک عظیم لہر اٹھی اور چین اور کوریا کے راستے ان جزیروں تک پہنچی۔ ۵۲۲ء کے بعد چین کے رسم الخط اور ہند کے مہایان فلسفے نے اس ملک کی موجودہ تہذیب کی تشکیل کی —— مورخ نے کہا۔

شنتو کاہن ان سامنے قصبوں سے بے نیاز مندر میں بیٹھا آباء کی پوجا میں مشغول ہے۔ لکڑی کے مکانوں کے آنگنوں میں ننھے ننھے معبدوں کے سامنے لوبان جل رہا ہے۔ ایٹمی سائنسدان اپنے دارالتجربہ سے گھر پہنچنے کے بعد چپل اتار کر اپنے کمرے میں شنتو معبد کے آگے سر جھکا دیتا ہے اور بدھ کی مورتی پر پھول چڑھاتا ہے۔

چنانچہ جاپان کی اصل تاریخ ۵۲۲ء سے شروع ہوتی ہے۔

مصر، چین، ہندوستان، ایران اور عراق کے برعکس یہ تو بے حد مختصر سا تاریخی وقفہ ہے۔ صرف سوا تیرہ سو سال مشرق کے ماضی کے اتھاہ سمندر میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔

جاپانی ادب کی تاریخ بھی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔

گویا جاپانی ادب بھی سوا تیرہ سو سال پرانا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں نارا میں دارالسلطنت قائم ہوا۔ اس وقت جاپان میں چینی زبان اور ادب کو وہی اہمیت حاصل تھی جو ہم عصر ہندوستان اور یورپ میں سنسکرت اور لاطینی کو ملی ہوئی تھی۔ ہندوستان سے بہت سے سنسکرت کے الفاظ اور حروف، فلسفے اور فن سنگتراشی کے ساتھ یہاں پہنچے۔

علم حسب معمول برہمنوں اور سرکاری افسروں کی ملکیت رہا۔ "کوجیکی" نثر میں پہلی کتاب ہے جو شاہی فرمان کے بموجب ۷۱۲ء میں لکھی گئی۔ ۷۱۰ء سے ۷۸۴ء تک دارالسلطنت میں تاریخ، قانون، طب، قدیم چینی ادب اور جمالیات کی تعلیم کے لئے اسکول قائم کئے گئے۔ خوبصورت مندر تعمیر ہوئے، باغات لگائے گئے۔ چین کا ثقافتی اثر گہرا ہوتا گیا۔

جاپان کا شاعر مناظر فطرت کا عاشق تھا۔ اس نے اپنے اشعار میں گرتی برف کا ذکر کیا اور ندیوں میں کھلتے پھولوں کا، اور خزاں میں مرجھاتی گھاس کا —— اس کے یہاں گہرا فلسفہ نہیں تھا (آج تک نہیں ہے)، جاپان کی ساری شاعری اور مصوری امپریشنسٹ رہی ہے۔ کھیتوں پر تیرتے ہلکے پھلکے بادلوں اور نازک رنگوں کا فن۔ جاپان کی ان چھوٹی چھوٹی نظموں نے مغرب میں امیجسٹ شاعری کو متاثر کیا۔ یہاں کی مصوری نے انیسویں صدی کے آخر میں یورپ میں امپریشنسٹ مصوری کی پوری تحریک کو آگے بڑھایا اور ان کو تاثرات کی ایک نئی دنیا دریافت کر کے دی۔ اسی مصوری نے بنگالی استادوں کو متاثر کیا

[illegible] انشالا ہارس وغیرہ نے آبی رنگوں کے واش کی تکنیک کو بنگال اسکول میں رائج کیا (عبدالرحمن چغتائی بھی بنگال اسکول کے شاگرد تھے) تاما کے شاہی دربار میں شاعروں کا اجتماع ہوا۔ خود شہنشاہ شاعری کرتے تھے۔ ساتویں صدی کے ایک شہنشاہ کے اشعار ہیں:

خزاں زدہ کھیتوں پر برستی بارش رات کے سمے
چٹائی کے چھت والے عارضی جھونپڑوں میں سے ٹپکتی
سوتے ہوئے کسانوں کی آستینوں کو بھگوئے ڈال رہی ہے

اسی شہنشاہ کی بیٹی کی نظم ہے:

موسم بہار گذر چکا
کاگو کی پہاڑی ڈھلوان پر
نئے دُھلے ہوئے کپڑے
سفید بادلوں کی طرح پھیلے ہیں

ایک اور شہنشاہ نے کہا:

ہزاروں جھونپڑوں میں سے دھواں
بل کھاتا اٹھ رہا ہے
سمندر پر سفید مرغابیاں اڑتی ہیں
دھان کے کھیتوں کی سرزمین! جس کے لئے ہم جیتے اور مرتے ہیں
یاماتو ——— متبرک ملک ———!!

اسی صدی میں شہزادی نوکاتا نے کہا:

موسم سرما میں سے بہار برآمد ہوئی
پرندوں کی چہکار سے جنگل گونج اٹھے
ان گھنے کنجوں میں سے گذرنا آسان نہیں
جہاں پگڈنڈیوں پر کلیوں کے انبار لگے ہیں
لیکن پت جھڑ کے مہینے میں
میں ان وادیوں میں سُرخ پتے چنتی ہوں
میرے لئے خزاں کی پہاڑیاں کافی ہیں!

ایک اور شاعر نے کہا:

سُرخ پتوں پر چلتے ہوئے
میں اکیلے ہرن کی پکار سنتا ہوں
پت جھڑ کا موسم کتنا اُداس ہے!

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دارالسلطنت کیوٹو میں منتقل ہو گیا۔ اب ادب کا ہیئن عہد شروع ہوا جو چار سو سال تک قائم رہا۔ یہ زمانہ انتہائی عیش و عشرت کا تھا۔ دربار میں ایک شدید مصنوعی اور پُرتکلف تہذیب پروان چڑھ رہی تھی۔ محل میں باضابطہ محکمۂ شاعری قائم کیا جا چکا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ امرا اور شہزادیاں اور بیگمات سب شاعری کرتی تھیں۔ چینی زبان اور ادب کو اب بھی فوقیت حاصل تھی۔ بدھ مت کے زیرِ اثر دنیا کے فانی ہونے کا احساس شدید تر ہو چکا تھا۔ سوسائٹی میں خواتین کی اہمیت اور ان کا اعلیٰ درجہ اس عہد کی خصوصیت ہے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا شاہکار چار ہزار صفحات کا ایک ناول "گینجی کی کہانی" ہے جو سنہ ء کے لگ بھگ فیوجی وارا خاندان کی ایک خاتون نے تصنیف کیا۔ اس ناول کو جاپانی ادب میں وہی اہمیت حاصل ہے جو انگریزی میں سڈنی کے آرکیڈیا اور فیلڈنگ کے ناولوں کی ہے۔ اس عہد میں اور بہت سی خواتین نے ناول لکھے جو آج تک اسی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری نے بھی اپنی قدیم قومی روایات برقرار رکھیں ـــــ

بطخیں گھر کی طرف پرواز کر رہی ہیں
خزاں کے چاند کی روشنی میں ان کے پر چمکتے ہیں

جہاں پر اکیلی کوئل چلا رہی تھی
میں بھی اکیلا تھا۔۔۔
میں نے اس کی آواز کی طرف نظر اٹھائی
مگر مجھے صبح کے پھیکے چاند کے سوا
اور کچھ نظر نہ آیا

جب میں اپنے گھر کو خدا حافظ کہہ کر چلا جاؤں
اور میرا گھر سنسان پڑا رہ جائے
میرے چھپر کے قریب اُگے ہوئے آلوچے کے درخت!
بہار کے موسم میں اپنی کلیاں کھلانا نہ بھولنا ـــــ!

او مسرور، قہقہے لگاتی، موسمِ گل کی بیکراں دھوپ!
اتنی بے صبری سے چیری کے شگوفے کیوں گرا رہی ہے؟
پیارے پہاڑی چیری کے درخت
آؤ ہم تم دونوں خوش ہو لیں
کیونکہ ہمارا اور کوئی دوست نہیں ہے
میرے بھائی!

بارھویں سے لے کر سولھویں صدی تک، جاپان مستقل خانہ جنگی کا شکار رہا۔ بدامنی اور سیاسی انتشار سے پناہ لے کر علم و ادب خانقاہوں میں جا چھپا۔ شاعری کا رنگ گہرا ہو گیا۔ خواتین بھی ادبی افق سے غائب ہو گئیں۔ ادب میں سیاسی اور جنگجو عناصر آ گھسے۔ تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں۔ اسی زمانے میں جاپان کا مشہور نوہ ڈراما پیدا ہوا جس کی بنیاد ہم عصر انگلستان ‘Miracle And Morality Plays.’ کی طرح مذہبی تھی۔ شنتو مندروں کا ڈانس ڈراما اس کا پس منظر تھا جس میں دیوداسیاں ڈھول اور نفیری کے سروں پر ناچتی تھیں (آج بھی اسی طرح ناچتی ہیں) سینکڑوں نوہ ڈرامے لکھے گئے۔ شوگن (جنگجو جاگیردار) سماج نے ان کی سرپرستی کی۔ ان ڈراموں کا ہیرو عموماً ایک راہب ہوتا تھا۔ پھر اس میں مزاحیہ عنصر بھی شامل کر دیا گیا۔ آج تک نوہ کو جاپان میں وہی مقبولیت حاصل ہے۔

نوہ ڈرامے کی شاعری کا ایک نمونہ یہ ہے:

چاروں سمندروں پر موجیں ساکت ہیں
دنیا پر سکون طاری ہے
وقت کی ہوائیں آہستہ آہستہ چلتی ہیں
ایسے زمانے میں وہ صنوبر بھی مبارک ہیں
جو اکٹھے بوڑھے ہوتے ہیں
ہم خوش قسمت ہیں جو اپنے قابلِ قدر آقا کے اس عہد میں پیدا ہوئے
سحر قریب ہے
اور کہرِ صنوبر کے درختوں پر گر رہا ہے
سدا بہار درخت
وقت کے اختتام کی علامت بنے کھڑے ہیں
درخت جو اکٹھے بوڑھے ہوتے ہیں

سنہ ۱۶۰۰ء سے سنہ ۱۸۶۷ء تک فیوڈل ادب کا زمانہ ہے۔ توکوگاوا شوگن خاندان کے دورِ حکومت میں ملک میں امن پھیلا اور تہذیبی اداروں کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔ چینی کلاسکس اور کنفیوشس کا فلسفہ ایک بار پھر سے رائج ہوا۔ یدو (موجودہ ٹوکیو) کا نیا شوگن دارالحکومت اپنی شان و شوکت اور تہذیبی سرگرمیوں میں کیوٹو کے شاہی دارالسلطنت سے بازی لے گیا۔ بدھ مت کا اثر کم ہوتا گیا اور قدیم شنتو مذہب کے زیرِ اثر شدید قسم کی نیشنلزم آگے بڑھی۔ ادب کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ ہر موضوع پر ان گنت کتابیں لکھی جانے لگیں۔ قدیم چینی کے یانگ اور ین کا فلسفہ (جو ہندو الٰہیات کے برہما اور شکتی کے نظریے کی مانند ہے) یہاں بھی بے حد مقبول ہو گیا۔ یانگ مثبت، مذکر اور متحرک ہے۔ ین منفی، مونث اور غیر متحرک ہے۔ یہ قدرت کی دو قوتیں ہیں جن کی کارفرمائی سے دنیا کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس فلسفے کے سوشل اخلاقیات اس شوگن سماج کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوئے جس میں فرض کو بڑی زبردست اہمیت حاصل تھی۔ نچلے طبقے کے انسانوں کا فرض تھا کہ اونچے طبقے کے انسانوں کی اطاعت کریں۔ اونچا طبقہ صرف حقوق کا مالک تھا، فرائض نچلے طبقے کو سونپ دیئے گئے تھے۔ اس زمانے کے ادب کا ہیرو سمورائی ہے۔ سمورائی جنگجو اس سماج کا آئیڈیل انسان تھا۔ بات بات پر لڑ مرنے والا، اعلیٰ خاندان، آن پر جان دینے والا بانکا سورما۔ اسی فیوڈل عہد میں عورت تقریباً پردے میں بٹھلا دی گئی۔ طوائف یا گیشا کا عروج ہوا۔ وہی ناولوں کی ہیروئن بنی۔

اب یدو، کیوٹو اور اوساکا میں چھاپہ خانے کھل گئے تھے۔ سماج میں سب سے اونچا درجہ سمورائی کو حاصل تھا اس کے بعد کاریگروں، کسانوں

اور تاجروں کی باری آتی تھی۔ یہ گویا جاپان کے چار ورن آشرم تھے۔

فیوڈل عہد ساموراؤں کا عہد تھا۔ نوہ اب بھی مقبول تھا لیکن پہلے غیر مذہبی تھیٹر یعنی کابکی کی بنیاد سولہویں صدی میں ایک دیوداسی نے ڈالی جو رہبانیت کی زندگی سے بھاگ کر اوساکا آگئی تھی اور اب گا بجا کر اپنا پیٹ پال رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنی ناٹک منڈلی لے کر یدو چلی آئی اور کابکی تھیٹر قائم کیا۔

نوہ اور کابکی کے علاوہ کٹھ پتلیوں کا ڈراما بھی اس ملک میں کئی صدیوں سے مقبول ہے۔

فیوڈل عہد کی شاعری ——

یہ رہا وہ پرانا تالاب
لو اس میں ایک مینڈک کودا
ذرا پانی کی جھنکار تو سنو!

اگر تم نیپون[1] کی اوپری روح کو دیکھنا چاہتے ہو
تو پہاڑی چیری کے شگوفے پر نظر ڈالو

دنیا جس میں سے ہم گذرتے ہیں
بارش کی پھوار سے بچنے کے لئے ایک سائبان ہے
اور پھر —— خدا حافظ!

سڑک کے کنارے ایک پھول کھلا تھا
گدھا آیا اور اس کو چر گیا

میرے پلنگ کے قریب کوئی چراغ نہیں
سوائے میری کھڑکی کے چاند کے!

دوستو مجھ سے دور رہو
تاکہ میں تنہائی میں دن بھر پھولوں کی عبادت کر سکوں

پائن کی شاخوں اور آدھی رات کی بارش میں سے جھانکتا
چاند آہستہ آہستہ گزر رہا ہے!

---

[1] جاپان

گو دنیا محض ایک شبنم کے قطرے کی مانند ہے
مگر ہماری دنیا تو ہے ——!

بے چاری چھوٹی سی یتیم
آ میرے ساتھ کھیل

جدید جاپانی ادب کا زمانہ ۱۸۶۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ شوگن حکومت کے زوال، مغربی اقوام کی آمد اور شہنشاہیت کی تجدید کے ساتھ ساتھ جاپان نے نئے زمانے میں قدم رکھا۔ اب تک ملک کے سارے دروازے غیر اقوام کے لئے سختی سے بند تھے۔ پچھلی صدیوں میں ڈچ تاجروں نے آمد و رفت شروع کی تھی، کیتھولک مشنری یہاں پہنچے تھے مگر ان سب کو نکال باہر کیا گیا تھا۔ جاپان مکمل طور پر باقی دنیا سے الگ تھلگ اپنی کائنات میں بند بیٹھا تھا۔ ۱۸۶۸ء میں ییدو میں نیا شاہی پایۂ سلطنت قائم ہوا جس کا نام ٹوکیو رکھا گیا۔ اب دفعتاً یورپ کی تہذیب، یورپ کی ادبیات کے مطالعے نے زور پکڑا۔ شہنشاہ نے ایک دستور بنایا اور ایک پارلیمنٹ قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ تقریباً سارے اہم یورپین، امریکن اور انگریزی ادب کا جاپانی میں ترجمہ کر ڈالا گیا۔ جاپانی ادیب مصلح قوم بنے۔ جاپانی زبان، جو ایک ہزار سال سے چینی خیالات کی ترجمانی کر رہی تھی اسی آسانی سے مغرب کی ترجمانی میں مصروف ہو گئی۔

لیکن آج کی شاعری میں بھی ایک ہزار سال قبل کی آواز بازگشت سنائی دے رہی ہے:

اب میں لیٹ کر خواب دیکھوں گا
اور بارش کی آواز
اور مینڈکوں کا شور مجھے لوریاں دے گا

میرے اوپر ہنسا کرو ——
مجھے کنویں کا مینڈک کہہ لو ——
لیکن میرے کنویں کی منڈیر پر پھول کھلے ہیں
اور چاند اس کے پانی میں تیرتا ہے!

ذرا سوزو موشی کا گیت تو سنو
اگر شبنم گا سکتی تو اس کی آواز ایسی ہی ہوتی
ہاں میرا مکان پرانا ہے
اس کی چھت پر پودے اُگ رہے ہیں
لیکن سوزو موشی کی آواز تو کبھی بوڑھی نہ ہو گی
میرے بچپن کا گھر جل چکا

لیکن جھینگروں کی صدائیں آرہی ہیں
میرا خیال ہے وہ پرانے اچھے دنوں کی یاد میں
گانے کی کوشش کر رہے ہیں!

جدید جاپانی ادب بے حد ترقی یافتہ ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں کتابیں اور رسالے چھپتے ہیں۔ ہر زندہ قوم کی طرح ان کا ادیب بھی معاشرے میں بے اندازہ عزت کا مالک ہے۔ وہ بھوکا نہیں مرتا۔ نہ وہ سڑکوں کی نالیوں میں بے ہوش پڑا پایا جاتا ہے۔ جاپان کے بڑے ایکٹر اور بڑے مصنف اپنی قوم کے لئے ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ قوم فنکار کی عزت کرنا جانتی ہے۔ جاپانی ادب اور آرٹ کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں، جس طرح وہ ساری زندگی کو بے حد سنجیدگی سے جینے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پی۔ ای۔ این کی بین الاقوامی تنظیم کی یہ انتیسویں عالمگیر کانگریس جو ان کے ملک میں منعقد ہو رہی ہے وہ اس کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ گویا دنیا کی قسمت کا فیصلہ یہیں ہونے والا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر پر ایک لڑکی کی شیریں آواز آئی —— "ادبی سیشن کے لئے اندر تشریف لے چلئے" ہم نے کافی کی پیالیاں کاؤنٹر پر رکھیں، کاغذات اٹھائے، لوبی کی سیڑھیاں اتر کر ہال میں اپنی اپنی نشستوں کی طرف چلے گئے۔ بارش کی پھوار اب بھی دریچوں کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی۔ بالکنی میں مترجم لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنے ہیڈ فون سنبھالے ——

نائب صدر موسیو روجر کیلیا نے کہا —— "یونیسکو کی طرف سے میں اس گول میز کانفرنس کے اراکین کا سواگت کرتا ہوں۔ مغرب کے اسکالر قدیم مشرق سے واقف ہیں، انہیں ہم عصر مشرق کے ذہن کا کوئی علم نہیں۔ اہلِ مشرق مغرب کو محض ایک فاتح اور کولونیل طاقت کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کا مغرب کے ماضی سے واقفیت نہیں۔ وہ گوتھک آرٹ کے مقابلے میں سرریلزم کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔ علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ مشرق آخر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے اور زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ "اورینٹ" کا وجود درحقیقت کہیں ہے بھی یا نہیں۔ عربی، ہندی اور چینی رسم الخط ایک سے نہیں ہیں۔ قاہرہ سے کراچی تک ایک رسم الخط ہے۔ مگر بہرحال، ایک یورپین طرزِ تحریر ہی نے ساری دنیا کو یکجا کر رکھا ہے۔ میرے پاس اورینٹ اور مغرب کے اختلافات کی بہت سی مثالیں موجود نہیں ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اورینٹ میں حقیقی اتحاد موجود ہے۔ مجھے یہ شبہ ہے کہ کہیں مغرب کی مخالفت ہی تو سارے مشرق کے اتحاد کی بنیاد تو نہیں۔ علاوہ ازیں مشرق کا اسکالر اپنے ہمسایہ ممالک کے ماضی کا پتہ چلانے کے لئے پیرس، لندن اور برلن کا رُخ کرتا ہے۔ مشرق کے سیاستدان نے نہ صرف مغرب کی یونیورسٹیوں میں بلکہ مغرب کے بنائے ہوئے جیل خانوں میں اپنی تربیت حاصل کی ہے —— اب تک یہ راستہ یک طرفہ رہا ہے۔"

مصر کے ڈاکٹر محمد عوض نے کہا "مختلف ملکوں کے مصور، موسیقار اور سائنسدان ایک دوسرے کے کام سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن دوسری زبانوں کے ادب کے سلسلے میں کمیونی کیشن کا معاملہ آڑے آجاتا ہے۔ بیتھوون کے سوناٹا کا عربی یا ہندی میں ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم لکھنے والوں کا فن ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ایک مترجم کی حاجت ہے۔

بڑی قابلِ غور بات یہ ہے کہ اہلِ مغرب نے آج تک مشرق کے ادب کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا، سوا چند مستشرقین کے جنہوں نے اس خزانے کا کھوج لگایا اور اس میں جرمن دانشور سب سے آگے تھے۔ گوئٹے تھا جس نے اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں عربی اور فارسی پڑھی۔ اس نے اپنا دیوان الگ قت

کہا جب اس کے وطن میں انتہا پسند اور جنگجو قوم پرستی کی لہر اپنے عروج پر تھی۔ اس شاعر نے اپنے آپ کو ہندوستانی اور ایرانی اور عربی تہذیبوں کے دھارے میں بہایا مگر اس کی تخلیقات سے کسی قسم کی دوسرے درجے کی، دوغلے پن کی جھلک نظر نہیں آتی جس کا خطرہ عموماً لوگوں کو اس قسم کا اثر قبول کرنے کے سلسلے میں محسوس ہوتا ہے۔

پچھلی صدی کے اواخر میں یورپ کے رابطے سے عرب ممالک میں نثر اور ناول اور مختصر افسانے کی تحریک چلی۔ سیاستدان عرب دنیا میں تفرقہ ڈالنے کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں اس کے باوجود ان تہذیبی کوششوں کے ذریعے مشرق اور مغرب اس خطے میں ایک دوسرے کے ہمدردی کی حیثیت سے قریب تر آسکے ہیں۔

آندرے شازوں نے کہا: "میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس محفل میں ہم سے کوئی بھی اپنی حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں بول رہا ہے۔ ڈاکٹر عوض نے جو کچھ کہا وہ اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنی حکومت کے بجائے اپنے ملک کی طرف سے تقریر فرمائیں۔"

برطانیہ کے اینگس ولسن نے کہا: "میں آپ سے ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مخاطب ہوں۔ تخیلی ادب سے باہر جانے کی مجھ میں صلاحیت نہیں۔ لیکن اگر میں صرف لکھنے کے فن ہی کی بات کروں تو فرار پسند ادیب نہ سمجھئے گا۔ کوئی ناولسٹ اس معاشرے کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا جس میں وہ زندہ ہے۔ آخر یہ معاشرہ ہی تو وہ مادہ ہے جس کو ٹھونک پیٹ کر اپنے اطمینان کے مطابق ایک شکل میں ڈھالتے ہوئے اس کی ساری زندگی بیت جاتی ہے۔ لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم سیاسی اور عمرانی نظریات پر بحث کریں اور اگر میں نے ایسا کیا بھی تو ان برطانوی ادیبوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی جن کی میں یہاں نمائندگی کر رہا ہوں اور کسی تھیوری کے ماتحت رہتے بغیر اپنے فوری اور بلاواسطہ تجربے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

میں نے اب تک صرف پانچ چھ جاپانی ناولوں کے ترجمے پڑھے ہیں اور اگر میرے میزبان برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ انہوں نے مغربی فارم کو اس پوری طرح کیوں قبول کر لیا اور کس خوبصورتی سے قبول کیا۔

اس سلسلے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں:

ایک لکھنے والے کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس کی اپنی جڑیں اس کے تخیل اور اس کے فن کی اصل بنیاد ہیں۔ یہ جڑیں کاٹ کر وہ بڑا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کو صرف اپنے بچپنے کے متعلق ہی لکھتے رہنا چاہئے اگرچہ چند تمثیلیں اور سانچے جو ہماری کہانیوں کے پس منظر میں رہتے ہیں شروع ہی سے ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکتے ہیں۔ گو اس کے بعد ہم اپنا مواد بہت سی مختلف دنیاؤں سے بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ کپلنگ، ای۔ ایم فورسٹر اور سمرسٹ ماہم نے ایشیا سے یہ مواد حاصل کیا۔

لیکن چند بنیادی سوال ہیں جن کی حیثیت لکھنے والے کے نقطۂ نظر سے بین الاقوامی ہے۔ گو ان کا حل قومی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ وہ بنیادی مسائل میرے نزدیک یہ ہیں ——

ایک انسان کے اندر وقت اور انسانی شخصیت کا باہم رشتہ کیا ہے؟

مختلف شخصیتوں کے وجود کا اظہار کس طرح کیا جا سکتا ہے اور ان کا ٹکراؤ کس طرح دکھایا جا سکتا ہے؟

کیا انسان کی سماجی اور پبلک شخصیت اور اس کی نجی شخصیت ایک ہی ہے۔ اگر نہیں تو کون سی زیادہ اہم ہے؟

کیا ہم لکھنے والے زندہ مواد کو اپنی ناولوں میں ٹھونس کر اور اس کو پلاٹ میں جکڑ کر اور اس پر اپنے فیصلے صادر کر کے اسے قتل تو نہیں کر دیتے؟

طرز بیان کیسا ہو؟

اس سال جاپان میں جب میں نے جاپانی ناول نگاروں تانی زاکی، کواباتا، اوکا اور می شی ما کے ناول پڑھے تو ان بنیادی سوالوں کے متعلق میرے دماغ میں ایک تعلق سا پیدا ہوگیا۔ گویا میں ایک اندھی گلی میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن جہاں جہاں ان ناول نگاروں کا رویہ شخصیت، وقت اور انسان کے سلسلے میں مغربی فنکاروں کا سا تھا وہاں ان کا خالص جاپانی فارم ہر اس چیز سے اس قدر مختلف تھا جو میں نے آج تک سوچی کہ مجھے فوراً مکمل **Liberation.** حاصل ہوگیا۔ ظاہر ہے ان کی تقلید میں نہیں کر سکتا لیکن یہ بذات خود ایک بڑی ہمت افزا بات تھی کہ چند بڑے فنکار شخصیت اور زندگی کے بنیادی مسائل کے متعلق ایسے خطوط پر سوچ رہے ہیں جن سے میں بالکل واقف نہیں، اور اس بات نے مجھے اپنی جڑوں میں اور گہرا کھودنے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ مغرب اور مشرق کے فنکار کو ایک دوسرے کے اختلافات میں بڑی تخلیقی تحریک مل سکتی ہے۔ دوسرے ممالک کے رسم و رواج کے متعلق تو آپ عام کتابوں سے بھی معلومات حاصل کرسکتے ہیں مگر لکھنے کے لئے اصل محرک وہ اچانک جھلک ہے جو ایک ایسے آئینے میں نظر آجائے جس میں ساری دنیا ایک دوسرے زاویے سے منعکس ہے۔ مقامی رنگ یا عالمگیر اپروچ کے بجائے یہ اصل چیز ہے۔"

جاپانی پی۔ای۔این کی طرف سے شوسے کی چی ہونو نے کہا:

"جاپانی کلچر کے معاملے میں شروع سے درآمد کا قائل ہے۔ چونکہ یہ ملک ہمیشہ خود مختار رہا لہٰذا اس کے باشندوں کو انتخاب کرنے کی آزادی میسر تھی۔ انہوں نے جو پسند کیا اختیار کیا جو ناپسند کیا اسے چھوڑ دیا۔ یورپ سے ہم نے حسن کا معنوی، ذہنی اور غیر شخصی احساس حاصل کیا جس کے مقابلے میں ہمارے یہاں حسن کا قدرتی، جذباتی اور شخصی احساس موجود تھا۔ شروع میں ہم یورپ کی معقولیت اور تناسب سے متاثر ہوئے لیکن جدید جاپانی ادب محض مغرب کا نقال نہیں ہے۔ قدرت سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش ہر جاپانی فنکار کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہی جاپانی طرز زندگی اور طریقۂ فکر کی جڑ ہے۔ گو یہ جڑ ایک مغربیت پسند اور صنعتی سماج میں بہت حد تک ہل چکی ہے۔

آج کے لکھنے والوں کو ایسی زبردست مذہبی اور سماجی آزادی حاصل ہے جو ہمارے غیر ملکی ادیبوں کو بھی چونکا دے گی۔ اس آزادی کی وجہ سے ہمارے لکھنے والوں اور عوام کے درمیان بڑی خلیج پیدا ہوگئی ہے۔ عوام کے نزدیک لکھنے والوں کا ایک اونچا طبقہ پیدا ہوگیا ہے۔

اس آزادی میں مغربی معدومیت اور انکار کائنات اور مشرقی فنا کے احساس کا رنگ شامل ہے اور خطرہ ہے کہ ادیبوں کا گروہ اینٹی سوشل نہ بن جائے۔"

ہندوستان کے ڈاکٹر سری نواس آینگر نے کہا:

"کیا مشرق کی مختلف اقوام کے ادب کا رنگ بھی مختلف ہے؟ موسیو تین نے ایک جگہ پوچھا ہے ادب کی علت و معلول کیا ہے؟ ان کا جواب ہے نسل، معاشرتی ماحول اور لمحہ۔ ایک خاص قوم اور ایک خاص ملک کے ایک خاص وقت میں یکجا ہونے سے لٹریچر فروغ پذیر ہوتا ہے۔ دلاوری کے عہد نے المیہ کی تخلیق کی۔ شہروں کے پرتکلف تمدن نے ڈرامے کو جنم دیا۔ انیسویں صدی کے صنعتی دور نے ناول اور آج کی ٹیکنالوجیکل تہذیب نے جاسوسی افسانہ، فلم اسکرپٹ اور ٹیلی وژن پروگرام پیدا کیا۔ لیکن ان سب چیزوں کے علاوہ کیا شخصی تجربہ اس تخلیق میں شامل نہیں؟ تیراک خواہ وہ دھارے کے ساتھ یا اس کی مخالف سمت میں پیرے، اگر دھارا اس کے بہنے یا اس کی جدوجہد میں شامل ہے لیکن تیراک بذات خود پیرنے کی مہم کا مرکز ہے۔ والمیکی اور ہومر، سوفوکلز، کالی داس، بھو بھوتی اور شیکسپیئر اور مولیئر کی اپنی مستقل شخصیتیں تھیں۔ "فردوس گمشدہ"، "گینجی کی کہانی" یا "کرامازاف برادران" لوگوں کا جاری کردہ مینی فسٹو یا کسی کمیٹی کی رپورٹ نہیں ہے۔ چارلس لیمب کے مضامین اس کے علاوہ اور کوئی نہ لکھ سکتا تھا۔

چنانچہ ادب کیا سوشل، نسلی یا علاقائی تخلیق ہے؟ وقت کی روح میں شرکت یا مختلف مردوں اور عورتوں کے دکھ، خوف، خواب اور وژن اس کی تخلیق کی اصل وجہ ہیں۔ تیرنے کی مہم کی اصل حقیقت کیا ہے، دھارا یا پیراک؟ غالباً انسان اور ادب میں بیک وقت دو خصوصیات موجود ہیں۔ اگر ایک طرف سے

دیکھا جائے تو انسان ویرانوں میں محصور ہے، تنہا اور منفرد۔ دوسری طرف وہ آدم کی ساری نسلوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ کائنات میں ذرے کی حیثیت سے شامل ہے۔ اسی طرح کوئی ایک شعر، کوئی ایک جملہ بذاتِ خود ایک ستارہ ہے جس کے اپنے قوانین ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ستارہ ایک بڑے نظامِ شمسی میں شامل ہے جسے ادب کہتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی ادب کی تخصیص اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان دونوں جگہوں میں ادب کی پھر مزید علاقائی تقسیم بھی موجود ہے لہٰذا ہم مشرق اور مغرب کے ادب کو کس مشترک پیمانے سے جانچیں؟ ہندوستانی، چینی اور جاپانی ادبیات میں کون سی قدر مشترک ہے؟ عربی، فارسی، بنگالی، مرہٹی، تامل اور برمی ادبیات کی کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ان کو ایشیائی کہا جاتا ہے؟ کیا امریکن، آسٹریلین، جنوبی افریقی ادب انگریزی لٹریچر کی مانند ہے؟ کیا مشرق و مغرب کی تخصیص اینگلو انڈین (یا ہندوستانیوں کے لکھے ہوئے انگریزی ادب) لٹریچر کو اینگلو امریکن آسٹریلین لٹریچر سے جدا کر دیتی ہے؟ روسی ادب کو مشرقی سمجھا جائے گا یا مغربی؟ کیا ہسپانوی ادب پیرو و [illegible] کے بہ نسبت پرتگالی سے زیادہ نزدیک ہے؟ بالفاظِ دیگر جغرافیائی قربت اور اتحاد یا مشترک زبان اور ادبیات کے رشتوں کی تشریح کرتی ہے؟ پھر قومیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اُردو اور بنگالی ادب اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں میں تخلیق کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی تخلیق کے پیچھے کون سی چیز زیادہ طاقت سے کارفرما ہے ـــــ ایک مشترک زبان یا ایک مشترکہ مذہب اور قومیت؟

زندگی میں ظاہری تغیر اور حقیقی تسلسل میں برابر تصادم رہتا ہے۔ ادب اس تصادم کا عکاس ہے۔ وہ کیا شے ہے جو فنکار کو اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ ادب کی آفاقیت وقت اور جغرافیائی حدبندیوں سے ماورا ہے۔ سچ عالمگیر ہے۔ حقیقی ادب میں انسان انسان سے بات کرتا ہے، مشرق مغرب سے، ماضی حال سے یا حال مستقبل سے نہیں۔ اعلیٰ ادب کے سامنے زمان و مکاں کی کوئی حیثیت نہیں۔

ظاہری طور پر انسان، ادوار، ممالک ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہمارا محبت اور غم اور رُوح کا تجربہ ساری دنیا میں یکساں ہے۔ سیاست، اقتصادیات، منظم مذہب اور متضاد فلسفوں نے انسانوں میں افتراق پیدا کر دیا ہے لیکن بڑا ادب خصوصاً شاعری، بجلی کی خیرہ کن لپک کی طرح ہمیں یک لخت اس اندھیرے میں راستہ دکھا دیتی ہے۔

مشرقی ادب نے روح کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کی ہے **Unknown** کے سمندر کو کھنگالا ہے۔ لامکاں کو پانے کی سعی کی ہے۔ رشیوں اور صوفیوں نے اس ادب کی آبیاری کی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کا ادیب زیادہ تر خارجی دنیا اور انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی کا عکاس ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرق کے لیکھک زندگی کے مادی تقاضوں سے بالکل بے نیاز ہیں۔ افلاس اس وقت ایشیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مغرب کے لکھنے والے تحفظ اور شخصی یا اجتماعی مسرت کے متعلق لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں افلاس سے چھٹکارا ملنے ہی پر شخصی یا اجتماعی مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔

اس وقت مشرقی اور مغربی ادبیات کا روایتی رول بدل گیا ہے۔ مشرق میں مادیت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ مغرب کے لکھنے والے روحانیت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود مشرق کے ادب کی اصل خصوصیات برقرار ہیں۔ یہاں جارج آرویل کے "جانور خانے" کی طرز کی طنز نہیں لکھی جا سکتی۔ نہ مغرب میں جاپانی شاہکار "بگلا" اور "غروبِ آفتاب" پیدا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑی عجیب بات ہے کہ سوفوکلز اور شیکسپیئر کی قسم کی ٹریجڈی کی تخلیق سے مشرق نے ہمیشہ انکار کیا۔ ہندوستان میں ایک سو سال سے شیکسپیئر پڑھا جا رہا ہے لیکن عوام (ذہن پرستوں کے علاوہ) ہیملٹ یا لیئر کے دوست نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مشرق طبعی موت کو آخری خاتمہ سمجھنے سے منکر رہا ہے۔

عیسیٰ کا مصلوب ہونا کوئی شے بھی نہیں آپ اگر ان کے دوبارہ جی اٹھنے پر یقین رکھتے ہوں۔

یقین اصل چیز ہے۔

دنیا ایٹمی تباہی کے دروازے پر کھڑی ہے اور اس وقت مشرق اور مغرب کے درمیان جو رشتہ قائم ہے وہ محض باناباکے شور و غل اور ہیو باریوں کی چیخ و پکار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔"

فرانسس کے ثاں سے ہی تو نے کہا ——

"ایک چینی حکیم چانگ سین کا مقولہ ہے 'ہوا، فطرت کی بانسری درختوں اور پانیوں پر سے بہتی ہوئی میرے نغمے بجاتی ہے۔ اسی طرح تاؤ' میرا فلسفہ، مختلف زمانوں میں میرا اظہار کرتا ہے اور اپنی جگہ قائم ہے ——

۱۹۱۶ء میں میں اپنی مرضی کے خلاف جنگ میں لڑ رہا تھا۔ میرے سارے دوست ختم ہو چکے تھے۔ یورپ خودکشی میں مصروف تھا۔ میرے سامنے صرف تاریکی تھی۔ اس وقت میں نے رابندر ناتھ ٹیگور کا وہ پیغام سنا جو انہوں نے جاپان کو دیا تھا۔ ٹیگور کے الفاظ کے ذریعے مشرق کی آواز پہلی بار میرے کانوں تک پہنچی۔ انہوں نے یورپ کی انسان کشی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایشیا کی نشاۃ ثانیہ کی پیش گوئی کی تھی اور جاپان کو خالی نقالی کے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ وہ قوم پرستی کے مخالف تھے۔ انہوں نے کہا: "ہمارے افلاس کے وسیع صحرا پر جنت خداوندی قائم کرو —— اور یاد رکھو کہ جو بڑے ہیں لازمی طور پر عظیم نہیں —— اور غرور ہمیشہ فنا ہوتا ہے۔"

اس وقت ہمیں یہ الفاظ ہمارے اپنے ماضی کی طرف سے آتے معلوم ہوئے۔ ٹیگور کی دعا تھی:

"جہاں روح بغیر خوف کے زندہ ہے اور سر اونچے اٹھے ہیں
جہاں علم حقیقی ہے
جہاں دنیا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر دیواروں میں محصور نہیں کی گئی ہے
جہاں خرد کی ندی مری ہوئی رسوم کی ریت میں نہیں کھوئی ہے
اس آزادی کی جنت میں، خداوندا! میرے ملک کو بیدار کر ——"

بڑی بات یہ تھی کہ مشرق نے یہ دعا یورپ والوں کے لئے مانگی تھی۔
یہی دعا میں اپنے ملک کے لئے مانگتا ہوں۔"

- لنچ کے بعد تیسرے پہر کو کانگریس کے اراکین دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک گروہ مادام صوفیہ واڈیا کی صدارت میں "طرز زندگی پر مشرق و مغرب کے اثر" پر تبادلہ خیالات کے لئے جمع ہوا۔ دوسرا گروہ امریکن ڈراما نگار ایلمر رائس کی زیر صدارت "جمالیاتی اقدار پر مشرق و مغرب کے اثر" پر گفتگو کرنے والا تھا۔

طرز زندگی پہ اظہار خیال کرتے ہوئے عظیم جاپانی ناولسٹ جون تکامی نے کہا ——

"میں ایک جاپانی ٹیپکل ہوں اور اس سمے جبکہ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں میرے چہرے پر وہ مسکراہٹ ہے جسے 'جاپانی پُراسرار مسکراہٹ' کہا جاتا ہے۔ بہت سے غیرملکی اس جاپانی تبسم کو غلامی اور کاسہ لیسی کی علامت سمجھتے ہیں۔ غیرملکیوں کا یہ رویہ اس جذبہ حقارت پر مبنی ہے جو ان کے دلوں میں

جاپانیوں کے لئے ہے۔

لیکن اس تبسم کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم ایک عرصہ دراز تک فیوڈل غلامی کے عالم میں رہے۔ جب ایک جاپانی کسی امیر سے ملتا تھا تو اسے فوراً مسکرا کر یہ ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مسکراہٹ عادت میں شامل ہوئی اور پھر اس عارفانہ تبسم میں تبدیل ہو گئی۔ میں بھی عادتاً مسکراتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس وقت میری شعوری کوشش یہ ہے کہ میں اس تبسم کے ذریعے آپ لوگوں کے لئے اپنے جذبۂ خیرسگالی کا اظہار کر کے آپ کا خیر مقدم کروں۔۔

جاپانی تبسم بندگی کے علاوہ امن اور مہربانی کا تبسم بھی ہے۔ یہ نرمی اور ملائمت نہ صرف جاپان بلکہ سارے ایشیائیوں کا شیوہ ہے۔ میرے ملک کی طرح تقریباً سارا ایشیا صدیوں تک ظلم اور تشدد کا شکار رہا ہے جس کی وجہ سے ایشیائیوں کو ایسا مسکین اور متحمل بننا پڑا۔ لیکن ایشیائی حلم کی محض یہی ایک وجہ نہیں۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ ایشیا کے لوگ فطرت کے ساتھ بڑے سکون اور ہم آہنگی سے رہنا جانتے ہیں۔ اہلِ مغرب فطرت سے لڑتے اور اس کے خلاف جدوجہد کر کے اس پر غالب پانا چاہتے ہیں۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں ان کے یہاں ایک سائنٹیفک کلچر پیدا ہوا اور اس جدوجہد کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایشیا سائنس کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا۔

فرد کی اہمیت کے جدید مغربی شعور کے بجائے افراد ہمارا مرکزِ خیال رہے ہیں۔ فطرت کے علاوہ انسانوں کے ساتھ سکون اور ہم آہنگی سے رہنا ہمارے فلسفے کی بنیاد ہے۔

ٹوکیو میں آپ نے مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کا عجیب و غریب امتزاج دیکھا۔ میں آپ کے سامنے مغربی سوٹ بوٹ پہنے بیٹھا ہوں۔ مگر میرے ہونٹوں پر ابھی تک وہ عارفانہ مسکراہٹ ہے۔ ہم نے اپنی جاپانی مسکراہٹ ابھی تک نہیں کھوئی۔

میں آپ سے اور بہت کچھ کہتا مگر میری انگریزی بے حد کمزور ہے۔"

ہندوستان کے آنند شنکر رائے نے کہا ——

"ہندِ قدیم نے روم کے ساتھ تجارت کی اور یونان سے لڑا۔ لیکن قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان باہر کے ممالک سے کٹ گیا۔ اس لئے جب یورپین ہمارے یہاں پہلے تاجر اور پھر حاکم کی حیثیت سے پہنچے تو ہم کو بے حد حیرت ہوئی۔ وہ اپنے نشاۃ ثانیہ کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر عہدِ جدید کے نقیب کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہم ابھی قرونِ وسطیٰ ہی میں پڑے تھے۔ پہلے مشرق و مغرب کے درمیان جغرافیائی فاصلہ تھا اب یہ فاصلہ وقت کا ہو گیا۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان غیر متوازن ارتقاء کے تین سو سال حائل تھے۔ سوال یہ تھا کہ ہم اس تین سو سال کے فرق کو کس طرح پُر کریں اور ترقی کی اس اسٹیج تک جا پہنچیں جہاں وہ اب موجود تھے۔ مگر دوسرا سوال یہ تھا کہ کہیں اس دوڑ میں ہم اپنا پرانا راستہ نہ بھول جائیں اور مغرب کی جس منزل پر پہنچیں تو معلوم ہو کہ شاید مغرب بھی غلط راستے پر چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے نے سوچا کہ ہر مغربی چیز مشرق کے لئے اچھی نہیں۔ لیکن موڈرن ہونا سب کے لئے اچھا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی نشاۃ ثانیہ مغربی اصلاحات اور اپنے ماضی کے ورثے کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ ہمارے علاقائی ادب اپنی روایات کو چھوڑے بغیر عہدِ نو میں داخل ہوئے۔ برطانوی آزاد خیالی اور فرانسیسی انقلاب اور اپنشدوں کا مطالعہ بیک وقت کیا جانے لگا لیکن بعد میں قوم پرستی کی تحریک کے زیرِ اثر مغرب کو بالکل مسترد کر دیا گیا۔ یورپ کے خلاف غم و غصے کا جذبہ شدید ہوا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ریفارمیشن کی مخالفت اور ماضی کی تجدید اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس زمانے میں آرٹ اور ادب میں بڑی اچھی اچھی چیزیں تخلیق کی گئیں لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہم اپنے ماضی میں محدود ہو کر موڈرن زمانے سے کٹتے جا رہے ہیں۔ تب راجہ رام موہن رائے کے سو سال بعد مہاتما گاندھی

نے کہا کہ وہ مغرب کے مخالف نہیں لیکن اس موڈرن تہذیب کے مخالف ہیں جو مغرب کو گھن کی طرح کھا رہی ہے اور اس کی مدافعت مشرق کو اپنی اہنسا کی پوری طاقت سے کرنا چاہیے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم اپنے اندر ستیہ اور اہنسا تلاش کریں اور اپنے باہر غریبوں، مظلوموں پر نظر ڈالیں۔ مہاتما گاندھی قرونِ اولیٰ کے کسی عیسائی سینٹ کی مانند رہتے تھے۔ جسمانی اور روحانی محنت کرتے تھے۔ "جمالیاتی" اور "ذہنی افکار" سے بے نیاز، فطرت، خدا اور عوام کی قربت میں وہ اس طرح زندہ رہے جس طرح آج کل کی دنیا میں اور کوئی انسان نہیں رہا ہے۔ اپنے اس جادو کے ذریعے وہ کروڑوں عوام سے جو چاہتے تھے منوا لیتے تھے۔ محبت ان کی جادو کی چھڑی تھی۔

ایسی صورت میں بحث کون کر سکتا تھا؟ یا آپ ان کو مانیئے یا ان کو مسترد کر دیجیے۔ ہم سے گاندھی کے راستے کو مسترد کرنا ناممکن تھا لیکن ہم جدید یا مغربی راستے کو بھی ترک نہیں کر سکتے تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جس چیز کو نامنظور نہیں کر سکتے تھے اسے قبول کر لیا؟ یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ دراصل جدید مغرب کا موہ ہمارے لئے فوری زائل ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہم جدید مغرب سے مایوس ہوئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہم کو اس سے کراہت آنے لگی۔ لیکن ہم کو یہ بھی یقین نہ تھا کہ گاندھی کا راستہ اختیار کر کے ہم کہیں ڈیڑھ سو سال کی ایک ترقی کو رد کرتے ہوئے پھر قرونِ وسطیٰ میں تو واپس نہ پہنچ جائیں گے۔ ہندوستان میں اس وقت ایسے خطرناک لوگ موجود ہیں جن کو اہنسا اور ستیہ کی قطعی پروا نہیں اور جو ہزاروں سال برس پرانا سماج اور برہمنوں کی طبقاتی برتری کا نظام واپس لانا چاہتے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ہمارے یہاں نہرو جیسے شدید موڈرن انسان بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ موڈرن انسان بغیر ایک فوج کے اپنا کام نہیں چلا سکتے اور یہ گاندھی کی اہنسا کی تعلیم کا بالکل الٹ ہے۔ گاندھی ۴۷ء کے بعد کے آزاد ہندوستان کا سب سے دکھی انسان تھا۔ نہ صرف اس لئے کہ ہمارا گھر تقسیم ہو چکا تھا، بلکہ اس لئے بھی کہ ہم نے قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت والے ان خطرناک لوگوں پر (جنہوں نے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا) قابو پانے کیلئے تشدد کا آزادی سے استعمال کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کو دھوکا دیا۔

ہم عدم تشدد کے اصول کے پابند نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہم ان کے سکھلائے ہوئے دوسرے اصول حق پرستی پر قائم ہیں۔ جن کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنا پڑا ہے اور اس کی بنا پر ہم بے حد دکھی ہیں۔ ہم ان کے بتائے ہوئے راستہ پر پوری طرح نہیں چل سکتے۔ ہندوستان کو سب سے پہلے اس تیزی سے جدید بنانا ہے کہ رجعت پسند عناصر تشدد یا فریب کے ذریعے گھڑی کی سوئی کو صدیوں پہلے تک واپس نہ پہنچا دیں۔ ہمارے عوام اس قدر بھولے ہیں کہ ان کو بڑی آسانی سے مذہب کے نام پر بھڑکایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ہم زمانہ حال کو اپناتے ہوئے اپنی دشمن یعنی قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت سے تو دور ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے دوست مہاتما گاندھی کے اور ہمارے درمیان کا فاصلہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مستقبلِ قریب میں تلوار کی جگہ محبت نہیں لے گی۔ شہروں کی جگہ گاؤں اور مرکزی نظامِ حکومت کی جگہ لامرکزیت نظر نہیں آئے گی۔ آج ہمارے یہاں کروڑوں عوام ووٹ دینے جانتے ہیں، اگر بے صبری میں انہوں نے ستیہ اور اہنسا کا سہارا چھوڑ دیا تو ملک ایک اور تباہی کی طرف جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی میں ہم زیادہ دیر نہیں لگا سکتے۔ تیز رفتار ترقی ہی انقلاب کا نعم البدل ہے۔

اس وقت ہندوستان کے لکھنے والوں کے سامنے یہ سارے مسائل ہیں۔ دماغوں میں جدیدیت، روایت پرستی اور گاندھیائی فلسفے کے درمیان کشمکش جاری ہے اور جب تک ایک محبت اور ستیہ پر مبنی ٹھوس بنیاد کا فیصلہ نہ کر لیا جائے عظیم آرٹ یا لٹریچر کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر اس وقت حالانکہ ان گنت کتابیں اور رسالے چھپ رہے ہیں کوئی غیر معمولی تخلیقات پیش نہیں کی جا رہیں۔ یوروپین تراجم میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب مغرب اور موڈرن ہم معنی سمجھے جا رہے ہیں۔ مغرب کو اجنبی نہیں سمجھا جاتا۔ کسی قسم کا احساسِ کمتری یا برتری یا اختلاف اس لفظ کے ساتھ شامل نہیں۔ مغرب کی موجودہ اقدار ہندوستان میں بھی رائج ہیں۔ اپنے سیاسی جھگڑے کے باوجود ہم ان کو منظور کر چکے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر کو انگلستان یا مغرب سے

کوئی عناد نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک قوم کی حیثیت سے اپنا کام کرنے کے لئے اور اپنے مسائل حل کرنے کے لئے ہمیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔

ہم آرٹ اور جمالیات کی عالمگیر قدروں میں یقین رکھتے ہیں لیکن ہم اپنی قومی انفرادیت کے بھی قائل ہیں۔ ہندوستانیت کو جدیدیت یا عالمگیریت کی لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔ صدیوں سے ہندوستان کی تشریح کی جا رہی ہے۔ پچھلی نسل کے لئے ہندوستان غیر مغربی یا غیر جدید کے مترادف تھا۔ آج ہندوستان میں سب کچھ شامل ہے لیکن اس کی روح منفرد ہے۔

ہمارے لکھنے والوں کا مستقبل کیا ہے؟ انھیں بہت جلد موڈرن اور گاندھین راستوں میں سے ایک انتخاب کرنا ہوگا اور یہ فیصلہ بڑا تکلیف دہ ہوگا۔ مغربی لکھنے والوں کے سامنے اس قسم کا کوئی اذیت دہ فیصلہ نہیں ہے۔"

بلغاریہ کے کمیونسٹ ادیب بویان بوتیفر نے کہا ———

"آج کی دنیا بے حد مختصر ہو گئی ہے لیکن زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے دنیا کا ادب ابھی تک قومی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ ہر ادب اپنی مخصوص قوم کے ایقان کی ترجمانی کرتا ہے۔ بالزاک کے ذریعے ہم انیسویں صدی کے فرانس کی روح میں اتر جاتے ہیں۔

لیکن اکثر ہوتا گیا ہے کہ قومیں جو صدیوں سے ایک دوسرے کی ہمسایہ ہیں (مثال کے طور پر بلغاریہ اور یونان کو ہی لیجئے) ایک دوسرے کے مصنفین کے بجائے فرانسیسی مصنفوں کو زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ (میں نے خود بالزاک کا حوالہ دیا) اور فرانس بلغاریہ سے بہت دور ہے!

چھوٹی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کی یہ بدقسمتی ہے۔ فن لینڈ اور پنجاب اور بلغاریہ اور ایران کے ادب نے ایک دوسرے کو کتنا متاثر کیا ہے؟ آپ کسی چیز کو جانے بغیر اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ ادب کے ذریعے آپ ان قوموں کو جان سکتے ہیں اور ان سے محبت کر سکتے ہیں۔ محبت کے بغیر امن کی باتیں کرنا بیکار ہے۔

میں ایک چھوٹی سی قوم بلغاریہ کے ادبی نمائندے کی حیثیت سے آپ لوگوں کو سلام کرتا ہوں تاکہ اس عالمگیر کونسرٹ میں میری آواز بھی سنائی دے جائے۔"

فرانس کے آرماں پیئرال نے کہا ———

"میں اپنے چند پسندیدہ جاپانی اشعار دہراؤں گا:

اگر چاند کے کنارے پر ایک لکڑی لگا دو
تو یہ کیسی خوبصورت پنکھیا بن جائے

———

ایک گرتی پنکھڑی
میں نے شاخ کی طرف واپس جاتی دیکھی
یہ تو تیتری تھی ——!

———

وہ لڑکی جو کبھی نہیں آتی!
پرسکون شام میں جلتی ہوئی سمندری گھاس کی مانند

ساحل پر اس کا انتظار کرتے کرتے
میں بھی جل کر راکھ ہو گیا

آہستہ خرام سنہری مور
کی لمبی دم کی طرح طویل رات میں
میں کہاں تک اس کی راہ دیکھوں ؟

میری زندگی
پہاڑی ندی پر تیرتے بلبلوں کی مانند نازک ہے

ان خیالات کی صدائے بازگشت دوسرے پیرایے میں آپ کو دوسرے ملکوں کی شاعری میں ملے گی۔ "شروع میں ـــــ جب زمین و آسمان جدا
ہوئے ـــ " ـــ فیوجی یاما کے متعلق ایک مشہور پرانی نظم ہے ـــ یہی الفاظ انجیل مقدس میں موجود ہیں۔ ساری دنیا کی لوک کہانیاں معلوم ہوتا ہے شروع میں ایک ہی
خاندان میں سنائی گئی تھیں۔ کارتن میرے ایک ہم وطن کی تخلیق ہے لیکن اسے اہلِ اسپین نے خالص ہسپانوی سمجھا۔ ایک چینی اور ہیرا اور چند فرانسیسی لوگ تینوں
میں نے عجیب و غریب مماثلت پائی۔ آج کل میں ایک جاپانی ناول کا ترجمہ کر رہا ہوں اس پر پوشکن زندگی کا جو نقشہ ہے وہ کسی بھی فرانسیسی صوبے کے شہر کا
ہو سکتا ہے۔"

جاپان کے ناکیو کوآبار نے کہا ـــــ
"پچھلی صدی میں اپنی تنہائی سے نکل کر دفعتاً ہمیں معلوم ہوا کہ اہلِ مغرب ہمارے سروں پر آن پہنچے ہیں۔ برطانیہ ہندوستان کو فتح کر چکا تھا اور اب
ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم خود مغرب کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مغرب کی مدافعت کریں۔ تبھی عہد میں ہمارے یہاں روسو کا اثر بھی
آیا اور سوشلزم بھی۔ روایت پرستی بھی برقرار رہی۔
جاپان اور نیپال کے علاوہ دنیا کی اور کوئی قوم ہزاروں سال تک متواتر اور مکمل طور پر آزاد نہیں رہی۔ یہ ایک اہم تاریخی حقیقت ہے۔ یہ حقیقت ہماری
بہت سی اچھائیوں اور کمزوریوں کی ذمہ دار ہے۔

• ہمارے ہاں مذہبی اختلافات یا غیر ملکی حملہ زیادہ نہیں تھے لہٰذا ہم منطق اور فنِ خطابت کو ترقی نہ دے سکے لیکن ان کے بجائے رعنائی اور نزاکتِ خیال

• کنفیوشس کے زمانے سے فلسفہ اور مذہب مرکزی حکومت کے ماتحت تھا لہٰذا جبھی سے قوم پرستی کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی۔ جدید ادب خالص مغربی
ادب کے زیرِ اثر پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کے لکھنے والے اپنی بہت سی روایات کے لیے نادم تھے۔ آج جاپان میں موپساں، استندال، تالستائی اور دوستوفسکی
کو ہی کلاسیک سمجھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی آپ یہ نہ بھولیے کہ جاپان میں تعلیم عام ہے اور عوام کتابیں پڑھنے کے شائق ہیں۔
میں یہی بتا دوں کہ ہم نے مغرب کے ہاتھ اپنی روح کو نہیں بیچا ہے۔ ہم مغربی لباس پہنتے ہیں مگر ہماری کھال کا رنگ زرد ہے۔ ہم اس نقطہ

• کے لیے نہ شرمندہ ہیں اور نہ اس کی وجہ سے مغرور۔ ہمارا تقلید کا دور ختم ہو گیا تنقید کا دور شروع ہو رہا ہے اور ظاہر ہے کہ ہم اپنے عہد کی نفسیات کی عکاسی غیر ملکی عہد

کے اعلیٰ طرزِ بیان کے ذریعے نہیں کہہ سکتے۔"

پولینڈ کے انطونی سلونیمسکی نے کہا ——

"جتنا طویل فاصلہ طے کر کے میں اپنے ملک سے یہاں آیا ہوں اسی کی مناسبت سے میرے الفاظ کی ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے۔ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں —— کیا یہاں پہنچ کر چند پٹے ہوئے فقرے دہرا دینے سے وارسا سے ٹوکیو تک کے سفر کا مقصد پورا ہو گیا۔ کیا میں یہاں محض اسی لئے آیا تھا ——؟"

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ذہنی تکمیل کے کارناموں کی جس بلندی پر پہنچو وہاں جا کر معلوم ہوگا کہ یہاں چین کا تیر پہلے ہی سے گڑا ہوا ہے جو کئی ہزار سال قبل پھینکا گیا تھا —— اور ہند کا تیر اور جاپان کا تیر ——

اور جاپان نے تو اس زمانے میں بھی جبکہ سارے مشرق کو طویل غلامی کی تاریکی میں ڈبو دیا گیا تھا، ایسی ٹیکنولوجیکل برتری حاصل کی کہ زار شاہی روس جیسی زبردست طاقت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

ترجمے کی دقت بہت حد تک مشرق اور مغرب کی ادبیات کو قریب لانے میں حائل رہی ہے۔ خصوصاً شاعری جس کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ طاقتور سمندری یوروپین طاقتیں صدیوں سے اہلِ ایشیا سے واقف ہیں۔ لیکن پولینڈ جیسے چھوٹے چھوٹے یوروپین ممالک بہت سیکنڈ ہینڈ طریقے پر واقف ہو سکے ہیں۔ ہم کو ہندو، چینی اور جاپانی شاعری کے ترجمے انگریزی سے پولش میں کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں آپ خود ایک دلچسپ تجربہ کر کے دیکھئے —— ایک گمنام پولش نظم پن کلب کے برطانوی مرکز کو بھیجئے جہاں سے اس کا انگریزی ترجمہ ہنگرین، پرتگالی اور جاپانی سنٹرز میں بھیجا جائے۔ ان ساری زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد اس کا آخری ترجمہ دوبارہ پولش میں کر کے دیکھئے۔ معلوم ہوگا کہ یہ تو کوئی دوسری نظم ہے ——!

ترجمے کی دقت کے علاوہ دوسری چیز قوموں کی ایک دوسرے سے مکمل ناواقفیت ہے۔ اس کی ایک معمولی سی مثال میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یوروگوئے میں جب یونیسکو کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ یونیسکو کو پولینڈ کے قومی شاعر آدم مکی ویز کے متعلق ایک کتاب شائع کرنا چاہئے۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ مغرب اس عظیم ترین سلاو شاعر سے کس حد تک ناواقف ہے۔ ایک مشہور ترین انسائیکلوپیڈیا میں میں نے اس کا نام ڈھونڈھنا شروع کیا۔ Mick کے خانے میں "مکی ماؤس" تو تھا لیکن مکی ویز کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ابھی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اپنے وطن واپس پہنچ کر وارسا میں اپنے یونیورسٹی طالب علموں کو میں نے مکی ماؤس اور مکی ویز کا یہ قصہ سنایا ——

ان کو ہنسی نہیں آئی۔ نہ اس بات میں کوئی لطیفہ انہیں نظر آیا ——

کیونکہ وارسا کے کسی ایک طالب علم نے بھی مکی ماؤس کا نام تک نہیں سنا تھا ——!

اس محفل میں جمالیاتی اقدار اور طرزِ زندگی پر مشرق و مغرب کا باہم اثر زیرِ بحث ہے۔ میں اس مسئلے کے ایک ایسے ضروری پہلو کا تذکرہ کروں گا جو میرے ملک کے لئے بڑی خاص اور ڈرامائی اہمیت رکھتا ہے۔ میرا اشارہ روسی کمیونزم کے چین پر اور چینی فلسفیانہ روایات کے کمیونزم پر اثر کی طرف ہے۔ اسٹالن عہد کی کمیونزم نے بہت سی حکایات اور دیومالائیں گھڑلی تھیں۔ گذشتہ سالوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ ایک طاقتور دیوتا اور کینہ پرور راکھشسوں کی ایک ٹولی کی ذاتی مرضی اور من کی موج پر زندگی اور شخصی آزادی کا تمام تر انحصار رہتا ہے۔ ہمیں یقین نہیں کہ وہ عہد دوبارہ دہرایا نہیں جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان راکھشسوں سے کس طرح لڑیں ——؟ یہاں پر کنفیوشس کا وہ جواب سنئے جو انہوں نے اپنے چیلوں کے اس سوال پر دیا تھا کہ دیوتاؤں اور راکھشسوں

کا رول کیا ہونا چاہیئے۔

"جہاں تک ہو سکے ان سے کم سے کم سروکار رکھو۔ پہلے یہ دیکھو کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ امن، انصاف اور محبت سے رہتے ہو یا نہیں۔"

جب کنفیوشس سے پوچھا گیا کہ ان ہم جنسوں کے لئے سب سے پہلے کیا کیا جائے ——

"انھیں روٹی مہیا کرو۔"

"اور اس کے بعد ——؟"

"انہیں تعلیم دو ——"

اس عقلیت پرست پروگرام نے اٹھارویں صدی کے یورپ کو متاثر کیا تھا۔ یہ پروگرام اب ایک نئی حقیقت میں تبدیل ہو رہا ہے۔ آیا مطلق العنان دیوتا اور راکھشس آخر میں فتح مند رہتے ہیں یا عقلیت پرست، آزاد انسانی خیالات، اس بات پر نہ صرف بہت سے چینی اور پولش دانشوروں کی قسمتوں کا انحصار ہے بلکہ سوشلسٹ ہیومنزم کی آئیڈیالوجی کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔

اس وقت ہم لکھنے والوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ یہ علم معیشت حیوانات کا مسئلہ ہے یا پوری انسانیت زندگی کے تبدیل شدہ حالات سے مطابقت پیدا کر سکے گی یا نیست و نابود ہو جائے گی۔"

"Total war" اور "Two Faces of Man" کے مصنف ڈچ ماہر نفسیات میرلورسٹ نے کہا ——

"ایک خالص مغربی سائنس کے نمائندے کی حیثیت سے اگر میں بار بار نفسیات کی اصطلاحات استعمال کروں تو مجھے معاف فرمائیے گا۔ مشرق اور مغرب کے انسان نے تجزیہ نفسی کے کلینک میں اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل سے جس طرح مجھے باخبر کیا ہے اس سے آپ کو روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ دوسروں کی مختلف خصوصیات انسانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں رکھتیں۔ اس علیحدگی کی اصل وجہ وہ روایتی تصور ہے جو انسانوں نے دوسرے انسانوں پر اپنی طرف سے چپکا رکھا ہے اور اس تصور کی اصلاح کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج یہ اختلافات بے حد شدید ہو چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی یورپ پیچھے کو سرک گیا اور روس، امریکہ اور ایشیا اپنی اپنی نئی ذمہ داریوں کے ساتھ سامنے آ گئے۔ مغرب اپنے غرور میں مبتلا یہ بھول جاتا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔

اگر میں اپنے مشرقی ماہر نفسیات دوست سے کہوں کہ وہ مغربی اور مشرقی کے روحانی فرق پر روشنی ڈالے تو وہ میری اس جاننے کی سعی پر مسکرا دے گا اور کہے گا۔ خاموش، رہنا سیکھو میرے بھائی اور دھیان میں مصروف ہو کر اپنی اندرونی آواز سنو۔

لیکن کیا تم کو دنیا کے اہم ہنگامی مسائل کا احساس نہیں؟ میں بے صبری سے کہوں گا۔ دیکھو کسی لمحے بھی جنگ چھڑ جائے۔ کولونیلزم، ایٹمی خطرہ، پرشور، مڈل ایسٹ، کمیونزم ——

کیا تم نے اپنے اچھے بھلے ہوئے زیادہ گہرے مسائل کی پردہ پوشی کرنے کے لئے یہ سیدھے سادے شفاف پرابلم تخلیق تو نہیں کر لئے ہیں ——؟ میرا مشرقی ماہر نفسیات دوست کہے گا۔

اور پھر خاموشی چھا جائے گی۔

ایک ڈاکٹر سے زیادہ بہتر یہ کوئی نہیں جانتا کہ بنیادی طور پر سب انسان ایک ہیں۔ ان کے دکھ، تکالیف، مسرتیں، انسان محبت کرتا ہے،

سے پیدا ہوتے ہیں، انسان مرتا ہے۔

جب میرا پہلا چینی مریض میرے پاس آیا تو مجھے بڑی گھبراہٹ سی ہوئی۔ مجھے دنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کے نمائندے کا علاج کرنا تھا۔ میں شدت سے نروس تھا۔ مجھے اینتھروپولوجسٹ حضرات نے خبردار کر رکھا تھا کہ مشرق بعید کا مطالعہ بہت مشکل کام ہے۔

لیکن اس کے پرابلم بھی وہی نکلے جو میرے یورپین مریضوں کے تھے ——— دکھی بچپن، سخت مزاج والدین، جنگ سے تباہ شدہ ملک میں اسکول کی تعلیم، بڑے بھائی سے حسد، چہیتی بیوی کی موت۔

ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی مخصوص نسل یا ملک میں محض اتفاقاً پیدا ہو گئے۔ گویا اسی پیدائش کے لحاظ سے ہمیں اپنی وفاداریاں منتخب کرنا پڑتی ہیں ———

مختلف کلچرل سانچوں کے اندر اور بے شمار روحانی سانچے موجود ہیں اور جب یہ متضاد کلچرل گروہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کے ذہنوں کے اندر وہ سارے تعصبات پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور کمیونیکیشن علامتوں اور آوازوں اور الفاظ کے مختلف ہونے کی وجہ سے اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پچھلی نصف صدی کی سیاسی اصطلاحات ——— نسل، خون، زمین، رنگ ——— دراصل غیر شخصی اور سائنٹیفک معانی کے بجائے گہرے جذبات کے مظہر ہیں۔

لیکن ہر کلچرل گروہ خوف اور شبہ اور تعصب کے پرانے پیٹرن توڑ کر مذہبی علامتوں اور تخلیقی آرٹ کے ذریعے اپنے آپ کو کمیونی کیٹ کر لیتا ہے۔ مشرق ڈائرکٹ تصوراتی اور الہامی ہے۔ مغرب بالواسطہ ہے تجزیے اور تعبیر و تفہیم کا قائل۔

لیکن بے صبر سائیکولوجسٹ ان سب باتوں کا جواب انسانی طرزِ عمل کی ٹیکنیکل اصطلاحات کے ذریعے چاہتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کنفیوشس، مہاتما بدھ، اسلام اور ہندو فلسفے کے نفسیاتی محرکات کیا تھے؟ یا یہ کہ عیسائیت اتنے مختلف کلیساؤں میں کیوں بٹ گئی؟

مشرق اور مغرب میں نفسیاتی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ بعض پسندیدہ جذبات مشرق سے تعلق رکھتے ہیں اور چند مغرب سے۔ مشرق کا انسان اپنے خاندان اور اپنی کمیونٹی سے زیادہ قریب رہتا ہے۔ اس کی نجی تنہائی کا مطالبہ مغربی انسان کے اس مطالبے سے جداگانہ ہے۔ یہاں یہ تنہائی مذہبی مراقبے کے ذریعے مہیا کی جاتی ہے لیکن اس مراقبے میں بھی مشرقی انسان گروہ کا فرد رہتا ہے۔ گروہ یہاں زندگی کا مرکز ہے۔ یہاں میں مشرقی ندامت کا کلچر اور مغربی احساسِ جرم کی کلچر کا فرق واضح کرنا چاہتا ہوں۔ انسان کو ندامت اپنے کنبے یا اپنے ہم چشموں سے ہو سکتی ہے۔ اس کا گروہ اس کے طریقِ عمل تیار کر کے دیتا ہے اور انسان اسی گروپ میں رچ بس جاتا ہے۔ ذاتی احساسِ جرم اور ذمہ داری کے مغربی تصوّر کے تحت فرد اور گروہ میں بہت فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں فرد کی کشمکش اس کے گروہ سے نہیں بلکہ خود اس کے اپنے اندرونی وجود سے ہے۔ مشرق میں جرم و سزا گروہ کے غیر شخصی قانون کے ماتحت ہے۔ یہاں کسی اخلاقی ضابطہ یا ذاتی ضمیر کے فیصلے کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس مغربی معاشرے نے فرد پر بے شمار پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ وہ غیر سماجی طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا۔ احساسِ جرم سے بچنے کے لئے اسے اپنے شعور سے نفرت اور تخریب پسندی کے جذبات کو اس حد تک نکال دینا پڑتا ہے کہ اس کی ریاکاری غیر شعوری بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن موجودہ ٹیکنولوجیکل تمدن کا مغربی انسان اب مشرق کے گروہ پسند انسان کی طرح روز بروز گروہ کے پیٹرن میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔

مغرب کے انسان کو اپنی شدید تنہائی کی وجہ سے نیوروسس کا شکار رہنا پڑا۔ اسی وجہ سے وہ اجنبیوں اور غیر ملکیوں سے اسے وحشت ہوئی۔ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو دوسروں سے برتر سمجھنے کی نرگسیت دراصل احساسِ کمتری اور غیر اطمینانی کو چھپانے کا ایک حربہ ہے۔

مشرقی تہذیبیں دوسری تہذیبوں اور نسلوں کے سلسلے میں ہمیشہ سے بہت مہمان نواز اور آزادہ خیال رہی ہیں۔ چین اپنی جنگوں میں ہارا لیکن اپنے فاتحوں کو فتح کر لیا۔ منگولیا اور منچوریا کے فاتح خود چینی بن گئے۔ ہندو مذہب کا رویہ سارے مذاہب کے لئے عالمگیر رواداری کا سلوک ہے۔ ہزاروں سال قبل ہندو حکماء نے اس نظریے کو (جو آج کل جدید Physical اصول ہے) منظور کر لیا کہ مختلف نظریے بیک وقت صحیح ہو سکتے ہیں۔ ہندو ازم دوسروں کے خیالات کے لئے جارحانہ طور پر متعصب کبھی نہیں رہی۔ اس کے باوجود بھی ہندو ازم روح کے اعتقادات کے متعلق رواداری اور جس منطقی انفرادیت کے اصول کی تبلیغ کی اسی ہندو ازم اپنے معاشرے کے اچھوت طبقے کے لئے انتہائی تنگ نظر ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے اسلام ہندوستان میں کامیاب ہوا۔ اسلام کا مساوات کا رویہ اور عمل پرستی گروہ پرست انسان کی طبیعت کو زیادہ بھلی معلوم ہوتی۔ مسلم مفکر اقبال مشرقی فلسفے کی انفعالیت اور خیال پرستی سے بہت نالاں تھے۔ گو اسلامی طرزِ فکر کی یکسانیت اور participation کے نفسیاتی پیٹرن کی وجہ سے مسلمان ممالک آمریت کے بڑی آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔

جدید ممالک میں انسان کے اکیلے پن پر زور دیا گیا ہے ——— انسان اور اس کا خاندان اور اس کا ملک اور سارا نظامِ کائنات اور زمان یہ سب ایک ہیں۔ اسے ذہنی سکون آفاقی سناٹے میں حاصل ہوتا ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے۔ فقیری، سخت کوشی اور غربت اب بھی اورینٹل کلچر کے آدرش ہیں۔

مغرب کا آدرش وہ باغی لوسی فر ہے جو اپنی خودی کے بل پر آفاق سے ٹکر لینے کے لئے تلا رہتا ہے۔ اپنے استادوں سے آگے نکلنا چاہتا ہے

مشرق کا انسان اپنے استاد، اپنے گرو کے ساتھ ہی رہنے کا متمنی ہے۔

مغرب کا انسان پُراسرار اور غیر منطقی چیزوں سے خائف ہے۔ اسے تفریح میں اندرونی مسرت نہیں ملتی۔ وہ خوشی کے متعلق باتیں کرتا ہے مگر خوشی محسوس نہیں کرتا۔

انسان کی کسی جگہ سے تعلق حاصل کرنے کی، کسی گروہ میں شامل ہونے کی حاجت کو مشرقیوں نے زیادہ آسانی سے حل کر لیا ہے۔ وہ آرام سے اپنے ماحول، اپنے خاندان، برادری، طبقے اور قوم میں شامل رہتے ہیں۔ ہم کو اس شرکت کے لئے ممبر شپ کارڈ، ڈپلوما، چرچ کی رکنیت کا لیبل اور شادی کا لائسنس درکار ہے۔ ٹیلی وژن دیکھتے وقت ہماری تنہائی سب سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ ہمارے اندرونی کھنچاؤ کو کم کرنے کے لئے گروہ کا سہارا بھی ہمیں میسّر نہیں ———

اب ٹیکنولوجی اور انفرادیت پرستی دونوں کی لہر مشرق میں داخل ہو چکی ہے لیکن کیا مشرق اور مغرب قریب آسکیں گے؟ انسان انسان سے مل سکے گا؟ غریب امیر سے؟ مسرت احساس سے تعلق پیدا کر سکتی ہے؟

مذہب یا فلسفے کے بجائے انسان کی طاقت اور دولت کی تلاش اور حرص نے دنیا کو تقسیم کر رکھا ہے۔

- چینیوں، روسیوں، کمیونسٹوں، اہلِ پیرس، عربوں، یہودیوں، ہسپانیوں اور جاپانیوں وغیرہ کے متعلق جو متعصب تصورات ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں ان کے زائل ہونے میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔ موجودہ سرد جنگ اور اس کے پروپگنڈے نے ان متعصب تصورات کو بے حد ہولناک طور پر بڑھا اور پھیلا دیا ہے“

اسی روز لکھنے والوں کے دوسرے گروہ نے امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس کی زیرِ صدارت جمالیاتی اقدار پر تبادلہ خیالات کیا۔

جاپان کے مسٹر ای ای تو نے کہا ———

”چیکوسلواکیہ کے نمائندے مسٹر اڈولف ہوف میسٹر نے آج ایک اخبار میں لکھا ہے۔ جاپانی مصوری کے متناسب اور جاندار خطوط دیکھ کر

پتہ چلتا ہے کہ تنظیم اور فولادی ہماری اس قوم کی فطرت میں داخل ہے۔

یہی سبب ہے۔ تنظیم کا یہی احساس آپ کو نظموں کی بحر اور اوزان، افسانوں کے اسٹائل میں ملے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایک بے حد کم آمیز اور جابر قوم خیال کئے جاتے ہیں۔

موت کے متعلق ہمارے رویئے کو بھی بہت حیرت انگیز سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جاپانی مرنے کی بالکل پروا نہیں کرتے اور خودکشی ہمارے معاشرے کا خاص انسٹیٹیوشن رہا ہے۔ موت سے ہم کنار انسان کو زندگی بے حد صاف نظر آتی ہے۔ اس کا اثر آپ ہماری مصوری میں دیکھئے جہاں سفید پس منظر کے مقابل میں صرف ایک پھول، ایک چٹان، ایک پہاڑ یا ایک انسانی شکل آپ کو نظر آئے گی۔ یہ سفید بیک گراؤنڈ فنا اور عدم وجود کی علامت ہے۔ یہی ہمارا بدھ فلسفہ ہے۔

گو جاپانی گروہ کے احساس سے محروم ہیں لیکن ان کو اپنے خاندانوں اور دوستوں سے بہت انسیت ہے۔ ایک قوم جو ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک دور افتادہ جزیرے میں رہتی ہے۔ اسی تنہائی کی وجہ سے وہ اپنے گھر اور اپنے باغات کو سجا کر رکھتی ہے لیکن اجنبیوں سے اسے زیادہ مروت نہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانی سپاہیوں کے طرزِ عمل کا پس منظر یہی تھا۔

جاپانی فنکار اسی بدھ فلسفے کے زیرِ اثر سوسائٹی سے بھاگ کر تنہائی میں پناہ لیتا ہے۔“

پال تبوری نے کہا ——

میں ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا جہاں مشرق یا مغرب میں سے ایک کا انتخاب ایک ہزار سال سے ایک بنیادی مسئلہ رہا تھا۔ ہنگری کو ایک ہزار سال تک اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ آیا وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل ہے، مشرق کے خلاف ایک فصیل ہے یا دونوں کے لئے ایک پھاٹک کا کام دیتا ہے۔

ایک مگیار سے اگر یہ کہا جائے کہ اس کا ملک بلقان کا ایک حصہ ہے تو وہ لڑ مرے گا۔ ہمارے لکھنے والوں نے پیرس، فلورنس اور میونخ کو اپنا روحانی وطن سمجھا اور اپنی قوم کی مشرقی ذہنیت سے بے حد نالاں رہے۔ ان کے نزدیک مشرقی ذہنیت کاہلی، بے ایمانی، ناکارہ پن اور جہالت کے مترادف تھی۔

ان لکھنے والوں کا یہ غم و غصہ بہت حد تک حق بجانب تھا۔ ہم نے بازنطیم سے تھوڑا بہت حاصل کیا مگر ہنگری کا صرف ایک بادشاہ صلیبی جنگوں میں لڑنے کے لئے گیا تھا اور وہاں سے مایوسی کے علاوہ اور کچھ ساتھ نہ لایا۔ ہمارے لئے مشرق صرف تباہی کا منبع تھا۔ تاتاریوں کے حملے اور قتلِ عام، ترکوں کا تسلط۔ ہم ڈیڑھ سو سال تک عثمانیوں کے غلام رہے اور اس عرصے میں ہماری تہذیب بالکل برباد ہو گئی۔ ہمارے نشاۃ ثانیہ کو دو سو سال تک انتظار کرنا پڑا۔ ترک تسلط کے دوران میں ان کی کاہل اور ظالمانہ حکومت اور آرٹ اور لٹریچر کی طرف سے ان کی مکمل بے اعتنائی نے ہمارے اندر غیر ملکی اقتدار کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی سلب کر دی۔ ہنگری کی تازہ صورتِ حال کی جڑیں دراصل اس وقت میں پہنچتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہنگرین قوم کے دل میں مشرق کے لئے عجیب قسم کی تمنا جاگزیں رہی۔ ساری اقوام اپنی نوجوانی کے عہد کا فردوسِ گم شدہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اپنے باغِ عدن کے خواب دیکھتی ہیں۔ مگیار وسط ایشیا سے آئے تھے۔ مدتوں ہمارے بہت سے ہم قوم اپنے ایشیائی رشتہ داروں کی تلاش میں سرگرداں چین، تبت اور افغانستان اور ایران میں مارے مارے پھرے اور اب تو پچھلے بارہ سو سال سے ہنگری کی کلچر کا رخ جبری طور پر مشرق کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

[illegible] اپنے پہلے ہماری ادب میں جانا جاتا ہے کہ ساز گیت کا بیہودہ سے کہتا ہے اس سے قبل کہ ترک اگلے مسل
ڈالیں اسے یہاں سے [illegible] ان لوک گیتوں میں ان ہنگرین فقیروں کی فریاد ہے جنہیں ترکوں نے اغوا کیا یا مار ڈالا۔ ڈھائی سو سال تک ترکوں کے
خلاف جنگ سے [illegible] لوک گیتوں میں رنگ بھرا۔ ایک سولھویں صدی کے شاعر نے کہا ——

ترک کا عقیدہ ہے
کہ کسی عیسائی کو وہ دھکا دے کر خوار کر سکے
تو صلے میں اسے جنت ملے گی

اس طویل اذیت ناک جدوجہد کے بعد ہنگرین اور ترک ایک دوسرے کی عزت کرکے امن کے ساتھ رہ سکے۔ سترھویں صدی کے آخر میں تو ہنگری میں ترکوں کے لئے گہری ہمدردی پیدا ہو چکی تھی اور بہت سے ہنگرین وطن پرستوں کے لئے جو اپنے زیادہ خطرناک دشمن یعنی ہیپس برگ تسلط سے لڑ رہے تھے، ترکی کا لشکر جائے پناہ ثابت ہوا۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں شاعر اور کیتھولک راہب پال آنیوس نے مغرب کو مشرق کے جھوٹ اور کھوکھلے پن سے بچنے کے لئے آگاہ کیا۔ اس وقت والٹیر کے زیر اثر سارا یورپ مشرق کے رومان سے مسحور ہوا جا رہا تھا۔
وہ سمت کھو کر چرواہوں کے جھونپڑوں والا ریگستان بڑا خوبصورت ہے — اس نے کہا ——

کیا لندن اور پیرس میں عظیم ترین عقلی شاہکار تخلیق نہیں ہوئے
کلیست اور کورنیل مغلوں کے
ہندوستان ہرگز نہیں گئے تھے
تم جس نے وی آنا کے محل دیکھے ہیں
تم الجزائر کے وحشیوں کے خیموں کو واقعی پسند کر سکتے ہو؟

لیکن ایک اور ہنگرین شاعر نے مشرق کی عظمت کے گیت گائے اور اس وقت کی بشارت دی جب مغرب کو زوال اور مشرق کو دوبارہ عروج حاصل ہوگا۔ یہ شاعر سوکوناٹی حافظ شیراز کا بڑا پرستار تھا۔

ہمارے عظیم ترین جدید شاعر اینڈرے آدی کے کلام میں اس روحانی رشتہ کشی کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اپنے محبوب پیرس کو خدا حافظ کہہ کر اپنے پیارے وطن واپس جا رہا ہے ——

دگا —— پیرس —— گا ——
اجنبی جسے تو نے اپنا لے پالک بنایا تھا
اپنے وطن واپس جا رہا ہے جہاں گیت پیدا نہیں ہوتے
اس پر نرس کہا ——
مجھے تو ہنگری کی آواز ابھی سے سنائی دے رہی ہے
فقیروں کی ٹولی کی صدا ——

وہاں کے پھولوں کی مہک میں نفرت ہے
زمین پر ایک لعنت طاری ہے
ان کھیتوں پر جنھوں نے سبزہ جھڑ دیا
سورج کی کرنوں کا گذر نہیں
لیکن اس کے باوجود میں جاتا ہوں
کیونکہ اپنی قسمت کو کوئی رد نہیں کر سکتا
میں وہیں پر مروں گا
وہ شہر نے بادل اور وحشت ناک ویرانہ
میری روح میں خنجر کی طرح اتر رہا ہے'

دوسری نظم میں وہ شیطان اور شراب کے دیوتا 'گویا —— مشرق کے مکمل اوتار —— سے مخاطب ہے :

'اس جدید زمانے میں میرے ساتھ بیٹھنے کے لئے
وہ اودی عبا میں ملبوس، گھوڑے پر سوار
ہاتھ میں ستار لئے، صبح سویرے
مشرق سے نکل کر میرے پاس آیا
وہ ابدی کلبیت پرست ہے
مشرق مسرور تھا
لیکن موجودہ زمانے میں اس کی مسرت کا خاتمہ ہو گیا!
اب کہ وہ مستقبل کو اپنی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں سمیٹے
شراب سے بھیگے میز پوش پر ناچتا ہے
شیطان بحث کئے جا رہا ہے

اس طویل بحث کے دوران شاعر اپنے پھٹے ہوئے کوٹ میں سکڑتا "اونگھتا رہتا ہے۔ سُرخ شراب بہتی جاتی ہے۔ میز پر ایک صلیب کے سامنے دو موم بتیاں جل رہی ہیں۔

'ہم دونوں کے درمیان یہ جھگڑا بابل کے زمانے سے چل رہا ہے
میرے کسی فضول خرچ پُرکھے نے
اسے معلق باغات کے نیچے گاتے ہوئے سُن لیا ہوگا
اور اس دن سے لے کر آج تک
ابدی کلبیت پرست
میرا خدا، میرا باپ اور میرا بادشاہ ہے'

[illegible] کا جو اعزاز کے لئے یہ بحث ختم کرتے ہوئے میں وہ اسے اپنا [illegible] پیش کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن [illegible] [illegible] سے شعر اس سے پہلے زمین اپنی آزادی واپس ملنے کی درخواست کرتا ہے۔ وہ شراب اور مشرق کے گوشے [illegible] کرتا جاتا ہے۔ اس ملک کے سرچشمے کی طاقت ہی سلب کر لینے کے بعد وہ انہیں مفت اس سے رخصت ہوتا ہے،

چنانچہ وہ مشرق سے نکل کر
اپنی کاٹ دار دین تلوار کے ساتھ
مغرب سے نئی لڑائیاں لڑنا چاہتا ہے
میں صلیب کو مضبوطی سے پکڑ کر
گر چکا ہوں، میرے جسم کی گرمی جاتی رہی ہے
ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے درمیان
میز کے نیچے پڑے ہوئے
میرے چہرے پر ایک منجمد مسکراہٹ ہے!

یہ نظم محض اشارتی ہی نہیں تھی۔ اس کا ملک جس طرح براؤن جابروں کے قبضے میں آیا تھا اسی طرح آج سُرخ آمریت کے مظالم سہہ رہا ہے لیکن ہنگری کے روحانی ورثے کو جو مشرقی تھا کوئی وطن پرست نظر انداز نہ کرنا چاہتا تھا۔ ایران کے نغمے، ترکی کی مزاحیہ کہانیاں، ہندوستان کی داستانیں اس کے دروازوں سے اندر داخل ہوئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مشرق اور مغرب کا فرق بالکل مصنوعی ہے۔ عربوں کے بغیر اسپین کے آرٹ اور لٹریچر میں کیا باقی رہ جاتا ہے؟ کیا شمالی اقوام نے اسکینڈی نیویا اور قسطنطنیہ کے درمیان ایک تہذیبی شاہراہ قائم نہیں کی؟ کوئی کلچر دوسری تہذیبوں سے کٹ کر الگ تھلگ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ ایسا کرنا چاہیں تو آپ کی کلچر مرجھا کر ختم ہو جائے گی۔"

بلغاریہ کے کمیونسٹ ادیب بورس ڈیلچیف نے کہا ——

"اس وقت جب کہ ہم سب جاپان میں جمع ہوئے ہیں، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس ایک نام کا تذکرہ کروں —— ہیروشیما —— پچھلے بارہ سال سے ہیروشیما محض ایک شہر کا نام نہیں رہا ہے بلکہ انسانی ضمیر کا سمبل بن چکا ہے۔ یہاں ہمارے عہد کی ایک ایسی روحانی حقیقت ملتی ہے جو تخریب کو تعمیر سے، کلچر کو غیر کلچر سے، انسانیت کو درندگی سے جدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس نے اچھے ادیبوں کو برے ادیبوں سے علیحدہ کر کے دکھایا ہے۔ ہمارے عہد کا اچھا ادیب وہ ہے جو اس خطرے کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے جو ہزاروں انسانوں کے سروں پر اٹھی طاقت کی وجہ سے منڈلا رہا ہے۔ یہ ادیب اپنے قلم کے ذریعے انسانیت کو ہیروشیما سے بچانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس کے سیاسی اور مذہبی نظریات چاہے کچھ بھی ہوں۔ یہ ہر انسان، ہر فنکار کا فرض ہے —— ہمارے عہد کے ادیب کا کام محض جذبات اور واقعات کی داستان گوئی ہی نہیں وہ اپنے لوگوں کی مصیبتوں سے بے نیاز زندگی کا غیر جانبدار تماشائی نہیں رہ سکتا جیسا کہ ڈرائنگ روم کے ادب کے مداحین کا خیال ہے ——"

سیشن کے بعد جنوبی کوریا والے میرے پاس آئے۔ "ہمارے ساتھ تصویر کھنچوائیے۔" انہوں نے کہا۔ مشرقی جرمنی کے بوڈو اوزے میرے پاس کھڑے تھے، ان سے بھی درخواست کی۔ "مگر میں تو مشرقی جرمنی کا ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ تصویر

گئی تھی۔ نہ جانے جنوبی کوریا والے اس گروپ کا اب کیا کریں گے۔ انہوں نے اپنی حکومت کے خرچ پر مجھے جنوبی کوریا چلنے کی دعوت دی اور بے حد مصر —— میں نے معذرت چاہی۔ "میرے پاس ویزا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "علاوہ ازیں مجھے اپنی حکومت سے اجازت لینا ہوگی اور میرے پاس دراصل وقت بھی نہیں ہے۔"

"اجازت ہم دلوا دیں گے، آپ کو ضرور بالضرور چلنا ہوگا۔ یہاں سے ہم بہت سے یورپین اور امریکن مصنفین کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔"

شام کو ایک [illegible] کے دوران میں میں نے شری واتسائن سے پوچھا۔ "آج صبح ڈاکٹر آئنگر نے ہندوستان میں اردو ادب کی تخلیق کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ تخلیق ان حالات میں پنپ سکتی ہے جو اس وقت وہاں اردو کے لئے پیدا ہو گئے ہیں؟" یہی سوال میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب موصوف سے بھی کیا تھا۔ وہ اس مسئلے پر بہت دکھی تھے۔ "زبان کے معاملے میں لوگ دیوانے ہو گئے ہیں، بالکل دیوانے ہو گئے ہیں۔ آج برصغیر میں زبان کے معاملے میں جس قدر نفرت سے کام لیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر دل لرزتا ہے۔" ڈاکٹر آئنگر نے اداسی سے کہا تھا

شری واتسائن نے مجھ سے کہا۔ "—— الٰہ آباد کی ہندوستانی اکیڈمی کی طرف سے ہر سال اردو اور ہندی کی کتابوں کو انعام دیا جاتا تھا۔ اب کے سے یہ طے کیا گیا کہ آئندہ صرف ہندی ہی کا کام ہوگا۔ اردو میں تصنیف و تحقیق کا سلسلہ اب ختم کر دینا چاہئے۔ صرف ایک میں تھا جس نے اس تجویز کے خلاف ووٹ دیا۔ مگر خالی میرے ووٹ سے کیا ہو سکتا ہے"

"کمال ہے۔ فلموں کی زبان خالص اردو ہے، مشاعروں کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو کے شعراء کا کلام ہندی میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ مرزا غالب کو گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔ کانفرنسیں ہوتی ہیں جن میں بار بار استدعا کی جاتی ہے کہ اردو کی حق تلفی نہ کی جائے —— مگر حکومت کی پالیسی ......"

"کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" ایک انگریز ادیب نے قریب آ کر خوش دلی سے میری بات کاٹی۔

"کچھ نہیں۔ ہم اپنے خاندانی جھگڑوں کا تذکرہ کر رہے تھے" —— مجھے یاد آیا کل شام مسٹر رائے نے ایک امریکن کو جواب دیا تھا، مگر مجھ سے یہ بھی نہ کہا گیا۔ لعنت ہو ایسے خاندان پر اور ان جھگڑوں پر، زندگی اسی رونے پیٹنے میں بیتی جا رہی ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا، ہندو کلچر اور مسلم تہذیب کا جھگڑا، کشمیر اور نہری پانی کا جھگڑا —— مجھے یک لخت بے انتہا شدید کوفت محسوس ہوئی۔ وہ کوفت جو اب زندگی کا خاصہ بن گئی ہے۔ برٹش کونسل کے ہال میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ لوگ کاک ٹیل کے گلاس ہاتھوں میں لئے ہنس بول رہے تھے۔ میں اور شری واتسائن اس سارے ہنگامے سے علیحدہ ہال کے ایک سرے پر کھڑے اپنے "خاندان" کے دکھ سکھ کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے کیا حق ہے —— میں سوچ رہی تھی —— کہ میں باہر کے ملکوں میں آ کر لمبے لمبے سفید جھوٹ بولوں۔ "کلچر" اور "امن" اور "زندگی کی اعلیٰ اقدار" اور "سچائی" اور "ایمانداری" پر تقریریں کروں۔ اس کام کے لئے سفارت خانے اور امیروں وزیروں کے وفد کافی نہیں —— ؟ کلچر اور زندگی کی اعلیٰ ابدی اقدار —— ! میرے پس منظر میں تو صرف روح کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے دکھ ہیں۔ جھوٹ اور ریاکاری کی فصیلیں میرے چاروں اور کھڑی ہیں۔

مجھے ان لوگوں سے کیا مطلب ہے جو کاک ٹیل کے گلاس ہاتھ میں لئے اونچی اونچی باتیں کر رہے ہیں؟

شری واتسائن بڑی نفیس لکھنوی اردو بولتے ہیں۔ گو پنجاب کے رہنے والے ہیں، گورکھپور میں پیدا ہوئے، لکھنؤ میں پلے بڑھے، اب الٰہ آباد اور دلی میں رہتے ہیں۔ مجھے ویسے بالکل ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرح کے مسلمان قوم پرست انٹلکچوئل معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی ادبدا کر وہی سوال کیا جو پچھلے سال ہندوستان میں ہر ملنے والے نے مجھ سے کیا تھا —— "جوش صاحب کے پاکستان میں کیا حال چال ہیں؟" —— اب میں واتسائن جی کو کیا بتاؤں

کروشی صاحب کے بچے کیا حال چال ہیں۔ مجھے واقعی ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔

ہم چار [illegible] نشیمن میں بوڈو اوزے سے مل گئے۔ "چلو!" انہوں نے کہا "کسی خاموش جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔"

پہلے چیک ادیب کو ساتھ لیا اور ساتھ ہی پل واپس آ گئے۔

تہ خانے کے گول ہال میں ابھی سناٹا تھا۔ اکا دکا امریکن کروشی پی ادھر ادھر بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ ہم تینوں ایک خاموش کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ "آج تم نے کس کس کے کارٹون بنائے؟" میں نے چیک ادیب اڈولف ہوف میسٹر سے اداسی سے پوچھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا کاغذ کے ٹکڑے پر لکیریں کھینچتا رہا۔ اڈولف شاعری، ڈرامے اور ناول کی پینتالیس کتابوں کا مصنف، پراگ کی چارلس یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف لاز، بین الاقوامی شہرت کا کارٹونسٹ جس کی تصاویر ماسکو کے علاوہ نیویارک کے میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں بھی موجود ہیں۔ اس وقت جانے کس گہری سوچ میں مستغرق بیٹھا تھا۔

"مجھ کو کشمیر کے متعلق تازہ ترین صورتِ حال سے مطلع کرو ———" اس نے اسی طرح منہ لٹکائے ہوئے کہا۔

"تمہاری کٹھ پتلیوں کی فلموں کا کیا حال ہے؟" میں نے ذرا غصے سے جواب دیا۔

"اچھا ——— اچھا ——— کشمیر نہیں ——— کچھ کلاسیکل رقص پر روشنی ڈالو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

بوڈو اوزے نے بھی بشاشت نظر آنے کی کوشش کی۔

اڈولف جنگ کے زمانے میں گسٹاپو سے بچ کر فرانس پہنچا لیکن وہاں جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہاں سے بھاگ کر مراکش اور پرتگال ہوتا ہوا امریکہ پہنچا۔ جنگ کے خاتمے پر پراگ واپس لوٹا اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک فرانس میں جمہوریہ چیکوسلواکیہ کا سفیر رہا۔ اس کے بعد کئی سال تک اقوام متحدہ میں چیکوسلواکیہ کی نمائندگی کرتا رہا۔ اب پراگ اکیڈمی آف ڈیکوریٹو آرٹس میں متحرک کارٹونوں اور کٹھ پتلیوں کے فلم کا پروفیسر ہے۔

کل اس نے میرے جانے بغیر میرا کارٹون بنایا تھا جو آج صبح کے اخباروں میں چھپا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا کانفرنس کے مندوبین کے کارٹون بنایا کرتا جو روزانہ ٹوکیو کے انگریزی اور جاپانی پریس میں دھوم دھام سے شائع کئے جاتے۔

بوڈو اوزے مشرقی برلن میں رہتے ہیں فلم بناتے اور ناول لکھتے ہیں۔ دس بارہ سال میکسیکو اور امریکہ میں رہے ہیں۔ جنگ کے اختتام پر امریکہ میں رہ جانے کے بجائے مشرقی جرمنی واپس آ گئے۔

"آپ نے کس قدر اُلٹی بات کی۔ آپ نے آزادی کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ اچھے خاصے امریکہ میں رہتے تھے۔ اُلٹے آہنی پردے کے پیچھے واپس آ گئے ——— اسے خلل دماغ کہتے ہیں ——— میں پوچھتی ہوں آزادی کا انتخاب کیوں نہ کیا آپ نے جناب والا ———؟" میں نے اور زیادہ غصے سے کہا۔

"ہم نے مستقبل کا انتخاب کیا ———" انہوں نے جواب دیا۔

"آپ کی امریکن بیوی نے کس طرح اپنے آپ کو کمیونسٹ سوسائٹی کا عادی بنایا ———؟"

"شروع شروع میں تو وہ بہت گھبرائی لیکن اب بے حد خوش ہے ———"

"اجی ہاں! خاک بے حد خوش ہے ——— روتی ہوگی اپنی جان کو ———" میں نے کہا ——— اب میری بشاشت بھی واپس لوٹ رہی تھی ———

اڈولف نے خوش ہو کر ویٹر کو آواز دی۔

"جب میں پہلی بار امریکہ گیا ———" اڈولف نے کہنا شروع کیا ——— "تو مجھے بڑا عجیب لگا ——— مثلاً جب میں نے امریکنوں کو اپنے دوستوں سے کہتے سنا ——— "آؤ میں تم کو ایک ڈنر خرید دوں" ——— یا "میں تمہارے لئے ایک ڈرنک خریدتا ہوں" ——— ہم لوگ کہتے ہیں ——— "آؤ میرے ساتھ

کھانا کھاؤ تو ـــــ پلیٹ ٹھیک کرو۔" اس میں خرید کر دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں انسان کی قدر و قیمت ڈالر سے لگائی جاتی ہے۔ فلاں پچیس ہزار کا آدمی ہے۔ فلاں ساٹھ ہزار ڈالر کا سوال ہے ـــ وغیرہ ـــ مگر امریکن درحقیقت بہت اچھے لوگ ہیں، دل کے برے نہیں۔ بس ان میں بچپنا ذرا زیادہ ہے۔ اگر یہ کمیونزم کی دہشت ان کے اعصاب پر اتنی سوار نہ ہوتی ـــ تو کیا پیارے انسان ہیں۔ دنیا کے سارے دوسرے انسانوں کی طرح۔"

اب برابر کی میز پر ڈوس پیسوس، جان ہرسی اور اشٹین بک آن بیٹھے۔ دوسری طرف البرٹ مالٹس تنہا بیٹھے تھے ـــ اڈولف ان سب کو منہ لٹکائے دیکھا کیا۔

"پچھلے سال جب میں دلی گیا اور میں نے ایشیائی کانفرنس دیکھی ـــ" بوڈو یوزے نے کہا ـــ "تو مجھے اندازہ ہوا کہ سارا ایشیا درحقیقت ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ سارے ادیب جو بحثیں کر رہے تھے، مشاعرے سن رہے تھے دراصل ایشیائی انسان تھے۔ گو یہ لوگ انگریزی بول رہے تھے مگر ان کی حرکات و سکنات، ردِ عمل، ماحول ہر چیز خالص مشرقی تھی۔ میں فیض سے بھی ملا جو پاکستان سے آئے تھے۔"

وہاں سے بات دوبارہ ہٹلر کے زمانے تک پہنچی اور عوامی محاذ اور اسپین کی خانہ جنگی ـــ

پھر اڈولف اور بوڈو یوزے اپنے اپنے لڑکپن کا ذکر کرتے رہے۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ میں پرشیا کے مشہور فوجی خاندان کا فرزندِ ارجمند تھا ـــ اور تم ـــ" بوڈو یوزے نے خوشدلی سے پوچھا ـــ "تمہارے باپ کے یہاں ہاتھی جھومتے ہوں گے ـــ؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "سفید ہاتھی۔ ہماری کلچر کا ایک بڑا سا سفید ہاتھی تھا جس پر ہم سب سوار تھے۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس نے زور سے اپنی سونڈ اٹھا کر ایسی پٹخنی دی کہ ہمارا سونے کا ہودہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔"

میں نے جھانک کر دیکھا ـــ اڈولف میز پر رکھے ہوئے سرویٹ پر ہاتھی کے اس منظر کا کارٹون بنا چکے تھے۔

اگلے روز صبح جاپان کے مصنف کوجی رویتری ناوا ادبی سیشن کی صدارت کر رہے تھے۔

جنوبی کوریا کے ان سوب زونگ نے کہا ـــ

"کوریا انیسویں صدی کے آخر میں مغربی لٹریچر سے متعارف ہوا۔ اس وقت کورین قوم تین بڑی طاقتوں کے حملے کے خطرے میں تھی چین، روس اور جاپان ـــ آخر الذکر نے اسے اپنا غلام بنا لیا۔ ۱۹۱۰ء میں جاپانی قبضے کے بعد سے حاکم قوم نے کوریا کے نیتاؤں کے علاوہ ہمارے دانشوروں پر بھی انتہا درجے کے ظلم توڑے۔ کورین لیکھکوں کو تحریر و تقریر کی آزادی سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔ اس کے باوجود کورین ادیب اپنے قلم کو جاپانی شہنشاہیت کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ جدید کورین ادب آزادی کے لئے اسی جدوجہد کی پیداوار ہے۔

کوریا کی تاریخ آج سے سوا چار ہزار سال قبل سے شروع ہوتی ہے۔ کورین قوم چینیوں اور جاپانیوں دونوں سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہے۔

لیکن ان ہی کی مانند روحانیت کی دلدادہ اور رمزیت پرست رہی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب کوریا ہی کے راستے جاپان پہنچی۔

جاپانی جابروں نے ہمارے لکھنے والوں پر ایسی ایسی سختیاں کیں جن کے تذکرے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ہمارے جاپانی حکمرانوں نے ہمیں اپنی قومی زبان استعمال کرنے کی بھی ممانعت کر دی تاکہ دنیا کی تمدنی تاریخ سے کوریا کے باب کا ایک سرے سے نام و نشان ہی مٹ جائے۔ جاہل کوریا کو مغربی زبانیں سیکھنے کی بھی اجازت نہیں رہی لیکن اس کے باوجود کورین ادیبوں نے انڈر گراؤنڈ طور پر اپنی جدوجہد

جاری رکھی۔ اس زمانے میں ایک شاعر نے "دردِ دل" کے عنوان سے کہا ——

'سمندر کے وسط میں ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے
رات کے سمندر پر یکساں تاریکی چھائی ہے
او آزادی —— !
میری زمین پر ابدی الم کا تسلط ہے
او شاعری کے پرندا
تو سمندر پر سے روتا ہوا پرواز کر رہا ہے
آج کی رات
میں 'نوحہ گر' ایک تنِ بے جان کی مانند
تیرے ساتھ ساحل پر جاؤں گا'

چالیس سال کے اس قبضہ کے دوران جاپانی غاصب کوریا کے سارے تہذیبی خزانے لوٹ کر اپنے یہاں لے گئے اور اپنے ماضی کی وراثت کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں بچا۔ ہمیں یقین ہے کہ اب یہ چیزیں کوریا واپس لوٹا دی جائیں گی۔

جدید کوریائی ادب نیو آئیڈیلزم، نیچرل ازم، ڈیکیڈینس، رومانیت اور کلاسیکیت کے ادوار سے گذر چکا ہے۔ غلامی کی وجہ سے الم پرستی ہماری خصوصیت رہی۔

پندرہ اگست ۴۵ء میں کوریا جاپان کی غلامی سے آزاد ہوا۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد ہمیں دفعتاً معلوم ہوا کہ ہماری قوم کو اڑتیسویں عرض البلد کے ذریعے تقسیم کردیا گیا ہے۔ ۲۵ر جون ۵۰ء کو کمیونسٹوں کے حملے کے بعد سے تاریخ کی ہولناک ترین جنگوں میں سے ایک شروع ہوئی۔ بہت سے ادیب اس جنگ میں مارے گئے۔

کوریا عرصے سے پے در پے غیر ملکی مظالم اور اقتصادی مصائب کا شکار رہا ہے۔ اب کمیونسٹوں کی وجہ سے ہمیں چین نصیب نہیں۔ کمیونزم کے خلاف شدید جدوجہد ہمارے ادب کا نصب العین ہے۔"

پاکستان کے ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہا ——

"یہ واقعہ ہے کہ مشرق کی ادبیات کی طرف سوا چند ایک ماہرین کے عام طور پر مغرب نے مطلق کوئی توجہ نہیں دی۔ مشرق کو مغرب نے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ غلامی بڑی آسانی سے روح کی طاقتِ پرواز سلب کرلیتی ہے۔ پچھلے دو سو سال کی بندگی میں ایشیا نے اپنی خود اعتمادی کھودی اور عظیم ادب پیدا نہ کرسکا۔ علاوہ ازیں یہ بھی سمجھا جاتا رہا کہ مشرق مغرب سے بے حد مختلف بالکل ایک علیحدہ دنیا ہے۔

کل ہی کی محفل میں ایک صاحب نے یہاں فرمایا کہ ان کو جاپان میں بالکل ایک نئی کائنات نظر آئی۔

اگر یہ بات کسی عام آدمی نے کہی ہوتی تو بھی ٹھیک تھا۔ مگر ایک اہلِ نظر دانشور کا یہ کہنا کہ مشرق، مغرب سے بے حد مختلف ہے بہت عجیب بات ہے۔ مشرق کی بھی وہی دنیا ہے جو مغرب کی ہے۔ یہاں بھی ویسے ہی سربلند انسان بستے ہیں جیسے مغرب میں۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانی ناقابلِ فہم ہیں۔ میں یہاں ڈھائی سال سے ہوں۔ ان کو میں نے پاکستان، یورپ یا امریکہ کے انسانوں سے مختلف نہ پایا۔

مغرب نے ہمیں انسانی آزادی اور حقوق اور مساوات اور جمہوریت کے تصورات سے ایک وسیع پیمانے پر متعارف کرایا لیکن اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے قوم پرستی کا تصور بھی آیا —— اور نیشنلزم خصوصاً انتہا پسند شکل میں انتہائی خطرناک چیز ہے۔ اس کے علاوہ ہماری پرانی روایات اور عقیدے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ کسی نئی روایت یا عقیدے نے نہیں لی جو روح کے اس خلا کو پُر کر سکے۔ کیا ہمیں مغرب کوئی عقیدہ دے سکتا ہے؟ کمیونزم یا جمہوریت ایسی چیز نہیں ہیں جو روح کو گرما سکیں۔ کوئی ادب بغیر عقیدے اور یقین کے پروان نہیں چڑھ سکتا۔ تاریخ عالم میں صرف ان ہی ادوار نے اعلیٰ ادب تخلیق کیا ہے جن ادوار میں عقیدے راسخ تھے۔ عقیدے کی تباہی کلچر کی تباہی ہے۔ جو آرٹ یا لٹریچر کسی عقیدے کی بنا پر تخلیق نہیں کیا گیا اس کا حشر اچھا نہیں ہوا۔

لہٰذا وہ عقیدہ اب کہاں سے حاصل کیا جائے ——

وہ عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ انسانیت ایک ہے اور متحد۔ اگر آپ کسی رسمی عقیدے میں یقین نہیں رکھتے تو انسانیت کے ایکے میں یقین رکھئے۔"

اٹلی کے البرٹو موراویا نے کہا ——

"مشرقِ وسطیٰ، روس، چین اور اب جاپان کی سیاحت کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مشرق و مغرب کی تفریق بہت غیر واضح ہے اور ان کا اختلاف اقتصادی اور صنعتی ترقی کی مختلف سطحوں کی وجہ سے ہے۔ ہم لوگ ایک زبردست صنعتی انقلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ مشرق جسے "پسماندہ ممالک" کے عجیب و غریب نام سے یاد کیا جاتا ہے، پچھلے پچاس سال سے وہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مغرب اس سے قبل کر چکا ہے —— یعنی زرعی معاشی نظام کی جگہ صنعتی نظام قائم کرنے کی کوشش —— اسی کوشش نے خونریز انقلاب بپا کئے۔ "اسٹالنزم" بھی دراصل چند سال کے عرصے میں ایک صنعتی روس کے قیام کی تکمیل تھی۔ یہی کام یورپ نے سو سال میں کیا تھا —— روس دوسری ساری ایشیائی اقوام کو جس انقلاب میں گھسیٹ رہا ہے وہ نظریاتی نہیں صنعتی ہے۔ جاپان اس انقلاب سے مدتیں ہوئیں گذر چکا لہٰذا اس وقت وہ ایشیا کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید ترین ملک ہے۔ جب میں بیس سال قبل چین گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا اٹھارویں صدی کی اٹلی میں واپس پہنچ گیا ہوں۔ ہم لوگ دراصل وسعت کے بجائے وقت میں سفر کر رہے ہیں۔ امریکن مستقبل میں رہتے ہیں، دوسرے حال میں زندہ ہیں اور بہت سے ماضی ہی میں جیسے جا رہے ہیں (اکثر یہ ماضی زمانہ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتا ہے) جاپان میں ہمیں مستقبل اور حال اور ماضی اکٹھے نظر آ رہے ہیں۔

"ایشیا صنعتی انقلاب سے دوچار ہے۔ یہاں نئے روس کی تعمیر ہو چکی۔ نئے چین کی تعمیر جاری ہے۔

ہم ایشیا کو کیا پیش کر سکتے ہیں —— ؟ اٹلی کا نظریۂ کائنات اب بھی نشاۃ ثانیہ کی ہیومنزم پر مبنی ہے۔ اس نظریے کا مرکز ملک یا مذہب یا کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔ اس کا مرکز انسان ہے۔ یہ نظریہ آپ کو اٹلی کے شاہکار ادب کے علاوہ اٹلی کے فلموں اور ہم عصر تخلیقات میں بھی ملے گا۔ یہ نظریہ مشرق کے خیالات سے مختلف ہے مگر ہم اپنی طرف سے آپ کی خدمت میں اسے پیش کر سکتے ہیں۔"

سیشن کے بعد سانکی کائیکان کی اسی عمارت کے زیریں فلور پر شین ٹوکیو ریسٹوران میں جاپان کے وزیر تعلیم اور یونیسکو کے جاپانی نیشنل کمیشن کے چیئرمین کی طرف سے لنچ تھا۔ ریسٹوران کے وسیع ہال کے دریچوں میں سے ٹوکیو کی فلک بوس عمارات نظر آ رہی تھیں۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ نیچے بسیں اور ٹرامیں رینگ رہی تھیں۔ ٹوکیو دنیا کا سب سے پُرشور شہر ہے۔ میری میز پر برابر میں ڈاکٹر گلیسنیپ بیٹھے ہوئے تھے اور فلپائن کا ایک نوجوان صحافی جو اوبزرور کی حیثیت سے آیا تھا۔ میں ڈاکٹر گلیسنیپ کو دیکھتی رہی۔ یہ اسی سالہ بوڑھا جو انسان دوستی اور مشرق پرستی کی خاطر اتنا طویل سفر کر کے یہاں آیا۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتے۔ لیکن مجھ سے ہمیشہ آرکیالوجی کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ کس قدر پیارے اور شفیق بزرگ ہیں۔ فلپائن کا صحافی جس کا کوئی ماضی نہیں، کوئی قدیم زبان، قدیم تہذیب نہیں، چپ چاپ بیٹھا بنارس اور ویدانت پر ہماری باتیں سن رہا ہے اور کھانا کھا رہا ہے —— میں اور

ڈاکٹر طلیپ ایک روحانی اور جذباتی پس منظر میں شریک ہیں۔ یہ فلپینو دور کھڑا رہ گیا ہے۔ پھر اس نے دفعتاً مجھ سے کہا —" تمہارا کیا خیال ہے ——
کوریا والے کو ایسی تلخ باتیں نہ کہنا چاہیے تھیں ——"
ڈسکشن کے بعد ہر شخص یہی کہہ رہا تھا۔ کوریا کا نمائندہ جاپان میں آ کر اپنے میزبانوں کو آدھ گھنٹے تک آج گالیاں دیتا رہا۔ یہ چیز سب کے لئے
بے حد خجالت انگیز تھی)

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا —" اس اجتماع میں انگریز بھی ہیں جنہوں نے میرے برصغیر کی اقوام کو دو سو سال تک غلام رکھا اور چلتے چلتے ایسی چوٹ دے گئے جس کا تماشا تم پچھلے دس سال سے دیکھ رہے ہو —— اس محفل میں ان کے شکار بھی موجود ہیں جن کو آج کی بین الاقوامی اصطلاح میں انڈین اور پاکستانی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں ڈچ بھی ہیں اور انڈونیزین بھی اور مشرق میں ڈچ کولونیلزم کا ریکارڈ تاریک ترین ہے۔ انہوں نے انڈونیزیا کو صدیوں تعلیم تک کی روشنی سے جبراً محروم رکھا۔ یہاں عرب بھی ہیں اور یہودی بھی' فرانسیسی بھی ہیں اور انڈوچائنا والے بھی کمیونسٹ بھی ہیں اور امریکن بھی۔ پھر ہم سب کا میزبان جاپان ہے جس نے صرف چند سال قبل آدھے ایشیا کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور اب خود کس بُری طرح امریکہ سے پٹ چکا ہے۔ اس کانفرنس کے سارے نمائندے ایک دوسرے کے سابق دشمن رہ چکے ہیں یا اس وقت جانی دشمن ہیں۔ اگر یہ سب اپنا اپنا حالِ دل کہنے پر آئے تو تیسری جنگِ عظیم کی ساری تیاریاں اسی اسٹیج پر مکمل ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ ذہن پرست حضرات ہیں' پیشہ ور سیاستدان نہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ یہاں ایسی باتیں نہ سوچیں گے۔"

"کوریا صرف چالیس سال جاپان کے قبضے میں رہا ہے۔" فلپائن کے صحافی نے کہا۔ "مجھے دیکھو۔ میں نے چار سو سال تک اسپین کی بدترین غلامی کا مزا چکھا ہے۔ میں امریکہ کی کولونی رہ چکا ہوں ——"

بڑھے انڈولوجسٹ خاموش بیٹھے ہماری باتیں سنتے رہے۔ کالی داس اور اپنشدوں کی دنیا میں رہنے والے اس دانشور کو ہماری باتوں سے تکلیف ہو رہی تھی۔ پھر میں نے شنکر آچاریہ اور مادھو پر ان سے تبادلۂ خیالات شروع کر دیا۔ مگر وہ بہت دکھی نظر آ رہے تھے ۔

"پروفیسر —— جنگ کے زمانے میں آپ کہاں تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں؟ —— میں ٹوکیو ہی میں تھا —— لیکن اتحادیوں کی بمباری سے میرا سارا کتب خانہ تباہ ہو گیا۔ اب میں وہ بیش بہا سنسکرت نسخے کہاں سے لاؤں گا ——" وہ خاموش ہو گئے۔

"معاف کیجئے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "ہم پھر سیاست کے تذکرے میں الجھ گئے۔"

"ٹھیک ہے ——" انہوں نے بے حد شفقت سے جواب دیا۔ "میں تم نوجوانوں کے اس جوش کو اس بے پایاں تلخی کو سمجھتا ہوں" ——

"مشرقی پاکستان میں ابھی مینامتی کی کھدائی جاری ہے ——" میں نے موضوع بدلا۔

"ہاں —— ؟" انہوں نے خوش ہو کر پوچھا —— "کیا کیا نئے انکشافات ہوئے —— ؟"

میں نے ان سے بنگال کے چندر دیو خاندان کا تذکرہ شروع کر دیا۔ ہم دوبارہ آٹھویں صدی میں پہنچ گئے جو بے حد محفوظ تھی ۔

لنچ کے بعد ایک صاحب جو پاکستان سے آئے ہوئے تھے مجھ سے آہستہ سے بولے۔" دیکھا آپ نے —— ہمارے نمائندے نے نیشنلزم کے سلسلے میں انڈیا پر کیسی چوٹ کی —— لطف آ گیا —— !!"

باہر کوریڈور میں ایک نسبتاً کم عمر فرنچ کیتھولک اور ان کی بیوی میرے پاس آئے —— "ہم یہاں سے واپسی میں کراچی آ رہے ہیں۔ چند روز

وہاں قیام کرکے ہمارا ارادہ ہے کہ پاکستان پر ایک کتاب لکھیں۔ ہمیں پاکستان سے شدید محبت اور ہندوستان سے دلی نفرت ہے ـــــ پنڈت نہرو ہمارے خیال میں ایک بے حد بے ایمان اور گھٹیا سیاستدان ہے۔ ہمیں پاکستان بے حد پسند ہے۔"

"جی ـــــ" میں نے جواب دیا۔ "یہ سیاسی جھگڑے ہیں اور ہمیں امید کرنا چاہیے کہ بہت جلد ان کا کوئی قابلِ قبول حل تلاش کر لیا جائیگا۔ آپ تو انٹلکچوئل ہیں آپ کو نفرت کے مسئلے پر زیادہ سائنٹیفک طریقے سے سوچنا چاہیے۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میرے اس رویے سے ان کو جو مایوسی ہوئی وہ ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ انہیں توقع رہی ہوگی کہ میں یہ مژدہ جانفزا سننے کے بعد کہ وہ کراچی میں ایک ہفتہ قیام کے بعد پاکستان پر ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھنے والے ہیں، خوشی سے بیحال ہو کر انہیں کافی پلانے لے جاؤں گی۔

تیسرا پہر

اب ہم لوگ جاپان کا کلاسیکل ڈرامہ نوہ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں بھی حسبِ معمول ہمیں تھیٹر کے دروازے پر تحفوں کے پلندوں سے لاد دیا گیا ہے۔ ہال میں ہماری آمد کو ٹیلی وژن پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہال دوسرے تھیٹروں کی مانند بے انتہا شاندار اور الٹرا ماڈرن ہے۔ سامنے اسٹیج کی جگہ ایک بے حد خوبصورت چوبی مندر ایسا بنا ہے جس کے عقب میں سینری کے پردے کے بجائے ایک بہت بڑا پائن کا سبز درخت لکڑی کی دیوار پر منقش ہے۔ یہ درخت نوہ ڈرامے کا سمبل ہے۔ مندر کے ایک طرف لکڑی کا کوریڈور ونگ کی سمت جاتا ہے۔ ایک پل ایسا آڈینس کی نشستوں کے درمیان سے گذرتا ہے۔ سارا کھیل ان تین راستوں پر پیش کیا جاتا ہے لہٰذا تماشائی گویا کھیل میں شامل رہتے ہیں ـــــ

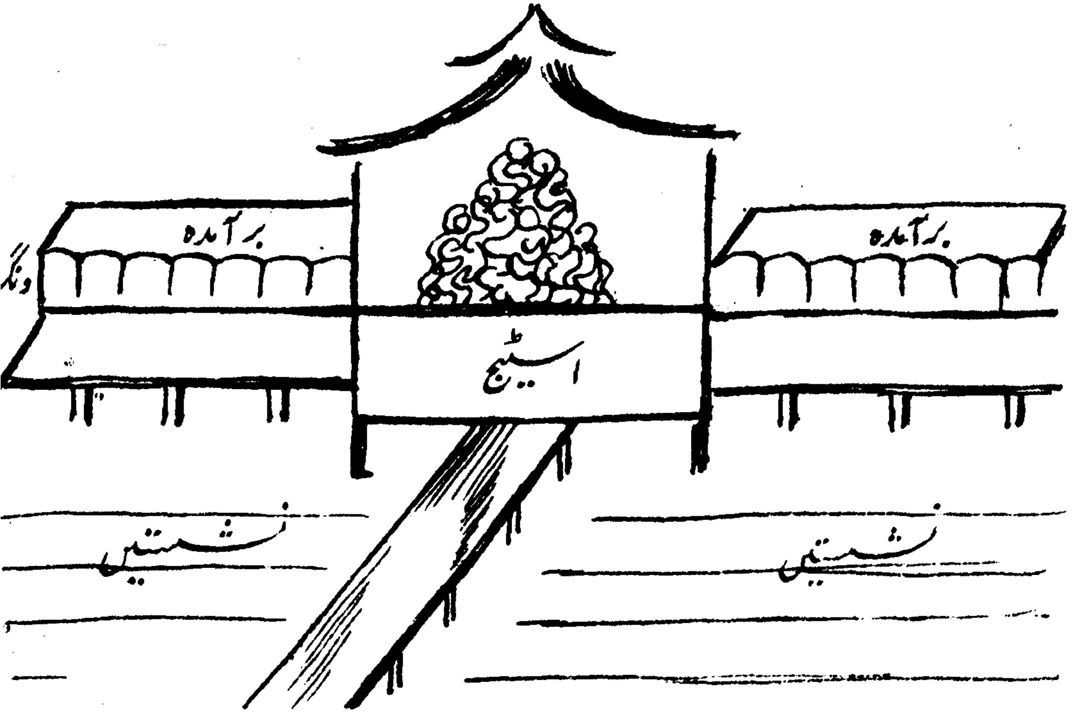

نوہ پر مغرب میں اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ نے کئی نوہ تمثیلوں کو ترجمہ کیا ہے مگر ہمارے ملک میں کسی کو اس کے رے بھی واقفیت نہیں۔ یہاں تھیٹر ہی سے کسے دلچسپی ہے۔ اللہ فلموں کو سلامت رکھے۔

یہ ایک ایسا عجیب و غریب تماشا ہے جو واقعی ہماری دنیا میں شامل نہیں معلوم ہوتا۔ سارا ڈرامہ چین کی طرح سمبلزم پر مبنی ہے۔ سارے وقت یاہ کپڑوں میں ملبوس کورس پس منظر میں موجود رہتا ہے۔ ایکٹر حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر مکالمہ ادا کرتے ہیں۔ یہ آوازیں بس سننے سے تعلق تی ہیں۔ مکالمے کے دوران میں کورس کے دو اشخاص تھوڑی تھوڑی دیر بعد انتہائی بے سُری بانسری بجاتے اور ڈھولکی پیٹتے جاتے ہیں (معلوم ہوا کہ ڈھولکی بھی نوہ کا ایک بڑا زبردست فن ہے اور اس کے چند مشہور ڈھولکی نواز گویا جاپان کے احمد جان تھرکوا اور نتھو خاں کا درجہ رکھتے ہیں) جاپانی موسیقی کی مخصوص میں تعریف نہیں کر سکتی۔ بے سُری، بے ہنگم آوازوں اور انتہائی غیر ترقی یافتہ سیدھے سادے چند سازوں پر مشتمل گویا جاپان کی قومی اور کلاسیکل موسیقی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی ایک قوم سارے ہی فنون لطیفہ کی استاد ہو جائے۔ ان کی موسیقی اور رقص سے خدا پناہ میں رکھے (معاف فرمائیے گا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ یہ فخر صرف اس برصغیر ہی کو حاصل ہے جہاں اجنتا ہو مائیورا اور سانچی بھی ہے اور مغل مصوری بھی۔ بھارت ناٹیم اور کتھک بھی ہے اور دنیا کی مشکل ترین اور خوبصورت ترین کلاسیکل موسیقی بھی۔ اسے آپ غیر ضروری قوم پرستی کہہ لیجئے یا شاونزم، مگر یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فرق البتہ یہ ہے کہ ہمارے عظیم موسیقار عموماً بھوکوں مرتے ہیں اور میراثی اور ڈوم ڈھاڑی اور طبلچی کہلاتے ہیں اور جاپان میں بے سُری ڈھولکی بجانے والے کو قومی ہیرو سمجھا جاتا ہے اور اس کے فن پر کتابیں تصنیف ہوتی ہیں)

نوہ کو اکثر قدیم یونانی ڈرامے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اکثر ایکٹر ماسک پہنتے ہیں، مرد عورتوں کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کورس اس ڈرامے کا بڑا نمایاں حصہ ہے جو ایکٹروں کے مکالمے کے ساتھ ساتھ روتا گاتا رہتا ہے۔ پورا ڈرامے کی ایک Ritnal کی سی کیفیت ہے۔

ان کی کوسٹیومز انتہائی بھڑکیلی اور پچھلی صدیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے والا عظیم ترین نوہ ایکٹر (جو بہت بوڑھا ہے) ماسک پہنے کوریڈور میں سے گذرتا اسٹیج پر آیا (ہیروئن ہمیشہ ماسک پہنتی ہے گویا مکمل سمبلزم) ہیرو ایک پندرہ سالہ لڑکا ہے جو اپنے فن میں پورا استاد معلوم ہوتا ہے۔

کہانی شوگن عہد سے متعلق ہے۔

برابر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈوس پیسس سوئیٹ بڑھے میاں بڑے غور اور انہماک سے ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ براڈوے کے ڈرامہ نگار ایلمر رائس بھی مبہوت بیٹھے ہیں۔

"یہ Pure Drama ہے" ڈوس پیسس مجھ سے چپکے سے کہتے ہیں "ذرا ان کی اداکاری کی گہرائی تو دیکھو ——"

- اپنے جذبات چہروں پر منجمد کیے ہوئے خواب کے سے عالم میں ایکٹر اسٹیج پر چل پھر رہے ہیں اور حلق سے لرزہ خیز آوازیں نکال رہے ہیں۔
- دوسرے سین میں راکشس کودتا پھاندتا ناچتا ہوا آیا اور میں دفعتاً اپنی مانوس دنیا میں واپس آگئی ——— یہ تو بالکل کتھا کلی کی طرح کا ناچ تھا —— کتھا کلی کے مقابلے میں وحشیانہ لیکن بہت کچھ اس سے ملتا جلتا ——

پچھلی قطار میں بیٹھی ہوئی کملا دیوی نے مجھے چپکے سے ٹہوکا دیا —— "ارے یہ تو کتھا کلی ہے ——!" انہوں نے جھک کر کھس پھس کی۔

"ہاں —— ہاں —— بالکل —— مگر چپکی بیٹھی دیکھتی رہیے ورنہ یہ ڈوس پیسس مجھے مار دے گا۔ وہ اس وقت Pure Drama میں غوطہ زن ہے ——" میں نے کھسر پھسر جاری رکھی۔ کیا تعجب ہے نوہ کا ڈانس ڈرامہ کتھا کلی ہی سے متاثر ہوا ہو ——

پہلے ایکٹ کے اختتام پر جانے کہاں سے خرگوشوں کی طرح بلوں میں سے نمودار ہو کر ریڈیو کے رپورٹر مائیکروفون سنبھالے ہمارے سامنے آن موجود ہوتے۔ نوہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے —— نوہ کی خصوصیات آپ کو کیسی لگیں —— ایک رپورٹر نے گینگ وے میں دو زانو بیٹھ کر مائیک ڈوس پیسوس کی ناک میں ٹھونس دیا۔ انہوں نے بے حد شفقت کے ساتھ بولنا شروع کیا —— دوسرا لڑکا مائیک سنبھالے میری طرف بڑھا —— نوہ کی موسیقی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ———

بے حد دلچسپ —— بے حد دلچسپ —— جی ہاں —— کتھاکلی سے آپ کا رقص بہت ملتا جلتا ہے۔ موسیقی —؟ جی — جی — جی ہاں ——

شام کو کیرازومی پارک میں ٹوکیو کے گورنر کی طرف سے عصرانہ ہے۔ چاروں اور حسبِ معمول کاغذی قندیلیں جل رہی ہیں۔ کلاکی کی خوبصورت تفریح گاہیں جھلملا رہی ہیں۔ دفعتاً باہر اندھیرے باغ پر جھکا ہوا آسمان روشن ہو جاتا ہے۔ یک بیک تاریک افق پر بجلی کے قمقموں سے ایک عظیم الشان فیوجی یاما کی آؤٹ لائن جگمگا اٹھتی ہے جس کے آتش فشاں دہانے سے انار چھوٹ چھوٹ کر سارے آسمان پر پھیل جاتے ہیں۔ رنگ برنگی آتش بازیاں آسمان پر خوش آمدید کے الفاظ لکھتی چلی جا رہی ہیں۔ اہلِ مغرب ہکا بکا اس محیر العقول تماشے کو دیکھ رہے ہیں۔ مہمانوں کا آتش بازی سے سواگت کرنا مشرق کی خاص رسم ہے۔ کملا دیوی ایک یوروپین کو سمجھا رہی ہیں۔ سبزے پر آرک لائٹس کی زد میں ناچتی ہوئی لڑکیاں سامنے آتی ہیں۔ یہ لوک ناچ ہیں اور ان کے 'کلاسیکل' ناچوں سے کہیں زیادہ جاندار اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ سبزے کے پرے بے حد خوبصورت جھیل ہے جس میں کشتیاں بندھی ہیں اور بطخیں تیر رہی ہیں۔ چاروں اور مصنوعی پہاڑی راستے ہیں اور درختوں کے کنج۔ جھیل کے کنارے کنارے لکڑی کے اسٹال نصب ہیں جہاں مہمانوں کو کھانے پینے کی چیزیں سرو کی جا رہی ہیں۔ جھیل کے کنارے سے آسمان کے مقابل میں کھڑا ہوا برقی روشنیوں کا فیوجی یاما اور زیادہ ہوشربا معلوم ہو رہا ہے۔ آسمان کی آتش بازیوں کی روشنیوں کا عکس جھیل پہ پڑ رہا ہے۔

اسی آسمان پر ناگاساکی کا دھواں پھیلا تھا۔

اگلی صبح لٹریری سیشن جاری رہا۔ کوکوسائی ہال میں سب اپنی اپنی نشستوں پر ہیڈ فون پہن کر بیٹھ گئے۔ آج انڈونیزیا کے سلطان تقدیر علی سجان صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا: "پچھلے دو دنوں میں جو کچھ کہا گیا اس سے ہم میں سے بہت سے اتفاق نہیں کرتے لہٰذا آج سے ہم مباحثے کا آغاز کریں گے۔"

امریکہ کے ڈونلڈ کین نے کہا ——

"اس محفل میں موضوع کی نوعیت کا تقاضا یہی تھا کہ تراجم کی اہمیت پر زور ڈالا جائے اور ایسا ہی کیا گیا۔ میں مسٹر ولسن کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے زور دیا کہ مترجموں کا طبقہ بھوکا نہ مرے اور ان کی اہمیت کا احساس کیا جائے۔ میں خود ایک مترجم ہوں اور میں نے جاپانی کے کئی ناول انگریزی میں ترجمہ کیے ہیں۔ اب جو کچھ میں کہنے والا ہوں وہ شمپین کے بعد ٹھنڈے پانی کی طرح آپ کو معلوم ہوگا۔ انسانیت کے ایکے اور عالمگیر برادری کے متعلق باتیں کرنا بہت ٹھیک ہے لیکن ذرا حقائق ملاحظہ ہوں:

(میں جاپانی کا ذکر کر رہا ہوں لیکن یہی حالت دوسری فار ایسٹرن زبانوں کے لیے بھی ٹھیک بیٹھتی ہے) اس وقت آدھی درجن کے قریب مترجم انگلستان اور امریکہ میں جاپانی ادب کا ترجمہ کرنے میں جُٹے ہیں۔ میرا بھی یہی کام ہے مگر مجھے ترجموں کا معاوضہ اتنا کم ملتا ہے کہ مجھے اپنی گذر اوقات کے لیے

یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا ہے۔

موسیو سلوآمسکی ترجمہ در ترجمہ کے خطرے سے آگاہ کر چکے ہیں اور زیادہ تر یوروپین زبانوں کے انگریزی ترجموں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ مسٹر یرآیا نے کہا ہے کہ مترجم کو خود ترجمہ کرتے وقت تخلیق کے تجربے سے گذرنا چاہیے' یہ بالکل درست ہے۔

جب میری ایک کتاب "منتخب جاپانی ادب" امریکہ میں شائع ہوئی تو ایک برطانوی ناشر نے صرف دو سو جلدیں خریدنا ہی کافی سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ دو سو جلدیں برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کینیڈا، غرضیکہ ساری دولت مشترکہ کے لئے کافی ہوں گی۔

اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟

رسالوں اور اخباروں کے اڈیٹر!

اس جولائی میں نیویارک میں جاپانی مصنف کاآکا کا شاہکار ناول "میدان کی آگ" شائع ہوا۔ نیویارک ٹائمز نے مجھ سے کہا کہ صرف چار سو الفاظ میں اس کا ریویو کروں۔ نیویارک ٹائمز کے اسی پرچے میں اس سے کہیں کمتر درجے کی کتابوں کے ریویو پر کئی کئی کالم سیاہ کئے گئے تھے۔ اسی طرح میری کتاب "منتخب جاپانی ادب" پر لندن کے ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ کے سترھویں صفحے پر دو پیراگراف کا ایک چھوٹا سا ریویو شائع ہوا اور اسی شمارے میں نارتھ کمبرلینڈ کے گرجاؤں کے متعلق ایک کتاب پر پانچ کالم صرف کئے گئے تھے! اگر کسی ادبی رسالے میں مثال کے طور پر ——— جاپان کے متعلق ایک مضمون جنوری میں شائع ہو جائے تو ستمبر تک دوسرا مضمون شائع نہیں ہو سکتا ورنہ اس رسالے کو مشرق بعید کا ضرورت سے زیادہ طرفدار سمجھا جائے گا ———

زیادہ مترجم حاصل کیجئے۔ ان کو زیادہ پیسے دیجئے اور پریس کی اس بے اعتنائی کو ختم کیجئے تب بیٹھ کر ہم عالمگیر ثقافتی اتحاد کی بات کریں گے ——!"

امریکہ کے مسٹر گے بیتلیئر نے کہا ——— "ذرا غور کیجئے کہ بیچارے مترجموں نے، جنہیں اتنا غیر اہم سمجھا جاتا ہے، دنیا کی تہذیب پر کتنے احسان کئے ہیں ——— رومن لٹریچر کو اینگلو سیکسن میں ترجمہ کیا گیا اور اس کے بعد جدید انگریزی میں، ورنہ روما کے زوال کے بعد تہذیب کا خاتمہ تھا۔ نثر کی زبان (جو میرے نزدیک تمدن کی زبان ہے، شاعری محض منتر پڑھنے کے مترادف ہے اور کسی کلچر اور کسی ملک میں بھی تخلیق کی جا سکتی ہے) انگریزی نثر کی زبان کو ایلزبتھ اول اور جیمس کے عہد میں مترجموں نے سنوارا اور نکھارا۔ رواقی فلسفیوں کے خیالات کے ترجمے کے ذریعے پہلی بار لبرل خیالات کا تعارف ہوا۔ ترجموں کی بدولت ہی بحیرہ روم کے لوگوں کے خیالات شمالی یورپ پہنچے اور پھر اٹھارویں صدی میں انگلستان اور ہالینڈ کی نئی بورژوازی سے نئے dinetic فلسفے اور ترقی پسند نظریوں نے الٹا جنوب کا سفر کیا۔ یہ زیادہ تر فرانسیسی مترجموں کا کام تھا اور انہی کی وجہ سے انقلاب فرانس برپا ہوا۔ ———"

اسٹیون اسپنڈر نے کہا ———

"مسٹر چیرمین ——— میں دراصل پاکستان کے سفیر سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کل کی ان کی گفتگو کو اس سیشن کی دلچسپ ترین تقریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ تقریر پرسنل اور غیر سفارتی تھی۔ اس صورت حال کو واضح کرنے میں بہت کامیاب رہی جس کو ہم سب محسوس کرتے ہیں ——— وہ صورت حال عقیدے کا فقدان ہے جس کا ذکر سفیر پاکستان نے کیا۔ میں ان کی اس راستبازی کا بھی مداح ہوں جس سے کام لیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان کے ہم مذہب یعنی مسلمان ادیبوں اور دانشوروں کے ایمان ناقص اور ان کے عقیدے متزلزل ہو چکے ہیں۔

میں اکثر باتوں میں ان کا ہم خیال اور چند باتوں میں بحیثیت ایک مغربی انسان کے، ان سے متفق نہیں ہوں۔

ان کا ارشاد ہے کہ جن زمانوں میں عقیدے راسخ تھے انہی زمانوں نے عظیم ادب پیدا کیا۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ممکن ہے یہ بات ہندوستان، پاکستان اور مڈل ایسٹ کے لئے صحیح ہو اور وہاں ایسا ہی ہوا ہو اور اس نکتے پر میں سمجھتا ہوں کہ مغرب اور مشرق کے فرق کو واضح کرنا بہت ضروری ہے۔

مغرب میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس عظیم ادب کے عہد یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کا یونان، ورجل کے زمانے کا لاطینی لٹریچر، اور چودھویں اور پندرھویں کی نشاۃ ثانیہ کا یورپ —— یہ سب وہ زمانے تھے جب عقیدہ کھویا جا چکا تھا۔ دراصل اس وقت اہلِ یورپ نے اپنے آپ کو اسی حالت میں پایا جو حالت سفیرِ پاکستان کو اپنی نظر آتی ہے —— یعنی جب عقیدہ صرف ایک سمبل کے طور پر باقی رہ گیا تھا۔ بلکہ میں تو اطالوی حضرات سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ڈانٹے واقعی ایک مذہبی شاعر تھا —— ؟ میرا خیال ہے کہ اس نے مذہب کو محض نشاۃ ثانیہ کے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔

اس کے علاوہ دو باتیں مغربی نقطۂ نظر سے اور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ مغرب میں عظیم عہد وہ سمجھے جاتے ہیں جب ایمان ڈگ گئے تھے، عقیدے محض سمبل تھے اور سیال۔ مذہب منجمد شاعری بن چکا تھا اور شاعری سیال مذہب تھی —— اگر آپ یہ استعارہ سمجھ سکتے ہوں۔

لیکن شاعری ایک ایسا مذہب ہے جس میں مذہبی دماغ ایک شاعرانہ سمبلزم کو آزادی سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن مذہب نے مغرب میں جن شاعروں کو اپنے تسلط میں لیا ہے وہ آرٹ کے لئے اس سمبلزم کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکے۔ یہی حال کمیونسٹ مذہب کا ہے۔

دوسری بات جو میں کہنے والا ہوں وہ یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغرب نے دنیا کی ترقی کے لئے جو کچھ کیا ہم اس کا ذکر کیوں نہ کریں کیونکہ ہم سب اہلِ مغرب کا یہاں پچھلے ایک ہفتے سے جمع ہو کر خاکساری کے مارے برا حال ہوا جا رہا ہے۔ ہمارا سارا وقت یہی روتے پیٹتے گزر رہا ہے کہ ہم مشرق کے سامنے کس قدر شرمندہ ہیں۔ ہم بڑے سخت قصوروار ہیں، مجرم ہیں، یہ ہیں، وہ ہیں۔ مشرق ہی سب کچھ ہے، ہم کچھ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آج سے ایک ہزار سال بعد کی نسلیں کہیں گی کہ ان کم بخت اہلِ مغرب میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اپنے کارناموں کی طرف اشارہ بھی کرتے، لہٰذا انہوں نے اپنے کمالات کو خود نیست و نابود ہو جانے دیا۔ میں نے کبھی لاطینی قوم کو، اہلِ روما کو دو سو سال یا ایک ہزار سال تک کے لئے اہلِ یورپ یا اہلِ برطانیہ کے سامنے اس طرح گڑگڑا کر معافی مانگتے نہیں سنا۔ ہمیں معاف کرو، ہم نے تمہارے لئے خوبصورت سڑکیں تعمیر کیں اور گرامر بنائی اور تمہیں اپنی زبان سکھلائی —— اگر مغرب اس وقت اپنے احساسِ جرم میں گرفتار ہو کر دستبردار ہو گیا تو دنیا ایک ہزار سال پیچھے لوٹ جائے گی ——

میں مانتا ہوں کہ سیاست میں ہم لوگ خطاوار مجرم ہیں مگر ہم نے اپنے آرٹ اور سائنس کے ذریعے دنیا کو آگے بڑھایا ہے اور اگر اپنے سیاسی جرائم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ہم اپنے انٹلیکچوئل کارناموں سے بھی مستعفی ہو گئے تو یہ ہمارا سب سے بڑا سیاسی جرم ہوگا —— یورپ کا عظیم ترین احسان یہ ہے کہ اس نے ایسے آرٹ فارم بنائے جو سماجی اور تاریخی ارتقاء کا ساتھ دے سکیں۔ یوروپین فنون اور ادبیات کی تاریخ تبدیلیوں کے ایک تسلسل پر مشتمل ہے۔ ایسی تبدیلی اور قلبِ ماہیت جس میں ساری تاریخ یا آتی تاریخ جو ذہن اور روح قبول کر سکے۔ آرٹ کی علامتی اصطلاحات میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم عصر علامتی فارم کو روایتی فارم سے منسلک کرنے میں کامیاب رہی۔ یہ یوروپین فنکاروں کا کمال ہے کہ انہوں نے ہم عصر زندگی سے مواد اکٹھا کیا اور اسے اس آرٹ میں ڈھالا جو ماضی کی روایات سے علیحدہ نہیں اور یہی یورپ کی جدید شاعری کی تحریک کا سارا ماحصل ہے۔ یہی راں بو اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کے معانی اور ان کے تنقیدی نظریوں کی بنیاد ہے۔ مشرق میں مجھے تبدیلی کے بغیر انقلاب کا خطرہ نظر آتا ہے۔ اپنے ماضی کے فارم مسترد کر دینا انتہائی خطرناک قسم کی جدیدیت ہے جس کی تحریک ایک دفعہ یورپ میں بھی فیوچرزم کے نام سے چلی تھی۔

اب میں اس مذہب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو سفیرِ پاکستان چاہتے ہیں موجودہ مذاہبِ عالم کی جگہ رائج کیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں ہم نے یہاں پر عالمگیر برادری کے متعلق ضرورت سے زیادہ باتیں کی ہیں۔ جب میں نے عالمگیر اتحاد، عالمگیر برادری کے متعلق یہ سب گوہر افشانیاں سنیں تو ایک مصنف کی حیثیت سے مجھے بے حد شرم آئی۔ یہ انسانی برادری کا تذکرہ ایک قسم کا شوربہ ہے۔ ہمیں شوربے میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس شوربے میں سیاسی خیالات اور گھٹیا آرٹ سب ملا جلا دیا گیا ہے۔ یہ ایک قسم کی کھچڑی ہے جو میرے نزدیک بہت بدذائقہ ہے۔

اہلِ قلم کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم چیزوں میں تفریق کریں، بجائیکہ ہم گھڑے گھڑائے مفروضے اور کلیات دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہ تفریق لازمی طور پر کرنا چاہیئے، ہم سب الگ الگ، ایک مخصوص جغرافیہ اور مخصوص تاریخ کے پس منظر سے نکل کر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کیا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان مختلف جغرافیاؤں اور تاریخوں کو آپس میں گڈمڈ کر کے اور الجھنیں پیدا کریں؟ ہم سب کو اس چیز کا شدت سے احساس ہونا چاہیئے کہ ہم ایک نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔ یہ حقیقت کہ میں ایک جاپانی سے مختلف ہوں، ایک ایسا واقعہ ہے جس کے لئے ہم دونوں کو شکرگزار ہونا چاہیئے یہ کہنا کہ میں، ادھر بیٹھے وہ کورین اصحاب، یا اس ہال میں جمع دوسری اقوام کے حضرات ایک ہیں بالکل لایعنی ہے ——— یہ ضرور ہے کہ ہم سب کی دو آنکھیں ہیں، ایک ناک ہے وغیرہ ——— لیکن ہمارا ایک دوسرے سے مختلف ہونا سب سے اہم چیز ہے اور اگر ہم مذہب پر گفتگو کر رہے ہیں تو کم از کم ہم تو سوچیں کہ مذہب سے ہماری کیا مراد ہے۔ مذاہب اور عقائد بھی مختلف اور مخصوص علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے الگ الگ سمبل، رسوم اور روایات ہیں۔ میں یہاں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مغرب میں ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ عالمگیر برادری کا نظریہ اور شخصیت جغرافیہ اور تاریخ کی تفریق کا ازالہ ادب کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ والٹ وٹ مین کی قسم کے جتنے ادیبوں نے اس نظریہ کو فروغ دیا وہ مغرب کے زوال کے باعث ہوتے ——— لہٰذا میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں کلیات میں جانے کے بجائے اختلافات پر زور دیجئے۔"

اسٹیون اسپنڈر کی اس تقریر سے ہال پر سناٹا چھا گیا۔ ہر ایک کو ان کا لہجہ بہت ناگوار گذر رہا تھا۔

چند لمحوں بعد بوڑھے پولش شاعر سلونمسکی نے کوئی بات کی اور پھر ترجموں کے متعلق تبادلۂ خیالات دوبارہ شروع ہو گیا۔

پروفیسر ونائک کرشنا گوکاک نے کہا ———

"میرے ملک میں انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے چھپتے ہیں اور مختلف ہندوستانی زبانوں کا ادب بھی انگریزی میں منتقل کیا جا رہا ہے لیکن چونکہ یہ کسی بین الاقوامی شہرت کے پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے شائع نہیں ہوتے لہٰذا انہیں بیرونی دنیا میں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہمارا ادب کے متعلق یہ رویہ ہے کہ کل جب یہاں جمالیاتی اقدار کے سلسلے میں ہندوستان کے نظریات پر گفتگو کی جا رہی تھی تو اسی جگہ پر بیٹھے ہوئے چند معتبر انگریز مصنفین نے سننے کی تکلیف گوارا کئے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اس پوری بحث کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ بکواس ہے ———"

انگس ولسن نے کہا ———

"اہلِ ایشیا کا، جیسا کہ ابھی ہندوستان کے نمائندے نے کہا، یہ غصہ حق بجانب ہے کہ ان کی کتابوں سے اس لئے بے اعتنائی برتی جاتی ہے کیونکہ وہ کسی معروف اشاعتی ادارے کی طرف سے نہیں چھپتیں۔ ہمیں ان سارے غیر معروف ایشیائی اداروں کی فہرست تیار کر کے مغرب کے اڈیٹروں کو دینا چاہیئے تاکہ وہ یہاں کی چھپی ہوئی کتابوں پر توجہ کریں۔ کل ہم ان سارے مسائل کے متعلق ایک تجویز آپ کے سامنے پیش کریں گے۔"

اوما شنکر جوشی نے پاکستان کے سینیٹر ڈاکٹر عمر حیات ملک کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے کہا، "کل مسٹر البرٹو موراویا نے اطالوی نشاۃ ثانیہ کی انسان پرستی کا تذکرہ کیا تھا جو ان کے ملک میں آج تک زندہ ہے۔ مغربی تہذیب نے انسان کو کائنات کا مرکز بنایا ہے۔ ممکن ہے تین چار صدیوں کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ غالباً اس رویہ کی اس وقت بے حد ضرورت تھی۔ یہ رویہ بہت زیادہ خود پرستی پر مبنی تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ مشرق میں خدا کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے سارے بڑے مذاہب مشرق ہی میں پیدا ہوئے۔ لیکن اس وقت اہلِ مشرق روحانیت کے اتنے دلدادہ نہیں ہیں جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ ہم اہلِ مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ روحانیت پرست ہیں، مبالغہ ہے۔

اور چونکہ مذاہب مشرق میں پیدا ہوئے اور مذہبی جنون کو بھی مذہب کا نام دیا جاتا ہے لہٰذا چند مقتدر پروپیگنڈہ باز حضرات کیوزم کو بھی ایک مشرقی مذہب کا نام دے رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کمیوزم جو مغرب کے صنعتی انقلاب کی جائز اولاد ہے مشرقی کیوں قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ملک نے انسانیت کے اتحاد پر زور دیا ہے۔ ٹیگور نے بھی انسانیت پرستی کے نئے مذہب کا پرچار کیا تھا۔

یہ نیا عقیدہ کہیں باہر سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ یہ ہمارے اپنے اندر پیدا ہوگا۔

بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے لکھنے والے مشرق و مغرب کے باہم اثرات کی اتنی پروا نہ کریں اور محض فن کے مکمل پن پر زور دیں۔ ممکن ہے وہ کہیں کہ ایک فن پارہ اگر وہ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکا پھر بھی فن پارہ ہی رہے گا۔ نیگرو مجسمے موڈرن آرٹ کو متاثر کرنے سے پہلے بھی بڑے فن پارے تھے لہٰذا اصل چیز یہ ہے، ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک قوم اپنی اندرونی جمالیاتی حس کا کس طرح اظہار کرتی ہے اور اگر ہم میں اتنا ظرف موجود ہے تو ہم دوسروں کی جمالیاتی حس کے مظاہر خود ہی پسند کر سکیں گے۔

مسٹر موراَیا نے صحیح کہا تھا کہ مشرق کو اپنی انفرادی جنس پہچاننے میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔ ہم لوگ ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جو یورپ نے تعمیر کی ہے بحیثیت ایک آرٹسٹ کے مجھے اندازہ ہے کہ ابھی تو مجھے اپنے گھر ہی میں چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کرنا ہے۔ آرٹ کی اپیل عالمگیر ہے مگر فن پارہ ایک ایسی منفرد شے ہے جو اپنے مخصوص زمان و مکان کے سیاق و سباق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی بات ابھی مسٹر اسپنڈر نے کہی مگر سنسکرت کے نقاد صدیوں پہلے یہ نظریہ پیش کر چکے ہیں۔ کروچے کا مطالعہ کرتے وقت مجھے اس کا نظریۂ فن سمجھنے میں دقت ہوئی۔ کروچے کے نزدیک آرٹ روحانی ہے اور آرٹ کے نمونے محض **Physical reminders** ہیں۔

لیکن پڑھنے والے اس تجربے میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں جس کے نتیجے میں آرٹسٹ نے اپنا فن پارہ تخلیق کیا ——؟

سنسکرت کے نقادوں نے ہزاروں سال قبل یہ مسئلہ حل کر لیا تھا اور اس میں کروچے والی الجھن شامل نہیں ——"

ابھی برازیل کا نمائندہ تقریر کر رہا تھا جب اینگس ولسن، کریمر سنگ اور میں اوپر لابی میں آکر ریزولیوشن کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ کام بہت تھا اور ہمیں جلدی سے چائے پینے کے بعد پھر باہر جانے کے لئے تیار ہونا تھا۔ شام کو گورنر ٹوکیو نے ہم سب کو کابکی تھیٹر کے لئے مدعو کیا تھا۔

جاپان کے ہر چھوٹے اور بڑے شہر میں اَن گنت تھیٹر ہیں جہاں جدید ڈرامے، اوپیرا، میوزیکل کامیڈیز اور بیلے دکھائے جاتے ہیں۔ اداکاری اور اسٹیج کرافٹ کے لحاظ سے جاپان کا تھیٹر یورپ اور امریکہ کے تھیٹر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ درحقیقت ایک جاپانی کھیل دیکھتے ہوئے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم پیرس یا میلان یا لندن کے کسی تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔

دیکھو کابکی نوہ کی طرح یہاں کا پانچ سو سال پرانا قومی تھیٹر ہے۔ کہانیاں مشرقی انداز کی ہیں۔ اداکاری کی طرز بھی خالص مشرقی ہے۔ —— لیکن اسٹیج —— کابکی کی اسٹیج دیکھ کر ہم سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہ ریوالونگ اسٹیج مغرب کی اسٹیج سے دو گنی بڑی اور چوڑی تھی اور بیک گراؤنڈ میں جس طرح کی منظر کشی کی جا رہی تھی وہ ہم میں سے کسی نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

ایک جگہ ایک جنگل کا سین تھا۔ ایک کونے میں پل تھا۔ اس کے نیچے بہت چھوٹی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ جانے ان لوگوں نے روشنیوں کے استعمال سے کیا ترکیب کی تھی یا کیا کرامت تھی کہ پورے وقت ندی کا پانی بہت فاصلے اور بلندی سے پس منظر کی پہاڑیوں میں سے نکلتا، شور کرتا، چاند کی روشنی میں جھلملاتا، پل کے نیچے سے گذر کر جانے کہاں غائب ہوتا رہا۔ اس میں پانی کی پھواریں بھی اڑ رہی تھیں۔ جگہ جگہ پس منظر کی وسعت اور گہرائی میں کہرہ اٹھ رہا تھا۔ چاند پر دھند تیر رہی تھی۔ دوسرے مناظر بھی اسی طرح حیرت انگیز حد تک حقیقی تھے۔ ایک مرتبہ اسٹیج پر پورا محلہ آباد ہو گیا۔ بارش ہوئی، کیچڑ پھیلی، پھر جاڑے آئے، برف گری،

بھرائی گاؤں کی چوپال کے آس پاس، جنت بیبی کے لیپوں سے ملتے گئے ——— آخری ایکٹ میں سارے ایکٹرس اور ایکٹرز جو پاس کھڑے ہوئے تھے (تماشائیوں کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ ان کا چیف ایکٹر اسی طرح سجدے ہی میں تمام امرا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کراتا رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کا تعارف کرایا جو اس ڈرامے میں سیکنڈ ہیرو بنا تھا اور آج پہلی بار اسٹیج پر آیا تھا۔ پندرہ منٹ تک سب اسی طرح ساکت و صامت سجدے میں پڑے رہے۔ اس کے بعد اٹھ کر اداکاری میں مشغول ہو گئے۔

کابوکی کی نوٹنکیاں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ کھیل صبح سے شروع ہو کر رات تک جاری رہتا ہے۔ بزرگوں نے شام کو آخر کے دو ڈرامے دیکھے جن میں سے ایک ٹریجیڈی تھی اور دوسری کامیڈی۔ دونوں ڈرامے ایڈو عہد سے متعلق تھے۔ ان کا ماحول اور جذبات خالص مشرقی تھے۔ ہیروئن کا رونا دھونا ہمارے اپنے یہاں کے پرانے تھیٹروں کی یاد دلاتی تھی۔ یہاں بھی تو وہ اسٹیج کی طرح کا بنا تھا اور اداکار برابر گلی پر آتے جاتے رہتے تھے۔

یہ بڑی قابلِ غور بات ہے کہ جاپانیوں نے جدید مغربی تھیٹر کو پوری طرح اپنا لیا، لیکن اپنا قومی تھیٹر بھی اسی طرح برقرار رکھا ہے۔ اس کی روایتی اور مصنوعی اداکاری بھی نہیں بدلی۔ کیا ہم کبھی اپنے یہاں طالب بنارسی اور آغا حشر کے ڈرامے اس عملی پیمانے پر اتنے اعلیٰ ماڈرن اسٹیج کرافٹ کے ساتھ پیش کریں گے؟ کیا ہم کبھی اتنے فخر اور چاؤ کے ساتھ "نل دمینتی" یا "صید ہوس" غیر ملکیوں کو دکھا سکتے ہیں؟ ہم تو اپنے پرانے تھیٹر کا مذاق اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ہمیں اپنے اس تہذیبی ورثے سے شرم آتی ہے۔

نوہ اور کابکی دونوں میں کومک عنصر بھی ہوتا ہے۔ طنز اور مذاق کا نشانہ عموماً مندر کے کاہن کا کردار رہتا ہے جو اپنی چالبازیوں سے بھولے بھالے اور خوش عقیدہ عوام کو بیوقوف بناتے تھے (جس طرح ہمارے یہاں بنارس کے پنڈے اور ملا جی ایک خاص کردار تھے)

اہلِ جاپان اداکاری میں بڑے ماہر ہیں۔ ان کے فلم ایکٹنگ اور ٹکنیک کے لحاظ سے فرنچ اور سویڈش فلموں کے استاد ہیں۔ ان کی میوزیکل کومیڈی امریکہ کی مانند بے حد **Lavish** ہے۔ بیلے یہاں کا قومی آرٹ بن گیا ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا اپنا رقص اس لائق نہیں کہ اسے آگے بڑھایا جا سکتا)

اگلی صبح مسٹر اسپنڈر سیشن کی صدارت فرما رہے تھے۔ جان ڈوس پیسس نے بتایا کہ اسٹین بک ابھی تک اپنے کمرے میں مقید ہیں۔ "ہوا یہ کہ ان کو مقامی انفلوئنزا ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر کوئی اور مرض سمجھ کر علاج کرتا رہا۔ اب اس علاج کا علاج ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بحران میں مبتلا تھے اس وقت انہوں نے یہ چند باتیں لکھی ہیں جو میں ان کی طرف سے آپ کو سناتا ہوں ——— "مجھے معلوم نہ تھا کہ میں سیاسی عزائم بھی رکھتا ہوں۔ اب پتہ چلا کہ ایسا ضرور ہوگا۔ میں بیمار ہوں۔ مار کھانے کا خطرہ ہی آپ کو تمیز سکھاتا ہے۔ اگر اکثر قوموں کے پاس ہائیڈروجن بم ہو گئے تب وہ لامحالہ امن کے حبث کبوتر بن جائیں گے، [illegible] سے [illegible] رہتا ہے۔ خاموشی نے کبھی غلط اطلاعات نہیں دیں۔ گورنمنٹ اس بات کا آخری ثبوت ہے کہ فرد کامیاب نہیں ہوا۔ سارے انسانوں میں ایک خصوصیت یقیناً مشترک ہے۔ یعنی یہ کہ وہ خود بہت اچھے ہیں۔ الّو کے پٹھے دوسرے ہی ہیں۔ اچھی زندگی گزار چکنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان مر جائے۔ برا آدمی اپنے حق میں اتنا برا نہیں ہوتا جتنا اچھا آدمی اپنے حق میں برا ہوتا ہے ——— خیالات کی قومیت یا نسل نہیں ہے ———" اسٹین بک کے فقرے سنانے کے بعد ڈوس پیسس نے کہا ——— "اس ریمارک کے سلسلے میں اپنے دوست اسٹیون اسپنڈر سے جھگڑنا چاہتا ہوں جن کو عالمگیر برادری پر اعتراض ہے ——— جو شخص بھی ساری دنیا گھوم چکا ہے اسے یہ اندازہ ہوگا کہ کلچر اور زبان سے قطع نظر

کوئی چیز ایسی ہے جو بالکل اجنبی انوکھی جگہوں میں بھی ہم کو موجود ملتی ہے اور جس سے ہم بار بار دوچار ہوتے ہیں۔

عرصہ ہوا میں ایک کارواں کے ساتھ شام کا ریگستان عبور کر رہا تھا۔ کارواں میں ایک ترک کے علاوہ سب عرب تھے۔ مجھے ترکی نہ آتی تھی اور ترک انگریزی سے ناواقف تھا۔ ایک روز عربوں کے ایک اور گروہ نے کارواں پر حملہ کر دیا۔ لڑائی شروع ہوئی جو سنجیدہ نہ تھی لیکن میں نے اور ترک نے اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کیا کہ ہم اس جنگ میں باہر والوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گئے اور جبکہ ہمارے سروں پر گولیاں سنسنا رہی تھیں ہم دونوں نے جانے کس طرح ایک دوسرے سے کمیونی کیٹ کیا کہ اس آدھ گھنٹے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی سوانح حیات سنا ڈالی اور اپنے خاندانوں اور بیوی بچوں کا ذکر کیا اور کسی نامعلوم طریقے سے ہم کو محسوس ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس طرح کا تجربہ مجھے بار بار ہوا ہے۔ کیونکہ اس کائنات کے باشندوں میں یقیناً کوئی چیز مشترک ہے جو اس خالص ذہن اور خطابت سے مختلف اور بلند تر ہے جس سے اعلیٰ ادب پیدا ہوتا ہے۔ وہ انسانیت کی کوئی خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت ان انسانوں نے پیدا کی ہے جو اس دنیا میں رہتے ہیں جہاں اپنے اختلافات کے باوجود کسی نہ کسی طرح کمیونی کیٹ کر لیتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے یوروپین ادبا کہتے تھے کہ وہ ادب کی ری پبلک کے ممبر ہیں۔ کیا ہم لوگ آج کی دنیا میں ایک ادب کی ری پبلک بھی پیدا نہیں کر سکتے؟“

اس کے بعد سلطان تقدیر علی سبحان نے کہا ــــــ

”ہر جگہ مشرق و مغرب اس وقت یکجا موجود ہیں۔ آفاقیت کے رویے نے موڈرن آرٹ کو تباہ نہیں کیا۔ ہم جدید انڈونیشین لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا کی تہذیب کے قانونی وارث ہیں۔ آجکل کی دنیا میں جغرافیائی حدود اور مخصوص قومی روایات کے بجائے افراد اور گروہوں کی آزادئ اظہار بیان اور انتخاب کی خود مختاری آرٹ کی محرک ہے۔ دوسری جنگ عظیم، تجزیہ نفسی، مذہب کے متعلق نیا رویہ، پرولتاری ادب، موڈرن شاعری۔ یہ ساری چیزیں سارے ممالک کی ادبیات پر یکساں طور پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ ادب اب یقیناً پرونشل نہیں رہا۔ ساری دنیا کے مسائل ایک جیسے ہیں لہٰذا میں مسٹر اسپینڈر کے خیالات سے متفق نہیں۔ آج کے فنکار کو اپنی سادہ لوحی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے جس کی وجہ سے وہ اتنے دنوں تنگ نظر سیاستدانوں کی بازی گری کا شکار رہا۔“

اپنی تقریر میں انہوں نے گوئٹے کا ذکر بھی کیا جس پر مسٹر اسپینڈر نے فرمایا کہ اس کانفرنس میں بار بار گوئٹے کا حوالہ خوب دیا گیا ہے۔

جاپان کے کنزو ناکاجی ما نے کہا ــــــ

”اب تک میں پس منظر میں بیٹھا مترجموں کی ٹولی میں آپ کی تقاریر کا آپ لوگوں کے کانوں کے لئے فوری ترجمہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہم لوگوں کے سامنے کمیونی کیشن کا کس قدر زبردست اور دقت طلب مسئلہ ہے۔“

اب انہوں نے بھی اسپینڈر کو مخاطب کیا: ”ہنگری کا موسیقار بیلا بارٹوک کی موسیقی اپنی نسلی اور قومی خصوصیات سے بھرپور ہے لیکن اس سے اس کی عالمگیر اپیل میں کمی نہیں آئی۔ اور اسے امریکہ اور یوروپ اور جاپان میں بے انتہا پسند کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اہل ہنگری کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ باہر والے بھی ان کے قومی موسیقار کی تخلیقات کی اسپرٹ میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

انگلستان کے کریبنر بنگ نے کہا ــــــ

”پروفیسر کنزو ناکاجی ما اور میں نے کل رات گئے تک کل کی تقاریر کا مطالعہ کیا جو دن کے وقت ٹائپ رائٹرز پر سے نکل کر ہمیں ملتی رہیں۔ ہم لکھنے والے دوسروں کے لئے کتنے دردِ سر کا موجب بنتے ہیں! مترجموں اور مختصر نویسوں نے کل رات بھر اس طرح کام کیا ہے جس سے کسی بڑے

اخبار کے دفتر کی فضا پیدا ہو گئی تھی جہاں صبح کا ایڈیشن نکالنے کے لئے رت جگا منایا جاتا ہے۔ اس پوری کانفرنس کی کارروائی پڑھنے کے بعد ہم جس نتیجے پر پہنچے (جو بے حد ہمت افزا نتیجہ تھا) اس کی بنیاد پر ہم ایک ریزولیشن آپ کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔

ترجمہ کا معاملہ بے حد کٹھن ہے جس پر ہم لوگ یہاں بہت طویل تبادلۂ خیالات کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ایذرا پاؤنڈ نے حال میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا عنوان انہوں نے رکھا ہے "Classic Anthology Defined by confucins" یہ کتاب قدیم چینی کلاسیک "کتاب نغمات" کی تین سو نظموں کا ترجمہ ہے اور ظاہر ہے کہ پاؤنڈ کی قابلیت سے کون منکر ہو سکتا ہے مگر کنفیوشس کے اوریجنل سے اسے [illegible] واسطہ نہیں۔ دراصل ایسا لگتا ہے جیسے جدید امریکن طرز بیان میں پاؤنڈ نے چینی شاعری کی پیروڈی کی ہے اور جنگ عظیم کے بعد سے آج تک مزاحیہ شاعری کی اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

مترجم کتنا ہی ماہر زبان کیوں نہ ہو اس کے سامنے سب سے بڑا پرابلم یہ ہوگا کہ مثال کے طور پر اردو یا جاپانی روزمرہ کو کس طرح مغربی زبان میں منتقل کرے۔ کیا لکھنؤ کی بولی ٹھولی کو انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت لندن کی کوکنی کا لباس پہنایا جائے ——— ؟ یا کیا کیا جائے ——— ؟"

اس کے بعد یونیسکو کے سامنے رکھنے کے لئے انطونی سلوی مسکی، اسٹیون اسپنڈر، انگس ولسن، کریزبنگ، اور میری طرف سے تراجم کے متعلق ریزولیوشن پیش کیا گیا جو اسی روز صبح ہم نے فائنل طور پر ڈرافٹ کیا تھا۔ مسٹر اسپنڈر نے تجویز میں ایک جگہ لفظ انڈر ڈیولپڈ ممالک لکھا تھا اس پر میں نے ان سے کہا کہ "پسماندہ" سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ممالک تہذیبی طور پر بھی پسماندہ ہیں۔ انگس ولسن نے بشاشت سے ذرا "اقتصادی طور پر پسماندہ" کا اضافہ کر دیا۔ مسٹر اسپنڈر تیوری پر بل ڈال کر خاموش ہو گئے۔ مصر کے ڈاکٹر محمد عوض کی اس ترمیم کے ساتھ کہ اس تجویز میں ایشیا کے ساتھ شمالی افریقہ بھی شامل کر لیا جائے، ریزولیوشن بالاتفاق رائے منظور کر لیا گیا۔ اس میں ہم نے ایک اہم شق یہ بھی رکھی تھی کہ مشرقی شاعری کے تراجم کو جو شروع میں آسانی سے فروخت نہیں ہوں گے یونیسکو خود sponson کرے۔

آخر میں میں نے کہا کہ ان ساری تقریروں سے جو مغرب کے مشرق پر اثر کے متعلق یہاں کی گئی ہیں یہاں یہ امپریشن پیدا ہوا ہے کہ ایشیا نے اپنی ادبی روایات کو بالکل مسترد کر دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یورپ میں جدید شاعری نے تاریخی احساس کو متعارف کیا۔ ہمارے یہاں ممکن ہے یہ احساس موجود نہ ہو کیونکہ ہمارا نظریۂ کائنات تاریخ اور وقت کے بجائے ابدیت پر مبنی ہے مگر صوفی تحریک کے زیر اثر انسان پرستی کی ہمارے یہاں بڑی عظیم روایت موجود ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان کی ساری علاقائی زبانوں میں انسان پرستی کی زبردست بیک گراؤنڈ موجود ہے۔ پچھلی صدیوں میں شمالی ہند، بنگال، پنجاب، سندھ، مہاراشٹرا اور جنوبی ہند کے شاعروں، صوفیوں اور سنتوں نے اپنی ہیومنزم کی بنا پر اعلیٰ ترین ادب کی تخلیق کی۔ لہٰذا یہ خیال بھی غلط ہے کہ مشرق انسان پرستی کے خیالات سے نابلد تھا۔ یورپ کی حالیہ خونریز جنگوں کے زمانے میں وہاں کے بیشتر فنکار انسان پرستی وغیرہ کو بھول چکے تھے لیکن ہمارے ادیبوں نے زبردست ترین کشمکش کے موقع پر بھی توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آج سے دس سال قبل تقسیم ہند کے موقع پر جبکہ سارا برصغیر آگ و خون اور نفرت کے سمندر میں ڈوب چکا تھا اس وقت بھی اردو ادیبوں نے انسان پرستی کی روایت کو زندہ رکھا اور آج بھی ان تاریک سیاسی حالات کے باوجود پاکستان کے ادیبوں کی تخلیقات ہندوستان میں شائع ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے اردو ادیب پاکستان میں مقبول ہیں۔ ادب کا فن ان "جغرافیائی" "تاریخی" اور "قومی" خصوصیات سے بالاتر ہے جو مسٹر اسپنڈر کا آئیڈیل ہیں۔

دیر تک ہم لوگ بیٹھے ان سب باتوں کا تذکرہ کرتے رہے۔

یہ لیکھک لوگ زیادہ تر کس قدر ہول سم تھے۔ نارمل، سیدھے سادے، دلچسپ۔ البرٹو موراویا، بے حد سادہ مزاج کے خاموش طبیعت انسان

بھی کی طبیعت ہی ذرا سا بھی مغرور نہیں۔ لنگڑا کر چلتے ہوئے ادھر آکر بیٹھ گئے۔ سیدھے سادے انداز میں کوئی بات کی اور پھر چپ ہو رہے کے مقابلے میں اسٹیون اسپنڈر تھے جو طرح طرح کی ذہنی الجھنوں میں گرفتار معلوم ہوتے تھے۔ اللہ اس شخص کو رات کو نیند کیسے آتی ہوگی —— ڈوس پیسوس جن میں انتہائی انکسار تھا اور حد سے زیادہ شفقت اور نرمی۔ بوڑھے کونرڈ ایکن میاں بیوی جو کیلیفورنیا سے آئے تھے، دونوں مجسم اور اخلاق کے پتلے تھے۔ ہر ایک کی بات کا [illegible] لگا کرتے تھے۔ چونکہ بے حد بوڑھے تھے لہٰذا عام طور پر ہر جگہ [illegible] جاتے اور خاموش بیٹھے رہ اینگس ولسن جن میں شدید مزاح کی حس موجود تھا۔ انتہا درجے کی ذہانت اور سنجیدگی۔ بوڑھے موسیو آندرے شانزوں فرانسیسی اخلاق اور فروتنی کا مجسمہ ڈونلڈ کین انتہائی سنجیدہ اور خاموش نوجوان، جس طرح کے نوجوان ذہن پرست مغرب کی یونیورسٹی میں ملیں گے۔ جاپان کے عاشق، کم آمیز۔ ڈرو کی ناولسٹ خاتون جن کے ہونٹوں پر ہمیشہ بڑی مدھم مدھم مسکراہٹ بکھری رہتی۔ برطانوی ناولسٹ خاتون [illegible] بالکل کھری تھیں۔ ڈاکٹر محمد حسن جو بے حد خوش مزاج تھے اور بات بات پر لطیفے سناتے۔ انڈونیشیا کا ایک نوجوان افسانہ نگار لڑکا جس کے چہرے پر بڑی بے کسی برستی او جو لگتا جیسے یہاں آ کر کھو گیا ہے۔ لبنان کے ابو صوان جو شکل و صورت اور لب و لہجے سے فرانسیسی معلوم ہوتے ("نہیں میں عرب نہیں ہوں۔ عرب قوم کا کوئی وجود نہیں۔ عربی زبان بولنے والی اقوام کہو۔") برازیل کا شاعر جس کے خوبصورت چہرے پر خالص لاطینی امریکی اداسی برستی ایلیکس واہ (ایولین واہ کے بھائی مگر کیتھولک نہیں)، سیدھے سادے اور چپ چاپ الگ تھلگ رہنے والے (سنا ہے بھائی صاحب اتنے ہی مغرور ہیں)، جارج مکیش ان ہی کی طرح سیدھے سادے لیکن بے حد خوش مزاج۔ کامیابی نے ان کا دماغ تو ذرہ بھر بھی خراب نہیں کیا۔

ان دنوں گفتگو سب اس قسم کی ہوتی تھی ——

"گراہم گرین اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟" (میرا سوال)

"مذہب تبدیل کیا تھا۔ اس کے بعد شادی کی، وہ ہو گئی فیل۔ اب رومن کیتھولک عقیدے کی رو سے طلاق نہیں دے سکتے۔ یہ وجہ ہے۔"

"اسپنڈر کیتھولک نہیں مگر اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟" (میرا سوال)

"بوجہ ان پریشانیوں کے جو ان کے ضمیر کو لاحق ہیں۔ ان کے مارے چین نہیں ملتا ان کو۔"

"تو پھر ضمیر درست کر لیں۔" (میری رائے)

"یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔"

"کہ ضمیر کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے؟"

"ہاں!"

"ٹھیک!"

"آہا! وہ دیکھئے کیا سڑک کی خوبصورت جاپانی لڑکی جا رہی ہے۔"

"جی ہاں! اور ذرا ملاحظہ کیجئے گھاس تک کس آرٹسٹک طریقے سے گھاس جڑی ہیں ——"

"گڈ آفٹر نون —— خواتین و حضرات ——" بس کے سرے پر کھڑی ہوئی لڑکی نے مائیک ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا۔

میرا نام —— [1] —— ہے جس کے معنی ہیں "بارش کی ہزاروں بوندیں"۔ میں آج کی شام آپ کی گائیڈ ہوں ——"

دوسری بسوں میں جن میں فرنچ بولنے والے اراکین سوار ہیں، فرانسیسی کی ماہر لڑکیاں اسی طرح کے اسمارٹ نیلے یونیفارم پہنے مائیک سنبھالے بولے چلی جا رہی ہیں۔

کانفرنس کے ڈسکشن ختم ہو چکے۔ اب ہم لوگ شاہی خندق کی ریلنگ پر جھکے پانی کی شفاف لہروں کو دیکھ رہے ہیں۔ بہت باتیں ہو چکیں۔ اب سب غیر معمولی طور پر خاموش ہیں۔ صرف مائیکل کا کیمرہ متواتر چلے جا رہا ہے۔ مائیکل ڈچ ٹیلی وژن کا نمائندہ اور ناولسٹ جو آندرے مالرو کی فلموں کے لئے اسکرپٹ لکھ چکا ہے، پھاٹک کے پل پر کھڑا حسب معمول فلم کھینچنے میں جٹا ہے۔ اسکولوں کے صحت مند بچے یونیفارم میں ملبوس بسوں میں سے اتر کر شہنشاہ کے محل کی زیارت کر رہے ہیں (یہ لوگ اپنی قوم پرستی کس حد تک فراموش کر سکیں گے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے) ٹوکیو کی سینٹ صوفیہ یونیورسٹی کا ایک استاد میرے قریب کھڑا ہے۔ وہ آپ سے آپ کہنا شروع کرتا ہے —— "تم کو معلوم ہے —— شکست کے بعد ہمارے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں تھے۔ کھانے کو چاول نہیں تھے۔ ہم گھاس اُبال اُبال کر کھاتے تھے فلپائن کے جنگلوں میں مجھے اطلاع ملی کہ شہنشاہ کو شکست ہوئی ہے۔ ہم نے فوراً ہتھیار ڈال دئے ہم سب نے خاموشی سے اپنی ہار کو منظور کر لیا اور اسی وقت سے فوراً تعمیرِ نو میں مصروف ہو گئے۔"

جنرل مک آرتھر نے لکھا ہے کہ شکست کے بعد وہ شہنشاہ کی توہین کے خیال سے معمولی بش شرٹ پہنے اس سے ملنے کے لئے گیا۔ شہنشاہ نے اس سے کہا کہ اصل مجرم میں ہوں۔ جنگ میری وجہ سے ہوئی۔ میں اس ساری تباہی کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے پھانسی دے دی جائے ——

دوبارہ جب مک آرتھر اس سے ملنے گیا تو پورے لباس میں ملبوس ہو کر اسی طرح پہنچا جس طرح ایک شہنشاہ کے سامنے جانا چاہیے۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ محلات کے دوسرے پھاٹک سے نکل کر ہم بسوں کی طرف بڑھے۔ آج ہم لوگ پھر گورنر ٹوکیو کی دعوت پر سارے شہر میں آوارہ گردی کرتے پھر رہے تھے۔ بس میں سوار ہوتے وقت یونیورسٹی کے اس استاد نے جلدی سے کچھ الفاظ نوٹ بک پر لکھ لئے۔ "یہ لڑکی جو اس بس میں آپ کی گائیڈ ہے یونیورسٹی میں میری انگریزی کی طالبعلم ہے۔ ابھی اس نے تلفظ میں چند غلطیاں کی ہیں جو میں نے نوٹ کر لی ہیں۔ کل کلاس میں اس کی تصحیح کروں گا ——"

ٹورسٹ بیورو کے گائیڈ سب کے سب یونیورسٹیوں کے لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ مائیک ہاتھ میں لے کر گائیڈ لڑکی نے دوبارہ بولنا شروع کیا —— "اب ہم لوگ ٹوکیو کے تیرہ سو سال پرانے مندر کی طرف جا رہے ہیں۔"

یہ پرانا ٹوکیو ہے۔ لکڑی کے مکان چھوٹی چھوٹی دکانیں، بازار، مندر کے باہر جمِ غفیر ہمارا منتظر ہے۔ گیشا لڑکیاں پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لئے سواگت کے لئے کھڑی ہیں۔ ٹیلی وژن کیمرے چل رہے ہیں۔ مندر میں نوجوان پروہت سیاہ لباس میں ملبوس، مائیکروفون پر نہایت فصیح و بلیغ انگریزی میں استقبالیہ تقریر کر رہا ہے۔

چھوٹی چھوٹی کاغذی قندیلوں میں موم بتیاں جلا کر ہم لوگ مندر کے برآمدے میں داخل ہوئے۔ میں اور مادام وادیا اندر چلے گئے جہاں بدھ کی عظیم الشان مورتی نیم تاریکی میں جگمگا رہی تھی۔

---

[1] مجھے اس وقت اس کا جاپانی نام یاد نہیں آ رہا۔

ماما م ماؔیا بدھ کی مورتی کے آگے جھکی آنکھیں بند کئے پالی میں اشلوک پڑھ رہی ہیں۔ میں نے مورتی کے عقب سے ان کو دیکھا ایک حسینہ جو پیرس کے ایک فرانسیسی خاندان میں پیدا ہوئی نیلی ریشمی ساری پہنے ماتھے پر بڑا سا قرمز کا ٹیکہ لگائے آنکھیں بند کئے پالی میں اشلوک پڑھ رہی تھی۔

ہمیں کدھر روشنی مل جائے۔

قندیلیں سنبھالے ہم سب کے سب باہر نکلے اور سیڑھیاں اتر کر اس ہنگو میں آ گئے جہاں جلوس چل رہا تھا۔ ہم کو تحفے کے طور پر مزید گلدستے قندیلیں اور مذہبی کتابیں دی گئیں۔ ایک کتاب کے سرورق پر بڑا سا اوم اور سنسکرت کے منتر منقش تھے۔ اندر دس ہاتھ والے دیوتاؤں کی تصاویر تھیں۔ مہایانی اور تانترک بدھ ازم جو بنگال سے چلی چین اور کوریا کے راستے یہاں پہنچی۔ اس دور افتادہ سرزمین میں اوم کا نقش ——— بڑا عجیب سا لگا۔

ہزاروں لاکھوں انسان روز اس مندر میں پوجا کے لئے آتے ہیں۔ آس پاس کچھ کچھ بنارس کا سا ماحول ہے۔ سوا اس کے کہ یہاں چیتھڑوں میں ملبوس فقیر اور غلاظت اور سانڈ اور پان کی پیک اور شور و غل اور ہڑبونگ نہیں ہے۔

افسوس کہ فقیر اور بھیک منگے بچے مجھے اب تک کہیں نظر نہ آئے (شکست کے عین بعد جب ان کی بے حد خستہ حالت تھی اس وقت بھی کوئی ایک انسان بھیک مانگتا دکھلائی نہ دیا تھا۔ کسی نے مجھے بعد میں بتایا) غالباً ۱۸۸۵ء میں ایک امریکن اخبار نویس لڑکی نیلی بلائی پچھتر دن میں ساری دنیا کا سفر کرتی یہاں پہنچی تو اس نے لکھا تھا کہ کوڑھیوں، لنگڑوں اور بھک منگوں کی اس سرزمین مشرق میں صرف جاپان ایک ایسا حیرت انگیز ترقی یافتہ ملک ہے جہاں اندھے بھی بھیک نہیں مانگتے۔ سارے اندھوں کو تیل مالش کے کام پر لگا دیا گیا ہے۔

”سلک گیلریز“ کی خوبصورت عمارت کے باہر دھوپ گھاس پر لہریں مار رہی ہے۔ مہذب خواتین اپنی ساری ”انٹلکچولزم“ چھوڑ چھاڑ ریشم اور شیفون کے تھانوں میں کھو گئی ہیں۔ مرد شیشے کے دریچوں والے برآمدوں اور نفاست سے سجے ہوئے ڈرائنگ روموں میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔

ایشیا میں اطلس کا ہمیشہ سے بہت عمل دخل رہا ہے۔ ”ریشم کی شاہراہ“ جاپان، چین، ترکستان، ایران، بابل، شام، بازنطیم سے گذرتی روم پہنچتی تھی۔ اسی شاہراہ نے مشرق کو مغرب سے تمدنی طور پر ملا رکھا تھا۔ مارکو پولو اسی ”سلک روڈ“ پر چلا ———

تاریخ ——— تاریخ ——— تاریخی حوالوں کا ایک سمندر ہے جو ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور اس میں ہم سب تیرتے جا رہے ہیں اور چائے پی رہے ہیں۔

رات ———

گنزا (چاندی کا شہر) حسب معمول نیون روشنیوں میں نہا رہا ہے۔ اندھیرے آسمان کے مقابل میں اشتہار برقی روشنیوں سے طرح طرح کے پیٹرن بنا رہے ہیں۔ گنزا جو پکیڈلی اور شانزے لی زے اور براڈوے کی مانند ہے جاپان کی موڈرن زندگی کا تابناک ترین رخ ان روشنیوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

سڑکوں پر کھڑی ہوئی سٹریٹ واکر لڑکیوں کی ٹولیاں۔ پیرس کی طرح کے شاندار نائٹ کلب جہاں "اسٹرپ ٹیز" ہو رہا ہے۔ الٹرا موڈرن ریشمی
امریکن سپاہیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان سپاہیوں کی سرپرستی کی وجہ سے اسٹرپ ٹیز جاپان کی قومی انڈسٹری بنتا جا رہا ہے۔

پھر یہاں کی لرزہ خیز انڈر ورلڈ۔ بوہیمیا۔ طوائفیں۔

جاپانیوں کا اخلاقیات کے متعلق بڑا عجیب و غریب رویہ ہے۔ "رات کو یہ لڑکیاں نائٹ کلبوں میں ناچتی ہیں۔ دن میں یونیورسٹیوں میں پڑھتی
ہیں۔ ان کے والدین اسے معیوب نہیں سمجھتے۔" کوئی مجھے بتا رہا ہے۔

"مشرق کی مشہور و معروف شرم و حیا کہاں گئی ——— یہ جاپانی عورتیں جن کی نسائیت کی تعریف کرتے کرتے ہم لوگ مرے جاتے ہیں
——— ان ہی کی بہنیں یہاں ناچ رہی ہیں ——— ؟" میں کہتی ہوں۔

"اسلامی ممالک کی شرم و حیا بھی تو بہت مشہور و معروف ہے ——— لیکن قاہرہ کے نائٹ کلب تم نے نظر انداز کر دیئے اور
واہیات زریں بیلی ڈانس ———" وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔

گنزا کی سڑکوں کے کنارے آرٹ اسکولوں کے طالب علم لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے ایزل سنبھالے تصویریں بنانے میں مصروف ہیں
نیم تاریک گلیوں میں بیٹھے ہوئے مصور ان راہگیروں کے منتظر ہیں۔ صرف ایک شلنگ[1] کے بدلے میں ان سے اپنے اسکیچ بنوا لیں ———
مصوروں کی برادری عالمگیر ہے ———!!

ایک روز میں ایک سوہو اور پکیڈلی کی اعلیٰ ترین تفریح گاہوں کی مانند عظیم الشان کئی منزلہ ریسٹوران میں گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ تو محض نچلے متوسط طبقے
کے لئے ہے۔ مختلف منزلوں پر نچلے اور مزدور طبقے کی لڑکیاں اور لڑکے چاروں طرف بیٹھے چینی چائے پی رہے تھے۔ دیواروں پر دبیز ریشم منڈھا ہوا تھا۔ چھت
پر مصنوعی ستارے جگمگا رہے تھے جن کی مدھم سی روشنی میں کہیں پیچھے سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اتنے میں ہال کے سرے پر جال ہلا اور رفتہ رفتہ آرکسٹرا
کے سازوں اور سازندوں کے سر ابھرتے نظر آئے۔ چند لمحوں بعد آرکسٹرا کا تخت اور مائیک پر گاتی ہوئی لڑکی فلور کے برابر آ گئی۔ کچھ دیر تک آرکسٹرا کا تخت
اس منزل پر رکا رہا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح اوپر کی فلور پر چلے گئے اور کچھ دیر بعد آرکسٹرا نیچے اترتا چلا گیا۔ مسلسل یہی ہوتا رہا۔

یہ ایک ایسا معمولی درجے کا ریسٹوران تھا جہاں اعلیٰ سوسائٹی نہیں آتی ———

ڈیپارٹمنٹ اسٹورز میں بقول شخصے سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک کی خرید و فروخت جاری ہے۔ ان دکانوں میں سلفریجز اور ہیروڈز سے
زیادہ سامان موجود ہے۔ ان کے اپنے ریلوے اسٹیشن ہیں۔ دوسری فلور پر ٹرین آ کر رکتی ہے۔ لوگ خریداری کرتے ہیں اور سامان لے کر باہر سڑک
پر نکل آتے ہیں۔ دروازوں پر ان کے ٹکٹ کی چیکنگ کوئی نہیں کرتا۔ ٹکٹ کے معاملے میں بے ایمانی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختلف فلورز
لفٹ گرلز دروازوں پر کھڑی بار بار تعظیماً جھک رہی ہیں۔ بعض سیڑھیوں کے نیچے استادہ لڑکیاں اناؤنسمنٹ کے ساتھ ساتھ متواتر تعظیماً جھکتی
رہتی ہیں۔ یہ لوگ اس قدر جھکتے جھکتے تھکتے بھی نہیں۔

مے نی چی دنیا کا سب سے بڑا اخبار کا دفتر ہے۔ دن بھر میں جس کے سترہ جاپانی ایڈیشن نکلتے ہیں۔ اس کا اپنا ٹیلی وژن اسٹیشن ہے
اپنے ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر اور کبوتر سروس ——— چھت پر کبوتر پلے ہیں جن سے خبر رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ پریس کلب اپنی آرائش کی وجہ
اچھا خاصا بکنگھم پیلس معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] تقریباً ایک روپیہ

خلاف توقع اس ملک میں امریکن زندگی نظر نہیں آتی۔ لڑکیاں جینز نہیں پہنتیں۔ مرد نہ رنگ برنگے بش شرٹ پہنتے ہیں نہ چیونگ گم کھاتے ہیں۔ ان کا معاشرتی ماحول زیادہ تر انگلستان کی طرح کا ہے۔ مجھ سے ایک اخبار نویس نے کہا کہ یہاں کمیونزم کا زبردست انڈر کرنٹ موجود ہے پتہ نہیں یہ کہاں تک بجا ہے۔

ان لوگوں کے اصل جذبات کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔

کمیونسٹ لیڈروں سے ملاقات بھی شاذ و نادر ہی ہو سکتی ہے۔ جارج مکینن جاپان کے سب سے بڑے کمیونسٹ لیڈر اور پارٹی سکرٹری کا انٹرویو کرنا چاہتے تھے۔ پہلی دفعہ کے بعد ان سے ملاقات کا وقت طے کیا گیا۔ لیکن ہر بار وہ کمیونسٹ لیڈر پیغامبروں کے ذریعے اپائنٹمنٹ ملتوی کرواتے رہے۔ اسی چکر میں جارج مکینن ہمارے ساتھ کیوٹو نہ جا سکے۔ انہوں نے حال ہی میں "ہنگری کا انقلاب" پر کتاب لکھی ہے اور اب مشرقی یورپ میں کمیونزم پر معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آخر بہت انتظار کے بعد ان کو ایک پارٹی ممبر کے ذریعے اطلاع ملی کہ وہ لیڈر ان سے نہیں مل سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے وقت ملک میں کمیونزم اپنے زوروں پر تھی اور بہت ممکن تھا کہ انقلاب برپا ہو جاتا مگر عین وقت پر امریکی امداد نے اس نازک صورت حال پر قابو پا لیا۔

کوئی جاپانی اپنے چہرے پر غصے کے آثار نہیں لاتا۔ کئی دفعہ میں نے دیکھا ٹرک یا سائیکل والے کی ٹکر ٹھیلے والے سے ہو گئی (تین پہیوں والے بڑے اور چھوٹے موٹر ٹھیلے ہیں ہاتھ کے ٹھیلے کوئی نہیں دھکیلتا) ان دونوں نے اُتر کر ایک دوسرے کا گریبان نہیں پکڑا۔ نہ گھونسے تانے نہ گالیاں دیں۔ خاموشی سے افسوس کا اظہار کیا اور اسی سکون کے ساتھ اپنے اپنے راستے چلے گئے۔

ایمانداری کا یہ عالم ہے کہ ساری قوم صدیوں سے لکڑی کے ایسے مکانوں میں رہتی آ رہی ہے جن کی پتلی پتلی کاغذی دیواریں ہوتی ہیں دروازے سرے سے ہوتے ہی نہیں۔ وہی دیواریں ادھر اُدھر کھسکا کر گھر بند کر لیا جاتا ہے۔ تالوں اور چٹخنیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر نہ چوریاں ہوتی ہیں نہ سیندھ لگتے ہیں۔ جبکہ حالت یہ کہ عام طور پر مکان ایسی نفیس چیزوں سے سجے ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ چوری کرنے کو جی چاہے۔

ٹرین نے چہل پہل کرتے ریلوے اسٹیشن کی دیواروں پر چربی اور روغنی فریسکو بنے ہیں۔ ٹرین کی ساری کوچیں ایر کنڈیشنڈ ہیں اور پہلے کے بجا درمیانی کوریڈور کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ سارے ڈبوں میں قالین بچھے ہیں۔ نشستیں ہوائی جہاز کی سیٹوں کی طرح آگے پیچھے ہیں لڑکیاں اور لڑکے انتہائی اسمارٹ یونیفارم پہنے انگریزی اور فرنچ میں اناؤنسمنٹ کرتے پھر رہے ہیں۔ ٹیلی وژن کیمروں سے یہاں بھی مفر نہیں۔ ہر ڈبے میں کانفرنس کے اراکین کا فلم کھینچا جا رہا ہے۔ ایک مغربی مصنف جو سخت متعصب ہے متواتر دبی زبان میں ہر چیز کی برائی کرنے میں مصروف ہے۔

"کس قدر شاندار ٹرین ہے" ——— ایک انگریز رشک اور حیرت سے کہتا ہے ———

انقلابات ہیں زمانے کے ———

صبح کے دھندلکے میں دو سو کے قریب کانفرنس کے مہمانوں کو لے کر ٹرین کیوٹو کی طرف روانہ ہوئی۔ چار کوچیں مہمانوں کے لئے ہیں۔ ٹرین کے چلنے کے بعد سب نے اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ لوگ دریچوں کے پاس گروہ بنا بنا کر بیٹھ گئے۔

باہر حد نظر تک کارخانے پھیلے ہیں جن کی چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ سبزے پر بارش شروع ہو گئی ہے۔ منظر کے

سبز رنگوں کا یہ امتزاج انگلستان کے صنعتی کنٹری سائیڈ کی یاد دلا رہا ہے۔ ہر طرف فیکٹریاں ہیں اور آگے نکل کر تیز ہری گھاس کے میدان اور گھاٹیاں، پہاڑیاں اور دیودار اور پائن کے جنگل جن کے درمیان لکڑی کے مکان بنے ہیں۔ یہاں چاروں اور اتنا حسن ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اصلی مناظر ہیں یا کابکی اسٹیج کی سینری ـــــ

جگہ جگہ سانچی کے پھاٹک کھڑے ہیں۔ ان کے اندر باغات ہیں اور شرائنز۔ چھتریاں لگائے عورتیں گڑیوں کی طرح چلتی لکڑی کے پلوں پر سے گزر رہی ہیں۔ پائن سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر بادل تیر رہے ہیں۔ بادل جھک کر گاؤں پر چھا گئے ہیں۔ دھان کے کھیتوں پر بہتے پھر رہے ہیں، ٹرین کے شیشوں سے ٹکرا رہے ہیں۔

پائن کا درخت صرف صاف ہوا میں بڑھتا ہے۔ یہ شفاف ہوا ہے جو بانس کے جھنڈوں میں سرسرا رہی ہے۔ اس قبرستان پر سے گزر رہی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی قبروں میں مرے ہوئے جاپانیوں کی راکھ دفن ہے۔ چاروں اور پہاڑیوں پر پائن کے سیدھے درخت کہرے میں چھپے کھڑے ہیں۔ کوناسی شکل بل کھاتی سرسبز گاؤں میں سے گزر رہی ہیں۔ برساتیاں اور فل بوٹ پہنے کسان کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ پریس نما سفید پاجامے پہنے اور سر پر سفید رومال باندھے کسان عورتیں پگڈنڈیوں پر سے گزر رہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتی اسٹیشنوں پر مسافر برساتیاں پہنے چھتریاں سنبھالے مغربی پوشاک میں ملبوس خاموشی سے ٹرین کے منتظر کھڑے ہیں۔ بالکل انگلستان کے دیہاتوں کا سا منظر ہے۔

ٹرین دیودار کے درختوں اور بے تحاشا طویل سرنگوں میں سے گزر رہی ہے۔ ان خوبصورت ہرے بھرے پہاڑی علاقوں میں سفر کرتے ہوئے مغربی گھاٹ کا خیال آتا ہے۔

"او ـــــ"

"او ـــــ طورشاں ـــــ"

وہ منہ لٹکا کر ایک نشست کے ہتھے پر ٹک جاتا ہے۔ "میں زین کے مطالعے سے دستبردار ہو چکا ہوں۔"

"بہت اچھی خبر ہے۔"

"وہ دیکھو ـــــ وہ رہا فیوجی یاما ـــــ"

"ہاں!! ابھی اناؤنسر لڑکی کی لاؤڈ اسپیکر پر آواز آئی تھی کہ ہم عنقریب فیوجی یاما ـــــ"

"یہ ٹرین کیا ہے اچھا خاصا ہوائی جہاز اور لکشری لائنر کا مجموعہ ہے ـــــ" طورشاں نے حسبِ معمول پھر ایڈمائر کرنا شروع کیا۔

"ہے تو سہی۔"

"اور تم دل میں سخت نازاں ہو گی کہ یہ عیسیٰؑ کے نہیں گوتم کے پیرو ہیں جنھوں نے یہ کراماتی دنیا آباد کر رکھی ہے۔"

"یہ بھی ـــــ" میں نے جواب دیا۔ "ایک حد تک ٹھیک ہے۔"

"میں مانتا ہوں کہ ان لوگوں کا آرگنائزیشن محیر العقول ہے۔"

"درست!"

"تم تو اس طریقے سے تعریفیں قبول کر رہی ہو گویا تمہارا ہی ملک ہے ـــــ"

"ایشیا تو ہے۔"

"کمال ہے واقعی۔" تاآن نے کہا۔ "جدید تہذیب کے علمبرداروں میں یہ امریکنوں سے بہتر ہیں۔ کیونکہ امریکنوں سے کہیں زیادہ مہذب اور ثقہ ہیں۔ انہوں نے جدید تہذیب کے اصل معنی سمجھ لئے ہیں۔ انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو یکجا کر لیا ہے ——— ان کے یہاں معابد بھی ہیں اور ایکسپریس ہائی وے کا تصور بھی ——— اوہ! ذرا دیکھنا کیل اور مائیکل اپنے کیمروں پر کس طرح جٹے ہیں۔"

لبنان کے کیتھولک عرب کیل الوصحان سر اٹھا کر مسکرائے "ادھر دیکھو ———" انہوں نے دفعتاً کہا ———

اب ٹرین سمندر کے کنارے کنارے جا رہی ہے ——— ریل کی پٹری اور لہروں کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ ہے۔ دوسری طرف پہاڑیوں پر پائنس کے جھنڈ ہیں جن کے ہلکے ہلکے ہرے سبز پتے آبشار کی طرح نیچے گرتے ہیں۔ سمندر کے کنارے کنارے کولتار کی شفاف سڑک پر سے اتامی کا موٹر سائیکل گذر جاتی ہے۔ سمندر پر چھایا ہوا کہرہ پہاڑیوں پر تیرتے بادلوں سے مل جل کر ایک ہو گیا ہے۔

ہماماتسو کے قریب اسکول کے بچوں کا ایک گروہ دھان کے کھیتوں میں سے گذر رہا تھا۔ اسٹیفن اسپنڈر نے کہا ——— ان کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے جب میں دکانوں کی کھڑکیوں میں سے اندر رکھے ہوئے کھلونوں کو حیرت سے دیکھتا تھا۔

مادام ستانوں کہنے لگیں ——— ان مناظر میں کس قدر نسائیت ہے ——— پہاڑوں کو دیکھ کر بھی فطرت کی کرختگی کا احساس نہیں ہوتا۔

اتامی میں گرم پانی کے چشمے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر خوبصورت ہوٹل بنے ہیں۔ ہر طرف جھرنے گر رہے ہیں۔

آسٹریلین نمائندہ کوردپٹوز ہنستا ہر ایک سے یہی دہراتا پھر رہا ہے ——— میں آپ کا ریڈیو آسٹریلیا کے لئے انٹرویو چاہتا ہوں۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد لاؤڈ اسپیکر میں بے حد سریلا گھنٹہ بجتا ہے اور لڑکی کے کسی اناؤنسمنٹ کی آواز آتی ہے۔

آٹھ گھنٹے گذر گئے۔ اب ہم کیوٹو کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ ہمارا اشتیاق اور ایکسائیٹمنٹ بڑھتا جا رہا ہے۔ کیوٹو کے متعلق تعارفی لٹریچر کا انبار تقسیم کر دیا گیا ہے۔ وہاں کی ہسٹری، عبادت خانے، چاء کی تقریب کی تاریخی بیک گراؤنڈ، مرد ڈرائنگ کار کی طرف چلے گئے ہیں جہاں ان کو ساکی پیش کی جا رہی ہے۔

اس ٹرین کا نام سکورا ہے اور اب یہ بیوا جھیل کے کنارے کنارے تیزی سے کیوٹو کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ٹرین نے اوساکا یا ماسٹرنگ کو عبور کر لیا اور اب کاموریا کے پل پر سے گذر رہی ہے۔ اوساکا نے نی چی اور دوسرے انگریزی اور جاپانی اخباروں کے رپورٹروں نے جو ہمارے ساتھ ٹوکیو سے آ رہے تھے فرداً فرداً سب کا انٹرویو شروع کیا۔ آپ کو جاپان کیسا لگا ——— وغیرہ ——— وغیرہ ———

ایک نوجوان رپورٹر مجھ سے یہی سوال کر رہا ہے۔ میں نے اکتا کر کہا ——— بھئی! یہاں کی ہر چیز ناقابلِ یقین ہے ——— اب میں کیا بتاؤں کہ کیسا لگا ———

واقعی ——— ! اس نے خوشی سے کھل کر کہا (اپنی قوم کے کارناموں پر جائز فخر کا موقع ملا کتنی خوش قسمتی کی بات ہے) ——— واقعی ——— اس نے دہرایا ——— یہ تو آپ نے ایک ایسا لفظ استعمال کیا جو ساری تعریفوں پر بھاری ہے۔

(اگلے روز اخبار کے اولین صفحے پر شائع ہوا ——— مس قرۃ العین حیدر کا خیال ہے کہ جاپان کی ہر چیز بالکل ناقابلِ یقین ہے ——— !!)

کیوٹو ——— سر سبز پہاڑیوں پر پھیلا ہوا، جاپان کا قدیم دار السلطنت ——— یہاں بمباری نہیں ہوئی اس لئے "اولڈ ورلڈ" ماحول اب بھی برقرار ہے۔ ہمارا اوکسیڈنٹل طرز کا میاکو ہوٹل ایک پہاڑی کی چوٹی پر ہے جس کے دریچوں میں سے سارا شہر نظر آتا ہے کچھ کچھ مستی

منظر ہے۔ ہوٹل کے عین عقب میں آبشار گر رہے ہیں۔ بارش اب تیزی سے برسنا شروع ہو چکی ہے۔

شام کو ہم لوگ چائے کی رسم کے گرینڈ ماسٹر یوراسینکے کے یہاں مدعو تھے۔ موسلادھار مینہ میں ہم لوگ مسٹر یوراسینکے کی ولا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں باغ کے پھاٹک پر چھتریوں کے انبار سنبھالے لڑکیاں ہماری منتظر کھڑی تھیں۔ کیچڑ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے بارش کے ریلے میں بہتے ہم اپنے میزبان کی خالص جاپانی وضع کی ولا میں پہنچے۔ حسب دستور اندر پہنچ کر جانے کے لئے چپلیں پہلے ہی سے برآمدے کے نیچے موجود تھیں۔ اس وقت ان بڑے بڑے دانشوروں کو جاپانی چھتریاں اٹھائے پاؤں میں شرابور بڑی بیکسی کے عالم میں لڑھکتے پڑھکتے قطار اندر قطار ولا کی طرف بڑھتے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی (ہم سب کا اب تک ایک بہت بڑا خاندان بن چکا تھا)

جاپانی مکانوں میں فرنیچر بالکل نہیں ہوتا۔ صرف چٹائیاں بچھی ہوتی ہیں۔ جابجا پھولوں کے واز نظر آتے ہیں۔ سر برآمدوں پر پینٹنگز یا لمبا سکرول آویزاں ہوتے ہیں۔ مہمانوں کی آمد پر گھر کی بی بی دیوار کے اندر بنی ہوئی نیچی سی الماریوں کا پٹ کھسکا کر کشن نکالتی ہے جو چٹائیوں پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ چوکی کے چاروں اور فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔

یہ کیوٹو کے قدیم ترین ارسٹوکریٹک خاندان کا مکان تھا مگر اس کی سادگی کا بھی وہی عالم تھا۔

چائے کی رسم کے متعلق ہم کو پہلے سے بہت سے لیکچر پلائے جا چکے تھے۔ ٹرین ہی میں اس کی ہسٹری کے متعلق ایک کتابچہ پڑھا لیا گیا تھا۔ یہ بتلایا گیا تھا کہ یہ ایک ایسا Ritnal. ہے جس کی بہت سخت روحانی، مذہبی اور تہذیبی اہمیت ہے۔ یہ جاپانی آداب محفل کا نچوڑ ہے۔ یہاں کے معاشرتی اخلاق کا سمبل ہے۔ پھول سجانے کے فن کے اسکولوں کی طرح یہاں چائے بنانے اور پیش کرنے کے فن کے اسکول بھی ہوتے ہیں۔ جہاں جائے بغیر اعلیٰ خاندانوں کی لڑکیوں کی تعلیم مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ اس رسم کا باقاعدہ ایک پورا فلسفہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یوراسینکے اس ملک کے گرینڈ ماسٹر ہیں۔ ایک قسم کے سجادہ نشین ــــــ اور اس کی آبائی مسند ان کے خاندان میں ہی کوئی آٹھ نو سو برس سے چلی آرہی ہے۔

ان کی بی بی اور بیٹے اور فرنچ بولتی ہوئی بے حد خوبصورت بہو نے ہم لوگوں کا سواگت کیا اور حسب دستور بات بات پر جھک جھک کر سر جھکاتی رہیں۔ یہ لوگ سب کیمونو میں ملبوس تھے۔ ہمیں مختلف کمروں میں بٹھلایا گیا۔ ایک کمرے میں کملا، مادام دلادیا اور میں مزے سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے مگر یورپین خواتین و حضرات کی فرش پر بیٹھنے میں بڑی کمبختی تھی۔ پھر نہایت اہتمام سے کمرے کے سرے پر ایک خاص طرح کی کیتلی میں چائے تیار ہوئی۔ اس کا چولہا فرش کے اندر ایک چھوٹے سے تہ خانے میں بنا تھا۔ ہم سب دم سادھے بیٹھے رہے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ فضا پر زبردست تقدس کا عالم طاری تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ میں کمرے کے کونے میں بالکل دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ میں نے ذرا پیچھے مڑ کر دیکھا ــــ اس کونے کی دیوار نما الماری کھسکا دی گئی تھی اور اس میں سے باغ کا ایک گوشہ نظر آ رہا تھا۔ درختوں کے پتے، باغ کے فرش کے پتھر اور بارش کی پھواریں اوپر کی منزل سے چھنتی ہوئی زرد روشنیوں میں گھل مل کر رہی تھیں۔ یہ اس قدر خوبصورت منظر تھا کہ ہم چائے کی آنے والی عجائبات بھول بھال بار بار باہر جھانکتے رہے۔

اب رنگ برنگے کیمونو میں خوب صورت لڑکیاں سخت سنجیدہ شکلیں بنائے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہمارے سامنے آئیں ــــ دونا جھک کر رکوع میں گئیں۔ سامنے ایک پلیٹ رکھی جس میں ایک عدد لڈو بانس کے ٹکڑے پر پتے میں لپٹا ہوا دھرا تھا۔ سجدے میں گریں۔ جواباً ہم بھی تعظیماً جھکے۔ پھر وہ اٹھ کر اسی طرح چلتی ہوئی واپس گئیں۔ لڈو منہ میں رکھا۔ بے حد بدذائقہ تھا لیکن خاموش رہے۔ معاملہ روحانیت اور تہذیب کی اعلیٰ ترین سمبلزم کا تھا۔ دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔

مگر ابھی کلائمکس باقی تھی۔ اب وہی لڑکیاں اسی طرح بے حد گریس فل انداز میں چلتی ہوئی دوبارہ نمودار ہوئیں۔ ہمارے سامنے آ کر
سجدے میں گریں۔ ایک چینی کے پیالے میں ایک ہرے رنگ کا گاڑھا سا جوشاندہ سامنے رکھا۔ دوبارہ سجدہ کیا۔ ہم بھی جھکے۔ وہ واپس گئیں
میں نے مادام وآدیا سے چپکے سے پوچھا:

"اب کیا ہوگا ——؟"

"اسے پی جاؤ اور کیا ہوگا۔ منہ ہرگز نہ بنانا ——"

"مگر یہ ہے کیا شے۔ خیر ابھی چائے آتی ہوگی۔ اس سے حلق صاف ہو جائے گا۔"

"ارے یہی تو چائے ہے ——" کملا نے مری ہوئی آواز میں کہا —— "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پوری پینا پڑے گی۔ ایک
پیالے میں نہ چھوڑنا ورنہ انتہائی بداخلاقی ہوگی۔"

لہٰذا انتہائی بہادری سے کام لیتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کیں اور انتہائی نفاست سے پیالہ ہاتھ میں اٹھا کر وہ کڑوا ملغو
جاپانی سسٹم طریقے سے چاء چکھتے ہیں؛ میں نے یوں الشافی کہہ کر پی ڈالا۔ کملا اور مادام وآدیا بھی اس فرض سے سبکدوش ہو چکی تھیں اور
سے بیٹھی تھیں۔ یقیناً اس وقت ہم تینوں کے چہروں پر گھڑوں نور برس رہا تھا۔

اس کڑوے کسیلے جوشاندے کے لئے اس قدر دھوم دھام۔ جب سے اس ملک میں آئے تھے مار سب جاپانیوں نے
ناک میں دم کر رکھا تھا۔ چائے کی رسم ایسی —— اور چائے کی رسم ویسی ——

بہت شور سنتے تھے ہاتھی کی دُم کا ——

اس جان لیوا چائے کے بعد چھوٹا سا حقہ پیش کیا گیا۔ سب نے باری باری کش لگائے۔

"اب کیا حقہ بھی پینا ہوگا؟" میں نے لرز کر مادام وآدیا سے پوچھا۔

مگر شکر کہ ہم تک حقہ آتے آتے کچھ ایسا کنفیوژن ہوا کہ ہم تینوں جلدی سے اٹھ کر جھک جھک کر میزبانوں کو Bow
اوپر کی منزل پر پہنچ گئے جہاں بڑی شاندار جاپانی طرز کی ضیافت کا انتظام تھا۔ ہم کئی بار خالص جاپانی دعوتیں کھا چکے تھے لہٰذا اس خوف
کی بھی عادت ہو چکی تھی۔ ایک طرف اسٹیج پر لڑکوں نے نوہ کا ایک ڈرامہ شروع کر دیا۔ زور شور سے باتیں ہونے لگیں۔ امریکن کونسل
کل اور بتایا کہ ہمارے میزبان کا جاپان کی سوسائٹی میں وہی درجہ ہے جو راک فیلر خاندان کو امریکہ میں حاصل ہے۔ ہمارا یہاں مدعو کیا جا
فخر کی بات ہے۔ یہ عزت کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

کھانے کی چوکی پر میرے اور کملا دیوی کے برابر چند فرنچ اور برٹش مصنفین بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر حسب معمول سیاسی گ
ہوگئی۔ ایک فرانسیسی نے دوسرے سے کہا —— "ہندوستانی اور پاکستان والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کر دی
ہیں جنت ملتی ہے ——"

"ہاں ——" دوسرے نے جواب دیا —— "اسی وجہ سے پاکستان میں اب ایک ہندو باقی نہیں۔ سب قتل ہو چکے
انڈیا میں چُن چُن کر مسلمانوں کو بھون ڈالا گیا ہے ——"

وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سنی ان سنی کرنا چاہی۔ کیونکہ میں ہندوستان اور پاکستان کی اس سیاس

سب بے طرح عاجز آچکی تھی۔ مگر کملا دیوی کے آگ ہی تو لگ گئی۔ اپنا غصہ چھپا کر انہوں نے رسان سے فرانسیسیوں سے کہا: "آپ تو بڑے دانشمند لوگ ہیں اور یہ آپ کی جہالت کا عالم ہے ——— ہم کو تو آپ کے بھائیوں انگریزوں نے لوٹ لیا" ——— وغیرہ وغیرہ ——— "آپ لوگ ———" وہ سُرخ ہو گئیں ——— "آپ تو نیٹشے کو ماننے والے ہیں۔ سارے کے سارے یورپین اور آپ نے کس طرح ایک دوسرے کو تباہ کیا ہے۔ اپنے ہی گرجاؤں پر بمباری کی ہے ——— لاکھوں کو پچھلی جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیا ——— آپ جو بڑے تہذیب اور انسانیت کے ٹھیکیدار بنتے ہیں:

"کیوں بیکار سر کھپاتی ہیں" میں نے ان سے کہا۔ "ان کو سمجھانے کا کیا فائدہ ہے۔ کیا یہ میری یا آپ کی بات سے سمجھ جائیں گے؟"

"واہ ——— واہ ——— ذرا ان کی باتیں تو سنو ———"

"مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ نہرو پاکستان کو غلام بنانا چاہتے ہیں ———؟" ڈنمارک کے ناولسٹ نے کملا دیوی کو مخاطب کیا۔ "نہرو کو کیا حق ہے کہ وہ پاکستان کو غلام رکھے۔ پاکستان صدیوں سے ہندوستان سے علیحدہ قوم ہے جسے انگریزوں نے برٹش انڈیا کے نام سے ہندوستان کے ملک سے مدغم کر رکھا تھا۔ اب نہرو کو کیا حق ہے کہ وہ پاکستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے ——— پاکستان کی انڈیا سے بالکل جداگانہ پانچ ہزار سال قدیم تہذیب ہے ——— کیا یہ صحیح نہیں ———؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"کملا دیوی ——— !" میں نے ان سے کہا ——— "ان سب باتوں کا جواب آپ ان کو دیجئے۔ میں تو کھانا کھا رہی ہوں۔ چاء نے الگ منہ کا مزا کرکرا کر دیا۔ جانے اس میں دھتورہ ملا دیا گیا ———"

"ابھی ہو گا دھتورہ ——— ان لوگوں کی باتیں تو دیکھو ——— ذرا ان کو اصلیت سمجھاؤ ———"

"اصلیت سمجھاؤں ——— کس کو ——— اصلیت سمجھنے پر کون آمادہ ہے ———"

چاروں طرف لوگ حسبِ معمول قہقہے لگا رہے تھے۔ ڈنمارک کا ادیب کملا دیوی پر برس رہا تھا ——— بار بار وہ مجھے دیکھتا کہ دیکھو میں تمہاری کیسی ترجمانی اور طرفداری کر رہا ہوں ———

میں ایوانِ ضیافت سے باہر نکلی تو سب شانزدن جھک کر اخلاق سے مسکرائے۔ ادامہ وآریا نے کہا ——— "ارے یہ تم اس قدر مضمحل کیوں ہو رہی ہو ———؟"

"کچھ نہیں ——— چاء کا اثر ہے ———" میں نے جلدی سے جواب دیا اور باہر آگئی ———

دوسرے روز صبح نین ریوجی مندر میں کانگریس کا آخری سیشن تھا۔ کیوٹو کے اخبارات نے ٹوکیو کے اخباروں کی طرح ہمارے متعلق سپیشل ایڈیشن نکالے تھے۔ ایک اخبار میں "**Hemming beck Hoax**" کے عنوان سے ایک مزاحیہ مضمون چھپا تھا جو کسی نے "معین براؤن" کے فرضی نام سے لکھا تھا ———[1]

"ولیم ہیمنگ بک نوبل پرائز وِنر ناولسٹ ابھی تک جاپان میں ہیں۔ اس وقت وہ ٹوکیو سے سینڈائی آنے کے لئے ایکسپریس ٹرین میں سوار ہیں۔ سینڈائی میں وہ وہاں کے اتاشے کلب کے مہمان ہوں گے۔ وہ حسبِ معمول اپنی بزرگ دوست ایبرا یونو اور ملٹن براؤن کے ہمراہ ہیں۔ ٹرین کے دریچوں سے بارش کی بوچھار دیکھ رہے ہیں۔

---

[1] یہ پن کلب کی پیروڈی تھی۔

ہیمنگ بک : جون اور جولائی کی بارش کے بعد آپ کے یہاں اگست کا مہینہ بھی ہوتا ہے؟

بونو : آئیے بشاشت کی باتیں کریں۔

ہیمنگ بک : اچھا! جاپان میں فاکنر کی مقبولیت کی کوئی ایک قابلِ قبول وجہ بتاؤ۔

براؤن : ایک وجہ میں بتاتا ہوں جو یقینی سی ہے۔ فاکنر مشکل بہت ہے۔

بونو : موصوف مشہور ہیں۔ جنس اور قتل کی ان کے یہاں فراوانی ہے اور مشکل ہیں۔

ہیمنگ بک : مشکل ——!!

براؤن : کیا آپ کو یہ معلوم نہ تھا؟

ہیمنگ بک : خداوندا! فاکنر کی شرابی تحریر سے تیر کر سو بار باہر نکل آتا ہوں تو بڑا شکر ادا کرتا ہوں۔ کیا جاپانیوں کو اس قسم کی نشہ آور عبارت
پسند ہے۔ انگریزی ایسے ہی بہت مشکل ہے ان کی سمجھ میں آتی ہوگی۔ تمہارا مطلب ہے کہ جاپانی طالب علم جو چیز ان کے پلّے
بالکل نہیں پڑ سکتی اسے بھی ایڈمائر کرتے ہیں ——؟

بونو : اکثر ——

براؤن : اور اکثر اس لئے زیادہ ایڈمائر کرتے ہیں کہ ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔

ہیمنگ بک : میں یہ بات نہ سمجھ سکتا ہوں نہ ایڈمائر کرتا ہوں۔

بونو : آہ —— پُراسرار مغرب!

ہیمنگ بک : جاپان میں مقبول ترین ناولسٹ کون کون ہیں —— آجکل؟

بونو : فاکنر، ہیمنگ وے، اشٹین بک اور آپ۔

براؤن : ڈوس پیسس۔

بونو : ارسکن کالڈویل اور پرل بک۔

براؤن : اور آپ کی مقبولیت کی چند معقول وجوہات ہیں چند نامعقول۔

ہیمنگ بک : لیکن ہم سب تو "مشکل" ادیب نہیں ہیں۔ ہیمنگ وے اور اشٹین بک اوسط فاکنر کی مانند دقیق نہیں ہیں نہ کم تر ہیمنگ ب
کی مانند ——

براؤن : "مشکل" ہونا یہاں مقبولیت کے لئے لازمی نہیں لیکن ایک حد تک فائدہ مند ضرور ہے۔ گو چند طالب علم اور اسکالر ایسے بھی
یوں ہیں کہ جو چیز آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے اسے کم پسند کرتے ہیں۔

ہیمنگ بک : (بڑبڑاتے ہوئے) مشرق کی طرح مغرب میں بھی ——

بونو : آہ پُراسرار —— ایں —— آپ کا کم تر ہیمنگ بک سے کیا مطلب تھا ——؟

ہیمنگ بک : میری تحریریں جب بہت زیادہ فاکنر کی طرح ہوں تب بے حد معمولی اور جب زیادہ مشکل پسندی پر نہ اتر دوں تو بہتر ہوتی ہیں
ایک مشہور نقاد کے الفاظ ہیں۔

براؤن : بالکل صحیح۔

یونو : لیکن ہم جاپانی آپ کی ادق تحریروں ہی پر عاشق ہیں خصوصاً " For Whom Absolom, For Whom ! "

ہیمنگ بک : غضب خدا کا ——— اب ایک راز سنئے ——— جب میں یہ راز لوگوں پر منکشف کرنا چاہتا ہوں تو لوگ مانتے ہی نہیں ——— (وہ باہر لینڈ اسکیپ پر برستی ہوئی بارش کو دیکھتے ہیں) جاپان میں ایسی کیا چیز ہے جو مجھے اپنی تحریروں کے متعلق راز عیاں کر دینے پر آمادہ کئے ڈال رہی ہے؟

براؤن : ایک غیر قوم کو اپنی فطرت کی عادتوں کے لئے موردِ الزام نہ ٹھہرائیے ——— اپنی ماسٹر پیس چیزوں کے متعلق اعترافات کرنے میں آپ کو کب تکلف ہوا ———؟

ہیمنگ بک : لیکن اب کے سے تو میں اپنے Minor piece کے متعلق اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔

یونو : یا الٰہی! Absolom کو آپ ماسٹر پیس کہتے ہیں تو پھر ماسٹر پیس کون سے ہیں؟

ہیمنگ بک : "Farewell to Grapes," "Of Mice and women," "The Dust Also Rises."

یونو : لیکن ہم جاپانی تو محض اسی لئے آپ کی دوسری کتابیں بھی پڑھ لیں گے کہ آپ نے Absolom لکھا ہے۔

براؤن : یہ حضرات آپ کا بہترین ادب اس لئے گوارا کر لیں گے کیونکہ آپ کے بدترین ادب پر عاشق ہیں۔

یونو : آپ کو Absolom کیوں پسند نہیں ———؟

ہیمنگ بک : ایک تو یہ کہ مجھے کچھ پتہ نہیں اس کا مطلب کیا ہے۔

یونو : آپ ہی نے لکھا تھا اسے۔

ہیمنگ بک : یہ میں مانتا ہوں۔ مگر یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ کتاب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں نے اسے مذاقاً لکھا تھا لیکن لوگ اس کے متعلق سنجیدہ ہو گئے۔ میں نے محض یہ دیکھنا چاہا تھا کہ جس طرح کا [illegible] لٹریچر میرے دوست اور دشمن لکھنے میں جٹے ہیں اور اس کی بدولت شہرت اور دولت حاصل کر رہے ہیں ایسا میں بھی لکھ سکتا ہوں یا نہیں۔ چنانچہ میں بھی ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر جو الم غلم دماغ میں آئے لکھتا چلا گیا ——— یعنی

bestial Absolom heating
bushes about David with a fountain pen stockings
in the dark runs of fish-nets sewn with tiny hairs,
curly, intestinal, flopping

یہ تو گویا اسٹائل ہو گیا بعد جو پرانی ناکارہ ادھوری کہانیاں درازوں میں پڑی تھیں ان میں سے چھان پھٹک کر "پلاٹ" نکال لیا۔ Absolom تیار تھا ——— میں تم سے کہتا ہوں یہ سب مذاق تھا، پیروڈی، ہوکس ———

براؤن : یعنی نثر کی پیروڈی a meter hoax میں ———

یونو : اس اطلاع سے جاپان کی ادبی دنیا میں زلزلہ آ جائے گا۔

ہیگنگ بک : (اگر تم لوگوں نے میرا یقین کیا بھی۔ مغرب میں تو سمجھا جاتا ہے کہ میں تہلکہ خیزی کے لئے سب کہہ رہا ہوں تاکہ کتاب زیادہ بکے وہاں بالکل نہیں بکتی)

براؤن : یہاں بھی مشکل ہی ہے کہ آپ کی بات مان لی جائے کیونکہ یہاں کے ریسرچ اسکالرز پر بڑی ایکٹوٹی ہو جائے گی۔ آدھ درجن کے قریب اسکالرز کو میں جانتا ہوں جو Absolom پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

یونو : آہ —— پُراسرار مغرب —— جاپانی اسکالرز پر یہ ستم نہ ڈھائیے۔

براؤن : غم نہ کرو۔ اس کتاب میں اگر کوئی معنی ہیں تو یہاں کے اسکالرز ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس سے مصنف کو بھی فائدہ ہوگا۔

یونو : (چہرہ زرد ہو جاتا ہے) مگر وہ تو معنی پہلے ڈھونڈ چکے ہیں۔

ہیگنگ بک : یہ بڑی زیادتی ہے۔ میرے ریسرچ اسکالر مجھ سے زیادہ چار سو بیس نکلے —— عظیم تر ہوکس —— ! —— کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں ہوکس ہوں ——؟

براؤن : اب تک نہیں —— دیکھو ٹوکیو کے ایک بڑے بھاری نقاد نے اس مضمون میں تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ آپ مندرجہ ذیل مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں:
تھیوڈور ریڈلیس، جان سے ووڈ، مسز آفرابن، جیک لنڈن، فیودر تیو جیف، پرنسٹن کے طلبائے قدیم کا میگزین، اکینو سورالوکی، ایڈمنڈ ملبنٹن اور وولف ایم فان ایکن باخ ——

یونو : میرے سر میں درد ہو رہا ہے —— آہ —— پُراسرار مغرب —— کس کے لئے سنڈائی —— کس کے لئے —— Absolom —— کس کے لئے یونو ——
(لڑکی کا اناؤنسمنٹ لاؤڈ اسپیکر پر) ہم تاریخی، تہذیبی شہر سینڈائی پہنچنے والے ہیں ——

ہیمنگ بک : یونو کو اسپرین دو ——

براؤن : بیکار ہے۔ بے ہوش ہو چکا ہے غریب۔ آئیے —— سینڈائی آگیا۔ انک کانفرنس میں آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا ——

میں نے اخبار تہ کر کے اینگس وِلسن کو دے دیا۔
ہم لوگ تین ریوجی مندر کی سمت رواں تھے جہاں کانگریس کا آخری سیشن ہونے والا تھا۔
"اس جگہ 'روشومون' کی شوٹنگ ہوئی تھی ——" گائیڈ لڑکا ڈرائیور کی سیٹ کے قریب کھڑا مائیک میں کہہ رہا تھا ——
ہوتی ہوگی بھٹی میں کیا کروں —— میں نے دل میں کہا۔
ان گائیڈ لوگوں نے اپنی اطلاعات سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ "ہاں تو پھر کیا ہوا؟" اینگس وِلسن نے بات جاری رکھی۔
"ہونا کیا —— میں نے ناول ختم کر لیا مگر وہ مسئلہ پھر بھی حل نہ کر پائی۔ کیا لکھنے سے حل مل جاتا ہے ——؟"
"پتہ نہیں —— دراصل ——"
میں اور اینگس وِلسن حسبِ معمول زور و شور سے ایک اور بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

نفرت کا مسئلہ میری تمام تر توجہ کا مرکز ہے۔ میں نے امریکن ناولسٹ جیمس فیرل سے بھی ایک مرتبہ اس کے متعلق سوال کیا تھا۔ جاپان آنے سے چند روز قبل میں نے ایک طویل ناول لکھ کر ختم کیا تھا جس میں میں نے نفرت کا مسئلہ سلجھانے کی کوشش کی ہے مگر محض حل تلاش کرنے سے حالات تو نہیں بدل جاتے ———)

اب بارش ختم ہو چکی تھی مگر آسمان ابر آلود تھا۔

" کتنی خوبصورتی ہے یہاں پر ———" اینگس ولسن نے کہا۔

" ایسے پیارے ملک میں رہنے والے حسن کار تو لامحالہ ہونے چاہئیں مگر ساتھ ساتھ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا ———" میں نے کہا۔

" ان لوگوں میں بڑی سادگی ہے۔" اینگس ولسن نے جواب دیا۔

" مگر تمہیں معلوم ہے سادہ طبیعتیں بڑی ظالم ہو سکتی ہیں۔ ان کے آرٹ میں ان کی شاعری میں کسی چیز میں گہرائی یا مابعد الطبعیات کا دخل نہیں۔ یہ چین یا ہندوستان کی طرح گمبھیر لوگ نہیں ہیں ———"

" جرمن تو بڑے گمبھیر لوگ ہیں۔ فلسفہ اور موسیقی اور مابعد الطبعیات ——— اور انہوں نے انسانیت کے ساتھ کیا کیا ——— شدید طور پر مہذب اور متمدن انسان اتنی ہی شدت سے وحشی بھی ہوتا ہے ———"

میں نے جواب دیا ——— " اس کی کیا وجہ ہے ———؟"

" میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ انسانوں نے ظلم اور آرٹ کو کس طرح ملایا ہے۔ میں جرمنی میں بھی یہی جاننے کا متمنی تھا لیکن وہاں کنسنٹریشن کیمپوں کے متعلق کوئی کچھ نہیں بتاتا ——— یہ کیا اسرار ہے ———"

" مجھے جاپان آئے اتنے دن ہو گئے مگر یہ لوگ کھل کر بات کرنا ہی نہیں چاہتے ———" میں نے کہا۔

" یہ عظیم الشان کانگریس میرے لئے بہت ڈراؤنی ثابت ہوئی ہے ——— اس میں میں نے نفرت کے بڑے زبردست انڈر کرنٹ محسوس کئے ہیں ——— بہت سے دھارے جو سطح کے نیچے متواتر رواں تھے ———" اینگس ولسن نے کہا۔

" بنیادی مسائل کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا ——— کل میں نے اسرائیل اور لبنان اور مصر کے نمائندوں سے علیحدہ علیحدہ بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کے بجائے وہ مجھے اپنی کھینچی ہوئی تصویریں دکھانے لگے ———" میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ بس میں ہر طرف حسب معمول زور شور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ———

" پتہ نہیں۔" میں نے دوبارہ کہا ——— " انسان کی فطرت کے راز سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کل ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس کانگریس کی مہمانداری کے لئے جس پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوا ہے، اس میں امیروں، وزیروں، تجارتی اداروں اور یونیورسٹیوں کے عطیات کے علاوہ اسکولوں کے بچوں، کسانوں اور ہسپتالوں میں لیٹے ہوئے مریضوں کا چندہ بھی شامل ہے ——— یہاں ہر انسان واقعی یہ محسوس کر کے خوش ہو رہا ہے کہ دنیا کے ادیب اس کے ملک میں جمع ہوئے ہیں ——— اسے ایک انتہائی اکتا دینے والا نعرہ سمجھا جاتا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ دنیا کے عوام امن چاہتے ہیں ———"

"یہ ہمارا سب سے بڑا ڈپارٹمنٹ اسٹور ہے ——" ڈاؤن ٹاؤن ٹوکیو میں سے گذرتے ہوئے گائیڈ نے فخریہ اطلاع دی ——

"نہ جانے یہ لوگ اپنے ڈپارٹمنٹ اسٹورز دکھانے پر اس قدر مُصر کیوں ہیں ——" اینگس ولسن نے اُداسی سے کہا۔

"غالباً اس لئے کہ اس وقت ان مندروں سے زیادہ بجلی کے کارخانوں اور ڈپارٹمنٹ اسٹورز کی ضرورت ہے۔ آپ ایشیا کو اب تک ٹورسٹ کے رویے سے دیکھنا چاہ رہے ہیں۔"

"میں ٹورسٹ رویہ نہیں" اینگس ولسن نے جواب دیا۔ "مگر قصبہ یہاں گھر گھر ٹیلی وژن دیکھ کر مجھے بے انتہا کوفت ہوئی کہ یہاں بھی روحانی بے اطمینانی اور ذہنی تہی مایگی کا وہی عالم ہو جائے گا جس سے مغرب عاجز آ چکا ہے ——"

"اور جی، لہٰذا ہم لوگوں کو موم بتیوں کی روشنی میں بانسریاں بجانی چاہئیں —— آخر آپ کو اس پرانی رومینٹک دنیا کو تباہ کرنے کا کیا حق ہے —— ! اور یہ کہ subsidised انٹلکچوئلز ——"

"اوہو یا —— بہت اچھی ترکیب استعمال کی تم نے ——" انہوں نے میری بات کاٹی —— "مگر بتاؤ آج کل انٹلکچوئلز کا ایک حد تک subsidised ہوئے بغیر کام چل سکتا ہے ؟"

"میں پچیسویں بار آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آج کے برطانوی ادیب کا مقصد کیا ہے —— احساس جرم —— ؟ یہ پچھتاوا کہ آپ نے ٹیلی وژن جاپان میں متعارف کر کے یہاں کا روحانی سکون تباہ کر دیا ؟ اس کی پرسپیکٹ کہ آپ نے اسپین کی خانہ جنگی میں حصہ لیا و مغربی یورپ کی مسیحی تہذیب اور بازنطیم کی روایات کی تجدید ؟ کیتھولک عقیدہ ؟ ہیومنزم —— ؟ ہیومنزم آج کی دنیا کے context میں سخت بوگس لفظ ہے —— لہٰذا جناب والا آپ اس سوال کا آج قطعی طور پر اطمینان بخش جواب عنایت فرمایئے اس لئے کہ آپ پوسٹ وار انگلستان کے ان دو یا تین بہترین ادیبوں میں سے ہیں جن کو میں اہم سمجھتی ہوں۔ گراہم گرین کو مذہب ہی سے فرصت نہیں۔ ڈیلن ٹامس مر گئے۔ مسٹر اسپنڈر کو ان کے جہاد نے کہیں کا نہ رکھا —— آخر جہاد کا ہے کے لئے کیا جا رہا ہے —— کمیونزم سے ایشیا کو بچانا چاہتے ہیں —— آپ ایشیائی ادیبوں کو اپنے مسائل سے آپ ہی نپٹنے دیجئے —— ادب میں آزادی کے قائل ہیں —— برطانیہ آزادی کا ہمیشہ سے زبردست علمبردار رہا ہے مگر ایک امریکن رسالہ انگلستان سے چھپتا ہے تو اس پر اصرار کیا جاتا ہے کہ اسے انگریزی رسالہ سمجھا —— میں یہی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں آپ آزادی اظہار کے حامی کس حد تک subsidised ہونا پسند کریں گے۔"

اتنے میں ایک فرنچ ادیب ایک جاپانی میزبان کے ساتھ آ کر برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے صبح کے اخبار کا مزاحیہ مضمون یاد آ گیا۔ میں نے وہ اخبار اینگس ولسن سے لے کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

باتوں اور قہقہوں کے شور میں بس سڑک پر رواں رہی۔ اب بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ ہم پیچ در پیچ راستوں سے نکلتے مندر کے باغات میں داخل ہوئے جن کو سرسبز پہاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ چاروں اور بالکل آسام کے ایسے مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ فرنچ اور جاپانی ادیب اٹھ کر پیچھے چلے گئے ——

"جاپانی ——" اینگس ولسن نے اصل موضوع پر پلٹتے ہوئے کہا —— "فرانس کو اپنا کلچرل اور ذہنی گرو مانتے ہیں حالانکہ فرانس آج کی دنیا میں بے انتہا غیر حقیقت پسندی کا ثبوت دے رہا ہے۔"

ہم مندر کے نزدیک پہنچ گئے۔ باغ کی سیڑھیوں پر کیوٹو کے باشندوں کا ہجوم کیمرے لئے منتظر تھا۔ اس ملک کے ہر فرد بشر کے ہاتھ میں ایک کیمرہ ہوتا ہے۔ مندر کے برابر میں ایک اور باغ تھا۔ ہم میں سے چند لوگ ٹہلتے ہوئے اس کے پھاٹک کے اندر چلے گئے ———

"جاپانی خانقاہ کے باغ ہیں" ——— یہ تو کسی صوفی کا نام ہو سکتا ہے ——— میں نے کہا۔

پلٹ کر دیکھا تو اسپنڈر وہاں دیوداروں کے نیچے فکر شعر میں مبتلا ٹہل رہے تھے۔ دوسری طرف ڈونلڈ کین ایک پتھر پر بیٹھا جاپانی میں نظم لکھنے میں جٹا تھا ———

اسپنڈر نے لکھا ———

Gray temple in green moss　　Nature pure yet designed
The well under the rock　　Spring renewing the mind

اب دھوپ نکل آئی ہے۔ تین ریوجی مندر سے چند گز کے فاصلے پر فر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ مندر کے عقب میں پہاڑیوں کے کنارے کنارے ایکڑوں پر پھیلی ہوئی جھیل کنول کے پھولوں سے پٹی پڑی ہے۔ صاف شفاف لکڑی کا بنا ہوا یہ مندر دھوپ میں جگر جگر کر رہا ہے۔ اس کے باغات کی صناعی زین فلسفے کی سمبل ہے۔ پہاڑی کے دامن میں درختوں اور پھولوں میں چھپے ہوئے چھوٹے چھوٹے معبد خوبصورت چوبی کوریڈورز کے ذریعے بڑے مندر سے ملحق ہیں۔ اس کے فرش آئینے کی طرح شفاف ہیں۔ درختوں اور پھولوں اور جھیل کی لہروں کے رنگوں نے منظر کے خالص حسن کو رنگ خیز بنا دیا ہے۔ باغ کی مصنوعی چٹانیں اور جھرنے سونگ عہد کی چینی پینٹنگز کی یاد دلاتے ہیں۔ سونگ عہد کے زین مذہب کی بنیاد پر یہ مندر ایک جاپانی وار لارڈ کے حکم سے ۱۳۳۹ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مندر کے برآمدے کی دیواریں تیرھویں اور چودھویں صدی کے چینی پروہتوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطاطی کے نمونوں اور پرانے شہنشاہوں کی تصاویر سے مزین ہیں۔ کچھ لوگ برآمدے کے باہر لکڑی کے جنگلے پر ٹک گئے ہیں، کچھ پہاڑیوں کے دامن میں گھوم رہے ہیں۔ چاروں طرف ٹیلی ویژن کیمرے چل رہے ہیں۔

اب کانگریس کا آخری سیشن شروع ہو چکا ہے۔ سب لوگ بڑے ہال میں فرش پر بیٹھ گئے ہیں۔ پہلو میں برآمدے کے باہر پہاڑیاں اور جھیل ایک عظیم الشان پینٹنگ کی طرح نظر آ رہی ہے۔

انگس ولسن مائیک پر جا کر کہہ رہے ہیں ———

"یہ بڑی امپریشنسٹک دنیا ہے۔ منظر بدلتے ہیں۔ ایک ایک درخت ایک بادل کی جھلک دکھلائی دیتا ہے۔ پھر دفعتاً منظر بدل جاتا ہے۔ ماحول کے مادری رنگ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیوٹو سے یہاں آتے ہوئے مسٹر اسپنڈر اور مسٹر موراویا نے کہا کہ یہ جگہ سوئٹزرلینڈ کی سی ہے۔ میں نے کہا ان مناظر میں آسام کی جھلک ہے مگر ان باغوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ جاپان اور صرف جاپان ہے۔ اس کانفرنس میں بڑی اچھی اچھی باتیں طے کی گئی ہیں۔ مجھے اب صرف اتنا کہنا ہے کہ مزاح جس ایک قوم کی ذہنی اور جذباتی پختگی کی سب سے بڑی علامت ہے۔ کل شام جب ہم چائے کی رسم کے لئے جا رہے تھے اس وقت بڑے بڑے بین الاقوامی شہرت کے لوگ پانی میں بھیگتے عجب نخرے کرنے لگے۔ ایک بے حد مشہور آدمی کو میں نے عجب

کیونکہ حالات میں افتاں و خیزاں دِلائی طرف بڑھتے دیکھا اور مجھے ہنسی آگئی۔ اس کی توقیر اور عزت کو قائم رکھنے کے لئے میں نے اپنی ہنسی روکی اور آگے بڑھ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہا تھا۔ میری توقیر برقرار رکھنے کی خاطر اپنی بے تحاشا ہنسی چھپانے کی کوشش کرتا کپڑوں میں پیچ کرتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔

"اپنے اوپر اور دوسروں کے اوپر ہنس لینا بہت بڑا وصف ہے۔ حالات میں مضحکہ کی صورت پہچان کر اس سے محظوظ ہونے اپنا مذاق آپ اُڑانے اور اپنا مذاق اُڑائے جانے پر بُرا نہ ماننے کی اہلیت سب سے بڑی نعمت ہے ـــــ"

مندر کے بڑے ہال میں بھکشوؤں کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا کھانا کھانے کے بعد ہم نے بسوں میں لد پھند کر شاہی محلات کا رُخ کیا۔

جاپانی ذہن میں اختراع کا مادہ بہت ہی کم ہے۔ یہاں کی ہر چیز چین اور ہندوستان کی تقلید میں بنائی گئی۔ کیوٹو کا لے آؤٹ بالکل چینی شہروں کا ایسا ہے۔ جن لوگوں نے پیکنگ کے شاہی محلات دیکھے ہیں ان کا کہنا ہے کہ کیوٹو کے یہ امپریل مکانات ان کے پاسنگ بھی نہیں۔ یہاں کے شہنشاہ بھی کس قدر سادگی سے رہتے تھے۔ ساری شاہی عمارتیں لکڑی کی ہیں۔ کارونیشن ہال کے دروں پر چقیں پڑی ہیں۔ معمولی سا ایک ایوان جسے دیوانِ خاص یا دیوانِ عام جو چاہئے کہہ لیجئے۔ اس کی ساری آرائش چینی فلسفیوں کی قدِ آدم تصویروں پر مشتمل ہے جو دیوار پر منقش ہیں۔ بادشاہ سلامت کے معمولی سے تخت کے دونوں طرف دو شیر بنے ہیں جن کو یہاں چینی کتے کہا جاتا تھا۔ کیونکہ جاپانیوں کو معلوم ہی نہ تھا کہ شیر کس جانور کا نام ہے۔ شیر کے یہ مجسمے بھی چین سے آئے تھے۔ محلات کی ان گنت ڈیوڑھیاں، صحن اور چہار دیواری ہمیں بعید مانوس معلوم ہوئی۔ ہم واقعی مشرقی ہیں ہیں۔

کیوٹو میں مہاتما بدھ کے چودہ سو مندر ہیں اور باغ ـــــ باغ ـــــ جاپان کے لینڈ اسکیپ باغات کی خوبصورتی کو آسانی سے بیان نہیں کیا جاتا ـــــ انہیں صرف دیکھنا اور محسوس کرنا چاہئے۔

یہ کستورا محل ہے ـــــ سولھویں صدی کے شہزادے توشی ہی ٹو کی ولا جس کے حد سے زیادہ خوبصورت باغ کے وسط میں بہت بڑی جھیل جس کے چاروں اور پہاڑی راستے ہیں۔ پہاڑیوں پر پائن کے درختوں میں ٹی ہاؤس چھپے ہیں جہاں یہ شہزادگانِ عالی مرتبت سر پر چٹیاں رکھائے دو زانو بیٹھے وہ کڑوا جوشاندہ پی پی کر خوش ہوتے ہوں گے۔ پگڈنڈیوں کے کنارے پتھر کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت لالٹینیں نصب ہیں جو جاپان کی خاص چیز ہے۔ چھوٹی چھوٹی مصنوعی ندیوں پر پُل بنے ہیں۔ معطر کنجوں میں آبشار گر رہے ہیں۔ کیمرہ مین کی پوری پلٹن حسبِ معمول ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے (ہم سے مراد ہم تین ساری پوش خواتین ہیں) اب تک ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کانگریس کی مندوبین مغربی خواتین کو ہماری اتنی پبلسٹی مطلق پسند نہیں آئی۔ مگر دراصل ہماری وجہ سے نہیں ہماری ساریوں کی وجہ سے یہ سارا ہنگامہ تھا۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم تینوں نے ساریوں کے بجائے فراک پہنے ہوتے (خدانخواستہ) تو ہرگز اتنا نوٹس نہ لیا جاتا۔ اس تصویروں ہی کے سلسلے میں ہم تینوں مرتے مرتے بچے۔

کستورا محل کے باغات کا چکر لگاتے ہوئے ہم جھیل کے ایک بہت اونچے پُل پر چڑھے جو دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو ایک دوسری سے ملاتا تھا۔ بغیر جنگلے کا یہ پُل اتنا تنگ تھا کہ بمشکل دو آدمی اس پر سے ساتھ ساتھ گذر سکتے تھے۔ بہت احتیاط سے قدم رکھتے باتوں میں مصروف میں اور رما دام راؤ آدیا آگے آگے جا رہے تھے کملا چند حضرات کے ساتھ ذرا پیچھے تھیں۔ یک لخت دائیں طرف ہماری نظر پڑی ـــــ دور نیچے پانی کے کنارے پر کوئی پچیس کیمرہ مین اور فوٹوگرافر اپنے کیمروں کا رُخ ہماری طرف کئے ڈٹے ہوئے تھے۔ "ذرا رُکئے گا" ـــــ انہوں نے چلا کر کہا ـــــ [illegible] ـــــ "ہم لوگوں نے دوسرا قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اسی لمحے دوسری طرف سے آواز آئی ـــــ "صرف ایک منٹ ـــــ" ہم نے چونک کر ادھر دیکھا۔ پُل کے بائیں طرف جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک اور پلٹن اسی طرح مستعد کھڑی تھی۔ یہ لوگ غالباً مخالف ٹیلی ویژن

اور اخباروں کے ناشر رہے تھے) آواز پر چونک کر دوسری طرف مڑنے میں ہم تینوں گرنے سے بال بال بچے ورنہ غڑاپ سے جاتے نیچے جھیل میں سارا آرٹ وارٹ کچر ولچر دھرا رہ جاتا۔

شام کو بہت امیر کبیر آدمی کے گھر میں ضیافت ہے جو کیوٹو کا بہت بڑا مل ٹائیکون ہے۔ بہت ساری چاردیواریوں اور ڈیوڑھیوں کو طے کرنے کے بعد ہم ایک اور بے حد وسیع لینڈ اسکیپ گارڈن میں پہنچے ہیں جو ہمارے میزبان کے گھر کا پائیں باغ ہے۔ پھاٹک پر گیشا لڑکیاں استقبال کے لئے موجود ہیں۔ گھر کی بیبیاں مکان کے اندر ہیں (جاپان میں الٹرا موڈرن اور فیوڈل تہذیبوں کا یہ امتزاج عجیب و غریب ہے)

گھر کے اندر جاکر میں نے اور مادام وادیا نے کڑوا جوشاندہ پیا۔ پھر باہر آکر ٹہلنا شروع کیا۔ سارا باغ گھوم ڈالا۔ نیم تاریک راستے، جھیل کے کنارے، خوبصورت پویلین، سارے پویلین چھان مارے مگر کھانے کے لئے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دفعتاً میں نے مادام وادیا سے کہا ——

"بڑا سناٹا ہے۔ سب لوگ کہاں غائب ہوگئے؟"

"اتنا بڑا باغ ہے۔ ادھر ادھر ہوگئے ہوں گے ——" انہوں نے جواب دیا۔ "چلو اس طرف چلیں۔ شاید کچھ ٹھکانے کی چیز کھانے کو مل جائے۔" پل عبور کرکے ہم اس پویلین پر پہنچے جہاں بہت بڑا مجمع تھا مگر وہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ قریب ہی کشتیاں بندھی تھیں۔ جھیل کے وسط میں ایک چوبی بارہ دری میں گیشا لڑکیاں رقصاں تھیں۔ چاند بہت نیچے جھک آیا تھا۔

"کتنا دلفریب منظر ہے ——" کسی نے کہا۔

"بے حد —— مگر مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں کیا کیا چیزیں ہیں کھانے کی ——"

مگر وہاں عالم ہی دوسرا تھا۔ لوگ باگ غیر معمولی طور پر خوش نظر آرہے تھے۔ بھائی سٹیون اسپینڈر تک کی شکل پر شگفتگی برس رہی تھی۔ ایک تخت پر کاک ٹیل ڈریس میں ملبوس بے حد خوبصورت جاپانی لڑکیوں کا ایک پرا بیٹھا تھا۔ دوسرا پرا مجمع میں رل مل کر مہمانوں سے مصروفِ گفتگو تھا۔ دفعتاً ہم نے محسوس کیا کہ یہ گفتگو ذرا زیادہ بے تکلف قسم کی تھی یا جو عام طور پر پارٹیوں میں نہیں کی جاتی۔ ذرا آگے جو بڑھے تو دیکھا بڑا بڑا بین الاقوامی شہرت کا دانشور اس وقت تخت پر راجہ اندر بنا بیٹھا ہے اور گیشا لڑکیاں اسے پنکھیاں جھل رہی ہیں —— ایک لمحے میں چودہ طبق روشن ہوگئے۔

مادام وادیا نے چپکے سے مجھ سے کہا "یہاں سے چلو۔ یہاں ہم لوگوں کا کوئی کام نہیں۔" ہم لوگ سارا فاصلہ عبور کرکے پھر جھیل کے دوسرے کنارے پر آگئے۔ درختوں کے نیچے پھل اور کافی کے اسٹال تھے اور سناٹا تھا۔ صرف ایک درخت کے نیچے بوڑھے جمبوناتھن اکیلے بیٹھے ناشپاتی کھا رہے تھے۔

"آپ لوگ کچھ کھا پی آئیں؟"

"جی نہیں۔ ہم آپ کے ساتھ یہیں بیٹھیں گے۔" ہم نے جواب دیا اور صبر کرکے چند پھل کھائے پانی کا گلاس پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

"ہم کملا کو تو ڈھونڈ لیں۔ جانے غریب کہاں بور ہو رہی ہوں گی۔" میں نے کہا۔ لہٰذا بے چارے شری جمبوناتھن کو اندھیرے میں اکیلا بیٹھے چھوڑ کر ہم نے کملا کی تلاش شروع کی۔ اس وقت ہمیں ٹیلوں اور پگڈنڈیوں پر، ساحل پر، درختوں کے کنجوں میں، مصنوعی پہاڑیوں کے نیچے، بہت جانے پہچانے حضرات نظر آئے جو کاک ٹیل لباس والی لڑکیوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ کملا کو ڈھونڈھ لینے کے بعد ہم ابھی یہی طے کر رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے اتنے میں کانگریس کی سکریٹری ہمیں تلاش کرتی ہوئی مل گئیں۔ باغ کے ایک حصے میں پنڈال سا بندھا تھا۔ اس میں اس پارٹی میں آئے ہوئے چند مہمانوں کو ٹیلی وائز کرنا تھا۔ وہاں سے بھی چند منٹ بعد فراغت ہوگئی۔ اب پھر بوریت شروع ہوئی کیونکہ بھوک کے مارے الگ حالت خراب۔

اسٹالوں پر پیگ سے گوشت تھا یا پورک یا کچی مچھلی یا شراب۔ ہم تینوں دقیانوسی اولڈ فیشن، مذہبی پابندِ صوم و صلوٰۃ بیبیاں۔ کریں تو کیا کریں۔ پھل کھانے سے کہیں بھوک بھرتی ہے۔

جھیل کے کنارے والی اسٹال پر حسبِ معمول ہجوم تھا۔ یہ لوگ مسرت کی تلاش میں بھٹکتے ہیں ہم کلچر کی۔۔۔ آئیے اس میوزک پویلین ہی کو ایڈمائر کریں گلے ہاتھوں۔ میں نے منہ لٹکا کر تجویز کیا۔ وہاں ملک کی جرمن مشہور رقاصہ مادام باچیانا اپنے حساب ناچ رہی تھیں۔ یہ انوکھا ڈانس کہلاتا ہے۔ بتایا گیا کہ موسیقی چین، ہندوستان، منگولیا اور کوریا سے یہاں پہنچی (خدا نہ کرے جو یہ موسیقی ہندوستان سے یہاں پہنچی ہو۔ ہندوستان غریب کو کیوں بدنام کر رکھا ہے خواہ نخواہ)

ڈانس بھی دیکھ لیا۔ اب کیا کریں ۔۔۔۔ ہم نے کہا۔ پھر میوزک پویلین کی سیڑھیوں سے اتر کر گھاس کی ڈھلوان پر آن بیٹھے۔ ہمارے وہاں بیٹھنے کے چند لمحوں بعد دفعتاً ایک درخت میں چھپی ہوئی آرک لائٹ کا رُخ ہماری طرف کر دیا گیا۔

"اب بتائیے اگر یہ ہم لوگ کہتی ہیں ہماری حد سے زیادہ پبلسٹی کی جا رہی ہے تو کیا غلط ہے"۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "چلیے یہاں سے بھی اٹھیں۔"

ہم وہاں سے اٹھ کر ایک درخت کے نیچے نسبتاً تاریکی میں جا بیٹھے۔ سامنے کچھ فاصلے پر نشیب میں اسٹال تھی جہاں مہمانوں کا مجمع تھا، خوب شور مچ رہا تھا۔ پانی پر سے گٹار کی آواز آ رہی تھی۔ بارہ دری میں رقصاں لڑکیوں کا عکس پانی میں جھلملا رہا تھا۔

بے شمار لاشیں اب پانی میں تیر رہی تھیں۔ گیند کی طرح پھولی ہوئی اور سفید۔ بڑی عجیب بات تھی کہ مردوں کی لاشیں منہ کے بل تیر رہی تھیں اور عورتوں کے چہرے اوپر تھے۔ عرصہ ہوا میں نے "ہیملٹ" میں مری ہوئی اوفیلیا کو اس طرح تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کس قدر صحیح تھا۔۔۔۔

پویلین میں گٹار زور زور سے بجنا شروع ہو گیا۔ جس وقت بجلی کا کوندا لپکا دفعتاً گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا۔ میرے چہرے کی کھال جدا ہونے لگی اور دھجیاں بن کر چہرے سے لٹک گئی۔ سامنے ہی ہسپتال تھا۔ یکلخت اس کی ہر کھڑکی سے سفید دھواں باہر نکلنا شروع ہوا۔ دوسری اور تیسری منزلوں سے مریض اور سفید پوش نرسیں کود کود کر دھوپ میں گرنے لگیں۔ وہ سب نیچے سیمنٹ کی سڑک پر گرتے ہی ختم ہو گئے ہوں گے۔ ہم سب نے بے تحاشا دوڑنا شروع کیا اور دریا تک پہنچے۔ وہاں سینکڑوں آدمی، زخمی اور جلے ہوئے، پانی میں اپنے چیتھڑے بھگونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک آدمی پانی پانی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ جل کر سیاہ کوئلہ ہو چکا تھا صرف دانتوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔

جھیل کے کنارے ایک برطانوی ادیب گلاس اٹھا کر امریکن ادیب کے گلاس سے ٹکرا رہا تھا۔ باغ کا منظر کسی تصویر کی مانند مکمل تھا۔

جس وقت بجلی کا سا کوندا لپکا میں باورچی خانے میں کھڑی برتن دھو رہی تھی میری بہن کالج گئی ہوئی تھی۔ جب دوسرے لمحے مکان کے پرخچے اڑے اور آگ لگی یہ سب ایسا معلوم ہوا جیسے کسی خاموش فلم میں ہو رہا ہے۔ میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آئی۔ میں سماعت سے مکمل طور پر محروم ہو چکی تھی۔ اگلے سال جب ہم نے اس کالج کے کھنڈر میں میموریل سروس منعقد کی تو ہمیں ملبے میں صرف چاکلیٹ کا ڈبہ ملا، جس پر میری بہن کا نام لکھا تھا جس میں وہ لنچ لے جایا کرتی۔ اس کالج میں تین سو لڑکیاں تھیں۔ سب کی سب اسی لمحے ختم ہو گئیں۔ متعدد نرسنگ اسکولوں، ہائی اسکولوں اور میڈیکل اسکولوں کا ایسا صفایا ہوا کہ ان کا ایک طالب علم زندہ نہیں بچا۔ سب آنِ واحد میں ختم ہو گئے۔

چاند پائن کے درختوں پر تیر رہا تھا۔ پیڑوں میں چھپے ہوئے لاؤڈ اسپیکر زمیں سے مدھم موسیقی نشر ہونے لگی۔

واقعے کے دوسرے روز ہمارے ہسپتال کے آنگن میں اندھا گھوڑا بھٹکتا ہوا آ نکلا۔ اس کا چہرہ جل چکا تھا اور آنکھیں

بچیں نہ تھیں۔ وہ آنگن میں چلنے کا اشارہ رہتا اور ہمیشہ سامنے کی دیوار سے جا ٹکراتا۔ دریچوں میں سے ہم اسے دیکھ کر اپنی تکالیف بھول کر اس کے لئے بہت دکھی ہوتیں گویا وہ گھوڑا اور ہم ایک دوسرے کے غمگسار تھے۔

نسل کی حالت کتنی تکلیف دہ تھی۔ وہ بھی radiation Sickness کے شکار ہو چکے تھے۔

موسیقی رات کی ہوا میں پھیلنے لگی۔

میں نے بوڑھی عورتیں دیکھیں جن کے چہروں کا چمڑا نیلی رنگت لئے تھا اور ان کے چہرے بے جان سے ایسے کہ ہونٹوں تک درمیان سے آدھے پھٹ گئے تھے۔ نوجوان عورتیں جن کے بازو ان کے جسموں سے علیحدہ ہو کر لٹک رہے تھے۔ ایک موٹا فوجی کرنل جو پاگل ہو گیا تھا اور اسے ایک بچہ گاڑی میں ٹھونس کر کہیں لے جایا جا رہا تھا۔

لاؤڈ اسپیکر پر کسی نے ایک جذباتی فرنچ گیت شروع کر دیا۔ یہ شاید "پیرس کے پلوں کے نیچے تمہارے ہمراہ" تھا —— دریا کے اوپر سے شعلے بھڑکتے ہوئے اڑتے رہے۔ جب پاٹن کے درختوں میں آگ لگ جاتی تو کنارے پر پڑے ہوئے زخمیوں کی فلک شگاف چیخیں بلند ہوتیں۔ میں اور میرے والدین نہ کسی طرح شعلوں سے بچتے پانی میں پہنچ گئے۔ برابر میں کچلے ہوئے لوگ مرے پڑے تھے۔ طرح طرح کی چیزیں پانی میں بہتی ہوئی آ رہی تھیں۔ گھاٹ پر کسی نے کہا تھا کہ پیاز کھانے سے طاقت آتی ہے۔ پانی میں گلی سڑی پیاز نما چیز بہتی آ رہی تھی میں نے وہ اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ دفعتاً آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے۔ ایک بے حد خوفناک جھکڑ اٹھا اور سیاہ تیل کی مانند بارش برسنا شروع ہو گئی۔ دریا میں طوفان سا آیا اور پاٹن کے درخت جڑ سے اکھڑ کر آسمان پر اڑنے چلے گئے۔ جب طوفان اور بارش کا یہ قہر ختم ہوا تو میں نے دیکھا جتنے لوگ آگ سے پناہ لینے کے لئے گھاٹ پر بیٹھے تھے وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ موجیں اور آندھی ان کو اپنے ساتھ بہا لے گئی۔

رنگ برنگے فراک پہنے لڑکیوں کا ایک گروہ پل پر سے گزر رہا تھا۔ ان کے ساتھ تین چار حضرات بھی تھے۔ وہ سب قہقہے لگا رہے تھے۔ مرد سارے یوروپین اور امریکن تھے۔ وہ سب گیت میں شامل ہو گئے تھے۔

میں حسب معمول لیبر سروس کے لئے ڈیوٹی پر گئی ہوئی تھی جب دفعتاً بجلی کوندی اور بڑی سخت بدبو سارے میں پھیل گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ملبے میں دبی ہوئی تھی۔ میرے ساتھی چاروں طرف دبے ہوئے چلا رہے تھے —— اماں —— ابا —— اماں —— خداوندا —— ایک چھوٹی سی بچی جو عفریت معلوم ہو رہی تھی مجھے دیکھ کر چیخی —— میں میا کے ہوں مس مورائے —— میں میا کے ہوں —— مجھے بچائیے —— مس مورائے —— میں نے اسے کھینچنا چاہا لیکن وہ میرے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ وہ چیختی رہ گئی۔ مس مورائے —— مورائے —— مجھے یقین ہے کہ وہ خوبصورت لڑکی مس میا کے جس کا عفریت میں بچا نہ سکی وہیں ختم ہو گئی ہو گی۔ ہم لوگ بمشکل آلو کے کھیت تک پہنچ سکے۔ ہوا میں آگ کے شعلے اڑتے ہوئے آتے اور ہمارے بال جل جاتے۔ ہم سب نے بارہ مربع فیٹ کی پانی کی ٹنکی میں گھسنا چاہا جو کھیت کے وسط میں تھی۔ چند لمحوں میں ہمارے خون کی وجہ سے پانی سرخ ہو گیا۔ فوراً لوگوں نے اسی میں الٹیاں کرنی شروع کر دیں۔ پانی کی تہ میں سے غلیظ کیڑے ابھر کر اوپر آ گئے اور ہمارے جسموں پر رینگنے لگے۔ پیاس سے بیتاب ہو کر ہم نے وہی غلیظ پانی جس میں ہمارا خون اور کیڑے اور قے شامل تھی بے تحاشا پینا شروع کر دیا۔ آسمان انگارے کی طرح سرخ تھا اور شہر آگ کی ایسی جل رہی تھی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ دن ہے یا رات —— میں نے پوری طاقت سے اپنا نام چلایا —— اور پھر بے ہوش ہو گئی ——

رقاصہ نے ہاتھ میں گھنگرو اٹھا کر تیزی سے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ بے سُری بانسریوں کا شور اونچا ہو گیا۔ پس منظر میں ڈھولک کی یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔ معزز پویلین کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے کسی نے ایک طویل جمائی لی۔

میں اپنی بہن کی تلاش میں سڑکوں پر دیوانہ وار بھاگی بھاگی پھر رہی تھی جب ایک سڑک پر میں نے بہت سی کھپریلیں ایک قطار میں رکھی دیکھیں۔ ہر کھپریل پر ایک انسانی ہڈی دھری تھی۔ چند پر سے ہڈیاں غائب تھیں۔ غالباً لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی ہڈیاں سمجھ کر اٹھا لے گئے تھے۔ چند ہڈیاں ابھی تک اس قدر گرم تھیں کہ ان میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ سارے میں ناقابل برداشت بدبو پھیلی تھی۔

قریب ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے فادر رابکس نے جھک کر چند خوشبودار پھول توڑے اور میری دوست یوکوہارا کو پیش کیے۔

اس وقت آسمان پر ایک ایسا اندھا [illegible] روشنی پھیلی۔ اس کے بعد گرد کا طوفان اٹھا اور سب اس میں اڑ گئے۔ اس سمے درد یا تکلیف کے بجائے بڑا سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب و غریب قسم کی ہمت سی ہم میں آ گئی اور ہم نے قومی اور فوجی گیت اور کورس بھی گانے شروع کر دیے۔ لیکن اس کے بعد ہماری کھال جھڑنا شروع ہوئی اور ہم تکلیف سے بیتاب ہو کر چوہوں کی طرح چکر لگانے اور کودنے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ ہم نے اندھا ہونا شروع کیا۔ مجھے اور میرے ہم جماعتوں کو ایک ٹرک میں بھر کر اوجینا بھیج دیا گیا جہاں ہسپتال میں پڑے پڑے ہم بہتا کرتے ـــ خدا کے لیے مجھے مار دو ـــ مجھے مار دو ـــ کسی نے میری ماں کو بتا دیا تھا کہ ککڑی کی پھانک زخموں پر ملنے سے فائدہ ہوگا لہٰذا وہ بیچاری ککڑیوں کی ٹوکری اٹھائے سارے میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ بارہ دن کے بعد اس نے مجھے تلاش کر لیا۔ میرے ساتھ کے طالب علم اس وقت تک ایک ایک کر کے مر چکے تھے لیکن میں زندہ رہا۔ گو میرے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے اور میں تڑپ تڑپ کر مرنے کی دعائیں مانگتا تھا۔ اب میں یونیورسٹی میں اکنومکس پڑھ رہا ہوں لیکن میری اصل زندگی تو چھ اگست کو ختم ہو چکی۔

اب مجھے محض یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک مہیب سایے کے نیچے زندہ ہوں اور روز بروز وہ سایہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر ٹرام میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو جن کے چہرے بگڑ چکے ہیں دوسرے لوگ گھورتے ہیں تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں۔ دنیا کو ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا کہ جنگ کی، ایٹم بم کی تباہ کاری کے کیا معنی ہیں۔ میرا وجود تو اب محض ایک پرچھائیں کی حیثیت میں باقی ہے۔ اکثر سوچتا ہے کہ اگر دنیا کی بڑی طاقتوں نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ آئندہ یہ قہر نہ برسائیں گے تو میری یہ دوسری سانحے کی ایسی زندگی سکون سے ختم ہو سکے گی۔ کیونکہ مجھے اب موت کا واقعتاً کوئی خوف نہیں ہے۔

ہوا درختوں سے معلق قندیلوں کو جھلکورے دیتی رہی۔ اب باغ کو نیند سی آ چلی تھی۔

جب میں خود بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی میں نے چار اسکول کے لڑکوں کو دیکھا جو سڑک کے کنارے گھبرائے بیٹھے تھے۔ چاروں بُری طرح جل چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ـــ "خاتون ـــ شاید میری ماں اور میری بہن بھی اسی طرف سے ہوں ـــ اگر آپ کو وہ ملیں تو ان سے کہیے کہ فوراً آئیں کیونکہ ہم چند منٹ میں دم توڑنے والے ہیں۔"

"ہم چاروں اکٹھے مریں گے۔" دوسرے نے کہا۔ "ہمارے اوپر تھوڑا سا سایہ کر دیجیے ـــ بڑی سخت گرمی ہے۔"

میں نے چند لکڑیوں کے تختے اور کاٹ کباڑ ان کے چاروں اور کھڑا کر دیا اور ان سے پوچھا کہ ان کو کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں ہے ـــ "نہیں ـــ" انہوں نے جواب دیا۔ "ہم تو مرنے والے ہیں ہمیں کاہے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔" میرے پاس دو ٹماٹر تھے

میں نے ان کے چند ٹکڑے کر کے ان کے حلق میں تھوڑا تھوڑا سا عرق نچوڑا اور ان سے پوچھا —— "کیسا لگا" —— "بیحد مزے دار —— شکریہ ——" انھوں نے کہا —— ایک سپاہی نے کہا۔ "اگر ذرا سا پانی مل جاتا ——" میں نے ان کو پانی پلایا اور دعا مانگی کہ کوئی امدادی پارٹی ادھر آ نکلے۔

دوسرے روز صبح جب میں اپنے شوہر کو لے کر وہاں پہنچی تو میں نے چاروں کو اسی طرح سر جھکائے گھیرے میں بیٹھے پایا۔ چاروں کب کے ختم ہو چکے تھے۔

اب باغ پر رفتہ رفتہ سناٹا اتر رہا تھا۔ پھول سو چکے تھے۔ پانی برستی ہوئی موسیقی اونگھ رہی تھی۔ مہمانوں کے قہقہے مدھم ہو چکے تھے۔ شراب کا اثر تیز ہو رہا تھا۔ گیشا لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔ میں اور مادام وآدیا گھاس کی ڈھلوان پر بیٹھے رہے۔ ہم دونوں پچھلے ایک گھنٹے سے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اب خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ دفعتاً بوڈو ویزے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"ہلو ——"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کامریڈ بوڈوویزے ہاتھ میں گلاس لئے کھڑے تھے۔ "بے حد اورینٹل پارٹی ہے —— ایسی اورینٹل ——"

"اورینٹل نہیں —— فیوڈل ——" میں نے جواب دیا۔ "پچاس سال پہلے ہمارے یہاں بھی طوائفیں امرا کی دعوتوں میں مہمانوں کو گا بجا کر اور باتیں کر کے محظوظ کرتی تھیں لیکن پچاس سال پہلے ——" میں نے انگلی ہوا میں لہرائی —— "یہ اورینٹل تہذیب نہیں ہے —— فیوڈل —— فیوڈل ——"

ہٹاؤ اب کون بحث کرے —— میں نے مزید اکتا کر سوچا۔

وہ گلاس لئے لئے پھر ڈھلوان سے اتر کر اسٹال کی سمت لوٹ گئے۔

کچھ دیر بعد یہ سب لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ مکمل خاموشی اور مکمل تنہائی یہاں پر چھا جائے گی۔ رات کو اس باغ میں کیا ہوگا۔ دنیا بھر کے باغوں میں رات کو جب سب چلے جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ کیسا سناٹا چھاتا ہے۔ جھیل، کشتیاں، پل، پھول، مندر، سامنے کچھ فاصلے پر پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر مندر میں روشنی جل رہی ہے۔ یہاں ہون ہوتا ہے۔ تانترک منتر دہرائے جاتے ہیں —— باغوں اور پہاڑوں کا اسرار ——

چلو ہم لوگ گھر واپس چلیں۔ یہاں تو آدھی رات تک شرابیں پی جائیں گی۔ ہم خواہ مخواہ بور ہو رہے ہیں۔ مادام وآدیا نے کہا۔ چلئے شہر چل کر شاپنگ کریں ورنہ دوکانیں بند ہو جائیں گی —— میں نے دفعتاً بشاشت سے تجویز کیا۔

کملا کو ساتھ لے کر ہم ڈھلوان سے اترنے لگے۔ جھیل کے کنارے پل پر انڈونیشیا کے سلطان تنقدیہ مل گئے۔ وہ بھی بے حد پریشان نظر آ رہے تھے —— بیچارے شریف مسلمان حاجی آدمی —— میں نے ہنس کر کہا۔ پھاٹک پر آ کر ہم نے میزبان کو خدا حافظ کہا۔ انھوں نے ہمیں حسبِ معمول چھتریوں اور کیمونو کے تحائف سے لاد دیا اور ہم کاروں کی طرف بڑھے۔ عین اس وقت ایک مشہور یورپین مصنف کی بے حد خوبصورت بیوی ہمارا تعاقب کرتی بھاگتی ہوئی آئی —— "آپ تینوں کہاں جا رہی ہیں۔" اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"واپس —— !"

"میں ساتھ چل سکتی ہوں —— ؟"

"ضرور —— مگر کیوں ؟"

"میرے شوہر نے ساری شام مجھ سے بات تک نہیں کی بس ان کم بخت لڑکیوں میں گھرا بیٹھا ہے نرا خبطی ہوا جا رہا ہے —— میں

ساری شام جل بھن کر کباب ہوا کی۔ مجھے اپنے ہمراہ یہاں سے لے چلو۔"

"ابھی نو بجا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم لوگ ذرا ڈاؤن ٹاؤن جا کر شاپنگ کرنے کی فکر میں ہیں۔"

"بس میں تمہارے ساتھ گھوموں گی۔ میں اسے سزا دینا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں سے ہوٹل واپس جا کر سر پیٹے گا۔ کمرے کی کنجی میرے پاس ہے۔" وہ ٹیکسی ہائر کرنے کے لئے آگے بڑھ گئی۔ ایک بس کے پاس آنند شنکر راستے کھڑے تھے۔ وہ بھی بے حد خاموش تھے۔

"اس ملک میں عورتوں کا بڑا زبردست مدّ فاضل ہے۔ جنگ میں لاکھوں مرد کام آ چکے ہیں۔ فالتو عورتیں کہاں جائیں" ——— کسی نے کہا۔ عموماً ہر متمول جاپانی ایک مسٹرس رکھتا ہے ———

یہ کاک ٹیل فراک والی بے حد دلکش اور اسمارٹ لڑکیاں پوسٹ وار زمانے کی گیشا گرلز تھیں۔ ان کو امریکہ میں آداب محفل کی ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ غیر ملکی مہمانوں کو ان ہی کے قاعدوں کے مطابق محظوظ کر سکیں۔

شاپنگ کر کے گیزا کے بازار سے جب ہم چاروں ہوٹل واپس لوٹے تو وہاں ایک قیامت صغریٰ بپا دیکھی۔ برساتی میں بہت سے لوگ پریشان کھڑے تھے۔ ٹیلی فون دوڑائے جا رہے تھے۔ لوگ پارٹی سے واپس آ چکے تھے اور ایک کرائسس کا عالم نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی ہماری ٹیکسی برآمدے کے سامنے جا کر رکی بہت سے لوگ ہماری طرف دوڑ پڑے ——— فرانسیسی اور سنٹرل یوروپین حضرات نے انتہائی ڈرامائی انداز سے ہاتھ ہوا میں پھیلا دئے ——— او مادموزیل ——— او مادام ——— انہوں نے جھک کر کہا ——— آپ نے مادام فلاں کو دیکھا ہے ——— اوہ ——— مادام ——— آپ آ گئیں ——— آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ کدھر غائب ہو گئی تھیں ——— آپ کا شوہر رو رو کر بُرا حال کئے دے رہا ہے ——— اپنے کمرے کے دروازے پر بیٹھے واقعی مسیو فلاں ——— اپنی بی بی کی پُراسرار گمشدگی کے غم میں پھکو پھکو کر رو رہے تھے۔

دوسری صبح بے حد خوشگوار تھی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ہم لوگ بسوں میں بیٹھ کر نارا جا رہے تھے جو جاپان کی قدیم ترین راجدھانی ہے۔ راستے میں چائے کے باغ تھے اور تنکوں سے بنی ہوئی نوکیلی بڑے بڑے چھجے والی ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ بالکل مشرقی بنگال کا ایسا منظر ہے۔

گاٹیلڈ لڑکا جو یونیورسٹی میں آرٹ ہسٹری میں پوسٹ گریجویٹ کام کر رہا تھا حسب معمول باتیں کرتا رہا۔

نارا آٹھویں صدی کے بنے ہوئے مندر، انوکی تنیشور کے مجسمے، پگوڈا، بوڑھے ایبٹ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہمارا سواگت کر رہے ہیں۔ یہ بے حد مانوس فضائیں ہیں۔ سارناتھ اور ٹیکسلا اور اجنتا کی صدائے بازگشت یہاں گونج رہی ہے۔ بیل، ہاتھی، کنول کے پھول، ڈیکوریٹو موٹف بہ خالص اجنتا اور باغ کی تقلید ہیں۔ پگوڈا استوپوں سے مستعار لئے گئے ہیں۔

بارش کا ریلا بڑے زور سے آ گیا۔ بوڑھے پروفیسر لوگوں کی گفتگو اور تبادلہ خیالات سے بے نیاز آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ ایک مشرقی جرمنی کا شاعر برگی نارا کے مندروں میں بیٹھا نظم لکھ رہا ہے۔ یہ بدھ کا عظیم مجسمہ ہے۔ کئی سو فیٹ اونچا۔ اس کے نیچے کھڑے ہوئے انسان دراصل ننھے ننھے بیر اور بیر بہوٹی معلوم ہو رہے ہیں۔ مندر کے باہر رنگ برنگی چھتریوں کا ایک زبردست سیلاب امنڈتا آ رہا ہے۔ بارش میں اخباروں کے نمائندوں نے ڈاکٹر گلبنسب کو گھیر لیا۔

"یہ چین کی ایک نوجوان آرکیالوجسٹ مس نتا قون ہیں ——— ——— یہ بات نوجوان سے پوچھو ———" ڈاکٹر میری طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

ان سے بارش میں بیٹھا نہیں جا رہا مگر ہمارے ساتھ گھسٹتے ہوئے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر گوئیٹسپ جیسے لوگوں نے انسانی تہذیب کو زندہ رکھا ہے۔ یہی ہمارے لئے قطب اور ابدال ہیں۔

بارش تیز ہو گئی۔

اس کنول والے تالاب کے اس سرے پر جو سنہرا پانچ منزلہ پگوڈا ہے۔ اسے چند سال ہوئے ایک دیوانے راہب نے آگ لگا دی تھی ——

ایک بھکشو جس کی ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔ خاموشی سے درخت کے نیچے کھڑا بھیگ رہا ہے۔ جنگل کی ڈھلوان پر سے سادھو نیچے اتر رہے ہیں۔ کنجوں میں کیسا سکوت ہے۔

اب ہم ایک شنتو مندر میں پہنچے۔ جہاں چاروں اور سرخ ستون ہیں۔ چڑھائی پر دونوں طرف پتھر کے چھوٹے چھوٹے سرخ ستونوں کا ایک جنگل سا کھڑا ہے۔ ان ستونوں میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ چاروں اور اونچے اونچے عجیب و غریب ہیبت ناک شکلوں کے درخت بارش میں جھوم رہے ہیں۔ واقعی پرکھوں کی ارواح ان درختوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ بڑا عجیب، لرزہ خیز ماحول ہے۔

بدھ کے مندر ہماری اپنی دنیا میں موجود ہیں۔ شنتو معبد کسی خوفناک پُراسرار انجانی کائنات سے تعلق رکھتے ہیں جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ pagan, primitive ——— نہ جانے کیا۔ قدیم مصر اور قدیم میکسیکو اور قدیم عراق کے ہیکلوں میں شاید ایسا ہی ماحول ہوتا ہو گا۔ یا شاید یہ بحرالکاہل کے اجنبی جزیروں کا مذہب ہے جو دھند کہرے سے نکلا ہے اور اسی کہرے میں موجود ہے۔ شنتو دنیا کا عجیب ترین مذہب ہے۔

برآمدے میں دیوداسیاں رقصاں ہیں۔ سنجیدہ چہرے، اگریس فل انداز، سفید عجیب و غریب لباس، ہاتھوں میں گھنگھرو لئے جن کو وہ کھڑتال کی طرح بجاتی ہیں۔ برآمدے کے سرے پر پچھوں کے پیچھے دو شنتو راہب کالی گول ٹوپیاں اور کالے چوغوں میں ملبوس ڈھول اور بانسری بجا رہے ہیں۔ بارش تیزی سے برس رہی ہے۔ چاروں اور اونچے نیچے راستے ہیں اور سیڑھیاں اور گلیارے اور سینکڑوں چراغوں کے ستون۔

ایک پتلی گلی میں سے گذرتے ہوئے اسٹیون اسپنڈر ڈاکٹر محمد عوض سے پوچھ رہے ہیں۔ "آپ کو یہ سب کیسا معلوم ہو رہا ہے ——"

"یہ سب ——؟ یہ سب تو ہمارے خون میں شامل ہے ——— ہزاروں برس تک ہم pagan, رہے ہیں ——! ہم ان علامتوں کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔"

اسٹیون اسپنڈر اس جواب پر خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو گویا جاپانی اور مصری تک ایک نکلے ——— اب غالباً انہیں مغربی تہذیب، مغربی روح کے جداگانہ ہونے کا احساس زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

مندر کی پہاڑی کے نیچے بارہ سو سال پرانا وسیع ڈیر پارک ہے جہاں سینکڑوں ہرن پلے ہیں (بنارس میں ایک ڈیر پارک تھا جہاں مہاتما بدھ گھوما کرتے تھے) ہمارے بلانے پر ہرن بھاگے بھاگے ہمارے پاس آتے ہیں۔ ٹوس پینس دوکان سے بسکٹ خرید خرید کر مجھے دیتے جا رہے ہیں جو ہرن نہایت ندیدے پن سے کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ باغوں میں بگل بج رہا ہے۔ بگل کی آواز پر ہرنوں کی قطاریں کی قطاریں بھرتی بھاگی جا رہی ہیں۔ یہ ان کا لنچ ٹائم ہے ——— کتنے چٹورے ہرن ہیں۔ ابھی ان کا پیٹ نہیں بھرا۔

"جھیل پریوں کی جھیل" پہ بارش برس رہی ہے۔

نارا ہوٹل کے عقبی باغ میں بارش سے پناہ لے کر ایک سنہرا ہرن جھاڑی کے اندر مزے سے پڑا سو رہا ہے۔

واپسی ——

نارا اور اوساکا اور ہیروشیما کا چکر لگا کر اب لوگ باگ مختلف سمتوں میں جا رہے ہیں۔ اسباب بندھ گئے۔ خدا حافظ کہے جا چکے۔ ڈوس پیسس اور صوفیہ وادیا اور بوڑھے ڈاکٹر گلینسپ۔ سب اپنے اپنے راستے لوٹ گئے۔ بوڈو یوزے ملک راج آنند کی دعوت پر بچوں کی فلم بنانے بمبئی گئے۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی دنیاؤں کو لوٹ رہے ہیں۔ پیرس اور بیروت اور نیویارک اور کلکتہ اور وارسا اور لندن۔

بادل ہکاکیو کے ڈائننگ ہال کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ عقب کے دریچوں سے چند فیٹ کے فاصلے پر آبشار گر رہے ہیں۔ ان کے پانی کی پھواروں سے دریچوں کے شیشے دھندلا گئے ہیں۔ ڈائننگ ہال میں خاموشی ہے۔ صرف ایک میز کے چاروں طرف کملا دیوی، اوما شنکر جوشی اور ماند شنکر یداسے اور سری نواس آئنگر اور رجبوناتھن خاموش بیٹھے ہیں۔

”کراچی میں میرے گجراتی دوستوں کو میرا سلام کہنا ——“ اوما شنکر کہہ رہے ہیں۔

میں ان پانچوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر آ جاتی ہوں۔

باہر جہاں ایک عظیم خلا ہے جس میں دھند تیر رہی ہے۔

بیل پر بیٹھا چرواہا بالآخر گھر واپس پہنچ گیا۔ اسے لو —— بیل تو غائب ہے۔ لڑکا قناعت سے اکیلا بیٹھا ہے۔ اس کا سونٹا اور رسہ پھونس کے چھپر تلے دھرا ہے۔

صرف خلا ہے نہ سونٹا نہ رسی نہ چرواہا نہ بیل۔ فضائے بسیط کو کون ماپ سکتا ہے؟

چرواہا مایا کے تغیر اور تبدیلیوں کو دیکھتا ہے —— ندیاں بہہ رہی ہیں —— ان کا رخ کدھر ہے؟ سرخ پھول کس کے لیے کھلے ہیں؟

اس کے جھونپڑے کا پھاٹک بند ہے۔ بڑے بڑے گنوان بھی اس کو نہیں جان سکتے۔ اپنا ڈنڈا سنبھالے وہ بازار میں داخل ہوتا ہے۔ اپنے عصا پر جھکا وہ گھر واپس لوٹتا ہے۔

بیل جو نتھنوں سے چنگاریاں نکالتا پہاڑیوں پر دیوانہ وار بھاگا پھر رہا تھا۔ لڑکے نے بالآخر اسے قابو میں کر لیا۔ اب بیل ندی کے کنارے گھاس چر رہا ہے۔ سورج ڈوبنے والا ہے اور دھندلکا چھا رہا ہے۔ سفید بیل اب سفید بادلوں میں گھر گیا ہے۔ چاندنی ابر میں سے چھنتی ہے۔ بیل غائب ہو چکا ہے۔ اب چرواہا اپنے وقت کا مالک ہے۔ وہ اس بادل کی مانند ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر تیرتا پھرتا ہو۔

اب چرواہا اور بیل دونوں غائب ہو گئے۔ روشن چاندنی خالی ہے۔ اس کا کوئی سایہ نہیں، صرف ایک خلا ہے۔

اگر اس کا مطلب جاننا چاہو تو ان سفید کلیوں کو دیکھو جو معطر گھاس میں کھل رہی ہیں[1]۔

بحرالکاہل پر پھیلے ہوئے بادل گہرے ہو گئے۔ خوفناک سمندری طوفانوں پر سے گزرتا ہوا طیارہ اس وسیع دھندلکے میں سے نکل کر

---

[1] ”بیل اور چرواہے کی دس تصویریں“ چین کے شونگ عہد کے زین فلسفی کوُوان شین کی نظم۔

منیلا کے ایرپورٹ پر اترا ۔

میں باہر آئی۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے خستہ حال بچوں نے بخشش مانگی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بے ایمانی کر کے زیادہ پیسے وصول کرنے کی کوشش کی۔ مچھروں نے کانوں میں بھنبھنانا شروع کیا۔

میں جنوب مشرقی ایشیا واپس پہنچ چکی تھی۔ سرسبز ٹروپیکل جنگل۔ کھمبوں پر استادہ لکڑی کے جھونپڑے، کیلے اور اناناس کے باغ، خستہ حال انسان، شاندار عمارات۔ خلیج منیلا جہاں کا غروبِ آفتاب کا منظر دنیا کا بہترین غروبِ آفتاب کا منظر ہے۔ فلپینو لوگوں کی بے مثال سادگی اور خوش خلقی۔

یہ ایشیا کا واحد عیسائی ملک ہے۔ گرجاؤں میں ماس ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ صدیقہ مریم کے مجسمے نصب ہیں۔ اتوار کے روز میں اپنی چند دوستوں کے ہمراہ ماس میں شامل ہوئی جہاں سیاہ اسکارف اوڑھے، سرخ گلاب کے پھول لگائے لڑکیاں اور ہسپانوی گاؤن میں ملبوس فلپینو خواتین رومالز جھکی تسبیح پھیر رہی تھیں ــــــ ہسپانیہ کی تہذیب جنوبی ایشیا میں، فرانس کی تہذیب انڈوچائنا میں، برطانیہ کی تہذیب ہانگ کانگ، ملایا اور برِصغیر ہند و پاکستان میں، مغرب کے اس بے پایاں تسلط کا ذرا اندازہ تو کیجئے ــــــ

اب میں نے حسبِ معمول جنوب مشرقی ایشیا اور پسماندہ ممالک کے مسائل کے سمندر میں تیرنا شروع کیا۔ وہی ساری باتیں جو ان ممالک کے جرنلسٹ، سیاستدان اور سرکاری پبلسٹی کے ماہرین کرتے ہیں۔

افلاس، کاہلی، گندگی، وبائی امراض، نوجوان انٹلجنسیا کا فرسٹریشن، کمیونزم کا خطرہ، آزاد دنیا کا اتحاد، امریکن امداد، غیر جانب دار ممالک کی حماقت۔

منیلا کی گلیوں میں اندلسی طرز کے مکان ہیں۔ لوہے کی جالی دار بالکنیاں، مورش محرابیں، سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی بسیں چل رہی ہیں۔ اِکا دُکا قدیم ہسپانوی وضع کی گھوڑا گاڑی دکھائی دے جاتی ہے۔ اندلسی محلات گھنے ٹروپیکل درختوں میں چھپے کھڑے ہیں جن میں فلپائن کا اعلیٰ طبقہ رہتا ہے۔ شکستہ فصیل کے اندر پرانا شہر ہے جو ہسپانیوں نے قرونِ وسطیٰ کے یورپین شہروں کی طرز پر تعمیر کیا تھا۔ یہ سارا شہر جاپانی بمباری سے تباہ ہو چکا ہے اور اس میں کھنڈرات کے علاوہ کچھ نہیں۔ سارے شہر میں افلاس زدہ لوگوں کے جھونپڑے پھیلے ہیں۔

جاپان میں ہر طرف امریکن بمباری کے نشانات دکھائے جاتے تھے۔ یہاں ہر طرف جاپانیوں کی بمباری کے نشانات نظر آ رہے ہیں۔ خوبصورت قدیم کیتھڈرل جن کو شہنشاہ ہیرو ہیٹو کے جانبازوں نے بم گرا کر تباہ کیا۔ خوبصورت مکان، پرانے میوزیم۔

اہلِ انڈونیزیا کی طرح ان لوگوں کو بھی جاپانیوں سے نفرت ہے۔ ان کو اہلِ ہسپانیہ سے بے اندازہ نفرت ہے جنہوں نے چار سو سال انتہائی جابرانہ حکومت کی۔ فلپائن میں امریکن بے انتہا مقبول ہیں۔ گویا یہ ملک امریکہ کی کولونی رہا لیکن امریکن آقاؤں نے یہاں تعلیم پھیلائی۔ فلپینو قوم کو برابری کا درجہ عطا کیا اور آخر میں بڑے پُرامن اور دوستانہ طریقے سے آزاد کر دیا ــــــ

فلپینو نفسیاتی طور پر اُلجھے ہوئے لوگ نہیں ہیں۔ میں جاپان میں فلپینو صحافی نِک کو ہمیشہ چڑایا کرتی تھی کہ تمہاری کوئی قدیم تہذیب نہیں اور آج کل قدیم تہذیبوں کا بڑا زبردست ریکٹ چل رہا ہے لہٰذا اب تم بھی اپنی ایک پرانی تاریخ ایجاد کر ڈالو ــــــ نِک اُداسی سے خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ ہسپانوی عجیب و غریب لوگ ہیں۔ انہوں نے دنیا کی تہذیبوں کی جس طرح بیخ کنی کی ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملے گی۔ اپنے ملک میں

انھوں نے ہر بہانے عیسائیت غالب کیا۔ میکسیکو پہنچ کر وہاں کے پرانے تمدن کا قلع قمع کر ڈالا مگر فلپائن آکر تو انھوں نے یہ ستم ڈھایا کہ اس قوم کا پہلا تمدن ہی مٹا دیا۔ فلپینو دنیا کی وہ واحد متمدن قوم ہیں جن کو یہ خبر نہیں کہ ان کا پس منظر کیا ہے۔ کیا وہ سولھویں صدی سے قبل جنگلوں میں بسنے والے وحشی تھے یا ان کی بھی میکسیکو کی طرح کوئی کلچر تھی جسے ہسپانوی فاتحین نے تباہ کر دیا۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ میرے چڑانے سے نیکسو کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی —— میرا خیال تھا —— ہونہہ —— مصنوعی ہسپانوی امریکی نیم دوغلی تہذیب کا وارث بھلا اس کو مشرقیت کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ اس کی جڑیں تو رامائن یا مہابھارت یا زین یا بغداد کے بجائے میڈرڈ اور سان فرانسسکو میں پلانٹ کی گئی تھیں —— اور نیکسو ہم سے مسکراتا تھا۔

فلپینو نسلاً ملایائی ہیں۔ ان کے پرکھے ہندو اور منگول اقوام تھیں جو انڈونیزیا سے یہاں پہنچیں۔ انھی اقوام میں شمال سے چینی تاجر ان سے ملے۔ ۱۵۲۱ء میں ہسپانیوں نے ان جزیروں کا انکشاف کیا (۱۴۹۸ء میں ایک پرتگالی ہندوستان کا پہنچ چکا تھا) انھوں نے ان جزیروں کو اپنے بادشاہ فلپ دوم کے نام پر معنون کر دیا۔ ان کے چار سو سالہ دورِ حکومت میں فلپینو قوم کی رگوں میں تھوڑا سا ہسپانوی خون بھی شامل ہو گیا۔

مجموعی طور پر فلپائن تمدنی اعتبار سے وسیع پیمانے پر گوا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فلپینو لوگ اپنے ہسپانوی ترکے اور اس دورِ غلامی سے شرمندہ اور متنفر ہیں اور اپنی موجودہ آزادی سے بے حد خوش۔

۱۸۹۸ء میں امریکہ اور اسپین میں جنگ چھڑی اور اسپین کی شکست کے بعد فلپائن امریکہ کے قبضے میں چلا گیا۔ انیسویں صدی میں فلپینو قوم نے آزادی کے لیے شدید جدوجہد کی۔ ان کے عظیم ترین قومی ہیرو ڈاکٹر رزال کو ہسپانویوں نے ۱۸۹۶ء میں پھانسی پر لٹکا دیا۔ فلپینو لوگوں کو ڈاکٹر رزال سے بڑی شدید عقیدت ہے۔ چپے چپے پر آپ کو ان کے تذکرے اور یادگاریں ملیں گی۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے فلپائن پر قبضہ کیا۔ ۱۹۴۶ء میں امریکہ نے ان جزیروں کو مکمل طور پر آزاد کر دیا۔

جزائر فلپائن میں تیس ۳۰ مختلف مقامی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ان کے بے حد خوبصورت جزیرے اور پہاڑیاں سرسبز جنگلوں سے ڈھکی ہیں۔ جنوب کے چند جزیروں میں مسلمان بستے ہیں جو ہسپانوی زمانے سے مورو کہلاتے ہیں۔ فلپائن میں جو سب سے شکستہ حال اور پسماندہ انسان آپ کو ملے سمجھ لیجیے کہ مسلمان ہوگا۔ مسلمان بھائی اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے ساری دنیا میں الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ نہ وہ تعلیم حاصل کرتا ہے نہ ترقی کی اسے فکر ہے۔ وحشیوں کی طرح مچھلیاں پکڑتا ہے اور عمیق جنگلوں میں رہتا ہے اور ڈاکے ڈالتا ہے۔ (اللہ کے فضل سے اس ملک میں زیادہ تر ڈاکوؤں کا طبقہ مسلمان فرقے سے تعلق رکھتا ہے) فلپینو مسلمان کو منیلا کی یونیورسٹیوں اور ٹیلی ویژن اسٹیشنوں اور تعمیری پروگراموں سے کوئی مطلب نہیں۔

نہ جانے اکثریت کے رومن کیتھولک تعصب کو اس کی اس حالت میں کہاں تک دخل ہے۔

چونکہ اہلِ فلپائن کیتھولک ہیں لہٰذا سخت کٹر مذہبی اور قدامت پسند ہیں۔ امرا کی خواتین ہسپانوی وضع کی پھولی ہوئی آستینوں کے گاؤن اور منٹیلا پہنتی ہیں۔ سرینیڈ تک ہوتے ہیں۔ بس بُل فائٹ کی کسر ہے۔

تعلیم کا پرچار بھی کافی ہے۔ افلاس عام ہے۔ پریس کو بڑی آزادی حاصل ہے۔ چوراہوں پر آنے والے الیکشن کے سلسلے میں ہر طرف دھواں دھار تقریریں —— انگریزی عام طور پر بولی جاتی ہے اور یہاں کی قومی زبان ہے۔ لوگ بے انتہا کاہل ہیں۔ ایک تو جنوبی ایشیائی صفت اوپر سے ہسپانوی اثر۔ سسیٹا کی عاشق اسپینش قوم یوں ہی بہت زیادہ پھرتیلی نہیں تھی لہٰذا کڑوا کریلا نیم چڑھا۔

بے حد میوزیکل ہیں اور مغربی موسیقی کے ماہر ——

شہر کے باہر سرسبز گھاس پر فلپائن یونیورسٹی کی جدید ترین وضع کی عالیشان عمارات دور دور تک پھیلی ہیں۔ ان کی دوسری مشہور یونیورسٹی سانتو ٹماس ہے جو ۱۶۱۱ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس میں اولڈ ورلڈ ماحول برقرار ہے۔ منیلا میں ۲۲ ریڈیو اسٹیشن ہیں اور ان گنت اخبار۔

پھر کیوزن سٹی ہے ــــــ وسیع اور سرسبز۔

منیلا کے مضافات میں "کروڑ پتیوں کا محلہ" ہے۔ ہرے بھرے خاموش ایونیو۔ بے حد خوبصورت جدید ترین طرزِ تعمیر کی کوٹھیاں، شاندار کنٹری کلب۔ درختوں کے سائے میں طویل امریکن کاریں کھڑی ہیں۔ کچھ کچھ لاہور کی گلبرگ کالونی کا سا نقشہ ہے ــــــ درختوں کے پرے لکڑی کے جھونپڑے ہیں جن کے دروازوں پہ نیم برہنہ سال خوردہ عورتیں بچوں کو گود میں لئے چاول پھٹک رہی ہیں۔

ٹیگالوگ فلم دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اپنی اس بناسپتی ہسپانوی اور امریکن تہذیب کے باوجود یہ لوگ واقعی مشرقی ہیں۔ ان کے اس فلم کا قصہ بعینہٖ کسی پاکستانی فلم کی مانند تھا۔ ہیروئن کا انداز سہما سہما۔ ہیروئن کی ماں گویا بتو کی نعم البدل تھی۔ باپ مستقل ڈریسنگ گاؤن پہنتا تھا اور آرام کرسی پر بیٹھ کر پائپ پیتا تھا۔ ہیرو ظالم سماج کے ہاتھوں نالاں تھا۔ ولن جنگل کا بڑا بھائی تھا۔ ویمپ آشا پاریکھ سی تھی۔ بات بات پر گانا اور رونا جاری تھا۔ یہ فلم دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بے حد مقبول فلم کی ہیروئن سینوریتا لولیتا گویا اس ملک میں صبیحہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ہیرو ایک قسم کا سنتوش کمار تھا۔ ہیرو کا باپ غلام محمد۔ قسم خدا کی بڑی تقویت ہوئی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ایشیائی تہذیب کے مطابق ان فلموں میں پیار کے مناظر نہیں ہوتے۔ ان کی زبان ٹیگالوگ ہوتی ہے جو فلپائن کی دیسی اور عوامی زبان ہے۔

منیلا کا پریس کلب بے حد الٹرا ماڈرن ہے۔ عالمگیر صحافی برادری کی طرح وہاں جمع ہونے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی بے تکلف، اور خوش خلق ہیں۔ ان میں کسی طرح کا الجھاؤ نہیں۔ ایک روز ان لوگوں نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ ایک نیوز پیپر کا مالک اور اس کی بی بی جو میزبان تھے۔ ایک لڑکی جو ایک روزانہ اخبار میں کالم نویس تھی۔ ایک ناولسٹ لڑکی جو بہت پُرمذاق تھی۔ ایک بے حد ذہین لڑکا پیڈرو جو یہاں کا مقبول ترین اور شعلہ بیان اخبار نویس تھا۔ دو تین اور صحافی جو ٹیلی ویژن اور مختلف اخباروں کے لئے لکھتے تھے۔ یہ سب لوگ اس قدر **human**۔ یہ لوگ منیلا کے بجائے نئی دہلی، لندن، ٹوکیو کسی جگہ کے بھی پریس کلب میں ہو سکتے تھے۔ ان سب کے وہی پرابلم تھے، وہی نفسیات، تلخی، مزاحی حس، بے نیازی، ایک طرح کی شدید **cynicism** جو دنیا بھر کے جرنلسٹوں کی طبیعت کا خاصہ ہے۔

رات گئے تک ہم لوگ زور و شور سے بحثیں کرتے رہے۔ پیڈرو ہندوستان اور پنڈت نہرو کا بے حد معتقد تھا۔ وہ سب اپنے ماضی سے متنفر تھے۔ امریکنوں کو پسند کرتے تھے۔ شروع میں میں نے ان سے امریکن امداد، فلپینو کمیونزم کے متعلق چند بے ڈھب سوال کئے مگر کچھ دیر بعد مجھ میں اور میرے میزبانوں میں سخت دوستی ہو گئی۔ آخر ہم سب ایک ہی کشتی میں تو سوار ہیں۔ ان کو جاپان سے شدید نفرت تھی جو اب ان کی خام پیداوار خرید کر کے اپنی صنعتی اشیا ان کے ہاتھ بیچ رہا ہے کیونکہ فلپائن بھی 'انڈر ڈیولپڈ' ملک ہے۔

پھر وہاں سیاسی انتشار ہے۔ بے شمار سیاسی جماعتیں ہیں وہی سب کچھ ہے جو پاکستان میں ہے۔ سب پریزیڈنٹ میگسے سے کو یاد کر کے روتے ہیں اور امریکن ڈالر کے سہارے زندہ ہیں۔

غصّے سے بولتے بولتے جذباتی ہو گیا۔ اس نے میز پر زور سے مکا مارا ــــــ میں تم کو سچ بتاؤں ــــــ اس نے کہا ــــــ یہ سب فراڈ ہے۔ یہ ساری ہسپانوی تہذیب اور امریکن تعلیم ــــــ ہم ــــــ ہم سب ــــــ تم کو سچ بتاؤں ــــــ ہم فلپینو مشرق اور مغرب کی ناجائز اولاد ہیں ــــــ

پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دوسرے صحافی نے مجھے تفصیل سے ملک کے اقتصادی مسائل سے روشناس کرانا شروع کیا۔ پھر ادبدا کر گفتگو کا رخ ہندو مسلم سوال، ہندو پاکستان کے جھگڑے اور کشمیر کی طرف مڑ گیا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ دور دور سے اداس، رومینٹک موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ نیچے بولنگ ایلی میں بہت سے نوجوان صحافی لڑکے لڑکیاں بولنگ کر رہے تھے۔ ٹیلی ویژن کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ لڑکیاں امریکن لہجے میں باتیں کرتی رہیں۔ پیڈرو دوڑا گیا۔ میزبان میاں بیوی خوش خلقی سے مسکراتے رہے۔ رات کا اندھیرا دھیما ہو گیا۔ صبح سویرے میں ان پیارے لوگوں کو خیرباد کہہ کر منیلا سے جا رہی تھی۔

ہانگ کانگ۔ میں مسٹر کریز برگ کے خوبصورت فلیٹ میں بیٹھی ان کی بی بی سے باتیں کرتی رہی۔ ان لوگوں کی شادی کو ابھی دو سال ہی ہوئے ہیں۔ مسز کریز برگ بھی کیمبرج کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ملایا میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی ایک سالہ بچی کو چینی آیا کھلا رہی تھی۔ ادب اور سیاست کو بھول کر ہم لوگ شاپنگ، دو مکان کے فرنیچر اور کرائے اور اس سے متعلقہ مسائل کا تذکرہ کرتے رہے۔ مسز کریز برگ نے ملایا کی اس 'آنا' کا ذکر کیا جن سے ان کی بچی سنگاپور میں سے ہلی ہوئی تھی۔

خدا کا شکر کہ میں مدتوں بعد برطانیہ کے زیر سایہ موجود ہوں۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ سامنے یونیورسٹی کی عمارات سرسبز پہاڑیوں پر دور دور تک پھیلی تھیں۔ میرے میزبان کریز برگ یہاں فار ایسٹرن ہسٹری پڑھاتے ہیں اور ٹوکیو کی کانگریس میں اسپنڈر اور اینگس ولسن کے ساتھ برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی مستشرق ہیں اور اپنی نوعمری کے باوجود بہت متوازن طبیعت کے بڑے عمدہ آدمی ہیں۔ یونیورسٹی میں خالص انگریزی ماحول ہے۔ شعبہ انگریزی کے صدر مشہور برطانوی شاعر ایڈمنڈ بلنڈن ہیں۔

فلیٹ کی بالکنی سے میں نے سامنے نظر ڈالی۔ چاروں اور بل کھاتے پہاڑی راستے تھے اور دور نشیب میں شاندار بازار تھے جہاں لاکھوں کا کاروبار ہو رہا تھا۔ ہندو سندھی تاجر دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ چوراہوں پر سکھ سپاہی ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے۔ لندن کی طرح کی سرخ ڈبل ڈیکر بسیں چل رہی تھیں۔ بولر ہیٹ والے انگریز متانت سے بنکوں کو جا رہے تھے۔ چینی قلی رکشا کھینچ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پیروں والی بوڑھی عورتیں تاریک گلیوں میں سے بھاگتی رہتی تھیں۔ مکاؤ میں افیم کا کاروبار جاری تھا۔ ریسٹورانوں میں بیہودہ ترین کیبرے ہو رہا تھا۔

ری پلس بے میں سوئمنگ کرتے ہوئے یا کسی اعلیٰ درجے کے برطانوی کلب کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے کون مردود یہ سوچ سکتا ہے اسی قوم کا ایک بڑا حصہ اب ایک دوسری فضا میں سانس لے رہا ہے۔ آزاد دنیا کا چینی تو اب بھی مزے سے افیم کھاتا ہے اور دندناتا ہے۔ جیب کترتا ہے، چار سو بیس کرتا ہے۔ جگہ جگہ غیر ملکی سیاحوں کو خبردار کرنے کے نوٹس لگے ہیں کہ جیب کتروں سے ہوشیار رہئے گا۔

شنگھائی کا سارا رنگ و بو، عیش و عشرت تو کمیونسٹوں نے لوٹ کر تاراج کر دیا۔ وہاں کی طوائفیں سڑکیں کوٹنے کے کام پر لگا دی گئیں مگر یہاں خدا کے فضل سے ابھی بڑی رونق ہے۔ مین لینڈ چائنا میں لوگوں کا جو حشر ہوا اگر یقین نہ ہو تو ان پناہ گزینوں سے پوچھ لیجئے جو ہانگ کانگ میں بھرے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے یہاں سلمز کی آبادی بڑھ گئی ہے۔

مگر برطانیہ بہرحال بہت حقیقت پسند ہے۔ پیکنگ میں برطانوی قونصل خانہ ہے۔ مین لینڈ سے زوروں میں تجارت ہو رہی ہے۔ اکیشوتی امریکیوں پر ہو گئی کہ جو چینی نوادر عوامی چین سے یہاں امپورٹ کیے جاتے ہیں اور کوڑیوں کے مول بکتے ہیں امریکن سیاح ان کو خرید نہیں سکتے

کیونکہ ان کی حکومت کی طرف سے اس کی مناہی ہے۔ ان چینی اشیا کے خریدنے کا مطلب یہ ہوا گویا وہ دشمن ملک سے تجارت کر رہے ہیں۔ ایلیز آکس کو بے حد کوفت تھی کہ اس وجہ سے وہ کچھ نہ خرید پاتے۔

آج کلب میں ملکہ معظمہ کی تصویر دیکھی تو آنکھوں میں تراوٹ آگئی اور گورنمنٹ ہاؤس پر لہراتے ہوئے یونین جیک پر نظر ڈال کر قسم خدا کی جی بھر آیا میرا۔

مشرق میں برطانیہ عظمیٰ کی آخری کولونی ——— پائندہ باد!

کرہیز بنگ نے کہا۔ "ریڈیو ہانگ کانگ والے بے حد اکسائیٹڈ ہیں۔ کیونکہ اس کمرشل شہر میں تمہاری قسم کے لوگ ذرا کم ہی آتے ہیں لہٰذا وہ تمہارا انٹرویو کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔"

"میری طرح کے لوگ" کی ذرا وضاحت کرو ——— یعنی آرٹی کرافٹی لوگ ———؟"

ریڈیو اسٹیشن پر آجکل بی بی سی کی ہوم سروس کا ایک اناؤنسر ٹرانسفر ہو کر آیا ہوا ہے۔ اس سے بی بی سی کنٹین کی سیاست شروع ہو گئی۔ پرانے ساتھیوں کی خیریت دریافت ہوئی۔ یہ بھول ہی گیا کہ اسے میرا انٹرویو کرنا تھا۔ وہ ہانگ کانگ میں اس قدر مگن ہے کہ بش ہاؤس واپس جانا نہیں چاہتا ———

ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سمندر ہے۔ ہر طرف سمندر ہے اور سرسبز پہاڑ اور ہری بھری وادیاں۔

ہانگ کانگ کی خوبصورتی کا کیا کہنا۔ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ فلک بوس عمارات، دلفریب کولونیل کوٹھیاں، غلیظ ترین سلم، پیچ در پیچ راستے، خالص مشرقی پرل بک کے ناولوں والا پُراسرار ماحول۔ مکاؤ پرتگالی علاقہ ہے لہٰذا اور زیادہ پُراسرار اور زیادہ رومینٹک۔ کشتیوں پر ایک پورا شہر آباد ہے۔ سمپانوں میں ریسٹوران ہیں جہاں سلیٹ فراک پہنے حسین لڑکیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔

وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے کی عالیشان عمارت کے برابر سے ایک سڑک ڈھلوان پر فیشن ایبل شاپنگ سنٹر کی طرف جاتی ہے جو گویا یہاں کی ریجنٹ اسٹریٹ ہے۔ سامنے پہاڑی ہے۔ اوپر سے بندرگاہ نظر آتی ہے۔

یہاں بڑے دلچسپ لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک امریکن مشنری خاتون جو سال بھر جنوبی ہند کے ایک مشن میں رہنے کے بعد وطن واپس لوٹ رہی ہیں۔ دو آسٹریلین لڑکیاں جو ماسکو کے یوتھ فیسٹیول سے آئی ہیں اور سڈنی واپس جا رہی ہیں۔ کئی بددماغ انگریز لڑکیاں ہیں جو یہاں سرکاری دفاتر میں ملازم ہیں۔ پھر چینی عیسائی خواتین ہیں اور مسز لم، وائی ڈبلیو سی اے کی چینی سکریٹری جو بے انتہا خوش اخلاق ہیں۔ میں اپنے عیسائی اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی وجہ سے یہاں بھی ایٹ ہوم محسوس کر رہی ہوں۔ کھانے کے بعد ہم گھنٹوں ڈرائنگ ہال کی میز ملہ پر بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ ٹوکیو اور منیلا کی پُرتکلف فضاؤں کے بعد یہ کالج ہوسٹل کا ایسا ماحول بہت آرام دہ ہے۔

آسٹریلین لڑکیاں مارگریٹ اور پالا عوامی چین کی تعریفیں کرتے کرتے بے حال ہوئی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں چند سال انگلستان میں پڑھتی رہیں۔ ماسکو کے تہوار میں شامل ہونے کے بعد چین گھومتی ہوئی یہاں پہنچی ہیں۔ ان کے ہمراہ ان امریکن طلبا کا گروہ بھی ماسکو سے ٹرین کے ذریعے پیکنگ آیا تھا جن سے امریکن حکومت بے حد ناراض ہے۔ مارگریٹ اور پالا دونوں کمیونسٹ نہیں ہیں۔ مارگریٹ سڈنی کی کئی عیسائی نوجوانوں کی انجمنوں کی عہدیدار ہے۔ پالا ایک مشن کالج میں پڑھاتی ہے لیکن مارگریٹ عوامی چین سے اس قدر متاثر ہو کر آئی ہے

---

[1] حوالے کے لئے دیکھو کلارک گیبل کی فلم Soldier of Fortune اور جینیفر جونز کی فلم ''Love is a many splendoured thing.

اٹھتے بیٹھتے اس نے وہاں کی بکھان کرتے کرتے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ چیرمین ماؤ ایسے اور چیرمین ماؤ ویسے۔ امریکن مشنری خاتون مس ننگ کہ وہ ہر وقت بتاتی رہتی ہے کہ عوامی چین میں وائی ڈبلیو سی اے کی تحریک نے انقلاب کے بعد کس قدر ترقی کی ہے اور کیا کیا کمالات ہوئے ہیں۔ مس ننگ سے بے چاری چپ چاپ بیٹھی سنتی رہتی ہیں۔ یقین کریں یا نہ کریں راوی "ریڈ" نہیں بلکہ خود ایک جوشیلی کرسچین ورکر ہے۔ مس ننگ بیشتر امریکن مشنریوں کی مانند بے حد منہ پھٹ بڑھیا ہیں۔ مسز لم کو جو قوم پرست چینی ہیں مارگریٹ کی باتیں بہت ناگوار گزرتی ہیں۔ سب پروپیگنڈہ ہے۔ جھوٹ۔ بالکل بکواس۔ میں تم کو ان پناہ گزینوں سے ملواؤں گی جو سُرخ چین سے آئے ہیں ——

مارگریٹ اکثر بڑی اُداسی سے مس ننگ سے کہتی ہے —— کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ آپ کا ملک اتنی عظیم قوم کے وجود ہی سے منکر ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

مس ننگ کیبالا کے ایک مشن میں سال بھر رہ چکی ہیں۔ "آپ تو خود ایک کمیونسٹ حکومت کا تجربہ کر کے آرہی ہیں۔ ذرا وہاں کے غلط حالات —" —— پالا معصومیت سے پوچھتی ہے۔

"عوامی چین کے لوگوں میں کتنا وقار ہے۔ کتنا توازن ہے۔ انہوں نے برسوں برس کس قدر شدید تکلیفیں اٹھائی ہیں" مارگریٹ کہہ رہی ہے —— "جب میں سرحد عبور کر کے ہانگ کانگ پہنچی اور میں نے یہاں کی غلاظت، یہاں کے سلمز، یہاں کی آوارگی، فری ورلڈ کی ساری نعمتیں دیکھیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چین فری ورلڈ میں نہیں۔ برطانوی کراؤن کولونی —— اونہہ —— جب میں نے یہاں دوکانوں پر انگریزی نام دیکھے، چینی لڑکیوں کو مغرب کی اسٹریٹ واکرز کی طرح گھومتے دیکھا۔ برطانوی سپاہی اور برطانوی جہاز نظر آئے —— برطانیہ کو کیا حق ہے کسی ایشیائی رقبے پر حکومت کرے ——"

"عوامی چین میں جنس کی دیوانگی نہیں ہے۔ نہ Dates ہوتی ہیں نہ لڑکیاں لپ اسٹک لگا کر اپنے جسموں کی نمائش کرتی ہیں —" پالا نے کہنا شروع کیا ——

"مارگریٹ —— سچ سچ ——" میں نے سنجیدگی سے کہا —— "تم بے حد بُری طرح سے برین واش کر دی گئی ہو" ——

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو —" مسز لم نے خوش ہو کر کہا۔ "کمیونسٹوں کو ایسی عجیب و غریب پروپیگنڈہ ٹکنیک آتی ہے کہ اچھے خاصے معقول انسانوں کا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔"

"جی ہاں! اب مارگریٹ اور پالا کو دیکھئے ویسے بالکل نارمل باتیں کرتی ہیں لیکن جہاں سُرخ چین کا ذکر چل نکلا اور یہ بہکیں۔" میں نے جواب دیا۔

ہیلنا مے کے اونچے دریچوں اور شاہ بلوط کی دیواروں والے ایوانِ نشست میں دو برطانوی اپر کلاس لڑکیاں میرے ساتھ بیٹھی ہیں۔ تذکرہ شہزادی مارگریٹ کے رومان، گریس کیلی کی بچی اور مارلن برانڈو کے فلموں کا ہو رہا ہے۔ مؤدب چینی بٹلر (لکھنؤ کے محمد باغ کلب کے ہیڈ آبدار عبدل کا روحانی کزن) خاموشی سے کھانا سرو کرنے میں مصروف ہے۔ دریچے کے باہر گُھپ اندھیرا ہے۔ میری میزبان جیلین، یہاں کونسل سروس میں عہدیدار ہے۔ بہت خوش شکل اور پیاری لڑکی ہے۔ اس کا باپ انڈین آرمی میں بریگیڈیر تھا اور دوسری جنگِ عظیم سے قبل لکھنؤ چھاؤنی میں رہا کرتا تھا۔ دوسری لڑکی پیملا بھی جیلین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور اسی کی طرح یہاں ملازم ہے۔ غیر معمولی طور پہ بے وقوف لڑکی ہے۔ اس کا باپ افریقہ کی کسی برطانوی کولونی کا گورنر ہے، یا تھا۔ مجھے تفصیلات یاد نہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اس اعلیٰ درجے

کے اقامتی کلب میں رہتی ہیں جو ہانگ کانگ کے کسی سابق گورنر کی بیوی کے نام پر معنون ہے۔ تیسرے پہر کو ری پلس بے میں سوئمنگ کرتی ہیں رات کو اعلیٰ سرکاری طبقے کی دعوتوں میں شامل ہوتی ہیں۔ اسی ڈھب سے ان کی زندگی گذرتی ہے۔ ان کی تعلیم انگلستان اور سوئٹزرلینڈ کے فنشنگ اسکولوں میں ہوئی ہے۔ ان کا مطالعہ لندن کے سوسائٹی رسالوں تک محدود ہے۔ ان کو بسنت کی کچھ خبر نہیں۔ مارگریٹ ان کو دیکھ پائے تو ہنسی کے مارے دیوانی ہو جائے۔ یہ سب چاروں لڑکیاں جو برطانوی امپیریلسٹ اپر کلاس سماج کے آخری چراغ ہیں۔

صبح مارگریٹ کہہ رہی تھی کہ میرا خیال تھا کہ ہانگ کانگ شاید دس سال تک برطانیہ کے پاس رہ جائے مگر آج ایک چینی نے اس سے کہا کہ فقط تین چار سال کی بات اور ہے۔

چند روز اور میری جان —— فقط چند ہی روز ——

ایسی بدشگونی کی باتیں مارگریٹ کرتی ہے۔

مارگریٹ یہاں سے جاپان ہوتی ہوئی سڈنی جائے گی۔ اس کے پانچ بھائی ہیں جن میں سے بقول اس کے مارکسسٹ اور تین کرسچین ہیں۔ پانچوں یونیورسٹی میں پڑھتے یا پڑھاتے ہیں۔ باپ سائنسدان ہے۔ سب سے بڑے بھائی کی دو مہینے قبل شادی ہوئی ہے۔ مارگریٹ نے ابھی اپنی بھاوج کو نہیں دیکھا۔

"میری اپنے مارکسسٹ بھائیوں سے خوب جھک جھک رہتی ہے۔ نہ آج تک وہ مجھے قائل کر پائے نہ میں انہیں عیسائی بنا سکی۔ بڑا لطف آتا ہے ——"

دوسرے روز برک فاسٹ کی میز پر مس ینگ نے اس سے کہا: "جاپان کب جا رہی ہو ——؟"

"نہیں جا رہی ——" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ارے ایک ری ایکشنری ملک بھی دیکھ آؤ —— فائدہ ہوگا ——" میں نے کہا۔

وہ خاموش ہو گئی —— "میں نے تم کو اب تک نہیں بتایا تھا۔" اس نے مجھ سے کہا: "کیونکہ ہم لوگ یہاں اتنا خوشگوار وقت گذار رہے تھے میں تم کو یہ خبر سنا کر رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"کیا ہوا ——؟"

"پرسوں مجھے گھر سے کیبل ملا ہے کہ میرا بڑا مارکسسٹ بھائی اور اس کی نئی دلہن اپنے کمرے میں سو رہے تھے گیس کھلا رہ جانے کی وجہ سے دونوں دم گھٹ کر سوتے میں ختم ہو گئے —— میں کل سڈنی جا رہی ہوں۔"

دوسرے روز ہم تینوں ہانگ کانگ سے روانہ ہو رہے تھے۔ رات کو ہم پیکنگ سے پہلے اپنا سارا سامان پھیلا کر فرش پر بیٹھ گئے۔

مارگریٹ اور رپالا روس اور چین سے ڈھیروں تحفے لے کر آئی تھیں۔ چین میں ان کو جو تحفے دیے گئے وہ حیرت انگیز تھے ہزاروں سال پرانے زیورات، سینکڑوں برس پرانی پینٹنگز، دوسرے انتہائی بیش قیمت نوادر —— مس ینگ بے حد تعجب اور مسرت سے ایک ایک چیز دیکھتی رہیں۔ "تم ان سب چیزوں سے اچھا خاصا میوزیم کھول سکتی ہو ——!" انہوں نے کہا۔

دوسری صبح میں فیری سے اتر کر کولون کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اسٹیمر سے باہر نکلنے والے مسافروں کے بھیڑ بھڑکے میں کسی نے

پیچھے سے آواز دی ——

میں نے مڑ کر دیکھا ——

ژاں کھڑا پلکیں جھپک رہا تھا

"ہلو —— " میں نے کہا۔ "تم یہاں کہاں۔ معلوم ہوتا ہے ابھی تم رائٹر لوگوں کی آوارہ گردی ختم نہیں ہوئی ——؟"

"ہر جگہ —— " اس نے کندھے اچکا کر کہنا شروع کیا۔

"ہاں! ہاں —— ٹھیک ہے —— " میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی —— "لیکن میں بھاگ رہی ہوں۔ مجھے ابھی چند منٹ میں ہوائی جہاز پکڑنا ہے۔"

"پیرس میں ضرور ملنا ——"

"ہاں! ہاں! پیرس میں ضرور ملوں گی —— " میں تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھی۔ ہانگ کانگ پانی کے دوسرے کنارے پر رہ گیا۔ کولون میں زندگی کا ہنگامہ اسی طرح جاری تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سامنے پینسولا ہوٹل تھا جہاں سے مجھے چند لمحوں میں ایرپورٹ جانے کے لئے ایرلائنز کی بس پکڑنا تھی۔

سڑک عبور کرتے ہوئے مجھے مارگریٹ اور پالا نظر آ گئیں۔

خدا حافظ —— وہ ہاتھ ہلا کر چلائیں —— بہت دور تک وسیع اجنبی سڑک پر سر جھکائے اکیلا جاتا ہوا ژاں بہت مسخرہ اور قابلِ رحم معلوم ہو رہا تھا۔ سارا ہانگ کانگ اور کولون مسخرہ اور قابلِ رحم تھا۔ صرف مارگریٹ اور پالا متوازن اور مضبوط ہستیاں تھیں۔

"تمہیں معلوم ہے ہم دوبارہ کہاں ملیں گے؟" مارگریٹ نے قریب آتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

"تم ہی بتاؤ —— !"

"ریڈ ہانگ کانگ میں ——"

"خدا خیر کرے —— تم تو واقعی بہت بُری طرح برین واشن کر دی گئی ہو۔ تمہارا کیا حشر ہوگا۔" میں نے متفکر ہو کر کہا۔

پھر ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر خوب ہنسے اور دونوں لڑکیاں اپنا اپنا سامان اٹھائے اپنے راستے چلی گئیں۔

اب مارگریٹ گھر پہنچے گی جہاں اس کا چہیتا بھائی مر چکا ہے۔ جب لوگ گھر پہنچتے ہیں تو کیسا لگتا ہے ——

ہر سفر کے بعد گھر موجود ہونا چاہئے۔

اور گھر تباہ نہ ہونے چاہئیں۔

دنیا کے، ایشیا کے شہروں کو بمباری سے بچاؤ ——

میں نے سوچا کہ اگر یہی جملے میں کاغذ پر لکھ دوں تو کس قدر بے معنی، واہیات، مصنوعی، سلوگن اور پروپیگنڈا اور ادعا بازی معلوم ہوگا۔

جب میں بنکاک پہنچی تو اس سے کچھ ہی عرصہ قبل ایک نہایت ایشیائی ترین قسم کا فلمی کُو کیا جا چکا تھا ۔۔۔ ایرپورٹ پر مسافروں کی نہایت زبردست چیکنگ ہو رہی تھی۔ چاروں طرف مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ باہر سڑکوں پر ٹینک گھوم رہے تھے اور نہایت سنجیدہ شکلوں والے افسر

جو سب کے سب ایک کومک اوپیرا کے کردار معلوم ہو رہے تھے۔ ایک صاحب نے پاسپورٹ دیکھنے کے بعد میرے ٹائپ رائٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کیا ہے ———؟"

"تارپیڈو ———"

"ایں ——— کیا ———؟"

"تارپیڈو ———" میں نے سادگی سے دہرایا۔

"یہ ——— یہ ———؟" انہوں نے انگلی سے دوبارہ اشارہ کیا۔

"جی! کیا اسے مارشل لاء میں اندر لے جانے کی اجازت نہیں ———؟" میں نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

"لیکن یہ ہے کیا ———؟"

"تارپیڈو ٹائپ رائٹر ——— مغربی جرمنی کا بنا ہوا ——— نہایت مضبوط ——— پائیدار ———"

"آپ آگے تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

شہر میں عجب چنڈو خانے کا مارشل لا نافذ ہے۔ لوگ گویا تہوار مناتے پھر رہے ہیں۔

شام کے اخبار جنرل سری آنند کے متعلق سنسنی خیز اور ڈرامائی خبروں سے پُر ہیں جو پرسوں بھاگ کر جنیوا پہنچے۔ فیلڈ مارشل سرت تھانارت نے حکومت پر قبضہ کر لیا ہے۔ نئی حکومت میں سری وساآرن واجا شامل ہیں اور ایک اور صاحب جن کا نام آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں تک ان حضرات کے نام سنسکرت میں ہیں وہاں تک تو خیریت ہے مگر پھوم لپاں پیہ ینگ قسم کے خطابات سُن کر دم بُولا جاتا ہے۔

معزول شدہ وزیر اعظم مارشل سنگرام کل رات ایک دیہاتی سے موٹر بوٹ مستعار لے کر کمبوڈیا کی طرف نکل گئے۔ بالکل ہالی ووڈ کے کسی فلم کا اسکرپٹ معلوم ہو رہا ہے۔

سیام ——— اسیام ——— !!

سیام جو کہ تھائی لینڈ ہے۔

جس طرح انڈیا جو کہ بھارت ہے۔

تھائی کے معنی آزاد کے ہیں۔ یوں بھی یہ ملک فری ورلڈ کی آزادی کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ اسی لئے فلپائن اور پاکستان اور تھائی لینڈ تینوں میں بڑی پکی دوستی ہے۔

بنکاک سے کچھ فاصلے پر سیام کی قدیم راجدھانی ایوتھیا ہے۔ سرحد کے اس پار کمبوڈیا میں انگ کور واٹ ہے۔

"ہم انگ کور جا رہے ہیں۔" ایک یوروپین سیاح اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

ہم انگ کور واٹ ہو آئے ——— آپ ابھی نہیں گئے؟

سارے یوروپین اور امریکی سیاح انگ کور واٹ جانا چاہتے ہیں ——— جو ایک زمانے میں روم کی مانند عظیم الشان تھا۔

اور چمپا ——— اور ملایا ——— اور جاوا ——— ہند قدیم کی نو آبادیاں ——— جو پہلی سے پندرھویں صدی عیسوی تک پھلی پھولیں۔

کمبوڈیا۔ مہاراجگان سجے ورمن، یشوورمن، اندرورمن اور سوریہ ورمن کا ملک۔ کمبوج دیش کمبوڈیا کے جنوب کی بادشاہت تھی جسے پانچویں صدی عیسوی میں مشرق کے اناّم اور مغرب کے تھائی لوگوں کے حملوں نے کمزور کر دیا۔ اپنے عروج کے زمانے میں سارا سیام، کوچین چائنا، کمبوڈیا، لاؤس، برما اور ملایا کے چند حصے اس میں شامل تھے۔ انگ کور اس کی راجدھانی تھی جس کا وشنو کا مندر دنیا کے عجائبات میں شامل ہے۔

انگ کور کا مندر ——— قرطبہ کی مسجد ——— اوّل و آخر فنا!

انگ کور واٹ آج بھی ایک خواب کی طرح موجود ہے۔ خاموش، مہیب، سنسان، جنوبی ہند اور اڑیسہ کی طرز کے مندر، وکنیشور اور ہری ہر کے عظیم الشان بت، شیو کے لرزہ خیز مجسّمے، اپسرا اور گندھروا، ہوا اور پہاڑ پور کی روایت کے دیوتا اور دیویاں اور رودیا دھر اور گندھرو، دیواروں کے ریلیف کے مجسّمے۔ مکمل خاموشی، مکمل حسن ——— چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں یہاں کا فن سنگتراشی جس بلندی پر پہنچ گیا تھا صرف دیکھ کر اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گپتا عہد کے کتنے فنکار یہاں آئے ہوں گے۔

مُردوں کا خاموش شہر۔

چمپا ——— مہاراج دھیراج سری جے آندروزن کا ملک ———

سولھویں صدی میں قبلائی خان کے حملہ آوروں نے ان ساری جگہوں کا خاتمہ بالخیر کر دیا ———

اوّل و آخر فنا ——— ظاہر و باطن فنا!

آخر میں چمپا اور اندلس اور انگ کور سب مٹ جاتے ہیں۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب تمدن اپنی بلندی پر پہنچتا ہے تو افق پر تخریب پسندوں کی فوج طلوع ہوتی ہے اور کہانی دفعتاً ختم ہو جاتی ہے۔

آج ان خطوں میں مون، کھمیر، تبتو برمی، اناّمی، ملایائی اور تھائی نسلوں کی ایک عجیب و غریب کھچڑی آباد ہے۔ بڑا بڑا اینتھروپولوجسٹ اور ماہر لسانیات یہاں آن کر چکرا جائے گا۔ بس ان کے عمرانی مطالعے کی کوشش سے فوراً دست بردار ہو گئی۔

ایک ہزار سال قبل سیام دواروتی کے مون لوگوں اور کھمیر (کمبوڈیا یا کمبوج دیش) کی ہندو سلطنت کے زیر نگیں تھا۔ جزیرہ نما ملایا کی طرف کا حصہ سماٹرا کے سری وجے کے قبضے میں تھا۔ اسی زمانے میں تھائی قوم نے جنوبی چین سے جزیرہ نما انڈوچائنا کی طرف ہجرت کی۔ دو ہزار سال اُدھر تھائی نسل شمال مغربی چین کے اس صوبے میں رہا کرتی تھی جو آجکل شین سی کہلاتا ہے۔ لفظ سیام اسی شین سے نکلا ہے۔ جنوبی چین میں جب تھائی بادشاہت پر قبلائی خان نے باضابطہ قبضہ کر لیا اس وقت تک تھائی لوگ ہجرت کر کے انڈوچائنا آ چکے تھے۔ یہاں انہوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کیں۔ اور آپس میں اور اپنے ہمسایوں سے لڑتے رہے۔ ان کی ایک شاخ برما میں شان قبیلے کے نام سے آباد ہو گئی۔ وسط سیام اب کھمیر سلطنت کی ہندو کلچر کے زیر اثر سیام دیش کہلاتا تھا۔ ۱۲۵۷ء میں ایک تھائی شہزادے اندر جیت اور اس کے بیٹے رام نے کھمیر تسلط سے آزاد ہو کر اپنی حکومت قائم کی۔ ایودھیا کا نیا شہر آباد کیا گیا جو ۱۷۸۲ء تک سیام کی راجدھانی رہا جس کے بعد بنگ کاک کی بنا پڑی۔

سیام تہذیبی طور پر کمبوڈیا کی برہمن تہذیب کا حلقہ بگوش رہا۔

مجموعی طور پر چین اور ہندوستان کی تہذیبوں اور ہندوازم اور ہنایان بدھ مت کے معجون مرکب کا دوسرا نام سیام یعنی تھائی لینڈ ہے۔

ان کا رقص بیلے اور ڈرامہ ہندوستانی کلاسیکل رقص اور ڈانس ڈرامہ کا چربہ ہے۔ موسیقی پر چین اثر انداز ہوا۔ سیام میں دواروتی کی سنگتراشی

---

[1] راج شاہی (مشرقی پاکستان)

دراصل گپتا عہد کی عظمت کی یادگار ہیں۔ کمبوڈیا کے زیرِ اثر سیام کے فنونِ لطیفہ نے بے حد ترقی کی۔ تیرھویں صدی میں سیام نے کمبوڈیا ہی کے ذریعے جنوبی ہند کا ایک رسم الخط حاصل کیا۔ پالی، سنسکرت اور کمبوڈین الفاظ سے ان کی زبان کی تشکیل ہوئی۔ راماتھی تھائی ادب کی بنیاد ہے اور اس کا سیامی ورشن یہاں کا اعلیٰ ترین کلاسیک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے بادشاہ اور شہزادے علم و ادب کے بہت سرپرست رہے ہیں اور انہوں نے خود بھی کتابیں لکھی ہیں۔

مذہب کا یہاں ہر چیز پر بہت سخت عمل دخل ہے۔ دیہات میں لوگ اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں، درختوں اور پرکھوں کی عبادت کرتے ہیں۔ وسط سیام کا اعلیٰ طبقہ اب بھی مذہبی طور پر خالص ہندو ہے۔ بنگ کاک میں چار سو خانقاہیں ہیں لہٰذا تجارت سکھوں اور چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔

ہر طرف مندروں اور پگوڈاؤں کی بھرمار ہے۔ یہاں عیسائی مشنریوں کو بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ مسلمان تقریباً مفقود ہیں۔ پگوڈا بھی ہندوستانی مندروں کی شکھارا طرز سے نکلے ہیں جو یہاں کمبوڈیا سے آیا۔ رنگین ٹائیل، شوخ رنگ، آئینوں اور رنگ برنگی گھنٹیوں اور سونے کے پتروں اور پروں، والا ہے۔ طرزِ تعمیر خالص سیامی خصوصیت ہے۔ ستوپ، منڈپ، گمٹی ان کی مختلف طرزِ تعمیر ہیں۔ واٹ مندر کو کہتے ہیں۔ ستوپ ستوپ ہے۔ منڈپ منڈپ، گمٹی کے معنی کٹی ہیں۔ ستوپ کے سر پر چھتر ہوتا ہے جس کا مطلب چھتر ہے ——

اس سے قبل کہ میں اور زیادہ گڑبڑا جاؤں میں اس موضوع کو تبدیل کرتی ہوں۔

بنگ کاک مشرق کا وینس کہلاتا ہے، بوجہ بہت سی نہروں کے جو شہر میں سے گزرتی ہیں۔ مگر یہ نہریں زیادہ تر غلیظ ہیں اور ان پر چلنے والی کشتیاں شکستہ اور گندی اور افسوس کہ مجھے ان میں کوئی افسانویت نظر نہیں آئی۔ دریا پر سے سینکڑوں کشتیاں، سامان اٹھائے گزرا کرتی ہیں۔ دریا اس ملک کی خاص تجارتی شاہراہ ہے۔ اس کے دونوں طرف سینکڑوں نہریں ہیں جن پر سمپان، موٹر بوٹ، اسٹیم لانچیں بہتی نظر آتی ہیں۔ ہاؤس بوٹ میں لوگ رہتے ہیں۔ نہریں گویا بازار کی چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں جہاں کشتیوں پر ہاٹ لگتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف نارنجی کپڑوں والے راہبوں کی ریل پیل ہے جو اکثر ناؤ کھیتے بڑی کشتیوں کے پاس جاتے ہیں، وہاں سے خیرات لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تھائی لینڈ کا سارا ماحول اس قدر مانوس سا ہے کہ مجھے بالکل یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کسی اجنبی، غیر ملک میں ہوں۔ یہ سب تو چاٹگام کی طرح ہے یا مشرقی پاکستان کے کسی بھی خطے کی مانند۔ ایرپورٹ سے شہر تک کا راستہ تیج گاؤں سے ڈھاکے جانے والی سڑک کی یاد دلاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے لکڑی کے جھونپڑے، ٹوٹی پھوٹی کھٹارا ایسی بسیں، سائیکل رکشائیں، کائی آلود تالاب اور نالے۔ جغرافیائی اور عمرانی لحاظ سے مشرقی پاکستان واقعی جنوب مشرقی ایشیا کا ایک حصہ ہے۔

مجھ سے ایک امریکن نے کہا: "یہاں مکمل آزادی ہے۔ ملک اپنی ضرورت بھر اناج اور چاول اُگاتا ہے۔ لوگ خوشحال ہیں لیکن حد سے زیادہ کاہل۔ مجھے ایک اور احمق امریکن مت سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ یہ لوگ طبعاً لاپروا اور خوش باش ہیں۔ سیاست ان کے نزدیک محض ایک اور تفریحی مشغلہ ہے۔ ان کے یہاں حکومت تبدیل کرنے کا نارمل طریقہ کُو ہے اور ملکوں میں الیکشن ہوتے ہیں۔ آئینی طور پر رد و بدل کیے جاتے ہیں۔ یہاں کُو دی تا کا فیشن ہے۔ بے شمار سیاسی جماعتیں ہیں۔ سب اپنی اپنی ہانکتے ہیں مگر ایک عام آدمی کو سیاست کی مطلق فکر نہیں۔ یہ صرف! ایک کھیل ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ شمال میں بڑا سخت قحط پڑ رہا ہے۔ بنگ کاک کی سڑکوں پر بے شمار فاقہ زدہ کسان مارے مارے پھر رہے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"یہ سب روسی پروپیگنڈہ ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "تھائی لینڈ خوشحال ملک ہے۔ لوگ اپنی کھال میں مگن ہیں اور بے حد سست الوجود۔ پیشہ ور سیاستدانوں کو پیس پولٹیکس لڑانے کی انہوں نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ بادشاہ اور ملکہ پریوں کی داستانوں والے ماحول میں رہتے ہیں۔

واقعی یہ بقول تمہارے بڑا زبردست کومک اوپیرا ہے مگر اس پریشان حال حقیقت پرست دنیا میں ایک الف لیلوی ملک بھی تو ہونا ضروری ہے۔ تم پاکستانیوں اور ہندوستانیوں میں یہ مرض ہے کہ ہر چیز کو حد سے زیادہ سنجیدگی سے لیتے ہو اور پھر تم کو اپنا مقابلہ ان لوگوں سے یوں بھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ یونہی معصوم سے لوگ ہیں ان کے یہاں وہ عظمت اور گمبھیرتا نہیں جو ہندو پاکستان میں ہے ــــ تم نے لیٹے ہوئے بدھا کا پگوڈا دیکھا ــــ؟"

پگوڈا ــــ مزید پگوڈا ــــ بادشاہ کے محلات۔ "زمرد کے بدھا" کا مشہور و معروف مندر جو در اصل ایک بد مذاقی سے بنائے ہوئے عظیم الشان تعزیے کے مانند ہے جس کے چاروں اور برآمدوں کی دیواروں پر راماین کی کہانی کے نہایت بھدے فریسکو ہیں۔ ہال میں فراکوں میں ملبوس عورتیں مورتی کے سامنے سجدے میں پڑی ہیں اور امریکن ٹورسٹ ان کی تصویریں کھینچ رہے ہیں۔

میں جلدی سے باہر نکل آئی۔ مشرق کے exolic ہونے کی بھی ایک حد ہونی چاہئے۔

باہر سڑکوں پر اخبار والے جنرل سنگرام کے متعلق تازہ ترین خبروں کی سرخیاں لگائے پھر رہے تھے۔ سیٹو کے دفاتر کے آگے طویل کاریں کھڑی تھیں۔ ٹینک بدستور چاروں اور چکر لگا رہے تھے۔

تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ جزیرہ نما مشرق میں ریاستہائے بلقان کی کمی کس خوبصورتی سے پوری کر رہا ہے۔ یہ ان گنت چھوٹی چھوٹی مضحکہ خیز بادشاہتیں، جہاں انقلاب آتے ہیں۔ سازشیں اور خونریز جنگیں ہوتی ہیں۔ گوریلا جانبازوں کے سروں پر انعام مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہ بڑا عجیب و غریب علاقہ ہے۔ یہاں شمالی ویت نام بھی ہے اور تھائی لینڈ بھی۔ یہ ہوچی منہ اور پرنس وان دونوں کی سرزمین ہے۔ ان سارے ممالک کی طرح جو اپنی تاریخ کو محض ٹورسٹ انڈسٹری کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ تھائی لینڈ بھی خاصا بوگس ہے۔

تاریخ نقد کاری ہے۔ حال بے کیف ہے مستقبل نامعلوم ــــ

پگوڈاؤں میں ہر طرف گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ دھان کے سرسبز کھیت کھلی ہواؤں میں لہلہا رہے ہیں۔ غیر ملکیوں کے لئے ان فضاؤں میں بڑا گلیمر ہے۔ اصلیت میں ہر طرف بھوک اور تباہ حالی ہے۔ غیر ملکیوں کو لوسندھ اور سرحد کے پسماندہ ترین گاؤں میں بھی بڑا گلیمر نظر آتا ہے اور اگر کوئی سمجھدار غیر ملکی اس پس ماندگی کی طرف ذرا سا بھی اشارہ کرتا ہے تو فوراً "موہن جوڈارو" کی "قدیم پاکستانی تہذیب" کے متعلق ایک رنگین پمفلٹ اس کی ناک میں ٹھونس دیا جاتا ہے یا کپلنگ کے پشاور کے بارے میں ارشادات اس کے گوش گذار کر دئے جاتے ہیں غیر ملکی سیاح یہ سوچ کر کہ پیسے وصول ہو گئے خوش خوش کراچی کے میٹروپول واپس آجاتا ہے۔

میں بھی سارے تاریخی مقامات کی سیر کے بعد خوش خوش بنکاک میں اپنی قیام گاہ پر لوٹی۔

بنکاک کی مشہور پبلشر خاتون اور زنانہ رسالے "استری سرن" کی اڈیٹر مس نیلاون نے رائٹر لوگوں کی دعوت کی ہے۔ اسٹیون اسپنڈر، انگس ولسن اور ڈیوڈ کارور جاپان سے واپسی میں مختلف ممالک کا چکر لگاتے ہوئے آرہے ہیں اور آج ہی انگکور واٹ سے واپس لوٹے ہیں۔ کمبوڈیا میں خالص سیاحوں والے طرز کے بڑے بڑے ایڈونچرز ان کے ساتھ رہے۔ یہ لوگ جنگلوں میں راستہ بھول گئے۔ ہوٹل میں رات کو مچھروں نے انہیں بہت ستایا۔ ایک مرتبہ طیارہ فورسڈ لینڈنگ کرتے کرتے بچا۔ اکثر موٹر کا انجن خراب ہوا۔ وشنو کے مندر کے سناٹے میں انہوں نے وقت کی پرواز کی صدائیں سنیں اور چمپا کے پرانے بادشاہ جے پرمیشورورما دیوالیشوورمن کے نام سے متعارف ہوئے۔

میرے خیال میں مشرق کا dose مسٹر اسپنڈر کے لئے اب ضرورت سے زیادہ ہو گیا تھا۔ موصوف معمول سے کہیں زیادہ اکتائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ طرہ یہ ہوا کہ مس نیلاون کی دعوت میں تھائی ادباء اور صحافیوں کی ایک بارات کی بارات ان کا دماغ چاٹنے کے لئے

موجود تھی اور ہمارے مستشرقیوں کی طرح کیا ناقابلِ یقین مسخرے پن کے ان خواتین و حضرات کے نام تھے ——— اثرمان رائج و حمن، شہزادہ پرکیم اٹھاکو رودیا شیو سری آنند، مس اندرا کامنگ، مس شُدھی لکشن ———

رات بھر بارش ہوا کی۔ میری لکڑی کی کاٹج اندھیرے میں گھری کھڑی ہے۔ چاروں اور گھنے درخت ہیں۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن کا پروگرام کب کا ختم ہو چکا۔ کاٹج میں بڑا سناٹا ہے۔ میری امریکن میزبان خاتون باہر بارش میں بھیگتی کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں: "صبح ہونے تک خنکی زیادہ ہو جائے گی یہ لو میں تمہارے لئے کمبل لائی ہوں ———"

تنگ نظر امریکن امداد، بوگس سیاحی، متعصب قوم پرست چینی اور ری ایکشنری جاپانی، مغربیت زدہ فلپینو اور راکل کھرے انگریز، حریت کے دشمن فرانسیسی اور مسخرے جنوبی کورین ——— سب انسان ہیں، عفریت اور دیو اور شیاطین نہیں۔ ان سے ڈرنے یا بدظن ہونے کی آخر کیا وجہ ہے۔ ان سب کے دلوں میں محبت اور ہمدردی اور شرافت اور نیکی کے جذبات موجود ہیں جو ہم آپس کی نفرت اور شکوک کی وجہ سے دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ دنیا مایوس کن نہیں ہے۔ اس دنیا میں امریکہ کے جوان ڈوس پیسس اور مغربی جرمنی کے ڈاکٹر گلیفنسٹپ جیسے عظیم اور پیارے انسان بستے ہیں جنہیں جاننا کسی بھی انسان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔

میری امریکن میزبان کمبل دینے کے بعد بارش میں بھیگتی ٹارچ کی روشنی چمکاتی گھاس کا وسیع قطعہ عبور کر کے اپنے مکان کی طرف چلی گئیں۔ میں نے روشنی جلا کر ایک تھائی رسالہ اٹھا لیا جس پر ہندو دیومالا کے روایتی عقاب "گرڑ" کی تصویر بنی تھی جو انڈونیشیا کی طرح تھائی لینڈ کا بھی قومی نشان ہے۔ قریب ہی پاکستان اور ہندوستان کے سفارت خانوں سے آئے ہوئے ہلال اور اشوک چکر والے پمفلٹ رکھے تھے۔ قومی نشانوں کی نفسیات کیا ہے۔ میں نے سوچنا چاہا۔ اکتا کر میں نے کاغذات میں سے دوسری کتاب اٹھائی ایک امریکن صحافی کی لکھی ہوئی ضخیم کتاب اٹھائی جس کے گرد پوش پر اردو ہندی اور دوسری ایشیائی زبانوں میں لکھا تھا ——— "ایشیا کا کوئی وجود نہیں۔"

اسے لیجئے اس سمجھدار آدمی نے سارا قضیہ ہی پاک کر دیا۔ اب سارے جھمیلے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ ٹوئنبی اینڈ کو اور فار ایسٹرن سوسائٹیوں کے متعلق کیا کہتا ہے اور پنڈت نہرو کا ایشیا کا تصور پاکستان والوں کی تھیوری سے کیوں جدا ہے اور انقلابی ایشیا اور غیر جانبدار ایشیا اور روسی ایشیا اور اسلامی ایشیا میں کیا فرق ہے ——— ممکن ہے بھائی ڈوائٹ گاٹ نے اس مسئلے میں بڑی دقیق ریسرچ کر کے اعداد و شمار جمع کئے ہوں اور ان کا تجزیہ صحیح ہو مگر ان کو یہ نہیں معلوم کہ یہ ایشیا جو اتنے سارے ایشیاؤں میں بٹا ہے اس کے اختلافات کے پردے میں صرف ایک حقیقت چھپی ہوئی ہے۔

وہ حقیقت محض اتنی سی ہے کہ میری اس سفید لکڑی کی خوبصورت اور نفیس کاٹج کے باہر درختوں کے اس پار کھمبوں پر کھڑے ہوئے ایک جھونپڑے کے اس پار کھمبوں پر کھڑے ہوئے ایک جھونپڑے پر بارش برس رہی ہے اور جب صبح ہوگی اور بارش تھمے گی تو ایک دبلا پتلا مرنجاں مرنج تھائی انسان اٹھ کر پھر چاول اگانے میں جٹ جائے گا۔ وہ اور اس کے سارے بھائی بند ان تمام انواع و اقسام کے ایشیاؤں میں ہزاروں برس سے اسی طرح کولہو میں جتے ہیں جو بدھ کے چکر کی طرح چلا جا رہا ہے اور اس نقطے پر پہنچ کر پروفیسر ٹوئنبی کے عالمانہ نظریے اور صحافیوں کی رپورٹیں اور سیاستدانوں کی تقریریں کیا بے حد فالتو نہیں معلوم ہوتیں؟

نوٹ: اس رپورتاژ میں دو ایک جگہوں پر نوجوان جاپانی ناولسٹ ہیروئیکی آگاوا کے تازہ ترین ناول Devil's Heritage میں سے اقتباسات لئے گئے ہیں۔ یہ ناول ہیروشیما کے متعلق ہے اور امریکہ کے جان میکی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ (قرۃ العین حیدر)

یہ کون سی جگہ ہے بابا۔ صحرائی نے اپنا سوال دہرایا۔

بڈھے کا سر یوں ہلنے لگا جیسے روئی کے گالے کا بنا ہو۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر آہ بھری اور کچھ کہے بغیر اپنی راہ ناپنے لگا۔

دیر تک صحرائی اس بڈھے کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ یوں مطمئن طور پر چل پڑا تھا جیسے اس نے صحرائی کی بات کا جواب دے دیا ہو۔

بہت سستانے کے بعد اتفاق سے اس کی نگاہ ایک درخت پر پڑی۔ وہاں ایک بورڈ لگا ہوا تھا اور لکھا تھا مداخلت بے جا کرنے والا گرفتار کر لیا جائے گا۔ مداخلت بے جا۔ وہ سوچنے لگا۔ اس ویرانے میں مداخلت بے جا کا کیا سوال ہے اور پھر اس دھندآلود وادی میں جہاں نہ کوئی عالیشان قصر ہے نہ کوئی عمارت۔

پاؤں کی چاپ سن کر صحرائی نے مڑ کر دیکھا۔ ایک گوالا دودھ کا مٹکا اٹھائے آ رہا تھا۔ کیوں میاں اس نے گوالے سے پوچھا یہ راستہ کدھر کو جاتا ہے۔

راستہ۔ گوالے نے حیرانی سے دہرایا۔ کونسا والا بابو
صحرائی نے وادی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ والا
کہیں بھی نہیں بابو وہ بولا کہیں بھی تو نہیں
پھر وہ بورڈ کیوں لگا ہے۔ صحرائی نے بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

لٹھ! گوالے نے خالی نگاہوں سے بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس شہر میں بورڈ تو جگہ جگہ لگے ہوئے ہیں۔ وہ بولا بورڈوں کا کیا ہے بابو۔ یہ کہہ کر گوالا چل پڑا۔

صحرائی روز اس شہر کے بازاروں میں گھومتا اور پھرتے پھراتے سمندر کے کنارے پر جا پہنچتا اور پتھر بن کر وہاں پڑا رہتا۔ اور پھر اس دھند بھری وادی کے کنارے بیٹھ کر غور سے اسے دیکھتا۔ روز وہ دھند جوں کی توں قائم ہوتی جیسے میخوں سے ٹھونک کر اس کھڈ پر مسلط کر رکھی ہو۔

اس روز وہ اپنا کیمرہ ساتھ لے گیا تھا۔ تاکہ مناظر کی تصویریں کھینچ سکے۔ اور دھندآلود وادی کے کنارے پر سستانے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اس روز بھی دھند جوں کی توں قائم تھی۔ اسے اس دھند سے چڑ محسوس ہو رہی تھی۔

لیٹے لیٹے اس نے کروٹ لی۔ اس کی ٹانگ کیمرے سے ٹکرائی اور وہ کھڈ میں جا گرا۔ ارے رے رے صحرائی چلایا۔ اور نیچے کی طرف لپکا۔ لیکن وہ کیمرا اس دھند میں غائب ہو چکا تھا۔ البتہ اس کے لڑھکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس آواز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ڈھلان پر لڑھک رہا تھا اور وہ ڈھلوان بتدریج تھی۔

پہلے تو کچھ دیر تک وہ اس آواز کو سنتا رہا۔ پھر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ٹیلے پر کوئی نہ تھا وہ ٹیلے سے اتر کر ڈھلان پر چلنے لگا۔ دیر تک وہ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتا ہوا نیچے اترتا گیا۔ پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے کسی چیز نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا ہو۔ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن اس کوشش کی وجہ سے وہ اور بھی الجھ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں نہ جانے کیا چبھ گیا۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں لائٹر ہے اس نے لائٹر جلایا۔ دھند میں معمولی سی روشنی ہوئی اس نے دیکھا کہ وہ خاردار تاروں میں الجھا ہوا ہے۔ لائٹر کی روشنی کی مدد سے بصد دقت اس نے اپنے کپڑے تار کی گرفت سے چھڑائے اور تار سے گزر کر دوسری طرف جا پہنچا۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ دھند ختم ہو چکی ہے اور سورج آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ تعجب سے اس نے مڑ کر دیکھا۔ ٹیلہ پہلے

ہی دھند چھائی ہوئی تھی۔ سبزہ زار اور تاریکی ختم ہو جاتی تھی۔ یوں یک لخت ختم ہو جاتی تھی۔ جیسے کوئی عمارت ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف ایک وسیع میدان پھیلا ہوا تھا جس میں بارک نما عمارتوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا۔ یہ بارکیں سیدھی نہیں بلکہ قوس کی شکل میں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے تین قوس نما بارکیں ایستادہ تھیں جیسے تین بڑی کمانیں رکھی ہوئی ہوں اور ان کمانوں کے درمیان لکڑی کے اونچے اور فراخ پلیٹ فارم بنے ہوئے تھے۔ جن پر چڑھنے کے لیے چاروں طرف لکڑی کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور پلیٹ فارم پر بہت بڑے جہازی صندوق رکھے ہوئے تھے۔ ان تین بارکوں کے پیچھے ایسی ہی اور تین بارکیں تھیں اور ان کے اور بارکوں کا یہ سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔

نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے۔ صحرائی نے سوچا شاید کوئی فوجی کیمپ ہو۔ بارکیں اور خاردار تار تو فوجی کیمپ سے ہی منسلک ہوتی ہیں۔ مگر وہ پلیٹ فارم اور ان پر رکھے ہوئے جہازی صندوق۔ ؟

وہاں کوئی پہرہ دار بھی تو نہیں تھا نہ ہی کوئی سپاہی دیتا تھا۔ وہ عمارتیں یکسر ویران دکھائی دے رہی تھیں۔

بارکوں کی طرف بڑھتے ہوئے صحرائی نے محسوس کیا جیسے وہ پھیلی ہوئی سورج کی شعاعیں عجیب سی ہوں جیسے وہ دھوپ کچھ مختلف سی ہو اس میں نیلاہٹ کی جھلک تھی اور جوں جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نیلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ جانے یہ کیسی دھوپ ہے جیسے نیل میں ڈبو کر نکالی گئی ہو۔

جب وہ بارکوں کے قریب پہنچا تو وہ نیلاہٹ اس قدر گہری ہو چکی تھی کہ اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ منظر سینما سکوپ کے پردے پر منعکس ہو جس میں ٹیکنی کلر کی بجائے رائل بلو کلر کا عمل ہو۔ اور وہ منظر کسی پراسرار قلعے کا حصہ ہو۔ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ صحرائی نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا خواب میں اس نے سوچا تو کہیں یہ چڑیوں کی بستی نہ ہو وہ رک گیا اس نے مڑ کر ٹیلے کی طرف دیکھا وہ دھند جوں کی توں قائم تھی اب تو اس نیلاہٹ کی وجہ سے دھند کا رنگ زرد دکھائی دے رہا تھا اس دھند سے تو یہ نیلاہٹ ہی بہتر ہے۔ اس نے سوچا اور جی کڑا کر کے آگے چل پڑا۔

بارک کے برآمدے میں کوئی نہ تھا۔ البتہ جگہ جگہ دروازوں اور کھڑکیوں کے پاس سٹول رکھے ہوئے تھے۔ دیوار پر جا بجا بورڈ لگے ہوئے تھے دروازوں پر چقیں پڑی تھیں اور کھڑکیوں کے شیشوں سے زرد رنگ کی روشنی جھلک رہی تھی۔

وہ برآمدے میں جا داخل ہوا اور اس خیال سے کہ شاید کمرے میں کوئی شخص موجود ہو جس سے وہ پوچھ سکے کہ وہ کون سی جگہ ہے اور وہاں سے باہر نکلنے کا راستہ کون ہے صحرائی نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔

کمرے میں کئی ایک میزیں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر بتیاں جل رہی تھیں جو بمشکل میز کے تختے کے ایک حصہ کو روشن کر رہی تھیں۔ باقی جگہ وہی نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی اس پھیلی ہوئی تاریکی میں زرد روشنی کے جھنڈ عجیب سے دکھائی دے رہے تھے جیسے سبز کھیت میں گرجی کے زرد پھول لگے ہوئے ہوں۔

میزوں پر لکڑی کے ریکوں پر الماریوں کے اندر اور ان کے اوپر فرش پر کرسیوں پر سٹولوں پر ہر جگہ کاغذوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لیکن کمرے میں کوئی نہ تھا تمام کرسیاں خالی پڑی تھیں۔

صحرائی نے دو ایک کھڑکیوں سے جھانکا۔ ہر کمرے میں ایک سا منظر دیکھ کر وہ حیران ہوا کمرے خالی پا کر وہ چق اٹھا کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچ کر کچھ دیر تک اس کی نگاہ دھندلائی رہی کچھ دیر تک وہ کھڑا رہا۔ تاکہ ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے اسے ٹھوکر کھانے یا گرنے کی کچھ پروا نہ تھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر کسی چیز کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی۔ تو شاید اس بارک کے مکین ان نیلے کونوں سے نکل کر اس پر وار کریں۔

پھر آہستہ آہستہ اسے چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ میزوں تلے ٹوکریاں پڑی تھیں جن میں کاغذوں کے پرزے بھرے ہوئے تھے۔ شلفوں پر گرد و غبار کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چھتوں اور دیواروں پر جالے تنے ہوئے تھے۔ اور اس چھائی ہوئی نیلاہٹ میں وہ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے جھاڑ فانوس لٹک رہے ہوں۔

تمام کمرہ کاغذات کی بو سے بھرا ہوا تھا۔ کاغذات کے پلندوں پر مچھروں اور کیڑوں کی قطاریں چل رہی تھیں اور رینگنے والے کیڑوں نے گھر بنا رکھے تھے۔

کمرے کے عین وسط میں شیشے کا بنا ہوا ایک جہازی مٹکا دیکھ کر وہ چونکا۔ نہ جانے اتنا بڑا مٹکا کیوں رکھا ہے یہاں اور اس میں کیا بھرا ہے۔ پانی تو نہیں ہے۔ پانی تو کبھی کالا نہیں ہوا اور پھر مٹکے کے اوپر چڑھنے کے لیے زینہ بنا ہوا تھا۔ صحرائی کا جی چاہا۔ کہ زینے پر چڑھ کر مٹکے میں جھانکے لیکن اسے خدشہ تھا کہ کوئی آ نہ جائے۔ اس لیے اسے ہمت نہ پڑی۔

دفعتاً میز کے قریب اس نے ایک فوری حرکت سی محسوس کی اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا کرسی خالی پڑی تھی۔ سٹول پر فیتے سے بندھے ہوئے کاغذات کے پلندے پڑے تھے دبے پاؤں چلتا ہوا وہ میز کے قریب پہنچا۔ میز پر کاغذوں کے انبار کے سوا کچھ نہ تھا مگر گرد و غبار کی تہیں لٹکتے ہوئے جھاڑ فانوس۔

آخر جگہ جگہ اتنے سارے کاغذ کیوں پڑے ہوئے ہیں وہ سوچنے لگا۔ اور ان پر لکھا کیا ہے۔ صحرائی نے کاغذوں کا ایک پلندہ اپنی طرف کھینچا۔ اور اوپر پڑے ہوئے کاغذ کو پڑھنے کی کوشش کی لکھا تھا۔

"اور نیز یہ بھی کہ موضوع مذکور جس کا ذکر پیرا نمبر ۱۱۳ اور ۳۲ میں درج ہے۔ جو بتدریج صفحات نمبر ۱، ۴۴، ۱۰۵، ۸ پر رقم کیا گیا ہے اور جن مقامات پر حضور کی سہولت کے لیے ا، ب اور ج کے جھنڈے گاڑ دیئے گئے ہیں جس کا تذکرہ رول نمبر ۵۵ ج ii ک کی سازی شق کے مطابق اس مثل میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔"

صحرائی نے عبارت کے اس ٹکڑے کو دوبارہ پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا اسے اس قسم کی الجھی ہوئی عبارت پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس نے ایک اور کاغذ اٹھایا کہ شاید کچھ سمجھ میں آ جائے۔ لکھا تھا۔

"قانون مراعات و اعزازات کے تحت رول نمبر III (د) الف ۵۶ کے مطابق نائب ناظم درجہ ک/۲ اپنی دستار پر طرہ چھوڑ سکتا ہے۔ بشرطیکہ دستار کا رنگ سفید نمرہ ب/۲ کا ہو اور مطابق جزوی رول ۷ شق س (iii) کے دستار کا عرض پونے سات انچ سے زیادہ نہ ہو اور وہ کلاہ کی دیوار سے سوا دو انچ سے زائد ابھرا ہوا نہ ہو البتہ اہلکار رول نمبر ۶ پ (ii) کے مطابق اپنے کالر کو کلف دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ کلف خالص میدے سے تیار کی گئی ہو اور اس میں گوند یا انڈے کی آمیزش نہ ہو اور کالر پر کلف کی تہہ ۱/۴ انچ سے زیادہ موٹی نہ ہو۔ تاکہ دیگر اہلکاروں سے تمیز کرنے میں مشکل نہ ہو۔ مزید براں کلف کی چھال نیلگوں رنگ کا نہ ہو۔"

لاحول ولاقوۃ بے اختیار اس کی ہنسی نکل گئی۔ یہ سب کیا ہے ایسی مضحکہ خیز تحریر اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

دفعتاً کرسی کے پیچھے حرکت ہوئی۔ اور کاغذوں کے ایک انبار کے پیچھے سے ایک عجیب سی شکل نمودار ہوئی۔ لمبا منہ پچکے ہوئے رخسار اور ادھر ادھر رینگتی ہوئی سلوٹیں اور ان کے درمیان مڑی ہوئی ناک کی چونچ پر ٹکی ہوئی عینک۔ اس پھیلی ہوئی نیلاہٹ میں دو زرد آنکھیں اس کی گھور رہی تھیں۔

حرکت کو محسوس کر کے صحرائی ٹھٹک گیا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر اس کا ڈر کافور ہو گیا۔ نہ جانے کیا شے ہے۔ بیچارہ۔ اس نے سوچا۔ کون ہے۔ صحرائی چلایا۔ کون ہے۔ پھر حرکت ہوئی اور وہ چہرہ اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ پھر کمرے میں شپاشپ کی آواز گونجنے لگی جیسے کوئی بچہ اپنے جھلی دار پاؤں مار رہا ہو، اور پھر خاموشی چھا گئی۔

صحرائی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک سائرن بجنے لگا۔ جس کی آواز بھیانک طور پر مدھم تھی۔ کتنی اداس اور ڈراونی آواز ہے۔ وہ کھڑکی کی طرف لپکا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ سائرن کے بند ہوتے ہی ایک شور بلند ہوا جیسے ایک ہجوم آ رہا ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ نہ جانے وہ کس کا شور تھا۔ کون آ رہے تھے۔ اس نے کمرے کا پھر سے جائزہ لیا۔ وہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا اور باہر نکلنا اور بھی پرخطر تھا۔ پھر اس کی نگاہ ایک بغلی کمرے پر پڑی۔ بھاگ کر اس نے دروازہ کھولا۔ اندر نہ تو کوئی میز تھی۔ اور نہ کرسی۔ چاروں طرف الماریوں اور ریکوں میں کاغذات کے ڈھیر پڑے تھے۔ وہ اس کمرے میں داخل ہو گیا اور الماری کے پیچھے چھپ کر کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے بہت سے لوگ آ رہے تھے جیسے غول بیابان ہو۔ جو چھوٹے بڑے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اور ایک دوسرے سے چلا چلا کر باتیں کرنے میں مصروف تھے، زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔ ہاتھ اشاروں میں مصروف تھے۔ آنکھیں زندگی کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ سرگوشیاں کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، منہ بنا رہے تھے، چیخ مار رہے تھے لیکن ان کی آوازیں مدھم تھیں ان کے قہقہے ان قہقہوں سے مختلف تھے جنہیں وہ سننے کا عادی تھا، ان کی باتوں کا انداز ہی الگ تھا اور ان کی آوازیں یوں مدھم اور بھیانک سنائی دے رہی تھیں جیسے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے ڈھول بج رہے ہوں۔

اور ان کی حرکات عجیب سی تھیں جیسے سلو موومنٹ کا فلم چل رہا ہو۔

سائرن کے بجنے اور ہجوم کے آنے سے صحرائی یہ سمجھ رہا تھا جیسے وہ سب خبردار ہو کر اس پر حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہوں، شاید اس عجیب الخلقت شے نے جسے اس نے میز کے نیچے دیکھا تھا۔ جا کر انہیں خبردار کر دیا ہو۔ کہ بارک میں ایک اجنبی داخل ہو گیا ہے لیکن اس ہجوم کو دیکھ کر اسے تسلی ہو گئی۔ وہ تو گویا اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر فرد اپنے آپ میں منہمک تھا۔ ہر گروہ دوسرے کے وجود سے بے خبر تھا۔ یہاں تک کہ چلتے ہوئے ان کی توجہ اس سڑک کی طرف بھی نہیں تھی جس پر وہ چل رہے تھے۔ وہ یوں چل رہے تھے جیسے احساس ہی نہ ہو کہ وہ چل رہے ہیں جیسے انہیں چلنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو جیسے انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ انہیں کہیں پہنچنا ہے۔ جیسے ان کی اپنی ذات ہی منزل ہو جس میں وہ شدت سے کھوئے ہوئے تھے۔

انہوں نے سفید قمیص اور کالی پتلونیں زیب تن کر رکھی تھیں۔ ان کے چہرے بے حد لمبوترے تھے، سر کے بال قلیل تھے۔ کھوپڑی سے ملی ہوئی پیشانی تلے پچکے ہوئے گال تھے۔ جن کے درمیان اونچی لمبی ناک اور ناک تلے مخروطی ٹھوڑی جو یہاں سے وہاں تک مسلسل چلی گئی تھی۔ دور سے انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چہرے تکونی ٹھوڑیاں ہیں کہ لٹکے ہوئے ہوں ان کی ناکوں پر بڑے بڑے شیشوں والی عینکیں تھیں جو انہوں نے ناک کی نیچی چونچ پر ٹکا رکھی تھیں۔ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے یا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ عینکوں کے شیشوں کے اوپر سے دیکھتے تھے۔ پھر نہ جانے عینکیں کیوں پہنے ہوئے تھے وہ ان کے لمبوترے جھریدار چہروں میں صرف زرد آنکھیں تھیں جنہیں دیکھ کر زندگی اور حرکت کا احساس ہوتا تھا۔

ان کی پتلونوں پر چوڑی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور دائیں ہاتھ ٹانگ کے ساتھ ساتھ تین فٹ لمبے سیاہ ڈنڈے سے یوں لٹک

رہے تھے جیسے سپاہیوں کے پہلو میں تلواریں لٹکتی ہیں۔ ایک دوسرے سے بحث کرتے ہوئے جب وہ جوش میں آجاتے تو بے خبری میں ان کے ہاتھ ان سیاہ ڈنڈوں کے قبضوں پر جا پڑتے اور ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی سورما تلوار نکالنے کی دھمکی دے رہا ہو۔

وہ قریب آتے گئے۔ پھر بارکوں کے پاس پہنچ کر وہ ادھر اُدھر بکھرنے لگے کچھ لوگ اس بارک میں داخل ہونے کے لیے بڑھ رہے تھے جس میں صحرائی چھپا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر صحرائی کھڑکی سے سرک کر الماری کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

دیر تک وہ چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس کے دل میں انہیں دیکھنے کا شوق چرّایا اور چپکے سے دبے پاؤں اس دروازے کی طرف بڑھا جس سے وہ اس کمرے میں داخل ہوا تھا اور چھُپ کر چق سے دیکھنے لگا۔ قریب کی میز کے گرد چھ افراد کھڑے ہنوز بحث میں مصروف تھے وہ اسی طرح مدھم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہاتھ چلا رہے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی زرد آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ ایک انگلی سے ہوا میں دائرے سے بنا رہا تھا۔ دوسرا ٹھوڑی میز پر رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ تیسرا اپنی عینک میں .... اپنے ساتھی کو گھور رہا تھا جیسے کوئی سائنسدان دُوربین لگائے بیٹھا ہو۔ چوتھا چھت کی طرف گھورتے ہوئے گہری سوچ میں پڑا تھا۔

دیکھو۔ دائرہ بنانے والا بولا۔ ایک تجویز اپنے ذہن میں آئی ہے۔ میز پر ٹھوڑی ٹیکنے والے نے سر ہلائے بغیر اوپر دیکھا۔ اور کہا دُوربین والے نے کیا مطلب تو یہ ہے اماں کہ ان کا وار بے کار ہو جائے۔ اور اور اور —— وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے انداز سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ کیا بات ہو رہی ہے اور وہ اپنے ہی خیال کے چکر میں پڑا ہو۔

چھت کی طرف گھورنے والے نے آہ بھری۔ اب تو ان کا وار چل گیا۔ وہ بولا۔ سنا ہے انہوں نے ایک نوٹ لکھا ہے۔

ہوا میں دائرے بنانے والے نے معاً اپنا دایاں ہاتھ سیاہ ڈنڈے کے قبضے پر رکھا۔ نوٹ۔ وہ نفرت سے چلّایا۔ وہ کیا لکھیں گے۔

ہوں! اپنے ہاتھ میں جو قلم ہے اس نے سیاہ ڈنڈا لہراتے ہوئے کہا، اس کے کاٹے نے کبھی پانی نہیں مانگا۔ قلم! صحرائی نے سوچا ارے یہ تو سیاہ ڈنڈا قلم ہے۔ اس نے غور سے اس سیاہ ڈنڈے کی طرف دیکھا جو ان سب کی پیٹیوں سے شمشیر کی طرح لٹک رہا تھا وہ حیران ہوا کہ آخر قلم کو شمشیر کی طرح لٹکانے سے کیا مطلب تھا۔

عین اس وقت ایک نووارد داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اس نے لہراتے ہوئے چلّا کر کہا۔ دشمن کا وار چل گیا۔ اپنی تمام سکیمیں خاک میں مل گئیں۔

کیا ہوا

ارے کیا بات ہے

میں نے پہلے ہی کہا تھا۔

آخر بول گئے بھی —— وہ سب چلّانے لگے۔

دشمنوں نے اپنے پیشوا کو صاف بچا لیا۔ نووارد بولا۔ اس کی ترقی منظور ہو چکی ہے اپنی سب کوششیں اکارت گئیں۔

کس کی کوششیں اکارت گئیں۔ ایک خوش پوش شخص نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

تم آگئے جاہ۔ ارے جاہ۔ وہ سب خوش پوش کو دیکھ کر شور مچانے لگے۔ جاہ نے تحکمانہ انداز سے نووارد کی طرف دیکھا۔ یہ جمال کیا کہہ رہا ہے۔ انگلی سے دائرے بنانے والے نے کہا کہ دشمنوں کے پیشوا کو ترقی مل گئی ہے اور ہماری سب کوششیں اکارت گئیں۔

ہاں ہاں جمال نے وہ کاغذ لہراتے ہوئے کہا۔ میں نے حکم نامے کی نقل اڑا لی ہے۔

کیا ہے۔ جاہ نے ایک وقار سے کہا۔ پڑھ کر سناؤ۔

سنو۔ جمال بولا۔ اور پھر دبی آواز میں اس کاغذ کو پڑھنے لگا۔

سنو سنو۔ وہ سب ایک دوسرے کو خاموش کرنے کے لیے شور مچانے لگے۔

ٹھہرو جاہ نے کہا۔ اور پھر انگلی سے دائرے بنانے والے کو مخاطب کر کے بولا

یوسف تم ادھر دروازے کے پاس کھڑے رہو۔ کوئی آئے تو اشارہ کر دینا اور تم حفیظ۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی ٹھوڑی سے کہا۔

تم ادھر نگاہ رکھو۔ ہاں جمال پڑھو اسے۔

جمال اس کاغذ کو پڑھنے لگا۔

مسمیٰ جالدار جو کہ پ برانچ کی قطار نمبر ۳ کے جزو نمبر ۲ کا کارمختار ہے اور د۔ ۳ قسم کا اہلکار ہے اپنے مختار اعلیٰ سے اچھے عمال نامے حاصل نہیں کر سکا۔ اور اس کے غبن کی ایک شکایت ہے جو کہ ابستس نامہ نمبر ن۔ ۱۱۔ ج۔ ۲۰۷ (iii) مورخہ ۱۸ جون ۱۹۵۲ء کے تحت حضور کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے اور جس پر حضور نے ابھی احکامات صادر نہیں فرمائے۔ مزید برآں عہدیدار مذکور پر یہ بھی الزام ہے کہ اس کا رویہ تسلی بخش نہیں۔ اور اس کے کردار میں خفیہ پن کا عنصر مناسب اور ضروری مقدار سے خفیف تر ہے لیکن بنیادی قانون کی شق نمبر ۵۵ د کے جزو نمبر ۲۰۷ کی حاشیائی وضاحت نمبر ۱۴۰۳ پ کے مطابق عہدیدار مذکور کی ترقی کو روکنے کے ہم مجاز نہیں۔ لہٰذا ترقی منظور فرمائی جائے۔

جمال رک گیا اور لمبے وقفے کے بعد بولا۔

اور نائب ناظم اعلیٰ نمبر ۲ نے اس پر لکھا ہے۔ قاعدے اور قانون کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ تجویز کے مطابق عمل کیا جائے۔

نائب کو تو صرف یہی ایک فقرہ حفظ ہے۔ دوربین والے نے کہا۔

ہر کاغذ پر یہی لکھتے ہیں۔ میز پر ٹکی ہوئی ٹھوڑی نے آہ بھری

لیکن اب ہو گیا۔

دشمن کی فتح ہو گی۔

ان کا وار چل گیا۔

بڑی زک پہنچی ہے ہمیں وہ سب شور مچانے لگے۔

دیکھو۔ جاہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کیا۔ کون نہیں جانتا کہ نائب کی یادداشت دھندلا چکی ہے۔ جب وہ نوٹ پڑھتے ہوئے تیسری سطر پر پہنچتے ہیں تو پہلی دو سطریں بھول چکے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ آخری سطر پڑھتے ہیں تو سارے نوٹ کا مضمون ان کے ذہن میں دھندلا چکا ہوتا ہے نوٹ ختم کرنے پر ان کے ذہن میں صرف آخری سطر رہ جاتی ہے۔ اگر وہ مثبت ہو تو سمجھو کہ احکامات مثبت ہوں گے۔ اگر وہ نفی کا مضمون لیے ہوئے ہو تو احکامات منفی ہوں گے۔

ٹھیک ہے ٹھیک۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں۔

لیکن اب کرنا کیا ہے۔

خدا کی قسم ہم بالکل نہ مانیں گے۔

کون ہار مانتا ہے جی۔

لیکن اس وقت تو پٹ گئے نا۔ وہ سب بول رہے تھے۔

ہم نہیں پٹے جاہ نے اطمینان سے کہا ہم نے پہلے سے ہی اپنا تحفظ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔ اور پھر ایک کاغذ نکالتے ہوئے بولا۔ ہم نے بھی احکامات حاصل کر لیے تھے۔

کیسے احکامات

سنو سنو۔ جاہ نے اشارہ کیا۔ اور وہ کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگا۔

اگرچہ مسمی جہاں دار جو کہ پ برانچ کی قطار نمبر ۲ کے جز نمبر ۱ کا کارمختار ہے اور د۔ ۲ قسم کا اہلکار ہے۔ بنیادی قانون کی شق نمبر ۵۵۵ کے جز نمبر ۷۔ ۲ کی جانبائی وضاحت نمبر ۱۴۰۲/پ کے مطابق ترقی کا حقدار ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ کہ اہلکار مذکور کا اعمال نامہ داغدار ہے اور مختار اعظم جس کے تحت وہ کام کر رہا ہے اس کے کام اور رویّے سے ناخوش ہے۔ اور عہدیدار مذکور کے خلاف غبن کا ایک کیس چل رہا ہے۔ جو حضور کی خدمت اعلیٰ میں مراسلہ نمبر ن۔ ۱۱۔ ج۔ ۰۰۲ (۱۱) مورخہ ۱۸ جون سنہ ۱۹۵۲ کو پیش کیا گیا ہے اور حضور اعلیٰ عہدیدار مذکور کو مناسب سزا تجویز کرنے پر سوچ بچار فرما رہے ہیں۔ مزید برآں کار مختار خفیہ نمبر س ۵۷ کی تازہ رپورٹ کے مطابق اہلکار مذکور کا رتبہ غیر خفیہ ہے اور وہ ذمہ دارانہ عہدے پر فائز ہونے کے قابل نہیں۔ لہٰذا ضمنی قانون نمبر ۶۔ ب۔ ب شق نمبر ۲۳ کے ذیلی نوٹ نمبر ۸۶ (۱۱۱) کی تشریح نمبر ۲۶ پیرا سوئم لائن ۱۸ کے مطابق یہ امر نائب ناظم اعلیٰ نمبر ۴ کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے کہ آیا اہلکار مذکور کو کڑی سزا دی جائے یا صرف اس کی ترقی روکنے پر اکتفا کیا جائے۔ جاہ رک گیا۔

اور اور وہ بولا نائب ناظم نے اس نوٹ پر یہ حکم دیا ہے کہ

قانون اور اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ فی الحال ترقی روکنے سے زائد سزا نہ دی جائے۔

ہیر پھیر

وہ مارا

کمال کر دیا

انہوں نے شور مچا دیا۔

اور معلوم ہے، جاہ نے کہا۔ یہ مراسلہ ہم نے حریفوں کے مراسلے سے دو روز پہلے پیش کر کے احکامات لے لیے تھے۔

لیکن ایک ہی کیس پر دو احکامات

ارے میاں اکل سے دائرے بنانے والے نے کہا۔ علیم داد کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں اور نائب ناظم خود اس کے جنازے پر موجود تھے اسکے باوجود علیم داد کا سفر خرچ کا بل بنا کر لے جاؤ۔ نائب ناظم اسے پاس نہ کرے تو میرا ذمہ۔ ہی ہی ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگا۔

دفعتاً ممدو نے باہر برآمدے کی طرف اشارہ کیا اور وہ سب خاموش ہو گئے۔ دروازے میں چار ایک افراد کھڑے اندر جھانک رہے تھے اندر کھڑے گروہ نے غضب آلود نگاہوں سے نوواردوں کی طرف دیکھا۔ نوواردوں کے چہروں پر فتح و نصرت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ کچھ

دیر تک وہ نفرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے زواردو اندر داخل ہو گئے۔

اس پر انگلی سے ہوا میں دائرے بنانے والے نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ اے صاحب۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ایک ساتھی نے اندر داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں اندر رکھا ہے۔ اور یہ فعل اہلکاروں کے طور طریقے کے اصول نمبر ۲۶ جزو تین کی بارھویں شق کے منافی ہے۔

زواردوں میں سے ایک چھاتی تان کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دوست کو معلوم ہونا چاہیے۔ وہ بولا کہ ضمنی رولز کے قانون نمبر ۲۵۶ کی تصحیح نمبر ۴۶ کے دوسرے پیرے میں وضاحت سے درج ہے کہ اگر اہل کار نے سفید کینوس کے بوٹ پہنے ہوئے ہوں اور وہ باقاعدہ طور پر فیتے سے بندھے ہوں تو وہ اہلکاروں کے طور طریقے کے اصول نمبر ۴۶ سے مبرا ہو گا۔

غلط۔ انگلی سے دائرے بنانے والا چلایا۔ ضمنی رولز کا قانون نمبر ۲۵۶ تو اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اہل کار قسم ج ۔ ۲ کس قسم کا بوٹ پہننے کا مجاز ہے۔ اسے کمرے میں داخل ہونے کے آداب سے کوئی تعلق نہیں۔

زواردوں نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

یہ ہے آپ کا منبع علم۔ ہوا میں دائرے بنانے والے نے نفرت سے کہا۔

زواردوں نے اپنے اپنے قلم کے قبضے پر ہاتھ رکھ لیے۔

یہ دیکھ کر کمرے والوں نے بھی قلم کے قبضے پکڑ لیے۔ اور دونوں گروہ غیظ و غضب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر جاہ نے اس خاموشی کو توڑا۔ وہ نہایت اطمینان سے کہنے لگا۔ کیا میرے دوست ضمنی رولز کے قانون نمبر ۲۵۶ کے نفس مضمون پر شرط لگانے کو تیار ہیں۔

بالکل۔ زواردوں میں سے ایک نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔

تو از راہ کرم ایک کاغذ پر لکھ دیجیے۔ کہ آپ کے خیال کے مطابق ضمنی رولز کے قانون نمبر ۲۵۶ کا نفس مضمون کیا ہے۔ آپ بھی لکھیے مسٹر احمد۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ جو ہوا میں دائرے بناتا تھا۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ وہ دونوں کاغذ پر لکھنے میں مصروف ہو گئے لیکن زواردوں کے سردار نے کہا۔ جج کون ہو گا۔ اور شرط کیا ہو گی۔

جاہ مسکرانے لگا۔ تنازعہ کی صورت میں وہ بولا۔ ہم کسی مشیر قانون کو جج ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اور شرط یہ ہو گی۔ کہ برانچ کے تمام افراد کو کینٹین نمبر ۲۶ سپیشل کاؤ میں چائے پلانی ہو گی۔ اور چائے کے ساتھ ریفرشمنٹ قسم د ۔ ۲ کے تمام لوازمات ہوں گے۔

منظور ہے منظور ہے۔ سب چلانے لگے۔

جب احمد لکھنے سے فارغ ہوا۔ تو اپنا لکھا ہوا کاغذ حریفوں کو پیش کیا اور ان کا کاغذ خود لے لیا۔ اور پھر وہ سب دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل کر لکڑی کے اس پلیٹ فارم کی طرف بھاگے۔

ان کو دیکھنے کے لیے صحرائی اس کھڑکی میں جا کھڑا ہوا جو لکڑی کے پلیٹ فارم کی طرف کھلتی تھی۔

وہ پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اوپر پہنچ کر وہ دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے دو افراد جہازی صندوق پر چڑھ گئے انہوں نے وہ صندوق کھولا۔ اور پھر صحرائی کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اس صندوق کے ورق کھول رہے تھے۔ اس وقت اس کی سمجھ میں آیا۔ کہ وہ جہازی صندوق نہیں تھا۔ بلکہ قانون کی کتاب تھی۔ جس کی ورق گردانی میں وہ مصروف تھے۔ تاکہ متنازعہ فیہ رول کے مضمون کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔

ویرنگ صحرائی حیرانی سے اس کتاب کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے زندگی بھر میں اتنی بڑی کتاب کبھی نہ دیکھی تھی۔ کتاب کے اوپر شیشے والی چھ ٹیوبیں لگی ہوئی تھیں اور اس کے پہلوؤں میں لکڑی کے زینے بنے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ محدب شیشوں کی مدد سے اسے پڑھنے میں مصروف تھے انہیں دیکھ کر صحرائی کو خطرے کا احساس نہ رہا تھا۔ اسے ان پر ترس آنے لگا تھا۔ اور وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ نیلے کنوئیں کے مینڈک ہوں اور کسی خود ساختہ جزیرے میں ڈبکیاں لگا رہے ہوں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اسے باہر نکل کر چل پڑنا چاہیے۔ ان لوگوں سے راستہ پوچھنا بھی بے معنی تھا وہ تو خود کھوئے ہوئے تھے وہ راستہ کیا بتائیں گے۔

وہ بے دھڑک باہر نکل آیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا نہ جانے کس طرف روانہ ہو گیا ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ دور کھڑے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ پھر بارکوں سے نکل نکل کر لوگوں نے اس کی طرف گھورنا شروع کر دیا۔ اور انگلیاں اٹھا اٹھا کر اس کی طرف اشارے کرنے لگے۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا، کہ سائرن بجنے کی آواز سنائی دی۔ یہ سائرن پچھلے سائرن سے بالکل مختلف قسم کا تھا صحرائی نے اس کی پروا نہ کی۔ لیکن جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے ٹپا ٹپ کی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ رک گیا۔ آوازیں بھی رک گئیں اس نے مڑ کر دیکھا اس کے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ صحرائی نے یہ دیکھ کر بھاگ نکلنے کا ارادہ کیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اسے عمل میں لاتا۔ چاروں طرف سے نیلے پانی کے دھارے اس پر پڑنے لگے اس کے کپڑے بھیگ گئے۔ بال تر ہو گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر وہ اسے دھکیل رہے تھے۔

پھر جب اسے پورے طور پر ہوش آیا تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی چند ایک لوگ آپس میں مشورہ کرنے میں مصروف تھے۔ باہر برآمدے میں بہت سے لوگ کھڑکیوں اور دروازوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ چند ایک کے سوا باقی سب لوگ وہاں سے چلے گئے اور مقام بارک پر خاموشی چھا گئی۔

اٹھو۔ ایک شخص اس کے پاس آ کر کہنے لگا۔ چلو اس نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ صحرائی اٹھ بیٹھا اور وہ چھ آدمی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے دو ایک بارکوں سے ہوتے ہوئے۔ وہ ایک کمرے کے قریب پہنچے، وہاں برآمدے میں ایک بوڑھا سٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ انہوں نے ایک چٹ پر کچھ لکھا اور پھر بوڑھے کو جگا کر وہ چٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ بوڑھا چٹ لیکر اندر کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلا اس نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ صحرائی کو پکڑ کر اندر داخل ہو گئے۔

کمرے میں ایک وسیع میز پڑی تھی۔ جو کاغذات سے لدی ہوئی تھی۔ کاغذات کے بائیں اور دائیں اطراف لگے ہوئے ڈھیروں کے عین درمیان ایک جھریوں سے بھرا ہوا نحیف چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس انہماک سے کاغذات کی طرف دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ کہ اسے احساس ہی نہ ہوا تھا۔ کہ سات آٹھ لوگ کمرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ دیر تک کسی میں جرات نہ ہوئی کہ اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرے۔

پھر اتفاق سے اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور انہیں دیکھ کر چونکا۔ پھر وہ خود بخود گنگنایا۔ اوہ اوہ ٹھیک ہے۔ اور ان کی طرف متوقع نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

حضور یہ ایک مداخلت بے جا کا کیس ہے۔

ہوں۔ اس نے سر ہلایا۔ اور پھر اپنی گہری زرد آنکھوں سے صحرائی کی طرف دیکھنے لگا۔

کون ہو تم لوگ۔ اس نے صحرائی سے پوچھا۔

صحرائی کو خاموش دیکھ کر اس کے ساتھی اسے گھورنے لگے۔ بولو۔ حضور کو جواب دو۔

کون ہو تم۔ حضور نے صحرائی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

صحرائی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا جواب دے۔ کچھ دیر وہ کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوچ کر کہا۔ میں انسان ہوں۔

انسان۔ افسر نے حیرانی سے دہرایا۔ اور صحرائی کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انسان۔ ان سب نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

حضور نے میز سے ایک کتاب اٹھا کر صحرائی کے ساتھیوں میں سے ایک کی طرف بڑھا کر اشارہ کیا۔ کتاب پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ لغت اصطلاحات الف بے انسان۔ گنگناتے ہوئے وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کتاب کو مؤدبانہ حضور کے سامنے رکھ دیا۔

پھر وہ بولا حضور عالی۔ بنیادی قانون نمبر ۷ کے مطابق کوئی فرد یا کارندہ ہو سکتا ہے یا کارکن یا قلم کار یا عہدیدار یا اہل کار اور یا وہ پبلک ہو سکتا ہے۔ بنیادی قانون میں انسان کا لفظ موجود نہیں۔ مداخلت کرنے والے سے کہا جائے کہ وہ اس لفظ کی تشریح کرے۔ پھر شاید ——

حضور نے صحرائی کی طرف دیکھا۔ سوچ کر بتاؤ وہ بولے۔ سوچ کر بتاؤ۔ میں قلم کار ہوں۔ صحرائی نے کہا۔

قلم کار۔ ان سب نے مشکوک نگاہوں سے صحرائی کی طرف دیکھا۔ قلم کار ہو۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ تو کون سی اقلیت کے فرد ہو۔ کون سے فریق سے متعلق ہو۔ کون جزو ہے اور کون سی قطار۔

صحرائی نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ مجھے معلوم نہیں

تو پھر قلم کار کیسے ہو سکتے ہو۔ وہ سب گنگنانے لگے۔

اس لیے کہ میں لکھتا ہوں۔ صحرائی بولا۔

لکھتا ہے —— انہوں نے نفرت بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔ اقلیت کا فرد ہونے کے بغیر لکھتا ہے وہ مسکرانے لگے۔

حضور ایک بولا۔ یہ شخص ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

حضور نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کر دیا۔ کیا لکھتے ہو تم؟ وہ صحرائی سے مخاطب ہو کر بولے میں شعر لکھتا ہوں۔ صحرائی نے جواب دیا۔

شعر؟ انہوں نے کھوئی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے کھڑے رہے۔ پھر ان میں سے ایک مؤدبانہ آگے بڑھا۔ حضور ضمنی قانون میں شعر کا ذکر آیا ہے۔ لیکن وہ لکھے نہیں جاتے۔ بلکہ بنائے جاتے ہیں۔

حضور نے بڑی دلچسپی سے کہا ہوں۔

وہ شخص بولا۔ جناب والا ضمنی قانون نمبر ک۔ س۔ ۱۱۔ ب۔ ۶،۷۲ کی حاشیائی وضاحت نمبر ۴۴ میں درج ہے کہ رئیس خانے میں بچھانے کے لیے ایسے قالین تیار کیے جائیں جن پر شعر بنے ہوں۔

صحرائی چڑھ گیا۔ بولا۔ میں قالینوں پر شعر نہیں بناتا۔ بلکہ شعر لکھتا ہوں۔ میں شاعر ہوں۔ شاعر جیسے غالب۔

شاعر غالب۔ وہ بولے۔ ایک بات کرو۔ کیا تم شاعر ہو۔ یا غالب ہو۔

پھر دوسیر و حضور نے اشارہ کر کے انہیں خاموش کر دیا۔ یہ کیس بہت اُلجھا ہوا ہے۔ پہلے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ شخص کون ہے۔ لہٰذا اس مداخلت بے جا کو پہلے ماہر قانون زمرہ ۲ اور ماہر اصطلاحات غیر قانونی الفاظ اور ماہر آثار قدیمہ جزو ۶ کے روبرو پیش کیا جائے۔ اور ان کی رپورٹ ہمیں بھیجی جائے۔ یہ کہہ کر وہ از سر نو کاغذات کو گھورنے میں منہمک ہو گئے۔

نائب ناظم کے کمرے سے نکل کر وہ گئی ایک باروں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے رکے جس پر ماہر قانون زمرہ ۲ کی تختی آویزاں تھی۔

ان میں سے ایک شخص نے کمرے میں جھانکا اور پھر ان سب کو اشارہ کیا اور وہ سب کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں چاروں طرف الماریاں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں موٹی موٹی جلدیں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک میز لگی ہوئی تھی جس پر کاغذات پڑے تھے۔ ماہر قانون اس کمرے میں یوں ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے ہوئے ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے جیسے وہ کمرہ ایک صحرا ہو۔ وہ اپنے خیال میں اس حد تک گم تھے کہ دیر تک انہوں نے لوگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔

دیر تک وہ سب قطار بنا کر دیوار سے لگے رہے۔

سوچتے سوچتے اچانک ماہر قانون نے اپنی دائیں اُنگلی منہ میں ڈال لی۔ وفعتاً انہوں نے ایک دبا سا نعرہ بلند کیا۔ جیسے ہیرا جیسے انہوں نے کچھ پا لیا۔ لیکن ان کی اُنگلی دانتوں میں کٹ گئی۔ وہ درد کی شدت سے بلبلانے لگے اور مضطربانہ طور پر انگلی ہلانے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ ماہر قانون کی طرف بڑھے۔ ایک نے انہیں تھام کر آرام کرسی پر بٹھا دیا دوسرے نے اپنا رومال نکال کر انگلی پر لپیٹ

جب درد کی شدت کچھ کم ہوئی۔ تو وہ بولے۔ ہوں۔ کیا کیس ہے۔

مداخلت بے جا کا کیس ہے۔ حضور

ماہر قانون نے غور سے صحرائی کی طرف دیکھا۔ ہوں۔

کس شخص نے یہ کیس پکڑا ہے۔

خاکسار نے حضور۔ ایک شخص جھک کر آداب بجا لاتے ہوئے بولا۔

ہوں۔ کون ہو تم۔ انہوں نے پوچھا۔

ناظمیت، مراعات و اعزازات اہلکاران خصوصی جزو نمبر ۲۳، قطار دار نمبر ۱۶ ہوں وہ بولے۔ تمہاری کارکردگی کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔

حضور دوسرا بولا۔ یہ کیس نائب ناظم اعلیٰ ہم نے حضور کی خدمت میں بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ حضور اور ماہر آثار قدیمہ جزو ۶ اور ماہر الفاظ و اصطلاحات غیر قانونی کے روبرو پیش کیا جائے اور رپورٹ نائب اعلیٰ کو بھیج دی جائے۔

تو پہلے ماہر آثار قدیمہ کے روبرو پیش کرو۔ وہ بولے

حضور وہ دو روز کی چھٹی پر ہیں ایک نے جواب دیا۔

انہیں چھٹی سے واپس آ لینے دو جب تک مداخلت بے جا کو بندی خانے میں رکھو۔ انہوں نے تحکمانہ انداز سے کہا۔

جب وہ جانے لگے تو ہر قانون چوتھے نمبر دو۔
لٹک گئے۔

انھوں نے ان میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ تم ضمنی قانون کی جلد ۲۲ کے ساتویں جزو کی ۸ ویں ترمیم کا مطالعہ کر کے دیکھو۔ انھوں نے اپنی مضروب انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ حادثہ ہو جانے کی صورت میں خصوصاً جب حادثہ ڈیوٹی کے دوران میں واقع ہوا ہو اور کوئی عضو زخمی ہو جائے تو اس خصوصی قسم کا کون بدلے کے طور پر کتنا روپیہ سرکاری خزانہ سے مل سکتا ہے تم ہمارا یہ کیس مکمل کر کے ابھی لا دو اور تم باقی لوگ اسے بندی خانے میں پہنچا دو۔ جاؤ۔

بندی خانہ ایک وسیع کمرہ تھا جس کی دیواروں میں بڑے بڑے سوراخ تھے۔ تاکہ ہوا اور روشنی اندر پہنچتی رہے اور چوکیدار اندر جھانک کر دیکھ سکے۔ کمرے میں ایک طرف تخت بچھا تھا جس پر کمبل پڑے تھے دوسری جانب چار لوہے کی کرسیاں اور ایک میز تھی اور بغل میں ایک چھوٹا سا غسل خانہ تھا۔

صحرائی تخت پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگا نہ جانے وہ لوگ اسے کہاں کہاں لیے پھریں گے۔ اور اس کا وہ دوست جس کے ہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ کیا کہے گا کہ صحرائی اطلاع دیے بغیر ہی بھاگ گیا۔

باہر کچھ لوگ خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ زندہ باد۔ زندہ باد۔ یہ مداخلت بے جا کا کیس ہمارا ہے۔ شاباش۔ مراسلوں میں تذکرہ ہوگا۔ اعزاز ملے گا۔

پھر آہستہ آہستہ وہ نعرے مدھم پڑتے گئے اور خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے محسوس کیا جیسے دیوار کے قریب کچھ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھا اور دیوار کے قریب جا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ ہنہ اعزاز ہوگا۔ مراسلات میں تذکرہ ہوگا۔ ہنہ

بڑی کارکردگی دکھائی ہے۔ انھوں نے

ایسی چال چلو کہ ان کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔

ضمنی قانون کے رول نمبر ۵، جزو ۲۳۔ شق نمبر ۶ کے مطابق یہ اسے بندی خانے میں بند نہیں کر سکتے۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن اپیل کرنی پڑے گی۔

اور پھر اپیل میں دیر لگے گی۔

ایسے میں بتاؤں۔ مداخلت بے جا کو بھگا کیوں نہ دیا جائے۔

وہ کیسے۔

یہاں غسل خانے کے عین نیچے گندا نالہ بہتا ہے۔ اگر وہ غسل خانے کے فرش کی دو اینٹیں نکال لے تو سیدھا نیچے اتر سکتا ہے اور پھر دائیں طرف چل پڑے تو پندرہ منٹ میں باہر پہنچ جائے گا۔

پر اسے بتائے کون۔

کوشش تو کرو۔

وہ آہستہ آہستہ دیوار پر ٹک ٹک کرنے لگے۔ مسٹر مداخلت بے جا

سنو، بندی خانے والے۔ وہ آہستہ آہستہ چلانے لگے۔

صحرائی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ کیا ہے۔

بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ وہ چلانے لگے۔

پھر وہ اسے ہدایت دیتے رہے اور آخر کار انہوں نے سوراخ میں سے ایک ہتھوڑا اور ایک ٹارچ صحرائی کو پکڑا دی۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ وہ خوشی سے چلا رہے تھے۔

غسل خانے کے فرش کی پہلی اینٹ نکالنے میں صحرائی کو دقت ہوئی۔ پھر دوسری اور تیسری اینٹ آسانی سے نکل آئی۔ اس نے ٹارچ جلائی۔ نیچے واقعی نالا تھا اس میں بہت کم پانی تھا۔ وہ نالے میں اتر گیا۔ اور ہدایت کے مطابق دائیں طرف کو چل پڑا۔

وہ جانے کتنی دیر اس نالے میں چلتا رہا۔ پھر مدھم سی روشنی دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا۔ کہ وہ صحیح راستے پر جا رہا ہے۔

نالے سے باہر نکل کر اس نے اپنے آپ کو اسی دھند میں پایا۔ لیکن ٹارچ کی وجہ سے اس کے لیے ٹیلے پر چڑھنا مشکل نہ تھا۔

جب وہ دھند سے باہر نکلا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہی بورڈ اس کے سامنے آویزاں تھا۔ مداخلت بے جا کرنے والا گرفتار کیا جائے گا۔ بورڈ کے پاس پہنچ کر وہ دھڑام سے گر پڑا۔

دیر تک وہ وہیں پڑا رہا۔ ایک ایک بیتی ہوئی تفصیل اس کی نگاہوں تلے گھوم رہی تھی جیسے وہ اسے ازسرنو بیت رہا تھا۔ وہ پھیلی ہوئی نیلاہٹ۔ وہ کالی بارکیں۔ وہ جہازی کتابیں۔ وہ عجیب مخلوق۔ ان کے وہ رول اور قانون اور ان کے گروہ۔ ان کی دشمنیاں۔ وہ کاغذوں کے انبار اور عجیب و غریب تحریریں۔

ابھی تک وہ اسے وہ آوازیں آ رہی تھیں۔ رول نمبر ۶۲۴ کے جزو نمبر ۲۷ کی شق نمبر ۹۳ کی تیسری ذیلی وضاحت کی تصحیح نمبر ——

صحرائی نے ایک جھرجھری محسوس کی۔ اور پھر کروٹ لی۔ اس کی ٹانگ کسی چیز سے ٹکرائی اسے وہ غور سے دیکھنے لگا۔ وہ تو اس کا کیمرہ تھا۔ اس کا کیمرہ تو گر پڑا تھا۔ ہاں ہاں گر پڑا تھا۔ اور اسی کیمرے کو اٹھانے کے لیے تو وہ نیچے کھڈ میں گر پڑا تھا لیکن لیکن کیمرہ تو اسے نہیں ملا تھا۔ کیمرہ تو اس نے اٹھایا نہ تھا۔

شاید وہ محض ایک خواب ہو۔ اس نے سوچا۔

شاید وہ پڑا پڑا سو گیا ہو۔ اور اس نے خواب میں سب کچھ دیکھا ہو۔ وہ ہنسنے لگا۔ عجیب بات ہے۔ پھر دفعتاً اس کی نگاہ ٹارچ پر پڑی۔ ٹارچ وہ اسے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھنے لگا۔ یہ تو انہوں نے مجھے دی تھی۔ بندی خانے میں دی تھی۔

تو یہ خواب نہیں تھا لیکن اس نے کیمرے کی طرف دیکھا عجب تماشہ ہے۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

عین اس وقت ایک جیپ ہونکتی ہوئی اس کے پاس آ رکی۔ جیپ سے چار ایک سپاہی برآمد ہوئے اور خاردار تاروں کے بڑے گچھے اٹھانے لگے۔ جو جیپ میں لدے ہوئے تھے

اسی دوران میں پگڈنڈی پر ایک بوڑھا نمودار ہوا۔

ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ سپاہی اس کے پاس جا کر چلانے لگے۔ یہاں تار لگایا جائے گا۔ تاکہ لوگ ادھر ادھر نہ جا سکیں۔

ٹھیک ہے۔ بڈھے نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تاکہ کوئی پاگل اوپر نہ چڑھ آئے۔

پاگل سپاہی نے غصے سے بڈھے کی طرف دیکھا۔

کہتے ہیں سرکنڈے بھی پاگل خانہ ہے۔ بڈھے نے معصومیت سے کہا۔

پاگل۔ سپاہی نے بڈھے کو ڈانٹا۔ بیوقوف۔ بڈھے کی شکل دیکھ کر سپاہی نے دو تین قہقہے لگا کر ہنس پڑا اور صحرائی سے مخاطب ہو کر بولا۔ یہ ان پڑھ لوگ کتنا بیوقوف ہے۔ اور پھر بڈھے سے کہنے لگا۔ بزرگ یہاں امور ضلعیات ہے جہاں سے شہر کا نظم و نسق ہوتا ہے۔ کیوں بابو صاحب۔ اس نے ہنستے ہوئے صحرائی کو مخاطب کیا۔

جی ہاں جی ہاں۔ صحرائی گھبرا کر بولا۔ بیچاری پبلک کو کیا معلوم۔

تب بڈھے نے کہا ہمیں کیا معلوم جو کسی سے سنا سو کہہ دیا۔

ہا ہا ہا۔ سپاہی قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ پاگل خانہ ہا ہا ہا!

حد ہو گئی۔ حد ہو گئی۔ ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔

رات، چور اور چاند

بلونت سنگھ

(چھٹی قسط)

دیوالی کے روز جو شک پال کے دل میں پیدا ہوا وہ کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا مٹ نہ سکا۔ دن گزرتے گئے۔

پالا سنگھ کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا وہی بیوپاری کے دن، کھانا پینا۔ دوستوں کے جھگڑے۔ وہی گندے مذاق، بیہودہ گانے، اور ان چیزوں کے ساتھ دل میں ایک دبی دبی سی کسک۔ ایک خارش آہ! گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا جانے والی۔

عورت اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی وہ کئی عورتوں سے تعلقات پیدا کر چکا تھا اس نے عورت ذات سے کبھی زیادہ امیدیں نہیں باندھی تھیں۔ وہ عورت کو بس عورت ہی سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا عورت بھرپور ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ عورت مرد ہی کے لیے بنی ہے۔ دن بھر کی محنت اور زندگی کے جھمیلوں سے نمٹ کر لینے کے بعد تھکا ماندہ فنکار عورت کی آغوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ....

اس کی مضبوط انگلیوں کی پکڑ لوہے کے زنبور کی طرح سخت تھی۔ اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت بچ نہیں سکتی تھی۔ عورت ذات کے ساتھ اس کی پیار کی حرکتیں بھی کافی سخت ہوتی تھیں وہ من پسند عورت کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لیتا اور پھر ایک جگہ جم کر کھڑا ہو جاتا۔ عورت کی کھینچا تان، چھینا جھپٹی اور ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود وہ کھونٹے کی طرح اپنی جگہ پر جما رہتا۔ ہنس ہنس کر اپنے دانتوں میں جڑی سونے کی میخوں کا مظاہرہ کرتا اور آخر وہ چلبلی چلبلی تڑپتی عورت کو بے بس کر دیتا ..... لیکن سرلوں کے معاملے میں وہ بے بس تھا۔

گاؤں کی پانچ سات دوکانوں میں سے ایک دوکان اس کے دوست خیراتی کی تھی۔ خیراتی بھی ایک ملنگ نوجوان تھا۔ اس کے گھر کی حالت اس ملنگ پن کی اجازت نہیں دیتی تھی وہ تنومند اکہرے بدن کا خوبصورت انسان تھا لیکن آواز بہت باریک اور سریلی پائی تھی۔ گاؤں بھر میں صرف نواب ہی اس سے اچھا گا سکتا تھا۔ نواب کی آواز قدرے بھاری تھی۔ لیکن اس میں بے حد لوچ اور درد تھا

گھر والوں کے کہنے پر خیراتی نے دوکان کھول رکھی تھی۔ جس میں گاؤں کی دوسری دکانوں کی ہر چیز موجود تھی۔ پر اس کا سودا کم ہی بکتا تھا۔ بزوری شربت اور عرق کئی برس کے پرانے تھے۔ مصالحوں میں کیڑے، اچار میں پھپھوندی یعنی ہر شے میں کوئی نہ کوئی خرابی موجود تھی، ہاں اگر کوئی چیز بکتی تھی تو ہڑ کا مربہ۔ نہ جانے اسے ہڑ کا مربہ بنانے کی ترکیب کہاں سے ہاتھ لگ گئی تھی کہ شیرے میں ڈوبی ہوئی ہڑیں چھوٹے آخروٹ کے برابر پھول جاتی تھیں۔ ایسا مربہ تو شہر میں بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک تو مربہ اتنا اچھا اس پر گاؤں کا اکلوتا حکیم علی اصغر جو اس کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ ہر مریض سے ہڑ کا مربہ استعمال کرنے کو کہتا۔ ہڑ کے مربے کے ساتھ چاندی کے ورقوں کی سفارش کی جاتی تھی۔ آس پاس کے دیہات میں علی اصغر کی حکمت چلتی تھی نتیجہ یہ کہ خیراتی کی ہڑیں خوب بکتیں جو مال تیار ہوتا فوراً بک جاتا اسی طرح گاہکوں کو بھی تازہ مال ملتا۔ اگر کسی کے پاؤں [illegible]

بھی آجاتی کہ اس کی شکے کی ٹہری تو ضرور ہی بک جائیں گے۔

کبھی جی میں آتی تو وہ جلیبیاں اور پکوڑے تلنے لگتا۔ اس دن کافی پیسے کما لیتا گاؤں میں پکوڑے یا چٹنی یا جلیبیاں کہاں کھانے کو ملتی ہیں۔ جیسے ہی وہ کڑاہی آگ پر رکھتا۔ گاؤں بھر میں خبر پھیل جاتی۔ ہر کوئی تھوڑے بہت پکوڑے وغیرہ ضرور لیتا۔ بچے تو جلیبیوں اور پکوڑوں کے پیچھے باؤلے ہو جاتے۔ اگر پیسے نہ ملتے تو گیہوں لے آتے۔ گاؤں والے جلیبیوں کو جلیب کہتے تھے۔ کڑاہی میں اُٹھتی ہوئی مہک سونگھ کر تایا ہرپرشاد اور کرم دین جیسے بزرگ بھی حقے اٹھاتے اور تہبند لہراتے پاس کے چبوترے پر پاؤں کے بل آن بیٹھتے۔ خوب مزے لے لے کر باتیں کرتے۔ جلدی جلدی کش لگا کر نتھنوں سے دھواں اڑاتے اور نظریں جلیبیوں پر جمائے رکھتے۔

سردیوں میں لوہڑی سے پندرہ بیس دن پہلے ایک شام کو لوگوں نے دیکھا کہ خیراتی نے اپنی دوکان کے سامنے بھٹی میں آگ جلا کر گھی کا کڑاہا چڑھا دیا ہے۔ راہ چلتے آدمی رک کر پوچھتے "کیوں بھئی خیراتی! جلیب؟" — "آہو بھاجی" — وہ جواب دیتا۔

پھر وہ لوگ وہیں پاس کے چبوترے پر اکڑوں بیٹھ جاتے۔ جنگ کے کارن میدے کی بڑی کمی ہو گئی تھی اس لیے اب کڑاہا بہت دنوں کے بعد چڑھایا گیا تھا۔ اس لیے تھوڑی ہی دیر میں بہت سے لوگ وہاں اکٹھا ہو گئے۔ خیراتی پور نکالتے ہی دونوں میں ڈال ڈال کر بانٹ دیتا۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ سب پیٹ بھر کر کھاتے اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنی سمجھ اور اندازے سے جتنے دام دیتا وہ رکھ لیتا۔ کبھی کسی قسم کی بک بک جھک جھک نہ ہوئی۔ گھروں سے بچے بھی بھاگم بھاگ آن پہنچے، ان کا الگ شور اٹھا۔

بالی بھی آ نکلا۔ جب سے وہ گاؤں میں آیا تھا اس کے لیے یہ پہلا موقعہ تھا۔ سب لوگ حقے گڑگڑاتے اور باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ خیراتی کی حرکتوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ضرورت محسوس کرنے پر اپنے قیمتی مشورے بھی دے دیتے تھے۔

دیہاتی ماحول میں پلا ہوا خیراتی بھی بڑے آرام سے کام کر رہا تھا۔ اسے گاہکوں کی فکر نہ تھی وہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ اس لیے بھٹی میں موٹی سی لکڑی گھسیڑ کر وہ رک جاتا اور سر کھجانے لگتا۔ پھر کڑاہے میں گھی انڈیل کر اپنی چھوٹی سی بودی (چوٹی) کو مروڑنے لگتا یا کوئی دوسرا چھوٹا موٹا کام کرنے لگتا۔ ہر کوئی اس کی اس طرح کی حرکتوں کو چپ چاپ برداشت کرتا حالانکہ ہر کسی کا جی چاہتا تھا کہ جلدی سے جلدی کڑاہے سے جلیب نکلیں اور وہ کھائیں۔

یوں تو گاؤں ہر شوقین وہاں موجود تھا۔ صرف کرم دین کی کمی تھی جو وہ ادھر سے نکلا تو قدم رک گئے۔ حقے کی نے ہونٹوں سے الگ ہو گئی اب وہ صرف ناک ہی نہیں بلکہ منہ سے بھی بھٹی سے نکل رہی جلیبیوں کی خوشبو سونگھنے لگا...... چلم کے ساتھ لٹکتی ہوئی چمٹی جھولتی رہی...... اس کی نیچے کو لٹکی ہوئی لمبی، پھیلی پھیلی مونچھوں میں لمحہ بھر کے لیے حرکت ہوئی......

ایسے موقعہ پر ہرپرشاد کہاں چوکنے والا تھا زور سے آواز لگائی ——— "بابا بیٹھ جا! کھڑے کھڑے کیا دیکھتا ہے۔ تیار ہو جائیں گے تو تجھے بھی مل جائیں گے......"

کرم دین نے مسکرا کر نے دانتوں میں دبا لی اور من ہی من میں ہرپرشاد کے حملے کا مناسب جواب سوچنے لگا۔

ہرپرشاد نے اسے چپ چاپ ایک جگہ بیٹھے دیکھا تو ساتھ والے کو کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے بولا ——— "دیکھ اب بابا! اس جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔"

کرم دین جلد جلد کش کھینچ کر دھواں چھوڑنے لگا۔ اس وقت نہ جانے کیوں اسے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔ ہرپرشاد نے چوٹ

پر جوش جاری رکھی۔ "ہا ہا بھلا جلیب دیکھیے اور پھر چل دیے ؟ ...... ارے توبہ !"

کرم دین نے ضعیف بن کر ایک چوتڑ سے پڑو پرہ جماتے ہوئے جواب دیا "اور بیٹا تم جو صبح سے یہاں بیٹھے ہو سو ؟"

ہر پرشاد نے سنی ان سنی کرتے ہوئے لوگوں سے کہنا شروع کیا "بچپن میں بھی اس کی ایسی ہی ۔ ہاں تو ۔ تمہیں ایک مزیدار بات سناؤں ؟

یہ کہہ کر ہر پرشاد نے کن انکھیوں سے کرم دین کی جانب دیکھا جو اس وقت بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ آج کمبخت ہر پرشاد پھیل گیا ہے اس لیے اس نے یہ کہنے کی اب جانے دیں ۔ ہیں خاص ہرج نہ جانا۔ بچپن میں ان دونوں ساتھیوں نے انجانے ہی سے یہ سمجھوتہ کر رکھا تھا کہ ان میں سے اگر ایک کو کوئی تماش ہو جائے تو دوسرے کو بڑے چین سے ٹل جانا چاہیے۔

"بچپن کی بات سناتا ہوں ایک بار ہم بیر چکھنے گئے ....." کرم دین سمجھ گیا کہ اب وہ کون سی بات سنانے والا ہے۔ وہ خود ہی بڑی شان سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے مسکرانے لگا۔ ہر پرشاد نے سلسلہ کلام جاری رکھا "ہم دونوں لگڑوالے بھی ساتھ تھے۔ اتنے میں ہمارا کرم دین سب سے ناک پکڑ کر کھسک ادھر ؟ بڑے آدمی کی طرف بڑھے جو اس وقت جلیب کھا رہا تھا۔ جاتے ہی زبردستی اس کی گود میں گھس بیٹھے اور بڑے پیار اور بھولپن میں کہنے لگے "تم میرے باپو ہو نا ؟"

اس بات سب لوگ ہنسے۔ نوجوانوں نے اپنی پگڑیاں ہوا میں اچھال دیں۔ ہر پرشاد نے اس کی نقل اتارتے ہوئے بڑا عجیب سا منہ بنا کر کہا "جی چاہتا ہے کہ اب جو کرم دین جلیب کھانے لگے تو چپکے سے دھوتی سمیٹ کر اس کی گود میں بیٹھ جاؤں اور کہوں ۔ تم میرے باپو ہو نا !"

"ہاہا ...... ہی ہی ...... ہو ہو ...... او ہو ہو" پہلے سے بھی زوردار قہقہوں سے آسمان گونج گیا۔ اتنے میں جلیبوں کا پہلا پور نکلا اور سب میں بٹ گیا۔ اس طرح جلیبوں کے ساتھ گرم گرم لطیفوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پال کو جلیب بہت پسند آئے اور اس کے دوست خیراتی نے بھی کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ نئے ڈھنگ کی محفل پال کو اس قدر پسند آئی کہ وہ سوچنے لگا۔ جلیب ضرور ہی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نکلنے چاہئیں۔ پال بھی اچھی اچھی کہانیاں سنانے میں مانا ہوا تھا۔ اسے بھی سب نے اکسایا اور اس نے بھی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے دو چار چٹکلے سنائے۔ لوگ اس کی باتوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ پال کے بعد وہ کرم دین کے پیچھے پڑ گئے۔ آخر کرم دین بھی چٹکلہ سنانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کہ باتوں باتوں میں ذرا ہر پرشاد کی بھی خبر لے لیں گے۔

جب لوگ کرم دین کی باتیں سننے میں محو تھے تو پال نے نظر اٹھائی تو دور سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ اسے فوراً شک گزرا کہ وہ سرنوں ہو گی۔ لیکن جب وہ موڑ سے مڑی تو اس کا شبہ دور ہوا۔

گاؤں میں آ کر جب اس نے پہلے پہل سرنوں کو دیکھا تو اسے اپنی امیدوں سے بڑھ کر حسین پایا۔ اس نے حالات کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ لیکن وہ سرنوں کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کبھی اس کے دل میں جبر کا خیال آیا بھی تو اس نے اسے فوراً دبا دیا۔ کسی انجانے جذبے کے تحت اس کے غیر ذمہ داری کے نظریے میں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ یوں بھی اسے اس بات کا یقین تھا کہ سرنوں سے اس کی شادی ہو جائے گی اور خود ہی اس نے اس بات کا ارادہ کر لیا تھا کہ اسے سرنوں کے والدین کی نظروں میں چڑھنے کے لیے پرانے پاپیوں سے ذرا بچ کر رہنا ہو گا۔ مگر جب سے اس نے پرتھی پال سنگھ کو دیکھا تھا اس کے من میں کئی جذبات ابھر آئے تھے۔ نہ جانے وہ کس کی آواز تھی جو ہر لمحہ اس کے کان میں خبردار ! خبردار !

ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس دن سے وہ سرزن اور پرتھی پال کے تعلقات کے بارے میں اصلیت کی ٹوہ لگا رہا تھا لیکن بے نتیجہ۔ کچھ دن پہلے اسے پتہ چلا تھا کہ پرتھی پال پھر چھٹی پر گاؤں آیا ہوا ہے اور وہ حیران تھا کہ آخر یہ پرتھی پال سنگھ کے لیے اس کے معمولی سے گاؤں میں کون سی کشش ہے جو وہ اتنی جلد جلد چھٹی لیکر آ دھمکتا ہے۔

وہ اسی قسم کے خیالات میں گم رہتا۔ دوستوں کی باتوں کی طرف بھی وہ زیادہ دھیان نہیں دے پاتا تھا۔ ان کی محفلوں میں بھی اس کی یہی حالت ہو جاتی اور وہ اس کی محویت پر اسے ٹوکا بھی کرتے تھے۔ اس وقت سب لوگ کرم دین کے لطیفوں پر ہنس رہے تھے اس لیے کسی نے اس کی جانب زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اسی اثنا میں نواب بھی ادھر آ نکلا اور جلیب دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ گاڑھے کی موٹی چادر کے گوشے میں جلیب ڈلوا کر وہ سیدھا پال کے پاس پہونچا اور اس کے ساتھ ہٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا "کہو پالی!"

پال نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو نواب نے دو تین جلیب ایک ساتھ منہ میں رکھتے ہوئے کہا "بیٹا! اکیلے اکیلے کھاتے رہے۔ ہمیں خبر تک نہیں کی....."

پالی نے مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بھئی مجھے خود اس بات کا پتہ نہیں تھا جب سے گاؤں میں آیا ہوں پہلی بار یہ تماشا دیکھا ہے۔"

نواب نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "لو کھاؤ"

"تم کھاؤ یار! میں پہلے بھی کھا چکا ہوں۔"

"ابے کھا بھی لے ہمارے کہنے سے"

پالی نے ایک جلیب اٹھا لیا۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اچانک نواب نے سرگوشی میں کہا "ہاں یار! میں تم سے ایک بات کہنے والا تھا....."

"کہو"

"وہ ہے نا! کیا نام ہے اس کا بھلا سا..... وہ لیفٹن دیکھو نام بھول رہا ہوں....."

پالی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا "پرتھی پال سنگھ"

"ہاں وہی......"

"تو کیا ہوا؟"

"کل میں نے اس گاؤں سے کچھ دُور   ادھر قبرستان سے بھی پرے...."

"اچھا؟"

"تو بھئی مجھے کچھ شک گزرا"

پالی چپ رہا لیکن اس کی نظریں نواب کے چہرے پر جمی تھیں نواب پھر سے کہنے لگا "سرزن بھی اُدھر سے آ رہی تھی"

لمحہ بھر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر پال نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"تو کیا ان دونوں کو تم نے ساتھ ساتھ دیکھا تھا؟"

"نہیں...... پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور ملے ہوں گے آخر اتنی دور جانے کا لڑکیوں کا کیا کام.....؟"

پال کے لیے یہ خبر غیر متوقع تھی۔

"سرزن ابھی ادھر اُدھر دیکھتی، بے پاؤں چلی آ رہی تھی اور میں بھی دوسرے راستے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کو آ رہا تھا تبھی میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ مگر کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔"

"کب دیکھا تم نے؟"

"ابھی ابھی...... جب میں رہٹ سے لوٹ رہا تھا"

"کیا تم نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ وہ سرزن ہی تھی"

"ہاں بھئی! تو کیا میں سرزن کو بھی نہیں پہچانتا؟"

پال پھر لمحہ بھر کو چپ ہو گیا اور پھر وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "دیکھو یار کسی اور کو معلوم نہ ہو"

"بالکل نہیں"

پال کو زراب پر پورا بھروسہ تھا وہ قابلِ اعتماد تھا بھی۔ لگائی بجھائی والی اس کی طبیعت ہی نہیں تھی دوستی کے ناطے پال کو یہ بتانا اس نے ضروری سمجھا۔

پال کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر تیزی کے ساتھ قبرستان کی جانب چل پڑا۔

زراب جانتا تھا اگر کہیں اسے پرمی یا پال دکھائی پڑ گیا تو ملاقات دونوں کے حق میں اچھی نہیں ہوگی لیکن وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ پرمی پال نہتا تھا اگر مڈبھیڑ ہو گئی تو پال کا پلہ بھاری رہے گا چنانچہ وہ بیٹھا جلیب کھاتا رہا۔

پال کے کچھ دوستوں نے اسے گاؤں سے باہر جاتے دیکھا تو ان میں سے ایک بول اٹھا "ابے دیکھو پال پیچھے سے کھسک گیا ہے"

"کوئی بکرے جرا جرا بھادے گا" وہ دوسرا بولا۔

اس پر بقیہ چپ چاپ ہنس کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ زراب نے دیکھا تو چلا کر بولا "یارو گجب کرتے ہو پاس کے کھیت میں پاخانہ کرنے گیا ابھی لوٹ آئے گا"

"کیا تجھ سے کہہ کر گیا تھا"

"ہاں بھئی تو کیا جھوٹ کہتا ہوں۔ عجب الول جلول آدمی ہو"

اس طرح اس نے سب کو چپ کرایا اور پھر ان کا دھیان ہٹانے کے لیے کھیرائی سے بولا۔

"ابے کھیرائی کیا ہو گیا ہے تجھے۔ جلیب لا جلیب۔ کھڑا ٹکر ٹکر منہ دیکھتا ہے"

پال تیزی سے قبرستان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابھی تک وہ طے نہ کر پایا تھا کہ اگر ان دونوں میں کوئی ایک مل جائے تو اس سے کیا برتاؤ کرے گا۔ لیکن چہرے کے آثار اچھے نہیں تھے دل میں ایک طوفان برپا تھا۔

آخر وہ قبرستان کے قریب سے ہوتا ہوا اس کی پرلی طرف پہونچ گیا مگر وہاں میدان صاف تھا دور دور تک نظر دوڑائی کہ شاید پریمی ہی دکھائی دے جائے پر کھیتوں میں کچھ کسانوں کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔

وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا پھر اس کے بالوں میں سرسراہٹ ہونے لگی ادھر کئی دنوں سے اس نے بال نہیں دھوئے تھے سوچنے لگا۔

کہیں جوئیں نہ پڑ گئی ہوں اسے اپنی بے پرواہی پر غصہ آنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ سرزوں کو اس قسم کی عادتوں سے سخت نفرت تھی۔ اور اب کچھ پڑھ لکھ چکنے کے بعد تو اس کا مزاج اور بگڑ گیا تھا پھر وہ سوچنے لگا پر تھی اگر زیادہ نہیں تو ہفتے میں دو بار تو ضرور دھوتا ہوگا اس نے بھی پختہ ارادہ کر لیا کہ گھر پہنچتے ہی وہ ریٹھے توڑ کر ان کے چھلکے پانی میں بھگو دے گا اور دوسرے دن سب سے پہلے بال دھو ڈالے گا ان کے پانی سے اگر ہو سکا تو بال دھونے کے بعد کہیں سے چنبیلی کا تیل بھی لائے گا اور ان سے بالوں کو خوب چپڑ لے گا۔ جوڑے پر بندھی جالی اور اس کے پھندنے جو چکنائی اور میل سے چکٹ رہے تھے انہیں بھی دھو ڈالے گا۔

ایسے سنبھلنے کے بعد وہ حالات کا نئے طریقے سے جائزہ لینے لگا۔ اس نے سوچا ممکن ہے کہ سرزوں اور پرتھی پال کے مابین ایسا ویسا معاملہ نہ ہو۔ چونکہ اسے خود سرزوں سے پریم ہے اس لیے یہ بھی ناممکن نہیں سب شکوک اس کے دماغ کی پیداوار ہوں۔ آخر سرزوں سے بیاہ میں رکاوٹ ہی کیا ہو سکتی تھی۔ خاندان کے لحاظ سے اس میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اگر سرزوں کا خاندان اونچا تھا تو جب سے وہ گاؤں میں آیا تھا اس نے بھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی تھی۔ جوالا سنگھ و دیگر بدکاروں سے اس کا خاص تعلق نہیں تھا۔ وہ جو ایک بار اس نے جوالا کے وہاں شراب پی اور کھانا کھایا تھا تو اس دن اس قدر زور کی آندھی چلی تھی کہ کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلا تھا۔ رہی تھوڑی بہت شرارت تو وہ گاؤں کا کون نوجوان نہیں کرتا تھا۔

اس نے سرزوں کے بارے میں بھی نئے سرے سے سوچا چاہے وہ کچھ بھی کہتا یا سمجھتا مگر سرزوں نے اسے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ وہ ایسی ہنسوڑ تھی کہ جب ملتی پھول کی طرح کھل جاتی۔ ہر وقت الھڑ پن سے ہنستے رہنے کی یہ عادت ہی تو تھی جو اس کے لیے ایک مصیبت بن گئی تھی اب وہ اسے کسی سے ہنس کر ایک بات تک کرتے دیکھ لیتا تو اس کے دل میں کئی طرح کے شکوک پیدا ہو جاتے نہیں نہیں یہ سب شکوک بے بنیاد تھے۔ وہ کبھی ایسی لڑکی نہیں ہو سکتی بلکہ وہ خود جذبات کی رو میں بہہ کر ایک دن اس سے بغل گیر ہو گیا تھا۔ پر اس کی اس حرکت کا بھی سرزوں نے برا نہیں مانا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اس کے لیے جگہ ہے، اگر وہ ڈھب سے آپس کے تعلقات مضبوط کر سکے تو۔ .... اور ویرال کے دن جب وہ من ہی من میں بالکل مایوس ہو چکا تھا بھابی نے سرزوں سے کہہ دیا کہ پالی تجھ سے خفا ہے تو بچاری بھاگی چلی آئی اس وقت اس کی حرکات و سکنات بہت پیاری لگ رہی تھیں، اگر اس کے دل میں اس کے لیے جگہ نہ ہوتی تو کیا وہ اس طرح وہاں آتی، نہیں ہرگز نہیں!!

اس طرح پالی نے اپنے دل کو ڈھارس دی۔ وہ دور دور تک نظریں دوڑا کر پھیلے ہوئے کھیتوں کی آڑی ترچھی، جال سا بنتی ہوئی مینڈھوں، ان کے پیڑوں کے گھنے سایوں تلے روں روں کرتے ہوئے رہٹ، کہیں کہیں چپ چاپ کھڑے ہوئے جھڑ بیریوں اور مدار کے جھنڈوں کی جانب دیکھتا رہا۔ کھلی ہوا اور پُرسکون فضا کا اس کے درماندہ اعصاب پر بڑا سہانا اثر پڑا۔ اس نے جی میں ٹھان لی کہ اگلے دن سے وہ سرزوں پر کسی قسم کا شبہ کیے بغیر اس سے نئے سرے سے تعلقات قائم کرے گا اور آئندہ کے لیے بھی اس امر کا خیال رکھے گا کہ جب تک اسے سرزوں کے خلاف واضح اور ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا وہ اس پر ہرگز شک نہیں کرے گا۔

وہ سیٹی بجاتا اور کبھی کسی گیت کا بول گنگناتا گاؤں کی طرف لوٹ پڑا۔ اپنی دھن میں اسے صاف ستھری پک ڈنڈی پر چلنے کا دھیان بھی نہ رہا جدھر اس کے پاؤں پڑتے تھے وہ ادھر ہی چلا جا رہا تھا اس طرح کئی بار اس کے پاؤں برسات کے دنوں میں مویشیوں کے کھروں سے بنے ہوئے گڑھوں میں پڑ پڑ گئے۔

ادھر اروڑی کے پاس گاؤں کی گلی شروع ہوتی تھی۔ جب وہ اروڑی کے ڈھیر کی چھوٹی سی چڑھائی چڑھ رہا تھا تو اس نے گاؤں کے بچوں کو وہی پرانا کھیل کھیلتے دیکھا جسے بزرگ ہمیشہ سے کھیلتے چلے آئے تھے۔

ایک لڑکا دیوار کی طرف منہ کر کے اس پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے نے اس کی پشت پر پاؤں رکھ دیا۔ پاس کھڑے ہوئے لڑکوں کے گروہ میں سے ایک نے کہا "تیری گھوڑی کیہہ رنگا؟"

دیوار والے لڑکے نے جواب دیا "لال بھورا"

"کھاندی کیہہ؟"

"دال وڑی"

"پیندی کیہہ"

"بھنگ"

"تیری گھوڑی دی لوڑدیاں ٹنگ"

اور پھر یکلخت اس کی پیٹھ پر ایک لات پڑی اور سب لڑکے پھلجھڑی کی طرح ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ اور دیوار سے ہاتھ ہٹا کر اس کو پکڑنے کے لیے لپکا۔ ان کی مسرت بھری چیخوں اور قہقہوں سے فضا گونج اٹھی —— اور پالی مسکرا دیا۔

پھر ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی پالی نے کُل ڈالا اور دروازہ بھیڑ دیا تاکہ گلی کی روشنی اندر نہ گھس آئے۔ آنگن میں لہنے کے بچے کھیل رہے تھے ابھی اس نے مویشیوں کے سامنے سانی نہ کی تھی۔ بیل اپنے کھونٹوں سے بندھے وہ سینگ ہلا ہلا کر "ڈ" کرتے اور اس طرح اپنی بے چینی ظاہر کر رہے تھے کھلی بھیگی پڑی تھی اس نے آستین چڑھا کر جلدی ہی کام کیا اور پھر سانی سے سنے ہاتھ دھونے بیٹھا۔ دو بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا اور جب کھلی کی چراند سے اس کی کلائیوں پر جلن سی ہونے لگی تو اس نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں ہاتھ کہنیوں تک ڈبو دیئے۔

چھت پر اس کی بیوی شاید کپڑے اٹھانے گئی ہوگی لیکن اب پڑوسن سے باتیں کرنے میں مگن تھی۔ پالی نے دو تین بار اسے بلانے کے لیے لڑکے کو بھیجا مگر اس کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ آخر اس نے منڈیر پر سے آنگن میں جھانکا اس کے ہونٹوں پر حسب عادت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پالی کا غصہ جو پہلے کبھی آیا ہی نہیں تھا اسے پر زیادہ غصے کے بل ڈال کر بولی "کیا ہے بھئی!"

پالی نے چڑانے کے لیے کہا "ہونا کیا ...... یوں ہی"

"ہائے رے کہاں جاؤں میں!"

"ہائے رے کیوں؟"

"پھر!"

"کیا ہم نے جھوٹ کہا ہے"

"اچھا بابا تم ہی جیتے۔ بتاؤ پھر میں کیا کروں"

"نیچے آؤ"

"بیٹھے لالہ"

"بھلا چھت سے نیچے آنے کے لیے کہہ رہے ہیں...."

"ہاں ٹھیک کر لی، پھر کہنے لگے آنے دو ماں کو"

"نہیں بھابی تمہیں قسم ہے...... ماں سے کچھ نہ کہنا.... اب آ بھی جاؤ۔"

"ذرا بات کر لوں"

"ہم بھی بات ہی کریں گے"

"کیوں میرا بھیجا چاٹتے ہو مفت میں....."

"واہ بھابی! ہم اس چاؤ سے بلا رہے ہیں اور تم....."

"میرا اچھا بھیا — میں بس ذرا سی بات کر لوں..... ابھی آتی ہوں"

پالی بچوں کی طرح مچل گیا: "نا بھئی ہم نہیں..... تمہیں قسم ہے"

مگر اب تاباں چھت کی پرلی طرف پڑوسن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ پالی جانتا تھا کہ اس کی ذرا سی بات کتنا وقت لے گی۔ پر اسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی ماں آنگن میں داخل ہوئی اور چھوٹتے ہی بولی "میری بھابی کہاں ہے"

"چھت پر"

"چھت پر؟"

"ہاں..... بہت دور نہیں چھت پر ہی ہے....."

ماں بگڑی "چھت پر تو ہے، پر میں پوچھتی ہوں کیا ہو رہا ہے وہاں؟"

"باتیں ہو رہی ہیں"

"باتیں........ ارے باتیں؟"

"ہاں...... کیوں؟"

"لو اور سنو بھلا باتیں کرنا بھی کوئی کام ہے؟"

"مجھ سے پوچھتی ہو؟...... اسی سے پوچھو!"

"آنے دو"

"آ چکی وہ؟"

"کیوں پڑوسن نے وہاں پکا ڈیرا ڈال دیا ہے کیا"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے"

"آخر بات بھی تو ہو کوئی"

"بات کیا..... دو گھنٹے سے تو میں ہی انتظار کر رہا ہوں..... ضرور کوئی خاص بات ہے۔"

سن کر اس کو تعجب ہوا۔ "دو گھنٹے سے؟"

"اور نہیں تو کیا"

اتنے میں لہنا سنگھ بھی آ گیا اس نے یہ بات سن لی۔ اب بسنداں سے نہ رہا گیا —— اری تاباں! تاباں!"

لہنا سنگھ نے سر سے پگڑی اتار کر اسے جھاڑا اور پھر اسے پرے چارپائی پر پھینکتے ہوئے بولا "کتنی بار کہہ چکا ہوں اس چڑیل سے باتیں نہ کیا کر۔ گھر کا کام کیا کر۔"

پالی نے جلتی پر تیل ڈالا "نہ جانے کب سمجھاتے ہو اس کے سامنے تو بھیگی بلی بنے رہتے ہو"

یہ الزام سن کر ایک بار تو لہنا سنگھ کو تاؤ آیا لیکن اس نے پالی سے کچھ کہا نہیں"

بسنداں نے پھر ہانک لگائی "اری تاباں"

آخر تاباں جلدی جلدی کھٹ پٹ کرتی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔

بسنداں بھری بیٹھی تھی اس کے آتے ہی برس پڑی "مدھو کی کیا مزا آتا ہے تجھے باتیں کرنے میں۔ جب دیکھو دو دو گھنٹے باتیں کرتی چلی جاتی ہے۔"

"تاباں بھی گرما گئی "کب..... میں کب دو دو گھنٹے باتیں کرتی ہوں۔ ... تمہارے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو"

اب لہنا سنگھ نے شوہرانہ حقوق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "تیری زبان کیسی چلتی ہے ری۔ ذرا کام کی بات کہہ دو تو مرچیں لگتی ہیں"۔

"مجھے مرچیں کیوں لگیں"

اس پر لہنا سنگھ نے آگے بڑھ کر دھمکایا "یاد رکھیو زبان کھینچ لوں گا منہ سے"

یہ دیکھ کر کہ سب بغیر معقول وجہ کے اس پر پل پڑے ہیں تاباں کی آنکھیں پرآب ہو گئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کاٹ کر کھا لو مجھے دن بھر کام کرتے ہوئے کمر ٹوٹ جاتی ہے دو گھڑی کسی سے بات کر لی تو سب کے سب سر پر سوار ہو گئے۔"

یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی دھلے ہوئے کپڑے رسی پر پھینک کر سب سے اندر والے کمرے میں گھس گئی اور دھڑام سے پلنگ پر جا گری۔

لہنا سنگھ نے چارپائی گھسیٹ کر اس کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عجیب عورت ہے۔ بھلا پوچھو کہ بھی بال بچوں والی گھر کا کام کاج کرتی ہیں نہ کہ منڈیر پر چڑھ کر پڑوسیوں سے باتیں کرتی رہتی ہیں"۔

بسنداں اور لہنا سنگھ دونوں بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے اس لیے جب پالی بھابی کو منانے کے لیے بھیتر کی اور بڑھا تو ان دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔

اندر والے کمرے میں تاریکی چھائی رہتی تھی۔ نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ لے دے کے چھت میں ایک گول سوراخ تھا جس میں سے دوپہر کے وقت کچھ روشنی آتی تھی پر اب شام ہو چکی تھی اور گول کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

جب وہ ایکدم اندھیرے میں داخل ہوا تو پہلے تو اسے بالکل کچھ نہ سوجھا تاریکی میں صرف سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔

تاباں کو اس بات کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ ساری آگ دیور کی لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے جب پالی کی آنکھیں مدھم روشنی سے مانوس ہوئیں اور اس نے بھابی کے لرزتے ہوئے شانے پر ہاتھ رکھا تو بھابی نے اعتراض نہیں کیا۔ پالی نے بھولپن سے کہا "بھابی —" وہ سسکیاں بھرتی رہی۔

"بھابی!"

اس نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔

تب اس نے بھابی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے ہاتھ نہیں کھینچا جس سے ثابت ہوا کہ اسے پالی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔"

"بھابی تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

جب اس بار بھی بھابی نے جواب نہیں دیا تو پالی نے کہا "دیکھو بھئی تم ہم سے بیکار ہی خفا ہو۔ ہم سے تو کچھ نہیں کہا۔ اگر کوئی غلطی ہو تو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہیں"

اس پر بھابی نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبا دیا جس سے مطلب یہ تھا کہ پالی سے اسے کوئی شکایت نہیں۔ پالی نے بات چن کر کہا بھئی کہہ دو تم ہم سے خفا نہیں ہو۔ وہ چپ رہی۔

"بھئی ہم یوں نہیں مانیں گے ...... منہ سے کہہ کچھ"

بھابی نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا جیسے جیسے دیور سے بھابی کیوں ناراض ہونے لگی۔ اس طرح پالی باتوں کے جھنکار دکھلاتا رہا اور ان باتوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ بالآخر تاباں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "دیکھو تو تمہارے تو سامنے ہی ساری بات ہوئی ہے جب دیکھو ہوا کے گھوڑے پر سوار، خود کھیتوں پر چلے جاتے۔ ان گھر گھر گھومتی۔ سب کام میں نبٹاتی ہوں پھر بھی یہ کاٹ کھانے دوڑتے ہیں ......" تاباں نے یہ بات بہت اونچے لہجے میں کہی تاکہ ان دونوں کانوں تک بھی پہنچ جائے۔ لیکن ان کے تو خواب خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ کان دبائے چپ چاپ سنی ان سنی کر رہے تھے۔ پالی نے بھابی کو ہمت دلاتے ہوئے "واہ بھابی! کسی کی مجال ہے گھر میں ——— گھر میں کیا گاؤں بھر میں ...... جو تم تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ ہم بھلا کس روگ کی دوا ہیں؟"

ان باتوں سے تاباں کی ہمت ہی نہیں بڑھی بلکہ وہ خوش بھی ہوئی"

"اچھا بھئی اب یہ رونا دھونا بند کرو تمہاری آنکھیں تو پہلے ہی سے دکھنی ہیں رو رو کر اور خراب نہ کرو۔"

اس قسم کی چکنی چپڑی باتوں کے بعد وہ اسے گدگدانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ گھر کی رانی کی ہنسی کی آواز سن کر سنداں لہنے کی جان میں جان آئی۔

سنداں نے چوکے کے برتنوں کی طرف دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تھا کبھی کبھار کڑچھی ہاتھ میں اٹھا لے خیر اب کے بھی اس نے [illegible] میں گھمانی شروع کر دی۔ ساتھ ہی اونچی آواز میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں بچے نے پاس آ کر کہا "ماں ماں ہمیں اٹھے کا تو .."

"بھئی تمہاری بے بے ہی بنائے گی ...... آئے تو اسی سے کہنا"

اتنے میں تاباں بھی آ پہنچی۔ سنداں اور لہنے نے ایسی صورت اختیار کی جیسے کوئی جھگڑا ہی نہ ہوا ہو۔ بلکہ بچوں کے ساتھ مل کر فضا کو خوشگوار بنا دیا۔

تاباں کو دیکھتے ہی سنداں نے چوکی چھوڑ دی۔ ترکاری کی ترکاری پک چکی تھی تاباں نے پتیلا اتار کر آگ دھیمی کر دی اور [illegible] رکھ کے آٹے کو پھر سے ملنے لگی۔ سنداں کو محفل میں ہنسی پیدا کرنے کے لیے ایک بات سوجھی۔ پاس مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بات چھیڑ دی "بھئی ان لونڈیا کی باہر نکلنے لگی ہیں کچھ کم"

پالی کے کان کھڑے ہو گئے۔

لینے کو اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن چونکہ ابھی ابھی روٹھی بیوی کے من جانے سے اسے خوشی ہو رہی تھی اس لیے اس نے ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "کون لونڈیا ہے بے"

"یہی اپنا سرنوں......"

لینے نے اونٹ کی طرح گردن آگے بڑھا کر کہا "اچھا۔ کہاں ہے"۔

سنداں کو بھی اس قسم کے سننے والی کی ضرورت تھی۔ پینچ سے چونک کر بیٹھ گئی رازدارانہ لہجے میں بولی "وہ ہے نا........ پرتھی پال...... یہی نام ہے نا اس چھٹین کا...... تونے دیکھا ہی ہو گا اسے"۔

اس پر لینے نے منہ کھول کر سر ہلایا اور بولا "نہیں میں نے اسے دیکھا تو نہیں نام سنا ہے...... ابھی ابھی جب ہم جیب کھا رہے تھے تو اسی کی باتیں ہو رہی تھیں"

پال کو تعجب ہوا شاید نواب نے کچھ کہہ دیا ہو۔ حالانکہ اس کو اس سے اس قسم کی قطعاً امید نہیں تھی۔

لینے کی بات سے سنداں کو اور شبہ ملا۔ منہ پھیلا کر کہنے لگی "اچھا تو اب وہ کانوں پر بھی باتیں ہونے لگی ہیں۔ بھئی دال میں ضرور کچھ کالا ہے پال کا باپ کہا کرتا تھا......"

لینا بولا "ارے نہیں بے بے تو تو بات سنے بنا ہی اپنی گاڑی چھوڑ دیتی ہے"

سنداں کو قدرے غصہ آیا۔ "ارے واہ! تو کہہ ہی تو......"

"کہہ ہی کیا...... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اس کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں"

سنداں نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا "اب یہ بھی تو بتاؤ کیا باتیں ہوئیں"

"ارے یہی...... کہتے تھے بڑا کھب صورت ہے۔ تم جانو لوگوں کو ایسی باتوں کا چسکا ہوتا ہی ہے...... ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہوئی"

یہ سن کر سنداں کو ناامیدی ہوئی اور وہ بولی "عورتاں ہیں تو ہوتی ہی ہیں باتیں"۔

تاباں بولی "ہاں عورتوں کو کیا ہے وہ تو یونہیں بکنے لگتی ہیں"

سنداں بزرگانہ انداز میں بولی "پر بیٹا کوئی نہ کوئی بات تو ہو گی ہی...... بے بنیاد کے بات تھوڑے ہی اڑتی ہے۔

تاباں نے انگلیوں سے آٹا چھڑاتے ہوئے کہا "کیوں نہیں لوگ تو چاہتے ہیں کہ کسی پر الزام دھر کر خوب نمک مرچ لگا کر باتیں کریں"۔

سنداں کچھ نرم پڑ گئی "اچھا بھر! ہمیں کیا جو کریں گے سو بھریں گے تم کیوں بیٹھے اداس"

اپنی دانست میں کبیر جی کے اس قول کے دہرانے پر سنداں کو امید تھی تاباں اس کو تعریف کی نظر سے دیکھے گی لیکن تاباں نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ کہنے لگی "اور تو کسی سے ایسی ویسی بات نہیں سنی جب سنی تمہارے منہ سے......"

ایسا مایوس کن جواب سن کر غصہ تو آیا لیکن یہ جھگڑے کا موقعہ نہیں تھا۔ نرمی سے بولی "تابھی! سرنوں تو میری بیٹی سی ہے بھلا میں اسے کیوں بدنام کرنے لگی ہاں اپنے گھر بیٹھ بات کرنا تو پاپ نہیں"۔

اس پر تاباں کچھ نہ بولی۔ سنداں نے زیادہ صفائی کے لیے بات جاری رکھی "بلکہ اگر کوئی میرے سامنے ایسی ویسی بات کرتا بھی تو میں اس سے یہی کہتی ہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ کسی کی اڑائی ہوئی گپ ہے"۔

پال نے ان کی بے تکی باتوں سے اُوب کر کہا "ہاں! اب کہہ بھی ڈالو کہ کیا بات سنی ہے تم نے اتنا گھبرانے کی ضرورت ہی کیا ہے"۔

سنداں نے تاباں اور پال کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہی سنا ہے کہ دونوں میں میل جول ہے"

"دونوں کون" جیسے پال کو یقین نہ آیا ہو۔

"یہی سرزوں اور پرتھی پال ......"

"شاید ٹھیک ہو پرتھی بھی خوب صورت" لینے نے رائے دی۔

سنداں نے چمک کر کہا "خاک خوب صورت ہے"

لینا ڈر گیا "بھئی میں کیا جانوں، لوگ ہی کہتے ہیں .... سنی سنائی کہہ دی میں نے"

سنداں ہاروں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے بولی "چالاک تو ہے۔ مجھے ایسا آدمی بالکل اچھا نہیں لگتا... مجھے تو دھوکے باز نظر آتا ہے"۔

تاباں توا چولہے پر رکھتے ہوئے بولی "ماں یہ ٹھیک مگر ہمیں بھلا کسی کے بُرے بھلے کا کیا پتا چل سکتا ہے"۔

"ہاں جی، بھاگوان ہی جانے۔"

پال کے دماغ کا سکون ختم ہو رہا تھا۔ بھلا وہ کیسے خاموش رہتا "ماں! تو کیا کسی نے اسے اس کے ساتھ دیکھا ہے؟"

تاباں کو یہ باتیں بالکل پسند نہیں تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس قسم کی باتیں ہوں لیکن چونکہ پال اُن میں دلچسپی لے رہا تھا اس لیے اس نے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

سنداں بولی "بھاگوان کے بکھیڑوں کا بھید کون جانتا ہے لوگ یہی کہتے ہیں کہ دونوں میں میل جول ہے سرزوں بھی تو ان کے گاؤں جاتی رہتی ہے"۔

تاباں کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پال کے دل میں یہ خیال جڑ نہ پکڑ لے بیچارہ دکھی ہوگا اس لیے اس نے سنداں کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا "اُن کے گاؤں تو وہ ہمیشہ سے جاتی ہے پہلے تو کبھی کوئی بات نہیں اٹھی....."

سنداں نے کہا "اور وہ بھی تو ان کے یہاں آتا ہی ہے"۔

"تو کیا سرزوں کے ماں باپ اندھے ہیں انہیں بھی تو پتہ ہی ہوگا"۔

"بھئی جو کچھ بھی ہو جب تک گڑبڑ نہ ہو لوگ باتیں نہیں بناتے"۔

تاباں نے آٹے کا پیڑا بناتے ہوئے جواب دیا "اصل بات تو یہ ہے کہ لوگ ان سے جلتے ہیں ان کے پاس کچھ دھن ہے لوگ انہیں دیکھ نہیں سکتے"۔

یہ بات سنداں کے دل میں بھی پوشیدہ تھی اس نے کانوں کو ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا "جی نہیں ہمیں کیا پڑی ہے جو ان سے جلیں ہمیں کس بات کی کمی ہے"؟

تاباں نے روٹی توے پر اُلٹا دی ——— "نہیں ماں میں نہیں کہہ رہی ہوں میں تو اوروں کی بات کر رہی ہوں۔"

سنداں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "ہاں اوروں کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے"

تاباں نے دو چار روٹیاں پیالی نکالیں بچوں سے بولی "آؤ بچیا تم لوگ کھالو" اور پھر ساس سے مخاطب ہوئی "ہاں ماں! سسرال بڑی ہنسوڑ ہے اور وہ پھپھی بھی ہنس کر بات کرتا ہے ہر کسی سے۔ اس طرح کے آدمیوں پر سبھی لوگ جھٹ شک کرنے لگتے ہیں۔"

تاباں اپنی دانست میں پال کو ڈھارس بندھا رہی تھی ——— تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر نہ جانے ٹینے کو کیا سوجھی "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چنداں ان دونوں کی شادی کرنا چاہتی ہو"

سنداں بگڑ کر بولی "کیا رکھا ہے اس بندر میں"

تاباں کو سنداں کی اس بات پر تعجب ہوا۔ پرتھی پال ایسے بانکے نوجوان کو بندر کہنا انتہائی حماقت تھی۔

ٹینے نے اپنی دانست میں بڑی دور کی بات کہی "شکل سے بندر ہی ہو گا۔ کون جانے نرنجن سنگھ کو روپے کا لالچ ہو۔ روپیہ بھی تو بڑی بلا ہے"۔

ان سب باتوں کا پال پر دل پر بُرا اثر ہوا۔ روپے والی بات سُن کر اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ جب سے وہ گاؤں آیا تھا اس نے چنداں سے جھوٹ ہی کہہ دیا تھا کہ وہ زمین خریدے گا حالانکہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ممکن ہے انکی اُس پر پہلے نظر ہو لیکن اب شاید زمین خریدنے کی بات ڈھکوسلہ سمجھ کر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ اور پرتھی پال بہتر نظر آنے لگا ہو۔

پال کے ذہن میں کئی خیالات آئے اور چلے گئے۔ وہ بیتے دنوں کی یاد سے پچھتانے لگا۔ اگر وہ ذرا سنبھل کر خرچ کرتا تو آج اس کے پاس کافی بڑی رقم ہوتی لیکن اس نے روپے کو روپیہ نہ جانا مٹی جانا ......"

اتنے میں ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر گائے کے گلے کے گھنگرو بج اُٹھے۔ وہ ڈیوڑھی کی جانب دیکھنے لگے۔ وہاں چنتو نظر آئی۔

سنداں نے اسے دیکھتے ہی کہا "آؤ بہن!"

لماں نے سرک کر چارپائی پر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ چنتو بیٹھتے ہوئے بولی "کہو بہن تاباں کیا حال چال ہے؟"

تاباں کو چنتو سے چڑ تھی اس نے دھیرے سے یہ کہہ کر ٹال دیا "

" آنند سے ہوں بہن"

" بہن سنداں تم کہو؟ ...... چین کی بنسری بج رہی ہے نا؟"

سنداں کو اس سے چڑ نہیں تھی بڑے پریم سے بولی "تمہاری کرپا ہے بہن!.... چین کی بنسری تو بھلا کیا بجائیں گے بس جیے جاتے ہیں"

"ہا ہا ہا" چنتو نے قہقہہ لگایا "بہن! مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ میں پھر کبھی ہوں گی گھر سے مٹی کا تیل لانے آئی تھی دوکان بند ہے اگر تیل ہو تو ایک تہائی اس بوتل میں بھر دو کل لوٹا دوں گی"

سنداں اندر سے تیل کی بوتل اٹھا لائی اور تیل چنتو کی بوتل میں ڈال دیا ——— چنتو اُٹھتے ہوئے بولی "تم نے دروازے کے پاس ہی تو گائے باندھ رکھی ہے آنے جانے والے کو مارنے کو دوڑتی ہے!"

بدھاں نے جواب دیا "اس کے سینگ آگے تک نہیں پہنچتے۔ کھونٹے سے بندھی ہوئی ہے بے فکر رہو۔"

"نہیں بابا! ...... چلو پالی مجھے دروازے سے باہر چھوڑ آؤ۔"

پالی کسلمندانہ انداز سے گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر اٹھا۔

"ڈرپوک کہیں کی"

ڈیوڑھی میں پہنچ کر چنتو رک گئی اور پھر پالی کے کان کے پاس منہ لاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا "بیل ویل کا تو بہانہ تھا اصل بات یہ ہے کہ تمہیں جوالا سنگھ نے بلایا ہے ...... اور سنو میں ڈرپوک نہیں ہوں تم سے بات کرنے کو کوئی حیلہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔"

پالی کو یہ سن کر اور اس چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر عجیب قسم کا احساس ہوا۔ اس نے بھانپ لیا کہ اسے کس غرض سے بلایا جا رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ صاف انکار کر دے۔ "کیوں کام ہے ......؟"

وہ چپ رہی۔

"پھر بھی ...... تمہیں تو معلوم ہی ہوگا۔"

چنتو نے مردانہ انداز میں سر پیچھے کی جانب جھٹک کر اس کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا ــــ "بس یہ سمجھ لو تمہاری شان کے شایاں کام ہے۔"

انکار کے الفاظ پالی کے ہونٹوں تک آتے آتے رک گئے!

"اچھا"

"تو کب آؤ گے؟"

"تم ہی بتاؤ"

"جلد از جلد"

"کیوں کوئی گڑبڑ ہے کیا؟"

"نہیں نہیں گڑبڑ کوئی نہیں۔ ابھی تو بات ہی کرنی ہے۔"

"تو میں کھانا کھا کر آ جاؤں گا"

"ضرور"

"ضرور"

چنتو کو رخصت کر کے پالی صحن میں آیا تو اس وقت گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔ لیکن پالی ابھی تک انہیں خیالات میں گم تھا۔ اس نے سوچا ممکن ہے سرزوں کی بابت افواہیں غلط ہی ہوں لیکن اگر اس کے والدین کی نظر پر بھی پال سنگھ پر ہوئی تو پھر بھلا سرزوں کو بھی کیا اعتراض ہوگا۔ اور اگر اعتراض ہو بھی تو وہ کیا کر سکتی ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ اگر سرزوں ان حالات سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ جانے پر آمادہ ہو تو وہ اسے بڑی خوشی سے بھگا کر لے جائے گا یہاں سے سیدھا کلکتے پہنچ جائے۔ کوئی اچھا سا دھندا شروع کر دے جس میں گرفتاری کا ڈر نہ ہو۔ ایک چھوٹا سا گھر ہو اور بس وہ ہو اور سرزوں۔

دوسرے لمحہ میں پال کا ذہن دل کی ان حماقتوں پر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر سوزن یا اس کے والدین کو ان کے خیالات کا علم ہو جائے تو وہ اس سے یقیناً بہت متنفر ہو جائیں۔ سوزن بچاری کو ان باتوں کا کچھ ہوش ہی نہیں۔

تو پھر اسے اپنے خیالات درست رکھنے چاہئیں۔ بار بار اس کا ذہن اُلٹی سیدھی باتوں کی طرف کیوں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے خیالات حقائق کی طرف منتقل ہو گئے۔ سوزن نے ابھی تک اس سے محبت کا اظہار یا اقبال نہ کیا تھا۔ اس کی حرکات سے کچھ اندازہ نہ لگ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا کہ اسے اس سے نفرت نہیں تھی۔ لیکن نفرت نہ ہونا ہی کافی نہیں محبت کا ہونا بھی لازمی ہے پھر اسے یاد آیا کہ دیوالی کی رات جب وہ اسے منانے کے لیے آئی تھی اور جب تنہائی میں اس نے اس سے کہا تھا کہ میرے پاس تمہاری اور تمہارے پاس میری نشانی ہونی چاہیے تو اس نے اس بات کا کچھ بھی جواب نہیں دیا تھا۔ حالانکہ اس میں سوچنے کی بات بھی کچھ نہیں تھی۔ وہ اس بات پر شرمائی بھی نہیں۔ بھابی کے وہاں پہنچنے سے پہلے اس کے پاس جواب کے لیے وقت بھی بہت کافی تھا پر نہ معلوم اس نے جواب کیوں نہیں دیا۔ اور پھر اس کے ذرا سا خفا ہو جانے پر کس قدر اداس دکھائی دیتی تھی۔ عجب لڑکی تھی۔ اس کی باتوں اور حرکات سے کچھ پلے نہ پڑتا تھا۔ اسے بہت کوفت ہو رہی تھی۔ دماغ عجب مخمصے میں گرفتار تھا اس کی بھابی نے اسے سوچ بچار میں گم دیکھا تو روٹی کی تھالی اس کے آگے کھسکاتے ہوئے بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

تاباں لمحہ بھر اس کے چہرے کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتی رہی پھر سرگوشی میں بولی۔

"دیکھو بےبے کی باتوں میں آکر وہم میں مت پڑنا۔ وہ تو یونہی آئیں بائیں شائیں بکتی رہتی ہے۔"

"وہ نہیں بھابی تم کچھ خیال مت کرو۔ میرے دل میں کوئی شک پیدا نہیں ہوا۔"

بیچاری تاباں کو بڑی ہمدردی تھی اس سے۔ آخر اس کے دکھ درد کا بھی تو وہی ایک ساتھی تھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اسے بزرگ بھی سمجھتا تھا اور اس کا محافظ بھی تھا۔

پال کے جواب سے اسے مکمل طور پر تسکین نہیں ہوئی۔ مگر اس وقت وہ گفتگو کرنے سے احتراز کر رہا تھا اس نے اسے مزید تسلی دینے کے لیے کہا:

"میں کل جاؤں گی سوزن کے پاس اور پتہ لگاؤں گی کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔"

پال نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا"

تاباں نے خطاوارانہ نگاہوں سے پال کی طرف دیکھا اور قدرے سکوت کے بعد بولی۔

"میں تو ہمیشہ ٹوہ میں رہتی ہوں۔ پر پال تمہارے سر پر بھی تو بھتنا سوار ہے نا......"

سنداں نے انہیں کانا پھوسی کرتے دیکھ کر ذرا بلند آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے آج تو بھابی دیور بہت سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔"

اس پر دونوں نے باتیں بند کر دیں۔ اور تاباں سنداں سے مخاطب ہوئی۔

"باتیں کیا...... کہتا ہے سر میں درد ہو رہا ہے..." بیچاری سنداں نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اچھا"

پال نے بھابی کی طرف قدرے کڑوی نظروں سے دیکھا کہ مُفت میں مُصیبت اس کے گلے ڈال دی۔

سمان کہہ کر پچھتائی لیکن جلدی میں اسے اور کوئی بات ہی نہ سُوجھ سکی تھی۔

لہنے نے شاید کبھی علی اصغر حکیم کی زبانی، یہ بات سنی ہو گی اب حکمت بگھارنے کا موقع ہاتھ سے کیوں کر جانے دیتا۔

"کئی بار قبض سے بھی سر درد ہونے لگتا ہے۔ کھیراتی کی دوکان سے ہڑ کا مربہ لے آؤ، یا جے مل کے ہاں سے گلقند لا کر گرم گرم دودھ کے ساتھ کھا ڈالو کل صبح پیٹ ہلکا ہو جائے گا۔"

پال ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"سر سے پیٹ کا کیا تعلق؟"

لہنا بیچارا ابھی کچا حکیم تھا۔ دب کر بولا۔

"یا گرو جانے...... ہمیں کیا معلوم۔ علی اصغر کہتا تھا..... اسی سے سنا ہے میں نے......"

دفعتاً پال کو خیال آیا کہ اسے باہر بھی جانا ہے یہ نہ ہو کہ ماں اسے لیٹنے پر مجبور کر دے۔ بولا۔

"ہاں تو پھر ٹھیک ہو گا۔ روٹی کھا کر لے آتا ہوں ہڑ کا مربہ......"

سندراں نے رائے دی۔

"بیٹا تو لیٹ رہیو۔ لہنا لا دے گا ہڑ کا مربہ۔"

لہنا تھکا ہارا آیا تھا اس کا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ چپ رہا لیکن جب سندراں نے کہا کہ لہنا ان باتوں میں بہت سیانا ہے اسے اچھے بُرے مُربے کی پہچان بھی ہے تو لہنے نے پندرہ بیس قدم جانے میں چنداں ہرج نہ سمجھا۔ کہنے لگا۔

"ہاں پال بھیا تو لیٹ رہو میں ہی لا دیتا ہوں۔

پال قدرے کرخت لہجے میں بولا۔

"نہیں بے۔ تو مجھے بِل کُل بچہ سمجھتی ہے میں کُھد ہی لے آؤں۔ جرا کھلی ہوا بھی کھا آؤں گا۔ لہنا بیچارا اب تھک تھکا کر واپس آیا ہے۔ اب پھر تھکا دو بیچارے کو...... اب لیٹا رہنے دو اسے۔ لڑکوں بالوں سے بات چیت کر کے دل بہلائے گا اپنا۔"

یہ سن کر لہنا مسلسل ڈاڑھی کھجلانے کی بجائے لڑکوں بالوں سے بات چیت کر کے دل بہلانے لگا۔

اب سب لوگ چپ ہو گئے اور اس قدر گہری خاموشی طاری ہو گئی کہ پال کو اپنے منہ کے ہلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور پھر جب سب لوگ آپس میں بات چیت کرنے لگے تو وہ ذہنی طور پر ان سے بہت دور ایک مرتبہ پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔

ایک مرتبہ پھر بھابی سے لے کر پرتھی پال اور سرنوں تک سب اس کے ذہن میں گھوم گئے۔

اسے بھابی سے اُمید نہیں تھی کہ وہ سرنوں کے دِل کا پتہ لگا سکے گی۔ اسے سرنوں اور پرتھی پال سنگھ کی بابت خود ہی غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی۔ بھلا ایسی حالت میں وہ ان کی حقیقت کیونکر سمجھ سکتی۔ سچ پوچھئے تو اس میں اس کا قصور بھی کیا تھا آخر وہ خود ہی تو سرنوں کی بابت قطعی طور پر کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ اس جگہ پہنچ کر پال کا دماغ متضاد قسم کے خیالات میں گڈمڈ ہو کر رہ گیا اور خیالات کی رو بے حد تیز اور بے تکی تھی۔ اس ذہنی خلفشار میں اسے ایک نہایت مدھم لیکن واضح آواز آئی۔ کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ سرنوں کے خیالات اور اس کے دل کی کیفیت سے بے نیاز ہو کر

اس کے والدین کا دل اپنی مٹھی میں لے لے۔

اس مقام تک پہنچ کر اس کے ذہن کو بڑی تکان کا احساس ہوا۔ اور اس نے سوچنا بند کر دیا اور ٹب میں پانی بھر کر انگلی سے مسوڑھوں کو مل مل کر زور زور سے کلیاں کرنے لگا۔

جلدی سے جھٹ اس نے پگڑی کے اندر دو انگلیاں داخل کر کے کنپٹیوں کے چند باہر کو نکلے ہوئے بالوں کو اندر داخل کیا، تہبند کے پلو دوبارہ کس کر باندھے اور جوتوں کو پاؤں کے پنجوں میں پھنسا کر زور زور سے جھاڑا اور پھر ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا گلی میں نکل آیا۔

چاندنی رات تھی خاموش گلیوں میں کچے مکانوں کے سایوں اور چاند کی دودھیا روشنی کا تضاد آنکھوں کو بہت بھلا دکھائی دیتا تھا۔

دو چار کتے اسے دیکھ کر بھونکنا بند کر کے دم ہلانے لگے۔ وہ اس کی صورت سے مانوس تھے۔ اسے چور، اچکا، یا ڈاکو نہیں سمجھتے تھے۔

رہٹ پر جانا عادت تھی۔ پالی ڈرا کہ کہیں کوئی دوست موجود نہ ہو مبادا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے۔ حالانکہ اس بات کا امکان بہت کم تھا وہ گاؤں کی پرلی طرف اندھے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جو لوگ موجود تھے ان سے مسکراہٹوں اور سر کی جنبشوں کا تبادلہ ہوا اور وہ بخیر و عافیت آگے نکل گیا۔ اور احتیاطاً پہلے وہ سیدھا کھیتوں کی طرف چلا گیا اور پھر ایک طویل چکر لگاتا ہوا جوالا سنگھ کے مکان میں داخل ہو گیا۔

صحن کے احاطے میں خراس چل رہا تھا۔ بوڑھی سانڈنی سست قدموں کے ساتھ ایک دائرے میں گھوم رہی تھی۔ خراس کو چلتے دیکھ کر اسے شک گزرا کہ کہیں جو گیہوں پسوانے والوں نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا گھر سے باہر کوئی اسے جوالا سنگھ کے ساتھ بات چیت کرتے دیکھ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ جنتی بہن کی بابت جو افواہ اڑی ہوئی تھی اس نے انہیں قدرے بدنام کر دیا تھا لیکن وہ بہت پرانی بات ہو چکی تھی اب تو جنتو کی عمر بھی ڈھل گئی تھی۔ اس لیے اس بات کا خیال بھی لوگوں کے دلوں سے اتر چلا تھا۔ پالی کو زیادہ خوف تھا تو سرلوں کے گھر والوں کا۔ ظاہرا ان کی زبانی بھی اس نے کبھی جوالا سنگھ کی برائی نہیں سنی تھی۔ لیکن یونہی اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ جوالا سنگھ سے اس کے گھر کے تعلقات کو وہ پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھیں گے اس لیے اس بات میں جتنی بھی احتیاط کی جائے بہتر ہے۔

شکر کا مقام تھا کہ جو لوگ گیہوں پسوانے کے لیے آئے تھے وہ ان کے گاؤں کے آدمی نہیں تھے۔ اور ان لوگوں نے سوائے اس بات کے کہ ایک لمبا تڑنگا جوان ان کے قریب سے ہو کر باہر احاطے میں سے گذرتا ہوا اندرونی صحن میں داخل ہو گیا ہے اور کسی بات پر دھیان نہیں دیا۔

صحن میں ایک طرف موسم برسات اور موسم سرما کے لیے ایک باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ باورچی خانے کے دو طرف اونچی دیواریں تھیں۔ اور باقی دو اطراف بالکل کھلی تھیں صحن میں چھاج، چنے چھاننے والی پرنے اور آٹے چھیدوں والی چھلنی اور چرخہ وغیرہ بے ترتیبی سے پڑے تھے ایک کتے کو زمین پر زور زور سے دم پٹختے دیکھ کر پالی نے کسی اور طرف دیکھے بغیر سمجھ لیا کہ ابھی گھر کے لوگ چوکے میں بیٹھے روٹی کھا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی طرف کو چلا گیا آلے میں سرسوں کے تیل کا چراغ روشن تھا اور اس کی ٹمٹماتی ہوئی مدھم روشنی میں کمبلوں اور کھیسوں میں لپٹی ہوئی چند صورتیں دکھائی دیں۔ وہ فوراً انہیں پہچان نہ سکا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی گویا ان بے جان سایوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

"واہگورو جی کا خالصہ" آواز آئی۔

"سری واہگورو جی کی فتح"

پالی نے جواب دیا۔

بہت قریب پہنچ کر پالی کو معلوم ہوا کہ جنتو چولہے کے آگے بیٹھی ہے۔ اور چارپائی پر جوالا سنگھ کے علاوہ دو آدمی اور بیٹھے ہیں

جن میں سے ایک ابھی روٹی کھا رہا تھا۔

انہوں نے اسے دیکھتے ہی اس کے بیٹھنے کے لیے چارپائی پر جگہ چھوڑ دی۔

جوالا سنگھ نے للکار کر کہا۔

"سناؤ بیٹا پالی! بہت کم ملتے ہو ..... معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ناکھش ہو ہم سے، نہیں؟"

پالی نے مدھم روشنی میں جوالا سنگھ کے چہرے کو واضح طور پر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

"نہیں چاچا بھلا کہو تم سے ناکھش بھی ہو سکتا ہوں میں ......؟"

"تو پھر آتے نہیں کبھی ......"

"یونہی ادھر اُدھر کے دھندوں میں پھنسے رہتے ہیں۔"

جوالا سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیٹھ پر دھموکا دیا۔ پیار سے اور طنز میں چھپی ہوئی آواز میں گڑگڑایا۔

"اچھا بیٹا اب اپنے چاچا کو بھی چکمے دینے لگے۔ یاد رکھو تو ہمارے ہاتھوں میں پلا ہے ......"

پالی نے یقین دلانے کے لہجے میں کہا۔

"سچ چاچا ..... چکمہ کیسا"

"واہ رے پالی ..... شاباش شاباش ..... بھلا بتا تو تجھے کام ہی کیا ہے ..... کیوں کسی کی وہٹی بھگا لے جانے کی پھکر میں تو نہیں ہوتا۔"

"ہا گورو! ہا گورو!!"

پالی نے گویا اس قسم کے کاموں سے پوری قطعاً لاتعلقی کا اظہار کیا۔

اس دوران میں اس نے دیگر دو آدمیوں کو پہچاننے کی کوشش میں ان کی طرف بڑے غور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا چنانچہ جوالا سنگھ نے حقیقتِ حال تاڑ کر بادل کی گڑگڑاہٹ کے مانند قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"ارے انہیں پہچانتے نہیں .... ہو ہو ہو ..... بھائی یہ ہے جیل سنگھ اور ادھر وہ سادھو سنگھ روٹی کھا رہا ہے ......"

بیشک بھاری چٹان کی مانند بیٹھا ہوا شخص سوائے جیل سنگھ کے اور ہو بھی کون سکتا تھا۔ اسے ایک مرتبہ دیکھ کر زندگی بھر اس کی صورت بھلانا ناممکن تھا۔ اور وہ بھی یقیناً اسے پہچان لیتا لیکن تاریکی کی وجہ سے نہ پہچان سکا۔ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے اس نے کہا۔

— نہیں میں جیل سنگھ کو خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں یہ جرا چاننا (روشنی) کم ہے نا۔ یوں میرے دل میں سوال تو تھا کہ ہو نا ہو یہ جیل سنگھ ہے۔"

اب کے جوالا سنگھ ہنسا تو اس کے بڑے بڑے گول گول کندھے آواز کے زیر و بم کے ساتھ لرزتے رہے۔ نہ معلوم اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ چیتو کی طرف بازو پھینک کر بولا "شتی تو چیتو" جرا دیوا (چراغ) ادھر کر جیل سنگھ کے منہ کی طرف"

جیل سنگھ بھی ہنسنے لگا۔ اس نے اپنے جسم کے گرد لپٹے ہوئے چار خانوں کے کھیس کے اندر ہی اندر بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔

"دیوا ادھر لانے کی کیا جرورت ہے۔ میں دیوے کی طرف منہ کیے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے روشنی کی طرف چہرہ بڑھا دیا۔

جوالا سنگھ بولا

"کیوں بھائی دیکھ لیا"

"ہاں چاچا دیکھ لیا"

"آ گئے کر تو نہ ہو گئے"؟

"بھولا تو اب بھی نہیں تھا پر اس کا منہ تھا جو اندھیرے میں ......"

"آ بھائی جیل سنگھ دیوے کی طرف منہ کر کے ایک بار پھر"

اس پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ہنسی کی ان آوازوں میں جوالا سنگھ کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوئی۔

"اس خوشی میں دونوں ہاتھ تو ملا لو"

ان دونوں نے ہاتھ ملائے، سادھو سنگھ کھانا کھا رہا تھا اس لیے اس نے داہنے کی بجائے بایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

جوالا سنگھ نے اب ذرا سنجیدہ بن کر دریافت کیا۔

"کہو گھر کے لوگ تو اچھی طرح سے ہیں نا؟"

"ہاں سب اچھے ہیں"

"...... تمہاری بھابی اور اس کے بال بچے؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں"

جوالا سنگھ نے جہاندیدہ بزرگوں کے سے لہجے میں کہا۔

"ہے نا ہنسنے کی بات۔ ایک گاؤں کے رہنے والے ہم ان کی خیریت یوں پوچھ رہے ہیں جیسے وہ کہیں پردیس میں رہتے ہوں .... لہنا تو کھیر کام میں غبار رہتا ہے۔ اس کی تو بات ہی جانے دو ہاں کبھی راستے میں بھینٹ ہو جائے تو دو باتیں کر ہی لیتے ہیں بھلا کوئی سندراں سے پوچھے کہ آخر اسے کیا کام پڑے رہتے ہیں ایسے کبھی شکل ہی نہیں دکھاتی آن کر ...... کے دن ہو گئے ہیں بھلا اس کی شکل دیکھے؟ کیوں چنتو تجھے تو خیال ہوگا کچھ"

چنتو نے چولہے سے سلگتے ہوئے اپلے کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

"اس پر کیوں دوش دھرتے ہو، بچاری تو آج ہی ملی تھی ......"

پالی کو ایک لمبی سی جماہی آگئی۔ اس نے جوالا سنگھ کی بے کیف باتوں سے اکتا کر بے معنی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تھا جوالا سنگھ کچھ اور مطلب سمجھا اور سرک کر اس کے قریب پہنچ گیا اس کی بغل میں اپنی کہنی سے ٹھوکا دے کر بولا

"کہو کس کی تلاش ہے"

پالی نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

۱.

"نہیں تلاش کس کی ہوئی مجھے"۔

جوالا سنگھ نے ایسے سر ہلا دیا جیسے وہ سب کچھ سمجھتا ہو۔

"وہ یہاں نہیں ہے"

پالی نے قریب سے جوالا سنگھ کی ڈاڑھی کے گھنے اور کھردرے بال اور اس کا انداز بیان دیکھ کر شرارتاً یونہی کہہ دیا۔

"بس چلی گئی جہاں سے آئی تھی"

اب پالی کو معلوم ہو گیا کہ جوالا سنگھ کا اشارہ کسی عورت کی جانب ہے۔ اس کی آنکھوں تلے پیارو کی صورت گھوم گئی۔

جوالا سنگھ نے خوب اچھی طرح دانت نمایاں کرتے ہوئے کہا

"بچاری بہت یاد کرتی تھی تمہیں"

پالی نے قدرے اشتیاق سے پوچھا۔

"واقعی بہت یاد کرتی تھی"؟

"تو کیا میں جھوٹ کہتا ہوں"

یہ کہہ کر جوالا سنگھ نے منہ قدرے زیادہ اوپر کو اٹھا دیا اور اس کے نتھنوں کے غلیظ بال نمایاں ہو گئے۔

پالی کو پیارو کی صورت یاد آئی تو دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ کیسا بانکا جسم تھا پیارو کا۔ سر سے پاؤں تک گٹھا ہوا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے یونہی شیخی میں آ کر اسے چھونے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ مت سنگھ پر یہ بات ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے زیر کر کے بھی پیارو سے دست بردار ہو سکتا تھا۔ لیکن اس جذبے سے بھی مضبوط تر جذبہ ایک اور تھا اور وہ تھا اس کا سسرزل سے پیار۔ عشق کے مدار میں یہ بھی ایک قربانی تھی۔ ان باتوں کو سوچ کر اس کا غم غلط ہونے لگا اور بالآخر اسے اس بات پر خوشی محسوس ہوئی اس نے اچھا ہی کیا جو اس حرامکار عورت سے ملوث نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ ہزار جان سے اس بات پر آمادہ تھی۔ پیارو کی بابت اس کا اشتیاق دفعتاً بھڑک کر ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن اس نے سلسلہ کلام جاری رکھنے کے خیال سے پوچھا۔

"پھر تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ وہ کہاں گئی ہے"۔

نہیں دھرم سے مجھے اس بات کا کوئی پتہ نہیں۔ بھلا تجھے بتا دینے میں میرا کیا حرج تھا۔

"اور وہ آدمی ..... ماتا کے داگون والا ..... کیا نام تھا اس کا مت سنگھ"

"وہ بھی تو اس کی دم سے بندھا ہوا ہے"۔

پالی کو اس کے ساتھ اپنی جھپٹ یاد آ گئی۔ اس نے مخصوص انداز سے جوالا سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"مت سنگھ بھی بڑا جہریلا آدمی تھا"

کچھ دیر تک جوالا سنگھ چپ چاپ اپنے دانتوں اور سرخ مسوڑھوں کی نمائش کرتا رہا۔ پھر اس نے زبان نکال کر اس کے سرے سے مونچھ کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن پالی تو نے دو ہاتھ ایسے کھائے کہ سارا جوبن تیری ناک اور مسوڑھوں میں سے بہہ کر نکل گیا۔ پھر تو بالکل بکری بن گیا تھا۔ اسے

تو کچھ گمبھیر ہی نہیں ہوا تھا مگر تم نے ایک ننھے بچے کی سمت کٹار رپے کیسے پھینک دیا ..... کیوں جیل سنگھ؟

جیل سنگھ ان کو سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھ کر ابھی تک چپ تھا۔ اب جو جوالا سنگھ اس کی طرف مخاطب ہوا تو وہ بھی گویا پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔ ڈھول کی طرح بول اٹھا۔

"ہا ہو"

جوالا سنگھ نے قہقہہ لگایا۔

"وہ بھی اودروں کا پلا ہوا اور عادی تھا۔ اس نے سمجھا ہوگا کل کا بچہ ہے ابھی دھول لگاتے ہیں ...."

جیل سنگھ بولا۔

"نہیں پالی کوئی کل کا بچہ تو نہیں دکھتا۔ اب بھلا اس سے تو جوان کیا ہوگا ہماروں میں ایک ہے۔ ٹھیک ہے کرمت سنگھ کو بھی اپنی طاقت پر گمان ہے پر پھر بھی اسے یہ تو دیکھنا چاہیے تھا کہ اس سے اس کا مقابلہ تو ہی نہیں سکتا ....."

اب تک تو سادھو سنگھ روٹی کھا رہا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگوں کے اس قول پر پورے طور پر پابند تھا کہ کھانا کھاتے وقت باتیں نہیں کرنی چاہییں۔ اور اس کا اصل مقصد تو وہ پا نہ سکا تھا لیکن شاید اس یہی کہتا تھا کہ اگر انسان روٹی کھاتے وقت باتیں کرے تو اس کا پیٹ باتوں سے ہی بھر جاتا ہے اور وہ تھالی میں پڑی ہوئی روٹیوں سے پورا پورا انصاف نہیں کر سکتا۔ خیر اب وہ اس کڑی آزمائش سے صحیح و سالم نکل آیا تھا۔ اس نے جھٹ بات کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا۔

"اجی وہ دکھتا کیسے ...... مارے نشے کے ہو رہا تھا۔ تو ..... تم جانو نشے میں آدمی سمجھتا ہے کہ وہ پہاڑ سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔"

جوالا سنگھ کے دل پر اس کی اس نصیحت گفتگو کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اس نے اس کی دبلی پتلی گردن کو اپنے بہت بڑے ہاتھ میں دبوچ کر کہا۔

"کیوں تم تو دیکھ لیتے ہو نا؟"

سادھو سنگھ نے مدرسے میں پڑھنے والے بچے کی طرح گردن اندر کو سکوڑ لی اور عجیب انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا:

"ہاں میں تو دیکھ لیتا ہوں"

جوالا سنگھ نے اس [illegible] میں تو اچھا تماشہ پیش کرتے ہوئے اس کی گردن کو دو تین جھٹکے دے کر اس کا سر اس انداز سے اٹھا دیا کہ پالی کا چہرہ دکھے۔

"نہیں ہمو دیکھ لے اچھی طرح دیکھ"

"ہاں ہاں دیکھ رہا ہوں۔ ارے بھائی مجھے مرزا نہیں بننا ہے جو میں دیکھوں ہی نہ"

پالی کو اس کی "ہی ہی" کرتی ہوئی ہنسی لمبی ڈاڑھی اور بے تکی باتیں مضحکہ خیز صورت بالکل پسند نہ آئی بلکہ اسے کوفت ہو رہی تھی کہ جوالا سنگھ منٹ میں کیوں بے تکی باتیں اور بے معنی حرکتیں کیے جاتا ہے۔

سب کو روٹی کھلا کر چنتو بھی روٹی کھانے بیٹھی تو پالی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"پالی روٹی کھا لے"

"نہیں...... بس میں تو کما کر آیا ہوں۔ باہگورو تمہیں اور دے"

پالی کی اس بات پر جوالا سنگھ جھوم اٹھا۔

"ہاہا...... واہ پالی واہ واہ۔ کیا بات کہی ہے۔ باہگورو تمہیں اور دے۔ پالی، باہگورو ہی سب کو دیتا ہے۔"

جیل سنگھ نے ڈھیلے جوڑے کو ذرا کس کر باندھتے ہوئے کہا۔

"جوالا سنہا بات تو تو نے ٹھیک کہی ہے۔ دینے والا تو باہگورو ہی ہے پر ایسا بھی نہیں کہ آدمی آپ سے تو کرے نہیں اور نری باہگورو ہی پر آس لگائے بیٹھا رہے۔"

جوالا سنگھ کی گردن نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے جب وہ اثبات میں سر ہلانے لگا تو سر کے ساتھ سارا دھڑ بھی ہلنے لگا۔

"ٹھیک کہی۔ ہاں بھائی رہ جی تو پتے کی ہی بات ہے......"

اتنے میں سادھو سنگھ نے مٹی کی انگیٹھی جس میں سوکھے اپلے سلگ رہے تھے چارپائی کے قریب آن رکھی۔ شدت کی سردی پڑ رہی تھی کسی نے انگیٹھی کی طرف ہاتھ بڑھا دیے اور کسی نے پاؤں۔

جیل سنگھ نے پاؤں بڑھایا تو اس کی موٹی، مضبوط اور سڈول پنڈلیاں عریاں ہو گئیں جنھیں دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگ سکتا تھا کہ وہ کتنی طاقت کا مالک ہے۔ ایسے موقع پر سادھو سنگھ بھی مسخرہ چھانٹے بغیر نہ رہ سکا۔ چارپائی کے بجائے انگیٹھی کے قریب پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"باہگورو بھی کسی حیلے سے دیتا ہے آسمان سے نہیں برساتا رہ جی...... کیوں چاچا جوالا سنگھ"

جوالا سنگھ نے آفرین بھیجتے ہوئے کہا

"کیا بات ہے...... واہ وا...... سادھو سنگھ تو پچھلے جنم میں ضرور سادھو ہوا ہوگا...... اس جنم میں بھی پورا حرام جادہ ہے۔ پکا...... کیوں جیل سنگھ سنی ان کی بات؟ مطلب یہ کہ آدمی جب تک کھد کوشش نہ کرے باہگورو اسے کچھ نہیں دے سکتا۔"

"باہگورو کہتا ہے......" جھنڈو نے نوالہ چباتے چباتے دفعتاً رک رک کر کہنا شروع کیا جیسے واہگورو سچ مچ اس کے کان میں یہ بات کہنے کے لیے آیا ہو...... "واہگورو کہتا ہے منکھ (اے انسان) دیکھ میں نے تجھے یہ موکا دیا ہے جو تو اس کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اٹھا لے۔ بعد میں پھر نہ کہیو مجھ سے کہ میں نے تجھے کچھ نہیں دیا......"

تھوڑی دیر تک ہر طرف سے باہگورو باہگورو کی صدائیں آتی رہیں۔ سب لوگ بڑی سنجیدگی سے آنکھیں موندے اس انداز سے بیٹھے تھے جیسے ان کے دل بھگتی رس میں ہچکولے لے رہے ہوں۔ جیل سنگھ کی تقریباً ساری ٹھوڑی کیس میں چھپی ہوئی تھی۔ دفعتاً اس کی آنکھیں اچھیں، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے جوالا سنگھ کی طرف دیکھ کر پر معنی لہجے میں کہا۔

"بھئی موکا تو باہگورو نے اب کے بھی بہت اچھا دیا ہے...... کیوں نہیں۔"

"ہوں ہاں...... کیوں نہیں۔"

اس کے بعد پھر ایک طویل خاموشی طاری ہو گئی اور بالآخر جب پھر تھوڑی بہت گفتگو شروع ہوئی تو جوالا سنگھ اٹھا اور پالی کو اشارے سے اپنے ساتھ لے گیا۔ پہلے وہ خراس پر گئے۔ وہاں جوالا سنگھ نے کام کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اس نے وہاں

ان لوگوں سے وہ چار باتیں کیں اور پھر پالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر احاطے کے ایک گوشے میں چھپر کٹ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

پالی کو اس کی حرکات اور سکنات ہی سے اس بات کا احساس ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

جوالا سنگھ نے ایک ہاتھ سے گدی کے بالوں کو سمیٹ کر اوپر کیا اور منہ پالی کے چہرے کے قریب لا کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"ایک گھر تاڑا ہے۔"

پالی کو اسی قسم کی بات کی توقع تھی۔ اس نے ابھی تک غور نہیں کیا تھا کہ اگر اس قسم کا کوئی پروگرام بنا تو اس میں وہ کس حد تک حصہ لے سکے گا۔ چنانچہ اب اس نے دل ہی دل میں اس پر غور کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہے"

جوالا سنگھ نے اپنے منہ کے آگے ہاتھ کی اوٹ کرکے تاکہ کسی اور کے کان میں بھنک نہ پڑ جائے آہستہ سے کہا۔

"ساہوکار ہے اور بہت ہی موٹی اسامی۔"

پالی خاموش رہا

"اپنے ضلعے کا سب سے بڑا ساہوکار ہے معمولی آدمی نہیں ہے جو ایک دو پیچ داؤ چل جائے تو بس کچھ بیڑا پار ہے۔ جیل سنگھ کی شادی ہونے والی ہے نا۔ اسی لیے وہ اپنی عورت کے لیے وہاں سے گہنے لانا چاہتا تھا تم جانو اس کے ہاں ایک عورت کا زیور تو نہیں ہو گا نا؟ نہ معلوم کتنی عورتوں کا زیور ہو۔ بس ہم لوگوں کی چاندی ہی چاندی۔ زیور، نقدی، کپڑے جو ملا ہم۔ جیل سنگھ کی نظروں میں سما گئے ہو۔ مجھ سے کہتا تھا کہ لڑکا اچھا ہے اسے لے چلنا چاہیے۔ دو چار بار جائے گا تو ہاتھ میں صفائی آ جائے گی۔ تم نے جو اس روز جیت سنگھ کو دو ہاتھ دکھلائے نا۔ تو بس اسی دن سے اسے تم سے پریم ہو گیا ہے۔ سمجھے۔ بڑا نیک آدمی ہے۔ اس کے ساتھ تمہارا دوستانہ ہو جائے گا تو بس عیش سے دن کاٹو گے دیکھو بھیا تمہارے باپ کے ساتھ بھی میرا یہی معاملہ چلتا تھا۔ لیکن وہ تھا بڑا دبنگ۔ اس کام میں جرا سنبھل کر پیر اٹھانا چاہیے۔ آگا پیچھا خوب اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے یہ بڑے پتے کی بات کہہ رہا ہوں۔ زندگی کا نچوڑ ہے جو آدمی ڈھب سے چلتے ہیں ساری عمر عیش کرتے ہیں۔ لہنا سنگھ کے باد اتنے سال ہو گئے ہم ایسی صفائی سے یہ کام کرتے ہیں کہ کبھی بال نہیں بیکا ہوا۔ یہ بات نہیں کہ کسی کو اس بات کا پتہ نہ ہو۔ سب جانتے ہیں کہ ہم یہ کام کرتے ہیں ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں اور بیچ کھیت کے کرتے ہیں لیکن کیسے کرتے ہیں یہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ کبھی پلس (پولیس) کے کابو آ جاتے ہیں۔ تو دو چار دن جوتے پڑتے ہیں۔ لیکن یہاں تو یہی معاملہ ہے کہ دو ٹکیاں بسترگیاں۔ یاراں دیاں دور بلائیں (دو گئیں اور بھول گئیں یاروں کی مصیبتیں دور) بہت سے جالم تھانیداروں سے نپٹ چکے ہیں۔ اپنی ...... تک کا زور لگا کر مر جائیں ہم نے کبھی اکبال ہی نہیں کیا۔ نہ کبھی چوری کا مال پکڑا گیا نہ کوئی ہتھیار۔ آخر ہم بھی تو بالک کچھ نہیں ہیں نا جو ان کے کابو میں آ جائیں۔ ہمارے پاس بہت چیج موجود ہے پر کہاں ہے یہی تو ان کو معلوم نہیں ہو سکتا......"

پالی چپ چاپ سنتا رہا۔

جوالا سنگھ نے تھوڑے سکوت کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

"پہلے پہل دل کو کچھ کھٹکا معلوم ہوتا ہے پھر کچھ بھی نہیں۔ آخر کو تم بھی دنیا دیکھے ہو۔ کوئی بالک تو نہیں۔ سب باتیں سوچتے اور سمجھتے ہو۔ اتنے دنوں سے گاؤں میں آئے ہوئے ہو۔ دو چار روز کو باہر چلے جائیں گے۔ گھومنا پھرنا بھی ہو جائے گا اور کام بن گیا تو سمجھو کہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام پھر آ کر عیش کرنا......"

جوالا سنگھ سبز باغ تو خوب دکھا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چونکہ پال کو پہلے کبھی ایسے کام میں حصہ لینے کا موقعہ نہیں ملا اس لیے وہ کچھ ہچکچا رہا ہے۔ لیکن پال کو اس قسم کی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ اس طرف تو اس کا طبعی رجحان تھا۔ جن کاموں میں وہ ہاتھ ڈال چکا تھا وہ بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھے۔ حقیقتاً ڈاکہ، جھگڑائی مار پیٹ۔ قید و بند بلکہ موت تک کا خوف اسے کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا۔ ایسے پروگرام میں حصہ لینے پر اسے اعتراض بھی کیا ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ سب سے آگے سینہ تان جانے کو تیار تھا۔ اگر اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ کے آثار نظر آ رہے تھے تو محض اپنے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جب سے وہ گاؤں میں آیا تھا اس نے اس قسم کی صحبت اور اس قسم کے کاموں سے عمداً احتراز کیا تھا۔ اب وہ تذبذب کی حالت میں تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

جوالا سنگھ اس کی خاموشی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

"ارے بیٹا۔ اس کام میں مشکل ہی کیا ہے جو تم ایسی گہری سوچ میں پڑ گئے ہو۔ جو آدمی ہمارے بیچ میں ہے مادھو سیٹھ کی سب باتوں کا بھیدی ہے ہم یہ سوچے ہوئے ہیں کہ کام ختم کرنے کے بعد اسے بھی مار ڈالیں گے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ پھر کون جانے کہ کس نے ڈاکہ ڈالا۔ پولیس کے آدمی ادھر ادھر پاگل کتوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ لیکن ہمیں نہیں پا سکیں گے۔ ارے بھائی اندر دس ہزار تو ایک آدمی کے حصے میں جو نہی، یونہی) آ جائے گا تو بھی اس روپے سے اپنی زمین خرید لیجیو اور بڑے عیش سے رہیو۔"

جوالا سنگھ نے آخری فقرہ کچھ ایسے کہہ دیا جیسے اس نے پال کے دل کا حال کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا ہو۔ اس کی ساری لمبی چوڑی باتوں کا پال کے دل پر اتنا اثر نہیں ہوا جتنا کہ صرف اس ایک بات کا ہوا۔ پال کے تخیل کو گویا پر لگ گئے۔ زمین خریدنے کے واسطے روپیہ حاصل کرنے کے لیے وہ دنیا کا کوئی کام بھی کرنے کو تیار تھا۔ سرلا کے ماں باپ کے دل میں اس کے سوا اور کوئی بات بھی نہیں تھی۔ وہ لوگ اتنے دنوں سے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ ادھر پال زمین خریدے ادھر وہ اس کے ساتھ سرلا کا بیاہ کر دیں۔ لیکن پال زمین کہاں سے خریدے۔ جیب میں روپیہ ہو تبھی نا۔ روپیہ درختوں کے ساتھ نہ لگتا تھا کہ وہ جا کر توڑ لائے۔ آسمان سے نہ برستا تھا کہ وہ جا کر بٹور لائے .... پھر دفعتاً پال کو احساس ہوا کہ خود واہگورو اکال پرکھ نے اسے مشکل میں دیکھ کر اس کے لیے یہ سنہرا موقع پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اب بھی چوک گیا تو پھر اس کی قسمت۔ کیا تعجب آج سے چند روز بعد سرلا کے ماں باپ کے کانوں میں یہ بات جا پڑے کہ سردار پال سنگھ زمین اور دو جوڑی بیل خرید رہا ہے۔ یہ سنتے ہی نرنجن سنگھ دوڑا چلا آئے گا۔ باتوں باتوں میں تفصیلات پوچھے گا۔ پھر وہ اسے اپنے گھر بلائیں گے۔ جنداں اپنے مخصوص انداز میں اس سے میٹھی باتیں کرے گی۔ اور یہ تلخی پال سنگھ اس طرح غائب ہو جائیں گے جیسے آندھی کے آگے خس و خاشاک۔ اور پھر کسی کو اس بات کا علم تک نہ ہو گا۔ آخر کسی کو خبر ہو ہی کیونکر سکتی ہے۔ کسی بہانے سے مثلاً یہ کہ اس کا ایک دوست کلکتے سے امرتسر میں آیا ہوا ہے وہ اس سے ملنے کے لیے جا رہا ہے۔ بس اسی دوران میں سارا کام ختم کر کے واپس آ جائے گا۔ جو ماں پوچھے گی کہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا تو وہ کہہ دے گا کہ برما میں ایک دوست کے پاس اس کا روپیہ موجود تھا اب وہ برما سے واپس آیا ہے تو اس نے روپیہ بھیج دیا۔ یا اسی قسم کا کوئی اور بہانہ لگا دے گا۔ آخر گھر والے پیچھے تو نہ پڑ جائیں گے کہ گھر میں روپیہ کیوں آ گیا۔ انہیں تو روپے سے کام۔ اس بات سے غرض ہی کیا کہ کہاں سے آیا۔ ماں کو تو معلوم ہی ہے جیسے اس کا باپ گھر میں روپیہ لایا کرتا تھا۔

پال اپنی سوچ بچار میں گم تھا۔ اور جوالا سنگھ اس کی پُراسرار خاموشی پر کچھ پریشان ہو رہا تھا۔ وہ اس دوران میں بڑے بھدے ایسے منہ میں زبان کو گھماتا پھراتا رہا۔ پھر دھندلی روشنی میں دونوں کی نظریں ملیں۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ وہ دونوں ایک ہی میدان

سے ششدر ہیں۔ پال حلق کی پچکاری چھوڑ کر مسکرایا اور جوالا سنگھ کی باچھیں چر گئیں۔ خاموش ہنسی کے ہر قہقہہ پر اس کے رخسار جو ابھرے تو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی دکھائی دینے لگیں۔ یہاں تک کہ بالآخر رخساروں کے ابھار اور بھنوؤں کے درمیان میں وہ محض دو بلوں کی مانند دکھائی دینے لگیں اور وہ ہاتھ بڑھا کر پال کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

بالا سنگھ نے اطمینان سے زمین میں گڑے ہوئے لکڑی کے ستون سے پیٹھ ٹیک کر پوچھا۔

"کس روج"؟

"بس۔۔۔۔ کل نہیں تو پرسوں۔۔۔۔ ۔۔۔ اندر چل کر جیل سنگھ سے بات چیت کر لیں گے"

پال نے ذرا سے آگے جھک کر پوچھا۔

"تم نے وہاں کی تسلی کر لی ہے نا اسامی کیسی ہے۔"

جوالا سنگھ نے چٹکی بجا کر کہا۔

"ارے اسامی کی کیا پوچھتے ہو سردار نے گھر کا۔ میں خود جا کر وہ گھر دیکھ آیا ہوں ساہوکار ہے ساہوکار۔ بڑا جبر جست مال ہاتھ لگے گا چل کر تماشہ تو دیکھیو"

"اچھا تو تم نے کھد دیکھ لیا ہے گھر"

"ہاں بھئی کھد" پھر جوالا سنگھ نے آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے کہا۔

"کھد ان آنکھوں سے دیکھا میں نے۔۔۔۔"

اب پال کا شوق تیز ہونے لگا۔

"اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہاں گاؤں ہی میں مال ہے سب"

"ہاں بھئی وہ اپنے گھر ہی میں رکھتا ہے لین دین کا کام ہے۔۔ اور [illegible] گہنا سب اس کے پاس ہی رہتا ہے۔"

"تو یہ سب باتیں اس بھیدی نے بتائی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ ایک بات اور بھی تو ہے۔ اُن نے گھر میں بندوک (بندوق) بھی ہے۔ جو ان کے گہنا دہنا نہ ہو تو بتاؤ بندوک رکھنے کی کیا جرورت ہے۔"

پال نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا

"یہ بندوک والا معاملہ ٹیڑھا ہے برا۔۔۔۔۔۔۔"

جوالا سنگھ اپنا منہ اس قدر قریب لے آیا کہ پال کو اپنی گردن پر اس کے منہ سے نکلتی ہوئی گرم گرم ہوا کا احساس ہونے لگا۔ جوالا سنگھ نے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ پھر اس کے بندھے ہوئے ہونٹ ہلے۔

"بھیدی کی جبانی معلوم ہوا ہے کہ ان کی بندوک بگڑ گئی تھی اس لیے مرمت کے لیے شہر بھیج دی گئی ہے۔ اب پانچ سات روج سے پہلے نہیں آئے گی اور ہم اس سے پہلے ہی سارا کام ختم کرا لیں گے۔۔۔۔"

پال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دل میں جوالا سنگھ کی ہوشیاری کا قائل ہو گیا لیکن جوالا سنگھ اب بھی اسی انداز سے اس کی

تغروں سے نظریں ملائے ہوئے تھا پھر اس نے ناک کی پھنکار کی سی آواز میں کہا

"پالی! ہمارے پاس بھی تو ہوگی بدوک!"

پالی کا دل مارے خوشی کے اچھلنے لگا۔ اس نے منہ پھیلا کر اظہار تعجب کیا۔

"اچھا"؟

"ہاں بیٹا! میں نے سب پاپڑ بیلے ہوئے ہیں، ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں"

پالی نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔

"چاچا واقعی تم اکل بند (عقلمند) آدمی ہو"

جوالا سنگھ نے بھی خوش ہونے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

"تم جوا تماشہ تو دیکھنا...... ارے جب تیرا باپ جندہ تھا تو بڑے بڑے میدان مارے تھے ہم نے جب سے تو آیا تھا میں سوچ رہا تھا کوئی موکا پڑے تو ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔ تو تو بالکل اپنے باپ کا روپ ہے۔ وہ تیرے برابر اونچا نہیں تھا۔ ٹھراب وراب بھی بہت پیتا تھا لیکن پھر بھی بڑا جور تھا اس کے بدن میں۔ ارے اس کی تو آواج بھی ایسی تھی جیسے شیر کی گرج۔ سننے والے کی گھگی بندھ جاتی تھی...... جوا ایک پلٹ...... ٹھہرے رہو۔ میں گھر اس تک ہو آؤں......"

جوالا سنگھ خراس کی طرف گیا۔ لپرائی کا گیہوں علیحدہ چھاج میں دھرا تھا۔ اسے دیکھ کر جوالا سنگھ نے بڑے اطمینان سے سینہ کھجایا۔ کام ہوتے جانے پر اعتراض کیا:

"بھئی جوالا سنگھا! یہ ساندنی بہت بڈھی ہوگئی ہے اس سے تو چلا ہی نہیں چلا جاتا اور چکی کے پتھر بھی ٹھیک کام نہیں کرتے۔

جوالا سنگھ نے خوش طبعی سے ہنستے ہوئے۔

"ہو ہو...... ہا ہو... یار اب یہ کام بھی کروا ڈالیں گے۔

اس کے بعد جب جوالا سنگھ کا آدمی گیہوں کا چھاج لے کر گھر کے اندر گیا تو پالی بھی اس کے قریب چلا آیا۔ جوالا سنگھ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہگورو اکال پرکھ نے آسمان میں تارے بھی کیا خوب بنائیں۔ جب آدمی کا جی گھبرا جائے تو آسمان کی طرف دیکھنے لگے...... ہو ہو نہ معلوم کتنے تارے ہوں گے کیوں پالی ہجار سے کم تو کیا ہوں گے"

پالی کو تاروں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کچھ جواب دیئے بغیر گاڑی پر بیٹھ گیا۔ اور وہ اس کے بوجھ تلے چرچرانے لگی۔

جوالا سنگھ نے اسے اپنی دھن میں گم پا کر اپنے آدمی کو آواز دی۔

"ہو لیکھا ہو"

"ہو"

"ارے باہر آ کہ تو اندر ہی مر گیا"

بھا بہت غلیظ اور سست آدمی تھا۔ اس نے صحن کے دروازے ہی سے گردن نکالتے ہوئے کہا۔

"ہو تو میرے پیچھے کیوں پڑ جاتا ہے......"

جوالا سنگھ نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاچی کو طویلے میں باندھ دے جلدی سے۔ حرام جاوے بڑے تخم"

دبلا پتلا بھا بڑبڑاتا ہوا سانڈنی کی نکیل پکڑ کے اصطبل کی طرف لے گیا۔

جوالا سنگھ نے پال کو اشارہ کرتے کہا۔

"آؤ اندر چلیں۔ اب سردی میں اس جگہ بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ دونوں صحن کی طرف بڑھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے جوالا سنگھ نے گھوم کر پیچھے کو آواز دے کر کہا۔

"بھیمے ہوئے۔ باہر کا دروازہ بند کر لیجیو سب اچھی طرح سے۔"

"ہوں" ادھر سے آواز آئی۔

پھر دونوں صحن کے اندر داخل ہوئے۔ باورچی خانے کی محفل برخاست ہو چکی تھی۔ جیل سنگھ کھڑکیوں کے قریب بیٹھا پیشاب کر رہا تھا۔ سادھو سنگھ ایک آوارہ کتے کو روٹی کے ٹکڑے ڈال رہا تھا۔ چنتو ایک عرصے ہی سے غائب تھی۔ شاید جب وہ دونوں خراس سے ذرا پرے چلے گئے تھے اس وقت چنتو ان کے علم کے بغیر ہی ادھر سے گزر کر باہر چلی گئی تھی۔

جیل سنگھ جب اٹھ کھڑا ہوا تو پال کو اندازہ ہوا کہ اس کا ڈیل ڈول کس قدر زبردست ہے۔ دیو کا دیو معلوم ہوتا تھا۔ وہ تہبند کے نیچے اپنے کچھرے کا ازار بند باندھتے ہوئے ادھر آیا۔ اس نے پُرمعنی نظروں سے جوالا سنگھ کی جانب دیکھا۔ جواب میں جوالا سنگھ کے گوشت سے پُر چہرے پر کئی نشیب و فراز پیدا ہوئے۔ اور پھر اس کی گردن بمشکل ہلی اور منہ کھلا۔

"بس ہو گیا کام"

پال کو اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

جوالا سنگھ نے آنکھ مار کر کہا

"لونڈے کو گرو منتر دے دیا ہے میں نے"

جیل سنگھ نے دوستانہ انداز میں اپنا بھاری بھرکم ہاتھ جوالا سنگھ کے کندھے پر رکھ دیا۔

سادھو سنگھ نے ان کی باتیں سنیں تو وہ بھی قریب کھسک آیا۔ اور پھر وہ آپس ہی بات چیت کرتے ہوئے پسار میں چلے گئے۔

جوالا سنگھ نے پوچھا

"چنتو کہاں گئی ہے؟"

سادھو سنگھ نے ڈکار لے کر کہا۔

"دو گھڑی کے لیے باہر گئی ہے"

پھر سادھو سنگھ کے سوا سب چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اور سادھو سنگھ اچک کر اوپر تلے دھری ہوئی گیہوں کی بوریوں پر چڑھ بیٹھا۔

جوالا سنگھ بولا

"اے سادھو سنگھ جرا انگیٹھی ہی لے آنا اندر"!

سادھو سنگھ نے بچوں کی طرح کندھوں کو حرکت دے کر جواب دیا۔

"بھاپا! اب کولے جانے چکے ہیں"

جوالا سنگھ نے بھنویں تان کر اس کی طرف دیکھا

"بے بابا وانہ ہوتو......"

سادھو سنگھ نے تیور بدلتے دیکھا تو بے دلی سے پوڑیاں پر سے نیچے اتر آیا۔ باہر نکلتے نکلتے بڑبڑایا۔

"بھینسے کی سی موٹی چمڑی ہے...... سردی سے مر تو نہ جائے گا۔

یہ حقیقت تھی کہ ان میں سے سردی کے مارے کوئی بھی مرنے والا نہیں تھا لیکن جوالا سنگھ کو تو مہمانوں کی خاطر داری منظور تھی نا۔

آخر کار سادھو سنگھ مٹی کی انگیٹھی میں چند سوکھے ہوئے اپلے سلگا کر لے آیا۔ اور اسے چارپائی کے قریب رکھ کر پھر اوپر چڑھ بیٹھا۔

جوالا سنگھ نے اسے بندر کی طرح بیٹھا پایا تو بولا

"پتر! جو اوپر سے کھسک گئے تو دھڑام سے نیچے آن رہے گا۔ ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔ یہ چونچ سی ناک پچک جائے گی"۔

جیل سنگھ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"اے چھوڑ ہرامجادے کو...... کوئی کام کی بات کر"

جوالا سنگھ نے فوراً بات کا رخ بدلتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بھائی پالی کی کسر تھی سو پوری ہوگئی۔ وہ ہمارے ساتھ چلے گا میں نے تجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ اپنا بیٹا ہے جانے پر تیار ہو جائے گا...... بس ہمارے کہنے کی دیر تھی۔"

جیل سنگھ نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"یہ تو مجھے لوم تھا لیکن پھر بھی میں نے سوچا ابھی ناتجربے کار ہے شاید ایسے کام سے گھبراتا ہو۔"

"ہو ہو —— تم اسے ناتجربے کار سمجھتے ہو۔ یار کیا بات کہہ دی تم نے اس روز اپنی آنکھوں سے اس کے ہاتھ کی صفائی دیکھ چکے ہو پھر بھی......"

"نہیں بھئی اتنا تو میں مانتا ہوں کہ وہ بڑا کرارا جوان ہے اگر اس دن لڑائی نہ بھی ہوتی پھر بھی اس کی صورت سے انداجا لگ سکتا ہے میں بھی شکل سے آدمی کو پہچان لیتا ہوں۔ اگر میرے دل میں اس کے لیے پریم نہ ہوتا تو بھلا میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تمہیں اتنی بار نہ کہتا..."

جوالا سنگھ نے زور سے سر ہلا کر کہا

"ہو تو ٹھیک ہے۔ پر تمہیں علم نہیں پالی بڑا جگرت ہے کلکتے میں اس نے بڑے ہاتھ مارے ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر گوروں کی پھوج سے ٹرک چرا چرا کر لاتا رہا۔ اب تو ہمارا ساتھ رہے گا تب دیکھنا اس کے ہاتھ......"

پالا یہ سب باتیں سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے انکسار سے کام لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ دانتوں کی نمائش کرکے دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے دانتوں کی درز سے تھوک کی پچکاری چھوڑ دی۔

جوالا سنگھ نے اپنی چھوٹی لیکن موٹی گردن کو بمشکل آگے بڑھاتے ہوئے [illegible] رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"اچھا بھائی جیل سنگھ! اب یہ بھی بتا دو کہ کس دن جانا ہوگا، کل کتنے آدمی ہوں گے ہمارے ساتھ کیا کیا سامان ہوگا کچھ اس کا اندازہ بھی ہے۔"

جیل سنگھ نے دونوں بازو آپس میں پھنسا کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک دیں۔

"اب تجھے کتنی دفعہ بتانا ہوگا کہ بڑا مالدار ساہوکار ہے تجھے تو گھر بھی دکھا دیا ہے اب پھر وہی پرانی بات پوچھے جاتا ہے......"

"ارے نہیں یار اپنے لیے نہیں جو پالی کو بتا دے نا مجھے تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔"

پالی کا بھی بہانہ تھا۔ ورنہ در اصل مال و دولت کا ذکر بار بار سن کر خود اسے حظ محسوس ہوتا تھا۔ اس نے پالی کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔

"لو بیٹا پالی سن لیا۔ میں نے کچھ جھوٹ نہیں کہا تھا...... ہاں یار تو پھر کس روز کا خیال ہے۔"

جیل سنگھ نے دماغ پر زور ڈال کر دو چار لمحے غور کیا۔ اور پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا

"ہمیں کل شام کے دھندلکے میں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ رات رات ہم کاہن سنگھ کے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"بھئی کاہن سنگھ کون ہے"

"ارے نہیں اتنا بھی یاد نہیں۔ ننکانے صاحب کے میلے پر جو وہ خوب صورت سا آدمی تھا نا۔ ارے بھائی جب ہم سب نے بھنگ پی تھی اور کاہن سنگھ کو ایسی ہنسی چھوٹی کہ بس توبہ ہی بھلی....."

جوالا نے ذہن پر زور ڈالا لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ جیل سنگھ نے بے چین ہوکر کہا۔

"جس کے دانت بہت بھدے تھے۔ تیس برس کی عمر ہوگی بھورے رنگ کی ڈاڑھی تھی اس کی....."

"اوہ ہاں..... یاد آگیا۔ تم ہی نے بتایا تھا نہ شاید کہ اسے ایک عورت نے بیٹا بنا لیا تھا۔"

"ہاں ہاں بس وہی...... بڑا چلتا پرزہ ہے۔ وہ عورت جس نے اسے بیٹا بنایا ہے رنڈوی تھی اکیس بائیس برس کی۔ مزاج چنچل تھا اس کا کچھ مال بھی تھا ادھر کاہن سنگھ یتیم تھا لیکن بڑا حرام کا تخم تھا۔ عورت نے اسے بیٹا بنا لیا۔ دو چار برس بعد جب اس کی ڈاڑھی مونچھ پھوٹنے لگی تو ایک رات اندھیرے میں اس عورت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا، وے کاہن یہ کیا کرتا ہے۔ تو اس حرامی کے پلے نے جواب دیا۔ بے بے جرا دیر بعد پوچھ لیتی تو تیرا کیا بگڑ جاتا" اس پر عورت نے نہ اسے کچھ کہا اور نہ کوئی سوال جواب کئے......"

"ہو ہو...... ہو ہو ہو...... ہا ہا ہا"

وہ سب قہقہے لگانے لگے۔

جوالا سنگھ نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔

"جب کمانے پینے کو گھر بار ہے تو پھر ایسے کاموں میں کیوں پڑتا ہے وہ"

"ارے ہمارا تمہارا بھائی ہے نا وہ۔ بس لت پڑ گئی۔ ویسے ہے بھی بڑا رسیا آدمی۔ اب چلو گے تو پھر معلوم ہوگا۔"

پالی نے پوچھا

اچھا تو وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔"

"جمدور بڑا کام کا آدمی ہے ایک بار ملو گے تو کہو گے کہ ایسا روح والا آدمی نہیں دیکھا۔ وہ خود بھی کہتا ہے میں تو روح والا آدمی ہوں۔ ہاں ابھی چاروں کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے۔ اور واہگورو اکال پرکھ سب کا رکھوالا ہے۔"

جوالا سنگھ اس وقت واہگورو اکال پرکھ کی باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے پھر حقائق کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں تو ہم کتنے آدمی ہوں گے......"

جیل سنگھ نے حساب لگا کر کہا

"کل چودہ آدمی ہوں گے"

"چودہ"

"ہاں چودہ...... لیکن بے فکر رہو سب کو برابر کا حصہ نہیں ملے گا۔ ان میں سے بہتیرے تو میرے چیلے چانٹے ہیں۔ اور پھر ہمارا خیال یہ ہے کہ گاؤں میں اور دو چار آدمیوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا جائے۔"

جوالا سنگھ نے کہا۔

"چنتو بھی تو ہوگی"

"اچھا چنتو ساتھ چلے گی...... بڑی ہشیار ہے وہ بھی ان کاموں میں"

"ہاں وہ تو میں بھی جانتا ہوں...... چنتو کو ملا کر کل پندرہ......"

"اور بھیدی"

"ارے ہاں اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔ بس سب ملا جلا کر سولہ ہو جائیں گے۔ سولہ کے سولہ گاؤں میں داخل ہو جائیں گے سب کے سب مجبوط اور ہشیار۔ باقی رہا سادھو سنگھ تو وہ مرگھٹ یا قبرستان کی جھڑ بیریوں میں سانڈنیوں کی رکھوالی کرے گا۔"

"اچھا تو اگر ہم کل شام ہی کو چل دیئے تو سانڈنیوں کا انتظام کون کرے گا"

"بے فکر رہو یہ سب کام کاہن سنگھ کے پاس پہنچ کر ہو جائیں گے۔ ملک میں نے تو اسے پہلے ہی سے خبردار کر دیا ہے۔ وہ بڑا ہی پکا آدمی ہے سب کام ٹھیک ٹھاک کر دیگا" جوالا سنگھ نے اطمینان سے سر ہلایا۔

اچھا تو کل شام کو چل دینا چاہیے...... سن لو پالی! کوئی بہانہ گھڑ رکھو گھر والوں کے لیے"

پالی نے مسکرا کر جواب دیا۔

تم بے فکر رہو چاچا!"

جوالا سنگھ گدھ کے پروں کی طرح اپنا کھیس پھڑپھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا تو کل رات ہم وہاں پہنچے تو اصل کام کس رات کو کیا جائے گا"

"بس پرسوں ہی ـــــ اور کب؟"

"ہاں بس ٹھیک ہے۔"

پال نے لقمہ دیا

"بھلے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

پال کے دوستوں رشنے، گپتے اور داب کا ذکر بھی آیا لیکن بالاتفاق رائے سے طے ہو گیا کہ وہ اتنے اہم کام میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں۔

دل کی پیاس

خدیجہ مستور

گھبرائی، میلا چکٹ برقع سمیٹتی پڑتی اپنی ماں کے پیچھے چلی آرہی تھی۔ سارے راستے ٹھوکریں کھائیں۔ ایک ذرا قدموں کی طرف دیکھ کر چلتی تو بھلا انگوٹھا زخمی ہوتا۔ نظریں کٹی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈول رہی تھیں۔ بازار مخلوق سے بھرا ہوا تھا اسے تو یہ بھی خیال نہ رہا کہ اگر کسی مرد کا دھکا لگ گیا تو کیسی شرم کی بات ہوگی۔ بس پھڑکتے ہوئے کپڑوں پر رال ٹپکی پڑتی۔ چھوٹے بڑے گھروں کی بے شمار عورتیں بازار میں آجا رہی تھیں پھر بھی وہ دیکھ دیکھ کر ٹھٹکتی۔ انگوٹھا کمبخت ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ اماں کے خیال سے اُف تک نہ کی۔ الٹا ڈانٹیں کہ اللہ نے منہ پہ آنکھیں نہیں دیں۔ اب اس کی اماں کو کون سمجھاتا کہ اللہ نے منہ پہ آنکھیں دیکر ہی تو غضب ڈھایا ہے۔ ان آنکھوں ہی نے تو اسے جنم جنم کا ندیدہ بنا دیا ہے۔ جب ذرا مٹر مٹر چلنا سیکھا تو گھر کے باہر پیپل کے پیڑ تلے جا بیٹھتی۔ بنیاں، ٹھکرانیاں لہنگے اور ساریاں پہنے، لمبی سی گھونگھٹ مارے چھم چھم کرتی باہر نکلتیں تو انہیں ٹکر ٹکر دیکھا کرتی۔ بھولی بھالی، عید بقر عید نئے پھڑکتے ہوئے کپڑے پہن کر اتراتے پھرتے۔ اسے عید پہ نیا کپڑا ازل ملتا مگر وہی گاڑھے سوسی کا جوڑا اوپر سے مل کی چھوٹی سی لال اوڑھنیا۔ سات آٹھ سال کی ہوئی تو عید پر شروع کی کہ ہم تو دل کی پیاس کا جوڑا پہنیں گے۔ اماں نے لاکھ سمجھایا بجھایا مگر وہ مچلے گئی آخر کو پکڑ کر پیٹ دیا کہ باوا تو مشکل سے سارا دن میں روپیہ بارہ آنے کماتا ہے اور بیٹی کو دل کی پیاس بجھانی ہے۔ ایک روپے میں دنیا کے ٹنٹے کرنے ہوتے۔ اسی میں جہیز اور شادی کے لیے بھی جمع کرنا ہوتا۔ اللہ نے ایک ہی اولاد دی وہ بھی بیٹی۔ کبھی کبھی تو اماں کلیجہ پھاڑ کر روتی۔ پر اسے ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہ کرتی تھی ہر آٹھویں دسویں دن بکھر جاتی ہم تو آنکھ کے نشے کی قمیض پہنیں گے۔ قمیض تو نہ ملتی مار چند دن کے لیے آنکھ کا نشہ آنسوؤں میں بہہ جاتا۔

جھک کر دیکھا تو انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا۔ درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں زمین پر بیٹھ جائے۔ اب تو بھرے بازار سے بھی نکل آئی تھی اور کوٹھری بھی بس دو چار قدم ہی رہ گئی تھی۔ سامنے سے دو عورتیں پھڑکتے ہوئے کپڑے پہنے اتراتی بازار کی طرف جا رہی تھیں اس نے نقاب الٹ کر ادھر دیکھا۔ عورتیں تو گزر ہی چلی گئیں مگر سامنے کھوکھے میں بیٹھے ہوئے بنواڑی نے کنکھار کر آنکھ ماردی۔ کیا پتہ صبح سے بیچارے کی بوہنی نہ ہوئی ہوگی۔

اماں گھبرا کر پیچھے مڑیں۔ نقاب اس سے پہلے ہی ٹھیک ہو چکی تھی "اری سڑک پر تو ہوش سے چلا کر، کیا دکھتا نہیں جالی سے جو نقاب اٹھا دیتی ہے" ـــــ وہ دھیرے دھیرے بڑبڑائیں ـــــ حرامزادہ اپنی اماں بہنیں نہیں جو انہیں تاکے" میں تو ان عورتوں کے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ مجھے کیا پتہ کہ ـــــ مر جائے اللہ کرے"۔ وہ بوکھلا کر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگی۔ ہوش گم ہو رہے تھے۔ اماں کو پیچھے ہی چھوڑ کر کوٹھری کا تالا کھول

اندر گھس گئی۔ ذرا سی کھٹکار سے دم پھونے لگا تھا۔ اپنی آنکھوں میں تو جیسے کونا چبھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

برقع اتار کر پلنگ پر پھینک دیا ——— "بھلا کیا کہیں گی اماں بھی، اپنے محلے میں تو نقاب نہ اٹھانی چاہیے تھی"۔ وہ مارے شرم کے [illegible] کا ورد بھی بھول گئی اور چولہے کے پاس بیٹھ کر اُپلے توڑنے لگی۔ اتنے میں اماں آگئیں، محلے تک بڑبڑا رہی تھیں۔

"اری تجھے بھی مل جائیں گے ریشمی کپڑے، بھلا گزارا ہے کہ کس منہ سے کہتے ہیں برابر کے ایسے شوق۔ غریبوں کی عزت ہی ریشمین کپڑا ہے"۔

[illegible] کا پہلا [illegible] یاد آیا۔ [illegible] وہ سر جھکائے آگ کو تک رہی تھی۔

"کوئی شرم حیا نہ رہی، شہروں پر ایسی پھرتی ہیں، کوئی پوچھے ان کے منہ میں جو سودا سلف لاویں۔ تباہ کر رہی ہیں شریفوں کی بیٹیوں کو"

اماں کی زبان رکتی ہی نہ تھی ——— "جانے کب آئیں گے وہ لوگ، خدا رکھا آ رہے ہیں کہ آج آتے ہیں اور کل، آ بھی چکیں تو دو بول پڑھا کر چھٹی کروں۔ مجھ بیوہ کے پاس کیا۔ کھلانے جس کے لیے تیاریاں کرتی ہیں، رات دن محنت کر کے بیگم صاحب کے پاس سو روپے جمع کرائے ہیں، بس اسی سے دو جوڑے بن جائیں گے، اپنے گھر جو جی چاہے کھائے پہنے" وہ آگ کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گئیں اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

اب اسے بھی غصہ آ رہا تھا۔ اندر ہی اندر کھولنے لگی ——— ذرا نقاب الٹ دی تو کیا ہو گیا ——— ندامت نے چپکے چپکے بغاوت کر دی "کبھی اچھا کپڑا پہنا نہیں نہ گوشت بھی نہ دیکھوں۔ سال میں ایک جوڑا آتا ہے وہ بھی کھادر کا، جاڑوں میں ایسی جوئیں پڑتی ہیں کہ کھجا کھجا کر گھاؤ پڑ گئے۔ بس برسے آئے وہ لوگ، اب انہیں ہندوستان میں نوکری جڑے گی نہیں جو مجھے یہاں کفن دینے آئیں گے"

"اب سالن بھی گرم کر یا یونہی سر پر دھرے بیٹھی رہے گی"۔ اماں کا غصہ اب کچھ کم ہو گیا تھا۔

"کدھر ہے گھی کا ایک قطرہ جو خواہ مخواہ گرم کر کے کھاؤں، منوں گھی جمع پڑا ہے نا"۔ ——— طاق سے مٹی کی دیگچی اتار کر نیچے پٹک دی اور پھر سالن کا پیالہ اس میں اوندھا کر چولہے پر دھر دی۔

"تو ماں سر کی محنت کر کے اور تیرے بھائیوں تلے بھی نہ آیا۔ اب کدھر سے لاؤں گھی کے پیپے"۔ اماں پھوٹ کر رو پڑیں۔ ایک آنکھ کی [illegible] ذرا سی جھپک نے کیسا فساد مچا دیا تھا۔

"بس ذرا سی بات ہوئی اور رو پڑیں" ——— وہ کھل کر ماں کی طرف بڑھی ——— "ذرا ان تھکتی ہو کام کر کر کے اور غصہ نکالتی ہو مجھ پر۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم گھر پر آرام کرو، میں کروں گی نوکری"۔

"ہاں! میں تجھے بھیجوں گی نوکری کرنے، دیکھے نہیں دنیا کے رنگ۔ آج تو تو نے ساتھ جانے کی ضد کی، پر اگلی دفعہ نام بھی لیا باہر نکلنے کا تو کنویں میں پھاند پڑوں گی"۔

"اچھا اب روٹی تو کھلا"۔ وہ ہنسنے لگی۔

"ہائے کیا زمانہ تھا جب اپنے ابا تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ اپنی بیٹی کو پندرھویں سال بیاہ دوں گا۔ اب کیسی روح بے چین ہو گی"۔

اماں نے لمبی آہ بھری۔ اسے بھی اپنے ابا یاد آ گئے۔ کتنا پیار کرتے تھے اسے۔ انہوں نے صرف ایک بار اسے مارا تھا وہ بھی چوری کرنے پر۔ بات بھی تو بری تھی، ٹھاکر صاحب کی لڑکی کا دوپٹہ نہ چراتی تو بھلا ابا اس پر ہاتھ اٹھاتے۔ ہائے کیسا نرم دوپٹہ تھا۔ جیسے منے سے بچے کا گال، وہ اس وقت کیسے مزے سے دوپٹہ اوڑھے، لمبی سی گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ اماں نے کس بری طرح سر سے دوپٹہ جھپٹ لیا تھا۔

گرم کیا ہوا سالن تام چینی کی پلیٹ میں ڈال کر اماں کے سامنے رکھ دیا۔ اور پھر دونوں بڑی خاموشی سے کھانے لگیں۔ اماں بار بار

لمبی لمبی سانسیں بھر رہی تھیں شاید انہیں اپنا اس سے اچھا زمانہ یاد آ رہا تھا تقسیم سے پہلے جب ان کا شوہر زندہ تھا۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس گھر میں وہ ہاتھ بھر بھر چاندی کی چوڑیاں پہنتی تھیں۔ پیروں کی ہر جنبش پر گھنگروؤں والی پازیب بجتی تھی اور سونے کے لمبے لمبے بندے گالوں پر لوٹ ہوتے تھے۔ یہ زیورات ان کے جہیز کے سبھی نگ تھے تو اپنے۔ موٹا جھوٹا پہن کر خوش تھیں کسی کی چاکری تو نہ کرتی تھیں۔ شام کو میاں کچھ نہ کچھ ہاتھ پر لا دھرتا ایک بیٹا نہ ہونے اور بیٹی کی شادی رچانے کے سوا کوئی فکر ستانے والی نہ تھی۔ بیٹی کی منگنی بھی کھاتے پیتے گھر میں کر دی تھی اور جب سے وہ پیدا ہوئی تھی بس اسی وقت سے جہیز کے نام پر وہ چار آنے روز گولک میں جمع کر دیتی۔ لڑکی کے سیانے ہونے تک اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ شادی کو ایک سال باقی تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بھی گھر بار چھوڑ ایک قافلے کے ساتھ ہو لئے۔ مٹی کی بھاری گولک اور زیور کی پوٹلی بغل میں دابے دابے ہاتھ شل ہو گئے۔ راہ کی وہ وہ مشکلیں جھیلیں کہ جانیں آدھی رہ گئیں۔ کیمپ تک پہنچے تو ہیضے نے لوٹ لیا۔ شوہر کے کفن دفن اور علاج پر گولک کا ایک ایک پیسہ چھڑ گیا۔ چند دن بعد زیور بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ اس وقت سے زندگی گزارنے کے لیے کیسے کیسے جتن کر رہی تھیں۔ اس پر بیٹی کی جوانی کی سل سینے پر دھری تھی۔ اس بوجھ سے تو بس کلیجہ منہ کو آیا جاتا۔

کھانا ختم ہو گیا۔ جھوٹے برتن سمیٹ کر وہ دھونے کے لئے بیٹھ گئی اور اماں برقع سر پر ڈال کر پھر اپنی ڈیوٹی پر چلی گئیں۔ چائے بنانے کا وقت ہو رہا تھا۔ آج تو وہ اپنی بیٹی کو گھر چھوڑنے کی وجہ سے دوپہر میں آ گئیں ورنہ صبح کی گئی شام کو چراغ جلے واپس آتیں۔ وہ سارا دن تنہا پڑے پڑے اکتا جاتی۔ ایسے میں کمبخت جوئیں اور بھی سرکشی پر اتر آتیں۔ وہ گھبرا کر کوٹھری کے دروازے کے پاس جا بیٹھتی اور ٹاٹ کے پردے کو ذرا سا سرکا کر باہر جھانکنے لگتی۔ قسم قسم کی عورتیں بازار میں آتی جاتی دکھائی پڑتیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے ان کے کپڑوں کے حسن اور قیمت کا اندازہ لگاتی رہتی۔ اسے تو ان کپڑوں کے نام بھی نہ معلوم تھے۔ اللہ جانے ان اڑتے پھڑکتے کپڑوں کا کیا نام ہوگا، مارے تجسس کے برا حال ہو جاتا۔ اسے تو بس وہی نام آتے تھے۔ آنکھ کا نشہ اور دل کی پیاس۔

اماں کے جانے کے بعد وہ ٹاٹ کے پردے سے جا لگی۔ پھر یوں ہی ذرا گردن اچکا کر باہر جھانکی۔ سڑک کے اس پار پنواڑی خالی بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا ——— "حرام زادہ" —— اس نے جلدی سے گردن اندر کر لی اور پھر کپڑوں کی لہروں میں ڈوب گئی۔ سامنے کپڑے چھپٹ چھپٹ کر اپنے جسم پر لپیٹ لیے۔ لمبی سی گھونگھٹ کے اندر مسکرانے لگی۔ ایسے وقت میں جوئیں بھی کس قدر باغی ہو جاتیں۔ تصور کی دنیا میں کھلبلی نے ہل چل مچا دی۔ مارے کھسیاہٹ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آج شام اماں ذرا جلدی آ گئیں۔ انہوں نے آتے ہی برقع کھونٹی پر لٹکا دیا۔ روٹیوں کی پوٹلی اور دال کا ڈبہ چولھے کے پاس رکھ کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ کر آگ جلانے لگی۔ اماں نے مٹی کا دیا روشن کر کے طاق میں رکھ دیا اور پھر خود بھی چولھے کے پاس بیٹھ گئیں:

"اندھیرے میں کیوں بیٹھی تھی، دروازے تو بند رکھا کر"

"کسی کی ہمت ہے اندر آنے کی؟" مارے دھوئیں کے آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ اس نے گھور کر اماں کی طرف دیکھا۔

"ایسے ہی کہہ رہی ہوں' زمانہ خراب ہے"

"ہوں! آج تو بیگم صاحب نے بڑی جلد چھٹی دے دی۔"

"طبیعت خراب ہو رہی تھی" ——— وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹانگیں دبانے لگیں ——— کوٹھری کی ساری زمین گھٹ

گھر ہے۔ دن بھر بیکار بیٹھی رہتی ہو اسے ہی لیپ ڈالو۔"

"لیپ ڈالوں گی"۔ اس کا لہجہ سخت تھا۔ اماں کی ایسی نظروں نے اس کی جان جلا دی تھی۔

کھانا گرم کر کے وہ دونوں کھانے بیٹھ گئیں۔ باہر تیز بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے اڑتے پھر رہے تھے۔ روشندان سے ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے اندر تک آ رہے تھے اور دیے کی لو بار بار لرز رہی تھی۔

کھانا کھا کر اماں اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ وہ دیر تک چولہے کے پاس بیٹھی آگ کریدتی رہی۔

"جانے رات بارش ہو گی" اس نے اماں کو دیکھے بغیر کہا۔

"ہوں!" اماں نے جلدی سے آنسو پونچھ کر لحاف میں منہ چھپا لیا ——— "اب تم بھی سو رہو"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بستر پر جانے سے پہلے کواڑ کھول کر باہر جھانکا۔

"یہ کیسے بادل چھائے ہیں" اس کی نظریں بزاز کی دوکان پر اٹھ گئیں ـــ ساری دوکانیں بند تھیں گر وہ ٹھاٹ سے بیٹھا ہمک گا رہا تھا "آواز دے کہاں ہے دنیا مری جواں ہے"۔ بادل دھیرے دھیرے دھمک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر کھٹر کھٹر کھجانے لگی۔ جانے کب نیند آ گئی اور خواب میں بزاز ہی دھم سے آ کودا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگ پڑی اور پھر دیر تک لاحول پڑھتی رہی۔

صبح تڑکے اماں چائے پی کر اپنے کام پر چلی گئیں۔ اس نے بستر تہ کیے۔ کوٹھری جھاڑی۔ اپنے لیے دو روٹیاں اُلیٹں اور پھر روز کی طرح ٹاٹ کے پردے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کی بہار دیکھتے دیکھتے جانے کیسے اس کی نظریں بزاز کی دوکان سے ٹکرا جاتیں۔ اس کا کھنکھارنا اور آنکھ مارنا یاد آ جاتا۔ مارے شرم کے ساری جان سے کپکپا اٹھتی ——— حرام زادہ ذرا اپنا منہ تو دیکھے ——— وہ سوچنے لگتی اس کے اپنے منگیتر کے گھر بھینس پلی ہے۔ اس سے اچھی دوکان ہے۔ اللہ نے آج برا دن دکھایا ہے تو کیا سدا دن ایک سے نہیں رہیں گے۔ آج مدسوں کے کپڑے تکتی ہے تو کل اسے بھی ایسے ہی مل جائیں گے۔ سچ کہتی ہیں اماں کہ کنوار پنے میں کوئی ایسے بھی بولایا کرتا ہے، بھرے بازار میں نقاب الٹ دی، بادل زخمی کر دیا۔ اماں کی جس بات سے اس کی جان جلتی آج وہی بات اس کے جی کو لگ رہی تھی۔

دروازہ بند کر کے اپنے پلنگ پر لیٹ گئی "ان کپڑوں کے پیچھے عزت خاک میں ملا دی۔ کل سے اماں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی۔ اب تو اگر وہ دروازے پر بھی جائے تو لعنت ہے صورت پر۔

بڑی دیر تک وہ چپ چاپ پڑی پنڈلیاں اور کمر کھجاتی رہی، جب کوئی کام نہ ہو تو کمبخت جوئیں بھی بیزار ہو کر حملہ کر دیتی ہیں۔ اٹھ کر کوٹھری کی دیواریں جھاڑنے لگی۔ دروازے کے پاس کی دیوار پر پہنچی تو زنجیر کھول کر ذرا سا باہر جھانک لیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کا پورا غول کا غول ہنستا بولتا جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے کپڑے دیکھنے لگی۔ جھاڑو ہاتھ سے گر گئی۔

بڑی دیر بعد جب وہ دروازے کے پاس سے ہٹی تو لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ اتنی بڑی زندگی یوں ہی ترس ترس کر گزر گئی۔ کوئی یہ بھی جینا ہے۔ کیا پتہ بھلے دن کب آئیں ——— اسے اپنے بچپن کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ اس دن اس نے خانصاحب جیلر کی لڑکی کی خوشامد کر کے قمیض پہن لی تھی۔ کتنے بڑے بڑے پھول پڑے تھے اس پر۔ اسی وقت کمبخت خانصاحب ادھر سے آ پڑے اور اپنی بیٹی کی کرتی پہ ننگ دھڑنگ اچکتے دیکھ کر اس کا منہ طمانچوں سے لال کر دیا تھا۔ پھر ابا نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ اور چھینٹ کی ایک قمیض بنوا دی تھی۔ چھینٹ کی قمیض۔ گدھے مدد

منہ سے یوں جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے ——— کوئی بات نہیں بارہ برس بعد تو گھوڑے کے دن بھی پلٹ جاتے ہیں۔ کیا وہ گھوڑے سے بھی گئی گزری ہے ——— اس نے خود کو تسلی دی اور جھاڑو اٹھا کر بڑی تیزی سے دیواریں رگڑنے لگی۔ اس نے سوچا کل اس سے کہہ کر گوبر منگا لے گی۔ دیوار جگہ جگہ سے اکھڑ گئی ہے۔

مگر پھر شاید بلنے کے بعد آج رات اماں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ آخر کوئی دوسرا سہارا ڈھونڈنا چاہیئے۔

”افسوس ہے کہ میں شادی کر لی۔ خواہ مخواہ مجھے سہارے پہ رکھا“ ——— وہ پلو سے آنسو پونچھنے لگیں ——— ”اب تک کہیں کر کے چھٹی کر دیتے۔ کوئی کمی ہے لڑکوں کی“۔

وہ چپ چاپ آگ جلاتی رہی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پکا مکان اس پر دھڑام سے گر گیا۔

”ہر دوسرے تیسرے خط لکھ دیتے تھے کہ آ رہے ہیں۔ چھ سال بیٹھے رہے انتظار میں! بیگم صاحب تو ہزاروں سنا رہی تھیں کہ میں نے انتظار ہی کیوں کیا۔ اب میں بھی ایسے تو“ ”شادی رچاؤں گی کہ انہیں منہ توڑ جواب مل جائے“۔ اماں کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ چولہے کے نیچے پڑی سسک رہی تھی۔ دیگچی میں سالن سنسنا رہا تھا۔

”بیگم صاحب نے تو آج ہی سے کہنا شروع کر دیا ہے۔ اب بھلا جس بات میں ان کا ہاتھ ہو اس کے کیا پوچھنے“ ———

اس نے چور نظروں سے اماں کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ خود کو چولہے سے گھسیٹ کر باہر لے آئی۔ ہری چوٹ میں درد ہو رہا تھا اس نے نئی امیدوں کا مرہم تھوپ لیا

کھانا پتیلوں میں نکال کر اماں کے سامنے رکھ دیا اور زبردستی کھانے لگی ارے ہاں کہیں مدینہ کہیں کہ اسے بھی دکھ ہوا ہے، کیسی شرم کی بات ہوگی۔

رات جب وہ بستر پر لیٹی تو کوئی کچوکے دے رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں پسلیوں کو توڑتی رہیں۔ اس پور پور میں جانے کیوں بے کل ہو رہی تھیں۔ اس کا جی اور بھی دکھا۔ جی چاہتا کہ چادر تان کر سارے جسم کو کھرچ ڈالے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ کوٹھری کے پچھواڑے بنے ہوئے صحن میں پھوس کی چٹائیوں سے زور کی کھڑکھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی حسرت سے رونا چاہا مگر ایک آنسو بھی نہ بہا سکی۔ نئی امیدیں مردہ حسرتوں کا مزار ڈھانے پر تلی ہوئی تھیں ——— آخر اب بیگم صاحب کچھ اچھا ہی کریں گی نہیں اپنی ماں کے پاس شہر میں رہے گی۔ شہری لوگوں کے پاس پیسہ بھی تو زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ بن ٹھن کر باہر نکلا کرے گی۔ ایک اچھا سا کالا برقع بنوا لے گی۔ چلو جو ہوا سو اچھا ہی ہوا ——— اس نے بڑے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

دن گزرتے چلے گئے۔ ٹاٹ کا پردہ آندھیوں اور بارشوں سے بالکل بوسیدہ ہو گیا۔ بڑے بڑے سوراخ ہو گئے تھے۔ وہ اب پردے کو سرکائے بغیر سوراخوں سے باہر جھانکا کرتی۔ پنواڑی کی دکان پر یوں ہی اچٹتی سی نظر پڑتی تو منہ پھیر لیتی۔ اماں ہر آٹھویں دسویں دن اس کے رشتے کی کوئی ٹوٹی پھوٹی سی بات کر ڈالتیں۔ وہ بھی اس طرح جیسے اپنے آپ باتیں کر رہی ہوں ——— ”بس حد ہے بیگم صاحب تو کسی کو پسند ہی نہیں کرتیں وہ تو بس یہی رٹ لگائے ہیں کہ جب تک لڑکی عیش نہ کرے وہ بھی کوئی رشتہ ہوا۔ اور پھر کوئی بھی اپنے طرف کے لوگوں میں ہے۔ ان پنجابیوں کی تو کوئی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ کہتے ہیں اچھے کو گھر لگتا ہے برا۔ بھلا ہمارا اور ان کا کیا جوڑ۔ بیگم صاحب کے گھر اسی لئے پڑے ہیں کہ وہ ہیں تو اپنی طرف کی کیسی فکر کرتی ہیں۔ جیسے وہ خود لونڈیا کی اماں ہوں۔ میں تو لاکھ کہتی ہوں کہ پیسہ کوڑی کچھ نہ دیکھو بس دو بول کہہ دو مگر وہ کاہے کو مانیں گی“ ———

وہ اس طرح کام کرتی رہتی جیسے اماں کی بات سنی ہی نہ ہو۔ مسکراہٹ چھپانے کے لیے دیر تک ان کے سامنے منہ نہ کرتی۔

ادھر کچھ دنوں سے اماں بجھی بجھی نظر آتیں۔ انھوں نے کوئی چیختی بات بھی نہ کی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اماں جدائی کے خیال سے رنجیدہ ہیں۔ اماں کے جانے کے بعد وہ سارا دن ٹاٹ کے پردے سے لگی بیٹھی رہتی۔ ہر کپڑے کو دیکھ کر سوچتی رہتی کہ ایک جوڑا تو ایسا بھی بنوائے گی۔ ان معلوم سارا جسم گدگدی بن گیا تھا۔

آج اسے پتہ چلا کہ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ ہر بات غلط سمجھتی ہے۔ اماں سخت ہراساں نظر آ رہی تھیں۔ "کیسی بری بگڑی ہے دنیا بھی جسے دیکھو یہی پوچھتا ہے کہ کیا کیا ملے گا، سلام کرائی میں لڑکے کو سائیکل ملے گی یا نہیں، اور یہ اپنی طرف کے لوگ تو اور بھی بدنیت ہوتے ہیں جو چار پیسے ادھر چھوڑ کر گئے ہیں تو اس کا چوگنا وصول کرنے پر تل گئے ہیں۔ ہمدردی تو اٹھ ہی گئی دنیا سے" — وہ سر کو ہاتھ پر رکھ کر آہیں بھرنے لگیں۔ پر سچی بات تھی کہ ان دنوں انھوں نے ادھر ادھر کے کئی گھروں میں جھانکا، خانساموں اور بیروں کو پٹانے کی کوشش کی مگر سب بے سود۔ بیچاری بیگم صاحب کو بھلا کب فرصت تھی ان ٹنٹوں کی۔ وہ تو بس تسلی کے ان رشتوں کی ستون بنا دی گئی تھیں۔

اماں کی ان باتوں نے اس کا کلیجہ دہلا دیا ——— ارے وہ تو پہلے ہی جانتی تھی کہ کچھ ابھی نہ ہوگا۔ بیگم صاحب اپنے عیش میں بھلا اسے کیوں یاد رکھیں گی۔ کبھی اپنا پرانا ریشمی جوڑا تک تو نہ دیا پہننے کو ———

رات اماں کے ساتھ کھانا بھی نہ کھایا اور یوں ہی بستر پر آ گری۔ ساری بادل دھمک دھمک کر برستے رہے اور اس کا کلیجہ مئی جون کی طرح جلتا رہا۔

رات کی بارش سے ٹاٹ کا پردہ ایک طرف سے پھٹ کر لٹک گیا تھا۔ آج جب وہ بڑی اداسی سے دنیا کی گہما گہمی کو دیکھ رہی تھی تو بڑی بے اعتنائی سے پوری گردن باہر نکال دی۔ پھر کھڑے ہو کر پرانے پردے کے باہر دھکیل دیا۔ پنواڑی اس وقت گاہکوں سے فرصت پا کر گا رہا تھا۔ وہ بڑے زور سے کھنکھارا اور پھر پانچ کا نوٹ ہاتھ میں لے کر ہوا میں لہرانے لگا۔ وہ جلدی سے اندر ہو گئی۔ پنواڑی کے سوا اسے کسی نے بھی تو نہ دیکھا تھا۔ سڑک پر گزرنے والے اس کے وجود سے کس قدر بے خبر تھے۔ انھیں پتہ بھی نہ تھا کہ ایک بے چین جی دنیا میں چمکنے کو ترس رہا ہے۔

دروازے کے پاس سے ہٹ کر وہ ابھی کھڑی ہی تھی کہ پنواڑی اپنا سفید تہبند لہراتا اس کے دروازے کے پاس سے گزرا۔ ٹاٹ کے سوراخوں سے اندر جھانکا اور پھر اس کی بلائیں لیتا ہوا چلا گیا۔ وہ جیسے اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔ لمبی لمبی سانسیں سینے کے پرخچے اڑائے دیتی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ آگے بڑھی اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔

دوسرے دن دروازے صرف اسی وقت کھلے جب اماں گھر میں آ گئیں۔ آج کل وہ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کتنی التجائیں اور کتنے عزت کے واسطے تھے۔ ان کی آنکھوں میں۔ وہ کیسی دبی دبی معصوم ہوتیں۔ کچھ نہ کر سکنے کی حسرت آنکھوں میں سلگ رہی تھی۔ اماں اس عالم میں دیکھ کر بڑے غرور سے سر جھٹکتی۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی ایسی نہیں ہو سکتی۔

دو تین دن دروازے بند رہنے کے بعد پھر کھل گئے۔ وہ ٹاٹ کے بنے ہوئے پردے کے پاس لگ کر بیٹھ گئی۔ ہنہ کس کی ہمت ہے اندر آنے کی۔ — وہ پردے کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگی۔ مخلوق اس سے منہ موڑے جیسے بے تحاشہ گزری چلی جا رہی تھی۔ "کیا دیکھ رہی ہو جان، ہمیں کیوں ترپاتی ہو؟" ٹانگ کھجاتا ہوا پنواڑی اس کے سر پر کھڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تم کو نہیں دیکھتی، میں تو کپڑے دیکھ رہی تھی"۔ وہ بڑی مشکل سے بولی۔

"تم بھی پہنو ایسے کپڑے، میں لا کر دوں گا اپنی قبل کر" اس نے ایک بار ایک مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور پلنگ پر گر کر الٹی سیدھی سانسیں لینے لگی۔ اس وقت وہ کچھ بھی نہ سوچ سکتی تھی۔ شام کو جب اماں آئیں تو ان سے نظریں ملاتے ہوئے کترا رہی تھی۔

مدرسے دو دن جانے سے پھر بند ہو گئے۔ وہ جی بہلانے کے لیے اکھڑی ہوئی زمین پر گیلی مٹی لیپتی رہی۔ دوپہر میں دروازہ کھٹکا تو اماں کے آنے کے خیال سے خوش ہو گئی اس نے جلدی سے زنجیر کھول دی۔ پنواڑی لپک کر اندر آ گیا۔

"میری جان" چین نہیں پڑتا، دوکانداری ہو چکی" وہ اس کی طرف بڑھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی۔ پنواڑی نے اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

"میں نے تمہارے لیے بڑا بڑھیا دل کی پیاس کا سوٹ سلوایا ہے، درزی سے کہا ہے کہ فٹ سی دے" وہ اسے بھینچے جا رہا تھا۔ اس میں جانے کہاں سے جان آ گئی جو اپنے کو چھڑا کر الگ کھڑی ہو گئی۔

"جاؤ نہیں تو میں چیخوں گی"

"عاشقوں سے ایسا سلوک نہیں کرتے ..... وہ ہنسا ..... "کل جوڑا لیکر آؤں گا پھر تو خوش ہو گی؟" وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

دروازے بند کر کے وہ جیسے بے ہوش سی اپنے پلنگ پر گر گئی۔ جسم میں جانے کتنے تنور دہک اٹھتے تھے پیاس کے مارے گلے میں کانٹے پڑ رہے تھے رات سونے میں پنواڑی کانوں میں سرگوشیاں کرتا رہا اور دل کی پیاس کا جوڑا اس کے جسم پر پھسلتا رہا وہ سوتے میں بار بار چونک پڑی۔ صبح اماں کے جانے کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے دروازے بند کر لیے۔ جوٹھے برتن اسی طرح پڑے ڈھلک رہے تھے۔ بستر کھلے پڑے تھے۔ کسی کام میں جی نہ لگ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا کنگھی کی اور بڑی مدت بعد آنکھوں میں سرمہ اور کاجل لگایا۔ اسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اگر اس وقت دل کی پیاس کا جوڑا پہن لے تو کیسا مزہ آئے —— ساری زندگی کی حسرت آج اس کے چہرے پر پھٹکار بن کر برس رہی تھی وہ سر جھکا کر پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ جوتیں بھی تو آج جانے کیوں بری طرح بے کل ہو رہی تھیں۔

بیٹھے بیٹھے وہ اٹھی اور کواڑ کی زنجیر کھول دی۔ ایک ذرا سی گردن اچکا کر باہر جھانکا۔ پنواڑی کی دوکان پر کئی گاہک کھڑے ہوئے تھے۔ دروازوں کو یوں ہی بھیڑ کر پھر پیڑھی پر آ بیٹھی۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دل کی رفتار کیسی بے ڈھنگی ہو رہی تھی اس پر دماغ ایک دم سن۔

دوپہر ہوئی تو عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ بھڑے ہوئے دروازے آہستہ سے کھلے پنواڑی نے اندر آ کر زنجیر چڑھا لی۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک پوٹلی پکڑے ہوئے تھا۔ وہ ہنستا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔ پوٹلی کھول کر دل کی پیاس کا نارنجی جوڑا اس کی گود میں ڈال دیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے پنواڑی کی طرف دیکھا اور پھر کپڑے دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر منہ چھپا لیا۔

"پہن کر دکھاؤ میری جان!" وہ اس کی طرف کھسکتا جا رہا تھا — "زندگی بھر غلام رہوں گا" ——

"اماں سے کہو نا!"

"وہ تو کہوں گا ابھی تو ذرا تڑپاؤ" پنواڑی فی البدیہہ جوڑے کی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانا چاہا

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں، لاؤ کپڑے دو میں جاؤں" پنواڑی غصے میں بڑبڑایا — "مفت کے ٹھاٹ کرنا کرائے" اس نے کپڑوں

کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں اماں سے دام لے کر تم کو بھجوا دوں گی" کپڑوں کو اس نے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ بزازی بڑے نخرے سے مسکرایا۔

"وہ تو سب بعد میں ہوگا" بزازی اس کی طرف جھپٹا۔ جوڑا اس کی گود سے زمین پر گر گیا۔

بزازی کے جانے کے بعد مارے شرمندگی کے تھوڑی دیر تک روتی رہی، پھر آنسو پونچھ کر نئے جوڑے کو دیکھنے لگی۔ ننھے بچے کے گالوں کی طرح نرم، چاند کی کرنوں کی طرح چمکتا ہوا ریشم۔ وہ جیسے سب کچھ بھول کر جلدی جلدی جوڑا پہننے لگی۔ سارے کپڑوں سے درست ہو کر اس نے آئینہ دیکھا۔ شیشوں کے دوپٹے کی گھونگھٹ اتنی لمبی ہوئی کہ آئینہ چھپ گیا۔

شام ہو رہی تھی اس نے چونک کر جلدی سے کپڑے تبدیل کیے۔ اب اسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ ان کپڑوں کو کہاں چھپائے۔ اگر اماں نے دیکھ لیا تو — شرمندگی کا احساس اس کے کلیجے کی طرف لپکنے لگا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے جوڑے کو احتیاط سے تہ کر کے اپنے بستر کے گدے تلے چھپا دیا اور جھوٹے برتن صاف کرنے بیٹھ گئی۔

رات جب اماں کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی تو انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا

"کیا روتی رہی تھی"؟ اماں نے نوالہ چھوڑ کر پوچھا اور لمبی سی آہ بھری

"نہیں تو"

"ہوں" وہ کھانا چھوڑ کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں اور دیر تک کروٹیں بدلتی رہیں۔

یہ ریشمیں جوڑا تو اس کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ کہیں اماں اس کا بستر نہ پلٹ دیں۔ ہر وقت فکرمند رہتی۔ خوبصورت جوڑا کسی چوری کی شے کی طرح چھپا پڑا تھا۔ دوپہر میں جب احتیاط سے دروازے بند کر کے جوڑا پہنتی تو شرمندگی کا احساس اس کا گلا دبوچنے لگتا۔ ادھر کئی دنوں سے ٹاٹ کے پردے کے پاس بھی نہ بیٹھی تھی۔ دل بہلانے کا یہ سامان بھی ہاتھ سے گیا۔ وہ تو اس خیال ہی سے کانپ اٹھتی کہ کہیں بزازی سے آنکھیں چار نہ ہو جائیں۔

دن آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ خزاں نے صحن کے چھوٹے سے درخت کو بالکل ٹنڈ منڈ کر دیا تھا۔ جب اسے کوئی کام نہ رہتا تو باہر کے دروازے کو ایک نظر دیکھ کر جوڑا پہن لیتی۔ کوٹھری کے اندر ذرا دیر کو بہار آ جاتی مگر شرمندگی صحن کے درخت کی طرح ٹنڈ منڈ اس کے سامنے اکڑی ہوتی۔ جوڑا اب کتنا ملگجا ہو گیا تھا۔

اس صبح جب اماں جا رہی تھیں تو ان کو ہلکا ہلکا بخار ہو گیا تھا۔ جاتے ہوئے کہہ گئی تھیں کہ دوپہر میں چھٹی لے کر آ جاؤں گی۔ الٹے اماں کی فکر ہو رہی تھی۔ کہیں بخار تیز نہ ہو گیا ہو۔ راہ دیکھتے دیکھتے تیسرا پہر ہو گیا تھا۔ آج بہت دن بعد وہ گھبرا کر پردے سے باہر جھانکنے لگی، شاید دور سے آتی ہوئی اماں دکھائی دے جائیں۔ جھانکتے ہوئے اس کی نظر دکان کی طرف اٹھ گئی۔ بزازی گاہکوں سے کچھ کہہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر زور سے ہنسا۔ اس کے گاہک بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بوکھلا کر اندر ہو گئی۔

چراغ جلے اماں آئیں تو ان سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔ روتے روتے سسکیاں بندھ گئیں۔

"مجھے اپنا ساتھ لے چلا کرو" — وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

"واہ ری پگلی، اب تجھے وہاں کیسے لے جایا کروں، وہاں صاحب کا اردلی رہتا ہے، بیگم صاحب اس سے بات کر رہی ہیں۔

پچاس روپئے پاتا ہے اور ہوتا ہے تو اللہ قسم منہ سے پھول جھڑتے ہیں" اماں اس کی طرف سے منہ پھیر کر جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں۔ صدقے جانے کر بھی جیا بنتا ہے۔ خدا بات کی راہ سے تو نیا نہ دلوائی گی۔" اس نے اماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھا اور پھر چولھے میں آگ جلانے بیٹھ گئی۔

پنواڑی کی بیٹھنے اور لوگوں سے اشارے کرنے کے بعد سے پھر اس نے جوڑا نہ پہنا جب فرصت ہوتی تو یوں ہی اسے نکال کر دیکھتی اور رکھ دیتی مگر یہ دیکھنا بھی اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا۔ کمبخت پنواڑی دانت نکالے اس کے سامنے آکھڑا ہوتا۔

آج جب دوپہر بالکل سنسان ہو گئی تو اس نے گدے کے نیچے سے جوڑا نکالا۔ چند منٹ تک اسے چھوتی رہی اور پھر جلدی سے پہن کر کھڑی ہوئی آئینہ دیکھتے ہوئے اس کی گھبراہٹ لمبی ہوتی گئی، پھر وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد اس نے تیزی سے اپنے کپڑے پہن لئے۔ جوڑے کو کاغذ میں لپیٹے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کھونٹی سے برقع اتار کر اوڑھا۔ پھر باہر جھانکی اور بنڈل کو بغل میں دبا کر جلدی سے سڑک پار کر گئی۔

وہ پنواڑی کی دکان پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ اس وقت خالی بیٹھا فلمی گیتوں کی کتاب پڑھ رہا تھا۔

"اور جوڑا چاہیے! تو دو گیارہ ہو باؤ۔" اس نے ناک سکوڑی۔

"میں تیرا جوڑا دینے آئی ہوں"۔ اس نے بنڈل پان کے تختے پر رکھ دیا۔

"اری مجھے کیا کرنا ہے، اپنی جورو بھی نہیں جو پہنے گی، اسے لے جا نا" پنواڑی گھبرا سا گیا۔

"پھر اسے اپنے منہ پر مارے، یہ جوڑا میرے جسم کو نہیں لگتا۔" وہ رنج اور غصے سے رو پڑی —— لوگوں میں میرا مذاق اڑاتا ہے ——

وہ تیزی سے مڑی اور اپنی کوٹھری کی طرف بڑھ گئی۔

واپسی پر کوٹھری کتنی ویران ہو گئی تھی۔ رہی سہی امید بھی پنواڑی کے تختے پر چھوڑ آئی تھی۔ کوٹھری کے دروازے بند کر کے پچھواڑے صحن میں پڑی جھلنگی اور ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر لیٹ کر ہوا سے ہلتی ہوئی چٹائیوں کو دیکھنے لگی۔ اب وہ اس طرح کھوئی کھوئی نظر آ رہی تھی جیسے اس کے پلے کچھ بھی نہ رہ گیا۔

جس جوڑے کو وہ اتنی بے دردی سے پنواڑی کے تختے پر پٹخ آئی تھی اب اس کی یاد کلیجے کی ہوک بن گئی۔ وہ یہیں پھر سے سرکشی پر آمادہ ہو گئی نہیں۔ اور جب سے وہ جوڑے کی مالک بنی تھی اسے خیال ہی نہ رہا تھا کہ ان بوسیدہ کپڑوں میں جوئیں آباد ہیں۔ اب وہ سارا دن کھاٹ پر پڑے پڑے کھسر کھسر کھجایا کرتی۔ رات سونے میں اسے محسوس ہوتا کہ جوڑا گدے کے نیچے مل رہا ہے۔ وہ چونک کر اٹھ جاتی۔ اماں کھنکھار کر کروٹ بدلتیں تو جھٹکے سے منہ چھپا لیتی۔

کئی دن یوں ہی گزر گئے۔ وہ کھوئی کھوئی پھرا کرتی۔ شام کو اماں اسے نیچی نیچی نظروں سے دیکھ کر گھٹی گھٹی آہیں بھرتیں۔ انہوں نے دوسری بار صاحب کے اردلی کا بھی ذکر نہ کیا تھا۔ اس نے کئی بار اماں کی طرف اس طرح دیکھا تھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ کیا ہوا، صاحب کے اردلی کا؟ کہیں اسے بھی تو سلامی میں سائیکل نہیں چاہیے؟ اماں ان نظروں کو دیکھ کر کنی کاٹ جاتیں۔ اب وہ کیسے کہتیں کہ اردلی بھی ان کے جھانسے میں نہیں آیا۔ وہ بھی کماتے پیتے گھروں کے خواب دیکھ رہا ہے۔

آج رات جب اماں کھانا کھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں تو کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بیٹھی برتن صاف کرتے ہوئے ہاتھ روک کر بیٹھ گئی۔ اماں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکیں اور زنجیر کھول کر ٹاٹ کے پردے کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ باہر پنواڑی کی آواز آ رہی تھی اس کا جی چاہا کہ چیخ پڑے۔

"اماں جی یہ رقعہ اور کپڑے رکھ لو، اگر رشتہ منظور ہو تو صبح کہلا دینا۔"

چراغ کی پیلی روشنی میں اماں دل کی پیاس کے نارنجی جوڑے پر جھکی ہوئی تھیں اور وہ سر جھکائے برتن رگڑ رہی تھی۔

تاریک صلیب اور زرد چاند

اے حمید

اور پھولوں [illegible] مہینے کی ایک رات کو جبکہ پورا چاند سبز آسمان کے وسط میں چمک رہا تھا اور درختوں پر سرخی آ رہی تھی اور مکمل فضا میں اڑتے ہوئے بھونروں سے [illegible] اور ریحوں کے رس دار پھولوں کی خوشبو سے مدہوش ہوتے جا رہے تھے وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس نے چائے بنائی اور ہم چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ یہ ایک منزلہ سرخ مکان کوارٹر کی طرز کا تھا اور شہر سے باہر ایک سوکھی ہوئی ویران کھائی کے پاس واقع تھا۔ پچھلے صحن میں نیم کا ایک گھنا پیڑ تھا جس کی ٹہنیوں پر پھول آ رہے تھے۔ بائیں طرف کونے میں اندھے پڑے ٹوکرے میں مرغیاں بند تھیں۔ کنارے کنارے اُگی ہوئی جھاڑیوں پر گرد پڑی تھی اور ساتھ والے کمرے میں اس کی بیمار ماں اور بہن بھائی سو رہے تھے جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہاں چھت پر ہم لیمپ روشن تھا اور سیلن کے باعث دیواروں کی سفیدی دو ایک جگہ سے اکھڑ رہی تھی۔ پرانی وضع کی آرام کرسیوں پر [illegible] بچھی تھی اور آتشدان پر فریم میں سجی ہوئی کچھ تصویروں کے درمیان چند ایک کتابیں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ پاس ہی ایک کالے رنگ کا میلا سا گلدان باسی پھولوں سے بھرا ہوا رکھا تھا۔ میز پر کچھ نئے اور پرانے انگریزی رسالے بکھرے ہوئے تھے۔ پلنگ پر سبز لحاف کے اوپر کورڈروے کا ایک بادامی پتلون بے خیالی میں پھینکا ہوا تھا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ ویران کھائی کی جانب کھلتے تھے اور ادھر سے آنے والی خنک ہوا میں لیموں کے پھولوں اور سبزے کی مہک تھی۔ سامنے درختوں کے تنوں میں سے ترکاریوں کے کھیت اور دور ناریلوں کے جھنڈ بھرپور چاندنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کسی وقت انہی درختوں کے جھنڈ میں کسی جانور کی اداس آواز اپنے پیچھے ایک ویران سناٹا چھوڑتی ہوئی گونج جاتی۔ میرے دوست نے سگریٹ جلا کر پیالیوں میں چائے انڈیلی تو فضا میں اس کی تازہ مہک کھائی میں اُگے ہوئے سرکنڈوں کی بو سے مخلوط ہو گئی۔ رات بڑی چپ چاپ تھی اور ہر طرف ایک جادو بھری، کچھ کہتی، کچھ سنتی، گہری خاموشی طاری تھی جس میں کبھی کبھی سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں چھپ کر بولنے والے جھینگروں کی آوازیں گُل ہو جاتی تھیں۔ چائے بنا کر اس نے ایک گھونٹ لیا۔ اپنی جگہ سے آہستہ سے اٹھا اور کالے گلدان کے پاس جا کر باسی پھولوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا:۔

تم نے گالز وردی کی کہانی سیب کا درخت ضرور پڑھی ہو گی اور تمہیں اس کی ہیروئن میگن بھی یاد ہو گی۔ میگن ——— یہی اسس کا نام تھا۔ کالے بالوں اور غلافی آنکھوں والی مذہبی لڑکی جو اپنے معصوم بہن بھائیوں کے ساتھ دیہاتی مکان میں رہتی تھی جس کے عقب میں سیب کے درختوں کا پرانا باغ تھا اور جسے اس کے ہیرو [illegible] نے پہلی بار سبز ڈھلوان سے نیچے اترتے دیکھا تھا۔ اس کی گردن اٹھائی ہوئی تھی اور کالے بال بہاری ہوا میں اس کے ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ مسافر نے پوچھا تھا۔ یہاں رات بسر

کرنے کو کوئی جگہ مل جائے گی؟ میگن نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک چشمہ ہے وہاں ہمارا گھر ہے میرے ساتھ چلو۔ وہاں میری امی اور ابا ہیں اور ایک گائے بھی ہے اور ہم آپ کو چاہتے ہیں...... اور پھر ایک شام اُسی دیہاتی مکان کے باغ میں دیودار کے ساتھ ٹیک لگا کر میگن نے مجھ سے کہا تھا جب سو جاؤں تو رات کو ریچھ غوں غوں کرتے نیچے آتا۔ اور پھر ایک روز میگن اُسی درخت کے نیچے چشمے کے نیلے پانی میں مردہ پائی گئی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر پتھروں میں سنہرے پھولوں کا ایک پودا اُگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی ننھے بچے کے چہرے کی طرح معصوم اور پُرسکون تھا۔ مرنے سے پہلے اُسے سیب کے شگوفے کی چھوٹی سی ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی جیسے اُس نے بالوں میں لگا رکھا تھا......

میری محبت کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے کہیں سے سیب کے شگوفے کی ٹہنی نہیں مل سکی اور میرے سرہانے پتھروں میں سنہرے پھولوں کا پودا نہیں اُگے گا۔ میں نے بھی جب پہلی بار آلیو کو ادمنی بس میں سے مال روڈ پر اُترتے اور رفتہ رفتہ ہاتھ پر اپنی طرف آتے دیکھا تھا تو وہ مجھے بالکل میگن ہی لگی تھی۔ زردی مائل گندمی سا رنگ، دوہرا جسم، نہ پاؤڈر، نہ لپ سٹک، سر کے بیچوں بیچ نکلی ہوئی باریک مانگ، ہلکے بھورے بال۔ یقین کرو مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے سیب کے درخت کی ہیروئن پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھائے سبزہ زار کی ڈھلوان سے نیچے اتر رہی ہو۔ مال روڈ پلک جھپکنے میں ایک پرانی پرسکون وادی میں تبدیل ہو گئی۔ زمین سبزے اور پھولوں سے ڈھک گئی اور نکھرا ہوا نیلا آسمان پرندوں کے راگ سے گونج اٹھا اور ہواؤں میں شہد کی خوشبو مل گئی اور میں ابھی میگن سے آگے بڑھ کر کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ ایک موٹر تیز ہارن دیتی ہوئی گزر گئی۔ اب میگن یا آلیو میرے قریب آگئی تھی۔ اپنے آپ میں مگن اور خاموش یوں ایک ایک قدم اٹھاتی جیسے پھولوں پر چل رہی ہو۔ میں پیپل کے درخت کے سائے میں کھڑا تھا۔ آلیو نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک پل کے لیے اپنی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ ذرا سا مسکرائی ہو۔ یہ مسکراہٹ بڑی حیرت انگیز اور دلکش تھی۔ اس میں کوئی بھولا بسرا خواب یاد دلانے والی کیفیت تھی۔ میں نے دیکھا کہ آلیو کے گالوں کا اوپر کا حصہ گلابی تھا اور بھورے خشک بال چمک رہے تھے۔ فارول سینٹ کی اداس مہک کا تیز سانس میرے ہونٹوں کو چھو کر گزر گیا۔ آلیو اگرچہ پاکستانی کرسچن لڑکی تھی لیکن اس کی چال میں قدیم سنتھالی شہزادیوں کا سا لمبا وقار اور بانکپن تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ اس گلی میں گھوم گئی جو ہماری بلڈنگ کے عقب میں پرائیویٹ کمپنیوں کے دفتروں کی جانب نکل گئی ہے۔ میں اپنی کتابوں کی دکان کے شوروم میں واپس آگیا۔ مجھے اس دکان میں نوکری کرتے دو سال ہو گزرے تھے مگر آج تک ایسی کرسچن لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ میرا کام صبح سے شام تک یہاں شوروم میں گاہکوں کا خیر مقدم کرنا اور انہیں ضرورت کی ہر کتاب اور رسالہ وغیرہ بہم پہنچانا ہے اور اس دوران میں کئی کرسچین اور غیر کرسچین لڑکیوں سے سابقہ پڑا ہے لیکن میں نے ایسی رازبھری مسکراہٹ، سہمی سہمی شبنمی آنکھیں اور سنتھالی شہزادیوں ایسی پُرتمکنت کھلی پیشانی نہیں دیکھی۔ جیسا کہ تم جانتے ہو میں فطرتاً شرمیلا اور کم آمیز ہوں۔ آج تک رسمی گفتگو کے سوا کبھی کسی لڑکی سے کھل کر بات نہیں کی۔ علاوہ بریں میرے حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں کسی لڑکی سے کھل کر بات کر سکوں۔ اُس سے اظہارِ عشق کر سکوں۔ میرا باپ مر چکا ہے۔ ماں دائم المرض ہے۔ دو جوان بہنیں کنواری بیٹھی ہیں۔ بادامی باغ سے ہر روز سائیکل پر آتا ہوں اور سائیکل پر ہی واپس جاتا ہوں۔ بارش ہو یا آندھی، مجھے اس شوروم میں آنا ہی پڑتا ہے۔ ان حالات میں کوئی کیا عشق کرے گا؟ اور پھر روزانہ دس میل سائیکل چلانے سے تو عشق ویسے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود آلیو کو ایک نظر دیکھ لینے سے میں اپنے آپ کو کھو بیٹھا تھا، اور اُسے ایک بار پھر دیکھنے کے لیے خود بخود دلی شاپ پر پہنچ گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آلیو کی شخصیت کے تمام رنگوں میں سب سے الگ اور سب سے

نیلو میں ایک ایسا رنگ نظر آگیا ہے جو میرا اپنا رنگ ہے۔ وہ ایک ایسی قدیم اور پُراسرار خوشبو بن کر میرے قریب سے گزر گئی تھی جس کی مدہوش لہروں میں میرے ہر جنم، ہر دور، ہر زندگی کے الم، درد، خوشیاں، محبتیں اور جنمی اَن بتیں پوشیدہ تھیں، ایک دل شکستہ، بکھری ہوئی خزاں آلود گرد میں اٹی ہوئی ویرانی، شناسا، اجنبی۔ کچھ کلکتی، کچھ یاد دلاتی کچھ اداس، کچھ مسکراتی ہوئی پُراسرار روح کی مانند جو ایک دلگیر آہ بھر کر پاس سے گزر جائے اور انسان عجیب چوراہے میں بیٹھا حیرت زدہ اور ہیبت زدہ ہو کر رہ جائے جیسے اس نے صدا کی آواز سن لی ہو۔ تم افسانہ نگار ہو شاید میری باتوں پر ہنسو اور کسی افسانے میں اس کا مذاق اڑاؤ لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا، کہ کوئی شئے، کوئی غیر مرئی ناقابل تسخیر شئے ہے جو مجھ سے کبھی —— ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں سال پہلے بچھڑ گئی تھی۔ جدا ہو گئی تھی اور جو مجھ سے کسی نہ کسی روپ میں ایک بار پھر ملنا چاہتی ہے لیکن نہیں مل سکی، نہیں مل رہی۔ کبھی کبھی، کہیں کہیں، مجھے اس کی جھلکیاں سی ملتی ہیں، زمانے سے نظر آتے ہیں، سرگوشیاں سی سنائی دیتی ہیں، آہٹ سی ملتی ہے اور دیکھتے دیکھتے کوئی نورانی پردہ درمیان میں آن گرتا ہے۔ دیوار آن کھڑی ہوتی ہے اور ایک بار پھر جدائی کا تند، وحشی اور جھاگ اڑاتا، غضبناک سمندر حائل ہو جاتا ہے۔ تم اس شئے کو اس گریز پا حسین ترین ذرے کو ایک خشک، دیوانی اور بے رنگ آواز سے تشبیہہ دے سکتے ہو۔ ایک ایسی آواز —— جس کی کوئی صدا نہیں، کوئی لے نہیں۔ جو گم شدہ ماضی کے نیم خوابیدہ، نیم فراموش مندروں کے گرد آلود، تہ خانوں سے ابھرتی —— قدیم جنگلوں کے عمر رسیدہ درختوں کو اپنے کھردرے زخمی ہونٹوں سے چومتی، بال پھیلائے، برہنہ، بے داغ اور لہولہان سیاہ جسم لیے قرنوں اور قرنوں سے آوارہ اور بے خانماں ہے جس نے ہزاروں سال پہلے تاریک درختوں میں چھپے ہوئے قلعوں کی مرمریں شہ نشینوں میں تیکھی چتونوں والی برہمن راجکماریوں کو جالی دار جھروکوں میں اپنے عاشقوں کو اشارے کرتے اور حبشی غلاموں کو پیچیدہ غلام گردشوں کے اندھیروں میں بیٹھ کر اپنے خنجر شہنشاہوں کی پشت میں پیوست کرتے اور بھگوان بدھ کو کر منڈل ہاتھ میں لیے شودروں کے دروازوں پر بھیک مانگتے دیکھا ہے یہ اڑتی، دردبھری، پرانی تیز خوشبوؤں والی صدا، آدھی رات کو جب چاند کہیں نہیں ہوتا اور ہری ہری پتیوں پر بارش کی گرم گرم بوندیں گرتی ہیں، جب ناریل اور تاڑ کے گھنیرے جنگلوں میں تاڑی کی رس بھری خوشبو پُراسرار اندھیروں کو زیادہ وحشی بنا دیتی ہے تو یہ میری تلاش میں اپنے گھر سے نکلتی ہے اور گیلے سایوں پر اپنے ننگے گرم حنائی پاؤں رکھتی ہر گھر کے دروازے سے منہ لگاتی مجھے اپنے پاس بلایا کرتی ہے۔ جب بارش والی راتوں کو گیلے مکانوں کی بھیگتی منڈیروں پر اُگا ہوا گھاس اپنے سرخ پھول چھپا لیتا ہے۔ اور محبت کے دکھوں کا جہنم اپنا دہکتا ہوا منہ کھول کر ہانپنے لگتا ہے اور جسم کی ساری ناتمام لذتیں، بے ثمر پارسائی کے سارے ملال، پشیمانیاں غم، نفرتیں اور کمینگیاں اس آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی ہیں اور آتما کا ایک نیا روپ، ایک نیا سر، ایک نیا سنگار جنم لیتا ہے۔ تو یہی صدا یہی آواز —— اس آگ کے ہر شعلے، شعلے کی ہر زبان میں سنسناتی، چٹکاتی۔ لپکتی اور ڈستی محسوس ہوتی ہے اور یہی وہ آواز تھی، یہی وہ شعلہ تھا جسکے ٹوٹتے ہوئے سُر کی بازگشت۔ مجھے آئیرس کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ یہی وہ پرانی محل سراؤں کی ریشمی خلوت گاہوں والی خواب ناک خوشبو تھی جس کا ایک رنگ۔ فاروِل سینٹ میں مل کر چھپ چھپا کر، سب کی نظروں سے بچ کر، میرے سفر میرے چہرے کو تیز کیلا سا بن کر چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔

دوسرے دن میں نے اسے پھر دیکھا۔ میں بس شاپ سے ذرا ہٹ کر پیپل کے پیڑ تلے جا کھڑا ہوا۔ ٹھیک نو بجکر تین منٹ پر ایک بس آکر رکی۔ اس کا دروازہ کھلا اور نیلو نیلے رنگ کی ایک نوٹ بک اور پرس ہاتھوں میں لیے، نسوانیت کی تمام دلکشی کے ساتھ، سر جھکائے خاموش قدم اٹھاتی اپنے دفتر کی طرف چل پڑی۔ پہلے روز کی طرح آج بھی اس نے ایک پل کے لیے مجھے دیکھا اور فوراً نگاہیں جھکا لیں

مجھے ایک بار پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں بڑی دلنشیں ادا سے مسکرا دی ہو۔ اس مسکراہٹ میں نہ تو پیام محبت تھا اور نہ دعوت عشق۔ نہ شوخی تھی اور نہ شرارت، نفرت تھی نہ حسرت —— بس ایک بے نام سا احساس تھا۔ یاد دہانی کا۔ تسلی اور خود اطمینانی کا —— جیسے کہہ رہی ہو۔ میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم وہی ہو نا، جس نے ہر دور میں موت پر فتح پائی ہے اور ہر عہد میں جنم لیا ہے۔ جو شہزادہ بن کر پیدا ہوتا ہے اور فقیر بن کر گلی گلی پھر کر عمر بسر کرتا ہے۔ جو کانٹوں پر اس طرح چلتا ہے جیسے پھول ہوں، جو پھولوں کو اس طرح پیار کرتا ہے جیسے اس کے بچے ہوں اور جو بچوں سے اس طرح پیش آتا ہے جیسے اس کے اپنے بازو ہوں، ہاتھ ہوں، ہزاروں ہاتھ ہوں، لاکھوں ہاتھ ہوں۔ جو کرب انگیز وحشیانہ چیخیں سنتا ہے اور صلح شانتی کے منتر پھونکتا ہے۔ جو بگولوں کے ساتھ اڑتا ہے اور شبنم کے ساتھ گرتا ہے جو دہکتے ہوئے انگارے نگلتا ہے اور دمکتے ہوئے ہیرے اگلتا ہے جو خاموش ہے لیکن بول رہا ہے جو چپ ہے لیکن سن رہا ہے، جو ازلی ہے ابدی ہے۔

تم وہی ہو نا؟ وہی ہو نا؟

وہ مجھ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی رہتی۔ میں جب بھی اسے دیکھتا، اسی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہوتی۔ میں چپ رہتا۔ خاموش رہتا۔ لیکن اسے دیکھتا رہتا، ہر روز دیکھتا۔ پورے نو بجے شوروم سے نکل کر بس شاپ پر پیپل کے پیڑ تلے آن کھڑا ہوتا۔ نو بج کر تین یا چار منٹ پر اس کی بس آکر وہاں رکتی۔ دروازہ کھلتا اور وہ باہر نکلتی۔ اترتے اترتے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتی۔ جیسے ذرا سا مسکرائی اور خاروں کی خوشبو اڑاتی چپ چاپ اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو جاتی۔ میں کبھی اس کے پیچھے نہ گیا تھا۔ اس نے کبھی مجھے بلانے کی کوشش نہ کی تھی۔ شاید اسی ایک تیکھی سی شوخ سی خود ستائی اور بے نیازی کے احساس نے ہمیں صدیوں سے ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا اور جانے ابھی کتنی صدیاں اور جدا رہنا تھا۔ اسی اثنا میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ جرمنی کی ایک ٹریکٹر بیچنے والی فرم میں سٹینو ہے اور ریلوے کالونی کے کہیں قریب ہی اپنی چچی کے ساتھ رہتی ہے۔ اور اس کا نام آلیو ہے۔ اس دفتر کا ہیڈ آفس کراچی میں تھا۔ اتفاق سے وہاں میرا ایک دوست ملازم نکل آیا جس کی بدلی لاہور والے دفتر میں ہو گئی تھی۔ وہ ایک روز اچانک ہمارے شوروم میں آ گیا اور واپسی پر مجھے اپنے ساتھ دفتر لیتا گیا۔ کہنے لگا چائے وہاں اپنے کمرے میں بیٹھ کر پئیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ آلیو اسی دفتر میں کام کرتی ہے۔ چنانچہ سیڑھیوں ہی میں میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور پھر دفتر کے بڑے کمرے میں سے گزرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ بھورے بالوں والی سبک اندام آلیو دیوار کے ساتھ خوبصورت سی چھوٹی میز کے سامنے بیٹھی ٹائپ کر رہی ہے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور مجھے دیکھتے ہی اسی پراسرار بے معلوم سے اشارے والے انداز میں مسکرائی اور اپنا چہرہ ٹائپ کی مشین کے پیچھے چھپا لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شوخ چشم ترچھے ابروؤں والی دیوداسی پرانے مندر کی زنگ لگی دیوار کے پیچھے چھپ گئی ہو۔ مجھے صرف آلیو کے بال اور ان کے درمیان نکلی ہوئی مانگ ہی دکھائی دے رہی تھی اور پھر ٹائپ رائٹر کی ننھی ننھی ٹک ٹک کی مسلسل آواز تھی جو ٹین کے چھپر پر بارش کی بوندوں کی طرح گر رہی تھی۔ میں اپنے دوست کے کمرے میں آ گیا۔ ٹک ٹک کی آواز نے وہاں بھی میرا پیچھا کیا۔ یہ صدا آلیو کے چہرے سے زیادہ نمایاں پرکشش اور بھرپور تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات کی تمام آوازیں، تمام بولیاں، تمام سُر اسی ایک ٹک ٹک سے نکلے ہوں۔ آلیو میرے پاس نہیں تھی۔ لیکن میرے لیے یہی خیال کافی تھا کہ جس کمرے میں میں بیٹھا ہوں وہاں کی فضا میں آلیو کے جسم کے ان چھوئے لمس کی حدت اور عطر بھری انگلیوں کی پاکیزہ خوشبو بسی ہوئی ہے اور کیا خبر —— کہ یہ ہوا جو سانس بن کر میرے جسم میں داخل

ہو رہی ہے۔ آئینے کے نیم گلابی دھندلکوں کو چیر کر آ رہی ہو۔ ایک بے صدا آواز سی ہو۔ اُس کا اپنا سانس ہی ہو۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ میں ہر روز بس سٹاپ پہ اُس کے درشن کرتا۔ پیپل کے پیڑ تلے چپ چاپ کھڑا رہتا اور اُسے بس میں سے نکلتے فٹ پاتھ پر سمٹ سمٹ کر خوبصورت پاؤں اٹھاتے اور دفتر والی گلی میں مڑتے دیکھتا رہتا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو واپس اپنے شوروم میں آ جاتا۔ اس دوران میں ہم نے ایک دوسرے سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ کبھی اپنا حالِ دل ظاہر نہ کیا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ تھی اور میں بھی محبت اور ازلی لگن کی اس دھیمی دھیمی آنچ کو اپنی روح میں جذب کر رہا تھا جس طرح کوئی غریب مسافر جاڑے کی ٹھٹھرتی رات میں کسی ویران میدان میں منہ زور دشمنوں کی چھوڑی ہوئی راکھ کے پاس بیٹھ جائے اور اپنے ہاتھ پاؤں تاپنے لگے بالکل اسی طرح میں بھی اس شور مچاتی، نفرت اور گندگی کا کف اڑاتی، ٹھنڈی دنیا کے بیابان میں گزری ہوئی محبتوں کی راکھ کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اُسے کریدتے ہوئے ڈر رہا تھا کہیں نیچے سے مٹی نہ نکل آئے۔ اتنی سی آگ بھی نہ بجھ جائے۔ مجھے میرے دوست نے بتایا کہ آلیو ایک سال سے اُس دفتر میں ملازم ہے لیکن اُس نے کبھی کسی سے زیادہ بات نہیں کی۔ ایک بار اُسکے منیجر نے اُسے سینما اور ریسٹوران میں ڈنر کی دعوت دی تھی جسے آلیو نے قبول نہ کیا تھا۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ جیسے میں نے ہی اُسکے منیجر کی ڈنر کی مکارانہ پیشکش کو ٹھکرا دیا ہو جیسے یہ ساری خودنگری، بے نیازی اور تمکنت میری اپنی ہو۔ میرے اپنے آپ کا ایک حصہ ہو۔

اسی طرح برسات کا موسم بھی گزر گیا۔ سردیاں آ گئیں۔ یہ رُت بھی گزرتی چلی گئی۔ جنوری کا مہینہ آ گیا اور جاڑے کی بارشیں شروع ہو گئیں۔ ایک دن صبح بڑی سردی تھی اور کہر چھایا ہوا تھا۔ رات بھر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر درختوں کے مسلسل ٹپکنے سے جا بجا تھوڑا تھوڑا پانی جمع ہو گیا تھا۔ بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ اُس روز ہمارے شوروم میں بڑی گہما گہمی تھی۔ میں نے برآمدے میں آ کر دیکھا کہ باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی اور درختوں پر دھند زیادہ گہری ہو رہی تھی۔ اتنے میں فٹ پاتھ پہ آلیہ نمودار ہوئی۔ وہ اپنا آپ سمیٹے تیز تیز قدم اٹھاتی بارش میں بھیگتی چلی آ رہی تھی۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ بارش ایکدم تیز ہو گئی۔ آلیو لپک کر ہماری دکان کے برآمدے میں آئی اور ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر رومال سے منہ پونچھنے لگی۔ اُس نے نسواری رنگ کی ٹویڈ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں اسی رنگ کا گرم اونی مفلر تھا اور کچھ بال بارش میں بھیگ کر پیشانی سے چپک گئے تھے۔ میرے قدم اپنے آپ ہی اُس کی طرف اٹھ گئے۔ اب اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور کچھ گھبرا سی رہی تھی۔ دوسرے لمحے میں اُس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ کبوتری کی طرح کچھ اندر ہی اندر سمٹ سی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پلکوں کے بال گیلے تھے اور سردی میں رخساروں کی روئیں کانپ رہی تھیں اور چہرے پہ آنکھوں کے اردگرد ایک مدھم اور ملائم سی چمک تھی۔ جیسے گیلی رات میں دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی دیا ٹمٹما رہا ہو۔ اس کا نچلا ہونٹ ٹھنڈ سے نیلا سا ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا:

"اگر آپ ہمارے شوروم میں بیٹھ جائیں تو بارش کے ......

وہ جلدی سے بولی،

"جی نہیں۔ آپ کا شکریہ۔ شکریہ ......

اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اُس کا سُرخ رومال فرش پر گر پڑا۔ میں فوراً اسے اٹھانے کے لیے جھکا۔ آلیو بھی جھکی۔ ایک دم ہمارے چہرے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے اور آنکھیں ایک دوسرے کی

آنکھوں کو ملنے لگیں اور پھر اُس نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مہر بہ لب ہو گئی۔ ساکت ہو گئی۔ جامد ہو گئی اور میں نے اُس کی آنکھوں میں اپنے آپ کو آندھی بن کر اُٹھتے، بادل بن کر گرجتے، بجلی بن کر چمکتے، پھول بن کر شاخوں میں سمٹتے، شیر بن کر ہرنوں پر جھپٹتے اور ہرن بن کر قلانچیں بھرتے ماں بن کر جنم دیتے اور بچہ بن کر جنم لیتے، روتے ہنستے، محبت سے باہیں پھیلاتے، نفرت سے منہ پھیرتے، غموں کے پہاڑ اٹھاتے، کمندیں پھینک کر دو رہیلے پرانے قلعوں کی دیواریں پھاندتے اور قدیم سدحتی بارہ دریوں کے دبیز قالینوں پر جھک کر اظہار محبت کرتے، سایہ دار کنجوں میں بکیاں بھرتی دوشیزاؤں سے خونریز عشق کے عہد و پیمان باندھتے، سنگدل محبوباؤں کی بیوفائیوں پر خوفناک سمندروں میں چھلانگ لگاتے، اور شاہی عبائیں پہن کر رات کی تاریکی میں راج محل سے جنگل کی طرف نکلتے اور اجاڑ برجوں میں سنگدل بیراگیوں کے ساتھ بیٹھ کر تپسیا کرتے، ریاضت کرتے دیکھا۔ میں یوں وفورِ مسرت اور حیرت سے چپ کا چپ رہ گیا۔ گویا کسی ناقابل عبور دریا کا منبع دریافت کر لیا ہو۔ جیسے کوئی کتاب آخر سے لے کر شروع تک پڑھ لی ہو۔ آلیو بھی مبہوت سی ہو گئی تھی۔ جیسے ایک طویل، خونچکاں فراق کے بعد دو ذرے اڑتے، بھاگتے، گھومتے، چکراتے، صدیوں کی راکھ اڑاتے۔ اچانک ایک دوسرے کے بالمقابل آ گئے ہوں اور دو معصوم بچوں کی طرح ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم وہی ہو؟ وہی ہو؟ ....

جی نہیں ــ آپ کا شکریہ شکریہ

میں نے سرخ رومال اٹھا کر آلیو کی طرف بڑھایا۔ اس نے رومال لے لیا اور جلدی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گرتی بارش میں ہی گلی میں مڑ گئی۔ ڈیڑھ دو سال کی مدت میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے کوئی بات کی تھی۔ میں نے آلیو کے رومال کو چھوتی ہوئی انگلیاں ہونٹوں سے لگائیں۔ اُن میں سے فاریل کی اُداس خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں اس خوشبو سے بھی زیادہ اداس ہو کر شوروم میں واپس آ گیا اور سوچنے لگا۔ اگر آلیو میری بات مان لیتی ہمارے شوروم میں آ جاتی تو دیکھتی کہ باہر کی گیلی سردی کے مقابلے میں یہاں کی فضا کتنی پرسکون اور گرم ہے۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ یہاں لاتا۔ اپنے رومال سے اس کے لیے کرسی صاف کرتا۔ سادہ پتیوں والی سونے کے رنگ ایسی چائے بناتا اور خود زمین پر بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ دیتا اور اسے ایک کہانی سناتا کہ کسی پہاڑ پر ایک بھولی بھالی صورت والا ایک چرواہا رہا کرتا تھا۔ اسے اپنی بھیڑوں سے بہت پیار تھا۔ جب بھیڑیں چراگاہ کی ہری ہری گھاس چرا کرتیں تو وہ درخت سے ٹیک لگا کر انہیں بانسری پر محبت کے نغمے سنایا کرتا۔ ایک روز بارش کے طوفان میں وہ گھر واپس آ رہا تھا کہ اس کی ایک بھیڑ گم ہو گئی۔ معصوم چرواہا پریشان ہو گیا اور اس کی تلاش میں کوہ قاف کی وادیوں میں جا نکلا۔ وہ بڑا غمگین ہو کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں ایک نیک دل پری نمودار ہو گئی اور چرواہے کو اپنے ساتھ پرستان لے گئی۔ وہاں اس کی بھیڑ اسے واپس مل گئی اور پری نے اسے میٹھے پھل اور ایک بانسری دی اور چرواہا خوشی خوشی بھیڑ کو ساتھ لے کر اپنے گھر واپس آ گیا .... پھر میں اُس سے کہتا۔ آلیو! دیکھو یہ کتنی عجیب سی کہانی ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی سب کچھ موجود ہے۔ گڈریا ہے، میٹھے پھل ہیں، بانسری کے گیت ہیں اور بارش کا وحشی طوفان ہے اور نیک دل پریاں ہیں اور آلیو! میں نے تمہیں سب سے پہلے اسی وادی میں دیکھا تھا اور سیب کے درخت کے پاس بیٹھ کر تمہارے بالوں کے لیے سفید پھولوں کے ہار بنائے تھے اور سرخ انگوروں کے خوشے زرد پتوں میں سجا کر تمہارے سامنے رکھے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا؟ یاد ہے نا؟ .... مگر آلیو برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر بارش میں بھیگتی اپنے دفتر جا چکی تھی۔ وہ

ہمارے شوروم میں نہیں آئی تھی اور میری سونے جیسے رنگ والی چائے اسی طرح پڑی رہی تھی اور بارش گرتی رہی تھی۔

ہمارے ہاں دوکان میں کبھی کبھی ایک عیسائی لڑکی آیا کرتی تھی۔ چھوٹے قد کی تھی جسم ذرا بھاری تھا۔ بڑی گول مٹول سی تھی۔ شوروم میں داخل ہوتی تو یوں لگتا جیسے چھوٹی سی گڑیا چلی آ رہی ہو۔ چہرہ بڑا بھولا اور معصوم تھا۔ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی دودھ پی کر آ رہی ہے۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار ضرور آتی اور ہمیشہ اکیلی آتی۔ عورتوں کا رسالہ یا کوئی سنسنی خیز ناول خریدتی اور بچوں ایسے قدم اٹھاتی واپس چلی جاتی۔ اس کا نام لیزا تھا۔ ایک روز میں نے اسے شرارت سے کہا: "لیزا! تم بالکل مجھے اپنی چھوٹی سی بہن لگتی ہو۔" وہ اس بات پر بڑی خوش ہوئی۔ شاید اسے آج تک سوائے اپنے بھائی کے اور کسی نے اپنی بہن نہ کہا تھا۔ اب وہ اندر داخل ہوتے ہی سیدھی میرے پاس آتی۔ میری خیریت پوچھتی۔ اگر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی ہوتی تو اسے ٹھیک کرنے کو کہتی۔ اگر سویٹر نہ پہنا ہوتا تو دوسرے روز پہن کر آنے کی تاکید کرتی، غرض کہ اسے مجھ سے بڑا لگاؤ ہو گیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ آلیو اس کے ساتھ ہمارے شوروم میں چلی آ رہی ہے۔ میں تو حیران سا ہو کر رہ گیا۔ لیزا حسب عادت سیدھی میرے پاس آئی۔ خیر خیریت پوچھی اور مجھ سے آلیو کا تعارف کروانے لگی۔

"مس آلیو ——— ہماری ملاقات آنٹی کے ہاں ہوئی۔ بڑی سویٹ ہے۔

میری طرح کسی سے کم آپ نہیں ہوتی اور وہاں وہ "ہاؤس وائف" آیا؟"

آلیو کچھ نہ بولی۔ حسب عادت خاموش رہی۔ صرف کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں اور فضا میں فارول کی سلگتی ہوئی خوشبو پھیل گئی اور میں نے دیکھا کہ آلیو کے کانوں میں نرگسی گرین کلر کے بُندے جھلملا رہے تھے جو کہ رنگ سونے کے تھے اور وہ رسالہ دیکھتے ہوئے بار بار اپنی جھینپی ہلکی پلکیں جھپکا رہی تھی۔ ایک بار اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور پھر بڑی خاموشی کے ساتھ آنکھیں جھکا لیں۔ پھر اس نے لیزا کے کان میں کچھ کہا۔ لیزا نے مجھے بتایا کہ آلیو کو ناول "ربیکا" کی تلاش ہے۔ میں انہیں کتابوں والے ڈیپارٹمنٹ میں لے گیا اور دیر تک میں خود وہ ناول تلاش کرتا رہا اور مجھے وہ چہرہ یاد آ گیا جس کی پھیر بارش کے طوفان میں گم ہو گئی تھی اور وہ اس کی کمر تک بہہ کر قاف کے مرغزاروں میں کھل گیا تھا۔ مگر افسوس ہم نہ ڈھونڈ سکے، کتاب نہ مل سکی۔ میں نے لیزا کی وساطت سے آلیو سے اس کے گھر کا ایڈریس لے لیا اور دوسرے دن ایک اور دوکان سے کتاب خرید کر اسے پھولدار کاغذ میں لپیٹا اور آلیو کو پارسل کر دی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خط لکھ دیا کہ ——— "مس آلیو! کتاب گھر پہ ہی بڑی مل گئی تھی۔ اسے بھیج رہا ہوں اور ساتھ ہی اس عقیدت اور محبت کو بھی جو ایک مدت سے میرے دل میں بہار بن رہی ہے ———" کچھ دنوں بعد وہ خط مجھے واپس مل گیا۔ آلیو نے اسے پڑھ کر لفافے میں بند کر کے مجھے پوسٹ کر دیا تھا۔ وہ خط میرے پاس موجود ہے۔ وہ لفافہ بھی جس پر اس نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا خط اسی لفافہ میں بند کر کے کسی ایسی رات کہ گھر سے نکلوں جب سہمی ہوئی چاندنی پرانی حویلیوں کی سنسان ڈیوڑھیوں میں پاؤں رکھتے ڈر رہی ہو اور ——— دھرتی کے سینے اور نیچے پربت کی چوٹی پر بانہیں پھیلا کر کھڑا ہو جاؤں اور لفافے پر لکھے ہوئے اپنے نام کو آنکھوں سے لگا کر چپکے سے کسی نظر نہ آنے والے ستارے کی دہلیز پر رکھ دوں ——— یا پت جھڑ کی رت میں اسے کسی ایسے پیڑ کے نیچے دفن کر دوں۔ اچھا۔ ٹاٹا۔

جب بہار آئے گی تو کیا وہاں بھی سرخ رنگ کے بے مہر پھول کھلیں گے؟

لیکن پھول تو صرف وہیں کھلتے ہیں جہاں آلیو اپنا پاؤں رکھ کر گزرتی ہے اور آلیو کو میں نے ابھی تک صرف پاتھ ہی پر گزرتے دیکھا تھا۔ ہر قدم پر خمیدہ کر کر ذرا سا بھینچے، کھلے سنہری بالوں کو لہراتی، بے معلوم سی مسکراتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتی۔ وہ

ایک پُرشکوہ اور متاثر کرنے والے خیال کی طرح میرے قریب سے گزر جاتی اور فاسول کے سینٹ کی تیز خوشبو، ان ننھی منی معصوم پریوں کی مانند پیچھے رہ جاتی جو شہزادیوں کے عقب میں ٹرین تھامے، ہر پل ساتھ چلا کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح وقت گزر گیا ہے اور میں اس کے پیچھے رہ گیا ہوں۔

اسی طرح کچھ اور وقت گزر گیا۔ آلیو کچھ اور آگے نکل گئی اور میں تنہا فٹ پاتھ پر اپنے دامن میں بیٹھے ہوئے پھول لٹاتا کچھ اور پیچھے رہ گیا۔ پھر —— ایک دن لیزا نے مجھے بتایا کہ آلیو ایک ڈانسنگ سکول میں داخل ہو گئی ہے۔ یہ سکول ایک خوبصورت، انگریزی سینما کے اوپر واقع ہے۔ دل نے کئی بار کہا۔ چلو وہاں چلیں اور کسی نیم روشن کونے میں بیٹھ کر، کسی دروازے کے ساتھ لگ کر چپکے چپکے آلیو کو ناچتے ہوئے دیکھیں۔ لیکن ہر بار یہ خیال کر کے رک گیا کہ اسے کسی دوسرے کے ساتھ محو رقص کیسے دیکھ سکوں گا۔ میں یہی جانتا تھا کہ ایک دن یہ الم خیز منظر بھی مجھے دیکھنا ہوگا۔ یہ کانٹوں کا تاج بھی سر پہ رکھنا ہوگا۔ یہ صلیب بھی کندھے پر اٹھانی ہوگی۔ اور پھر وہ تاریک، خون رلانے والی شام بھی آ پہنچی جب سینما ہال کی لابی میں کھڑے ہوئے آلیو کو پہلی بار ایک خوش پوش غیر مرد کے ساتھ ڈانسنگ سکول کی سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ میں اسے غیر مرد ہی کہوں گا۔ اس لیے کہ آلیو کا سوائے میرے بھلا اور کون اپنا ہو سکتا ہے۔ مگر آلیو نے میری طرف نگاہ بھی نہ کی۔ وہ اس آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، بڑے اطمینان سے لابی میں سے گزر کر باہر نسواری رنگ کی ایک چھوٹی سی کار میں جا بیٹھی اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ میری پہلی شب تنہائی تھی جو میں نے جاگ کر کاٹی۔ مجھے یاد ہے اسی کمرے میں، جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں۔ میں پہروں کھڑکی کے ساتھ لگا، کھائی میں اگی ہوئی ویران جھاڑیوں کو تکتا رہا تھا۔ جانے پچھلی رات کا کون سا پہر ہوگا کہ میری جلتی ہوئی آنکھوں پر رحم دل نیند نے اپنی حنا میں ڈوبی ہوئی خوشبودار انگلیاں رکھ دیں اور میں سو گیا اور خواب میں دیکھا کہ آلیو اسی خوش پوش آدمی کے ساتھ ایک پھولوں سے لدے ہوئے باغ کے کنج میں بیٹھی ہے اور آنکھوں میں آنسو لیے اسے اپنا سرخ رومال محبت کی نشانی کے طور پر دے رہی ہے۔ اور جیسے میں ایک بہت بڑے، بے برگ و بار، سیاہ درخت کے روپ میں پاس ہی کھڑا ہوں اور میرے تنے سے بہتے ہوئے سرخ خون کا ہر قطرہ یاقوت بن کر نیچے گر رہا ہے۔ پھر جیسے ایک یاقوت اچانک نسواری رنگ کی کار بن گیا اور یہ کار پوری رفتار سے سڑک پر بھاگنے لگی اور آلیو کے بال ہوا میں وحشی بن کر اڑنے لگے اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ بھینچ لیے اور پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا اور دوسرے لمحے آلیو کی لاش سڑک کی مٹی میں پڑی تھی، اس کی آنکھیں سرخ رومال میں چھپی ہوئی تھیں اور نازک گردن پر گہرے زخم کا نشان نیلا نشان تھا —— میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرہ سنسان تھا۔ صرف اس کھڑکی میں سے ستاروں کی پھیکی کمزور سی چمک اندر آ رہی تھی۔ میں کسی سحر کے تحت اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور جلتی ہوئی خشک آواز میں آہستہ آہستہ آلیو کو پکارنے لگا۔

آلیو! آلیو!

مگر وہاں کون تھا جو مجھے جواب میں کہتا۔ کہو۔ کہو۔۔۔۔ میں یہاں ہوں۔۔۔۔ باہر درخت اندھیرے میں سر جھکائے سائیں سائیں کر رہے تھے۔

دوسرے روز میں نے لیزا سے آلیو کے نئے دوست کے بارے میں پوچھا۔ اب وہ میری راز دار بن گئی تھی اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں آلیو کو چاہتا ہوں، صرف اسے چاہتا ہوں اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیزا نے بتایا کہ وہ آدمی کسی بہت بڑی غیر ملکی فرم

کا ایجنٹ ہے اور آلیو کو بڑے قیمتی تحفے دیا کرتا ہے وہ انہیں ضرور پسند کرتی ہے مگر محبت نہیں کرتی۔ آلیو ایسی لڑکی ہے جو شاید کسی سے محبت نہیں کر سکتی — — لیکن میں تو ایسا لڑکا نہیں ہوں لیزا۔ میں تو اس سے محبت کرتا ہوں۔ ایسی محبت جس نے آلیو کی پیدائش سے پہلے جنم لیا تھا۔ مجھے بتاؤ، اس نے کبھی تم سے میرا ذکر نہیں کیا؟ کبھی میری بات نہیں کی؟ لیزا کے ہاتھ میں نرگس کے پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ وہ خاموش نگاہوں سے پھولوں کو دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے کہنے لگی۔ کبھی کبھی مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ آلیو اگر اس دنیا میں کسی سے پیار کرتی ہے وہ تم ہو۔ اگرچہ اس نے میرے سامنے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن عورت، عورت کے دل کا حال بہت جلد معلوم کر لیتی ہے۔ ایک دن وہ مجھے کہہ رہی تھی۔ لیزا یہ کیسا عجیب سا لڑکا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جب سے پیدا ہوا ہے مجھے چپ چاپ ٹکٹکی لگائے تک رہا ہے اور منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ کبھی کبھی میں شوروم میں اسے دیکھتی ہوں۔ کہ یہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کتابوں کی الماریوں کے پاس جاتا ہے ایک پل کے لیے رکتا ہے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہے۔ چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ پھر ایکدم اداس ہو جاتا ہے اور کوئی پرانی سی جلد والی کتاب کھول کر اس کے ورق الٹنے لگتا ہے۔ گویا کوئی بدنصیب شہزادہ ہے جو اجاڑ قلعے میں مرے ہوؤں کا ماتم کرنے کے لیے اکیلا رہ گیا ہو۔ یا کوئی اگلے وقتوں کی بھٹکی ہوئی روح ہے جس کی باتیں غمگین اور بڑی دل پر اثر کرنے والی ہیں مگر جنہیں کوئی نہیں سنتا۔ کوئی نہیں سمجھتا ....

لیزا خاموش ہو گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلدستہ لیا۔ زرد پھولوں کو آنکھوں سے لگایا اور انہیں واپس کر دیا۔ لیزا کچھ نہ بولی۔ جاتے ہوئے اس نے وہ پھول میری میز پر رکھ دیئے۔

اب آلیو اکثر اس خوش پوش ایجنٹ کے ساتھ نظر آنے لگی۔ وہ اپنی چھوٹی نسواری کار میں اس کے دفتر بھی آنے لگا۔ کبھی دوپہر کو لنچ کے لیے شیزان بھی لے جاتا اور کبھی دفتر سے اسے گھر تک چھوڑتے چلا جاتا۔ ایک روز برسات کا موسم تھا اور بارش سے لدے ہوئے سیاہ کالے بادل مال روڈ والے درختوں کے بالکل اوپر جھک آئے تھے اور خنک ہوا چل رہی تھی کہ میں یونہی دفتر سے اٹھ کر پھرتا پھراتا ڈانسنگ سرکل میں جا پہنچا۔ دو روز پہلے میں نے آلیو کو لیزا کے ہاتھ پنک کلر کا ایک خوبصورت ریشمی سکارف بھجوایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آلیو وہی سکارف گلے میں ڈالے، اسی ایجنٹ کے ساتھ ایک طرف بیٹھی کافی پی رہی ہے۔ میں چپکے سے ایک کونے میں بید کی کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے منگوائی۔ آلیو نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں ذرا اندھیرا تھا اور دوسرے آلیو کا چہرہ میری طرف نہ تھا۔ ہال میں ایک دم ریڈیوگرام پر ناچ کی موسیقی شروع ہو گئی اور آلیو نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور اپنے ایجنٹ دوست کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ میرا سکارف اس کے بھورے بالوں سے لپٹ کر لہرانے لگا اور وہ خوشبوؤں کے دائرے بناتی فلور پر اڑتے ہوئے پھول کی طرح چکر کھانے لگی۔ ایجنٹ کا بازو اس کی آغوش میں تنگ ہوتا جا رہا تھا اور وہ آلیو کو میووں سے لدی ہوئی جھکی ہوئی شاخ کی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کا پردہ پرے ہٹا کر ایک پٹ کھول دیا اور باہر جھانکنے لگا۔ پہلی بارش کی دو تین گرم بوندیں میرے ہاتھ پر گریں اور پھر بڑے زور کا مینہ برسا۔ بادل گرجا اور بجلی چمکی اور میں اسی موسلادھار بارش میں وہاں سے چل پڑا اور واپس شوروم میں آ گیا۔ اور کونے والی الماریوں کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور ہمہ تن گوش ہو کر کھلے ہال کی چھت پر گرتی بارش کے شور کو سنتا رہا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بہت بڑے درخت کے نیچے بیٹھا ہوں اور شوروم کی ساری الماریاں، کتابیں، رسالے، آدمی، عورتیں —— اوپر سے آتے ہوئے تند اور پرشور پہاڑی نالے کی طوفانی لہروں میں بہہ کر جا رہی ہیں۔ اور لاکھوں صورتیں لاکھوں آوازیں، آپس میں گھل مل کر ایک ہی صورت ایک ہی آواز میں ڈھل رہی ہیں، جو پہچانی نہیں جا رہی، سنائی نہیں دے رہی،

پھر جیسے اچانک گمازدوی کے سیب کے درخت والے پرسکون، سوئے ہوئے گاؤں میں آ گیا ہوں اور جلیوبڑ کے چھپروں کے پاس کھیت میں بیٹھا ہوں اور منگی، ٹوکری کا ہاتھ میں لیے، سامنے کی ڈھلان سے اتر کر میرے قریب آ کھڑی ہو گئی ہے اور اس کے سر کے اوپر نیلے آسمان پر شفاف سورج چمک رہا ہے اور سیب کے شگوفوں میں سے میٹھی، مہدار، گرم خوشبو اٹھ رہی ہے اور منگی کا چہرہ گرمی میں دمک رہا ہے اور ہونٹوں پر پسینے کے موتی جھلملا رہے ہیں اور میں اس سے پوچھ رہا ہوں کیا یہاں تھوڑی سی رات بسر کرنے کو تھوڑی سی جگہ مل جائے گی؟ .... جگہ مل جائے گی؟ ......

پھر ایک گنجے سروالے گاہک نے جھک کر پوچھا۔

"ڈی ویکیٹو کا تازہ پرچہ آ گیا کیا؟"

اور میں ایکدم چونک اٹھا۔ میرا سگریٹ میرے ہاتھ میں ہی بجھ چکا تھا اور چھت پر بارش کا شور اسی طرح گونج رہا تھا۔ اس گنجے گاہک کی طرف دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ زندگی سیب کے درختوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

مارچ کے پہلے ہفتے آلیو نے اپنی سالگرہ منائی۔ لیزا کے ہاتھ اس نے مجھے بھی دعوت نامہ بھجوایا۔ وہاں جانے کو میرا دل نہ مانا مجھے معلوم تھا کہ وہ خوش پوش ایجنٹ وہاں ضرور موجود ہو گا۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ چلو آلیو کے درشن تو ہو جائیں گے، میں لیزا کے ہمراہ آلیو کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے سالگرہ کے تحفے کے لیے فارول سینٹ کی ایک بڑی شیشی اور جاپانی سلک کا پیازی رومال خرید لیا تھا۔ آلیو کا گھر ریلوے کالونی میں کیتھولک چرچ کے پاس ہی تھا۔ ہرے بھرے باغیچے والا چھوٹا سا کاٹیج نما گھر تھا جس کے دروازے پر جنگلی گلاب کی جھاڑیوں نے محراب سی بنا رکھی تھی۔ شام ہو رہی تھی کہ ہم اس محراب کے نیچے سے گزر کر آلیو کے گھر میں داخل ہوئے۔ باغیچے میں سبزے کی وجہ سے خنکی تھی اور اندر کمرے کی فضا نیم گرم تھی مجھے یوں لگا جیسے میں نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ کسی لڑکی کے گرم کوٹ کی جیب میں ڈال دیا ہو۔ آلیو نے ہلکے سبز رنگ کا خوبصورت ریشمی فراک پہن رکھا تھا اور اس کا رنگ پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گیا تھا۔ وہ اسی خوش پوش ایجنٹ اور اپنے گھنی مونچھوں والے سخت مزاج چچا کے ساتھ کھڑی مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ سبھوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے گرم اور ملائم پروں والی فاختہ مٹھی میں لے لی ہو۔ کمرے میں لمبے رخ پر میزیں جوڑ کر ان پر چائے کا سامان چن دیا گیا تھا۔ کچھ مہمان دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ ٹولیوں میں بٹے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے دیوار پر ایک چھوٹی سی صلیب لگی ہوئی تھی جس پر یسوع مسیح کو مصلوب دکھایا گیا تھا۔ آتشدان پر چند ایک گھریلو تصویروں کے ساتھ عیسائی راہبوں کی تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان سنہری جلد والی مقدس بائیبل پڑی ہوئی تھی۔ داہنی جانب پارٹیشن کی دیوار کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور اندر سے کپڑوں والی الماری، آدھی مسہری اور ایک پھٹا ہوا بھدا صوفہ دکھائی دے رہا تھا۔ مہمانوں میں ہر قسم کے کرسچین، ہندو اور پاکستانی لوگ تھے ان میں داڑھیاں، گون، شلواریں اور فینائل کی بو چھوڑتی اچکنیں، پرانی گرگابی محنت سے استری کی ہوئی پتلونیں، خوب رگڑ کر شیو کیے ہوئے چہرے، کریم، پاؤڈر، سینٹ اور لپ سٹک کی خوشبوئیں، میلے پائپ اور سگاروں کے دھوئیں، چوڑے تکونی کالر، تنی ہوئی سوکھی گردنیں، بھڑکیلی ٹائیاں، ترچھی آنکھیں، کالے رنگ منڈھی ہوئی بھنوئیں اور بے وجہ کھلی ہوئی بتیسیاں اور تازہ تازہ کی ہوئی حجامتیں تھیں جن کی وجہ سے سر گردنوں سے الگ معلوم ہو رہے تھے۔ میز کے بیچ بیچ میں گلدانوں میں خوب کھلے ہوئے گلاب رکھے تھے۔ کمرے کی فضا، تمباکو، پھولوں، ریشمی لباس سینٹ اور لوگوں کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھی۔ کیک کٹنے کے بعد چائے میزوں کے اردگرد گھوم پھر کر پی گئی۔ مہمانوں نے بڑی فراخدلی سے انڈے، کریم کی گجوریں۔

اور میز پر چائے، بسکٹ اور تازہ کیک کھانے جن پر زعفران چھڑکا گیا تھا۔ آئیرس کا گھنی مونچھوں والا چچا بار بار مہمانوں کے آگے کیک والی پلیٹ پیش کرتا اور پھر بھنویں سکیڑ کر ایسی غضب ناک نگاہوں سے دیکھتا کہ مہمان کی جرأت نہ ہوتی کہ ٹکڑا اٹھا لے۔ ایک دیو ہیکل موٹا بھدا انجن ڈرائیور بیئر پی کر آ گیا تھا اور اب کالے رنگ کا میلا پائپ جبڑوں میں لیے بھم بھم کر اپنے ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کا منحنی سا مسکین صورت ساتھی پیالی ہاتھ میں لیے دانتوں سے ناخن کاٹ رہا تھا اور اُس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔ اس اثنا میں وہ خوش پوش ایجنٹ مسلسل آئیرس کے ساتھ رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آئیرس بھی اُس سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ چائے کے بعد ساتھ والے کمرے میں جہاں سالگرہ کے تحفے میز پر سجے ہوئے رکھے تھے، گراموفون پر مسیح کی دھن کے ریکارڈ لگائے گئے اور جوڑوں نے ہنسی مذاق اور قہقہوں کے شور میں ناچنا شروع کر دیا۔ آئیرس ناچنا نہ چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں وہاں موجود تھا۔ شاید ...... لیکن اس خوش پوش ایجنٹ کے اصرار پر کچھ شرما کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اُس کے ساتھ لگ کر ہولے ہولے رقص کرنے لگی۔ مختلف قسم کی خوشبوؤں، جسم کی گرماہٹ، چاندی ایسی روشنی کی تیز جگمگاہٹ، مسکراتے چمکدار چہروں اور گونجتی ہوئی موسیقی کے باوجود وہاں یکدم ویرانی سی چھائی اور ہر چیز دھندلی ہوتے ہوتے نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی۔ لیزا گراموفون کے پاس صوفے کے بازو پر بیٹھی منہ سے موسیقی کی نقل اتار رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر چپکے سے اُس کے پاس گیا۔ آئیرس کے تحفوں والا پیکٹ اُس کے حوالے کیا اور اُسے کچھ حیران سا چھوڑ کر دیوار والی یسوع مسیح کی مصلوب شبیہ کو عقیدت سے ہاتھ جوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر سورج ڈوب چکا تھا اور اندھیرے میں کھلے ہوئے پھولوں کی اداس خوشبوؤں میں کیتھولک چرچ کا تاریک مینار زنگ آلود، بے نور آسمان کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ میں وہاں سے چپ چاپ گزرتا سڑک پر آ گیا۔ آئیرس کے گھر سے آنے والی موسیقی اب مدھم ہو گئی تھی اور مجھے اپنے آپ پر ایک ایسے جہاز کا گمان ہو رہا تھا جس کے سینے میں سمندر کی کسی چھپی ہوئی چٹان سے ٹکر کھا کر گہرا شگاف پڑ گیا ہو اور وہ اپنے ڈیک پر ڈوبنے والے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی فلک شگاف چیخوں کے باوجود گہرے پانیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو ...... ڈوبتا جا رہا ہو ......

دو مہینے بعد مئی کی ایک گرم شام کو میں نے پہلی اور آخری بار آئیرس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ وہ مجھے لیزا کے ساتھ لارنس کے اوپن ایئر کیفے میں مل گئی۔ اس نے ہلکے وائلٹ رنگ کے ریشمی فراک کے ساتھ بالوں میں گلاب کے سفید پھول لگا رکھے تھے۔ لیزا نے مجھے وہاں دیکھ کر پاس بلا لیا۔ آئیرس نے آنکھیں جھکا لیں۔ وہ کچھ اداس معلوم ہو رہی تھی۔ یا شاید میں اُسے دیکھ کر اداس ہو گیا تھا۔ لیزا بھی کچھ پریشان سی تھی اور مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ آئس کریم کھا رہی تھی اور آئیرس چائے پی رہی تھی۔ لیزا نے چائے کی دوسری پیالی بنا کر میرے آگے رکھی اور جیسے کسی بڑے اہم موضوع کو ٹالنے کے لیے یونہی موسم کی باتیں کرنے لگی۔ میں چائے پیتے ہوئے آئیرس کی جھکی ہوئی پلکیں اور خمیدہ و بلند دل کے سلسلے دیکھتا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مئی کی یہ گرم شام اپنے دہکتے ہوئے طشت میں سفید پھولوں کے ڈھیر لے کر بھی آ سکتی ہے۔ ہوا گرم تھی اور آئیرس کی طرف سے جو جھونکا سا جھونکا آتا اُس میں پھول کی اداس خوشبو بھی ملی ہوتی۔ ابھی پہلا جھونکا ہی میرے ہونٹوں کو چھو کر گزرا تھا کہ لیزا نے رک رک کر اپنی طرف سے بڑی بے نیازی سے بتایا کہ پرسوں آئیرس کی منگنی ہو رہی ہے۔ اور لڑکا ایک فرم میں ایجنٹ ہے ......

چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور سامنے والے گھاس کے میدان میں درختوں کے پیچھے سرخ رنگ کا خون آلود گول چاند ابھرتا چلا آ رہا تھا۔ اور گرد اس قدر گہری خاموشی چھا گئی کہ میں نے سرخ چاندنی کو کان لگا کر سنا اور آئیرس کے بالوں میں لگے

ہوئے سفید پھولوں کو غور سے دیکھا۔ ان پھولوں پر اب سرخ چاندنی نے خون ایسے رنگ کے چھینٹے پھینک دیے تھے۔ میں نے پیالی میز پر رکھ دی اور آلیو کا ننھا سا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے آہستہ سے کہا۔ آلیو! آلیو! منگنی، شادی، بیاہ، موت کسی اور ہی ملک کی زبان ہے، میں اس زبان سے ناواقف ہوں۔ میں صرف غم کی زبان بولتا ہوں۔ اور محبت کی بولی سمجھتا ہوں جس طرح کوئی خاردار بیل ننھے سے پودے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اسی طرح تمہاری محبت نے مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ کئی رتجگوں کے اندھیروں کے جگ بیتے کہ پہلی بار مجھے تاریک بیکراں خلاؤں میں زندگی کی ایک پھلجھڑی چھوٹی تھی اور میں تمہارے شعلے سے لپٹ کر ہلاک ہو گیا تھا اور کئی روشنیوں کے، اندھیروں کے اور جگ بیت گئے کہ میں ہمیشہ کے لیے اسی شعلے میں ڈھل جاؤں گا۔ میں نے ہمیشہ تم سے خاموشی کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ اس لیے کہ محبت کی سلطنت پر جادو بھری خاموشی کا راج ہے۔ اس آسیب زدہ قلعے میں جو کوئی بھی ہے مہر بلب ہے۔ تم بار بار بچھڑ کر ایک بار پھر بچھڑ رہی ہو۔ وقت پرانی یادوں کے چیتھڑوں کو بیلوں اور خود رو جھاڑیوں سے ڈھانپ ضرور سکتا ہے۔ انہیں ختم نہیں کر سکتا۔ میں زندگی کے تمام خود رو غموں اور دکھوں کے جھاڑ جھنکاڑ میں بکھر کر بھی تمہیں نہ بھلا سکوں گا۔ تم نے اپنی پراسرار مسکراہٹوں کے اتنے پھول کھلا دیے ہیں کہ میرے دونوں ہاتھ پھولوں سے بھر گئے ہیں۔ میں انہیں اپنی جھولی میں سمیٹ کر زندگی کے ان تمام گرم ہاتھوں اور خاک اڑاتی گلیوں میں سے گزر جاؤں گا اور ایک کبھی طلوع نہ ہونے والے دن اور کبھی غروب نہ ہونے والی شام کی تاریک دھند اور نورانی اندھیروں کے درمیان، کسی ان کہے، ان دیکھے سبز دریا کے کنارے نیم کے پتھروں پر بیٹھا، دامن میں سفید پھول لیے تمہارا انتظار کروں گا۔ تمہاری راہ دیکھوں گا۔ کیا تم آؤ گی؟ تم آؤ گی؟ ......

پھر میں آہستہ سے اٹھا۔ آلیو کے بالوں میں سے ایک سفید پھول نکالا۔ اُسے آنکھوں سے لگایا اور گھاس کے میدان میں اُس طرف چل پڑا، جدھر سرخ چاند، زرد چاند، طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے ایک پل کے لیے بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ آلیو مجھے کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کیسے دیکھ رہی تھی اب میرا چہرہ اُبلتے ہوئے گہرے سُرخ چاند کی جانب تھا جس میں صدیوں کی محبتوں کا خون چھلک رہا تھا اور ان گنت روتی ہوئی لال لال آنکھیں میری طرف ٹکٹکی لگائے تک رہی تھیں۔

کرسمس کی شام آ گئی۔

آلیو کی اُس خوش پوش الیجٹ سے منگنی ہو چکی تھی۔ میں کچھ کچھ گوشہ نشین سا ہو چلا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے چچا کے پاس گاؤں چلا جاؤں اور باقی زندگی وہیں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے گزار دوں۔ مگر حالات کی نزاکت مجھے اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ہمارے ہاں حالات عورتوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ دو سو اور دو سو روپوں کی نوکری کرو۔ دس میل روزانہ سائیکل چلاؤ۔ پونے دو سو روپے لا کر گھر کے اخراجات کے لیے دو اور باقیوں میں جس طرح بھی ہو اپنا گزارہ کرو۔ اور اگر اس کے باوجود کسی سے محبت ہو جائے کسی چھپی ہوئی چٹان سے جہاز ٹکرا جائے اور سینہ شق ہو جائے تو خاموشی سے اپنے ڈیک پر بلند ہوتی ہوئی چیخوں کو سنتے رہو اور آہستہ آہستہ تاریک گہرے پانیوں میں اترتے جاؤ......... اترتے جاؤ۔

خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہی چلیں گی۔ میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ کرسمس کی شام آ گئی

میں نے آلیو کے لیے ایک چھوٹا سا ایک بٹوا اور ایک خوبصورت کرسمس کارڈ خریدا اور شام کو اُن کے گھر کی جانب چل پڑا۔ کارڈ بڑا خوبصورت تھا۔ اُس پر زیتون کی ایک شاخ بنی تھی جس کے ساتھ قندیل جل رہی تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی اور بازاروں میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔

آلیو مجھے اپنے مکان کی عقبی گلی ہی میں مل گئی۔ وہ احاطے میں کچی دیوار کے ساتھ جس پر انگور کی خشک بیل چڑھی ہوئی تھی، مرغیوں کے ڈبے میں سے انڈے نکال رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ وہاں اس وقت کوئی نہ تھا۔ ذرا پرے مکان کی دیوار کے ساتھ دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا۔ آلیو نے ہلکی اونی

شال اوڑھ رکھی تھی اور سردی میں کانپ سی رہی تھی۔ اس کے بال گیلے تھے چہرہ شگفتہ تھا اور جسم میں سے خوشبودار صابن کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی اور کسی شاندار پارٹی میں شامل ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ کرسمس مبارک ہو آلیو! وہ کچھ نہ بولی اور دیوار کے ساتھ سمٹ سی گئی۔ میں نے کیک کا پیکٹ اور کارڈ دیا۔ اُس نے پلکیں اٹھا کر مجھے بڑی اداس اور پشیمان سی نظروں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ میں آلیو کے اور قریب ہو گیا۔ میں نے اس کا چہرہ نازک پھول کی طرح اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور فارول کی خوشبو مجھے اپنی غلافی آنکھیں گھورے دیکھ رہی تھی اور وہ زیتون کی کمزور ٹہنی کی مانند تیز ہواؤں میں لرز رہی تھی اور میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اور شاخ پر جلنے والی قندیل کے شعلے نے بھڑک کر سارے درخت کو سارے جنگل کو اپنی خون آشام آگ کی لپیٹ میں لے لیا اور آسمان پرندوں کے راگ اور گرجا گھروں کی گھنٹیوں اور مناجات کی صداؤں سے گونج اٹھا اور آلیو جلدی سے مکان کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ اس روز شام کی تقریب، منجمد ویرانی میں مجھے ایک شعلے کی طرح بھڑکتی ہوئی خوں رنگ چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ میرے اُن بازوؤں سے بلند ہوئی تھی جن کے حلقے میں فارول کی گرم لہریں آلیو کا سانس بن کر سمٹ آئی تھیں۔ پھر میں کئی بار آلیو کے مکان کی عقبی گلی میں سے گزرا اور کچی دیوار پر پھیلی ہوئی انگور کی بیل کے قریب پہنچ کر کئی بار اُس وحشی شعلہ فشاں چیخ کو سنا۔ لیکن آلیو کہیں نظر نہ آئی۔ کہیں دکھائی نہ دی۔ اور آج صبح لیزا نے مجھے بتایا کہ کل آلیو کی شادی ہو رہی ہے۔

ہاں۔ کل آلیو کی شادی ہو رہی ہے اور کل ہی دریا کے پرچم سرنگوں ہوں گے اور سیب کے شگوفے ٹہنیوں پر سے ٹوٹ کر خاک پر گر پڑیں گے اور میرے پیار کی لاش چشمے کے نیلے پانی میں پتھروں پر ملے گی۔ اس نے دلہن کا لباس پہنا ہو گا اور بالوں میں سیب کے پھولوں کی ننھی سی ٹہنی لگا رکھی ہو گی۔ آلیو کے بالوں سے اتارا ہوا سفید گلاب میرے پاس ہے۔ وہ مرجھا گیا ہے اور اس کی پتیاں خشک ہو کر زرد ہو گئی ہیں۔ یہ پھول میرے ساتھ جائے گا اور میرے ساتھ ہی ایک بار پھر زمین کی تاریک تہوں کو چیر کر نمودار ہو گا۔ اب میرے سامنے ایک اور جنم کا انتظار ہے۔ طویل اور دشوار گزار۔

اب آلیو مال کے بس سٹاپ پر سے نہیں اترا کرے گی۔ اب کوئی فارول کی اداس خوشبو اڑاتا، چپ چاپ قدم اٹھاتا فٹ پاتھ پر سے نہیں گزرا کرے گا۔ مگر میں پیپل کے درخت تلے کھڑا ہو کر اُس گھڑی کا انتظار کروں گا، جب آلیو وہاں سے اپنے بچے کو لے کر گزرے گی۔ وہ بہت تیز ہوا کا آخری دن ہو گا اور پیپل کے سارے زرد پتے ایک ایک کر کے بجری پر گر چکے ہوں گے۔ صرف ایک پتا باقی ہو گا کہ آلیو اپنے معصوم بچے کو ساتھ لیے مجھے دیکھے بغیر وہاں سے گزر جائے گی اور وہ پتا اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر جھکولے کھاتا، سسکیاں بھرتا میرے قدموں میں آن گرے گا۔ پھر میں اُسے اٹھا کر، اپنے کوٹ کی اندر والی جیب میں چھپا کر شو روم میں واپس آ جاؤں گا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاؤں گا۔

آلیو! آلیو! ہم بھی تمہاری محبت میں اسی خشک پتے کی طرح اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر فٹ پاتھ پر آن پڑے ہیں اور وقت کی تیز آندھی ہمیں اڑائے لیے پھر رہی ہے۔ کبھی اس جنگل میں، کبھی اس ویرانے میں —— کل تمہاری شادی ہو گی، تم دلہن بنائی جاؤ گی۔ تم پیتم دیس بسانے گھر سے نکلو گی اور ہم گاؤں کنارے بیٹھ کر تمہاری بارات کی شہنائیاں بھی نہ سن سکیں گے۔ جانتی ہو جب ہمارے ہاں دلہن گھر سے نکلتی ہے تو اس کی سہیلیاں کون سا گیت گاتی ہیں؟ وہ ہاتھ میں حنا آلود ریشمی رومال تھامے ہچکیاں لیتی دلہن کی طرف اپنے سوگوار چہرے اٹھا کر کہتی ہیں۔

ہمیں بھلا تو نہ دو گی؟

دلہن!

......نئی بیاہی دلہن!

معاً اگر تم دلہن بن کر ہمارے گھر ـــــ آتیں تو میری بہنیں رات بھر سرخ کپڑے پہن کر ڈھولک پر گیت گاتیں۔ میری ماں مکان کی دہلیز پر سرسوں کا تیل انڈیل کرتیں، تمہیں اپنے گلے سے لگا لیتیں اور پھر ـــــ پھر ایک ایک کر کے سب عورتیں آنچل اٹھا اٹھا کر تمہارا مکھڑا دیکھتیں تم شرما جاتیں اور وہ ہنس ہنس کر کہتیں: شرماؤ نہیں دلہن! اُٹھیو: آ ری! ....

اس کے بعد کمرے میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ میرا دوست خاموش تھا، چپ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر جیسے خاک اڑ رہی تھی۔ اور کھڑکی سے باہر پچھلی رات کا زرد چاند ویران کھائی کے بالکل اوپر جھک آیا تھا۔

جونکیں

مہندر ناتھ

آشا جب بستر سے اُٹھی۔ تو اُس کے سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ نہ جانے یہ درد کی لہریں کہاں سے آگئی تھیں۔ جو اُس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی تھیں۔ کئی دنوں سے اُسے صرف ایک ہی خیال ستا رہا تھا۔ کہ آنند کا خط کیوں نہیں آیا۔ کیا وہ آرہا تھا۔ یا نہیں۔ گھر کا ماحول اُسے کاٹنے کو دوڑتا تھا زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس سی محسوس کر رہی تھی۔ گھر میں سب کی نگاہیں آشا پر تھیں۔ کیونکہ زندگی کی ضروریات آشا ہی پوری کر رہی تھی۔ اگر آشا نے اپنی زندگی کے ساتھ ہولی کھیلی ہوتی۔ تو یہ سارا کنبہ کبھی کا مر کھپ گیا ہوتا۔ لیکن آشا کی تگ و دو کی بدولت یہ کنبہ آج تک دو وقت کا کھانا کھا رہا تھا۔ بڑے بھائی نے شادی کر کے الگ مکان لے لیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے پان کی دوکان کھول لی تھی اور ساتھ ہی شادی کر لی تھی۔ اور اُس کی زندگی پان کی دوکان اور ایک موٹی بیوی اور ایک بدصورت بچے کے گرد طواف کر رہی تھی۔ بڑی بہن ایک آوارہ مزاج عورت تھی جس نے اپنی ساری زندگی آوارگی اور عیاشی کے سپرد کر دی تھی۔ اُس نے بھی اپنی منزل تلاش کر لی تھی۔ اس بڑھاپے میں جو اس کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ جب شباب کا سارا رس نکل جاتا ہے اور جسم میں ایک ڈھیلا پن سا آ جاتا ہے۔ جب کنپٹیوں کے آس پاس بال سفید ہونے لگتے ہیں۔ جب ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت اپنی جگہ چھوڑنے لگتا ہے اور جب بڑھاپا آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ موت کی دستک آہستہ آہستہ سنائی دیتی ہے۔ اس موقعے پر بھگوان نے بہن کی دعائیں قبول کر لیں۔ پرانے گناہ معاف کر دیئے۔ اور پرماتما نے اُسے ایک شخص کے قریب لا کھڑا کر دیا۔ جو اُسے دو وقت کھانا۔ ایک عدد کھولی۔ اور ساتھ ہی آدھے دل کی زندگی دی جس میں بھوک اور پیاس اپنے جبڑے کھولے ڈرا رہی تھی ان سب ہیبت ناک چیزوں کو ایک لمحے کے لیے دور پھینک دیا تھا۔

لیکن آشا ابھی تک اکیلی تھی۔ اُس نے گھر کے ہر فرد کے لیے سب کچھ کیا تھا۔ اپنے جسم کی بازی تک لگا دی تھی۔ اپنی آشاؤں اور تمناؤں کا خون کیا تھا۔ اپنے جسم اور جوانی کو بیچا تھا۔ لیکن نتیجہ ایک ایک کر کے سب لوگ اُس سے الگ ہوتے گئے۔ ہر شخص اپنے محور کے گرد گھوم رہا تھا۔ اور آشا آج زندگی کی دہلیز پر بالکل اکیلی کھڑی تھی۔

وہ بستر سے اُٹھی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ صبح کے وقت اُسے اپنی صورت کبھی اچھی نہ لگی۔ نہایت دُبلا پتلا سا چہرہ۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے۔ چہرے کی رنگت زرد۔ زرد سی۔ بالوں کی نرمی اور اُن کی چمک آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے کپڑے جو آج سے چھ مہینے پہلے اُسے پھنس کر آتے تھے۔ آج بہت ہی ڈھیلے ڈھالے سے تھے۔ ہر چھ مہینوں کے بعد وہ اپنے کپڑوں کو دوبارہ سیتی۔ کبھی کاٹتی۔ کبھی بڑھاتی۔ کبھی کمر کے قریب اپنی قمیص کے گھیرے کو کم کرتی۔ کبھی بلاؤز کو دوبارہ سیتی اور سینے کے پھیلاؤ کو دوبارہ ناپتی۔ یہ تبدیلیاں جو اُس کے جسم میں ہو رہی تھیں اُن کے متعلق آشا کو احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو دیکھ کر جھنجھلا اُٹھتی۔

اُس کا بھی ایک زمانہ تھا۔ جب وہ پہلی بار ایک دُلہن کی طرح اس شہر میں آئی تھی۔ ناچتی۔ گاتی، لہراتی بل کھاتی ہوئی اس شہر میں وارد ہوئی تھی ہر شخص نے اُس کے متناسب جسم۔ اُس کی متبسم آنکھوں۔ اس کی پتلی کمر، اُس کے گیسوؤں اور اُس کے لمبے قد کی تعریف کی تھی جس شخص نے اُسے دیکھا ایک لمحے کے لیے وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ایک مسکراہٹ لیے ہوئے۔ ہتھیلی پر دل۔ چیک بک جیب میں ڈالے ہوئے۔ مستقبل میں اُمیدوں اور تمناؤں کا چراغ روشن کیے ہوئے۔ اپنی جانِ تمنا بنانے کے لیے بیقرار نظر آتا۔ اُس کی اداس راتوں میں گرمی پیدا کرنے کے لیے۔ اس کی روح میں بیقراری کے لمحات کا اضافہ کرنے کے لیے۔ ہر ملنے والا بڑی گرمجوشی سے ملتا۔

لیکن آشا کی رُوح اِن لوگوں سے سیراب نہ ہوتی۔ ہر آنے والے مرد میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی۔ اگر رُوپئے تھے۔ تو صورت شکل کریہہ منظر تھی۔ اگر صورت اچھی تھی۔ تو بنک بیلنس ندارد۔ اگر آنے والا قبول صورت اور بنک بیلنس کی نمائش کر رہا تھا۔ تو بڑھاپا سر سے پاؤں تک سے کرناچ رہا تھا۔ اور اگر تینوں چیزیں میسر تھیں۔ تو شخصیت نہایت ہی پراگندہ۔ باتیں کرو تو ترستے آجائے۔ ذوقِ جمال ندارد جمالیاتی حس صفر۔ بات کرنے کے بعد معلوم ہوتا۔ شاید بھیڑیا بکری کا گاہک لگ گیا تھا۔

آشا نے ان تمام مردوں کو دیکھا۔ اپنی مفلسی، غربت اور گھر میں ان بلکتے ہوئے ہوئے انسانوں کو دیکھا جو اُس کی رُوح کی دہلیز پر سسک رہے تھے۔ رو رہے تھے ——— گو یہ سب لوگ اُس سے عمر میں بڑے تھے۔ بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں نہ کر پاتے تھے کبھی حسرت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دو وقت کے کھانے کے لیے تکتے رہتے۔ یاس بھری نگاہیں لیے ہوئے۔ ڈرے سہمے سہمے ہوئے کونے میں پڑے رہتے۔ جیسے آشا ہی ان کی زندگی کا مرکز تھی۔ جیسے یہی ان کی پالنے والی پالن ہار تھی۔ کہ تم کچھ کرو۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے ہم سب بیکار ہیں — ——— ہماری طاقت گویائی چھن گئی ہے۔ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ ہم کچھ نہیں ہیں۔ کچھ نہیں ہیں۔

اُن کی سسکتی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر آشا کے دل میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا۔ یہ نگاہیں۔ جو ہر پل۔ ہر منٹ، ہر سیکنڈ۔ اُسے اپنی زندگی بیچنے کے لیے مجبور کرتی رہتیں۔

اور شاید آشا نے سوچ لیا تھا۔ کہ بھگوان نے اُسے ان تمام لوگوں کو پالنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ شاید ان تمام کو پیدا کر کے اُس نے اپنا کام ختم کر دیا تھا۔ اب آشا کی باری تھی۔ کہ ان کی سب کی کشتی کو منزلِ مقصود پر لے جائے۔ ایک ناخدا کی طرح ———

اور آشا نے اِن دس سالوں میں یہی کچھ کیا۔ انہیں کی طرف دیکھ کر۔ انہیں کی مفلسی اور غربت کا اندازہ کر کے۔ انہیں کی بھوک سے متاثر ہو کر انہیں کے مستقبل کو بنانے کے لیے اُس نے اپنی جوانی کو نیلام کر دیا۔ لیکن یہ نیلام بڑا سوچ سمجھ کر کیا۔ رُک رُک کر۔ دیکھو۔ دیکھ کر سنبھل سنبھل کر کیا۔ یہ لمحات جو بیچ میں آتے رہے۔ اُن لمحات نے اُس کی روح کو بھی پراگندہ نہ کیا۔ کیونکہ اُس کی اپنی رُوح اس نیلام میں شامل نہ تھی۔ اُس کی اپنی منزل یہ نہ تھی۔ اُسے خود رُوپیوں سے محبت نہ تھی۔ اُسے یوں زندہ رہنا مقصود نہ تھا۔ یہ سب کچھ اُس نے اپنے کنبے کے لیے کیا۔ اس دس برسوں میں چار پانچ عشق بھی کیے۔ ایک دو سوچ سمجھ کر ایک دو مجبوریوں کے تحت۔ کچھ بھائیوں کو دیکھ کر۔ کچھ ماں کی طرف نگاہ ڈال کر۔ آہستہ آہستہ یہ کارواں اپنے ٹھکانے لگنے لگا۔ اور پھر وہ اپنی زندگی شروع کرے گی۔ لیکن یہ کارواں تو بڑھتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کے ہاں ایک لڑکی ہو گئی تھی۔ بڑے بھائی کے ہاں پانچ بچے تھے۔ دو بچے آشا کے پاس پل رہے تھے۔ اور تین بچوں کے بوجھ کو خود بڑا بھائی سنبھال رہا تھا۔ سب سے زیادہ رنج تو اُسے اس بات کا تھا کہ کوئی شخص اُس کی عزت نہ کرتا۔ اُس کی ماں بھی تو یہی کہتی۔ تو رنڈی ہے، رنڈی!

ہائے یہ لفظ کہتے ہوئے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ جس کا کھائیں اُسی کو گالیاں دیں۔ اے ماں میں تیری جائی ہوں۔ تیرے ہی خون کی بوند ہوں۔ تیری رگیں، اور نسیں میرے دل و جگر ہیں — میں تم سے الگ تو نہیں، اے بھائی۔ اے میری بھابیوں۔ شرم نہیں آتی۔ تم مجھے دیکھ کر ہنستی کیوں ہو ——— اپنے من ہی من میں خوش کیوں ہوتی ہو۔ کب تم نے میرا خون نہیں پیا۔ یہ گھر میں کھسر پھسر یہ تضحیک آمیز ہنسی یعنی جب کبھی آنند آتا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو سنوارنے لگتی ہوں۔ اپنے بال دھوتی ہوں، انہیں سکھاتی ہوں۔ اپنے بدن پر لپ سٹک

لگاتی ہوں۔ اور اُس کے انتظار میں ایک خوبصورت نیلی ساڑی پہنتی ہوں۔ یہی ساڑی تو انہیں پسند ہے نا۔ تو تم جل بھن کر خاک ہو جاتی ہو۔ محلے والوں سے جاکر کہتی ہو۔ "اسے بھی وہ آج آنے والے ہیں"۔ ماں تم بھی خوش نہیں ہوتیں۔ جس دن سے وہ آتا ہے یا اُسے آنا ہوتا ہے۔ تم کیوں مجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کرتی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ تم ہی سے ہر شخص کو معلوم ہے کہ میں کیا کرتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تم میری کمائی پر زندہ ہو۔ مجھے تو آنند سے محبت ہے میں آج کل دن رات اُس کا انتظار کرتی ہوں۔ دن رات اُس کی مالا ہوں۔ اُس کا نام لیکر زندہ ہوں۔ جب اُس کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ماں دیکھو تو۔ مجھے کیا ہو گیا۔ میں تو پہلی سی نہیں رہی۔ چہرے پر وہ شگفتگی نہیں رہی۔ وہ رونق نہیں ہے۔ آواز میں وہ نغمگی نہیں۔ دن بدن دُبلی ہوتی جا رہی ہوں۔ ان دس سالوں میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پھر بھی تمہیں رحم نہیں آتا۔ شاید میں رحم و کرم کے قابل ہی نہیں۔ میں تو رنڈی ہوں ماں۔ جو رنڈی کی کمائی کھاتے ہیں انہیں کس نام سے پکارا جاتا ہے۔ چھوڑو آشا۔ ماں کو مت گالی دو۔ ان بھائیوں کو مت کوسو۔ نا سمجھ ہیں نا۔

آج آسمان بڑا خوبصورت تھا۔ دھوپ میں ایک نشہ سا تھا۔ سامنے کے مکان پر کبوتروں کا ایک جوڑا۔ ایک دوسرے سے پیار کر رہا تھا۔ ناریل کے درخت اس خنک ہوا میں جھوم رہے تھے۔ دُور ایک جہاز سفر کے لیے اپنے پر تول رہا تھا۔ آج آنند کا خط آنا چاہیے۔ کیا وہ آج ضرور آئے گا۔ وہ آجائے گا تو وہ اپنے دل کی ساری کدورت کو اُس کے سامنے رکھ دے؟ وہ ہر چیز کو میری ہر شکایت کو۔ میری ہر التجا کو بڑے غور سے سنتا ہے۔ اور حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کمبخت بہت دُور رہتا ہے۔ تین مہینے کے بعد۔ صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے آتا ہے۔ اور چلا جاتا ہے۔ اپنا تبادلہ یہاں کیوں نہیں کرا لیتا۔ اتنی دور رہنے سے کیا فائدہ۔ خط بھی نہیں لکھتا۔ جب آتا ہے۔ تو محض ایک تار بھیج دیگا۔ اور میں اُس کے انتظار میں تڑپتی رہتی ہوں۔ گھلتی رہتی ہوں۔ اُس پر طرہ یہ کہ جس دن وہ یہاں آنے والا ہوتا ہے۔ گھر میں ہنگامہ ضرور ہوگا۔

اُسی دن تو میں خوش ہوتی ہوں۔ وہ دن تو میرا ہوتا ہے۔ باقی سب اُن کے ہوتے ہیں۔ باقی سب شامیں۔ راتیں اُن کی ہوتی ہیں۔ اُن سے کوئی کیا کہے۔ کہ اے گھر والو۔ کیا تم مجھے ایک سہانی صبح نہ دو گے۔ کیا میری زندگی کی ایک گرم رات تمہاری نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ اتنے ہی خوددار ہو۔ تو گھر سے نکل جاؤ۔ آنند بھی کہتا ہے۔ کہ اب ان کو گھر میں کیوں رکھا ہے۔ تم نے ان سب کو نوکری کے قابل بنا دیا۔ شادیاں تک کرا دیں۔ لیکن پھر بھی یہ سارا بوجھ تمہارے کندھوں پر۔ آخر کب تک۔

لیکن آنند کو کیا بتاؤں کہ یہ جونکیں ہیں آنند۔ جونکیں۔ جونکوں کو خون پینے کی عادت ہوتی ہے نا۔ وہ ساری عمر کسی نہ کسی کا خون پیتی ہیں۔ اور مجھے خون دینے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ جب تک کوئی مجھے گالی نہیں دیتا۔ مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب تک ماں مجھے رنڈی نہیں کہہ لیتی۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ جب تک بھائی یہ نہیں کہہ لیتے کہ تم کیا کچھ کر سکتی تھیں۔ اور ہمارے لیے کچھ نہ کر مجھے راحت نصیب نہیں ہوتی۔ میری قربانیوں کا یہی صلہ ہے نا؟ اور کیا کرتی۔ اور کیا کر لیتی۔ آنند۔ اب تو آ جاؤ۔ آنند۔ یہ صبح بڑی پیاری ہے۔ آسمان بے حد نیلا ہے۔ دھوپ میں ہنس کے پروں کی نرمی اور گرمی ہے مجھے اتنا نہ تڑپاؤ۔

دن کے بارہ بج گئے۔ اور ڈاکیہ آیا۔ اور ساتھ میں ایک تار۔ آشا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تار کھولا۔ لکھا تھا۔ "شام

کر آ رہا ہوں۔ تمہارا آنند۔"

آشا خوشی اور حیرت سے جھوم گئی۔ اور تار کو چوم لیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے کی چارپائی پر اُس کی ماں لیٹی ہوئی تھی۔ رسوئی میں اس کی بھابی کھانا پکا رہی تھی۔ صرسلے پر بھائیوں کے بچے لیٹے ہوئے تھے۔ ادھر نیچے فرش پر اُس کا بھائی خراٹے لے رہا تھا۔ سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ جانے وہ آئیں گے تو کیا کہیں گے۔ گھر کو سجا کر بھی نہیں رکھا۔ کیا شریفوں کے گھر ایسے ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے ہر طرف افلاس نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب لوگ کوچ کی تیاری کر رہے ہیں۔ آشا نے ہر چیز کو سلیقے سے رکھنا شروع کیا۔ صوفہ اپنی جگہ پر رکھا۔ جھاڑو سے اسے صاف کیا۔ اور پھر ہر چیز کو قرینے سے رکھا۔ تصویروں کو کپڑے سے صاف کیا۔ اپنی جوانی کی تصویر کو۔ ہائے آشا تو کتنی خوبصورت تھی۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تصویر صاف کرتے ہوئے۔ ایک تصویر نیچے گر پڑی۔ اور پلنگ پر سوئی ہوئی ماں۔ جاگ اٹھی۔ "کیا شور مچا رکھا ہے۔ آشا تم نے۔ سونے بھی نہیں دیتی۔"

"یہ سونے کا وقت ہے۔ ماں۔ بارہ بج چکے ہیں۔ بارہ"! وہ چلائی۔

"بڑھیا ہوں۔ نیند زیادہ آتی ہے نا۔ جب تم بڑھیا ہو جاؤ گی تو ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکو گی۔ دن بھر سوئی رہو گی۔"

فرش پر بھائی نے انگڑائی لی۔ اور وہ چلایا۔ "رات پالی کر کے آیا ہوں۔ لیکن اس گھر میں سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور اُس نے پھر کروٹ بدل آنکھیں بند کر لیں۔

کیا وہ اپنی ماں کو بتا دے۔ کہ آنند آج شام کو یہاں آنے والا ہے۔ اگر اُس نے بتایا تو وہ لڑنا شروع کر دے گی۔ پہلے گھر کو صاف کرے۔ چیزوں کو سجائے۔ فرش کو دھوئے۔ موری کو تیزاب سے صاف کرے تاکہ گندگی کا احساس نہ رہے۔ کپڑوں کو اچھی طرح ٹانگ دے۔ جالے صاف کرے۔ برتن سجا کر رکھ دے۔ یہ سب کچھ کرے۔ اکیلی۔ ہاں اکیلی۔ اس کام میں تمہارا کوئی ساتھ نہ دے گا۔

اُس نے اپنی چھوٹی بھابی کو ایک کونے میں بلایا۔ دیکھو بازار جا کر ایک مرغ لے آؤ۔ دو سیر ڈیرہ دون کے چاول اور ہاں پاپلیٹ کی مچھلی۔ وہ مچھلی بڑی خوشی سے کھاتے ہیں۔ کچھ پلاؤ۔ بنا لے۔ ایک آدھ میٹھی چیز۔ میری پیاری بھابی۔ اُس نے بھابی کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "سر پر پلو تو رکھو۔ اری بچوں کو تو نہلا دے۔ اچھے سے کپڑے پہنا۔ اور نتھو سے کہہ کہ وہ اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے۔ شام کو وہ.....

وہ شرما گئی۔ لجا سی گئی۔ اور ڈھلکتے ہوئے پلو کو سر پر رکھ لیا۔ "بڑی سہاگن بنی پھرتی ہے۔ بھابی۔ سب کچھ سمجھ گئی اور رسوئی کی طرف گئی۔ اور بڑبڑانے لگی۔ "بے شرم کہیں کی۔ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آج وہ آ رہے ہیں۔ رنڈی کہیں کی۔ شادی نہیں کر لیتی۔ کتنے مرد کھا چکی ہے۔ ابھی تک جی نہیں بھرا۔ محلے بھر میں ناک کٹوا رکھا ہے ہمارا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ کل ہی گلی کا مسٹنڈا میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں بھی...... ہائے رام۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اور یہ کہتے ہوئے دال میں نمک ڈالتی گئی۔

اری دال میں نمک ڈالے جاتی ہے۔ ذرا ہاتھ کو روک تو سہی۔" ماں نے چارپائی پر چلاتے ہوئے کہا۔ "تو مر جاتی تو اچھا تھا۔ نگوڑی گشتی کہیں کی مری جاتی ہے۔ وہ کیا کرے۔ اور تم لوگ کھا کھا کر بیل ہوتے جا رہے ہو۔ اتنی نمکین دال کون کھائے گا۔" وہ چلا کر بولی۔

بھابی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اُس نے زور سے ڈھکنا پتیلے پر رکھا اور پاؤں سے تھالی کو ہٹایا۔ اور قریب کھڑے ہوئے ایک بچے کو ایک تھپڑ رسید کیا۔ اور کہنے لگی۔ "کس کس کا کھانا پکاؤں۔ یہاں آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا۔ کہ شام کے کھانے کی فرمائش ابھی سے ہونے لگی۔"

"شام کو کون تیرا خصم آ رہا ہے۔ کتیا کہیں کی۔ حرام خور۔"

"آشا سے پوچھ نا۔ مجھے کیا معلوم۔ مچھلی۔ گوشت کباب۔ میٹھا۔ سب کچھ پکانا پڑے گا؟ کون آ رہا ہے۔ رنڈی چھوڑ۔" وہ بستر سے اُٹھ کر بولی۔

آشا مڑتی ہوئی ماں کے قریب آئی۔ "کوئی نہیں۔ وہ آ رہے ہیں۔ کیوں چلا رہی ہو ماں"۔

"اری تیرا مردہ نکلے۔ تو کہیں کی نہ رہے ...... وہ کون؟"

"ماں تو جانتی نہیں۔ وہ۔ ماں۔ وہ"

"تیری جوانی کو آگ لگے۔ تیری ماں مر جائے"

"نام کیوں نہیں لیتی۔ کون ہے تیرا خصم؟"

"ماں۔ وہ۔ آنند"!

"اچھا آنند آ رہا ہے" ماں نے ایک گہرا سانس لیکر کہا۔ "مُوا مُسٹنڈا۔ سانڈ۔ منہ اٹھائے چلا آوے۔ جیسے یہ اُس کے باپ کا گھر ہے۔ نہ دن دیکھے۔ نہ رات۔ بس مرنے کھانے چلا آوے۔"

"ماں۔ وہ تو تین مہینے کے بعد آ رہا ہے۔ ہر روز کہاں آتا ہے"

آشا نے شرماتے ہوئے کہا۔

"تو گھر میں رکھ لے یار کو۔ ہمیں یہاں کیوں رکھا ہے۔ اپنے بھائیوں کو گھر سے نکال دے۔ ان بچوں کو کسی دھرم شالا میں بھیج دے اس گھر کو آگ لگا دے۔ اور رکھ لے اپنے یار کو۔ میں تمہیں کیا کہتی ہوں۔ میری بات کوئی مانتا ہے۔ اری وہ دیتا کیا ہے؟ جو تو اُس پر مرتی ہے۔ جان چھڑکتی ہے۔ کتنی بار کہا۔ کہیں شادی کر لے۔ اور میری جان چھوڑ۔ میں تو چند دنوں کی مہمان ہوں۔ اُس مالدار بنئے سے تمہاری شادی ہونے والی تھی۔ ہمیں ایک مکان لے کر دے رہا تھا اور دس ہزار روپیہ دے رہا تھا۔ لیکن تو کب ماننے والی۔ گھر بھی اچھا خاصہ تھا۔ اور ہم سب چین سے رہتے۔ تیرے بھائیوں کی قسمت کھل جاتی۔ تیرے چھوٹے بھائی کی دوکان چھوٹ جاتی۔ کوئی اچھا سا دھندا کر لیتا۔ دن رات پان بیچتا رہتا ہے۔ ابھی تک مُوا سڑیا ہوا ہے۔ اتنی اچھی صورت پائی تھی تم نے۔ تم سے اُوپر والی رنڈی ہی اچھی جس نے بُرقعہ اوڑھ کر پٹھان کے ساتھ شادی تو کر لی۔ مٹی میں رو ندی اپنی جوانی تم نے۔ تم سے تمہاری بڑی بہن اچھی۔ جس نے دھندا تو بند کر دیا اور بڑھاپے میں ایک نوجوان کے ساتھ شادی کر کے گھر بسا لیا۔ لیکن تو ساری عمر کنواری رہے گی۔ ساری عمر بغیر خصم کے رہے گی۔ کیسے کٹے گی پہاڑ سی جوانی۔ جب میں مر جاؤں گی تب تو میری باتیں یاد کرے گی۔ اب نہیں۔ اری یہ بھائی تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ نہیں کما پائیں گے۔ تمہارے بھائی ایک پیسہ نہیں دیں گے تمہیں میری بات یاد رکھ۔ اے شنکر کی ماں۔ جا بازار سے مچھلی اور مرغ خرید لا۔ دال تو میں بگھارتی ہوں میں۔ اب گھر میں مہمان آئے گا کچھ تو کھلانا پڑے گا۔ اُسے مُوئے مسٹنڈے۔ شہدے۔ غنڈے کو۔ ماں بستر سے گالیاں دیتی ہوئی اٹھی۔ اور بھائی کو پانچ کا نوٹ دیا۔ لے اور بازار سے جا کر زہر لے آ یہ دونوں کھا لیں گے جب جا کر ان کا جی بہلے گا" گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ رگھو کی سکول کی فیس نہیں دی۔ چار مہینے کا کرایہ تک تو دیا نہیں لیکن آج مرغ ضرور آئے گا۔ اری کھڑی کھڑی کیا تک رہی ہے۔ باہر جا کر مرتی کیوں نہیں۔ رنڈی چھوڑ۔ گشتی کہیں کی۔ جاتی کیوں نہیں۔ حرام خور۔"

یہاں اکثر ہوتا تھا۔ یہ تو آشا کے لیے روزمرہ کی بات تھی۔ یہ گالیاں۔ یہ غصہ۔ چہرے پر کرودھ بھری لکیریں۔ ان سب سے آشنا تھی آشا اور گالیوں کو سننے
کی عادی ہو چکی تھی۔ اور ماں کو ان گالیوں کو سنانے کی عادت تھی۔ گھر کے احول میں یہ تلخی۔ یہ تندی۔ یہ گھبراہٹ۔ یہ وحشت۔ یہ زمانہ سازی یہ بہانہ بازی یہ
سب کچھ اس گھر میں ازل سے ہو رہا تھا۔ گھر کے تمام فرد اسی چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ آشا نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن نکلنا آسان نہ تھا۔ اسی لیے آشا
نے ان گالیوں کو زندگی کا ایک حصہ بنا لیا تھا جیسے گندگی اُس کی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اس پراگندگی جس کا مداوا اُس کے پاس نہ تھا اُس سے نکل کر وہ
زندگی کے کچھ لمحات۔ اپنی خوشی کے لیے رکھنا چاہتی تھی۔ آشا چاہتی تھی جیسے اُس نے اپنی زندگی کو ان کی خوشی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی طرح گھر
کے باقی افراد بغیر کسی تنقید کے
اُس کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ اور اُسے خوشی کے لازوال لمحات عطا کرنے میں فراخ دلی سے کام لیں گے۔ لیکن یہاں فراخ دلی
کہاں۔ یہاں تو تلخی اور شرارت تھی۔ یہاں تو خود غرضی تھی۔ صرف اپنے آپ کو خوش رکھنے کی تمنا تھی۔

جبھی تو آشا پر ان گالیوں کا خاص اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنے کام میں منہمک رہی۔ چھوٹے بھائی کو صوفے پر لٹا کر فرش کو دھویا۔ دری بچھائی۔
کمرے کی ہر چیز کو قرینے سے رکھا۔ خود نہائی۔ بالوں کو دھوپ میں سکھایا ——— نئے کپڑے پہنے۔ آنکھوں میں کاجل۔ لبوں پر لپ سٹک۔
اور بالوں میں تیل اور سینٹ۔ ہاتھوں میں چوڑیاں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں۔ اور گلے میں رولڈ گولڈ کا ہار پہن لیا اور پھر آنند کے انتظار میں بیٹھ
گئی۔ گھر کا ہر فرد کن انکھیوں سے آشا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھابیاں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ وہ تو بیاہی ہوئی تھیں۔ اُن کا ایک خاوند تھا۔ ہاں صرف ایک
ماتھے پر ایک ٹیکا۔ مانگ میں صرف ایک ہی ہاتھ کا سیندور نگاہوں میں ایک ہی چمک تھی۔ ایک ہی کی صورت تھی۔ ایک ہی مرد سے
آشنائی تھی۔ ایک ہی کا انتظار تھا۔

آشا کے سلسلے میں کتنے آئے۔ اور چلے گئے۔ کتنی بار مانگ بھری گئی۔ اور پھر اجڑی۔ کتنی بار وہ ہنسی اور پھر روئی۔ کتنی بار یہ گھر بنا
اور اجڑا۔ ہائے کتنے آدمی آئے اور چلے گئے۔ اور آشا نے قسمیں کھائیں۔ کہ اب وہ کسی اور سے محبت نہ کرے گی۔ لیکن چھ مہینے یا سال کے
بعد وہی چکر۔ ہر شخص نے اس گھر کی بدلتی ہوئی زندگی کو دیکھا تھا۔ لیکن ہر بار گالیوں کی بوچھار آشا کو سننا پڑیں یہ جانتے ہوئے اس گھر
کے افراد خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اگر قابل ہوتے تو کب کے یہاں سے چلے جاتے۔ لیکن کہاں جاتے کون سنبھالتا انہیں۔ سنبھالنے
والی صرف آشا تھی اور گالیاں کھانے والی بھی آشا!

بھابیوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکتی۔ سالی خود عیش کرتی ہے اور ہم صرف ایک مرد پر قناعت کریں۔ یہ مرد کتنے بھدے گندے
اور نامرد تھے۔ خود کچھ نہ کماتے تھے۔ بہن کی کمائی پر زندہ تھے۔ اُجڈ۔ گنوار۔ چپ رہنے والے ماں اور بہن کی گالیاں سننے والے۔ بازوؤں
میں ہمت ہوتی۔ تو ایک گھر نہ بناتے۔ اُن کے ذہنوں میں کئی بار بغاوت نے جنم لیا۔ لیکن کہاں جاتیں ——— کون اپنائے گا انہیں۔ اب تو
اسی گھر میں زندگی کاٹنی پڑے گی۔ یہیں سے جنازہ نکلے گا۔ لیکن آشا تو عیش کرتی ہے۔ ہر چھ مہینے کے بعد۔ نیا مرد۔ کبھی گورا چٹا۔ کبھی گول مٹول
کبھی سوٹ پہن کر آتا ہے کبھی ہیٹ لگا کر۔ کبھی کار میں بیٹھ کر۔ کبھی ٹیکسی میں۔ کبھی سینما لے جاتا ہے۔ کبھی کپڑے خرید کر دے جاتا ہے۔ یہ
حرافہ عیش کرتی ہے اور ہم۔ بس صرف ایک مرد۔ کالے کلوٹے۔ دبلے پتلے۔ جاہل سرکھے۔ سڑے۔ محض نامرد۔ اسی لیے انہیں اچھا نہ لگتا
تھا کسی کا اس گھر میں آنا۔ ان کمروں کو صاف کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ کمرے تو ازل سے گندے ہیں۔ اس صفائی سے کیا فائدہ جس میں اُن کا کوئی حصہ
نہیں۔ بس کام کرتے جاؤ اور دو وقت کھانا کھاؤ اور جاہل مردوں کو اپنا پتی سمجھو جبھی تو ناک سکوڑے سبھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج مہمان

نہیں آنے والا تھا۔ بلکہ اُن کی جاگی ہوئی خواہشوں اور اُمنگوں کا جنازہ نکلنے والا تھا۔

ہر صبح کے بعد شام آتی ہے جب آفتاب اپنی تمام رعنائی سمندر میں غرق کر دے گا۔ اور آسمان پر شفق پھیل جائے گی۔ تو کچھ عرصے کے بعد بادلوں کے کنارے ارغوانی ہو جائیں گے تو ایک نیا چاند ابھر کے آئے گا۔ جبھی یہ کمرے سجائے گئے ہیں۔ آشا ایک دُلہن بن کر بیٹھتی ہے۔ نابکار رنڈی۔ مردوں کو کھلانے والی۔ گھر کی عزت بیچنے والی بے غیرت۔ خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے والی۔

کاش آنند نہ آئے۔ دن بھر تیاریاں یوں ہی رہ جاتیں۔ یہ کھانا پکا پکایا رہ جائے۔ یہ صفائی، یہ رکھ رکھاؤ، یہ اُجلا اُجلا سا فرش۔ یہ بناؤ سنگھار۔ یہ مسکراہٹ اس رنڈی کی دھری کی دھری رہ جائے۔ یہ روئے۔ اور زور زور سے روئے، اپنے بال نوچے۔ دیواروں سے ٹکریں مارے اس کی ماں روئے۔ اس کے بدصورت بھائی روئیں۔ یہ کپڑے پھاڑ کر بازاروں میں ننگی ناچے۔ یہ پاگل ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ خوش ہوں گی اور بہتر ماں کے مندر میں جاکر پرساد چڑھائیں گی۔

یوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ آشا کے دل میں انتظار کی کلیاں۔ سارے گلشن کا جوبن لئے ہوئے جھک رہی تھیں۔ اب آنند کی گاڑی اس اسٹیشن پر ہو گی۔ اب بڑی ڈالی کے قریب۔ اب گورے گاؤں۔ اب اندھیری۔

"مرا ستندہ اب آتا ہی ہو گا کھڑکی میں نہ بیٹھ۔ تیرا [illegible] جائے گا۔" ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔

باورچی خانے سے [illegible] ان کے چاولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ پلاؤ تیار ہو رہا تھا۔ چپاتیاں پک رہی تھیں۔ براتی ایک ایک کر کے گھر سے جا رہے تھے۔ جب وہ آتا ہے۔ تو مردوں کو گھر سے جانا پڑتا ہے۔ صرف ماں رہ جاتی ہے۔ بھابیاں ٹیپ کرنے میں دُبک جاتی ہیں۔ ایک کمرے میں۔ جس کے ٹیپ کرنے سے ہنسی مذاق، مسکراہٹیں۔ کبھی کبھی دبی دبی سی سسکیاں۔ کبھی آہیں۔ بیقراری۔ وعدے۔ قسمیں، گڑگڑاہٹ اور کبھی کبھار مار پیٹ۔ کسی کا کانوں [illegible] آشا کا اوئی کر کے رہ جانا۔ ہائے کیا کرتے ہو۔ آہستہ سے بال کھینچو۔ یہ سب کچھ بھابیاں دبکی سنتی۔ اور اپنے مردوں کو گالیاں دے کر رہ جائیں۔ اور جب کبھی وہ آنے والا ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے دُعا کرتیں۔ کاش وہ آج نہ آئے۔ آج وہ نہ آئے۔ اے سائیں بابا۔ اے کالی کملی والے۔ اے دو جہاں کے مالک۔ اے بانسری والے کاش وہ آج نہ آئے۔

وقت گزر رہا تھا۔ وقت گزر جائے گا۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ آسمان پر ستاروں کی کہکشاں لرز رہی تھیں۔ چاند نظروں سے اوجھل تھا۔ کمرہ [illegible] بنا ہوا تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ اور آشا کسی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں بستر پر دراز تھی۔ ہر شخص کسی کی آہٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹیکسی آئے گی۔ کوئی اترے گا اور آشا کی مرگھٹ کا وارث اس دنیا میں وارد ہو گا۔ ہر سانس میں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ آشا تو خوش تھی اُسے کسی کا خیال نہ تھا۔ یہ لمحات اُس کے اپنے تھے۔ [illegible] دکھ دیے تھے دنیا کے ہر شخص نے اُس سے بے رُخی برتی تھی۔ ماں سے لے کر بھائیوں تک۔ دوستوں سے لے کر دشمنوں تک۔ ہائے اُس کا اپنا بچہ نہ تھا جس کو وہ سینے سے لگا کر زندگی کے باقی دن کاٹ دیتی۔ جبھی تو اس نے ان لمحات کو پراگندگی کے بہتے ہوئے اُس نے زندگی کو سولی پر چڑھا کر۔ عزت کے ٹکڑے کر کے اپنے گوشت کو بیچ کر۔ شباب کو نیلام کر کے خون کے تالاب میں نہا کر خوشی کے چند لمحات اپنے لیے تخلیق کر لیے تھے۔ یہ سوچ کر کہ دنیا تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتی۔ کہتی رہے گی۔

اسی سوچ۔ بچار میں انتظار کا وقت کٹ گیا۔ شام کی تاریکی نے اندھیری رات کی چادر اوڑھ لی۔ ستاروں کی جگمگاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔ مغرب سے مخمور ہوائیں جاگیں۔ اور سارے آسمان پر ایک کہکشاں لرزنے لگی۔ چاند نے اپنی دلفریب مسکراہٹ سارے آسمان کو

منور کر دیا ہے یہ چاندنی۔ یہ تاروں بھری رات۔ یہ چمپلی کے پھولوں کی مہک۔ یہ ناریل کے درخت۔ یہ لہریں۔ اور یہ دبلی پتلی سی تھکی۔ اور آنند۔ تو کب آئیگا۔

کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ماں کی سوندھی سوندھی خوشبو آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اُس کی بھابیاں خوش ہو رہی تھیں۔ اور آشا کے دل میں درد کی ٹیسوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ہاں۔ آج کوئی مانگ نہیں بھریگا۔ آج اُس کی اُجڑی ہوئی زندگی میں بہار نہیں آئے گی۔ آنند تو کبھی بھی آسکتا ہے جب سے آنا ہے۔ وہ ضرور آئے گا۔

وقت بیت رہا ہے۔ بیت جائے گا لیکن ان لمحات کی کون قدر کرے گا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی رہی۔ جامد و ساکت ساتھ مکان کے ایک ٹیلیفون کی۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ خوگرِ ستم کی طرح۔ یہ صبر و سکون کا دیوتا تھا صدیوں سے اُس کی روح بیقرار اور پیاسی تھی۔

نہیں۔ نہیں۔ یہ خوشی۔ مسرت اور نور کا سیلاب تھا۔ ٹیکسی وہیں رک گئی۔ اِدھر نہیں آئی۔ پھر زینے پر آہٹ آئی۔ ایک قدم پھر دوسرا قدم۔ تیسرا قدم۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آشا کے لبوں پر سانس آکر رک سا گیا۔

"آ گیا مسٹنڈا۔ سالم مرغ کھانے والا۔ آگ لگے اس کے پیٹ کو۔ ماں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ تو مر جاتی تو اچھا تھا۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے تیری یہ حالت نہ دیکھتی۔ بھابیوں نے قہر آلود نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

"آ گیا۔ ملک الموت۔ ان کی خوشیوں کو فنا کرنے والا۔ اُن کی راحتوں کا جنازہ نکالنے والا۔ بھیڑیا۔ آ گیا۔"

آشا نے سوچا۔ وہی ہوں گے۔ وہی ہو سکتے ہیں۔ میرا آنند۔ میری راحتوں اور خوشیوں کا رکھوالا۔ اے جانِ بہار۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا جیسے سینکڑوں بہاریں محوِ رقصاں ہیں۔" دروازہ کھلا۔ سامنے تار والا کھڑا تھا۔ ایک خاکی وردی پہنے ہوئے موت نگاہوں کے سامنے ناچنے لگی اُس نے لفافہ کھولا۔ شاید کوئی منحوس چیز ہو۔ ۔ یہ کیسی خزاں تھی جس نے بہاروں کی ساری رنگینی لوٹ لی تھی۔

"لکھا تھا"

آج نہیں ——— پھر کسی دن آؤں گا۔ آنند

تار پڑھتے ہی آشا کے سارے جسم پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔

آشا تار کو اپنی انگلیوں میں بھینچتی ہوئی۔ پلنگ پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھابیاں خوش تھیں۔ ماں کے چہرے پر ایک نور سا برس رہا تھا۔

رات کی آنکھیں

کشمیری لال ذاکر

کئی روز تک چلتی ہوئی جھڑی آنند کو ہمیشہ پریشان کرتی رہتی تھی۔ اس کی ایک پرانی چوٹ جاگ اُٹھتی تھی اور اس انداز سے جاگتی تھی جیسے قیامت جاگا کرتی ہے۔

سکول کے دنوں میں کرکٹ کھیلتے ہوئے اُس کے سامنے کے دانتوں پر گیند لگی تھی۔ میچ تو اُس کی ٹیم نے جیت لیا تھا لیکن اُسے کئی دنوں تک ڈاکٹر مونگا کے کلینک جانا پڑا تھا اور پھر اُس کے دونوں دانت ٹھیک ہو گئے تھے اور کئی برسوں تک اُسے کوئی تکلیف نہ ہوئی تھی۔ بلکہ وہ تو بھول بھی گیا تھا کہ کبھی اُسے گیند لگی بھی تھی۔ کبھی وہ کرکٹ کھیلا بھی تھا اور کبھی وہ جیتا بھی تھا۔ شکستوں کے بہت بڑے ڈھیر میں دبی اُس کے ماضی کی جیت کبھی اُسے یاد بھی نہ آتی تھی۔ لیکن جب سے اُس نے بی۔ ٹی کرنے کے بعد سکول میں نوکری کر لی تھی اُس کے سامنے کے دو دانت اُسے پریشان کرنے لگے تھے گویا اس کے ذہن کے ساتھ اس کے دانت بھی اس کی شریفانہ حرکت پر احتجاج کر رہے تھے۔ آنند کئی غیر شریفانہ حرکات کرنے کے بعد آخر یہ گھناسی قسم کی شریفانہ حرکت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اُس نے چپ چاپ ایک سو دس روپے کی نوکری کر لی تھی۔ جس روز سکول کے سٹاف رجسٹر میں اُس کا نام بارھویں نمبر پر لکھا گیا تھا اُس روز ٹوٹ کر مینہ برسا تھا اور اُسی روز کئی برسوں کے بعد اُس کے سامنے کے دانتوں میں بے پناہ درد اُٹھا تھا اور اُسے اپنی پرانی چوٹ یاد آ گئی تھی۔ ہواؤں اور گھٹاؤں کا یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا اور اُس کے سامنے کے دانت اسی شدت سے دُکھتے رہے اور اُس کی بوڑھی ماں رضائی میں منہ چھپائے کھانستی رہی۔

پچھلے چار برس سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔ دسمبر کے مہینے میں ضرور جھڑی لگتی تھی اور اُس کے سامنے کے دانت اس بُری طرح دُکھنے لگتے تھے کہ اُس کا مُنہ سوج جاتا تھا اور اُس کی ماں بستر میں پڑی کھانستی رہتی تھی اور وہ ہفتہ بھر سکول سے غیر حاضر رہتا تھا۔

آج صبح وہ سات روز کی چھٹی کاٹ کر سکول آیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سوجن تو نہیں پر کچھ بھاری پن سا اب بھی موجود تھا۔ اُس کے ذہن میں اپنی ماں کی کھانسی کی آواز اب بھی گونج اُٹھتی تھی جیسے ایک لمبے سفر کے خاتمے کے بعد بھی گاڑی کے جھٹکے لگتے ہوئے محسوس ہونے لگیں۔ مہینے کی دس تاریخ تھی اور قاعدے کے مطابق آج اُس کو اپنی جماعت کے لڑکوں سے فیس وصول کرنا تھی۔ وہ چونکہ دیر سے سکول پہنچا تھا۔ اس لیے جماعت کے مانیٹر سے خود ہی ایک کاغذ پر لڑکوں کے نام لکھ کر فیس لینا شروع کر دی تھی اور اب وہ دوسرے کمرے میں بیٹھا حاضری کے رجسٹر میں فیس کا اندراج کر رہا تھا اور اُس کے سامنے میز پر ریزگاری اور نوٹ بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ آج بہت دنوں کے بعد دھوپ نکلی تھی اور باہر میدان میں نکھری ہوئی دھوپ کا دلکش سا اُجالا کمرے کے اندر بھی آ رہا تھا۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور

شیشوں سے باہر میدان میں پھیلی ہوئی دھوپ جیسے اُسے باہر بلا رہی تھی۔ وہ جب کبھی بند کمرے اور گھٹے ہوئے ماحول میں ہوتا اُسے لگتا کہ باہر کی وسعتیں اُسے آوازیں دے دے کر بلا رہی ہیں۔ وہ ان آوازوں کو سن کر جھلا اُٹھتا کیونکہ کمرے اور گھٹی گھٹی فضا میں اُس کے مقدر پر مہروں کی طرح چپکی ہیں ویسی ہی گرم گرم لاکھ کی مہریں جو وہ یونیورسٹی کے نمبر لگائے ہوئے پرچوں کو سفید سفید بنڈلوں میں سی کر لگاتا تھا۔ ایک بار تو مہریں لگاتے ہوئے اس کی انگلی بھی جھلس گئی تھی۔ دفعتاً اسے بنگلے میں بیٹھے ہوئے آنند کو اپنی جھلسی ہوئی انگلی کا خیال آ گیا۔ اُس نے ایک نظر اپنی انگلی پر ڈالی جس پر پڑا نشان اب بالکل صاف ہو چکا تھا اور پھر اُس کی نگاہ بند دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ شیشے کے ساتھ کسی عورت کا چہرہ لگا تھا جیسے اُبلی اُبلی سیاہ پرت پر کرال کی کوئی مہر سلگ رہی ہو۔ وہ پل بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔

بیرے نے دروازہ کھولا اور آنند نے دیکھا کہ اُس کے سامنے جنوبی ہندوستان کے کسی دور افتادہ حصے کی رہنے والی ایک عورت کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ ایک دم سیاہ تھا جیسے اماوس کی گمبھیر رات ہو۔ اُس کے بال خشک اور اُلجھے ہوئے تھے اور ناف سے اوپر تک ڈھکی ہوئی ایک پرانی سی سُرخ رنگ کی تنگ چولی میں اُس کی جوان چھاتیوں کا اُبھار اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اُس کی میلی سی پرانی دھوتی کی طرف اور پھر اس کے ننگے پیروں کی طرف دیکھتا آنند کی آنکھیں کچھ لمحے اُس کی چھاتیوں پر اٹکی رہیں جیسے کوئی تیز چلتی ہوئی گیند کسی روک سے ایک دم ٹھہر جائے اور پھر اُس کی آنکھیں اُس کے چہرے کی طرف اُٹھیں۔ سیاہ چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھوں میں وحشت اس طرح ناچ رہی تھی جیسے اندھیری رات میں شعلے لپک رہے ہوں۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ جنوبی ہندوستان کی ایک جھوک سے [illegible] ہوئی عورت کو نہیں اماوس کی ایک گہری اتھاہ رات کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔ جن میں روشنی کم اور جلا دینے کی صلاحیت زیادہ تھی۔

بند کمرے میں اماوس کی گہری رات کی اتھاہ تاریکی تھی اور باہر میدان میں سردیوں کی نکھری ہوئی دھوپ انگڑائیاں لے رہی تھی۔

"کیا ہے؟" اُس نے عورت سے پوچھا

عورت نے جنوبی ہندوستان میں بولی جاتی ہوئی کسی زبان میں اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کیا۔ وہ صرف اتنا سمجھ سکا کہ اُس عورت کو کہیں جانا تھا اور اُس کے پاس کرائے کے لیے پیسے نہیں تھے۔

"کتنے پیسے چاہییں تمہیں؟"

"دس روپے" عورت نے اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں پھیلا کر سامنے کر دیں۔

آنند نے دیکھا کہ اُس کے دائیں ہاتھ کی پہلی دو اُنگلیوں کا درمیانی حصہ سگریٹ اور بیڑیاں پی پی کر زرد ہو چکا تھا۔

"سگریٹ پیو گی؟"

"ہاں" عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور ذرا سا مسکرا دی اور آنند نے دیکھا کہ اُس کے دانت بے حد گندے اور پیلے تھے۔ آنند نے اپنی جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اُسے ایک سگریٹ دیا اور پھر دیا سلائی جلا کر اُسے سلگا بھی دیا۔ جنوبی ہند کی اُس عورت کا سگریٹ جلاتے ہوئے اُسے یوں لگا جیسے دیا سلائی کا شعلہ اُس کی آنکھوں میں لپکتے ہوئے شعلوں سے اچانک ٹکرا سا گیا تھا اور بند کمرے میں جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں ناچ گئی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ"

آنند کے کہنے سے عورت فرش پر بیٹھ گئی اور بڑے مزے سے سگرٹ پینے لگی جیسے وہ اپنا سارا دکھ درد بھول چکی تھی۔

آنند دوبارہ رجسٹر میں فیسوں کا اندراج کرنے میں محو ہو گیا۔ اُس نے کچھ ہی لڑکوں کی فیس درج کی تھی کہ عورت بول اُٹھی۔

"ہیڈ ماسٹر کدھر ہے؟"

"اپنے دفتر میں ہے" آنند نے جواب دیا۔

"ایک بجے کا گاڑی جانا"

آنند نے محسوس کیا کہ وہ نہ تو شدھ اردو اور نہ شدھ ہندی ہی بول سکتی تھی لیکن الفاظ کو جوڑ توڑ کر اپنا مطلب ادا کر لیتی تھی۔ اُس نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ اُس نے سوچا اگر اس عورت کو ایک بجے کی گاڑی جانا ہے تو اُسے کچھ دے دلا کر چلتا کرنا چاہیے!

"یہ لو ایک روپیہ" آنند نے میز پر بکھرے ہوئے نوٹوں میں سے ایک نوٹ اٹھا کر عورت کی طرف بڑھایا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک دم اٹھی۔ سگرٹ کے آخری حصے کو بڑی بے پروائی سے کمرے میں پھینکا لیکن ایک روپے کے نوٹ کو لیا نہیں۔ اُس کی نظریں میز پر بکھری ریزگاری اور نوٹوں پر جم گئیں اور جانے کیسے اس کی پرانی میلی ساڑھی اُس کے کندھے سے ایک طرف سرک گئی اور اُس کی تنگ چولی میں ڈھکی چھاتیاں اور بھی زیادہ اُبھر آئیں۔

"بس ایک روپیا!" اُس کی آنکھوں میں جیسے شعلوں کی لپک اور بھی تیز ہو گئی تھی۔

"اچھا یہ لو ایک اور" اُس نے میز سے ایک نوٹ اور اٹھایا۔

"بس؟!" عورت نے عجیب طنز بھرے انداز میں کہا جیسے اُس کی مردانگی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ اُس کی نظریں بدستور [illegible] سے میز پر بکھرے ہوئے نوٹوں اور ریزگاری کو گھور رہی تھیں اور اُس کی دھمکی کا پہلو بھی [illegible] تھا

"چالاک!" ہیڈ ماسٹر جو اب تک خاموش کھڑا تھا غصے سے بولا اور آنند کو احساس ہوا کہ وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔ کوئی دوسرا شخص بھی موجود تھا جو اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ لو اور جاؤ" آنند نے ریزگاری میں سے ایک اٹھنی اور اڑھائی روپے اُس کی طرف بڑھا دیے۔ اُسے اپنے من میں عجیب سی گھبراہٹ کا احساس ہونے لگا۔

"پانچ لینا ہے" عورت نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں آنند کے چہرے کے سامنے کر دیں۔ آنند کو لگا جیسے وہ اپنی چھاتیوں کے اُبھار کا مول تول کر رہی تھی سفر کے لیے کرایہ نہیں مانگ رہی تھی۔ اُس کے جسم میں لمحہ بھر کے لیے ایک عجیب سی تھرتھری پھیل گئی۔ اُس نے عورت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اماوس کی رات کے سینے پر ایک دہکتا سا الاؤ دہک رہا تھا۔

پل بھر کے لیے اُسے خیال آیا کہ کاش یہ منحوس ماسٹر اس وقت کمرے میں نہ ہوتا۔ لیکن پھر فوراً ہی اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا جیسے اپنے ذہن کو خبردار کر رہا ہو جو کچھ وہ سوچ رہا تھا وہ غلط تھا۔ اُسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ ایک شریف آدمی ہے اور بہت سی غیر شریفانہ حرکات کرنے کے بعد اس نے روزی کمانے کے لیے ایک شریفانہ حرکت کی ہے۔ وہ چاہ رہا تھا کہ وہ عورت فوراً ہی اُس کی نظروں سے دور ہو جائے۔ اماوس کی رات کے سینے پر دہکتا ہوا الاؤ جیسے اُسے جھلس رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر بھی اُس کی حاضری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اُسے ایک دم چلے جانا چاہیے۔

”یہ لو پانچ“ اس نے پانچ کا ایک نوٹ اٹھا کر عورت کے ہاتھ میں تھمایا اور اپنے رجسٹر پر جھک گیا۔ اسے لگا جیسے عورت کی آنکھیں برمے کی طرح اس کی گردن پر چپکی اسے چھید رہی تھیں۔

”جاؤ اب“ آنند نے سختی سے کہا اور کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ باہر نکھری ہوئی دھوپ جیسے اسے بلا رہی تھی اور اس نے اس کی آواز کو کچلنے کی کوشش میں اور بھی اونچی آواز میں کہا۔

”جاتی کیوں نہیں؟“

”سگرٹ!“ جنوبی ہندوستان کی ایک بے بس عورت جس کے پاس کرائے کے لیے پیسے نہیں تھے مسکرا رہی تھی۔ آنند نے کوٹ کی جیب میں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور غصے سے اس کی طرف پھینک دی۔ عورت نے مسکراتے ہوئے اسے اٹھا لیا۔

”اچھی بابو“ اس کے کندھوں پر پڑا ہوا ساڑھی کا پلو بھرپور انداز سے نیچے سرک گیا اور چولی کے ناف کے اوپر والے حصے کے دو بٹن کھل گئے۔

آنند کو لگا جیسے کسی نے جھولی بھر انگارے اس کے دماغ کی سطح پر بکھیر دیے تھے۔ وہ تلملا سا اٹھا۔ اس نے میز پر رکھی ماچس کو اتنی زور سے پھینکا تو اس کی تیلیاں فرش پر بکھر گئیں اور پھر اس نے اپنی آنکھیں یوں رجسٹر کے خانوں پر جما دیں جیسے کسی نے اس کے پپوٹوں میں کیلیں گاڑ کر انہیں ایک جگہ جما دیا ہو۔

ہیڈ ماسٹر اپنے استاد کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور وہ عورت فرش سے تیلیاں اٹھا کر جمع کر رہی تھی لیکن اس لاپروائی سے جیسے انہیں جمع کرنے کی بجائے بکھیر رہی ہو۔

آنند نے اس کے بعد رجسٹر سے نظر نہیں اٹھائی

کچھ عرصے کے بعد جب اس نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اوپر کی تو مدراس کی رات ڈھل چکی تھی۔ عورت جا چکی تھی اور برمے کی طرح چھیدتی ہوئی اس کی آنکھیں دور ہو گئی تھیں۔ آنند نے غیر ارادی طور پر اپنی گردن کو سہلایا جیسے کسی گہرے زخم کو سہلا رہا ہو۔

”کم بخت نے سارا وقت برباد کر ڈالا“ اس نے ہیڈ ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس لمحہ سکول کی لمبی گھنٹی بجی۔ فیس وصول کرنے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ آنند نے ریزگاری اور نوٹوں کو بغیر گنے اپنے رومال میں سمیٹا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس نے دیکھا فیسوں کے اندراج میں اس نے بے شمار غلطیاں کی تھیں۔ میزان غلط تھے اور رقم جمع کراتے وقت اس نے پانچ روپے کم جمع کرائے تھے کیونکہ اس کی اپنی جیب خالی تھی اور اس نے فیسوں میں سے پانچ روپے اس لاچار عورت کو دیئے تھے۔

جنوبی ہندوستان کی وہ عورت چلی گئی لیکن اس کا چہرہ، اس کے پریشان بال، اس کی چھاتیوں کا ابھار اور چمکتی ہوئی آنکھیں تمام دن آنند کے ذہن میں گھومتی رہیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے چھت کی منڈیر پر دو بڑے بڑے چراغ روشن تھے یا کسی گھپ اندھیری کوٹھری میں سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں باہر نکھری ہوئی دھوپ کو گھور رہی تھیں۔ جنوبی ہند کی اس عورت کا قصہ سارے سکول میں پھیل گیا۔ اس کے ساتھی استادوں نے اس سے جی بھر کر مذاق کیا۔ لیکن اس کے باوجود اسے ایک سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ضرورت مند لاچار

عورت کی مدد کی تھی اور دوسروں کی طرح اُس سے کچھ وصول نہیں کیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک بجے کی گاڑی میں بیٹھ کر دو سو میل دور جا چکی ہوگی ، راجستھان کے کسی خوبصورت شہر میں ، اور اب وہاں سے آگے جانے کے لیے کرایہ اکٹھا کر رہی ہوگی ۔

شام کے چھ بجے تھے ۔

آنند اپنے ہونٹوں کے بھاری پن کو زبان سے محسوس کیا اور دانتوں میں رکھے ہوئے روئی کے پھائے میں رچی ہوئی دوا کا کڑوا پن تھوکا اور پھر اُس گلی میں داخل ہو گیا جس کی نکڑ پر پنوں پنواڑی کی دوکان تھی جس سے اُس کا سگریٹ پانی کا ادھار چلتا تھا ۔ اُس کی دوکان پر بیسیوں ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں شیشوں میں جڑی تھیں ۔ پنوں پنواڑی کی دوکان خاص قسم کے پانوں کے لیے مشہور تھی جس میں بقول پنوں موتیوں کا رس ڈلتا تھا نورا وردی پہ واقع دیسی شراب کے ٹھیکے سے نکلتا ہوا ہر شخص ادھر سے گذرتا تھا اور موتیوں کے رس والا پان خریدتا تھا ۔ دیسی شراب کے ٹھیکے پر آنے والے ہر شخص کا پنوں کے ساتھ حساب چلتا تھا ۔

آنند پنوں کی دوکان پر آیا ۔ اُس نے سگریٹ کی ڈبیا ، ماچس اور موتیوں کے رس والے دو پان لیے ۔ سگریٹ سلگا کر جب وہ واپس بازار کی طرف مڑنے لگا تو اس کی آنکھیں ٹھیکے کے باہر لگے لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑی عورت کی طرف اٹھیں ۔ ان جانے میں ہی اُس کے قدم اُس طرف بڑھے ۔

جنوبی ہند کا ایک مرد ہاتھ میں بوتل پکڑے ٹھیکے سے باہر نکل رہا تھا ۔ اور جنوبی ہند کی وہی عورت جسکو آنند نے فیسوں کی رقم میں سے پانچ روپے دیئے تھے ۔ سگریٹ کا دھواں اڑائے ہوئے اُس کا انتظار کر رہی تھی ۔

اماوس کی رات اپنے بھرپور جوبن پر تھی اور اُس کی آنکھوں میں الاؤ سلگ رہے تھے ۔

ایمان کی سلامتی

جیلانی بانو

”حافظ جی آئے ہیں“ — امّاں بی کا ہلتا ہوا سر تھام کے تقریباً اُن کے کان میں گھستے ہوئے زرینہ نے سنایا۔

حافظ جی کے آنے کی خبر سن کر امّاں بی کا روئی کی طرح سفید سر اور ڈگمگانے لگا۔ اپنی افیون کی ڈبیہ انھوں نے تکیے کے نیچے چھپا دی۔ حمائل شریف چوکی پر رکھی۔ اور سفید پلکوں پر سے بہتا ہوا پانی پونچھ کر وہ پلنگ پر اپنی چادر ٹٹولنے لگیں۔

اُن کا پوتا سلیم امّاں بی کے ان بوڑھے چونچلوں کو سخت ناپسند کرتا تھا کہ پچھتر برس کی عمر میں بھنگی بہشتی سے پردہ ہوتا ہے۔ حافظ جی کے آنے کی خبر سن کر چادر ٹٹولی جا رہی ہے۔ کہیں جانا ہو تو تانگے میں پردے لگائے جا رہے ہیں۔ عورت چاہے املی یا کی طرح سوکھی نارنگی بن جائے مگر خوش فہمی پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اب بھلا بتائیے حافظ جی بچارے خود آنکھوں سے اندھے کانوں سے بہرے مگر امّاں بی اُن کا آنا سن کر یوں اُچھل پڑیں جیسے اُن کا منگیتر پسند کرنے آ رہا ہو۔

سلیم کے بڑبڑاتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر امّاں بی سمجھ گئیں کہ انھیں نصیحت کی جا رہی ہو گی!

”عورت پر تو قبر کے تین دن بھی بھاری ہوتے ہیں۔ زندگی بھر غیر مرد نے ایک بال نہ دیکھا تو اب تمھاری بہنوں کی طرح سر جھاڑ منہ پھاڑ، چھاتی کھولے کیسے مٹکتی پھروں۔“

ویسے بھی حافظ جی تو اُن کے دشمنوں میں سے تھے۔ امّاں بی کے خاندان اور کھارے کنوئیں والوں سے تو ایک زمانے کی عداوت چلی آ رہی تھی۔ اُس زمانے سے جب حافظ جی کے سکڑ دادا نے امّاں بی کے لکڑ دادا کی زمینوں پر چری بوائی تھی۔ بڑھتے بڑھتے اس بات میں اتنی شاخیں پھوٹیں کہ امّاں بی کے دادا نے حافظ جی کے کسی بزرگوار سے بیچ چوک میں کھڑے ہو کر کہا تھا۔ ”آج سے ہمارے اور کھارے کنوئیں والوں کے درمیان سارے رشتے ناطے بند۔ حرامی ہو گی وہ اولاد جو تمھارے دروازے پر جائے۔“

یہ بات اس زمانے کے بزرگوں کے منہ سے نکلی تھی جب بزرگ یونانی دیوتاؤں کی طرح کائنات کی ساری چابیاں اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے۔ لہٰذا سب نے حدیث شریف کی طرح اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھا۔ مرتے مرگئے مگر نہ ان کی مٹی لی نہ اپنی دی۔ ویسے آمنے سامنے والوں سے یوں تو خوشی غمی میں شریک ہونا ہی پڑتا۔ پڑوسیوں سے لڑنے اور ملنے کی روایتیں بھی نبھائی جاتیں۔ بچے ہیں تو ایک آنگن میں چھپک چھپا کھیل رہے ہیں۔ جوان ہیں تو ایک دوسرے کی دوستی کو نباہ کر دکھانے کی فکر میں ہیں۔ بزرگ بھی اوپری جی سے ملتے۔ مگر اس طرح کہ بھری محفل میں ایک دوسرے کی دکھتی رگ پکڑنے سے کبھی نہ چوکتے۔

حافظ جی اسی کے پھیر میں تھے۔ وہ تو کہو کہ اگلے وقتوں کی کھلائی پلائی تھی کہ اس عمر میں بھی لاٹھی پکڑ کے گلی پار کر لیتے تھے۔ بجھتے دیئے جیسی آنکھوں پر ٹوٹی کمانیوں کی عینک لگا کے۔ لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے۔

ہاتھ پیروں میں رعشہ، زمین اپنی طرف بلاتی تھی اور وہ کھنچتے جا رہے تھے۔ اوپر سے دمہ تھا کہ ایک پل چین نہ لینے دیتا تھا۔ ہر وقت دھونکنی چلتی رہتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ فرشتوں کو جُل دے دے کر جیے جا رہے تھے۔

مگر آج اماں بی نے انھیں جس بات کے لئے بلایا تھا، اس نے ان کا ٹھنڈا خون کھولا دیا تھا۔ اتنا جوش تھا کہ کہاں تو پٹی سے اٹھنا دوبھر تھا یا ایک جانب کسی بچے کا ہاتھ لئے، ایک جانب لاٹھی ٹیکتے اماں جی سے ملنے نکل کھڑے ہوئے۔ کھٹ کھٹ کرتے وہ اندر آئے تو اماں جی کی چھوٹی بہو آگے بڑھیں کہ ہاتھ پکڑ کے راستہ دکھا دیں۔ مگر انھوں نے ہاتھ جھٹک دیا۔

"مگر میرے لئے نیا تھوڑی ہے بٹیا۔ میں نے تو اس آنگن میں گلی ڈنڈا کھیلا ہے۔"

حافظ جی کی اس بات پر سارا گھر ہنس پڑا۔ کیا یہ بھی کبھی بچے تھے --- یقین نہ آتا تھا۔

"اچھی ہو --- ؟" وہ خود کانوں سے بہرے تھے۔ اس لئے اتنے زور سے بولتے تھے کہ دوسرا بہرا بھی سن لے۔ چنانچہ بہری اماں بی نے ان کی بات کا جواب دینے کے لئے جلدی جلدی اپنا پوپلا منہ چلایا۔

"اچھے ہیں تو کونسا تیر مار لیا ہے۔ ہمارا تو جینا مرنا سب برابر ہے۔ جانے کونسی گھڑی مقرر ہے کہ آ ہی نہ چکتی۔" انھوں نے ڈگر ڈگر ہلتی ہوئی گردن کو تکئے کے سہارے ٹھہرایا اور یاد کرنے لگیں کہ پہلے اپنی دائمی کھانسی کا حال سنائیں یا اختلاج کا، پیروں پہ ورم کی تکلیف بیان کریں یا گنٹھیا کا دکھ سنائیں۔

ہاں ---- حافظ جی کو لوگوں نے اٹھا کر پلنگ پر ڈھیر کر دیا تو وہ ایک ہائے کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ ہم تم بھی اب کنارے آ لگے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ سلامتی ایمان کے اٹھالے۔ ایمان مضبوط ہے تو پل صراط بھی پار کر لیں گے۔" اتنے میں ایک نوکر نے حقہ بھر کے سامنے رکھا اور نے حافظ جی کے ہاتھوں میں تھما دی۔

مگر اماں بی نے ان کی پوری بات نہ سنی۔ کچھ دنیا سے اٹھانے کی بھنک کان میں پڑی۔

"اور کیا۔ میں تو یہ سوچوں ہوں کہ اس قیامتی وقت کو دیکھ کر دل بند کیوں نہ ہو جاتا ہمارا ---؟"

وہ چپکے چپکے افیون کی ڈبیہ ٹٹولنے لگیں کیونکہ جماہیوں کے مارے برا حال تھا۔

"اوس کی مصلحت ہے۔" حافظ جی نے انگلی اٹھا کر اوپر دکھایا اور حقے کا گھونٹ بھر کے دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

"نمرود کی خدائی میں تو اُس نے آگ لگادی تھی۔ مگر یہ مردود تو آسمان پر تکلی لگا رہے ہیں۔ دیکھتی جاؤ کیسا قہر نازل ہوگا۔۔۔"

بات ختم کرکے وہ یوں چپ ہو رہے جیسے اس قہر کے ٹوٹنے کا انتظار کر رہے ہوں۔

"لے تو کیا یہ قہر سے کچھ کم ہے" اماں بی نے ہاتھ نچا کے انگلی لبوں پر رکھی۔

"لڑکیاں اپنے منہ سے بر مانگ رہی ہیں!"

حافظ جی چونک پڑے۔ حقّہ کی نے ہاتھ سے چھوٹ گری۔ جیسے اس قہر کا پہلا پتھر اُن پہ آن گرا ہو۔ یہ تو اماں بی صفاں پر چوٹ کر گئی تھیں۔ ابھی وہ ایک ہی چوٹ سے سنبھل رہے تھے کہ اماں بی نے پتھراؤ شروع کر دیا۔

"اب کہاں گئیں وہ اُونچی ناکیں جو اپنی ضد میں آ کے آڑے آڑے بیل پھیر دیا کرتی تھیں۔ اے جوان ہنستے کھیلتے اُٹھ جاتے ہیں۔ مگر اللہ میاں نے ہمیں تو جینیں کیا کیا دکھانے کو باقی رکھا ہے۔"

لیکن حافظ جی کو کھانسی کے پھندوں نے کچھ نہ کہنے دیا۔ صرف بے بسی سے ہاتھ ہلاتے رہ گئے۔

اماں بی سچ مچ جینے سے بیزار ہو چکی تھیں۔ زندگی کے سارے رنگ تو دیکھ ڈالے۔ میاں پر حکومت کی اور ساس کی مار بھی کھائی۔ ایک جوان بیٹے کو اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ دو لڑکوں کے سر پہ سہرے باندھے۔ پھر ان کے بچوں کو بھی اپنے ہاتھ سے دولہا بنایا۔ اور تین دامادوں کی آؤ بھگت کی۔ تیس برس ہوئے کہ سہاگ کی چوڑیوں پہ پتھر گرا۔ زندگی کی یہ کڑواہٹ بھی گھونٹ گھونٹ کرکے پینا پڑی۔ اب وہ سارے محلے کی اماں بی کہلاتیں۔ آیا گیا ان کے نورانی چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا۔ انھیں سلام کرکے ان کی دعاؤں کا منتظر رہتا۔ لوگ کہتے تھے اماں بی اگر کسی کو دل سے دعا دیں تو وہ ضرور پوری ہوتی تھی۔

سفید چاندی سے بالوں میں چھپی ہوئی اُن کے چہرے کی میلی جھریاں اماں بی کے صبر و استقلال کی کہانیاں کہتی تھیں۔ ان کے چہرے پر ڈوبتے سورج کی خوبصورتی تھی۔

اب تو وہ دن آن لگے تھے کہ وہ سارے گھر کے لیے گرم دودھ بن گئی تھیں، جو نہ نگلا جاتا نہ اُگلتے بن پڑتی۔ ان کی بک بک جھک جھک سے سب بیزار تھے، مگر کوئی مانے یا نہ مانے وہ ہر بات کو اپنے زمانے سے ملا کے دیکھتی تھیں اور نصیحت بھیجا کرتیں۔ نواسوں پوتوں کے خون میں تو [illegible] طراوت تھی۔ بلکہ ان کے اپنے بیٹے بیٹیاں بھی اماں بی کے کہے کو مجذوب کی بڑ سمجھتے تھے۔ شاید اللہ میاں کے ہاں ان کی عمر کے حساب کتاب کے کاغذ چوہے لے گئے تھے اور وہ بس جئے جا رہی تھیں۔

اب اسی بات کو لے لو۔ سات پشتوں سے ہوتی چلی آ رہی تھی کہ کمہارے کنویں والوں سے رشتے ناطے نہیں ہوتے۔

مگر آج اماں بی کے ناخلف پوتے سلیم نے طے کر لیا تھا کہ بیاہ کرے گا تو حافظ جی کی نواسی غزالہ سے، اور دونوں کے ماں باپ رشتہ کرنے کو ہنسی خوشی راضی تھے۔

اماں بی نے سنا تو سر پیٹنے لگیں، چیخ چیخ کر سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا۔ اپنے بیٹے کے بازو میں لٹک گئیں کہ پہلے انھیں قبر میں ڈال آئے۔ پھر کمہارے کنویں والوں کی بیٹی اس چوکھٹ پہ چڑھے گی۔ اماں بی کا بیٹا ابھی حال ہی میں پروفیسری سے ریٹائر ہو کر گھر میں آن پڑا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد خاندان کو سنوارنے اور پرانی روایتوں کو نبھانے کا شوق اکثر جاگتا ہے۔ مگر چلتی ہوا کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ یہ بات چھہتر برس کی اماں بی نہ سمجھ سکیں۔ لیکن ایک ریٹائر پروفیسر تو سمجھتا ہے!

مایوس ہو کر اماں بی نے حافظ جی کو بلا بھیجا۔ وہ سارے محلے کی اماں بی تھیں تو حافظ جی بھی اپنے خاندان میں متبرک کے حد پوجے جانے والے بزرگ تھے۔ بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں، پڑپوتوں کو ملا کے بیٹھتے تو تعداد سو تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ لوگ خود ان پردیسی سوداگروں کو اپنے سے نیچا سمجھتے تھے۔ دُنیا جانتی تھی کہ اماں بی کے سکڑ دادا کے کوئی لکڑ دادا اونٹوں پر مشک لادے کہیں سے آئے تھے۔ اب وہ اپنے منہ سے سید کہیں تو دُنیا کو ماننا ہی پڑتا۔ ویسے دل کا حال کون جانے کہ کس کھیت کی مولی تھے ---! حافظ جی کا بس چلتا تو دیدہ پھٹی چلبلی نکٹی عزالہ کو زندہ گاڑ دیتے۔ مگر عزالہ پر تو اُن کے داماد کا بھی بس نہ چلتا تھا۔

"وہ کوئی ناسمجھ بچی تھوڑی ہے۔ ڈاکٹری پاس کر چکی ہے۔ اپنا بُرا بھلا سوچ سکتی ہے۔"

حافظ جی نے داماد کی یہ بات سُنی تو چکرا کے رہ گئے۔ کیا لڑکیوں کے پاس بھی دماغ ہوتا ہے! وہ بھی اپنے بُرے بھلے پر غور کرتی ہیں!

اُنھوں نے لاٹھی سنبھالی اور چلے اماں بی کے پاس۔

جب سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہوں تو اِترانا کیسا! مگر اماں بی تو کانٹوں بھری جھاڑی کی طرح اُنھیں لپٹ گئیں۔ ایک تو کھانسی کے پھندے۔ اُوپر سے اماں بی کے زہر بجھے ہوئے جملوں کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش۔ حافظ جی تیز ہوا میں کانپنے والے کپڑے کی طرح لرزنے لگے۔

"میں جانتا ہوں تمھاری سب چالیں۔ وہی زمینوں کا انتقام لے رہی ہو --- مگر یاد رکھو۔ خود بھی قبر میں پیر لٹکائے ---"

لیکن اماں بی نے ہاتھ اُٹھا کر اُن کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

"ارے جا رے بڑے آئے قبر کے عذاب سے ڈرانے والے۔ پہلے اپنی اُن کٹنیوں کو تو روکو جو معصوم بچوں کا راستہ گھیرتی پھرتی ہیں۔ اُن کے لئے بھی تو اللہ نے کوئی سزا مقرر کی ہے جنھوں نے تمھاری سفید داڑھی میں کالک ملی ہے۔"

"مم --- مم --- میرے --- میری نواسی کو کچھ کہا تو --- تو ---" حافظ جی ہاتھ کے اشارے سے بات پوری کرنے لگے۔ وکالت کر چکے تھے۔ مگر یوں اماں بی کی طرح چک پھیریاں دینے والے مخالف وکیلوں سے پالا تھوڑی پڑا تھا۔

"ہائے ہے --- بڑے آئے اُونچی ناک والے۔" غصّہ کے مارے اماں بی کی سانس پھولنے لگی۔

"سب جانتے ہیں تمھاری پھوپھی کے کرتوت۔ کون جانے کیا عیب تھا کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹی تھی۔"

"اور تمھارے --- تمھارے ---" حافظ جی غصّہ کے مارے تن چھنا گئے۔ ہاتھ اُٹھا کے کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حقّہ کی چلم گر کے ٹوٹ گئی۔

"بس بس رہنے دو۔ میرے عیب کیا گنو گے تم۔ میں نے اپنی ناک اُونچی رکھنے کے لئے اپنے آپ کو خاک میں ملا دیا ہے۔"

عورت سے بحث میں کون مرد جیتا ہے کہ حافظ جی جیت جاتے۔ ان کی رگوں میں جما ہوا خون شاں شاں کرنے لگا۔ جی چاہ رہا تھا اس بدزبان لپوس بڑھیا کو اُٹھا کے کنکر کی طرح پھینک دیں۔ یوں بھی عورت کی زبان کے سامنے مرد ایک ہی ہتھیار استعمال

کرتا ہے ---- قوت ---- مگر آج تو وہ ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے مفلوج تھے۔ ایک قدم چلنا پڑتا تو سہارے کے لئے کسی کو پکارتے۔ زبان کی پٹریاں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں۔ آنکھوں میں سیاہ تارے ٹوٹتے رہتے تھے۔ مرد کو اس سے زیادہ عبرتناک سزا اور کیا مل سکتی ہے ---- !

شور سن کر سب گھر والے اپنے اپنے کام چھوڑ کے آگئے۔ اور کہہ سن کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔

"اب آپ لوگوں کے یہ دن ہیں کہ بچوں کی طرح آپس میں لڑیں"

"اور کیا حافظ جی تو ہمارے دادا کے برابر ہیں" اماں بی کی بڑی پوتی زرینہ بولی۔

"ارے لعنت بھیجو ہم پر۔ تمہارا بس چلے تو ہمیں زندہ گاڑ آؤ" اماں بی نے مارے غصہ کے اپنا پلنگ کھسوٹ ڈالا۔

"یہ آجکل کے لونڈے ---- ہونہہ ---- آخر ہم بھی تو تھے" ---- حافظ جی نے ہکلاتے ہوئے کہا اور خلا میں گھورنے لگے۔

"اور کیا ---- ہمارے وقتوں میں تو ----" اماں بی نے آنکھیں چندھیا کے حافظ جی کو گھورا اور دھکا سا کھا کے پیچھے کو لڑھک گئیں۔ ایک آنسو ڈھلک کے تپتے ہوئے بیابان میں آن گرا۔ اور ایک لمحہ نے اچانک پھیلی ہوئی زندگی پر یلغار کی۔ انھوں نے ہاتھوں کا چھجہ سا بنا کے آنگن میں کھڑا ہوا آم کا پیڑ دیکھا، جس کی بور سے لدی ہوئی شاخیں سارے آنگن کو گھیرے ہوئے تھیں۔

یہی پیڑ تو تھا جسے ابا میاں کسی باغ سے اکھاڑ کے لائے تھے۔ اور سب بچے اس کا "پپیا" بنانے کو جھپٹ پڑے تھے۔ مگر وہ بہت ہی اعلیٰ قسم کے آم کا پودا تھا۔ اس لئے ابا میاں نے سب کا ہاتھ جھٹک کر اماں بی کو وہ پکڑا دیا تھا۔ (جو اس وقت ننھی کہلاتی تھیں) وہ کھرپی سے آنگن میں گڑھا کھودنے بیٹھیں تو پاس ہی حافظ جی بھی آ بیٹھے جنھیں ننھی رجو بھیا پکارنے کی بجائے ریاض کہتی تھی۔ (انھوں نے حافظ جی پر ایک نظر ڈال کے اس کھلنڈرے ریاض کو یاد کیا جو ان کے ہاتھ پکڑ کے کنوئیں میں جھلایا کرتا تھا۔ مگر اس نے کبھی اماں سے ریاض کی شکایت نہ کی۔ حالانکہ ڈر کے مارے اس کا دم نکل جاتا تھا۔ نہ جانے اس وقت ننھی کی کیا عمر تھی۔ مگر اتنا تو یاد تھا کہ وہ بچوں کے ساتھ کھیتوں پر دوڑیں لگانے کی بجائے اب سنبھل سنبھل کر چلنے لگی تھی۔ پھوپھی جان دن بھر اسے اپنے پاس بٹھا کے سینا سکھانے کے بہانے اپنے بچوں کے کرتے سلوایا کرتی تھیں۔ اگر ذرا بھی ٹانکا ٹیڑھا ہوا اور پھوپھی جان نے اس کی پنڈلی میں سوئی گھونپی۔ مگر اس پہ بھی وہ ہنسے جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں آپی آپ ہنسی آئے چلی جاتی تھی۔ مگر اس روز وہ بار بار اپنی آنکھیں دھنک رنگے دوپٹے سے رگڑتی پھر رہی تھی۔ جب ریاض نے کھرپی چھین کر خود گڑھا کھودنا چاہا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ اس بات پر ریاض کو بڑا تعجب ہوا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے ننھی کو دیکھا جس کی نتھ میں موتیوں کی طرح آنسو گوندھے گئے تھے۔ ریاض کی وہ عمر تھی جب آدمی اپنے دل کا غلام ہوتا ہے۔ اور دماغ اسے نافرمانی کی کوئی سزا نہیں دے سکتا۔

کھارے کنوئیں والوں سے رشتہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ننھی کو اچھی طرح معلوم تھی۔ مگر پھر بھی وہ ریاض سے ہر وقت کچی املیاں منگوائے تو اماں کب تک ڈھیل دیے جاتیں۔ آخر ریاض سے صاف صاف کہنا پڑا کہ لڑکی سیانی ہو رہی ہے۔ گھر

بن کھنکار کے آیا کرو۔

ریاض نے سنا تو یوں لڑکھڑا کے پلنگ پر بیٹھ گیا جیسے ٹانگیں ٹوٹ گئی ہوں۔ اب اس میں کیا رکھا تھا جسے اٹھا کے یہاں سے لے جاتا ——— (جب چار برس کا تھا ڈال کر آم کا پودا اگا۔ ہے ننھے تو ریاض نے اسے اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتے ہوئے کہا تھا ——— "اگر تم چاہو تو ننھی میں زندگی بھر یہاں رہ سکتا ہوں" اور پھر مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ جھٹک کر اس نے جاتے وقت کہا تھا ——— "سوچ لینا"

"تو پھر مت جاؤ" یہ بات اس نے ایسی دلدوز چیخ کے ساتھ کہی جو یقیناً عرش کو ہلا گئی ہوگی۔ مگر اس کے لبوں کو نہ ہلا سکی۔

پھر اس نے کچھ نہ سوچا ——— کیا لڑکیاں بھی سوچا کرتی ہیں!

پھر ایک دن گلی باجوں سے گونج اٹھی اور سارے محلے والے ننھی کی برات دیکھنے نکل آئے، جو ریاض کے گھر میں ٹھہرائی گئی تھی۔ ریاض بھی گلی میں آ کے آتش بازی دیکھنے لگا۔ کسی نے ایک انار رکھ کر انگارہ دکھا دیا۔ انار پہلے ذرا سا مسکرایا اور پھر ہنس پڑا۔ اس کے قہقہوں کے ستارے چاروں طرف چمک رہے تھے۔ پھر وہ ٹوٹتے تاروں کی طرح اندھیرے کو تھرا کے ڈوب گئے۔ چاروں طرف سیاہیاں چھا گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اس انار کو اٹھانا چاہا تو ہاتھ جل گیا۔ اور وہ بڑی دیر تک انگلی چوسے سی سی کرتا پھرا۔

اس دن ننھی نے اتنا ——— ہاں اتنا سوچا کہ اس کے سہرے میں آنسوؤں کی لڑیاں گندھ گئیں۔ وداع کے وقت وہ ماں سے لپٹ کے خوب روئی تھی "اماں ابا میں سچ مچ اپنا آم کا پیڑ چھوڑ کے جا رہی ہوں ——— ؟"

اس دن سے ریاض نے لڑکیوں کی چوٹی پکڑ کے جھولا جھلانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ لڑکیوں کو دہکتا ہوا انگارہ سمجھنے لگا۔ لڑکیوں کی شکل دیکھ دیکھ کر اسے بے نام سا خوف ہوتا تھا۔ جیسے بچوں کو انجانی چیزوں سے ہوتا ہے۔

اس نے قرآن شریف حفظ کر کے محلے بھر سے حافظ جی کا خطاب پایا۔ پھر جھوم جھوم کر گلستاں بوستاں پڑھ ڈالی۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔ اسے پڑھانے والے مولانا طاہر علی تک کہنے لگے کہ ریاض بے حد ذہین ہے۔ وہ کوئی سبق کوئی بات نہیں بھول سکتا۔

"کیوں نہیں بھول سکتا ——— ؟" وہ خوف زدہ ہو کر مولانا کی صورت تکنے لگا تھا۔ "چاہوں تو بہت سی باتیں بھلا دوں"

وہ گویا خم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا تھا۔ مگر مولانا ٹال گئے ——— "اچھا اچھا چلو آگے پڑھو۔"

پھر وہ منصف بن گیا اور دنیا بھر کی قسمتوں کے فیصلے منٹوں میں کر ڈالے۔ پھر ایک دن محلے والوں کو شہنائی کی چیخوں نے گلی میں اکٹھا کر دیا۔ وہ سہرا سنبھالتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور کسی نے پھر ایک آتش بازی کا انار چلا دیا۔ اچانک اسے اپنی انگلی میں سوزش محسوس ہوئی۔ پھر یہ آگ بھڑک کر اس کے لس لس کرتے کپڑوں میں لگ گئی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ لڑکھڑا کے گھوڑے پر سے گر پڑا تھا۔ مگر اس کی ریشمی گڑیا سی دلہن نے اس کے جی پر ایسے ٹھنڈے پھائے رکھے کہ اس پر

غنودگی سی چھا گئی تھی ۔ اس طرح اُس نے بڑے امن و سکون سے زندگی گزار دی۔

گرمیوں کی دوپہروں میں وہ اپنے بیٹے بیٹیوں کے ساتھ آم کھانے بیٹھتا تھا تو ننھی کے ہاں سے آئے ہوئے آموں سے اس کے دانت میں ایسا درد اُٹھتا کہ ٹیس سارے بدن میں پھیلنے لگتیں —— اس پیڑ کے پھل کیسے کھٹے نکلے —؟

اور ننھی کبھی برسوں میں میکے آتی تو آم کے تنے سے لپٹ جاتی۔

"اے اماں جنیں کیا بات ہے۔ اکثر خواب میں دیکھتی ہوں۔ کہ جیسے میں ہوں اور کھڑی اس آم کو آگ لگا رہی ہوں۔"

خواب کا نام سنتے ہی سب سروں پر پلّو ڈال کر قبلہ رُو ہو بیٹھتے۔

"اُوئی اللہ نہ کرے" اماں کہتی تھیں۔ یاد ہے ساجدہ ننھی کنوارپنے میں اس پیڑ کو بچوں کی طرح چاہتی تھی"

"کبھی بچوں پر غصہ اتارتی ہوں کبھی اُن سے لڑائی ہو" وہ کہے جاتی —— "پھر دن بھر میرا جی ڈوبا ڈوبا رہتا ہے —— بچارے چپکے بیٹھے ٹکر ٹکر مجھے دیکھتے رہتے ہیں۔"

پھر جب وہ بیوہ ہوئی تو ہمیشہ کے لئے اس گھر میں آن بسی تھی۔ تب ایک دم اسے اپنی بزرگی کا احساس ہوا تھا۔ اُس نے اپنے بچوں کو سمجھایا کہ کھارے کنوئیں والوں سے ان کا کتنا پرانا بیر چلا آرہا ہے۔ اور ان کی وجہ سے امی نے زندگی کی ہر سانس میں کیسی کڑواہٹ پی ہے۔

اُدھر ریاض حافظ جی سے وکیل بنا۔ وکیل سے منصف بنا۔ نانا بنا۔ دادا بنا۔ اور سب مرحلوں کو طے کر کے پھر اسی محور پر آن ٹکا۔ محلے والے پھر اسے حافظ جی پکارنے لگے۔ وہ صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ محلے کے بچوں کو قرآن شریف پڑھائے۔ یا کوئی ماں اپنے منتوں مرادوں کے بچے کو لاتی تھی کہ حافظ جی اسے دعا دیں۔ اس کی عمر بھی حافظ جی کی طرح لامحدود ہو جائے۔

اُٹھتے بیٹھتے، تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے وہ اس دنیا کی ہر چیز کو گالیاں دیئے جاتے تھے۔ کہتے ہیں ایمان کی سلامتی کے لئے اُس کی رضا پر راضی ہونا ضروری ہے۔ مگر وہ جانے کیوں کبھی سچے دل سے اللہ کا شکر ادا نہ کر سکے۔ نماز پڑھتے میں دھیان بٹنے اور غلط سجدے کرنے کی عادت بڑھاپے میں بھی نہ گئی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر توبہ کرتے۔ گھنٹوں سجدے میں پڑے ناک رگڑتے رہتے۔ دنیا کے سارے مزے تو چکھ ڈالے۔ پھر بھی دل سیر کیوں نہ ہوا —— جیسے وہ زندگی بھر ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا انتظار کرتے رہے ہوں۔ اور جھنجھلا کے وہ تسبیح پٹک دیتے۔

"بوڑھے تو سبھی ہوتے ہیں۔ مگر ابا میاں کی طرح ناک پر غصہ کسی کے نہیں رکھا ہوتا ہے" ان کی بہو عاجز آگئی تھی۔

"اوں ہوں۔ بڑھاپا ہے سٹھیا گئے ہیں" بیٹا ٹال دیتا۔ یا پھر کہیں شامت کی ماری غزالہ ہنس پڑتی اور وہ خوخیا کے دہاڑتے —— "ہم پر بھی جوانی آئی تھی۔ مگر تمہاری طرح کتے نہ بنے۔ انسانوں کی طرح شرافت سے ——" انھوں نے بڑے فخر و غرور کے ساتھ بات شروع کی مگر ختم کرنے سے پہلے جانی سی ختم ہو گئی —— اُدھر کھانسی کے پھندے —— توبہ ہے ——

"اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے" انھوں نے انتہائی تسکین بخش اور اذیت ناک لہجہ میں کہا۔

پھر افیون کی پینک سی آگئی اور کئی گھنٹے اُن کے درمیان سے گزر گئے۔ اس طرح کہ وہ دونوں آنکھیں میچے جانے کہاں کہاں کی سیر کر آئے۔

اچھا تو اب چلوں ——؟ انھوں نے چونک کر یوں کہا جیسے سچ مچ حواسوں میں آگئے ہوں۔

" کہاں جاؤ گے بیٹھو ——" مگر پھر اماں بی کو یاد آیا کہ یہ بات آج کہنے کی تو نہ تھی ——!

" زمیں جنبیں کیا کہہ رہی تھی ——؟ وہ سچ مچ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سوچنے لگیں۔ خیالوں کا وہ اژدہام تھا جیسے لاد کر آتم پہ پورا آیا تھا۔

" اب کہنا کیا ہے ——" حافظ جی لرزتے ہاتھوں سے لاٹھی ٹٹول کر اُٹھنے کا ارادہ کرنے لگے۔

" اب ہم تم کیا کر لیں گے کہہ کر ——" بات کہتے کہتے وہ یوں رُکے جیسے کسی درد میں تڑپنے والے کو دوا یاد آجائے۔

" میں تو کہتا ہوں کر ڈالو بیاہ ان حرامیوں کا۔ خواہ مخواہ غلط سلط نمازیں پڑھا کریں گے ——" ایمان تو سلامت رہے گا منحوسوں کا ——؟

اِنسان اور صلیب

صادق حسین

"اے میرے خدا! اے میرے خدا! تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" پادری، متی کی انجیل کے ستائیسویں باب کی چھیالیسویں آیت پڑھ کر لمحہ بھر کے لیے رُکا۔ اُس نے خطبہ گاہ سے سامعین کی طرف دیکھا۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھوں میں آنسو چمکے اور پھر آناً فاناً اُس بارہ لفظوں کے جملے سے فصاحت و بلاغت کے چشمے اُبل پڑے۔ پادری کا سلجھا ہوا اندازِ بیان سحر پھونکنے لگا۔ اُس کی باوقار، پُرخلوص اور رقت انگیز آواز نے کلیسا کے در و دیوار پر گمبھیر درد کی پرچھائیاں پھیلا دیں۔

عبادت گزاروں کی مخلوط جماعت کافی بڑی تھی۔ عورتیں رنگ برنگ کے ساٹن اور عمدہ عمدہ ساڑھیاں زیب تن کیے سر ڈھانپے، اپنی اپنی نشستوں پر ہمہ تن گوش بیٹھی تھیں۔ مرد ننگے سر تھے اور یورپین لباسوں میں ملبوس۔ ہر شخص کے سامنے ڈیسک پر انجیل مقدس، مناجات اور عام دعاؤں کی مجلد جیبی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ خطبہ گاہ کے بائیں جانب دیوار کے ساتھ سیاہ تختہ کھڑا تھا، جس پر سفید حروف میں آج کی عبادت کے لیے منتخب مناجات کے حوالے درج تھے۔ قربانگاہ کی پاک میز پر چینی کے گلدانوں میں شگفتہ پھول سجے ہوئے تھے۔ اُن کے وسط میں پیتل کی صلیب چمک رہی تھی۔ اُس کے دائیں بائیں شمعدانوں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ پس منظر میں محراب کی کانچ پر یسوع مسیح کی زندگی کی مختلف رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں، جن کو آفتاب کی روپہلی کرنوں نے ہالۂ روشنی و سے گلزار کر رکھا تھا۔ پاک میز کے کچھ ادھر سرود خوانوں کی ٹولی دو حصوں میں بٹ کر قرینے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ عورتیں دائیں جانب، مرد اور صلیب بردار لڑکا بائیں جانب۔ ارغنون نواز دیوار کی طرف منہ کیے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اُن سب کے لباس برف کی مانند سفید تھے۔ پادری کے ڈھیلے ڈھالے کرتے اور اُوپر کے جبے کی طرح، پروفیسر ڈیوڈ کے سر کے بالوں اور ابرو کی مانند۔ وہ پروفیسر ڈیوڈ جو یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتا تھا اور اس وقت آخری صف کے وسط میں بیٹھا وعظ کے ایک ایک لفظ کو نہایت غور سے سن رہا تھا۔

بندگی کی فضا میں تمام چہروں پہ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ فرد فرد کے دل کے دروازے پر کوئی غیبی ہاتھ دستک دینے لگا۔ تن تن کر کانپ اٹھا۔ من من کا گوشہ گوشہ بیدار ہونے لگا۔ دلوں کے پٹ دھیرے دھیرے کھلنے لگے۔ مسز فریڈرک نے جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو ملتے ہوئے اپنے دل کا دروازہ نیم وا کیا ہو اور اُس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں "یہ پٹ پورے کھل گئے تو میری بچی ربیکا بھوکوں مر جائے گی۔ میری منہ بولی بہن کا دوا دارو کون کرے گا۔" مسز فریڈرک کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ربیکا ابھی تک

حیرت سے منہ کھولے اپنی ماں کے ہیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ زردی مائل تنکوں کا ہیٹ جس کے گھیرے پر کالا فیتا لگا ہوا تھا۔ ربیکا نے گرجا، پادری اور اپنی ماں کے سر پر ہیٹ زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر وہ اپنی ماں سے بیسیوں باتیں پوچھنا چاہتی تھی مگر لب کھولنے سے ڈر رہی تھی۔ اس لیے کہ گرجے میں آنے سے پہلے اسے ماں نے گھر پر اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ معبد میں بات نہیں کیا کرتے۔ ربیکا کے پاس ریٹائرڈ کرنل بُت بنا بیٹھا تھا۔ اُس کی نگاہیں پادری پر گڑی ہوئی تھیں۔ کرنل کے چہرے کی لکیروں میں آنسوؤں کے قطرے ٹھہر ٹھہر کر اُس کے کوٹ کے کالر پر گر رہے تھے۔ ربیکا اُن آنسوؤں کو گن گن کر تازہ تازہ سیکھا ہوا گنتی کا سبق دھرانے لگی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ۔ دفعتہً مسز فریڈرک نے اپنے دل کے کواڑ بھیڑ کر اطمینان کا سانس لیا اور یوں کرتے ہوئے اُسے اپنی ملبارن پڑوسن یاد آگئی جو ہر وقت کھٹیا پر لیٹے لیٹے کھانستی رہتی تھی۔ اُس کے گندمی چہرے کی ملاحت اب قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ جب وہ پہلے پہل مالابار سے آئی تھی تو محلے میں اُس کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت وہ ایک باغ و بہار قسم کی لڑکی تھی۔ اُس کی جوانی بھرپور تھی اور باتیں مصری کی ڈلیاں۔ وہ نہایت معمولی سفید ساڑھی پہنا کرتی تھی مگر اس قرینے سے کہ اُس کے سڈول بدن کا بانکپن دوبالا ہو جاتا۔ وہ اپنا جوڑا ایک مخصوص انداز میں بنا کر اُس میں سفید کلیوں کی وینی باندھا کرتی تھی۔ اور جب وہ سینہ تان کر چلتی تو اُس کی پشت پر انگ انگ سے جوانی کا کندن کوندے بھرتا اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چکا چوند سی آجاتی وہ ملیالم کے علاوہ انگریزی بھی لکھ لیتی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے ایک غیر ملکی فرم میں ٹیلی فون آپریٹر کی ملازمت مل گئی ہنس مکھ تو وہ پہلے ہی تھی اب اس کی لپک جھپک میں بلا کی تیزی آگئی۔ کوئی سینما کی دعوت دیتا تو وہ مسکرا کر قبول کر لیتی۔ کوئی ریستوراں لیجانا چاہتا تو وہ خوشی خوشی ساتھ ہو لیتی۔ اسی ہلچل میں دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی جوانی قبل از وقت ڈھل گئی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ بدن کی قوسیں اور خطوط اپنی آب و تاب کھو کر ویران ہو گئے وہ ملازمت سے برطرف کر دی گئی۔ اب وہ اپنے ڈربے میں کھٹیا پر پڑی دن رات کھانستی رہتی تھی۔ مسز فریڈرک ابھی تک نہیں جانتی تھی کہ اُس ملبارن کے ماں باپ کون تھے لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی، شہر کی وہ گندی اور تاریک گلی، جس کے دونوں طرف ڈربے سے بنے ہوئے تھے، ایک ایسی بستی تھی، جس کی گھٹتی بڑھتی آبادی کے ماضی پر اجنبیت کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ سورج نکلتے ہی مرغ مرغیاں ڈربوں سے نکل جاتے اور دن بھر دانہ دنکا چگ کر رات کو لوٹ آتے۔ مسز فریڈرک نے کوئی پانچ سال پہلے وہاں ایک ڈربہ کرائے پر لیا تھا۔ اُس وقت ربیکا پورے برس دن کی بھی نہیں تھی۔ اُس روز سے لے کر آج تک کسی نے مسٹر فریڈرک کو نہیں دیکھا تھا۔ اسی طرح اُس کی ملبارن پڑوسن کے ماضی پر بھی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہاں مسز فریڈرک اتنا ضرور جانتی تھی کہ اُس کھنڈری ملبارن نے ایک رات اپنا جسم بیچ کر اُس کی لاج رکھ لی تھی۔ مسز فریڈرک چوری کو بھیک مانگنے پر ترجیح دیتی تھی۔ اُس دن وہ عین ارتکاب جرم کی حالت میں پکڑی گئی تھی۔ پچاس روپے تھما کر معاملہ دبایا جا سکتا تھا، مگر اتنی رقم اُس کے پاس ہوتی تو وہ ٹائیفائیڈ میں مبتلا ربیکا کو گود میں اٹھا کر ہسپتال لے جانے کے بجائے کسی اچھے ڈاکٹر کو گھر پر نہ بلوا لیتی۔ جب ملبارن کو اس واقع کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنے ڈربے میں ہر اُس جگہ کی تلاشی لی جہاں سے نقدی ملنے کا امکان تھا۔ اُس نے کچھ ریزگی تکیے کے نیچے سے سمیٹی۔ چینی کے گلدان کو الٹا تو چونیاں، دونیاں اور اکنیاں چھن سے باہر آ پڑیں۔ پرس سے روپے روپے کے پانچ نوٹ ملے۔ سب ملا کر دس روپے بنے ابھی چالیس کم تھے۔ ملبارن سوچے سمجھے بغیر سینہ تان کر سیدھی ہوٹل والے کے پاس چلی گئی اور دس دس روپے کے پانچ نوٹ ہاتھ میں تھامے اُلٹے پاؤں لوٹ آئی۔

بات کی بات میں دس دس کے پانچ نوٹوں نے کسی کا منہ بند کر دیا۔ کوئی اٹھی انگلی شرما کر جھک گئی۔ اُس کے بعد ملبارن نے چپکے سے پچپن روپے کے پانچ نوٹ اور ریزگاری ربیکا کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ شام کو کنگھی چوٹی کر کے اُس نے اپنے جوڑے میں سفید کلیوں کی وینی باندھی اور اندھیرا چھاتے ہی ویلے پارلے ہوٹل والے کے چوبارے پر چلی گئی اور رات بھر وہیں رہی۔ دوسرے دن اُس نے سارا قصہ مسز فریڈرک کو سنایا۔ اُس دن سے مسز فریڈرک اُسے اپنی منہ بولی بہن سمجھنے لگی تھی اور اب چوری کر کے اُس کی دوا دارو کرتی تھی، ربیکا کا اور اپنا پیٹ پالتی تھی۔ اور آج وہ برسوں کے بعد گرجے آئی تھی، اپنی منہ بولی بہن کی درازیٔ عمر کی دعا مانگنے کے لیے۔

"اور مقدس کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا اور زمین لرزی اور چٹانیں تڑق گئیں"

پادری کی آواز کے جوار بھاٹے نے مسٹر ہملٹن کے باطن میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ ایک دُبلا پتلا آدمی جس کے بھاری بھاری پپوٹوں اور سرخ سرخ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک چڑھی ہوئی تھی جس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کی پوریں سگریٹ کے دھوئیں سے پیلی پڑ چکی تھیں جس کی آنکھوں کے نیچے سوجن نمایاں تھی۔ گالوں کے ڈھیلے اور مرجھائے ہوئے گوشت نے اس کے سن و سال پر سُود در سُود کی چھاپ لگا دی تھی۔ یہ تھا مسٹر ہملٹن جو مسز فریڈرک کے بائیں طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے پہلو میں اس کی اہلیہ مسز ہملٹن کے بیضوی سر پر پھول دار کپڑے کی ٹوپی ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ اور رخسار لپ اسٹک اور روج کی آرائش سے جاذبِ نظر معلوم ہو رہے تھے۔ مسٹر ہملٹن جانتا تھا کہ اس مصنوعی سرخی کے نیچے خوفناک زردی کا تسلط ہے۔ اس وقت مسٹر ہملٹن کا جی چاہ رہا تھا کہ با آوازِ بلند اپنے گناہوں کا اعتراف کرے۔ اپنی رفیقۂ حیات کا ہاتھ چوم کر کہہ دے کہ اب میں شراب پی کر تجھے کبھی نہیں پیٹوں گا۔ ہر سال بچہ جننے کی پاداش میں تجھے ٹھوکریں نہیں ماروں گا۔ مسز ہملٹن نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ "برتن مانجھ مانجھ کر میرے ہاتھوں کا یہ حال ہو گیا ہے۔ وہ لمبے لمبے ناخن جن پر میں کیوٹیکس لگایا کرتی تھی گھس ٹوٹ کر اب کس قدر بھدے ہو گئے ہیں۔ میں بازار سے سودا سلف لاتی ہوں۔ کھانا پکاتی ہوں۔ لکڑیوں کو پھونکیں مار مار کر چولہا سلگاتی ہوں۔ بینائی دھوئیں کی نذر ہوتی جا رہی ہے۔ بچوں کے کپڑوں میں پیوند لگاتے لگاتے انگلیاں دکھ گئی ہیں۔ مر جانا کتنا آسان ہے۔ مر مر کے جینا کتنا مشکل ہے۔" پھر اُسے وہ دن یاد آ گیا جب پہاڑ پر ایک چھوٹے سے خوبصورت گرجے میں اُس کا بیاہ پڑھایا گیا تھا۔ اُس نے اپنے داہنے ہاتھ سے ہملٹن کا داہنا ہاتھ پکڑ کر خادمِ دین کے پیچھے پیچھے کہا تھا۔ "میں روزی میکنزی تجھ جان ہملٹن کو اپنا شوہر ہونے کے لیے قبول کرتی ہوں تا کہ خدا کے پاک حکم کے موافق آج سے لے کے جب تک موت ہم کو جدا نہ کرے بھلائی اور بُرائی، تنگی اور بحالی، بیماری اور تندرستی میں تجھے اپنا بنائے رکھوں، تجھ سے محبت رکھوں، تیری خاطر کروں اور تیرے حکم میں رہوں اور اس کا میں تجھ سے قول و قرار کرتی ہوں۔" اُس قول و اقرار کا نشان ایک چھلا تھا جو اب بھی مسز ہملٹن نے اپنے بائیں ہاتھ کی چوتھی انگلی میں پہن رکھا تھا۔

مسٹر ہملٹن کے پاس نوجوان کلارک بیٹھا ہوا تھا اور کلارک کی ساتھ والی نشست پر اُس کا دوست رونلڈ۔ کلارک کی نگاہیں سب سے اگلی صف میں بیٹھی ہوئی ڈورو کی مرمریں گردن کا طواف کر رہی تھیں۔ رونلڈ کھلے دروازے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پھولوں کی کیاریوں پر جوبن آیا ہوا تھا۔ ایک بنفشی رنگ کی تتلی کی چنچل اُڑان ہوا کے دھاگے میں رنگ بھر رہی تھی۔ درختوں کے پس منظر

میں نیلا نیلا آسمان حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ رونالڈ کی نگاہیں، خارجی زندگی کے جمالیاتی پھیلاؤ سے ہٹ کر اُس ستون کی طرف اٹھ گئیں جس پر مصلوب یسوع کی تصویر آویزاں تھی۔

" تو نے اپنی صلیب اور بیش قیمت خون سے ہمارا فدیہ دیا" رونالڈ نے بے اختیار رقت انگیز لہجے میں سرگوشی کی۔ کلارک چونکا اُس نے غور سے رونالڈ کی طرف دیکھا، اور پھر اُس کی نظریں ڈوروتھی کے باپ پر جم کر رہ گئیں، جس کی دولت اور صحت دونوں قابلِ رشک تھیں۔ ڈوروتھی کا باپ ریس کورس میں کامیاب بکی تھا اور کلارک کو کھلم کھلا لفنگا اور آوارہ کہتا تھا۔ نہ جانے کیوں ڈوروتھی بھی اب اُس سے کنی کاٹتی تھی۔ خدا جانے اُس نے تمام عہد و پیمان یکسر کیوں بھلا دیئے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے کلارک نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی طرف دیکھا جو ٹریکٹر، بل ڈوزر، ڈریگ لائن، باٹم ڈمپ اور دوسری بھاری بھاری مشینوں کی سروسنگ کرتے کرتے سخت اور کھردری ہو گئی تھیں۔ آج پھر اُسے شدید احساس ہوا کہ اگر وہ تمام عمر اسی رفتار سے محنت کرتا رہے تو بھی وہ ایسی ایک کار نہیں خرید پائے گا جیسی چار کاریں ڈوروتھی کے باپ کے پاس تھیں۔

شمع دانوں میں موم بتیاں بدستور جل رہی تھیں۔ خطبہ گاہ سے وعظ کا سمندر مسلسل بہہ رہا تھا۔ وقت کی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا کبھی طوفان بن کر، کبھی نیلی نیلی وسعتوں کا دبدبہ بن کر، کبھی لہروں کی بیقراری بن کر اور کبھی اتھاہ گہرائیوں کا راز بن کر۔ اور بھیڑوں کا گلہ چپ چاپ سن رہا تھا۔ ان ہی کرسیوں پر لوسی نرس بھی تھی۔ ریمنڈ کیا ونڈر بھی تھا۔ میکالے پائلٹ بھی تھا۔ جواری جانسن اور شیر افضل بھی تھے اور ناول نویس کرشن بھی۔ لوسی کے دل میں سینکڑوں الاؤ جل رہے تھے۔ گذشتہ کل اپریشن تھیٹر میں ڈیوٹی دینے کے بعد اُس کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ نوجوان اکبر کا کشمیری نقشہ اب بھی اُس کی نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والا اکبر جس کے دل کا اپریشن ہوا تھا۔ سرجن نے کمال چابکدستی سے اکبر کا سینہ چیر کر اُس کے دل پر جما ہوا مواد اُتار دیا تھا۔ اکبر چند گھنٹے بے ہوشی کے عالم میں رہا تھا۔ آکسیجن اور خون اُس تک پہنچتی رہی تھی۔ پھر اکبر ہوش میں آیا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ مسکرایا تھا اور لوسی کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے جارج پھر زندہ ہو گیا ہو۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والا جارج! جو ایک خوبصورت شام کو سمندر کے کنارے کنارے تیر رہا تھا کہ ناگاہ موجوں کی یلغار نے اُسے ہمیشہ کے لیے لوسی کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اپریشن کے بعد جب اکبر کے کانپتے ہوئے ہاتھ نے لوسی کے ہاتھ کو چھوا تھا تو لوسی کی تھکی تھکی اُداس آنکھوں میں مسرت کی شبنم تھرتھرانے لگی تھی، پھر اکبر کا لرزتا ہوا ہاتھ آن کی آن میں بے حس ہو کر سرخ کمبل پر گر پڑا تھا اور لوسی کو یوں لگا تھا جیسے اُس کا سارا بدن شل ہو گیا ہو۔ جیسے جارج دوبارہ مر گیا ہو۔ جیسے اُس کی آنکھوں کی شبنم کو واردات کے دہکتے ہوئے انگاروں نے اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ لوسی نے سر جھکا کر دعا مانگی تھی" خداوندا میری روح کو چین عطا کر" اور پھر اکبر کا چہرہ سرخ کمبلی سے ڈھانپ کر باہر چلی گئی تھی۔ آج وہ سکونِ قلب کی تلاش میں گرجے چلی آئی تھی۔ اس لیے کہ آج اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر سات میں اکبر کے بجائے ایکسیڈنٹ کی زد والا مہاجن لیٹا ہوا تھا جو نیند میں خراٹے لیتا اور ساتھ ساتھ منڈی کے بھاؤ بڑبڑاتا تھا۔ اور آج پادری کے خطبے کا افتتاحی جملہ جیسے لوسی کے دل کی پکار تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا جسم زندہ ہے مگر اُس کی روح صلیب پر لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے ہونٹ چپ ہیں مگر اُس کا دل یسوع کے الفاظ دہرا رہا ہے:" اے میرے خدا! اے میرے خدا!

تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" اُس نے سوچا۔ جارج کو سمندر کی موجیں چھین کر لے گئیں اور اکبر کی لاش کو اُس کے عزیز و اقارب۔ اُس وقت میں پھوٹ پھوٹ کر رو بھی نہ سکی۔ میں تو ایک نرس ہوں۔ مریضوں کی خدمت کرنا تو میرا فرض ٹھہرا۔" مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ ایک دن اکبر نے تکیہ سے ٹیک لگا کر لوسی کا اسکیچ بنایا تھا۔ لوسی سفید کاغذ پر اپنا رنگین عکس دیکھ کر ظاہری طور پر تو یونہی مسکرا دی تھی مگر اُس کے دل کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اُس دن ڈیوٹی دینے کے بعد جب وہ اپنے فلیٹ میں پہنچی تھی تو اُس کی نس نس میں ایک نئی زندگی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اُس نے اپنے پرس سے اسکیچ نکال کر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں بار بار دیکھا تھا۔ اُس نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ اسکیچ کے خطوط میں بھرپور زندگی ہے۔ اُس کے دل نے اعتراف کیا تھا کہ اکبر نے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اُس نے انسان کو بہت قریب سے دیکھا ہے یہ سوچتے ہوئے اُس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ پھر بالوں میں کنگھی کی تھی۔ ساڑھی کی سلوٹوں کو درست کیا تھا۔ لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ رخسار بیر بہوٹی بن گئے تھے۔ اور پھر آرام کرسی میں دھنس کر وہ کسی وادیٔ جنت میں گم ہو گئی تھی۔

پادری کی آواز بدستور گونج رہی تھی۔ عبادت گزار بت بنے بیٹھے تھے۔ نمناک آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ گداز دل سہم رہے تھے لوسی کی نرم و نازک انگلیوں نے فاختئی رنگ کا پرس تھام رکھا تھا۔ اُس پرس میں اکبر کے ہاتھ کا بنا ہوا اسکیچ تھا۔ یکایک لوسی کو خیال آیا کہ اکبر اپنی آرزو تو ادھوری ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک دن اکبر نے بھرائی ہوئی آواز میں لوسی کو بتایا تھا "گورنجن سنگھ میرا دوست تھا۔ فسادات میں اُس نے اپنی جان دے کر میری جان بچائی تھی۔ اُس کی اکلوتی بیٹی دل جیت کور مجھے چاچا کہہ کر پکارتی تھی۔ اب دل جیت کور کی امرتسر میں شادی ہونے والی ہے۔ اس لیے میں جلد از جلد اچھا ہو جانا چاہتا ہوں۔ میری بھتیجی اور میری بھابی میری راہ تک رہی ہوں گی"۔

لوسی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ انسان کی خدمت کرتے کرتے اب تھک گئی ہو۔ جیسے دوسروں کے زخموں پر پٹیاں باندھتے باندھتے اب خود اُس کا جسم زخموں سے نڈھال ہو گیا ہو اور اب وہ سرخ کمبل اوڑھ کر اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر سات میں آنکھیں موند کر لیٹ جانا چاہتی ہو۔

مسز فریڈرک نے آنکھوں کے کونوں سے اُس بوڑھی عورت کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی اندر داخل ہوئی تھی اور اب فرش پر رکھے ہوئے گدے پر گھٹنے ٹیکے، ہاتھ جوڑے، ڈیسک پر سر جھکائے، آنکھیں بند کیے، دعا مانگ رہی تھی۔ مسز فریڈرک اُس عورت کو جانتی تھی۔ وہ مسز جیمز تھی جس کا اکلوتا بیٹا دوسری جنگ عظیم میں مارا گیا تھا لیکن مسز جیمز کہتی تھی۔ "میرا بیٹا زندہ ہے وہ کل تک لوٹ آئے گا اُس کے سینے پر بہادری کے تمغے ہوں گے۔ وہ اُسی طرح پاؤں زمین پر مار کر مجھے سلام کریگا" وہ ہر روز ریلوے اسٹیشن کے پھاٹک تک جاتی تھی اور ٹکٹ چیکر ہر روز ایک ہی جواب دیتا تھا۔ "مائی اس گاڑی سے تمہارا بیٹا نہیں آیا"۔

دفعتہً ربیکا فرش پر کھڑی ہو کر سامنے ڈیسک پر پڑی ہوئی مقدس کتاب کے اوراق اُلٹنے لگی۔ مسز فریڈرک نے ربیکا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ماتھے پر بل ڈالے۔ ربیکا پھر قرینے سے بیٹھ گئی۔ مسز فریڈرک کی نگاہیں پادری کے داہنے ہاتھ کا تعاقب کرنے لگیں۔ پادری کا داہنا ہاتھ آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کبھی عمودی، کبھی اُفقی اور کبھی ترچھے انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ اُس کی انگشت شہادت کبھی دائرے بنا رہی تھی اور کبھی نصف دائرے۔ ہاتھ کی اِن حرکتوں میں اَن گنت ساعتیں، گھنٹے، دن اور راتیں، مہینے سال، اور صدیاں گردش کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ ربیکا کے پاس بیٹھا ہوا بڈھا کرنل اپنا پوپلا منہ کھولے پادری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ریبکا بڈھے کرنل کے کندھوں اور گلے کے جھریاں پڑے ہوئے گوشت کو غور سے تک رہی تھی۔ بڈھے کرنل کے دل کے معبد میں مناجات کے وہ اشعار گونج رہے تھے جو وعظ شروع ہونے سے قبل عبادت گزاروں کی جماعت نے سرود خوانوں کے ساتھ مل کر گائے تھے، امن، آسودگی، اور محبت کا گیت۔ ردِ عمل کے طور پر، میدانِ جنگ کے ہولناک واقعات خود بخود بڈھے کرنل کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ آج پھر ان آنکھوں میں پتھرائی ہوئی آنکھیں سوالیہ نشان بن گئیں۔ آج پھر لہو کی سرخ ندیاں وحشت برسانے لگیں۔ اس کا رُواں رُواں کانپ اٹھا۔ آج پھر ایک عورت کی درد بھری آنکھیں اس کی آنکھوں کے بوسیدہ جھروکوں میں جھانکنے لگیں۔ وہی عورت جو انگور کے گچھے توڑتے توڑتے اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھی۔ اس کی بھیڑیں زیتون، لیموں اور نارنگی کے پیڑوں کے سائے میں چر رہی تھیں۔ یہ برسوں پہلے کی بات تھی۔ دنیا کے ایک اجنبی حصے کا ناقابلِ فراموش قصہ تھا جب قتل و غارت کے سیاہ بادلوں میں مسرت کی ایک انمول کرن چمکی تھی جب ایک کوری مسکراہٹ نے سرسبز و شاداب وادی سے طلوع ہو کر اس کی روح کے گوشے گوشے کو منور کر دیا تھا۔ آج پھر اس معصوم بچے کے ننھے ننھے ہاتھ اس کی طرف بڑھنے لگے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

مسز ہیلٹن کے رخساروں پر پاؤڈر اور روج کی موٹی تہہ پر بہتے ہوئے آنسوؤں نے ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر بنا کر جلد کی زردی کو فاش کر دیا تھا۔ مسز ہیلٹن وعظ کی تاثیر میں ڈوب کر آنے والے کرسمس کے اخراجات کا تردد دھل گیا تھا۔ نوجوان کلارک کی نگاہیں پادری کے چہرے پر سے ہٹ کر ادھر اٹھ گئیں، جدھر ڈورتھی بیٹھی ہوئی تھی۔ سورج کی روپہلی کرنیں روشندان میں سے گزر کر ڈورتھی پر ترچھی ترچھی پڑ رہی تھیں۔ اس کے تراشے ہوئے بالوں نے مرمریں گردن پر سائے اور روشنی کا حسین امتزاج پیدا کر رکھا تھا۔ رونلڈ ٹکٹکی باندھے ریمنڈ کیپا ڈونڈ کے کانوں پر اگے ہوئے لمبے لمبے سیاہ بالوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رونلڈ بچپن میں ریمنڈ کیپا ڈونڈ کو دیکھ کر ڈر جایا کرتا تھا۔ جب وہ سیانا ہوا تو ریمنڈ کیپا ڈونڈ کے کانوں کے بال دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ اب جو وہ نوجوان ہو چکا تھا تو وہ ریمنڈ کیپا ڈونڈ سے ڈرتا تھا نہ اس پر ہنستا تھا بلکہ اسے دیکھ کر کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔ اول تو وہ یہی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ لوگ ریمنڈ کو کیپا ڈونڈ کیوں کہتے ہیں اس لیے کہ ریمنڈ تو ایک بیکر تھا جو ڈبل روٹی، بند، پیسٹری، عام کیک کے علاوہ ویڈنگ، برتھ ڈے اور کرسمس کیک بھی فروخت کرتا تھا اور شام کو شراب پی کر آوارہ کتوں اور فٹ پاتھ پر سونے والے بھکاریوں اور مزدوروں میں باسی ڈبل روٹیاں بانٹتا تھا۔ اور جب کبھی آندھی آتی تھی۔ درخت جھومنے لگتے تھے۔ سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوائیں جھونپڑیوں کی چھتیں اڑا لے جاتی تھیں تو ریمنڈ کیپا ڈونڈ سمٹ کر گلی کے نکڑ پر کھڑا ہو جاتا تھا اور ہر راہرو سے مخاطب ہو کر کہتا تھا ”لائف بیلٹ باندھ لو طوفان آنے والا ہے“

پادری کا چہرہ روشندان سے آتی ہوئی سورج کی کرنوں میں درخشاں نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیلم دھل کر چمک اٹھے تھے۔

میکالے پائلٹ دوسری صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں ہوائی جہازوں کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ بعض اوقات تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ جب وہ ہوا میں اڑتا تو ہوائی جہازوں کی آوازیں طیارے کے انجن کے شور و غوغا ہی میں مدغم ہو جاتیں لیکن اپنے ہوائی اڈے پر واپس آ کر جب وہ طیارے سے باہر نکلتا تو یہ آوازیں پھر اس کی سماعت کو گھیر لیتیں۔ جب وہ کسٹم آفس کے سامنے سے گزرتا تو اس کے کانوں کا شور دفعتہً دب جاتا اور چست وردی میں کسی ہوئی مونا کی مترنم ہنسی امرت گھول کر اس کے تھکے ہوئے کانوں میں انڈیل دیتی۔ تھکان آسودگی کا چولا پہن لیتی۔ وہ ہونٹوں کا ایک چھوٹا سا

تازہ بنا کر سیٹی بجاتا ہوا ریستوران میں پہنچ کر مونا کا انتظار کرنے لگتا۔ زندگی میں ایک دلچسپی کی آس سی لگ جاتی اور جب مونا ڈیوٹی دینے کے بعد ریستوران میں آتی تو وہسکی کی بجائے چکن سوپ کی فرمائش کرتی۔ پھر جلدی جلدی کھانا کھا کر تیز کافی پیتے "گڈ نائٹ" کہہ کر چلی جاتی تو تشنگی، پھر تھکان میں بدل جاتی۔ زندگی کی ایک دلچسپی زندگی کی کتنی بے قراریاں کھینچ لاتی۔ ایک دن میکالے نے زچ ہو کر مونا کا راستہ روک لیا۔ مونا نے بڑی خود اعتمادی سے میکالے کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر نہایت سنجیدگی سے کہا "تم میرے دوست ہو اس لیے کہ مجھے ڈنر کھلاتے ہو۔ اور آج کل مجھے صرف اسی سہارے کی ضرورت ہے۔ یہ پیسے بچا کر میں اپنی ماں کی آنکھوں کا علاج کروا رہی ہوں جب میری امی کی آنکھیں اچھی ہو جائیں گی تو میں تمہیں سارے ڈنر لوٹا دوں گی" یہ کہہ کر مونا کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو بھر آئے اور میکالے کے کانوں میں اس شدت سے غوغاں ہونے لگی کہ الاماں! وہ لوٹ کر ریستوران میں چلا گیا اور کم وقت میں زیادہ وہسکی پی کر نشے میں دھت ہو گیا۔

دفعتہً گرجے کے گھڑیال نے دس بجائے ٹن ٹن کی صدا سن کر ربیکا چونک پڑی۔ آج اس کا ننھا سا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے دلچسپی سے دائیں بائیں اور سامنے دیکھا۔ اور پھر مایوس ہو کر سوچنے لگی "اسکول میں تو گھنٹی بجتے ہی چھٹی ہو جاتی ہے مگر یہاں تو سب رنگ برنگے لوگ بیٹھے ہیں" اور سچ مچ ربیکا کے آس پاس عبادت گزار بت بنے بیٹھے تھے۔ ربیکا کے عقب میں دو صفیں بیچ چھوڑ کر بنچ کے سرے پر بیٹھا ہوا جانسن بھی ساکت و صامت نظر آ رہا تھا لیکن اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا اس کا پارٹنر شیر افضل جانتا تھا کہ جانسن کے دل میں طوفان برپا ہو چکا ہے اس لیے کہ جانسن نے اپنی ٹھوڑی دائیں ہتھیلی پر ٹکا رکھی تھی اور اس کے ماتھے کی لکیریں سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آ گئی تھیں۔ شیر افضل یہ بھی جانتا تھا کہ جانسن آج گھر پہنچ کر معمول سے زیادہ وہسکی پیئے گا اور پھر اسے گلے سے لگا کر زار و قطار روئے گا۔ وقت کی گھڑی کی سوئیاں پورے سال کا چکر کاٹ کر جب آج کے دن پر پہنچتی تھیں تو جانسن ایسا ہی کیا کرتا تھا اور اس باضابطگی میں شیر افضل اس کا ساتھ دیتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں جہاں گھڑ دوڑ اور تاش کے پتوں کی ہیرا پھیری کی کامیاب شرکت میں فرق آ گیا تھا وہاں روزانہ شراب نوشی، تاش بینی اور سال میں ایک دفعہ گرجا جانے کی رفاقت بھی جوں کی توں قائم تھی بعض اوقات شیر افضل کو اپنی بزدلی پر شرم آتی تھی، اس لیے کہ جانسن کم از کم سال میں ایک مرتبہ تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا اور دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا مگر شیر افضل ہر شب چپکے چپکے آنسو بہاتا تھا۔ تین سو پینسٹھ دن کے بعد جانسن کے آنسوؤں کی ندیا بہنے کی وجہ تو شیر افضل کو معلوم تھی مگر اس کے دکھ کا راز دنیا میں کوئی نہ جانتا تھا۔ کلب، ریس کورس، عورت اور شراب کی دنیائے رنگ و بو، روز بروز بڑھتے ہوئے بینک بیلنس کی تسکین، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو تنہا سمجھتا تھا حالانکہ جانسن کی طرح اس نے بھی اچھی نسل کے کتے، گھوڑے، بلیاں، اور پرندے پال رکھے تھے۔ ان کی دیکھ بھال دو ملازموں کے سپرد تھی۔ ان ملازموں کو اچھی خاصی تنخواہیں ملتی تھیں پھر بھی وہ بڑی صفائی سے کتوں، بلیوں اور پرندوں کی خوراک چرا کر نکل جاتے تھے۔ ربیکا پھر عام دعاؤں، مناجات اور انجیل مقدس کی جیبی کتابوں سے کھیلنے لگی۔ زرد مائل تنکوں کے ہیٹ کے سائے میں دو مرجھائی ہوئی آنکھیں نمناک ہوتی جا رہی تھیں۔ مسٹر اور مسز ہملٹن عقیدتمندانہ نظروں سے پادری کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پیلا پیلا لمبوترا چہرہ جس پہ چشم غم کے دیپک جل رہے تھے۔ آنکھوں کی دو نیلی نیلی جھیلیں جن پہ گھنیری کالی کالی بدلیاں منڈلا رہی تھیں۔ کبھی آہستہ اور کبھی بلند ہوتی ہوئی آواز جس میں درد رچا ہوا تھا۔ مسٹر فریڈرک کی نگاہوں میں اس کی منہ بولی بہن کا بیمار چہرہ پھرنے لگا، کلائیں، دودھ جیسی مرمریں گردن پر سے نگاہیں ہٹا کر پھر اپنے کھردرے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک

عورت کی وہ روشن آنکھیں جو بڑھے کرنل کی آنکھوں کے بوسیدہ جھروکوں میں جھانکنے لگیں۔ اس معصوم بچے کے مانند جو اُس کی طرف بڑھنے لگے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ مسز جیمز دل ہی دل میں پکار رہی تھی "اے خداوند، میری دعا سن، میری منتوں پر کان رکھ اپنی وفاداری اور اپنی صداقت سے میرا جواب دے" رونلڈ کھلے دروازے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بنفشی رنگ کی تتلی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ آسمان کی شفاف نیلاہٹ دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ پھولوں کی کیاریاں بڑی خوشنما معلوم ہو رہی تھیں، مکالے پائلٹ کے کانوں میں کوئی "ہیلو میگی" "ہیلو میگی" کہہ رہا تھا۔

ناول نویس کرشن آس پاس بیٹھے ہوئے افسردہ لوگوں کے چہروں کا نہایت غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ مثلاً مسٹر رچرڈ جو کسی سفارت خانے میں پبلسٹی انچارج تھا۔ پریس اتاشی مسٹر گومز جس کی بیوی فرانسیسی زبان میں شعر لکھتی تھی۔ کارٹونسٹ مسٹر جوزف جس کی لکیروں کے کوزے میں نت نئے دریا بند ہوتے تھے۔ سیاسی لیڈر مسٹر الفریڈ جس کے منہ سے بات کرتے میں جھاگ اڑتے تھے۔ یہ لوگ کرشن کو دوسرے جاننے والوں کی طرح سے جیون داس کہہ کر پکارتے تھے اور اُس کا پیدائشی نام تھا بھی جیون داس ہی، لیکن ادبی دنیا میں وہ کرشن کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نام اُس نے خود اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس نام میں عجیب دلکشی ہے۔ اس لیے کہ کرشن کا نام لیتے ہی ذہن میں رادھا چھم چھم کرنے لگتی ہے۔ گوپیوں کی پائلوں کی جھنکار گونج اُٹھتی ہے۔ ایک خوبصورت زندگی کے تصور میں نئی تمنائیں بیدار ہوتی ہیں۔ مسٹر رچرڈ، مسٹر اور مسز گومز، مسٹر جوزف اور مسٹر الفریڈ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جیون داس کا کوئی مذہب نہیں۔ اس لیے کہ جس طرح آج وہ گرجے میں پہنچا ہوا تھا اُسی طرح وہ مندر، مسجد، گوردوارہ اور دوسری عبادت گاہوں میں جاتا تھا اور ہمیشہ کہا کرتا تھا "میں خدا نہیں ڈھونڈتا۔ میں تو انسان کی جستجو میں ہوں۔ میں جب کاغذ کی ناؤ بنا کر تالاب کی سطح پر رکھتا ہوں تو وہ تیرتی رہتی ہے۔ میری بیوی کی چھاتی سے جب دودھ کے قطرے خود بخود ٹپک پڑیں تو وہ جان جاتی ہے کہ بچے کی بھوک پکارنے والی ہے مگر وہی بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے۔ تو اُس کی بھوک پکار پکار کر دم توڑ دیتی ہے مگر کسی کے سینے میں درد نہیں ہوتا" یکایک کرشن کی نگاہ ڈیوڈ فلسفی پر جا پڑی اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی جستجو کے آکاش پر دھنک نکل آئی ہو۔

ڈیوڈ فلسفی نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سامنے بیٹھی ہوئی فربہ عورت کو دیکھ کر اُسے اپنی پڑوسن یاد آگئی جس نے اپنے گہنے بیچ کر اور کچھ روپیہ قرض لے کر نئی کار خریدی تھی، اُس کے خاوند نے نئی سنگر مشین بیچ کر نیا ڈریس سوٹ سلوایا تھا اس لیے کہ اگلے ہفتے کی شام کو وہ ایک بہت بڑے تاجر کے ہاں کاکٹیل پارٹی پر مدعو تھے۔ ڈیوڈ فلسفی جانتا تھا کہ اُس تاجر نے بنگال کے قحط میں مرنے والوں کی بھوک کتنی دولت پیدا کر کے سیف ڈیپازٹ والٹز میں رکھ چھوڑی تھی۔ اب وہ دو کپڑے کی ملوں کا مالک تھا۔ اُن ملوں میں ان پڑھ مزدور کام کرتے تھے۔ اُن مزدوروں نے شہر کے باہر اپنی ایک علیحدہ دنیا بسا رکھی تھی۔ جہاں عموماً ڈاکٹر پہنچنے سے پہلے ہی بیمار چل بستے تھے۔ دراصل اُس بستی کے لوگ ہر بات میں عجلت کرتے تھے۔ مذہب کی رکھوالی بھی اُنہیں کے سپرد تھی۔ ذراسی چمکار پہ جان قربان کر دیتے تھے اپنی خوراک میں حیاتین کا کوئی خیال نہ رکھتے تھے۔ اس لیے کیڑے مکوڑوں کی طرح سانس لیتے اور وقت سے پہلے مر جاتے تھے۔

ڈیوڈ فلسفی کو یوں محسوس ہوا جیسے انسان مر گیا ہے۔ یا شاید وہ جاگتا ہے مگر اُس کا ذہن صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔

اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" پروفیسر ڈیوڈ کے کانوں میں یسوع کا یہ جملہ گونجنے لگا۔ اس نے گھبرا کر دریچے میں سے باہر دیکھا۔ سنہری دھوپ میں درختوں کے سبز پتے پرسکون معلوم ہو رہے تھے۔ ایک معصوم بچی پیلا فراک پہنے سبزے کے زمرّدیں فرش پر آلتی پالتی مارے گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ ایک پیڑ کی ٹہنی پر فاختاؤں کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ پروفیسر ڈیوڈ نے ڈیسک پر رکھی ہوئی انجیل مقدس دائیں ہاتھ میں اٹھالی۔ وہ حال کی قید سے نکل کر مستقبل کی ایک دلکش وادی میں جا پہنچا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

دو ہزار روپے کا چیک (۲)

دیوندر اسّر

جب میں بس میں سوار ہوا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ حالانکہ جب تک میں بس کے انتظار میں اسٹینڈ پر کھڑا رہا، میرے سوا وہاں دوسرا کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں ذرا سمٹ گیا۔ وہ اور میرے قریب ہو گیا۔ نامعلوم کیوں مجھے اس سے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا۔

"اب تم گھر جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تو تمہیں اس بیوپار میں کتنا روپیہ ملا؟"

"کس بیوپار میں؟"

"پیار کے بیوپار میں!" اس نے کہا۔

"کیسا بیوپار؟ پیار کا؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"یوں ہی سمجھ لو!" اس نے سر ہلایا اور میری جیب سے چیک نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔

دو ہزار روپے کا چیک ——— شاید یہ اجنبی کوئی جیب کترا ہے۔ میں نے سوچا۔ جب میں منگل داس کے گھر سے باہر آیا تو مجھے ایک لمحے کے لئے احساس ہوا تھا کہ میرے ساتھ میرے پیچھے کوئی دوسرا آدمی بھی چل رہا ہے۔ لیکن اس اندھیرے میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا اور میں اپنے خیالوں میں اس طرح گم رہا کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ اس دو ہزار روپے کا مصرف کیا ہوگا۔ دو ہزار روپیہ پہلی بار میری زندگی میں اس طرح یکمشت آیا تھا...... میں بنگلے میں رہنا چاہتا ہوں! میں کار خریدنا چاہتا ہوں...... میں امریکہ جانا چاہتا ہوں...... لیکن دو ہزار روپے سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بنگلہ، کار، امریکہ...... اور صرف دو ہزار روپے کا چیک۔ اگر میں منگل داس سے زیادہ روپے کی مانگ کرتا تو وہ رضامند ہو جاتا۔ اس کی عزت کا سوال تھا۔ اگر مجھے سودا ہی کرنا تھا تو زیادہ روپے کے لئے کرتا ———

"میں صرف ایک ہزار روپیہ دے سکتا ہوں۔" منگل داس نے کہا تھا۔

"ایک ہزار...... کیا آپ کی لڑکی کی قیمت صرف ایک ہزار روپیہ ہے؟" میں نے طنزاً کہا تھا۔

"بات یہ ہے مسٹر! ایک تو تم نے بھولی بھالی لڑکی کو ورغلایا، اس سے پیار کا ڈھونگ رچایا اور اب......

کیا میں نے رمانی سے پیار کا ڈھونگ رچایا ہے؟ کیا مجھے اس سے پیار نہیں تھا؟ نہیں نہیں مجھے اس سے پیار تھا۔

"ہاں ہاں تمہیں اس سے پیار تھا۔" اجنبی نے میری بات کی تائید کی۔

جب میں منگل راس کے گھر سے باہر آیا تو رمانی کھڑکی کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ کتنا روپیہ ملا؟ خوش رہو۔ سب باتیں اس کی خاموش پُرنم آنکھوں سے ہوئیں اور میں سر جھکائے تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل آیا۔ اس لمحے میں مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ شاید میرے پیچھے یہی اجنبی تھا۔ لیکن میں سب کچھ بھول گیا۔ سوائے دو ہزار روپے کے چیک کے ——

رمانی —— میں نے تجھ سے پیار کیا ہے۔ تم سے پیار کا ڈھونگ نہیں رچایا۔ تم جانتی ہو تیرے پیار میں میں نے دفتر چھوڑا، اپنا شہر چھوڑا۔ لیکن! رمانی! تم امیر باپ کی بیٹی ہو اور میں —— میرا کوئی باپ نہیں۔ غالباً میرا باپ بھی امیر تھا اور میری ماں .... میری کوئی ماں نہیں، شاید میری ماں غریب تھی۔ شاید میں نے کسی تاریک گھروندے میں جنم لیا۔ شاید میرے ماں باپ دونوں امیر تھے۔ لیکن ...... مجھے کچھ معلوم نہیں رمانی! بس میری ماں وہی ہے جس نے میری پرورش کی ہے۔ جو غریب ہے، بدصورت ہے، لیکن جس کا دل سونے کا ہے، جو محنت کرتی ہے اور دکھ سہتی ہے اور پیار دیتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے خاوند نے اسے چھوڑ دیا ہے، وہ بدصورت ہے۔ ہاں وہ بدصورت ہے۔ اس کا چہرہ رمانی! تمہارے چہرے کی طرح خوبصورت نہیں۔ لیکن اس کی ممتا میری زندگی ہے۔ آج وہ ماں خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ صرف اس کی نگاہیں خلا میں گھومتی رہتی ہیں اور کچھ سوچتی رہتی ہیں، کچھ یاد کرتی رہتی ہیں —— اور میں بے گھر ہوں اور میرے پاس پیسے نہیں کہ اس کے خاموش لبوں میں زبان دے دوں اور وہ پھر مجھے 'بیٹا' کہہ کر پکار سکے۔

"کیا تم نے اپنی ماں کے لئے میرے پیار کو چھوڑ دیا؟" رمانی کی آواز آئی۔

"یا آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے ماں کی مصیبت کا سہارا ڈھونڈھ لیا؟" اجنبی نے کہا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

وہ خاموش ہو گیا۔

نہیں رمانی! میں نے تیرے پیار کو نہیں چھوڑا۔ میرے دل میں اب بھی تیرا پیار ہے۔ لیکن؟ .... مجھے اب بھی یاد ہے جب تم میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتی تھیں اور مجھے کوئی ایسا کام آپڑا جو صرف لڑکیاں ہی کر سکتی تھیں۔ میں صرف تمہارا نام جانتا تھا اور کچھ بھی نہیں، اور میں نے تمہیں وہ کام سونپ دیا اور تم نے بتایا کہ تم رات بھر سوچتی رہیں کہ کیسا آدمی ہے۔ نہ جان نہ پہچان اور کہہ دیا کام —— جیسے میں اس کی داسی ہوں! اور پھر تم نے شرم سے سر جھکا کے دھیرے سے کہا ..... ہاں شاید میں داسی ہی ہوں ..... جنم جنم کی داسی —— اور پھر چاند ستارے دھرتی پر آگئے۔ میں نے تمہیں اپنی باہوں میں بھر لیا اور ہم ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ لیکن رمانی تم بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ میری شادی تم سے نہیں ہو سکتی اور جب میں تمہیں حاصل نہیں کر سکتا تو پھر کیوں نا ......

"بڑی اچھی دلیل تلاش کی ہے۔" اجنبی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رمانی تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار تھی، وہ تمہارے ساتھ بھاگنے کے لئے تیار تھی۔ اس نے تمہیں سب کچھ سونپ دیا۔ کوئی بھی اس کی شادی زبردستی نہیں کر سکتا۔ اگر رمانی ایسا کرتی تو تم اس کا گلا گھونٹ دیتے۔" اجنبی نے جوش میں کہا۔

"لیکن ہم بھوکے مر جاتے۔" میں بولا۔

"تو کیا ہوتا؟ اس تسلی سے تو مرتے کہ تم نے پیار کیا ہے۔"

یہ سازش ہے۔"

"تم بزدل ہو۔ انٹلکچوئل ہیپوکریٹ۔"

"خاموش رہو، ورنہ میں تمہیں باہر پھینک دوں گا۔" میں غرّایا۔ میں اگلے بس اسٹاپ پر ہی اتر گیا۔ اگر میں بس میں ہی رہتا تو میرے ہاتھوں اس کا قتل ہو جانا ناگزیر تھا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ محض انٹلکچوئل بھی نہیں ہوں۔

"اگر تم رانی سے شادی کا خیال ترک کر دو تو میں تمہیں دو ہزار تک روپیہ دے سکتا ہوں۔" منگل داس نے کہا تھا۔

"لیکن پیار؟"

"پیار جوانی کا واہمہ ہے مسٹر!"

"میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"اسی لئے دو ہزار روپیہ دے رہا ہوں تاکہ تم اس کے بغیر زندہ رہ سکو...... زندگی پیار سے نہیں پیسے کے دم سے قائم ہے۔"

اور منگل داس نے دو ہزار روپے کا چیک کاٹ دیا اور میں نے وعدہ کر لیا کہ شہر چھوڑ دوں گا اور عمر بھر رانی سے نہیں ملوں گا۔ ماں ٹھیک ہو جائے گی، میں کوئی کاروبار کر لوں گا۔ مگر رانی کے بغیر زندگی یادوں کے بھوتوں کی ایک ڈراؤنی بستی ہے۔ میرے گرد بھوتوں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ میں بھاگا۔ میں نے اس بدنام بستی میں پناہ لی جہاں شراب اور عورت کے جسم کی گرمی میں سب بھوت بھسم ہو جاتے ہیں۔ میرے سامنے شراب ہے اور شراب میں بدمست ایک عورت اور اس عورت کو کچھ ہوش نہیں اور اس کے جسم اور لباس میں ایک موہوم رشتہ باقی ہے۔

"تم جو چاہو کر سکتے ہو لیکن میرے ہونٹ نہیں چھو سکتے۔" اس موہوم سے لباس سے بے نیاز ہوتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔

"کیوں نہیں چھو سکتا ـــــ میں نے پیسے دیے ہیں ـــ سارے جسم کے پیسے..... ہونٹوں کے پیسے۔"

"میں پاؤں پڑتی ہوں ـــ میرے ہونٹ مت چھونا ـــ میں نے ان ہونٹوں سے وعدہ کیا ہے......"

میں نے اس کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔ میں اس کے ہونٹ چھو چکا تھا اور وہ کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا سب نشہ غائب ہو چکا تھا۔

"اب تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ اب میں واقعی رنڈی ہوں۔"

میں اس کے قریب ہو گیا۔ "کیسی عورت ہے۔"

"میں نے ان ہونٹوں سے وعدہ کیا تھا، وفا کروں گی۔ یہ ہونٹ صرف اس کے لئے تھے۔"

"تم یہ پیشہ کرتی ہو اور پھر بھی......"

"دل بیچنے سے جسم بیچنا کم گناہ ہے۔" وہ عورت بولی۔

"دل بیچنے سے جسم بیچنا کم گناہ ہے؟ یہ کیسا اخلاق ہے۔" میری جیب میں دو ہزار روپے کے چیک میں سرسراہٹ ہوئی۔

"خاموش رہو۔"

لیکن وہ چیک خاموش نہیں رہا۔

"بدچلنی اور عیاشی کا نیا فلسفہ۔" چیک نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"بدچلن تم ہو ـــ بدمعاش" میں غصے میں بولا۔ میں نے چیک کو جیب سے نکالا اور پرزے پرزے کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا

"مجھے معاف کر دو رمانی" میں نے اس عورت سے کہا۔

"تمہارا نام رمانی نہیں اختری ہے۔"

"ناموں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جب تک کہ عورت کا دل ایک ہے" میں یہ کہہ کر نیچے اتر آیا۔ پیچھے ہی اجنبی کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک میرا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی نگاہوں سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب آ گیا۔ میں زور سے چیخنا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چیک کے پرزے تھے۔ وہ مسکرایا اور میرے گلے سے لپٹ گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی اجنبی نہیں، بلکہ میرا جانا پہچانا میرا ہمراز ہے۔

وہ میں تھا!

انسان، اُس کا گھوڑا اور خدا

انور سعید

پینشنر جمعدار اللہ بخش نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے ابراہیم کے سوا باقی سب کی شادی اپنے ہاتھوں کر دی تھی۔ لیکن جب چھوٹے لڑکے کے لیے مناسب رشتے کی تلاش میں مصروف تھا تو موت نے اُسے اچانک آ دبوچا۔ کیونکہ ابراہیم اُسے سب سے زیادہ پیارا تھا اس لیے باپ کی موت کا غم اس پر پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا۔

اپنے گھر کے دوسرے افراد کے مقابلے میں ابراہیم تنہائی پسند اور جذباتی تھا۔ اور ستار کی مانند حساس جو تھوڑا سا چھو جانے پر جھنجھنا اُٹھتا ہے۔ وہ متناسب ڈیل ڈول رکھتا تھا، لچکدار، چھریرا جسم، سرکس کے کھلاڑیوں کی مانند اُس کے چہرے سے نسوانیت ٹپکتی تھی جس کے باعث سکول میں اُس کے ہم جماعتوں نے اُسے اِس کی چھیڑ جانی رکھ دی تھی۔ جب لڑکوں نے اُسے حد سے زیادہ مذاق کرنا شروع کر دیا تو وہ اس کی تاب نہ لا سکا۔ ان کی چھیڑ خوانی مکمل صورت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس لیے ابراہیم کو پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ یہ کسی حد تک بجا بھی تھا کیونکہ اگر وہ اپنے گھر والوں سے اس بارے میں شکایت کرتا تو وہ ضرور اس کا سدِ باب کرتے۔ اس میں بہرحال کوئی شک نہ تھا کہ جنوبی ہند کے سکولوں میں ایسی باتیں غیر معمولی نہ تھیں۔ اُس کے والد مرحوم نے تو پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ اس کے چہیتے بیٹے کو منشی عالم کرنے کا قطعاً کوئی شوق نہ تھا۔ جو اس کی والدہ کی خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا لاڈلا مشرقی علوم حاصل کر کے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں منشی یا محرر بھرتی ہو جائے۔ وہ تو اب فوجی ملازمت سے تنگ آ گئی تھی اس لیے بیٹے کی تعلیم جاری رکھنے پر مُصر تھی۔ ابراہیم دل ہی دل میں رسالے میں بھرتی ہونے کا ارادہ کر چکا تھا۔ جب ماں کے کان میں اس کی بھنک پڑی تو وہ اس کے خلاف سینہ سپر ہو گئی۔ اُس نے کھلے بندوں اعلان کر دیا کہ جب تک وہ زندہ ہے وہ بیٹے کو ہرگز موت کے منہ میں سر دینے کی اجازت نہ دیگی۔ اور اس وقت ابراہیم کی عمر کیا تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس۔ ادھر لڑکا خاندانی عقیدے اور رسم کے مطابق شادی کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ باپ کی بھی بس یہی آخری خواہش تھی۔ غیر متوقع موت کی وجہ سے یہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکی۔ باپ کی المناک موت پر ابراہیم کو تنہائیوں میں اور بھی زیادہ غرق ہو گیا اور ماں کی پشیمانی بڑھتی چلی گئی۔ کسی کے سمجھانے بجھانے کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ماں کے علاوہ بھائی بہنوں کا بھی نہیں یہ سب شادی شدہ تھے۔ ان کے گھر آباد تھے اور وہ اپنے کاموں پر مامور۔ انہوں نے ابراہیم کے دل پر سے غم کا بوجھ کم کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کہا۔ کہ شاید اس طرح فضا کی تبدیلی سے اُس کا دل بہل جائے، لیکن وہ نہ مانا۔

یوں ایک برس گزر گیا لیکن ابراہیم باپ کی موت کے صدمے سے بحال نہ ہو سکا، نہ ہی اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپکا۔ نتیجتاً اس کے بزرگوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اُس کی شادی کر دی جائے۔ اس طرح باپ کی روح کو بھی تسکین ملے گی اور لڑکے کے دل کے زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔

چنانچہ ایک برس بعد بڑی شد و مد سے مناسب رشتے کے لئے تلاش شروع ہوئی۔ یوں تو حسب منشا منگنی اور بیاہ بھی ہو سکتا تھا لیکن مرحوم کی وصیت کے مطابق خاندانی بہو لانا ضروری تھا۔ اس کے نزدیک بیوی کی حیثیت سپاہی کی تھی، شوہر کی افسر کی۔ ابراہیم کے معاملے کی گتھی ایک دن اپنے آپ سلجھنی شروع ہوئی۔ ایک دفعہ جب وہ شام کے وقت حسب معمول، دیر سے گھر واپس آیا، تو اس کا مزاج بدلا ہوا تھا...... وہ خلاف معمول خوش تھا۔ لیکن اس لیے نہیں کہ اس کی والدہ نے اسے صبح اشارتاً بتایا تھا کہ وہ اس کی عنقریب شادی کرنے والی ہے اس کے بعد اس کا جو جی چاہے کرے۔ نہ ہی اس لیے کہ اس کے لیے نہایت خوبصورت اور حسب منشا رشتہ مل گیا تھا۔ لیکن جب اس کی ماں نے اس سے ہونے والی بہو کی تعریف میں بات کرنی چاہی تو ابراہیم کا چہرہ یک دم اتر گیا اور اس نے قدرے توقف کے بعد اسے جواب دیا۔

"اماں! بہتر ہوگا اگر آپ جائداد میں سے میرا حصہ مجھے دے دیں۔"

یہ جواب سن کر ابراہیم کی والدہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے کے سامنے توپ رکھ کر داغ دی ہو۔

اس نے بڑی جلدی اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بیٹا، تمہارا حصہ میرے پاس محفوظ پڑا ہے۔ تمہاری امانت ہے۔ یوں تو جب چاہو لے لو۔ لیکن ... شادی"

"نہیں ماں"

"تو پھر تمہیں ایسی کون سی چیز کی ضرورت ہے جس کے لیے اتنی رقم درکار ہے؟"

"میں گھوڑا تانگہ خریدنا چاہتا ہوں۔ لاہور میں چلاؤں گا"

اس جواب سے ماں نے یوں محسوس کیا جیسے اس کے سر پر بم آ پھٹا ہو۔ وہ ایک ثانیہ کے لیے چکرائی۔ پھر ہمت کر کے چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اب ابراہیم اسے سہارا دے رہا تھا۔ وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر بتا رہا تھا کہ اس نے کیا.. نہایت خوبصورت گھوڑا تاڑ رکھا ہے۔ جس کی مثال فوجی رسالے اور سٹڈ فارم Stud form پر بھی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے نہایت عمدہ ساز اور شاندار پشاوری تانگہ خریدے گا۔ ایسا تانگہ جس پر تو بادشاہ بھی بیٹھنا پسند کرے گا۔ یوں وہ گھوڑے کی تعریف میں قصیدے گاتا گیا۔ ماں سر جھکائے انہیں سنتی رہی۔ بیٹے کی زبان کھلتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو چھلک پڑے اس نے اٹھ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھتا بھی جاتا۔ اس خیال سے کہ باپ کا نام کس طرح روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ کو حیرانی! لیکن ممتا غیرت پر فتحیاب ہوئی۔ اگر اس نے بیٹے کی اس سے پہلی فرمائش کو ٹھکرا دیا تو؟ اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا

"اور شادی؟"

"وہ بھی کروں گا۔ لیکن پہلے"

"خدا تمہیں خوش اور سلامت رکھے بیٹا، اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ..... چند روز میں تمہیں تمہارا حصہ دے دوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے ابراہیم کی والدہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، بھاری بھاری قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

تیسرے روز جب وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو چکی تو اس نے بیٹے کو اپنے پاس بلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تین ہزار روپے کے نوٹ ابراہیم کے ہاتھ میں دے دیئے۔ ابراہیم نے حسرت آمیز، لیکن منجمد جذبات سے اپنا حصہ وصول کیا۔

"یہ تمہارے مرحوم باپ کی زندگی کی کمائی ہے، بیٹا۔ جہاں تک ہو سکے اس کا اچھا اور نیک استعمال کرنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تم جوان ہو گئے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خود سمجھ سکتے ہو کہ اس کا بہترین مصرف کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے باپ نے تو۔ ۔ ۔ ۔" کہتے کہتے اس کی گھگی بندھ گئی۔

"یہ تمہاری۔ ۔ ۔ شادی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے لیے۔ ۔ ۔ انہیں کتنا چاؤ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ بہو۔ ۔ ۔" ابراہیم کو اس وقت اپنی باتوں سے متاثر ہوتے دیکھ کر اس نے سلسلہ کلام وہیں بند کر دیا۔

"خدا تمہیں نیکی کی ہدایت دے، بیٹا"

"ماں میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں باپ کے روپے کا ایک پیسہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، ماں! میں ان کی روح کی قسم کھا کر کہتا ہوں"۔

ماں بیٹا کچھ دیر کے لیے ایک ہی جگہ کھڑے رہے۔ لیکن ابراہیم نے جلد ایک جست لگائی اور صحن میں سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔

دوسرے لمحہ وہ اپنے محلے دار ضیا کے اصطبل میں تھا۔ ابراہیم کو آتے رات گئے، گیارہ بجے کے قریب۔ گھر آتے دیکھ کر ضیا کو بڑی حیرت ہوئی اُسے اصطبل سے واپس آتے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے۔ اس کے ابراہیم کے خاندان، بالخصوص جمعدار اللہ بخش مرحوم کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے۔ وہ اس کے بہی خواہوں میں سے تھے، متوفی کے خاص حلقے کا ایک رکن۔ اب بیٹا بھی باپ کی طرح اس کے قریب آ گیا تھا۔ ضیا پیشے سے چابک سوار تھا۔ علاوہ ازیں گھوڑوں کی خرید و فروخت کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ اگر اس نے ابراہیم کے باپ سے فوجی رسالے کے گھوڑوں کی وجہ سے فطری یگانگت تھی تو اس کے بیٹے سے بھی کچھ ایسی ہی مشترکہ بنا پر۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ ابراہیم ایک اعلیٰ قسم کا تانگہ خریدنا چاہتا ہے۔ اسے مہیا کرنے کے لئے اُس سے بہتر اور کون شخص ہو سکتا تھا۔

کچھ عرصہ سے ضیا کے پاس تربیت کے لیے ایک گھوڑا آیا ہوا تھا۔ ابراہیم اس خاص النسل، کم عمر، سنہرے رنگ کے جانور کو محمود شاہ کے تکیے اور اکھاڑے کے نزدیک دوران تربیت دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ابراہیم کے دل میں اسے حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی جب اس نے اسے شروع شروع میں دیکھا تھا تو وہ ایک پھٹتا ہوا آتش فشاں، چٹانوں سے ٹکراتا ہوا، تند و تیز سمندر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں اچھلتے اُسے کتنے بھلے لگتے تھے۔ وہ منہ سے جھاگ اڑاتا۔ اس کی رگ و ریشہ و پٹھوں کا تھرکنا اور پھڑکنا ایسا دکھائی دیتا جیسے سطح آب پر کئی مچھلیاں تڑپ رہی ہوں۔ ابراہیم کو اس کی گرفتاری پر افسوس بھی ہوتا۔ لیکن بے پناہ قوت کے مڑنے اور ڈھلنے کے منظر نہ صرف اُس کے لیے بلکہ تماشائیوں کے لیے بھی جن میں بچے، جوان اور بوڑھے بھی شامل ہوتے۔ باعث استعجاب، لطف اور دلچسپی تھا۔ کیونکہ بڑے بڑے تجربہ کار چابک سواروں کی رائے میں ایسے جانور کو تربیت دینا ناممکن تھی۔ وہ آتشی گھوڑا کبھی تانگے کے جوئے کو برداشت نہیں کریگا۔ یہ خیال ضیا جیسے ماہر کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس لیے ماہرین کے علاوہ ابراہیم کی تمام تر توجہ اس گھوڑے پر مبذول ہو گئی تھی۔

"آدمی شیر کو ٹرین کرتا ہے یہ بیچارہ تو گھوڑا ہے! اور میرا نام بھی ضیا ہے، ضیا!" ضیا نے چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور پانچ چھ مہینے کے اندر زیر تربیت گھوڑے نے ہار مان لی تھی۔ اس نے معیاری چال کے زیر و بم پر دوڑنا قبول کر لیا تھا، منہ میں لگامیں، آنکھوں پہ اندھیاری۔ اب وہ بھاگتا، ہانپتا، دائرے کے گرد ناچتے وقت ہنہناتا۔

"او۔ جیو، جیو!" ضیا اُسے جواب دیتا

اور یوں جب گھوڑے کی تربیت ختم ہو چکی تو ابراہیم نے ضیا کو خاص طور پر مبارک باد دی اور ضیا اس نازک چھکڑے کی موروثی گھوڑا

شناسی اور خلق سلیم سے بہت متاثر ہوا۔ ابراہیم جوں جوں ضیا کے قریب آتا گیا اس کا شوق پل بڑھ کر جوان ہو گیا اور اس کا کوئی ان جیا خواب اُس گھوڑے کے جسم میں ڈھل کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ اب اس کے ذہن کے وسیع و عریض میدان میں دوڑ رہا تھا۔ اسے حاصل کرنا ابراہیم کی زندگی کا مقصد بن گیا۔

لیکن وہ گھوڑا ایک سیٹھ کی ملکیت تھا۔ اس نے اُسے اپنے ایک قرضدار کے ۵۰ روپے واپس نہ کرنے پر قرق کرالیا تھا۔ اس کے مالک کو اسے علیحدہ کرنے پر بڑا رنج ہوا تھا کیونکہ اس نے اُس جانور کو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے پال رکھا تھا جسے اس پر چڑھنا کبھی نصیب نہ ہوا۔ سیٹھ کی خواہش تھی کہ وہ گھوڑا اب اس کی بگھی میں جُتے۔ وہ گاڑی جو اس نے نیلام میں بولی دے کر خریدی تھی۔ جو سلطنت برطانیہ کے شہنشاہ کی گاڑی سے مشابہ تھی۔

جب ابراہیم نے دیکھا کہ اس گھوڑے کا حاصل کرنا قریباً ناممکن ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پھر اس نے ضیا کو بڑے مایوسانہ انداز میں بتایا کہ وہ اس کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔ اس پر ضیا نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اس بارے میں اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ ابراہیم نے گھوڑے کی تربیت ختم ہونے سے چند روز پہلے ضیا کو اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کے بعد تو گھوڑے کو سیٹھ کی گاڑی کی زینت بننا تھا۔

چنانچہ ضیا نے ابراہیم کی طرف سے سیٹھ کو گھوڑا خریدنے کی پیش کش کی۔ سیٹھ نے پہلے تو انتہائی درشتی سے یہ بات مسترد کر دی۔ لیکن ضیا کے اصرار کرنے پر وہ اس پر غور کرنے کے لیے رضامند ہو گیا۔ پیش کش پانچ سو سے شروع ہو گئی پہ سیٹھ نہ مانا۔ گھوڑا خطرناک تھا اور اس کا سنبھالنا کسی ایرے غیرے کا کام نہیں تھا۔ ضیا نے سیٹھ کی بزدلی پر وار کرتے ہوئے معاملے کو نیا رخ دیا۔

لیکن میں نے اسے کتنا روپیہ کھلایا ہے اور اس کی ٹریننگ پر خرچ کیا ہے۔ کیا اس کا بھی تمہیں علم ہے۔ ماسٹر؟ اگر یقین نہ آئے تو کھاتہ دکھلاؤں۔ رقم بہت تھوڑی ہے" سیٹھ نے ضیا کو جواب دیا۔

درحقیقت سیٹھ کو اب بھی اس میں ایک سو ایک روپے کا منافع ہے، بہرحال معاملہ طول پکڑتا گیا۔ سیٹھ کو گاہک کی کمزوری کا پتہ چل گیا تھا چنانچہ سودا آخر ایک ہزار پر طے ہوا۔ اس پر ابراہیم نے سوچا کہ وہ اتنی رقم میں تو شادی کر سکتا تھا۔ گھوڑے کا ساز و سامان اور تانگہ وغیرہ کا خرچ الگ۔ لیکن ضیا کے اثر و رسوخ اور اصرار کے باوجود اس کے کہنے کے مطابق سیٹھ ایک ہزار سے ایک کوڑی کم لینے پر آمادہ نہ تھا۔

جس رات ابراہیم ضیا کو ملا وہ سیٹھ سے اپنی کمیشن مقرر کروا کر اور سودے میں پچاس روپے کم کروا کر واپس آیا تھا۔ اس نے ابراہیم کو دیکھ کر اسے بتایا کہ بات پکی ہو گئی تھی۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی کہ سیٹھ گھوڑا بیچنے پر آمادہ ہو گیا تھا ورنہ اُس کی وہ واقعی اس سے دوگنی قیمت وصول کر سکتا تھا۔ ابراہیم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سیٹھ کو نقد روپے سے دلچسپی تھی۔ سودے کی بات پکی ہونے کی خبر سن کر ابراہیم پھولا نہ سمایا۔ اس نے اپنی صدری کی اندرونی جیب سے فوراً نوٹوں کا گڈا نکالا اور اسے گنے بغیر ضیا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ضیا نے اس میں سے گھوڑے کی قیمت اور اپنی کمیشن وضع کر کے باقی روپیہ ابراہیم کو واپس کر دیا۔

"ذاتی تعلقات کو کاروبار میں نہیں لانا چاہیے" ضیا نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر روپے جیب میں ڈالتے ہوئے تصنع آمیز ہچکچاہٹ سے کہا۔

"بھلا اتنی کرنے کی جلدی کیا تھی"

گھوڑا اب ابراہیم کی ملکیت تھا لیکن اُسے اسی وقت اس کا قبضہ نہ ملنے سے بڑا دکھ ہوا۔ کیونکہ یہ لکھت پڑھت کے بغیر اسے نہیں مل سکتا تھا۔

"اس کی ایک جھلک تو دکھا دو ...... کہ ...... کہ ...... کہ" ابراہیم نے ضیا سے استدعا کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری بیقراری خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن پہلی رات وہ ابھی دلہن کو دیکھنے کے لیے اتنا بے چین نہیں ہوتا جتنے تم"!

ضیا کا یہ جواب سن کر ابراہیم کانوں کی لووں تک سرخ ہو گیا۔ اُسے اتنا مضطرب دیکھ کر ضیا نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے کہا۔

"آؤ، آؤ۔ میرے بھائی۔ اگر تم ضرور اسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہو تو میں انکار کر کے تمہیں ناخوش نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں اس لیے ٹالنا چاہتا تھا کیونکہ وہ تمہیں اتنی تاریکی میں صاف دکھائی نہیں دیگا۔"

اس خیال کے ماتحت کہ وہ کمزور آدمی نہ سمجھا جائے، ابراہیم نے اپنی خواہش کو مشکل سے دبا دیا۔ اور ضیا کی بات مان لی کہ وہ صبح کے وقت آکر گھوڑا دیکھ لے اور ساتھ لکھت پڑھت بھی کروا لے۔

شہر پر امن اور خاموشی آہستہ آہستہ مسلط ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی واپس آتے ہوئے تانگوں کے گھوڑوں کی کلاپ کلاپ کی آوازیں سنائی دیتیں۔ گہرے اندھاریک آسمان میں کہیں کہیں کسی کے رخصت کے وقت پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کی طرح تارے جھلملاتے دکھائی دیتے۔ ہوا خراماں خراماں، سائیں سائیں کرتی ہوئی سنائی دیتی۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہوگا۔ ابراہیم کے لیے پو پھوٹنے میں ابھی رات پڑی تھی۔

اس وقت اُسے یکبارگی یاد آیا کہ اس کے پاس بہت سی رقم تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گیا کہ آیا رات ضیا کے ہاں چلا جائے یا گھر واپس چلا جائے۔

ضیا سو رہا تھا۔ ابراہیم اب تک راستے میں ہی ایک دکان کے چبوترے پر بیٹھا تھا۔ ضیا کو تو فوراً نیند آ گئی تھی۔ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ اسے جگانا نامناسب تھا ابراہیم کے پاؤں آپ ہی آپ اصطبل کی طرف اٹھتے چلے گئے تھے۔ اس نے جلد ہی اپنے آپ کو اصطبل میں گھستے پایا۔ اس نے تاریکی میں جھانک کر دیکھا۔ اُسے کوئی سیماب نما، متحرک، جاندار شے دکھائی دی۔ یہ اُس کا گھوڑا تھا جو اس کی ملکیت ہو جائیگا۔ ابراہیم اس پر ہاتھ پھیرنے کے لیے اس کی طرف بڑھا اس کا پاؤں چارہ کے ڈبے سے ٹکرایا۔ اس کی آواز سن کر ضیا چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"کون ہے"؟ اس نے فوراً اپنے قریب رکھی لٹھ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"اگر جواب نہ دیا تو کھوپڑی توڑ دوں گا" ضیا نے لالٹین کی بتی اونچی کر کے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ابراہیم وہاں گونگا سا کھڑا تھا۔ وہ شرم کے مارے جواب دینے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ ضیا اسے دیکھ کر چونک سا پڑا۔

"ابراہیم۔ لالے! تم یہاں؟ اس وقت؟ پاگل تو نہیں ہو گیا کیا! جلدی گھر واپس چلا جا۔ کہیں اماں پریشان نہ ہو رہی ہو۔"

اس وقت چند پڑوسی اس کی تلاش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اس کی کھوج لگاتے لگاتے ادھر ہی آ رہا تھا۔

گھوڑے کے متعلق کاغذی کارروائی ختم کرنے کے بعد اُسے اپنے قبضے میں لیکر ابراہیم اگلے دن فوراً گھر واپس آیا۔ آج اس کا دل اُچھل رہا تھا۔ جیسے اُسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ لوگوں کو یوں معلوم ہوا جیسے وہ بیاہتا دلہن گھر لا رہا ہو۔ اس نے گھوڑے کا نام سلطان رکھا۔ اس نے اُسے اپنے گھر کے باہر باندھ دیا۔ ضیا کی ہدایات کے مطابق اُسے خوراک دی اور کھرارا کیا۔

سلطان بہت جلد ابراہیم کے ہاتھوں سے مانوس ہو گیا۔ ان میں کتنا پیار اور احتیاط تھی۔ اور ابراہیم گھوڑے کی دیکھ بھال کرتے وقت اپنے گردوپیش سے بے خبر رہتا۔ اپنے اردگرد کھڑے تماشائیوں، عزیز و اقارب سے بے پروا۔

اس کی ماں آئی۔ اس نے جذبات بھرے انداز میں اس کے کام میں برکت کے لیے دعا کی۔ بیٹے نے اُسے خاموشی سے لبیک کہا۔

تیسرے دن کے بعد وہ متوازن، شکیلا، رتھ نما، پشاوری تانگہ ابراہیم کے مکان کے آگے آکر رکا۔ اس میں سلطان جتا ہوا تھا۔ سازوسامان

وہ اچھا، ابراہیم اس میں بیٹھا کوچوانی کر رہا تھا۔ وہ شاہانہ انداز میں ریشمی، شوخ رنگ دار قمیض اور پاؤں میں چکدار شو پہنے ہوئے تھا۔ نیچے شلوار، سر پر ایک خاص خاندانی کلاہ تھی جو اس کی ماں نے اُسے دی تھی۔ سلطان بازار میں اپنے پاؤں اور گردن میں پیتل کے گھنگرو اور سر پر لال کلغی کی نمائش کر رہا تھا۔ اس کے ار منظر کے ٹھیکے ہی کیا۔

ابراہیم کے بیشتر محلے داروں کو اس کی سنجیدہ شوخی پر تعجب ہوا۔ دیگر کو اس کی اس حرکت پر غصہ اور رنج ہوا کہ اس نے خاندان کی ناک کاٹ ڈالی تھی۔ لیکن شہر میں ابراہیم اور سلطان جلد موضوعِ سخن ہی ہو گئے جو اتنی تیز، بڑا جاندار نکلا تھا!

ضیا کی مدد سے اپنے کاروبار کے رازوں سے واقفیت حاصل کر کے ابراہیم اب اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے۔ لاہور جانے کے لیے۔ تیار ہو گیا۔ اس کی ماں نے ضیا سے درخواست کی کہ وہ چند روز کے لیے لڑکے کے ساتھ لاہور رہے اور اُسے کام کے نشیب و فراز سے عملاً متعارف کروا دے۔

ایک سہانی صبح ابراہیم تانگہ چلاتا شہر سے نکلا، اس کا آبائی شہر جہاں وہ خود پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس شہر کو چھوڑتے وقت اس میں عجب ولولہ ابھر آیا۔ لیکن اس میں نہ تو درد تھا، نہ میل، نہ غم۔ اس نے دوبارہ مڑ کر اشکبار ماں کو دیکھا حتیٰ کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سلطان کا سر غیر معمولی شان اور فخر سے اوپر اُٹھ اُٹھ جاتا تھا۔ اس کے قدم بھی نئی دنیا میں بڑی بے تابی سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ وہ دونوں جوان تھے۔ سلطان ابراہیم کی رمزیں سمجھنے لگ گیا تھا۔ اس کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اس کے اشارے پر مڑ جاتا۔

"جیو، سلطان! بس تیز تر چل میرے دوست! ہم اپنی منزل سے دور نہیں۔ ایک نئی دنیا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میں تمہیں اس کی سیر کراؤں گا" ابراہیم نے سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور جواب میں یوں محسوس ہوا کہ اس نے ہنہنایا ہو۔

بے نوٹے دے! پاس بیٹھے ہوئے ضیا نے کہا۔

وہ لاہور جا رہے تھے، وہ سفر میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے۔ گو سلطان تھکنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن ابراہیم آرام آرام سے جانا چاہتا تھا۔ پانچویں دن وہ لاہور پہنچ گئے۔ وہ شہر جس کے متعلق انہوں نے کئی قصے سنے تھے، جب وہ نورجہاں اور جہانگیر کے مقبروں کے پاس سے گزرے تو شہر کی بتیاں صاف دکھائی دینے لگیں۔ بوڑھے راوی کے اوپر سے، شاہی مسجد کے پاس سے، مشتعل شہر کے مرکز کی طرف، جہاں سے موسیقی کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر گانی اور ہوس جوانی سے، اور جوانی دولت سے لپٹتی اور پیاس رقص و سرود میں کھو جاتیں۔

جونہی سلطان کے کانوں میں موسیقی کی لہریں پڑیں، وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ وہ اپنے پچھلے پاؤں پر ایستادہ ہو گیا۔ اور جب وہ بھیڑ میں سے گزرا تو راستہ مسدود دیکھ کر، شور و غوغا سن کر تلملا اٹھا اور اپنے پچھلے پاؤں تانگے کے پچھلے تختے سے مارنے لگا۔ اس پر ضیا نیچے اترا اور اُسے باگ سے پکڑ کر پیدل ہجوم میں سے لے کر چلایا۔

"شہر میں یہ بالکل نیا معلوم ہوتا ہے! کیوں!" ایک شہ نشین سے نقرئی آواز نے پوچھا۔ یہ ہیرا منڈی کی شہرۂ مغنیہ و ساحرہ ظلم شعار خورشید بیگم تھی۔

"ہاں، ہم ابھی ابھی پنڈی سے آ رہے ہیں" ضیا نے مردانہ وار جواب دیا۔ لیکن اس کی نظریں گھوڑے سے کوچوان اور کوچوان سے گھوڑے پر جاتیں اور پھر واپس لوٹ آتیں۔

"کتنا خوبصورت گھوڑا اور تانگہ ہے! اپنے دیس کا ہے۔ تم میں سے مالک کون ہے؟" خورشید نے متجسس نظروں سے ابراہیم کو

دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ابراہیم نے شرم کے مارے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور قریب کی دکانوں اور بیٹھکوں کی بتیوں کی روشنی اس کے چہرے پر اس طرح پڑی کہ اس کے خدوخال قدرے نمایاں ہو گئے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ نرم اور معصوم۔ پھڑپھڑاتے نتھنے۔ گلابی ہونٹ۔ خورشید کی نظریں نوجوان میں کھب گئی تھیں۔ ابراہیم ان سے باخبر ہو گیا۔

"لالہ! ادھر بھی دیکھو ناں۔ تمہیں ان سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔" ضیا نے کہا۔

"نیا ملک ہے"! ابھی شرماتا ہے۔ خورشید نے ضیا کے اشارے اور باتوں کا جواب دیا۔

"یہاں اس کا کام خوب چلیگا۔ ہم اس کے تانگے کی ہر روز سیر کیا کریں گے"۔ اس نے دونوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ضیا نے ایسے سرپرست کا شکریہ ادا کیا۔ اسے ساتھ ہی ابراہیم کے شرمیلے پن پر افسوس اور غصہ بھی آیا۔ خورشید ابھی اور باتیں کرنا چاہتی تھی کہ بیٹھک کے دروازے کے آگے کوئی جھنڈی بردار کار آ کر رکی۔ جھنڈی کا اس وقت خول میں بند تھی اور اس میں سے کوئی ممتاز افسر برآمد ہوا۔ اس پر خورشید فوراً بیٹھک کے اندر چلی گئی۔ اس نے بیٹھک کے اندر غائب ہوتے وقت ابراہیم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اتنے میں ہجوم چھٹ گیا اور ضیا تانگے میں بیٹھ کر ابراہیم سے باگیں لے کر سلطان کو چلاتا شاہ عالمی دروازے کی طرف روانہ ہوا۔

ضیا نے لاہور آنے سے پہلے اپنے چند کوچوان دوستوں کو ابراہیم کے لیے جگہ کا بندوبست کرنے کے بارے میں خط لکھوا دیا تھا۔ چنانچہ جگہ کا بندوبست ہو گیا تھا۔ ضیا نے وہاں پہنچ کر ابراہیم سے اس کی برادری کا تعارف کروایا۔ تانگے کے لائسنس دلوانے کی ابتدائی کارروائی شروع کی لیکن چند روز بعد ہی اسے گھر سے پیغام آیا کہ وہ جلد واپس چلا آئے۔ یہ خط اس نے دراصل اس نے خود لکھوایا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کاروبار میں کسی طرح نقصان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ابراہیم کو اپنے دوستوں کے سپرد کر کے وہ واپس چلا گیا۔

چند روز بعد لائسنس ملتے ہی ابراہیم نے تندہی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

مہینے میں دو بار اُسے گھر سے اُس کی خیر خیریت پوچھنے کے لیے خط آتے۔ ماں اُس کے لیے دعائیں کرتی اس سے وہ اور بھی تن دہی سے کام کرتا اُس کا کام خود بخود چل نکلا تھا کیونکہ سلطان کی برق رفتاری اور حسن اور اس کے تانگے کی شان کے چرچے چاروں طرف پھیل گئے۔ اس کا تانگہ اڈا نمبر پر نہ ہوتا تھا بلکہ بیشتر سواریاں تو اُسے سب سے افضل سمجھتی تھیں وہ سلطان سے ضرورت سے زیادہ کام نہ لیتا۔ دوسروں کے مقابلے میں اُسے زیادہ آرام دیتا لیکن اس کے باوجود اس کی روزمرہ آمدنی کی اوسط دس بارہ روپے بیٹھتی۔ وہ دوسرے کوچوانوں کے برعکس کرایہ کے معاملے میں سواریوں سے بہت کم جھگڑتا چلتے پھرتے طے کرتا۔ [illegible] کر جاتا۔ بعض اوقات سواریاں اُسے مقررہ رقم سے کم پیسے بھی دیتیں لیکن وہ اُسے بلا حیل و حجت وہ جو دیتے قبول کر لیتا اس پر اسے دل ہی دل میں غصہ ضرور آتا لیکن شریف ہونے کے باعث اسے پی جاتا۔ بصورت دیگر بابو لوگ اس کے خلاف پرچا کرانے کا مطالبہ کرنے [illegible] اس کو تھانے میں رپٹ لکھوانے کی دھمکی دیتے۔ وہ ان سے ڈر جاتا اور قسمت پر شاکر ہو کر اپنا کام کئے جاتا۔ اُسے تو سلطان کے لیے دانہ دنکا کرنا پڑتا اسے آسانی سے اتنے روپے مل جاتے جو سلطان اور اُس کے لیے کافی تھے۔

[illegible] کچھ [illegible] اپنا پڑا۔ کیونکہ اُس کے حریف پیدا ہو گئے۔ عام سواریاں اُس کے تانگے پر پروانوں کی طرح ٹوٹتیں بالخصوص اس حالت میں جب وہ کرایہ واجبی طلب کیا کرتا۔ اُسے "بی" اور "سی" کلاس چھوڑ "اے" کلاس والے بھی اس سے چلتے لیکن ابراہیم کو "بی" اور "سی" کلاس سواریوں کو بٹھانے سے بھی چڑ تھی۔ وہ خود غلیظ ہوتے اس لیے اس کے تانگے کی اُجلی گدیاں میلی کر دیتے۔ اُسے اس بات سے خوف تھا ادھر "اے" کلاس سواریاں بھی کم لیتی ادھر دوسرے کٹر تانگے والے۔ اس کا چالان کروا دیتے۔ کبھی اس لیے کہ وہ اپنی باری پر نہیں گیا۔

تھا اس لیے کہ اس نے سنتری یا صاحب کو خوش نہیں کیا۔ کبھی یہ الزام لگا کر کہ وہ بڑا کام کرتا ہے۔

" ارے میاں تمہارا یہاں کیا کام۔ تم کسی ہوٹل وہوٹل، سینما یا ہیرا منڈی کی سواریاں لو۔ تم تو ایک چکر میں بھی اتنے روپے کما سکتے ہو جتنے ہم سارے دن میں۔ ہمارے پیٹ پر کیوں لات مارتے ہو۔"

" ایک ہی پلٹن کے"

" گھمنڈ [illegible] بیچ بھول گئے کیا۔"

گھٹیا درجہ کے تانگے والے اس پر تبصرہ کرتے۔

اب ابراہیم کا اپنی ہر جماعت سے مقابلہ کرنا تھا۔ اُس کا کسی اچھے اڈے پر ٹھہرنا ناممکن تھا۔ اگر کچھ نہیں تو سپاہی اُسے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کو سیٹی بجا دیتا۔ اور ابراہیم نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کبھی کسی کی ہتھیلی گرم نہیں کریگا۔ اس کا نتیجہ بھی اس نے بھگتنا شروع کر دیا۔ آئے دن جرمانہ اور چالان ہی وہاں دوگنا خرچ بھرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ اپنے چند مخصوص اڈوں پر ہی ٹھہرے ورنہ گھومتا رہے۔ سواران کو آرام دینے کا سوال اڈے سے ہٹ کر کس جگہ دیا جا سکتا تھا۔ اس طرح اس کی روزانہ آمدنی کم ہوتی چلی گئی۔ سواری حاصل کرنا قدرت پر چھوڑنے سے زیادہ سے زیادہ پانچ سات روپے ہوتے جن میں سے ساڑھے تین چار روپے تو سلطان کی خوراک کے لیے درکار ہوتے۔ اس کا اپنا کھانا، پینا اور دوسرے خرچ اخراجات الگ۔ سرکاری فری سواریاں الگ۔ اس صورت میں بھی اس کا آئے دن چالان ہو جاتا۔ وہ سفارش ڈلوانے سے رہا اس لیے جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا اسلئے وہ پانچ سات روپے میں ابراہیم کو کھلائے، جرمانہ دے، خود کھائے، طبیلے کا خرچ پورا کرے۔ ساز و سامان کی مرمت کرائے۔ گھر بھیجے کیا رہے اسے سب سے زیادہ فکر گھوڑے کی خوراک کا تھا کہ اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ جب گھر سے ماں کا روپوں کے لیے خط آتا تو اسے نہ صرف انکار کرنا بلکہ صحیح حالات بھی بتانا ناممکن تھا۔ کیونکہ وہ پانچ چھ مہینے تک تواتر سے ہر ماہ پچاس روپے بھیجتا رہا تھا۔ دو مہینے سے نہ بھجوانے کا اس پر قرض بھی چڑھ گیا تھا۔

" ارے یار۔ تم بھی بدھو ہو۔ بالکل بدھو! سونے کی کان ہوتے ہوئے اسے استعمال نہیں کرتے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس تانگے کے ذریعہ اب تک شاندار ہوٹل کھڑا کر لیا ہوتا۔ کم از کم ہزار روپیہ ماہوار اس میں سے پیدا کرتا" کلو خاں، تنور کا مالک، ابراہیم کے مقروض ہو جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

ابراہیم میں اب تک سواریوں کی طبیعت اور تقاضا جاننے کی [illegible] نہیں ہوئی تھی لیکن تانگے کی [illegible] نقد داد۔ واہ واہ اور شاباش" خوب۔ خوب" جیسی داد و تحسین ملنے پر بھی خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ اور ادھر سننے میں آیا تھا۔ اس کی سگائی بھی پکی ہو چکی تھی اس کے دل ہی دل میں یہ یاد کرکے ٹیس اٹھتی کہ اس نے اپنے باپ کی آخری خواہش ۔ شادی ۔۔ پوری کرنا ہے۔ اور یہ کہ اس نے اسے دھوکہ دیا تھا۔

آخر [illegible] بعد اسے ایک منفعت بخش کام ملا تھا۔ ایک سیٹھ کی لڑکی کو گھر سے سکول پہنچانا اور وہاں سے گھر واپس لانا۔ یہ کام مشکل آدھ گھنٹے کا تھا۔ اس کے بدلے اسے ساٹھ روپے ماہوار کرایہ ملتا۔ لیکن ہر بار اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد تو وہ خدا کا شکر ادا کرتا۔ کہ اس کی سواری کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ کیونکہ تانگے والے اس معاملے میں کافی بدنام تھے۔ وہ مذکورہ رقم ہر ماہ ملتے ہی اپنی والدہ کو گھر منی آرڈر کے ذریعے بھیجتا۔ لیکن چار مہینے بعد اسے سیٹھ نے اچانک جواب دے دیا۔ اسے سیٹھ سے استفسار کرنے پر بھی اس کی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ لیکن بعد میں نوکر سے پتہ چلا کہ لڑکی کا درپردہ طور پر کسی آوارہ لڑکے سے معاشقہ ہو گیا تھا جس کا نتیجہ سیٹھ اور اس کے خاندان کے لیے

بدنامی کا باعث بنا چاہتا تھا۔ اس لیے بیٹھنے اُسے چند ماہ کے لیے کسی دوسرے شہر بھیج دیا تھا۔ معاملہ سیٹھ کی اپنی گلی سے شروع ہوا اور دیوالی کے دن عروج کو پہنچا جاتا۔

اُس رات جب وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب چھاؤنی سے واپس آ رہا تھا۔ سلطان کی باگیں تختے سے باندھے اور خود پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا، خیالات میں مستغرق تو ایک نیم مدہوش سواری نے اُسے آواز دے کر تانگہ رکوایا۔ ابراہیم نے پہلے تو اُسے انکار کرنا چاہا کیونکہ وہ دس بجے کے بعد کبھی سواری نہ لیا کرتا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اب یہ عادت بدلنا پڑے گی۔ سواری نے شراب پی رکھی تھی اور وہ سڑک کے عین درمیان لڑکھڑاتی ہوئی آ کھڑی ہوئی تھی۔ اگر سلطان اُسے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں ہنہنا کر خطرے کا الارم دیکر ابراہیم کو بیدار نہ کر دیتا تو وہ ایک معزز راہ گیر کو لاپرواہی سے تانگہ چلانے کے باعث مار ڈالنے کے جرم میں جیل خانے کی ہوا کھاتا نظر آتا۔

وہ نیم مدہوش سواری اب ٹانگے کی پچھلی سیٹ پر دراز تھی۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے نکل رہے تھے۔

"میری، نہ کیا دیکھتے ہو۔ میں ہوش۔ میں ہوں۔ ہوش میں..... مجھے..... ایسے ہی تانگے کی تلاش تھی۔ رات..... کے وقت
...... سیر کرانے کے لیے۔ عیش۔ عیش......"

"صاحب!"

"..... لو۔ ایڈوانس۔"

سواری نے کانپتے ہاتھ سے اپنی بیرونی جیب میں سے ایک چرمرشدہ پانچ روپے کا نوٹ نکال کر ابراہیم کو تھماتے ہوئے کہا۔

"سیر کراؤ.. خوش کر دوں گا۔ خوش!"

"کس جگہ کا صاحب؟" ابراہیم نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

"کتنی دیر سے کام کر رہے ہو؟"

"کوئی ایک سال سے....."

"تو پھر کیا سیر کا مطلب۔ نہیں جانتے"

یہ جواب سن کر ابراہیم چونک پڑا۔

"تم فسٹ کلاس تانگے والے ....." سواری نے جیب میں سے جانی واکر کی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "......
..... مولوی..... تم......"

اس پر ابراہیم اپنی سیٹ سے اُچھل پڑا۔ اس نے ایک لحظہ کے لیے باگیں کھینچ لیں لیکن پانچ روپے کی لس نے اُسے اس حرکت سے باز رکھا۔ اس کا جی چاہا کہ سواری کے منہ پر چابک دے مارے۔ اُسے ہر طرح کے گاہک کو خوش نہیں کرنا چاہیے تھا کیا؟ اس نے سوچا۔ اس سواری سے تو وہ اس رات پچاس ساٹھ روپے کما سکتا تھا۔

"اپنے ٹھینگے..... اور آسمانی گھوڑے کی توہین نہ کرو۔ یہ ہم لوگوں کے لیے ہے..... ہم.. ہم۔ سواری نے جانی واکر کی بوتل سینے سے ٹھونکتے ہوئے کہا۔ اس سے اس میں سے شراب چھلک کر اُس کے کپڑوں اور منہ پر جا پڑی۔

"آ.. ہا... ہا" سواری نے شراب کی خوشبو سے سرشار ہوتے ہوئے کہا۔

سن کر لہو کے گھونٹ پیتا گیا۔ وہ سواری کو

" ے ۔ سے تو بھی پی، اور گھوڑے کو بھی پلا۔ گھوڑے کو بھی۔" اور ابراہیم یہ باتیں

رنیڈ ہوٹل کی طرف لے گیا۔

یہ سن کر ابراہیم نے سلطان کا رخ اس طرف موڑا۔

کدھر کدھر ... ارے، اُو ۔ ھر، اُدھر ....

"... تم ۔ گڑبڑ ہو گیا ۔ جو اُدھر جا رہے ہو۔"

" مجھے ایک ہی راستہ آتا ہے بابو صاحب .... معاف کیجیے۔"

" با د مت ا ..... " سواری نے جانی واکر کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

" تو جس جہ بن م ۔ سے بچ لو۔"

سواری نشے سے چور ہو کر سیٹ پر لیٹ کر مدہوشی میں کہنے لگی۔

" میرا سن ڈی .... خورشید .... ا ..... ل ....." وہ قدرے توقف کے بعد بڑبڑایا" اس پر ابراہیم نے چابک کھول

یں سے نکال زور سے ہوا میں لہرایا۔ سائیں سائیں۔ شاپ ۔ یہ آواز سن کر سلطان یوں سرپٹ بھاگا جیسے ریس کر رہا ہو۔ اگر ابراہیم اُسے آہستہ

چلنے کے لئے آواز نہ دیتا تو وہ شاید تانگے کے سمیت سیدھا رخ دوڑتا ہوا راستے میں کوئی نالہ بھی پھلانگ جاتا۔ ابراہیم نے سلطان کو پہلی بار

چابک دکھایا تھا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے سے نکل رہے تھے۔ تانگے کی رفتار تیز

وہ آن واحد میں ہیرا منڈی میں سے سواری لیے گزر رہا تھا۔

ہونے کے ساتھ وہ پہلے تو سیٹ سے پھر ابراہیم کو چمٹے جاتی تھی اور " بچاؤ۔ بچاؤ" کیے جاتی تھی۔

" کہاں اترنا ہے؟" ابراہیم نے سواری کو ایک بیٹھک کے سامنے تانگہ آہستہ آہستہ کرتے ہوئے پوچھا۔ چاروں طرف سے موسیقی کی تانیں

سواری نے بڑی مشکل سے سر اٹھایا۔

اُٹھ رہی تھیں۔ سلطان کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ بدکا ....

" یہی ہے ۔ اس کی آواز .... بیٹھ ...... ک" سواری نے ابراہیم کو کندھے سہارا دے کر اتارنے کے لیے کہا۔ ابراہیم کو اُسکے

قریب جاتے ہوئے متلی سی آنے لگی۔ اس نے منہ پر ٹھاٹھا سا باندھ کر اُسے اپنے کندھے کا سہارا دے کر جلدی جلدی تانگے سے اتارا اور یوں ایک طرف

دھکیلا جیسے وہ بوری ہو۔

لیکن وہ اُسے اٹھا کر بیٹھک کے اندر لے جانے پر مصر تھی۔ ابراہیم کی نگاہیں یکدم پاس ہی منور بیٹھک جس کے دروازے کھلے تھے اور

چقیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں، کے اندر کھنچتی چلی گئیں

" کون؟" اندر سے خورشید کی آواز سنائی دی۔

" ایم۔ ایل۔ اے صاحب ہیں۔" کسی سازندے نے نیم ایستادہ ہو کر باہر کی طرف جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

" اللہ ۔ اور ۔" کہتے کہتے خورشید رک گئی۔ اس نے ابراہیم کو پہچان لیا تھا۔

" اللہ ۔ اندر ہیے آؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو؟" خورشید نے ۔۔ ایم۔ ایل۔ اے کا استقبال کرتے ہوئے اپنی جگہ اٹھتے اٹھتے

بیکو ابراہیم کو اس کے ساتھ اندر آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا۔

ابراہیم چونکا۔ خورشید بیگم کی مانوس آواز اس کے کانوں میں گونج اٹھی اور ایک سال پہلے کا منظر جب وہ لاہور میں پہلی مرتبہ

وارد ہوتے وقت اس کی بشاشت ساتھ نہ دے سکی وجہ سے رُک گیا تھا، گھوم گیا۔ "ہم اس کے تانگے کی سیر کیا کریں گے" خورشید نے اس وقت کہا تھا۔

"یہاں سے تو خوب کام چلے گا۔"

یہ الفاظ اس نے ہی بار بار دہرائے، انہیں چھوڑ کر جلدی سے واپس مڑا اور ایک ہی جست میں تانگے پر جا بیٹھا۔ وہ اس وقت وہاں سے فوراً ہی جانا چاہتا تھا۔ اس نے جونہی گھوڑے کی باگیں پکڑیں، محسوس کیا کوئی طاقت اُسے بیٹھک کی طرف کھینچ رہی ہے۔ ایک معطر جھونکا یکلخت اسے اپنے قریب محسوس ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، خورشید کبھی ایک نظر اُسے دیکھتی کبھی اپنے سرپرست ایم۔ ایل۔ اے کو اور ابراہیم کی سواری کو۔

"نہیں، اس سے ... ہے؟" خورشید نے ابراہیم کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ابراہیم نے محسوس کیا جیسے وہ اس میں کُھبی جا رہی ہوں۔

"اوہ۔ تم ... میں بھی تنی تھی۔ کہیں دیکھا ہے۔ تم ہی ... وہ ......" خورشید کی بات اُدھوری رہ گئی، ابراہیم یکدم تانگہ بڑھا کر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے پاس ہی موڑ مڑتے وقت ایک بار گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ خورشید بیٹھک کے اندر جاتے وقت نظروں ہی نظروں میں اُس کا تعاقب کر رہی تھی۔

جب وہ اپنے طبیلے واپس پہنچا، رات کی فضا میں سے ایک نیم عریاں بادامی آنکھوں کا جوڑا اس کی طرف گھورتا نظر آیا۔ جب وہ سلطان کو ساتھ لا رہا تھا اس وقت اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے کھنڈروں میں سے کسی کے ناچنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جب اپنی سخت ... ہوئی چارپائی پر دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں پھنسا کر اور ان کی ہتھیلیاں سر تلے رکھ کر لیٹ گیا تو بادامی آنکھوں کا سحر انگیز جوڑا اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ قریب ... اور بھی قریب۔ تازہ چھلے ہوئے بشنہ کردہ باداموں کی مانند اور اس کے خیالات بار بار اس سے پہلی ملاقات کی طرف لوٹتے ...... ایک سال ہوا وہ اس شہر میں آیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہاں سونے چاندی کا دریا بہتا ہے۔ لیکن اُس کے حصے میں تو ریت ہی ریت آئی تھی۔ اس نے مال روڈ بھی دیکھا اور اس کے متوازی عالیشان عمارتوں کے پیچھے بنا ہوا گندہ نالہ اور گندگی کے ڈھیر اور شکستہ و خاک بند عمارتیں اور مفلس و نادار لوگ۔ وہ اپنے تانگے کے شاہی تخت پر بیٹھا، سلطان کو بادلوں پر سرپٹ دوڑاتے دیکھا کرتا تھا۔ انہی یادوں میں سے وہ بادامی آنکھیں پھر اُسے گھورتی دکھائی دیتیں۔ اتنے میں سلطان کے ہنہنانے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کی چارپائی سلطان کے قریب ہی پڑی تھی۔ جانور اپنا منہ نیوا کیے اپنی تھوتھنی ابراہیم کے ہاتھ پر رگڑ رہا تھا۔ ابراہیم اٹھا۔ اس نے گھوڑے کے منہ کو اپنے کندھے پر رکھا، اسے سہلایا۔ پھر اسے تھپکی دی اور اس کے سامنے چارہ ڈال کر پھر چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ وہی آنکھیں پھر نمودار ہوئیں۔ بعد اُس کی ماں کی آنکھوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس نے دو ہفتے سے گھر پیسے نہیں بھیجے تھے۔ ماں کے کتنے خط آئے تھے۔ ان میں سے اس نے بیشتر کا جواب نہیں دیا تھا۔ جواب دیتا بھی تو کیا۔ اس کی شادی کی بات پکی ہو گئی تھی۔ لیکن ہو گی کس طرح؟ اس نے سوچا۔ بہرحال اُسے ماں اور مرحوم باپ دونوں کی خواہش پوری کرنی تھی۔ شاید شادی کرنے سے اُس کے کندھوں کے بوجھ مزید اضافہ ہو جائے گا، دوسرے تانگے والوں کی طرح۔ اس صورت میں اُسے زیادہ کام کرنا پڑے گا ...... بیوی اور بعد میں بچوں کے لیے بھی روپے پیدا کرنے ہوں گے۔ اس حالت میں بیچارے سلطان کی کیا حالت ہو گی؟ وہ جو پہلے ہی دبلا ہو رہا تھا لیکن سلطان کی خوراک اور اس پر خرچ میں کسی طرح کی کمی واقع ہونا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے حالات میں مستغرق تھا اس کے دیدے اندر ہی اندر گھوم رہے تھے، جیسے وہ منڈوے میں تماشہ دیکھ رہا ہو جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ رات دھند کی طرح کافور ہو چکی تھی۔ فضا میں چڑیاں رقصاں تھیں۔ یہ ان کی چہچہاہٹ سے مخمور تھی۔ سلطان بھوک کے مارے اپنے مضبوط سم سے فرش کھرچ رہا تھا۔

جب ابراہیم اٹھ کر تیار ہوا تو اسے تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ تمام تانگے والوں نے ہڑتال کر دی تھی۔ کارپوریشن نے ان کی یونین کا کرایہ بڑھانے کا مطالبہ ٹھکرا دیا تھا۔ یونین نے مزید فیصلہ کیا تھا کہ جب تک یہ پورا نہ ہو ہڑتال جاری رکھی جائے۔

یہ خبر ابراہیم پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑی۔ اس نے تو ان دنوں روزمرہ کا خرچ بمشکل پورا کرتا تھا۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے [illegible] آنکھوں کے سوا اس کا اتنے بڑے شہر میں کوئی اور دوست نہیں۔ لیکن اس کے لیے راستہ مسدود تھا۔ زیادہ فکر تو اسے سلطان کی تھی۔ کیونکہ وہ اس کی خوراک نقد لاتا تھا اس کے لیے اسے ہڑتال کے دوران میں وہ ادھار بھی مل سکتی تھی۔ باقی رہا اس کا اپنا معاملہ اس کا وہ مالک تھا۔

سالا لونڈا بہت شریف ہے۔ اگر ہڑتال کے دنوں میں اسے قرض نہ ملا تو بڑا تنگ ہوگا۔ آج پانچ روپے دے گیا ہے باقی پھر دے جائیگا۔ تنور والے کلو خاں نے ہڑتال پر تبصرہ کرتے ہوئے، ابراہیم کے بارے میں اپنی بیوی سے کہا۔ رات واپس آتے ہی ابراہیم نے اسے پانچ روپے دیے تھے۔

"ان لوگوں کو ادھار نہ دے کر خود بھوکوں مرنا ہے، رکھی"۔ کلو خاں نے خوش ہو کر ابراہیم کے اپنی بیوی سے کہا تھا کل بیس روپے ہی تو تھے اس کے ذمے۔ کیونکہ وہ دوسرے تانگے والوں کے مقابلے میں بہت کم کھاتا ہے۔

"ضرور کسی اچھے خاندان کا ہے ——— اگر ہماری کوئی بیٹی ہوتی تو میں تو اسے اپنا داماد بناتا۔" کلو خان ابراہیم کو دیکھ کر کہدیا کرتا۔

خیر ابراہیم کو سلطان کے لیے خوراک ادھار قرض مل گئی اور اپنے لیے کھانا بھی لیکن اگر حالات مختلف ہوتے تو سلطان کے بھوکا رہنے کا خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتا۔ پھر سوچنے لگا کہ اس نے اپنی یہ درگت تو خود بنائی تھی۔ اس کی جیب میں تو ہر روز کم از کم بیس تیس روپے ہونے چاہیئے تھے وہ اس وقت کام آتے۔ اس کی کلاس کے تانگے والے کتنی عیش کرتے تھے۔ منڈوہ دیکھتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ اور ...... [illegible] جتنی بھی کرتے تھے کیا اس کی اسی طرح کٹ جائے گی؟ وہ پہلے کی نسبت بہت لاغر ہو گیا تھا جیسے بیمار ہو لیکن وہ دوسری کلاس سے تو بدرجہا بہتر تھا۔ اس کا تانگہ اپنا تھا۔ اسے مالک کو ہر روز مقررہ رقم ادا نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جو زندگی بھر اپنا تانگہ نہیں بنا سکتے تھے۔ کئی بیمار تھے اپنے جانوروں اور بال بچوں کا خرچ

اب ہڑتال جاری تھی۔ اس سے سلطان کو آرام مل رہا تھا۔ لیکن یوں کب تک کام چلیگا۔ کب تک تو وہ شاہی سواری ختم کیا وہ اس کا بیڑا پار کریگا؟

ابراہیم اسی ادھیڑبن میں تھا کہ کسی متجسس آواز نے اسے چونکا دیا۔ کسی نے باہر سے پوچھا۔

کیا ابراہیم خاں کوچوان یہاں رہتا ہے؟

ابراہیم چونک کر باہر گیا۔ کیونکہ اس سے بہت کم لوگ ملنے آتے۔ اور یہ آواز بھی تو غیر مانوس تھی۔ وہ جلدی سے باہر آیا۔

"تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے جوتی گھس گئی، یار" نووارد نے ابراہیم کو پہچاننے کے باوجود لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے" ابراہیم نے پوچھا

"بات، بات کیا۔ فلم کے ہیرو بننے والے ہو"

"کیا مطلب؟"

"تمہیں مس خورشید نے بلا بھیجا ہے"۔

خورشید کا نام سنتے ہی ابراہیم کے سامنے دو شربتی، بادامی آنکھیں پھر گئیں۔ لیکن "فلم سٹار" سن کر وہ گھبرا سا گیا۔

"فلم"

"ہماری بائی فلموں میں بھی کام کرتی ہے۔ "پنڈ دی کڑی" اور "کالا چور" میں کام کیا ہے، اس نے کہا تم نے یہ فلمیں نہیں دیکھیں"؛

ابراہیم نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا کام ہے؟" اس نے نووارد کو اندر بلاتے ہوئے، چارپائی پر بٹھلاتے ہوئے کہا۔

"اسی وقت بلایا ہے۔ تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہو گا"

"لیکن"

"ڈرو مت۔ نہیں ہڑپ تو نہیں کر جائے گی۔ تم سے ایک سودا کرنا چاہتی ہے، ا سنہری موقعہ پھر ہاتھ نہیں لگے گا"۔

"میں کچھ نہیں سمجھا۔

"تیرے پاس بہت بڑی چیز ہے، میرے یار۔ پیارے چل گھبرا نہیں۔

"میں گھوڑے تانگے کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا"۔

"تو تانگے ہی پہ چلے چلو"۔

"ہڑتال ہے"

"تمہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ میرا ذمہ ہے"۔

"کسی کو دھیان رکھنے کے لیے کہہ دو۔ کون سی کنواری لڑکی ہے جو کوئی بھگا کر لے جائے گا"

"لیکن۔ لیکن"

"چھوڑو خان۔ پٹھان ہوتے ہوئے ڈرتا ہے۔ میرے سب تانگے والے اپنے یار ہیں۔ میں ان سے کہدوں کہ خیال رکھیں"؛

ابراہیم نے نووارد کا ایک دو بار سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ پھر کھونٹی سے لٹکتا ہوا پرانا تالا اتار کر طویلے سے باہر نکل آیا۔ اسے مقفل کر کے نووارد کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں جاتے وقت گل خان کو طویلے کی حفاظت کرنے کی ہدایت دے گئے۔

بیس منٹ کی مسافت کے بعد۔ چلتا چلتا ابراہیم جونہی اجنبی کے ہمراہ ہیرا منڈی میں داخل ہوا اسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو اسے ان بادامی آنکھوں نے بلا بھیجا تھا۔

"اس کا کام یہاں خوب چلے گا۔ ہم اس کے تانگے پہ ہر روز سیر کیا کریں گے۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں ہر قدم کے ساتھ، زیادہ

شدت سے گرجنے لگے۔ بازار اس وقت قبرستان کی مانند خاموش اور بے جان سا دکھائی دیتا تھا

جب دونوں منزلِ مقصود پہ پہنچے تو ابراہیم نے اس مکان پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جس میں سے داخل ہوتا تھا..... مس خورشید بیگم، علم شناسی جلی حروف میں لکھا ہوا اس کے ماتھے پہ ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد ابراہیم نے اپنے آپ کو بادامی آنکھوں کے سامنے کھڑا پایا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کے منہ پر جیسے والا تالا لگ گیا ہو ـ وہ آنکھیں اسے مقناطیس کی مانند اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ وہ مسکرائیں۔ لب کھلے۔ مخاطب کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خاموش باتیں کر رہے ہوں۔ اس نے دیکھا کہ وہ ہاتھ سے اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے اشارہ کر رہی ہے۔ پھر اُسے یکدم سنائی دیا۔

"ہمیں تمہارا گھوڑا تانگہ بہت پسند ہے"۔

ابراہیم اس بات پر دل ہی دل میں خوش ہوا۔

"کرائے کے لیے نہیں، پرائیوٹ استعمال کے لیے ہونا چاہیے"

خورشید کے پاس بیٹھا ہوا دوسرا شخص، یٰسین، جو ابراہیم کو گھیر کر لایا تھا۔ گویا ہوا

ابراہیم یہ بات سن کر اُٹھ بیٹھا۔

"خفا کیوں ہوتے ہو۔ بھئی جاتے والے ٹوڈو نان" خورشید نے یٰسین سے کہا۔

"لالے، اپنے وطن کے ہوتے ہوتے تم ..... سے ہم غلط بات تھوڑی کر سکتے ہیں پر ہم غریب آدمی ہیں تم ہم جیسی سواریوں کو کب پوچھو گے"۔

جب تک چائے نہ آگئی خورشید اور اجنبی ابراہیم سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"یہ شرمیلا ہے"۔

"پر دھندا انہیں نہیں کرنا چاہیے۔" خورشید کے ساتھی نے لقمہ دیتے ہوا کہا۔

"جتنا روپیہ تم نے اس جوڑی تیار کرنے پر خرچ کیا ہے اس سے نوکری اور کاروبار کر لیتے" اس نے قدرے توقف کے بعد سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا کیا مطلب یہ ہے کہ جو چیز اس نے اتنے شوق سے بنائی ہے اُسے بیچ ڈالے؟"

خورشید نے یٰسین سے پوچھا۔

"اور کیا۔ تم نے جو کہا تھا مجھے ایک عمدہ گھوڑا تانگہ چاہیے۔ اپنی سیر کے لئے"۔

"نہیں" کہہ کر ابراہیم واپس جانے کے لیے اُٹھا۔

"اتنی جلد کیوں خفا ہو گئے، میں تو تمہارے نفع نقصان کا خیال رکھنے کے لیے بیٹھا ہوں۔"

"یٰسین! خبردار اگر ایسی بات کی!"

"میں اس کی چیز اس سے چھینتا تھوڑی ہوں، پیسے دوں گا۔ مثلاً" یٰسین نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سو سو کے نوٹوں کا بنڈل نکا کر سامنے رکھتے ہوئے کہا "منہ مانگی قیمت دوں گا"۔

"لیکن تم یہ تانگہ خریدنے پر کیوں مصر ہو؟" خورشید نے پوچھا۔

اس پر ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لحظہ کے لیے جواب میں خورشید نے آنکھیں جھپکیں اور وہ مسکرا دی اور اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ فکر نہ کرے۔

"میں اسے مصیبت سے بچانا چاہتا ہوں۔ یہ کام بڑا مشکل ہے...... اِدھر ہڑتال...... اُسے اس کا جو خرچ آیا ہے اس سے ڈیڑھ گنا دینے کو تیار ہوں!"

"نہیں میں اپنا گھوڑا تانگہ کسی قیمت پر نہیں بیچوں گا" ابراہیم نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا بھئی۔ تمہاری مرضی" خورشید کے آدمی نے جواب دیا۔

"چلو چھوڑو" خورشید نے اُسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "کوئی اور صورت کر لیں گے"

اس نے تھوڑی دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لی جیسے کسی مسئلے کا حل سوچ رہا ہو۔ پھر یکلخت گویا ہوئی۔

"یٰسین، تم نے چیز تو اوّل درجہ کی چنی ہے۔ لیکن لالہ نہیں مانتا۔ تو پھر ماہوار کرائے کی بات ہو جائے۔ صبح شام ڈیڑھ دو گھنٹے سیر کے لیے!"

ابراہیم کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔

"اچھا۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی تو کرایہ دیا ہے کر بھی اپنا بیڑا کروانا ہے تو......"

"کیوں ابراہیم۔ منظور ہے؟" اس نے اب ابراہیم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں نامنظوری کی کیا بات ہے"

"کتنا ہو گا؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار" خورشید نے جواب دیا۔

"ڈیڑھ سو! ڈیڑھ سال میں اتنے کرائے سے ایسی جوڑی بنتی ہے۔ اچھا جانی! اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو......"

"کیوں بھئی خان۔ منظور ہے؟ اب تو ہاں کر دو" یٰسین نے ابراہیم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

ابراہیم نے دونوں کی طرف دیکھے بغیر اثباتی نگاہ سے دیکھا پھر انگلی سے فرش پر دائرے سے بنانے لگا۔

"بھئی۔ بڑے شرمیلے ہو۔ تو کیا میں بھی دلہن کی طرح تمہاری طرف سے ہاں کہہ دوں" خورشید ہنس کر بولی۔

ابراہیم مسکرا پڑا اس نے پگڑی کے پلو سے منہ ڈھانپ لیا۔

"واہ میرے جانی!" یٰسین نے اُسے گلے سے لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر لاؤ ایڈوانس!" وہ بولا۔

"کتنا؟" خورشید نے پوچھا۔

"یہی۔ ایک مہینہ کا۔ آج کل ہڑتال ہے۔ نہ معلوم......"

"تو پھر اپنی جیب سے دے دو۔ حساب کر لیں گے"

یہ کہتے ہی بیگم نے ڈیڑھ سو روپیہ گن کر ابراہیم کے سامنے رکھ دیا۔

اس وقت ابراہیم کا جی چاہا کہ اٹھ کر خورشید کے ہاتھ چوم لے۔ اس نے تشکر آمیز آنکھوں سے خورشید کی طرف ایک بار دیکھا۔ ان
شربتی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو گئے اور ابراہیم کا دل کپکپا اٹھا۔

چند ماہ بعد حسب معمول، ابراہیم اپنی رنگین مالکن کو تانگے پر بٹھائے سیر کرانے کے لیے داتا صاحب کے دربار کے پاس جاتا دکھائی دیا۔
سلطان کے قدم یوں معلوم ہوتا۔ بڑے فخریہ انداز میں زمین سے اٹھ اٹھ جاتے تھے اور خراماں خراماں چلتی ہوا میں خورشید سرخ ریشمی برقعہ
آہستہ آہستہ پھڑپھڑا رہا تھا۔

چاند کے گرد یہاں بادلوں نے رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔
ہوا تند ہونی شروع ہوئی اور سلطان کے ایال اس میں لہرانے لگے اور سرخ برقعہ میں خورشید کے گھنگھریالے بال تلملا کر باہر نکل آئے

آج وہ ہاتھ سے نکلا جاتا تھا اس کے جسم کی مچھلیاں سطح آب کے نیچے تڑپتی اور مچلتی دکھائی دیتی تھیں۔
آج ابراہیم کو پہلی مرتبہ اس سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ ایک آرو سڑک اس کے پاؤں تلے گونج رہی تھی۔ زنانی توپوں کی مانند

راستے میں لوگ ایسی شاہی سواری کو سڑک پر گزرتے دیکھنے کے لیے باہر نکل آتے۔

راہ گیر بھاگ کر سڑک سے دور ہٹ گئے۔

گاڑیاں گھوم کر ایک طرف ہٹ گئیں

سواری ایسا منظر دیکھ کر مسکراتی جاتی۔

"سنبھل کر" ابراہیم سلطان کو مخاطب کر کے بار بار کہے جاتا۔ وہ اس کی باگیں جتنے زور سے کھینچتا وہ اتنا ہی تیز ہوتا جاتا۔

آسمان فاختئی رنگ کا تھا۔ بادل شیطان کی آنتوں کی مانند گول چکر کاٹتے ہوئے وحشیانہ انداز میں رکتے ہوئے سے تھے۔

خورشید نے [illegible] سے راوی کی طرف مڑنے کا اشارہ کیا۔
جب وہ پرانے دریا کے پل پر سے گزر رہے تھے تو ابراہیم نے ایک بار پیچھے کا جائزہ کیا۔ جلتی ہوئی بتیاں دور سے
[illegible] کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔

تاروں سے بھرا [illegible] کی مانند۔ جانے پہچانے [illegible] کی مانند [illegible] جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک گرم ہاتھ نے
کلاپ کلاپ [illegible] تھپ تھپ۔ وہ ہوا کے دوش پر اڑے جا رہے تھے۔ سلطان تندرے کی طرح اڑا جا رہا تھا اور دور سے
ابراہیم کو پیچھے سے شانے دبایا [illegible] کار! ابراہیم نے چونک کر یکلخت گھوڑے کا رخ بدلا۔ سارا دن محنت کر کے آیا ہے۔ نور جہاں
آتے ہوئے [illegible] کی سی آواز پیدا کرنے لگا۔ وہ آہستہ کر دو بیچارے بے زبان کو کیوں تھکاتے ہو۔ اس نے ایک ہاتھ سے گدی کو مضبوطی سے پکڑ لیا
کے مقبرے کے پاس سے گزرتے وقت خورشید نے اپنا برقعہ اتار کر اپنے زانوؤں پر دبا لیا۔
اور پیچھے سے ابراہیم کے اتنی قریب ہو گئی کہ اس کا معطر اور گرم سانس اس کی گدی سے چھو چھو کر نکلتا۔

آج موسم کتنا اچھا ہے۔ سیر کا کبھی اتنا لطف نہیں آیا۔ اور عالم سکر و مستی میں اسے قہقہوں کی صورت
اس کی آنکھیں کچھ مچ جاتیں۔ وہ منہ کھول کر اس کے گھونٹ بھرتی

میں باہر نکالتی۔

اتنے میں انہیں اپنے پیچھے پیچھے آتے ہوئے ایک تانگے کی آواز سنائی دی۔ وہ سرپٹ بھاگا آ رہا تھا۔ پٹاخے کی طرح جونہی وہ ان کے پاس سے گزرا تو ہوا میں ایک پٹاخے کی طرح چابک چھوٹا۔

"ارے کتے ..... اس ..... کو کہاں لے جا رہے ہو، تجھے پر لگ گئے ہیں، ـــــ دیکھیں آج تیرا بھی گردہ۔ بھگا کے لیکے لے!" ابراہیم نے چونک کر گردن موڑتے ہوئے دیکھا یہ وہی ایم۔ ایل۔ اے تھا جسے اس نے شراب کے نشے میں چند ہی ماہ پیشتر خورشید کی جھلک کے سامنے آمادہ تھا۔ یہیں ٹانگہ چلا رہا تھا۔

"خبردار اگر گالی دی" ابراہیم نے بڑی تندی سے گرج کر جواب دیا۔ "پیٹ چاک کر دوں گا" اور اس نے لگا غول میں سے مستعمل شدہ چابک نکالا اور اسے گھما کر حریف کے منہ پر زور سے دے مارا۔ اس نے کیفیت "یاعلی" کا نعرہ لگایا اور سلطان کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ اب فضا میں ٹپ ہونے لگے، تیزی سے ٹاپیں چھم چھنے کی آواز بلند ہوئی۔ سڑک کھلی، سنسان اور لمبی تھی۔ اس وقت ابراہیم کو فقط یہ خبر تھی اس کے ہاتھ میں باگیں تھیں۔

آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں ایک شعلہ سا دور اڑتا چلتا دکھائی دیا۔ گرجتا ہوا شعلہ!

سردی میں سلطان کے منہ سے آتشیں بگولے نکلتے اور دھند میں تحلیل ہو جاتے۔ وہ پسینے میں شرابور، سنہری مہاکا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔

اب ابراہیم نے دریا کے کنارے کچی سڑک پر پہنچ کر اسے روک دیا۔ ایک گھنے ذخیرے کے قریب، جہاں سے دریا کبھی اژدہا کی مانند رینگتا ہوا گزرتا دکھائی دیتا تھا۔

"شاباش!" خورشید نے اسے نظروں اور منہ سے داد دیتے ہوئے کہا اور فرطِ انبساط سے جھپک کے اس کی گردن کے گرد اپنا بازو حائل کر دیا۔

"اس نے مجھے گالی دی تھی"!

"تم نے بھی تو کچھ کم نہیں کیا۔ اب پولیس سے ہوشیار ہو کر رہنا۔ وہ ہمارے خلاف ہو گیا ہے"۔

ابراہیم نے اس کا بازو آہستہ سے گردن سے ہٹایا۔ اس وقت اس کی نیلگوں آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں۔ خورشید پر وارفتگی سی چھائے جا رہی تھی۔

"میں ان شہدوں کی کراس بند کرانے کا بندوبست کروں گی۔ فکر نہ کرو۔ تمہارا کوئی بال تک بیکا نہیں کر سکتا"۔

سلطان کی مانند ابراہیم کا چہرہ بھی پسینے میں شرابور تھا اس کے تمتماتے چہرے پر اس کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ اسے اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ اب شہوت آمیز ہنسی ہنس دی اور اسے شرماتے دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ ابراہیم گھبراہٹ میں اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنا منہ پونچھنے لگا۔ خورشید نے اپنی چولی سے گہرے نیلے رنگ کا رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس وقت رات کی رانی خوشبو سے مہک اٹھی۔

"کتنے بہادر ہو۔ مجھے آج پتہ چلا۔"

رومال دیکھ کر ابراہیم یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے لے یا نہ لے۔ خورشید مسکراتی ہوئی گدی پر سے نیچے اتر آئی۔ ابراہیم جلدی سے

دوسری طرف سے تانگیا سلطان ہنہنایا۔ ابراہیم اس کی پشت تھپتھپاتا اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا پھیرتا اس کی گردن تک پہنچا۔ گھوڑے نے اس کی طرف منہ موڑا

ابراہیم نے اسے اپنے شانے سے لگالیا۔

"شاباش، شاباش!"

دوسری طرف سے خورشید گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتی ہوئی ابراہیم کے پاس آکھڑی ہوئی، اور اپنے رومال سے جو ابراہیم نے پہلے سے ادا کر دیا تھا۔ اس کا منہ پونچھنے لگی۔ ابراہیم اس حرکت سے چونک پڑا۔ "ڈر گئے کیا؟"

خورشید کی آنکھوں پر معنی سی چھاتی دکھائی دیتی۔ ابراہیم ان شربتی اور بادامی آنکھوں سے سحر زدہ ہو گیا تھا۔ خورشید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے ایک طرف کھینچتے ہوئے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں وہ بلا ارادہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

تھوڑی کی دیر بعد قریبی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ اسے سن کر دونوں ایک دوسرے سے چونک کر الگ ہو گئے جیسے مجرم ہو گئے ہوں۔ دفعتہً وہ دو گوشے سے الگ ہو گئے۔

ابراہیم اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا تیر کی مانند تانگے کی طرف لپکا۔ سلطان غصے سے زمین پر پاؤں مارنے لگا اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ دوسرے لمحہ ابراہیم اپنی کمر کی پیٹی کے نیچے ایک لمبا سا چاقو نکالتا دکھائی دیا۔ کمان کھلی وہ اپنے سامنے لپکا۔ خورشید بھاگ کر تانگے کی اوٹ میں ہو گئی اس نے برقعہ اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔ شکست خوردہ حریف اس سے گتھم گتھا ہوتا دکھائی دیا۔ لیکن ڈر کے مارے پیچھے کھڑا تھا۔

"مارو۔ اس مونڈی کاٹے کو! یہ، ایم۔ ایل۔ اے سیٹھ کا من چہیتا تھا۔

یٰسین کے کراہنے کی آواز سنائی دی اور وہ جھاڑیوں میں بھاگتا سنائی دیا۔ سیٹھ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

خورشید اور ابراہیم آدھ گھنٹہ بعد آہستہ آہستہ تانگے پر واپس جا رہے تھے۔

"بڑا جیالا نکلا، یٰسین کی قسمت اچھی تھی جو بچ گیا"

"اچھا ڈاکا چاہا ہے!"

خورشید سے محلے والوں نے یہ ماجرا سن کر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چند روز بعد ہی ابراہیم کی یٰسین پارٹی سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔ کیونکہ اب وہ اکیلا نہ تھا اور اس کا ہاتھ کھل گیا تھا اس لیے خاصا معرکے کا مقابلہ ہوا۔ جس میں جہاں اُسے بھی چند زخم لگے وہاں یٰسین میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ "مراری" نے آخر کار داڑھی اتار دی تھی۔ اور اب ابراہیم ہر روز کم از کم پچیس روپے کماتا۔ اس نے اپنی شادی کی تاریخ خود مقرر کروائی تھی۔ ملک آزاد ہونے کے دو دن بعد۔ اس کے ماتھے پر ایک چاند نما زخم کا نشان لگ گیا تھا۔ وہ اب نڈر ہو گیا تھا۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ شادی کے بعد خورشید کی ملازمت چھڑوا دیگا اور تمام ترکمائی اپنے بل بوتے پر کرے گا ...... وہ اب ہر مذہب
وقت کو سرمایہ داروں کی خواہشات پوری کرتا جن میں معروف و غیر معروف، سیاسی و غیر سیاسی کارکن بھی شامل ہوتے حتیٰ کہ جب ان آزادی کے لیے طوفان بڑھتا
چلا گیا جس کے بعد وہ اپنی ماں اور باپ مرحوم کی خواہش پوری کر سکے گا۔ اس نے شہر کے مفلوک الحال اور تاریک سے تاریک ترین گوشے دیکھے تھے
شہر اور ملک کے کونے کونے میں آزادی کے لیے جلوس نکالے جا رہے تھے۔ اس کے لیے زیر کشمکش اور اجتماعات جذباتی حیثیت رکھتے تھے۔ ملک
کے کسی حصے میں اسلامی حکومت کا قیام۔ لیکن وہ اپنی ڈگر پر بدستور چلتا گیا وہ تو اسی پیشے سے روزی کما سکتا تھا۔ ورنہ اوروں کی طرح فاقے مرتا

وہ آزادی کا خود مختار۔ اُسے کسی مالک کو روزمرہ یا بہرصورت روزانہ مقررہ رقم نہیں ادا کرنی تھی خواہ وہ اپنے پلے، ادھار کر، مانگ تانگ کر ان ہی نہ ہو۔ وہ آزادی اور سلطان اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں ہی ہو کہ وہ گھوڑوں اور کوچوانوں کی شکل بنا نا برداشت کر سکتا تھا۔

سیاسی حالات پریشان کن ہو گئے تھے۔ ملک میں ابتری پھیل گئی تھی افواہیں پھیلنی شروع ہو گئیں کہ اگر پاکستان کا مطالبہ پورا کیا گیا تو ملک میں فساد ہو جائیں گے، خون خرابہ ہو گا، تباہی ہو گی۔ دوسری طرف یہ کہا [illegible] گیا تو اس کے نتائج نہایت ہی ہولناک ہوں گے۔

ایک وقت آیا کہ ہر جماعت حتیٰ کہ کوچوانوں نے بھی۔ اپنے اپنے تانگوں پر رنگا رنگ کے سیاسی جھنڈے گاڑ دیئے آزادی کی آمد آمد تھی۔ فضا اس سے معمور و مرتعش تھی۔ کانگرس، مسلم لیگ، مہا سبھا، تمام پارٹیاں۔ ملک کے طول و عرض میں اجلاس منعقد کر رہی تھیں۔

اس فضا میں ابراہیم صرف ایک بات سمجھ پایا تھا۔ کہ ۱۴ اگست ۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آئے گا۔ اس سے پہلے اس نے راولپنڈی اور ملک کے دوسرے حصّوں سے قتل عام کی خبریں سنیں۔ بلا امتیاز ہندو، مسلم، سکھ جو اس کے تانگے پر چڑھا کرتے تھے۔ اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔ معصوم بچوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کے قتل سے، عورتوں کی عصمت دری سے۔ جگہ جگہ عورتوں کے برہنہ جلوس نکلنے کی خبروں اور افواہوں نے ابراہیم کو یقین دلا دیا کہ آزادی قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔

جب یوم آزادی آ پہنچا۔ یہ گہری اور تاریک خاموشی، طوفان سے پہلے سکوت سے لبریز تھی۔ یہ اس کی زمین کے ہڑتال سے مشابہ تھی اس کا اس پر کیا اثر ہو گا؟ وہ سوچتا۔

اور جب لاہور کو پاکستان کا شہر قرار دیئے کا اعلان ہوا تو وہاں سے غیر مسلم آبادی نے ہجرت کرنی شروع کی۔ اس سے شہر میں آتشزدگی، چھرا گھونپنے کی وارداتوں کا نیا باب کھلا۔ اس شہر میں جو رنگ و بو، راگ رنگ، کھیل کود اور تماشوں اور فیشن اور میل جول کی آماجگاہ تھا۔ اب آتش فشاں شعلے میں تبدیل ہو گیا۔ ہندو اور مسلمان ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کوئی شکار کوئی شکاری ... آزادی نے اپنی بھینٹ لینا شروع کر دی تھی! ایک طرف پنجاب سے آبادی بھاگ رہی تھی، دوسری طرف بہت سی ہندوستان سے آ رہی تھی..... اس کے باوجود آزادی آئی پاکستان معرض وجود میں۔

شہر پاکستانی جھنڈے اور جھنڈیوں سے مزین کیا گیا۔ اب ابراہیم کی شادی میں دو روز باقی تھے۔ اس نے گھر لکھا تھا کہ تیار رہیں وہ جشن آزادی دیکھ کر آئے گا۔

شہر میں باقی ماندہ خونخوار اور انتقام جو غیر مسلم مسلمانوں کو، جہاں جہاں وہ ان کے ہتھے چڑھ جاتے۔ موت کے گھاٹ اتارنے کی تلاش میں تھے۔ اسی طرح مسلمان اپنا انتقام لے رہے تھے۔

شہر میں امن کمیٹیاں قائم کی گئیں جو لوگوں کو گزشتہ واقعات کو بھول جانے اور فسادات کو ختم کر دینے کی تلقین کر رہی تھیں۔

ایسے دن کے لیے ابراہیم نے سلطان کو اچھی طرح نہلا دھلا کر اس کے پہلوؤں پر سرخ رنگ سے جلی حروف میں پاکستان زندہ باد لکھ دیا۔ اس نے اس کے ساز پر جگہ جگہ پاکستان کی جھنڈیاں گاڑ دیں۔ اور خلافِ معمول قبل از وقت کام پر نکل پڑا۔

اس کے ساتھی کوچوانوں نے اور خاص طور پر خورشید نے خبردار کیا کہ شہر میں کشت و خون ہو رہا ہے اور اس میں مخالف فرقوں کے کوچوان بھی دھرے جا رہے ہیں۔ اس لیے وہ اوّل تو اس دن باہر نہ نکلے یا جلد از جلد واپس آ جائے۔

"ہم جشن دیکھے گا۔ ہمارے شہر میں اب نہیں کوئی کیا کرے گا۔ اللہ مالک ہے!" کہہ کر وہ سیر کرنے کے لیے چل دیا۔ وہ نادانستہ

غیر مسلم علاقوں سے گریز کرتا شہر کا چکر لگاتا رہا۔ سنسان ویران شہر جس کے اندر سے دھوئیں کے غبار اٹھنے ہی سے اس کے اندر کسی متنفس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ ورنہ کوئی .... فوج یا پولیس کا آدمی ہی ادھر گھومتا دکھائی دیتا۔

راستے میں ایک جگہ اس پر کسی مکان کی چھت سے فائر ہوا۔ لیکن وہ بچ نکلا۔

یوں شام ہو گئی۔ دھوئیں کے باعث دھندلکا اور بھی گہرا اور ہیبت ناک دکھائی دینے لگا۔ کبھی کسی طرف سے مصیبت زدہ عورتوں اور بچوں کی آوازیں بلند ہوتیں۔ سلطان کی کلاپ۔ کلاپ کی آواز کے ساتھ ساتھ یہ چیخنے، کرلانے اور اللہ اکبر یا ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کے نعروں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ ابراہیم کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کہ اچانک کرفیو آرڈر اور پولیس کی سیٹیاں بج اٹھیں۔

اس نے گھر کی طرف تانگہ موڑا۔ وہ جوں جوں شاہ عالمی کی طرف ریلوے روڈ کی طرف چلتا گیا سڑک کی بتیاں گل ہوتی گئیں۔ وہ چوکس ہو گیا۔ سلطان کے کان بار بار کھڑے ہو جاتے اور وہ آگے جانے سے رُکتا۔ اس نے خطرہ محسوس کر کے اسے موڑا اور ایک گلی میں سے گزر کر جلد جلد گھر پہنچنے کے لیے چھوٹا راستہ اختیار کرنا چاہا۔

اس وقت اسے پُراسرار آوازیں آتی سنائی دیں۔ وہ چونکا۔ اس نے دیکھا کہ دھوئیں دار دھند میں سفید بھوت نما صورتیں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ وہ غیر مسلم آبادی میں "گھسا تھا کہ اب مڑنا بے سود تھا!! بازار تنگ تھا۔ اس نے سایوں کے پاس سے سرپٹ گزر جانے کا فیصلہ کیا۔ جوں جوں آگے بڑھتا صورتیں واضح ہوتی جاتیں

اس نے سڑک کے پار ایک لمبی چوڑی گیلی گرتی دیکھی۔ اس پر اس نے "یا علیؓ" کا نعرہ لگایا اور سلطان کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ وہ وحشیانہ طور پر ہنہنایا اور پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر، منہ زور سے اِدھر اُدھر مار کر، پاؤں تیز تیز رکھتے ہوئے سرپٹ بھاگا۔

حملہ آوروں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

"وہ رہا پاکستانی گھوڑا!! ایک آواز فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دی۔

"یا علیؓ" ابراہیم نے جواب دیا اور بڑی سرعت سے اپنی سیٹ کے نیچے سے چھرا نکال تختے سے چمٹ کر بیٹھ گیا۔

گھوڑے نے گیلی کو ایک ہی جست میں پھلانگ لیا۔

تانگہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

ہجوم کا نعرہ بلند ہوا۔ سلطان تانگہ گھسیٹتا بھاگا جاتا تھا۔

کوئی بچ کر نہ نکلے۔

پیچھے "ہائے" "مر گیا" کی آوازیں سنائی دیں۔ تانگہ گھوڑا راستے میں آتے حملہ آوروں کو روندتا آگے جا رہا تھا۔ اب صرف بازار کی نکڑ باقی رہ گئی تھی اس کے بعد کھلی سڑک کے پار مسلم آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ ——

لیکن ابراہیم نے اچانک دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے ایک طرف کھڑا گڈا دھکیل کر سڑک کے آر پار کھڑا کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک فاتحانہ قہقہہ بلند ہوا!

"اب کیسے بچ کر جاؤ گے؟

سلطان کی ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا وہ اس تندی سے بھاگا جا رہا تھا کہ اگر تانگے سے جُتا نہ ہوتا تو گڈے کو بھی پھلانگ جاتا

ابراہیم نے بازار تنگ ہونے کی وجہ سے گنبد کے پاس تھوڑی سی جگہ میں سے گزارنے کے لیے اس کا رخ ادھر موڑا۔ اگر تانگہ بچا بچو ہو کر بھی اندر سے اس تنگ جگہ سے نکل جاتا تو اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ لیکن وہ ایک طرف بجلی کے کھمبے اور دوسری طرف گڑھے میں دھنسا کے پھنس گیا۔

ابراہیم یکلخت نیچے کودا۔ اس نے سوچا کہ گھوڑا کھول کر اس پر بیٹھ کر بھاگ نکلے۔ لیکن ایک کونے میں سے سات آٹھ آدمی تلواریں سونتے اور برچھیاں تانے ان کی طرف لپکتے دکھائی دیئے۔

سلطان والہانہ انداز میں ہنہناتے ہوئے پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور وحشیانہ طور سے ادھر ادھر کاٹتا ہوا باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

اب چاروں اطراف سے حملہ آور لپکے

ہوا میں خالی فائر ہوئے۔

ابراہیم کا چھرے والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور سلطان کی گردن میں تین چار مرتبہ گھونپا دکھائی دیا گھوڑے کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

وہ زمین پر گرا۔ ابراہیم اس کی گردن سے لپٹا ہوا نیچے آ رہا۔ اس نے گھوڑے سے پہلے دم توڑ دیا

”پاکستان زندہ باد!“

حملہ آوروں نے ان کے قریب پہنچ کر نعرہ لگایا

بجھتے چراغ

رام لعل

سائیں داس شام کو چھ بجے گھر لوٹا۔ تھکا ماندہ اور پریشان سا، سائیکل کو ڈیوڑھی میں دیوار کے ساتھ لگا کر اندر پہنچا۔ برآمدے میں اس کی بیوی چارپائی پہ آگے بہت سارے شلغم بکھیرے انہیں ایک بڑی تھالی میں کاٹ کاٹ کر رکھتی جا رہی تھی۔ خاوند کو دیکھ کر وہ مسکرائی مگر اس کی مسکراہٹ دوسرے ہی لمحہ بجھ بھی گئی۔ خاوند کی طرف حیرانی سے دیکھا اور پوچھا "خیریت تو ہے؟"

سائیں داس ایک لمبی "ہوں" کہہ کر نکٹائی کی گانٹھ کھولتا ہوا سیدھا کمرے کے اندر چلا گیا۔ کوٹ اور پتلون اتار کر کرسی کی پشت پر ٹانگ دیے اور ایک رنگدار تہمد باندھ کر آرام کرسی میں دھنس گیا۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی اندر آگئی، شلغم اور چھری سمیت۔

"بتایا نہیں، بات کیا ہے؟"

"بات وہی ہے کوئی نئی تھوڑی ہے!" سائیں داس نے ایک لمبی سانس چھوڑ کر کمرے کی پرانی چھت کو گھورا۔ بوسیدہ دیمک لگی کڑیاں چھت کے بوجھ سے ہر وقت گر پڑنے کے لئے تیار نظر آتی تھیں۔ کمرے کے وسط میں دیوار کے اندر سنگِ مرمر کا ایک کتبہ نصب تھا جس پر سیاہ جلی حروف میں "اللہ اکبر" لکھا ہوا تھا۔

"آج پھر کلیم کے دفتر کی خاک چھانی ہے۔ دفتر سے دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا تھا وہاں، لیکن لگ گئے پورے چار گھنٹے۔"

"پھر؟ کچھ ملا مکان کی مرمت کے لئے؟"

"خاک! کہتے ہیں ایک ہفتہ بعد آؤ۔"

"بتایا نہیں سردیوں کی بارشیں شروع ہوگئیں تو مکان گر جائے گا؟"

"ان کی بلا سے! ان کے نزدیک ایک رفیوجی کنبہ تو ختم ہو جائے گا۔ اگر سارے کے سارے ملبے کے نیچے آکر دب گئے تو کلیم تو نہیں دینا پڑے گا گورنمنٹ کو!"

"اندھیر ہے بالکل اندھیرا اگر کچھ ملنے کی امید ہو تو اپنے پاس سے ہی کچھ خرچ کر ڈالیں۔"

"کیا بھروسہ دفتر کی کارروائیوں کا! ملتے ملتے بھی سال دو سال تو گزر جائیں گے۔"

اس کی بیوی پاس ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ بولی: "آج ٹھاکر داس اور اس کی بیوی آئے تھے بیٹے کی شادی کا کارڈ دینے۔"

"اچھا!"

"آپ تو سنتے نہیں۔ میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا کچھ کہنا سننا، بس کارڈ لے کر رکھ لیا۔ جانے سرلا نے کہاں رکھ دیا ہے۔"

اس نے سر گھما کر سرلا کو پکارا:

"سرلا ——! بیٹی سرلا!"

کہیں سے ایک باریک سُریلی آواز سنائی دی: "آئی ماتا جی!" اور پھر پاؤں میں پہنے ہوئے ربڑ سول سلیپروں سے شپ شپ کی آواز پیدا کرتی ہوئی جس میں ایک رقص کا سا ترنم اور نظم تھا، سرلا کمرے کے اندر آ گئی۔ باپ پر نظر پڑی تو مسکراتی ہوئی اُدھر بڑھ گئی۔ پھر کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے باپ کے کپڑے دیکھے تو انہیں اٹھا کر دیوار پر لٹکاتی ہوئی بولی: "کہئے ماتا جی!"

"وہ کارڈ کہاں ہے ترلوک کی شادی کا، جو آج دوپہر کو دے گئے تھے ——؟"

"یہاں رکھا تو ہے!" وہ لپک کر دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر کے پیچھے سے ایک سفید چوڑا سا لفافہ نکال لائی۔ سائیں داس چند لمحوں تک کارڈ پڑھنے میں محو رہا۔ اس کی بیوی شلغم کا چھلکا دھیرے دھیرے اُتارتی ہوئی بولی: "کیا خیال ہے؟ جائیے گا شادی میں!"

"جی تو نہیں چاہتا۔ آج تک انہوں نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اسے دیکھ کر یہ کارڈ لینا ہی نہیں چاہئے تھا۔" یہ کہہ کر سائیں داس نے اپنے سُرخ و سفید کلین شیو چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ اس کی انگلیاں ٹھوڑی کے نیچے پھر سے نکلے ہوئے سفید بالوں کو کھجانے لگیں۔ اونچی اٹھی ہوئی ناک اور بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اس کی سخت ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اسی طرح تنکی تنکی اور اکتائی ہوئی سی آواز میں بولا ——

"اسی مکان کا قصہ لے لو۔ ہماری الاٹمنٹ کینسل کرانے کی خاطر اس نے کتنی کوشش کی۔ امرت! کوشش کی تھی نا! لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ ہمارے ساتھ ایسا حاسدانہ رویہ اختیار نہ کیا ہوتا اس نے تو آج ہم دونوں ایک دوسرے کے کتنے قریب ہوتے! یاد ہے تم نے ایک بار میرے سامنے اپنی سرلا اور ان کے ترلوک کا بھی ذکر کیا تھا!"

سرلا اپنا نام سن کر باہر نکل گئی —— پھر چھوڑ کر —— ربڑ سول کے سُرخ سلیپروں کا [illegible] ترنم آہنگ اب سنائی نہیں دیا۔ مایوسی میں ڈوبی ہوئی ایک خاموشی چھائی تھی بس!

"ہاں وہ تو ان دنوں کی بات ہے جب رام دیوی آلکشن پھر میرے گھر میں گھسی رہتی تھی۔ جب دیکھو بہن یہ بات ہے، بہن وہ بات ہے۔ غرض میرے گھر بھی اُسے ذرا کام ہوتا تو مجھ سے پوچھے بغیر ہاتھ نہ ڈالتی۔ ہر بات پر دوڑی بھاگی چھپاک سے میرے پاس آ جاتی۔ اب وہی پڑوس ہے وہی میں ہوں اور وہی رام دیوی ہے! لیکن مہینوں گزر جاتے ہیں ایک دوسرے کی شکل دیکھے ہوئے۔ حضرت گنج میں ایک دکان کیا کھول لی، دماغ ہی آسمان پر پہنچ گیا!" سائیں داس کی بیوی نے ایک شلغم کی جلدی جلدی کئی ڈلیاں بنا ڈالیں اور کاٹ کاٹ کر اپنی جھولی میں ڈالتی گئی۔

سائیں داس بولا: "روپیہ محبت کا دشمن ہے! روپیہ پا کر انسان قریبی رشتوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ ہم تو محض ایک شہر کے تھے۔ پاکستان سے نکل کر یہاں اتفاق سے پڑوسی بن گئے تھے۔"

"ہم لوگ بھی کتنے عجیب ہیں۔ اس شہر میں جس کی کئی لاکھ کی آبادی ہے اپنی طرف کے ہمارے مشکل سے تیس چالیس گھر ہوں گے۔ اس پر بھی کبھی مل نہیں بیٹھتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ نام کو بھی ہمدردی نہیں رہ گئی!" یہ کہہ کر سائیں داس کی بیوی نے اپنا کان کھجایا۔ اطمینان نہ ملا تو کان میں سے طلائی جھمکا اتار کر کان کے سوراخ کو انگلیوں سے سہلانے لگی۔ اس کے کانوں میں کنارے کنارے کئی سوراخ تھے۔ کسی زمانے میں

اس کے کان طلائی بالیوں کے بوجھ سے پھلوں سے لدی ہوئی شاخوں کی طرح جھکے جھکے رہتے ہوں گے۔ وقت کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اس نے کانوں میں صرف ایک ایک جھمکا پہننا شروع کر دیا۔ اس کے خاوند نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں بند کرکے سوچتا رہا۔ وہ اٹھ کر باہر جاتی ہوئی بولی۔

"کھانا لگاؤں آپ کے لئے۔ پریتم اور اشوک بھی آتے ہوں گے!"

"کہاں گئے ہیں؟"

"کہیں یار دوستوں میں گپ لڑا رہے ہوں گے باہر۔"

وہ باہر چلی گئی۔ سائیں داس سوچتا رہا۔ آنکھیں بند کرکے، ٹھاکر داس کے ساتھ اپنے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ گذشتہ دس سال سے وہ اس شہر میں اکٹھے رہتے تھے۔ وقت پر لگا کر اڑ چکا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دس سال گذر گئے تھے۔ تب دونوں کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ آج بڑے ہو کر شادی کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ٹھاکر داس بیٹے کی بارات لے کر تین سو میل دور ایک دوسرے شہر جائے گا۔ سوچوں کا ریشم الجھائی، سفر بھی! ایک سنجوگ کی بات بھی ہوتی ہے! سائیں داس کے کانوں میں چند آوازیں آئیں۔ قدموں کی آوازیں، ہنسنے کی آوازیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ صحن میں کچھ لڑکیاں اس کی بیوی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ چلی گئیں تو اس کی بیوی نے اندر آکر بتایا۔

"ٹھاکر داس کی لڑکیاں آئی تھیں بلانے، آج ان کے ہاں گانا بجانا ہے۔ میں نے کہہ دیا میرے تو جوڑوں کا درد رہتا ہے سرلا کو بھیج دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھر رسوئی میں جا بیٹھی۔

سائیں داس پھر سوچ میں پڑ گیا۔ بالکل ڈوب گیا۔ سرلا اگلے سال بی۔ اے کر لے گی۔ اگلے سال اسے پراویڈنٹ فنڈ میں سے قرض لینا ہوگا۔ کلیم کا روپیہ جانے کب تک ملے گا! لڑکی کی شادی ضروری ہے۔ بھگوان کو منظور ہوا تو اسے یہی مکان کلیم کے عوض مل جائے گا۔ چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ایک بڑا دالان کا دالان صحن ہے۔ کسی بچارے مسلمان کا مکان ہے۔ وہ بھی پاکستان میں کسی ہندو کے مکان میں اپنی عزت آبرو سمیٹے رہ رہا ہوگا۔ اسے بھی کئی غم ستاتے ہوں گے۔ اس کی بھی کئی فکریں ہوں گی۔ وہ بھی اپنے لوگوں کے بدلتے ہوئے رویے کی شکایت کرتا ہوگا۔ سب دن ہوت نہ ایک سمان! مصیبتیں بادلوں کی طرح زندگی کے آسمان پر چھا جاتی ہیں۔ بادل برستے ہیں، گرجتے ہیں، تھک جاتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں۔ اڑتے اڑتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ ہر طرف دھوپ پھیل جاتی ہے، جل تھل بھری کو زندگی کی آنچ بخشنے، تخلیق میں مدد دینے، نئی فصلیں، نئے پھول، نئی بہاریں! سائیں داس آنکھیں بند کئے ہوئے مسکرا دیا۔ آنکھیں نیم وا کرکے دیوار پر لگے ہوئے اللہ اکبر کے کتبے کو دیکھا۔ اسے دیکھتا ہی رہا۔ سیاہ جلی حروف ابھر کر اس کے قریب آکھڑے ہوئے۔ اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے آگئے۔ پھر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔ سب حروف مل کر ایک لمبی لکیر بن گئے۔ اونچی سیدھی لکیر۔ زمین سے اٹھ کر آسمان تک پہنچنے والی لکیر۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک پڑے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بند کئے لیٹا رہا۔ اچانک اس کے کانوں میں پھر کچھ آوازیں آئیں۔ بولنے اور چلنے کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں، آنسو پونچھ ڈالے، سر اونچا کرکے دیکھا۔ اس کے دونوں لڑکے چلے آرہے تھے۔ سرخ و سفید مسکراتے ہوئے چہرے، خاص انداز سے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال، ٹخنوں سے اونچی اونچی پتلونوں میں ہاتھ ڈالے۔ پیچھے پیچھے سرلا تھی، ماں کی طرح پتلی اور اونچی، پھولدار کریپ کی لمبی قمیص کے اوپر گہری سرخ شنیل کی کوٹی پہنے اور سنہرے بالوں کی لمبی چوٹی کو ہاتھ کے گرد لپیٹتی ہوئی۔

"پتاجی! ہم ترلوک کی بارات میں جائیں گے۔"

"ہاں پتا جی! ہم ضرور جائیں گے۔ نہیں گئے تو ترلوک ناراض ہو جائے گا۔"

سرلا چٹائیوں سے آگے بڑھ کر باپ کے پاس آ بیٹھی۔ آرام کرسی کے بازو پہ۔ سائیں داس کی قمیص کا بٹن بند کرتی ہوئی بولی "پتا جی! میں بھی جاؤں گی۔ راج مجھے ساتھ لئے بنا جائے گی نہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ میری کتنی گہری دوست ہے۔ کلاس فیلو بھی ہے۔"

سائیں داس نے سب کی طرف انکار کے طور پر دیکھا اور پھر بلند آواز سے بیوی کو پکار کر بولا: "ارے او سنو! یہ سب کے سب بارات میں جائیں گے جیسے دولہا یہی ہیں! انہیں ساتھ لئے بنا جائیں گے نہیں۔"

اس کی بیوی نے وہیں سے جواب دیا: "ان کا تو دماغ خراب ہے!"

"نہیں پتا جی! ہم ضرور جائیں گے۔ شادی کے بہانے بمبئی بھی دیکھ لیں گے۔ یہ شہر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"اگر سیر و تفریح ہی کرنا ہے تو ویسے کبھی چلے جانا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہیں!"

"نہیں پتا جی! میری سب فرینڈز جا رہی ہیں۔ پتا جی پلیز!"

"اچھا اچھا! اب یہاں سے جاؤ۔ سوچیں گے ابھی تو کئی دن پڑے ہیں۔"

"کہاں کئی دن پڑے ہیں! پرسوں بارات جا رہی ہے شام کی گاڑی سے۔"

"بیٹا! ان کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے نہیں ہیں کہ شادی بیاہ میں سب کے سب شریک ہوں۔ وہ بھی کہیں گے کیسے احمق ہیں۔"

اس کی بیوی بھی رسوئی میں روٹی پکاتے پکاتے ہنس کر بولی: "سچ مچ بڑے ہی احمق بچے!"

تینوں بچے مایوس ہو گئے۔ کھانے کے وقت بھی سب اداس سے چہرے لٹکائے بیٹھے تھے۔ نہایت ہی بے دلی سے کھانا کھا رہے تھے۔ پڑوس سے لڑکیوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈھولک بج رہی تھی، گھنگھرو جھنک رہے تھے۔ کوئی لڑکی لہک لہک کر گا رہی تھی۔

من ڈولے میرا تن ڈولے میرے دل کا گیا قرار رے!

گانے کی آواز سن کر تینوں بچوں کی نگاہیں بار بار چپکے سے باپ کی طرف اٹھتیں اور پھر ایک دوسرے سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں۔ سرلا کے لئے یہ دیکھ سوچ کر نوالہ نگلنا بھی مشکل ہوا جا رہا تھا کہ جانے اسے لڑکیوں کی گانے کی محفل میں جانے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں! لیکن اچانک اس کی ماں نے یہ کہہ کر اس کی مایوسی خوشی میں بدل دی:

"کھانا کھا کر ذرا دیر کے لئے وہاں چلی جانا — سرلا!"

سرلا کھانا اسی دم ختم کر کے جلدی جلدی پانی کے دو گھونٹ حلق سے نیچے اتارتی باہر بھاگ گئی۔ پریتم اور اشوک بھی جلدی جلدی اٹھ کر باہر چل دئے۔ سائیں داس نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

تو جواب دیا: "ابھی آتے ہیں پتا جی! ذرا ترلوک کے ہاں کچھ دوست جمع ہیں، مل کر لوٹ آئیں گے۔"

سائیں داس حقہ بھر کر پھر کرسی پر آ بیٹھا۔ صبح کا اخبار سامنے رکھ لیا۔ اخبار کا ایک آدھ صفحہ وہ روزانہ رات کو اسی وقت پڑھنے کے لئے صبح چھوڑ دیتا تھا۔

اس کی بیوی بھی رسوئی کے کام کاج سے فرصت پا کر اپنے بستر میں آ گھسی۔ ہاتھ میں تیل کی شیشی بھی تھی جسے گرم کر کے لائی تھی۔ انگلیوں پہ تیل لگا لگا کر گھٹنوں پر ملنے لگی۔

پڑوس میں کسی لڑکی کی آواز اونچی اٹھتی گئی۔ سائیں داس [illegible] گانے ہی گاتے جاتے ہیں پر وقت پر

[illegible] ہوش میں کسان کب آ گئے ہیں۔"

[illegible] سائیں داس [illegible] حقے کی گڑگڑاہٹ اور اخبار کی موجودگی میں کسی کا [illegible] ممکن نہ تھا۔ اس کی بیوی سے بھی اپنی بات

[illegible] گھٹنوں کی مالش کر رہی تھی [illegible] لگا کر [illegible] لئے گئے تھے۔

پڑوس میں کسی دیوار پر سے ایک [illegible] آواز تیز ہوتی ہوئی اس کمرے میں آ پہنچی:

[illegible] تیوہاروں کا [illegible]

[illegible] سائیں داس نے اخبار [illegible] جا کر سرلا کو بلا لاؤ۔ کس کی شادی پہ گا رہی

ہے وہ ہمارے کون لگتے ہیں؟"

بیٹی کا گانا سن کر سائیں داس کی بیوی کے چہرے پر بھی [illegible] پیدا ہو گئی تھی [illegible] نے گھٹنوں پر ابھی [illegible] کی تھی۔ سرلا کا گانے سے منع کرنا بھی ضروری تھا اور کہاں جا [illegible] دونوں گھٹنوں پر گرم گرم [illegible] ہتھیلیاں [illegible] پھر آہستہ آہستہ سنبھل کر باہر نکل گئی۔

جب تک سرلا کے گانے کی آواز [illegible] کی طرف [illegible] چند منٹ کے بعد سرلا کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے اخبار پھر اپنی طرف [illegible] سطر پڑھ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ بالکل ہی عجیب سی آواز [illegible] سے کوئی آواز آئی ہو [illegible] آواز [illegible] عورت گا رہی تھی۔

ہیں آئی [illegible] سانوں [illegible] دسے
[illegible] دل وسے
[illegible] جاسنے تے [illegible] جانئے
میںڈا ڈھول [illegible]

سائیں داس نے اخبار پھر ایک طرف رکھ دیا۔ [illegible] کے ساتھ لگی رہ گئی۔ وہ [illegible] ہو کر جالا میں گھورنے لگا۔ [illegible] گھر میں [illegible] سی گئی تھی۔ [illegible] اسی قسم کی آواز سنی تھی یہی بول سنے تھے [illegible] آج سے [illegible] راحت بخش، خنک اور [illegible] پنجاب [illegible] اس کے لبوں سے نکلے ہوئے بول [illegible] اپنے دوستوں کے ساتھ [illegible] گایا کرتا تھا۔ [illegible] چونک پڑتی تھیں اور [illegible] کے کانوں سے ٹکراتے تو وہ چھتوں پر سوتے سوتے [illegible] بے چینی سے گھورنے لگتی تھیں۔

[illegible] کی طرف بہت بے چینی سے [illegible] اچانک سائیں داس کو یاد آیا۔ اس کی بیوی سرلا کو بلانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ کیا اس نے بھی یہ آواز سنی تھی؟ وہ بھی شاید سنتی تو حیران رہ جاتی۔ اس کی مانند اپنے آپ کو چند لمحوں کے لئے بھول جاتی۔

میں پانی بھریسندی ہاں راتی
نیندی ہووے وڈی حیاتی
بھاویں جانے نہ بھاویں ناں جانے
مینڈا ڈھول جوانیاں مانے

یہ آواز محض آواز نہیں تھی، کوئی کشش تھی، غیبی طاقت تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، اسے پکار رہی تھی، صدا دے رہی تھی، دعا دے رہی تھی —— لمبی عمر پانے کی دعا۔ اس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ چاندنی رات میں کنوئیں پر جا کر پانی بھرنے کے بہانے اس سے ملنے کی التجا کر رہی تھی۔ اس کی جوانی کا واسطہ دے دے کر اسے بلا رہی تھی۔ اسے یاد تھا تیس کٹھے اور طویل سال گزر جانے کے باوجود اسے وہ ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ عشق اور اضطراب میں گذری ہوئی ایک ایک کیفیت اس کے ذہن میں تروتازہ تھی۔ اپنی پوری دردانگیزی اور شدت کے ساتھ۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا ان کیفیتوں کو! وہ آہستہ سے اٹھا۔ تہمد کو اچھی طرح کس کر کمر کے گرد باندھا۔ بغیر کھانسے، بغیر کوئی آواز پیدا کئے وہ دبے ہوئے قدم رکھتا ہوا صحن میں سے گذرا۔ پڑوس کی دیوار کے پاس پہنچا۔ اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تندور کو ٹٹولا۔ اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ ایک لکڑی کے صندوق میں سے کنکر الٹ کر صندوق کو تندور کے اوپر رکھ دیا اور پھر سنبھل سنبھل کر اس کے اوپر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر دیوار سے اوپر نکل سکتا تھا۔ وہ جھانک کر دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سر جھکا کر گانا سننے پر اکتفا کی۔ گانا جو اس کی روح کی پیاس کو بجھاتا بھی تھا اور بھڑکاتا بھی —— وہ دیکھ بھی نہیں سکا کہ کون عورت تھی وہ! اس کی صرف کانوں میں میٹھا رس ٹپکانے والی آواز سن سکتا تھا۔

اتساں اٹھے نے ماہی ساڈا اوٹھ چھپے
کالی راتیں بدل پیا کڑکے دل دھڑکے
بھاویں جانے تے بھاویں ناں جانے
مینڈا ڈھول جوانیاں مانے

وہ تندور کے اوپر رکھے ہوئے صندوق پر اکڑوں بیٹھا سن رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی روشنی بھی بجھا کر آیا تھا لیکن گیت کے مسحورکن الفاظ اس کے سامنے جیسے ایک سیمیں پردے پر فلم پیش کر رہے تھے۔ برستی راتوں میں کھڑکی سے لگ کر اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہوئی حسینہ! وہ کب لوٹے گا؟ تلاشِ معاش اس کے محبوب کو اس سے کب تک جدا رکھے گی؟

ہیں اتھے نے ماہی مینڈا لوہڑے
مینڈا کلا پیا دل اکو ہڑسے
رُت ملنے دی —— ڈھول جانی

ڈھولک کی آواز تیز ہو گئی، تال بدل گیا، گھنگھروؤں کے چھناکے اور عورتوں کے قہقہے بلند ہو گئے اور ایک نئی آواز اور ایک نیا گیت فضا میں گونجنے لگا۔

نینڈی ماں تاں مینڈی ماہی
ہکے پُلتھے تے ادب نہ راسی

وکھری تھیندی ہاں — ڈھول جانی
ساڈی گلی آویں تینڈی مہربانی

قہقہوں کے طوفان کے درمیان تالیوں کا شور بھی سنائی دیا۔ تالیاں جو ایک خاص تال پر بجائی جا رہی تھیں اور سائیں داس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اپنے علاقے کے گیت سن کر خوشی اور جوش سے!

اس مرتبہ ایک نئی آواز گونجی!

ساڈی کندھاں تے ٹرن بلیاں
تیڈی ماں دیاں مرن سہیلیاں
اُنہاں گھر پٹیا ہم — ڈھول جانی
ساڈی گلی آویں تیڈی مہربانی

ہر بار آواز مختلف تھی۔ ہر بول نیا تھا: طنز، مزاح اور حقیقت سے بھرپور۔ زندگی کی ساری سچائیاں، ساری تلخیاں ان بولوں میں بھری ہوئی تھیں۔ ناچ، گانے اور قہقہوں کے ذریعے ایک دوسرے کو کوسا جا رہا تھا۔ گلے اور شکایتیں کی جا رہی تھیں۔ یہ مقصد کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کرنا مشکل تھا۔ یہ صرف گیتوں کی مدد سے ہی ہو سکتا تھا۔ گیت جو ایک قوم کی خاصیت تھے، گیت جو ایک قوم کا مزاج تھے۔ ایک خاص علاقے کی صدیوں کی روایات، تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ سینکڑوں میل کے فاصلے اور دشوار گذار منزلوں کی صعوبتیں برداشت کر کے یہ گیت سینوں کے اندر محفوظ کر کے یہاں تک لائے گئے تھے۔ کتنے بھائی، کتنی بہنیں، کتنے بچے گنوا کر بھی اس خزانے کو لُٹنے سے بچا لیا گیا تھا۔ آج وہ پیچھا لکھنؤ بہت دور ہے، لودھراں تک پہنچنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ لیکن ان کی یاد، ان کا حسن، ان کی سردی اور گرمی سینے کے اندر محفوظ ہے۔ نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں حیران تھے۔ وہ اس زبان کے جس میں گیت کہے گئے تھے، محاوروں اور چٹخاروں سے آشنا نہیں تھے۔ محبت، سادگی اور خلوص اور حسن سے مالا مال زبان کا محافظ کون بنے گا؟ حالات نے انہیں نئی سرزمین پر پیدا کیا۔ بسنے اور سمجھنے کے لئے نئی زبان دے دی۔ ان کے آباؤ اجداد کا اتنا بڑا سرمایہ ان کے ماں باپ کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ تیس سے پچاس برس تک کی عمر کی عورتوں کی یہ مختصر سی ٹولی پھر یہ گیت نہیں گا سکے گی۔ یہ گھر خاموش ہو جائیں گے۔ یہ تال ٹوٹ جائیں گے۔ یہ چراغ بجھ جائیں گے۔ ایک ایک کر کے سارے چراغ!

سائیں داس کے کانوں میں اچانک اپنی بیوی کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل بے اختیار سا ہو کر دیوار سے سر نکال کر، اس بات کی پروا کئے بغیر کہ اس کے چہرے پر روشنی پڑ رہی تھی۔ اس نے عورتوں کے ہجوم میں اپنی بیوی کو ڈھونڈا، اور حیران رہ گیا۔ وہ باقی عورتوں کی طرح سر کے اوپر چُنری کے انداز میں، مٹھی باندھے، جھومر لگا، دو ہاتھ اٹھا کر ناچ رہی تھی۔ گا رہی تھی:

بیں اُٹھے تے ماہی میڈا واں تے
لگا آویں بدلاں دی چھاں تے
ٹٹ گئی دی — ڈھول جانی
ساڈی گلی آویں تینڈی مہربانی

اس نے دونوں بازو دیوار کے اوپر ٹیک دیے۔ اس کو جی چاہا بیوی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک بول وہ بھی گائے مگر دوں کہ ناچ دیکھنے کے لئے بہت سارے لوگ صحن میں جمع ہو گئے تھے۔ عین اس کے بازو کو کسی نے چھوا اور دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنے سامنے دیوار کی اُس طرف ٹھاکر داس کو کسی چیز کے سہارے ابھرتے ہوئے دیکھا۔ ٹھاکر داس اسے دیکھ کر زور سے ہنس پڑا اور بولا۔

"آ جاؤ یار، ادھر آ جاؤ۔ بڑا لطف آ رہا ہے۔"

سائیں داس نے ایک لمحہ کے لئے توقف کیا۔ ٹھاکر داس کو گھورا، اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے خلوص کو پرکھا جسے اپنے ملاقاتی کے جذبات ابھرے لوک گیت اور لوک ناچ اس کے من کی انتہائی گہرائیوں میں سے کھنگال کر اس کی آنکھوں میں لے آئے تھے۔ سائیں داس مسکرا دیا اور بازوؤں پہ بدن کا سارا بوجھ ڈال کر بدن کو اوپر اٹھایا اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ ٹھاکر داس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلایا اور بے اختیار گانے لگ گیا:

چھلا پاتی کھٹڑی میں ڈھوں
نمبردار وڈی دا توں
وتن ڈسے غریباں نوں
دسے بلا تکمت!
چھلا تو ری رکھنا!

یہ دیکھا تو ٹھاکر داس نے ہنستے ہوئے سائیں داس کو اپنے بوڑھے مگر مضبوط بازوؤں پر اٹھا کر دیوار سے اپنی طرف اتار لیا۔

ایک رات

ڈاکٹر شفیق

کار پورٹیکو میں کھڑی کر کے وہ بے تحاشہ اپنے کمرے کی طرف چلی۔ اس قدر سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ جھلملا رہا تھا۔

"بے بی آگئیں! کوئی ضرورت تو نہیں ہے۔" آیا اس کے کمرے کے دروازہ پر آ کھڑی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ چلی جاؤ۔" وہ جھپٹ کر کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔

"بے بی نے آج بڑا انتظار کرایا۔ بھوک کے مارے بُرا حال ہے" برابر کے کمرے سے اس کی ماں کی آواز آئی۔ اس نے بیزار ہو کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور سینڈل اتارے بغیر بستر میں لیٹ گئی۔ ٹیبل لیمپ کے سرخ شیڈ سے نکلتی ہوئی روشنی میں اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور فکرمند نظر آ رہا تھا۔

"بے بی! کھانا میز پر لگا ہے۔ سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" آیا بولتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔

"کہہ دو کہ میں اپنے فرینڈ کے یہاں سے کھانا کھا آئی ہوں" اس نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "اور سب سے کہہ دو کہ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" وہ تقریباً چیخ پڑی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ پھر ایکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سینڈل اتار کر قالین پر پھینک دیے اور لحاف پیروں میں کھینچ کر کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"بے بی آج بہت جلدی سونے چلی گئی" بند دروازوں سے مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ کیا آج خدانخواستہ طبیعت خراب ہو گئی ہے؟"

"چل کے معلوم تو کیا جائے"

"نہیں سب آہستہ آہستہ بولو ورنہ وہ آرام سے نہ ہو سکے گی۔ بچہ ہی تو ہے جلدی نیند آ گئی"

سب آوازوں کو سکتہ طاری ہو گیا۔ بس کبھی کبھی وقت پلیٹوں اور چمچوں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد مکمل سکوت چھا گیا۔

بس یہ انگوٹھی ہی کافی ہو گی اور اسے نجات مل جائے گی۔ اس نے اپنی پتلی سی انگلی کو چھوتے ہوئے سوچا۔ کتنی ہوس تھی کمبخت کی آنکھوں میں۔ بیترنی۔ اُف! اس نے بڑے کرب سے اپنی گرم گرم ہتھیلیوں کو رگڑ ڈالا۔

"سو رہی ہو بے بی۔ کوئی ضرورت تو نہیں" آیا سونے سے پہلے اپنا آخری فرض انجام دے رہی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے دروازہ انگلی سے کھٹکھٹایا۔ وہ بالکل چپ پڑی رہی۔ اس وقت وہ بالکل برداشت نہ کر سکتی تھی کہ آیا اس کا سر سہلا سہلا کر سلائے۔

وہ اٹھ کر بیٹھتے ہی بولی۔ "توبہ توبہ! اگر گھر میں کسی کو معلوم ہو جائے تو؟ سب کیا کہیں گے؟ گھر کے گورے پاؤں دبیز قالینوں میں پلی چیزوں سے ابھر ابھر کر غائب ہو جاتے۔ کمرے کے پانچ چھ چکر لگانے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئی کمبل کھینچ کر منہ ڈھک لیا۔ اتنے میں اسے ایکدم یاد آیا کہ یہاں کتابوں کی الماری میں اس کے بھائی کی وہسکی کی بوتل چھپی ہوئی ہے جو کبھی وہ اس کے کمرے میں سب سے چھپ کے پیتا تھا۔ ایک بار اس نے اسے بھی پلانے کی کوشش کی تھی۔

"بے بی! ذرا اسے چکھ کر تو دیکھ۔"

"مگر بھیا! اس کی بو سے ہی سر چکراتا ہے" پھر ایک چھوٹا سا گھونٹ پی گئی۔ "تھو تھو کیسی کڑوی ہے میرا تو برا حال ہو گیا" اس نے برا سا منہ بنایا اور میز پر پڑے ہوئے ٹافی کے ڈبے کو اٹھا کر ایک ٹافی منہ میں دبا لی۔

"تم نہیں جانتی بے بی! اس کڑواہٹ میں کتنا سکون ہے۔ ذرا دیر کو تو میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔۔۔۔ میں اس کا دکھ بھی بھول جاتا ہوں" اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے "مگر بے بی! وہ غریب ہے۔ بالکل غریب۔ یہ سات پشتوں سے امیر خاندان چلا آ رہا ہے اس میں کسی غریب کو قافلہ سے کم نہ ہوگا۔ میرے کسی بھائی نے ایسی حرکت کی ہے، بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہو نا بے بی" وہ نشے کی شدت سے گھگیا رہا تھا۔

"قطعی نہیں۔ قطعی نہیں بھائی جان!" اس نے نفرت سے منہ بنایا۔ "تم نے وہ کہانی سنی ہے؟ کون سی؟

وہی جو آپا مجھے سناتی ہے"۔ ایک بھکارن پر ایک راجہ عاشق ہو گیا اور وہ اسے محل میں لے آیا۔ لاکھ چاہا کہ اس فقیرنی میں رانیوں والی بات پیدا کرے مگر وہ اپنی عادتوں سے باز نہ آئی۔ جب تنہا ہوتی تو محل کے طاقوں میں روٹی کے ٹکڑے رکھ رکھ کر مانگتی، دے مائی۔ خدا تیرا بھلا کرے گا۔"

"کاش میں راجہ ہوتا بے بی۔ میں تو خود ہی بہت سے طاق بنوا دیتا محلات میں روٹی کے ٹکڑے سجا دیتا" وہ نشہ میں برابر روئے جا رہا تھا۔

"خدا نہ کرے، توبہ توبہ بھائی جان تم کتنے پاگل ہو" وہ اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

"مگر یہ لوگ کیسے ہوتے ہیں بے بی۔ یہ دل میں اس طرح کیوں چھو جاتے ہیں۔ جب وہ میرے سامنے آتی ہے تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں بالکل حقیر ہوں وہ جادوگرنی ہے بے بی! جادوگرنی!"

"تم ایسا محسوس کرتے ہو گے۔ مگر مجھے تو وہ بالکل حقیر نظر آتے ہیں" اس نے بڑے غرور سے سر جھٹکا۔ اس وقت اسے اپنا سارا غرور یاد آ رہا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ وہ اپنی ساری امارت بھول کر ایک غریب انسان کو اپنا سب کچھ سونپ دے گی اور ایک حقیر سی روح اس کے اندر پرورش پانے لگے گی۔ اور یہ روح اسے عزیز بھی ہو جائے گی۔

اس نے دکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا لیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہسکی کے دو چار گھونٹ پی لے مگر اس کی کڑواہٹ کے خیال نے اسے چپ پڑا رہنے دیا، خیالات کی چکی گھمر گھمر اسے پیسے جا رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ اتنا امیر خاندان جس کے بچوں کے پوتڑے تک چاندی کے تسلوں میں ڈھلتے، کہنے والے یہ بھی کہتے کہ یہ دولت خدا کی دین نہیں تھی بلکہ غدر کے زمانہ میں انگریزوں کے عشق نے جنم دی تھی۔ بس اس وقت سے بزرگوں نے تعلیم دینا شروع کی کہ اب ایسا وقت نہ آئے گا اس لیے دولت بڑھاؤ کے عمل پڑھے جائیں۔ غریبوں سے ناطہ رشتہ نہ کیا جائے ورنہ خاندان کی ساکھ ختم ہو جائے گی۔ بچوں کی آیاؤں کو ہدایت کی جاتی کہ انہیں راجہ اور فقیرنی کی کہانی سنائیں۔ لڑکیوں کو بے بی اور لڑکوں کو چھوٹے صاحب کے نام سے پکاریں اور ان کے سامنے سر جھکا کر بات کریں۔ ان تمام ہدایتوں کے باوجود نہ جانے کیا بات تھی کہ جوان جوان لڑکے ان جھکے ہوئے سروں کو صند یا صندیا کر اپنے ہاتھوں

سے اٹھاتے اسے اپنے برابر کر لیتے۔ بزرگوں کی تیز نظریں غراتیں اور سر پھر جھک جاتے۔ دائمی سرکشی کسی نے بھی نوٹ نہ کی تھی۔ بچپن کی نسیم حدود کو پھلانگنے دیتی۔ لڑکوں کے ساتھ دس پانچ قصے وابستہ ہو جاتے اور بس لڑکیاں بھی ادھر ادھر جھانک لیتیں دل میں کہیں کہیں کوئی گھاؤ بھی پڑتا جیسے دوسرے گھر جاکر وہ لذت کے مرہم سے اچھا کرنے کی کوشش کرتیں۔ چاندنی راتوں اور برسات کی رم جھم میں لمبی لمبی آہیں بھرتیں کبھی کبھی کونے کھدروں میں چھپ کر وہ آنسو بہالیتیں اور پھر میک اپ کے انبار میں چہرے کو شگفتہ بناتے ہوئے کسی دعوت میں شریک ہونے چلی جاتیں۔ مگر اس آٹھ دس بھائیوں کی بہن اور ماں باپ کی بے حد لاڈلی بیٹی نے تو ستم ہی ڈھا دیا تھا۔ اور اپنے کئے پر ذرا بھی شرمندہ نہ تھی۔

ابھی ابھی وہ ڈاکٹر کے پاس سے واپس آئی تھی کچھ دن سے طبیعت گری گری رہتی اسے شبہ بھی نہ ہوا کہ امتحان سر پہ ہے —— اس لئے جسم میں خون کی کمی ہو گئی ہے مگر جب ڈاکٹر نے اسے کچھ اور ہی بتا دیا تو وہ تھوڑی دیر کے لئے بلبلا کر رہ گئی۔

"بکواس مت کرو! میری ابھی شادی نہیں ہوئی"

"ممکن ہے میں غلطی پر ہوں آپ کسی لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھا لیں" ڈاکٹر اس کی بدتمیزی پی گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی یہی کچھ بتایا اور بڑی رازداری سے یہ بھی بتادیا کہ پانچ سو ہاتھ میں رکھ دے تو اس وبال سے نجات مل جائے گی۔ وہ اس وقت کچھ سوچنے کے لئے تیار نہ تھی۔ کار میں بیٹھ کر سیدھی اپنی کوٹھی میں آئی اور بغیر کچھ کہے اپنے کمرہ بند کرکے پڑ رہی۔

خیالات کی چکی اسے پیستے چلی جا رہی تھی۔ اسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ ہولے ہولے دل مسلا جا رہا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہے" غریب ماسٹر سر چڑھتا جا رہا تھا۔

"پھر کیا ہو سکتا ہے" وہ متاثر ہونے کے باوجود غرور سے سر جھٹکتی۔

"ہوں" وہ ہونٹ چباتا "تمہارے سینہ میں دل نہیں اور اگر ہے تو سونے چاندی کا بنا ہوا ہے۔ سارے احساسات سے پاک ٹھیک ہے نا؟"

"دل تو گوشت کا بنا ہوا ہے۔ مگر آج کل امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہے" وہ اسے چھیڑ کر لطف اٹھاتی۔

"تم لوگ ہمیشہ امتحان کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہو۔ اتنا ذہن ہوتا ہی نہیں جو فیل اور پاس ہونے کا فیصلہ کر سکو۔"

"کیا فضول باتیں ہیں" وہ غصہ سے سرخ پڑ جاتی مگر اسے ذرا بھی پروا نہ ہوتی۔ اس کے اسی انداز پہ تو اس کا دم جاتا تھا۔ ورنہ اس نے تو جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں تو لڑکے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ اسے دیکھ کر سو سو دفعہ کرسیوں پر اٹھتے بیٹھتے۔ اس کی ایک ایک بات پر "واہ" کے نعرے لگاتے۔ تعریفوں پر تعریفیں کرتے موسم پر، پتلونوں کوٹوں کاروں اور لباسوں کے فیشن کی باتیں کرتے۔

"تم مجھے اچھے تو لگتے ہو ماسٹر مگر" ایک دن انتہائی ضبط کے باوجود اس کے منہ سے نکل گیا"

"مگر کیا؟" وہ اسے بے حد گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کچھ بھی نہیں، اب پڑھنا چاہیے۔ اس کے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کبھی نہیں وہ اپنے خاندان کی امارت کے چاند پر افلاس کا داغ نہیں لگنے دے گی اس کے کانوں میں سارا خاندان سرگوشیاں کرنے لگا۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہے"

"قطعی نہیں! قطعی نہیں!" اس نے بڑے استقلال سے کہا۔ مگر وہ اپنے آپ سے کس طرح جھوٹ بولتی۔ اس کا خیال سائے کی طرح

ساتھ لگا رہتا۔

اس دن گھر کے تمام لوگ ڈنر میں شریک ہونے کو شام ہی چلے گئے تھے مگر وہ امتحان کا بہانہ کر کے نہ گئی۔ اس دن وہ اداس تھی۔ اپنے کمرہ کی ساری روشنیاں بجھا کر صوفے پر پاؤں اٹھائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس دن ماسٹر کے انتظار میں اس نے پہلی بار اپنی دعوت چھوڑی تھی۔ اور جب آیا نے آکر اسے بتایا کہ ماسٹر صاحب ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں تو اس نے پہلی بار اسے اپنے ہی کمرہ میں بلا لیا۔

"کمرہ میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر کھڑا رہا۔

"آ جاؤ اندر۔ آج مجھے روشنی بری لگ رہی ہے" وہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا اور دروازہ کے پاس ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آج سب لوگ ایک دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔

"تم کیوں نہیں گئیں"

"میرا جی نہیں چاہا"

"روشنی کر دو"

"نہیں" اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا "تم میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ"

"نہیں

"ہاں! ہاں" پھر وہ اس کے پاس آ گیا۔ اندھیرے میں جذبات کتنے چمکیلے ہو جاتے ہیں۔ وہ پکے انگور کی طرح اس کی گود میں گر پڑی۔ "میں تمہاری ہوں، میں ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔" وہ جیسے نشے کی حالت میں سچ بولنے لگی تھی۔ پھر اس کا دماغ سن ہو گیا۔ کان گنگ پڑ گئے۔ وہ کہاں ہے اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا اور جب وہ ہوش میں آئی تو اپنے بستر پر پڑی تھی اور سارے بلب روشن تھے۔

"سو جاؤ اب کل ملیں گے"۔ وہ پردہ سرکا کر آہستہ سے دروازہ سے نکل گیا۔

"کوئی ضرورت تو نہیں ہے بی بی" آیا پردے کے پاس کھڑی اسے ذرا غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا گئی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے میں پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہوں"

اس رات وہ صبح تک جاگتی رہی۔ وہ رات بھر اس کے متعلق سوچتی رہی وہ اسے نہایت اچھا لگتا ہے وہ اس سے ہمیشہ ملتی رہے گی وہ اسے بھولے گی نہیں۔

مگر .... مگر .... مگر وہ اس کے ساتھ زندگی کیسے گذار سکتی ہے۔ ناممکن .... ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں وہ اس سے ملتی رہیگی کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔

دوسرے دن جب وہ آیا تو بہت خوش تھا۔

"تم میرا ساتھ دو تو آج ہی تمہارے والد سے کہوں۔ تم نے میرا ننھا سا گھر دیکھا ہے نا اب میں نے وہاں بہت سے گلاب کے پودے لگائے ہیں۔ میں اسے تمہارے لیے اور بھی اچھی طرح سجاؤں گا۔ تنخواہ کے علاوہ میں زیادہ سے زیادہ ٹیوشن بھی کروں گا۔ اور ..... اور ..... تم بولتی کیوں نہیں؟

وہ چند لمحے تک اسے دیکھتی رہی۔ اس کا تمام نشہ ہرن ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال سکی۔

"میں تم سے ہمیشہ ملتی رہوں گی۔ میں تم کو کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ پر دیکھو۔ ہماری شادی ناممکن ہے۔ ہمارے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اور۔ اور"

"اچھا!" وہ زور سے ہنسا "تو تم اپنے شوہر کو دھوکہ دے کر مجھ سے ملا کرو گی۔ تم تو بہت خطرناک ہو۔ تم دولت کے لیے اسے آزمایا کرو گی اور محبت مجھ سے کیا کرو گی۔ تم بہت خطرناک ہو۔ مجھے معاف کیجیے بی بی۔" وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔ ایک لمحہ کو رکا اور پھر چلا گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس دن نہ تو وہ کسی سے بول سکی اور نہ ایک لمحہ کو اس کے ہونٹوں پر ہنسی آئی۔ اس کے بعد وہ اسے پڑھانے نہ آیا۔ اس کی جگہ ایک بوڑھا سا ماسٹر آنے لگا۔ جو بے چارہ کئی دفعہ جھک جھک کر سلام کرتا۔

سوچتے سوچتے اب وہ بالکل تھک گئی تھی۔ آج جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو تو؟ تو وہ یقیناً خوش ہوگا اسے یاد آیا۔ کہ ایک بار اس نے بڑے پیار سے بچوں کا ذکر کیا تھا۔ اور اگر گھر والوں کو معلوم ہو گیا تو جو کیا ہوگا۔ سب اسے کس قدر حقیر سمجھیں گے —— اوہ! تم اور تمہارا باپ کوئی بھی تو میرا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے پیٹ کو چھو کر جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ افلاس کتنا بڑا جرم ہے۔ وہ اس جرم کو کس طرح اپنے سر مار لے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تپائی پر پڑے ہوئے پرس سے چابی نکال کر الماری کھول لی اور وسکی کی بوتل اٹھا لی پھر [illegible] کی طرح وسکی کا آدھا گلاس انڈیل کر ناک بند کر کے غٹا غٹ پی گئی۔ تھوڑی دیر میں بیٹھے بیٹھے چکر آنے لگے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ رات کس قدر سرد اور اداس تھی۔ شراب نے دل اور دماغ کو اور بھی حساس بنا دیا۔ وہ بڑبڑانے لگی۔ کیا بکواس ہے کہتے ہیں کہ غم بھول جاتا ہے۔ وہ تو مجھے اور بھی یاد آ رہا ہے۔ کتنا عجیب، کتنا پیارا۔ اس نے لحاف میں منہ چھپا لیا۔ اسے اب پھر وہ تمام قصے یاد آنے لگے۔ جن سے دامن چھڑانے کے لیے اس نے پہلی بار شراب پی تھی۔ پھر اس کا ذہن صرف اسی قصہ پر چپک کر رہ گیا جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اگر وہ اسے اس وقت نہ دیکھ سکی تو شدت غم سے مر جائے گی۔ کسی طرح بھی چین نہ پڑ رہا تھا۔

آدھی رات بھیگ چکی تھی۔ سینے میں جلتا ہوا لاوا کسی صورت ٹھنڈا نہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنا پرس اٹھا کر کمرے سے باہر آ گئی۔ آہستہ آہستہ دالان پر ٹہلتی رہی۔ چوکیدار پھاٹک سے ٹیک لگائے کھڑے کھڑے اونگھ رہا تھا۔

"ذرا پھاٹک تو کھولو۔ میں سیر کے لیے باہر جانا چاہتی ہوں۔ اب صبح بھی ہونے والی ہے" اس نے کار میں بیٹھ کر اسٹارٹ کر دی۔ چوکیدار اسے حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ کہ آج بے بی کے لیے آدھی رات صبح کیسے ہو گئی۔

کار صاف چوڑی سڑک چھوڑ کر ایک پتلی سی گلی میں رینگ گئی اور ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کار بند کر کے وہ بلڈنگ کی طویل سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ایک فلیٹ کے سامنے رک گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون"

"میں ہوں۔ میں" . . . . اس نے دروازہ کی درز میں ہونٹ چپکا دیئے۔

"تم!" دروازہ کھلا اور اس نے اسے اندر کھینچ لیا . . . . "اتنی سرد رات اور تم یہاں"

"میں تمہارے پاس آئی ہوں"۔ وہ اس کے صاف ستھرے بستر پر بیٹھ گئی اور لحاف پیروں پر کھینچ لیا۔

"میں تمہارے لیے کافی بناؤں، میرے پاس ہیٹر ہے" اس نے ٹیبل لیمپ روشن کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، تم میرے پاس بیٹھ جاؤ" ٹوٹتے نشہ سے سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیے "وہ رات یاد ہے نا؟ اب اسی رات کی یادگار میرے جسم میں پرورش پانے لگی ہے"۔

"اوہ! —— وہ جیسے خوشی سے دیوانہ ہو گیا —— اب تم کہیں نہیں جا سکتیں، تم میری ہو، ہم صبح ہی شادی کر لیں گے۔ کیا میرا یہ فلیٹ اس لائق نہیں کہ تم اس میں رہ سکو"؟ وہ اس کے شانے جھنجھوڑنے لگا۔

"مگر وہ تو صرف ایک رات تھی۔ میں تم سے ساری زندگی محبت کر سکتی ہوں۔ تم مجھے کتنے اچھے لگتے ہو، میری شادی ہو جائے گی مگر میں تم سے ملتی رہوں گی، صبح مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے مجھے دکھ تو ہوگا مگر میں مجبور ہوں ہمارے گھرانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی غریب کو جگہ دی گئی ہو؟"

"اب تم اپنے گھر جا سکتی ہو" اس کی آواز میں سخت تحکم تھا اور وہ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچ رہا تھا۔

"میں تم کو اس محبت کا بدلہ دیا کروں گی صرف اس لیے کہ تم جانے کیوں مجھے اچھے لگتے ہو" اس نے بڑے غرور سے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

کمرے میں ایسا سناٹا چھا گیا جیسے یہاں کی ہر چیز موت کی نذر ہو گئی ہو۔ اس وقت نہ جانے کہاں سے اس کے ذہن میں اپنی ماں کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ —— وہ بھی تو اپنے ایک غریب کلاس فیلو سے محبت کرنے لگی تھی مگر وہ تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے آٹے کی طرح اکڑا رہتا جب ماں نے اسے انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم دلانے کا وعدہ کیا تو مدتوں اس کی جوتیاں سیدھی کرتا رہا۔

"لو ——" وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ اور گلے سے ہیرے جڑے زیور اتارنے لگی —— "محبت کے بدلے میں میں تم کو ہمیشہ بہت کچھ دیتی رہوں گی" یہ سب تم لے سکتے ہو"

"نکل جاؤ" —— وہ چیخ پڑا اور اسے بستر سے کھینچ کر کھڑا کر دیا —— "نکل جاؤ میرے گھر سے" —— زیور پرس میں ٹھونس کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔

"ذلیل کمینہ تم لوگوں کو ذرا منہ لگاؤ تو سر پر چڑھنے لگتے ہو" —— وہ بپھر کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی —— "یہ فلیٹ۔ اس سے زیادہ اچھی جگہ تو میرے نوکر رہتے ہیں اور تم چاہتے ہو کہ اس جگہ میں تمہارے ساتھ اپنی قیمتی زندگی گزار دوں، اپنے خاندان کے منہ پر کالک لگا دوں، ذرا اپنا منہ دھو لو پھر محلوں کے خواب دیکھنا۔ تمہارے لیے یہ کیا کم عزت کی بات تھی کہ میں تم سے محبت کرنے لگی"، وہ اسے حقارت سے دیکھتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ بازوؤں میں منہ چھپائے کھڑا تھا۔

پو پھٹ چکی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوائیں کا تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ اس کا منہ آنسوؤں سے دھل کر ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

کھلی کھڑکیاں

ہاجرہ مسرور

کردار:۔

ڈاکٹر نور:۔ پینتالیس پچاس سال کی درمیانی عمر کے آدمی۔ مغربی لباس، فرنچ کٹ داڑھی، موٹے فریم کے چشمے اور بڑے سے پائپ مزاج سوچ سوچ کر بولنے اور رہ رہ کر ٹہلنے کے عادی۔

نسرین۔ دبلی پتلی پچیس سالہ بیوی۔ نئے زمانے کے مطابق لباس اور سنگار۔ جلدی جلدی بحث کے انداز سے بولنے کی عادی۔

خالہ جان لکھنؤ ٹھاٹ باٹ کی بوڑھی خاتون۔ ٹھہر ٹھہر کر بولتی ہیں۔ لیکن پان چبانے کے لیے منہ مسلسل چلاتی جاتی ہیں

اختر:۔ نسرین کا ہم عمر، کالی شیروانی میں ملبوس، شاعرانہ چال ڈھال اور بکھرے سے بال۔

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک معمولی سی خوابگاہ سامنے ہے دو مسہری نما کٹہرے دار پلنگ۔ پلنگوں کے درمیان ایک تپائی ہے۔ تپائی پر کتابوں کا ڈھیر ہے۔ ایک گلاس اور سوئٹر بننے کا سامان بھی اس پر ہے ایک کونے میں لکھنے کی میز اور ایک کرسی میز پر بھی کتابیں ڈھیر ہیں ڈریسنگ ٹیبل بائیں دروازے کے قریب ہے۔ اور کپڑوں کی الماری دائیں دروازے کے قریب ——— ایک فالتو تپائی اور ایک آرام کرسی سامنے کی دیوار کے قریب ہے۔

نسرین بستر پر نیم دراز کچھ سوچ رہی ہے۔ دوسرے بستر پر خالہ جان دوشالہ اوڑھے بیٹھی پاندان کھولے چھالیہ کتر رہی ہیں

کمرے میں شام کا اندھیرا ہے)

خالہ جان:۔ اے دلہن کھڑکی میں کیا گھور رہی ہو پڑی ——— دونوں وقت مل رہے ہیں روشنی کر دو ———

نسرین:۔ ابھی تو سورج ڈوب رہا ہے ——— روشنی ہے کافی

خالہ جان:۔ روشنی ہے۔ لو مغرب کی اذانیں ہونے والی ہیں۔ اور یہ موئی کھڑکی بھی بند کر دو ——— کیا بھر بھر ہوا آ رہی ہے۔

نسرین:۔ (بیزاری سے) کھڑکی بند ہو تو میرا دم گھٹتا ہے

خالہ جان:۔ اوئی بیوی۔ تم سے تو ہر بات کا کرارا جواب لے لو۔ ذرا آکر بیٹھی ہوں صاف کہہ دو کہ اٹھ کر چل جاؤں۔

نسرین:۔ (بڑا مان کر) آپ سے کچھ بھی کہو تو آپ اعتراض کرنے لگتی ہیں۔ لیجیے یہ روشنی (جل کر کھٹاک سے لیمپ کا بٹن دباتی ہے اور ننگے پاؤں اُٹھ کر دھڑ دھڑ کر کے کھڑکی کے پٹ بند کرتی ہے)

یہ لیجیے کھڑکی بھی بند۔ (کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

خالہ جان:۔ (سروتا زور سے پٹخ کر) واہ بھئی واہ۔ کاہے کو ہمارے گھرانوں میں بہوؤں کے یہ ڈھنگ ہوتے۔ ہمارے ہاں تو جہاں دونوں وقت ملے۔ بہو بیٹیوں نے سر ڈھک کر بسم اللہ کہا اور روشنی کر دی ——— رہی کھڑکیاں تو وہ ہمارے زنان خانوں میں کہاں ہوتی تھیں۔ نہ کسی کا دم گھٹتا تھا۔ (دھیمی پڑ کر) ابھی برا لگا ہے تو معاف کرو بابا۔ بجھا دو روشنی۔ اور کھول دو کھڑکی ——— ہمارے گھرانوں میں کاہے کو بڑے چھوٹوں سے کوئی بات کہہ کر یوں چور بنتے تھے۔

نسرین:۔ (تنک کر) آپ کے گھرانوں میں ——— آپ کے گھرانوں کی کہانیاں سن سن کر میرے تو کان پک گئے ہیں۔ میں نے کوئی ہاتھ جوڑے تھے کہ آئیے مجھے کرلی اپنے گھر کی بہو۔

خالہ جان: (منہ بنا کر) اب مجھے کیا پتہ؟ کس نے کس کے ہاتھ جوڑے بیوی ———

نسرین:۔ (چیخ کر) آپ کا مطلب ہے کہ میں نے آپ کے بھانجے کے آگے ہاتھ جوڑے ہوں گے

(پلنگ پر بیٹھ کر رونے لگتی ہے)

خالہ جان:۔ اے تو ہمارے میاں ہی ہاتھ جوڑتے رہتے ہیں تمہارے آگے۔ جبھی تو یہ دماغ ہیں۔ خود ہی دوسروں کے منہ پر جوتیاں سی مارو اور خود ہی بیٹھ کر ہائے واویلا کرو ——— جیسے نور میاں آ کر ہماری کھال کھنچوا لیں گے اور اپنی چہیتی بیگم کے قدموں تلے بچھا دیں گے ———

(سروتا پٹخ کر زور سے پاندان بند کرتی ہیں)

نسرین:۔ (غصے سے آنسو پونچھ کر) چہیتی بلا ——— میں چہیتی ہوتی تو آپ یوں کہتیں ———؟ بڑے آئے چاہنے والے۔

(ڈاکٹر نور دروازے پر نمودار ہوتے ہیں، ان کے منہ میں پائپ ہے اور ہاتھ میں ڈاک کا لفافہ ——— آہستگی سے اندر آتے ہیں اور دھیرے سے کھنکھار کر دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹہلنے لگتے ہیں۔ نسرین انہیں غصے سے دیکھ کر اون اور سلائیاں اٹھا لیتی ہے)

خالہ جان:۔ (فوراً شگفتہ ہو کر) لے نور میاں آج کیسے شام ہی سے اپنے کمرے سے اٹھ آئے۔ کیا کوئی ملنے والے آ گئے۔ چائے بنوانا ہے ان کے لیے۔

ڈاکٹر نور:۔ (گھبرا کر) جی نہیں تو۔

خالہ جان: میں تمہاری دلہن کے پاس آ کر بیٹھ گئی کہ اکیلے گھبراتی ہوں گی۔ مگر مجھ بڑھیا کے منہ سے نکل گیا کھڑکی بند کر دو ——— بس جب سے بگڑ گئیں۔ خیر بچہ ہیں۔ تو چائے کو کہوں۔

(نسرین گھور کر خالہ کو دیکھتی ہے اور زور زور سے ہنسنے لگتی ہے)

ڈاکٹر نور:۔ (بے دلی سے) نہیں چائے نہیں۔ آپ تو ذرا کھانے کی تیاری کرا دیجیے۔ میرے سر میں درد ہے میں جلدی کھانا کھا کر آرام کروں گا آج۔

خالہ جان: ارے سر میں درد کیوں ہے۔ رات جاگے ہو گے۔ نہیں تو ٹھنڈ لگ گئی ہو گی۔ کھڑکی جو رات وہاں کھلی رہتی ہے۔ آؤ قل ہو اللہ پڑھ کر پھونک دوں۔

ڈاکٹر نور: جی زیادہ درد نہیں۔ (بیزاری سے) آپ تو چائے بنوا دیجیے۔

خالہ جان: (حیران ہو کر) لو ابھی تو کھانے کو کہہ رہے تھے چائے سے انکار تھا۔ اب چائے کو کہتے ہو۔ آؤ دیکھوں بخار تو نہیں کہیں۔ سر دبانا ہو تو میں دبا دوں۔ (اٹھتی ہیں)

ڈاکٹر نور: نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں آرام کروں گا اس وقت۔ (اس طرح ٹہلتے رہتے ہیں)

خالہ جان: (قریب جا کر) یہ خط کس کا ہے۔ زینب کا تو نہیں؟

ڈاکٹر نور: (خط جلدی سے جیب میں رکھ کر) آں —— خط زینب کا تو نہیں۔ سرکاری خط ہے۔

خالہ جان: (پریشان ہو کر) کوئی سرکاری حکم ہے؟ اس لیے تمہاری صورت اتری ہوئی ہے —— کیا بات ہے؟

ڈاکٹر نور: (سوچ کر) کوئی خاص بات نہیں ہے خالہ جان۔ آپ فکر نہ کیجیے۔

خالہ جان: (دوبارہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے) میں تمہاری فکر نہ کروں گی تو کون کرے گا۔ زینب ہر خط میں لکھتی ہے کہ نور بھائی کا خیال رکھیے آپ کے سوا ان کا کون رہ گیا ہے۔

نسرین: (حقارت سے منہ بنا کر) بے چاری زینب! (زور زور سے سلائیاں چلاتی ہے اور خالہ کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے)

خالہ جان: (ایک دم بگڑ کر) دیکھا نور میاں۔ یہ حال ہے۔

ڈاکٹر نور: (سر پکڑ کر) خالہ جان میں چائے پیوں گا۔

خالہ جان: (پکارتی ہیں) ارے نواب۔ ارے نواب۔

ڈاکٹر نور: (لمبی سانس لے کر) میں آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیوں گا خالہ جان اگر آپ بنا دیں تو ——

خالہ جان: (سر ہلا کر) تو یہ کہو نا میں چلی جاؤں یہاں سے ——

ڈاکٹر نور: (پریشان ہو کر) میرا مطلب ہے ہاتے۔

خالہ جان: ہاں — ہاں جاتی — اچھا مگر تم دلہن کو میری وجہ سے کچھ نہ کہنا —— بچی ہیں ——
وہ مجھے جو چاہیں کہہ لیں۔

(پاندان اٹھا کر چلتی ہیں) (نسرین غصے سے خالہ جان کو گھورتی ہے۔ ڈاکٹر نور خالہ جان کے جانے کے بعد جلدی سے دروازہ بند کر لیتے ہیں اور پھر پشت پر ہاتھ باندھے نپے تلے قدموں سے نسرین کے پلنگ کے پاس آ کر اسے غور سے دیکھنے لگتے ہیں)

نسرین: (طنز سے ہنس کر دیکھتے ہوئے بستر سے اٹھ کر) آج سر شام کیسے یہاں قدم رنجہ فرمایا؟ (بال جھٹک کر دوبارہ بُن کستے ہوئے) کیا آپ کے کمرے میں خالہ جان کی فریاد پہنچ گئی تھی۔ خالہ جان کے لیے جو فیصلہ دینا ہو وہ سنا دیجیے اور میرے سلسلے میں جو حکم ہو وہ مجھے عنایت کیجیے۔

ڈاکٹر نور:۔ (بجھا ہوا پائپ جھٹکتے ہوئے) نسرین زبان کے جوہر مجھے نہ دکھاؤ —

نسرین:۔ (مصنوعی ادب سے) واقعی یہ طاقت، یہ مجال! آپ جیسے عالم فاضل کے سامنے میری کیا مجال — لیجئے میں چپ ہوں میں جب تک ناخنوں پر سُرخی لگاؤں گی۔ آپ پھر شروع کیجئے۔ موضوع ہے خالہ جان کی اہمیت۔ (ٹہلنے سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ جاتی ہے)

ڈاکٹر نور:۔ (مضبوط آواز میں) نہیں یہ موضوع پرانا ہے۔ (بجھا ہوا پائپ دانتوں میں دبا کر نسرین کو تیز نظروں سے گھورتے ہیں اور پھر کھڑکی کے قریب جاکر باہر جھانکتے ہیں۔ نسرین بے تکلفی سے بیٹھی ناخنوں پر سرخی لگاتی رہتی ہے)

ڈاکٹر نور:۔ (رنجیدگی سے) میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں نسرین بیگم؟ (ذرا رک رک کر) کہ — کہ تمہیں کھڑکی بند کرنے کے مشورے پر اس قدر جلال کیوں آتا ہے؟

نسرین:۔ (اسی طرح سرخی لگاتے ہوئے) اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے بھی خالہ جان کی طرح حفظانِ صحت کے اصول نہیں پڑھے — وہ جو غالباً تیسرے یا چوتھے درجے میں پڑھائے جاتے ہیں؟

ڈاکٹر نور:۔ ہوں — خوب!! (جیب سے ماچس نکال کر پائپ سلگاتے ہیں اور پھر ایک دم نسرین کے پیچھے کھڑے ہو کر جیب سے لفافہ نکال لیتے ہیں) میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خط کیسا ہے؟

نسرین:۔ (بے پروائی سے) آپ نے ابھی خالہ جان کو بتایا تھا کہ سرکاری ہے۔ آپ کے ہاتھ میں ہے دوبارہ دیکھ لیجئے۔

(ڈاکٹر نور خط کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاتھ کو دور لے جاکر۔ پھر جیب سے دوسرا چشمہ نکال کر پہلے چشمے کی جگہ لگا لیتے ہیں)

ڈاکٹر نور:۔ (پڑھتے ہیں) القاب ہے۔ "جانِ تمنّا" اس کا کیا مطلب ہے؟

نسرین:۔ (بغیر چونکے اطمینان سے) قطعی غیر سرکاری القاب ہے یہ تو —

ڈاکٹر نور:۔ ہوں — خوب۔ (چند قدم بے تابی سے ٹہلنے کے بعد جھٹکے سے رُکتے ہوئے) اسے محبت نامہ کہا جا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے!

نسرین:۔ (اسی اطمینان سے) جی ہاں موٹی بات ہے — یعنی آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گویا آپ بھی کسی کی "جانِ تمنّا" ہیں — خیر یوں ہی سہی (ایک دم مڑ کر غصے سے) آپ مجھے اپنی تصنیف لیکر کیا سمجھانے آئے ہیں — میں تو ویسے بھی آپ سے کوئی اُمید نہیں رکھتی — ہم دونوں تو الگ الگ زندہ ہیں۔

— کھسیانی ہنسی ہنستی ہے۔

ڈاکٹر نور:۔ (خط کو مٹھی میں مروڑ کر پشت پر ہاتھ باندھتے ہوئے) اس کے بعد تمہیں ہنسنا نہیں روٹھنا چاہیے تھا۔ تبھی یہ تصنیف مکمل

ہوگی۔

نسرین :۔ (بے رخی سے) ہُنھ۔ دھتّے میری بلا۔ (بستر کی طرف بڑھتی ہے جیسے اب منہ کر لیٹ جائے گی)

ڈاکٹر نور :۔ (تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) ہاں۔ واقعی۔ (رُک کر) دھتّے تمہاری بلا کیونکہ تم جانتی ہو کہ مجھے کوئی نہیں چاہ سکتا (لمبی سانس لیتے ہیں) تم بھی نہیں — کوئی بھی نہیں —

نسرین :۔ (بستر کے پاس کھڑے ہو کر جھلا کر) آپ نے پھر چاہت کا قصہ چھیڑا؟ آپ کے منہ سے یہ باتیں بڑی عجیب سی لگتی ہیں — (اداس ہو کر) بڑی عجیب جیسے کوئی دودھ پیتا بچہ اٹھ کر ریاضی کا مسئلہ حل کرنے لگے —

ڈاکٹر نور :۔ اور کچھ؟ (اس کے قریب آ کر مجروح نظروں سے اسے دیکھتے ہیں) اور کچھ کہو۔

نسرین :۔ (ڈاکٹر نور کو کھوئے ہوئے انداز سے دیکھتے ہوئے) ایک بار جب میں چھوٹی سی تھی تو مجھے ایک عجیب سا تجربہ ہوا — سفیدی ہو رہی تھی اس لیے بڑے کمرے کا سارا سامان نکال دیا گیا — میں کھیلتی کھیلتی وہاں پہنچ گئی — (رُک کر سوچنے لگتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ پھر کیا ہوا —؟

نسرین :۔ میں نے اتفاق سے اماں کو پکارا — آواز کی گونج میں نے دوسرے لمحے سنی۔ اماں — مجھے یہ بازگشت کا احساس پہلی مرتبہ ہوا۔

ڈاکٹر نور :۔ اچھا تو اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟

نسرین :۔ میرا مطلب ہے کہ محبت کی بازگشت بھی خالی دلوں اور خالی کمروں ہی میں سنی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر نور :۔ (پائپ دوبارہ سلگا کر حقارت سے) خالی دل —؟ خالی کمرے؟

نسرین :۔ جی ہاں — گو آپ کے کمرے میں تو کتابیں ہی کتابیں ہیں۔ دیواریں یکسر ڈھکی ہوئی — (بے اختیار ہنس کر) دل میں ہی کتابیں — یہاں تو آپ اپنی آواز کی بازگشت نہیں سن سکتے —

ڈاکٹر نور :۔ (چُبھتے ہوئے انداز سے) تم کیا کیا ہو نسرین بیگم۔

نسرین :۔ (چونک کر طنز سے) کچھ بھی نہیں — ایک چھچھوری بیوی — جو اکیلی پڑی ٹُھنکتی ہے یا پڑھتی ہے —

ڈاکٹر نور :۔ میں یہ نہیں کہہ رہا تھا۔ (حقارت سے مسکرا کر) میرا مطلب تھا کہ تم ہو بڑی شاندار شے —

نسرین :۔ (پہلا موڈ جھٹک کر خالص بیویانہ انداز سے) — شے؟ — میں شے ہوں — مجھے شروع ہی سے معلوم تھا کہ آپ مجھے انسان سمجھنے پر تیار نہیں — (بستر میں جا کر بیٹھ جاتی ہے اور ہنسنے لگتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ میں تمہارا معترف ہوں نسرین بیگم — میں جانتا ہوں۔ اگر تم وکیل ہوتیں تو ڈاکوؤں اور قاتلوں کو باعزت بری کرا لیتیں۔ یہ تو ہوئی تمہارے زورِ بیان کی تعریف — اگر تم اداکار ہوتیں تو —

نسرین :۔ (سلائیاں روک کر غصے سے) تو؟

ڈاکٹر نور :۔ تو تم اچھی اداکارہ بھی ہو — میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اتنی دیر سے بڑی اچھی ایکٹنگ کر رہی ہو۔

نسرین: (چیخ کر) کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں ایکٹنگ کر رہی ہوں۔

ڈاکٹر نور: (بغیر توجہ دیے طنز سے) میں چاہتا ہوں تمہاری ایکٹنگ کے اور بھی کمالات دیکھوں۔

نسرین: (دانت اور مٹھیاں بھینچ کر) بکنے کی حد ہوتی ہے — آپ کو میرے بارے میں اس قسم کی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں یہاں سے چلی جاؤں؟

ڈاکٹر نور: میں آج تمہاری ایکٹنگ کے کمالات دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہاں تو دوسرا منظر۔ (خط سامنے کر کے) "جانِ تمنّا"

نسرین: (انتہائی غصے کے عالم میں) جہنم میں جائے جانِ تمنّا۔

ڈاکٹر نور: اس کے آگے لکھا ہے: "تمہارے کمرے کا کھلا ہوا دریچہ میرے لیے ایک دعوت ہے مگر میں معذور ہوں —" اس کا کیا مطلب ہے؟

(نسرین ایک دم لڑکھڑا کر مسہری کا سہارا لے لیتی ہے)

ڈاکٹر نور: کھلے ہوئے دریچے کی تشریح بھی کر دو — چپ کیوں ہو گئیں؟

نسرین: (بہت مدہم آواز میں) تو میں — تو میں ایسی ہوں؟ — ایسی! —

ڈاکٹر نور: مگر یہ تم بھی نہیں جانتی تھیں — ٹریجڈی پر سسکیاں لے کر روتے ہیں نسرین بیگم —

نسرین: (ایک قدم آگے بڑھ کر) تو میں — (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

ڈاکٹر نور: (اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ٹہلتے ہوئے) مجھے نہیں معلوم تھا کہ خالہ جان سے جو روزن و کھڑکیاں بند کرنے پر جھگڑے ہوتے ہیں، وہ کس لیے — میں نے خالہ کی باتوں کو کبھی اہمیت ہی نہ دی — ابھی تم نے کہا تھا کہ محبت کی بازگشت خالی دلوں ہی میں گونجتی ہے۔ مگر تم نے یہ نہ کہا کہ تمہارا دل دوسروں سے بھرا پڑا ہے — ؟

(نسرین تڑپ کر سر اٹھاتی ہے اور کمرے میں ہر طرف دیکھتی ہے)

ڈاکٹر نور: (دریچے کے پاس آ کر اسے پاٹوں پاٹ کھول دیتے ہیں۔) یہ رہا حفظانِ صحت کا پہلا اصول جو تم نے شاید چوتھے درجے میں پڑھا تھا۔ کیوں نا — مگر صاف ہوا سے ذہن بھی پاک ہو سکتے ہیں؟

(نسرین بے بسی سے سر اٹھا کر ڈاکٹر نور کی طرف دیکھتی ہے) صاف ہوا کے باوجود تمہارا چہرہ کس قدر بیمار ہے — (نسرین کی طرف آتے ہوئے) تم چپ کیوں ہو۔ بیوفا عورتوں کے پاس منطق کی کمی نہیں ہوتی۔

نسرین: (تڑپ کر) میں — میں بیوفا ہوں —؟ (فیصلہ کن انداز سے آنسو پونچھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

ڈاکٹر نور: (حقارت سے) یہ گویا کلائمکس ہوا اداکاری کا۔

نسرین: (غصے سے کانپ کر) کیا آپ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان میں گفتگو نہیں کر سکتے؟

ڈاکٹر نور: (کاش میں پڑھا لکھا نہ ہوتا — اور تم یہ مطالبہ کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتیں — تم جانتی ہو، جب میں نے یہ خط کھولا تو سب سے پہلے میرا کیا جی چاہا —؟ تم اخبار میں جرائم کی خبریں پڑھنے کی شوقین ہو — سمجھ گئی ہو گی۔

نسرین: تو میں — میں (کچھ نہیں کہہ پاتی اور ڈاکٹر نور کی طرف سے پیٹھ موڑ لیتی ہے)۔

ڈاکٹر نور: (دانت دبا کر) مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ایسی ہو، ورنہ تم مجھے مر کے بھی حاصل نہ کر سکتیں۔

نسرین: (مٹھیاں بھینچ کر تڑپتی ہے) میں نے آپ کو حاصل کیا؟ آپ نہیں چاہتے تھے مجھے؟

ڈاکٹر نور: میں نے تو تمہیں ایک یتیم مہاجر لڑکی سمجھ کر ترس کھایا تھا — مجھے تمہاری بیک گراؤنڈ کا علم نہ تھا۔

نسرین: (ہونٹ کاٹ کر) مجھے بھی تم پر ترس آیا تھا کہ بیچارہ بڈھا —

ڈاکٹر نور: کون! — میں بڈھا — تم نے یہ سمجھا تھا۔ کہ تم میری آڑ میں —

نسرین: (چیخ کر) چپ رہیے — بس — مجھے چھوڑ دیجیے

ڈاکٹر نور: (ایک دم جیسے پڑ کر یکن ش۔ یہ حقارت سے) یہ تم میرا فیصلہ سنا رہی ہو تم کتنی چالاک بھی ہو تاکہ دنیا کے سامنے شیخی بگھارتی پھرو کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا — کیوں؟

نسرین: (بے تحاشہ چیخ کر) نہیں جائیے۔ آپ اشتہار بانٹ دیجیے شہر میں کہ آپ مجھے چھوڑ رہے ہیں — مجھے ذرہ برابر پروا نہیں — (ایک دم پھر روتے ہوئے) ہاں میں ایسی ہوں۔ مجھے ابھی چھوڑ دیجیے — میرے اللہ! (روتی ہے)

ڈاکٹر نور: عورت کو چھوڑنے کے لیے اس کے گلے سے زنجیر نہیں اتاری جاتی — تم آزاد ہو۔ (نسرین کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نسرین تلملا کر ہاتھ ملتی ہے ایک آدھ قدم اٹھاتی ہے اور پھر زور زور سے رونے لگتی ہے)

ڈاکٹر نور: (نفرت سے یوں نسرین کی طرف مڑ کے) جھٹ کر تو کہتے ہی خوشی سے بھاگ گئے ہیں — (نسرین جھکولا لگی کہ بجلتی ہے اور پھر آنسو پونچھ کر مضبوط قدموں سے چل کر کپڑوں کی الماری کھول دیتی ہے۔ اور اپنے کپڑے نکالنے لگتی ہے۔ خالہ جان اندر آتی ہیں صورت احوال کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کچھ نہ سمجھ کر)

خالہ جان: اے ہے کیا پھر پھر ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے — یہ موئی کھڑکی پھر کیوں کھول دی گئی۔ ایک تو نور میاں کے سر میں درد ہے اس پر سے یہ ٹھنڈی ہوا کسی کو خیال ہو جب نا۔ کیوں دلہن؟

ڈاکٹر نور: (تلملا کر) خالہ جان کھڑکی میں نے کھولی ہے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔

خالہ جان: (حیران ہو کر) تمہارا دم گھٹ رہا تھا — اوپر سے چائے پی گئے سردی گرمی سے زکام نہیں ہو جائے گا۔

ڈاکٹر نور: بہت اچھا خالہ جان میں چائے نہیں پیوں گا اب (کھڑکی کے قریب جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

خالہ جان: (سر پر دوپٹہ ڈال کر ان کے پیچھے جاتی ہیں) اب کیا کہوں کسی کی سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں — ہر ایک کا دم گھٹتا ہے کھڑکی بند ہو تو — اب کیا کہوں میں کسی سے — کھڑکی کھلی ہو تو میرا دم گھٹتا ہے۔

ڈاکٹر نور: اب کھڑکیاں بند رہیں گی خالہ جان —

خالہ جان: تو ابھی بند کر دو، سارا سامنا ہوتا ہے یہاں کا۔ وہ موا اکھڑ رہا ہوگا۔

ڈاکٹر نور: (چونک کر) کون؟

خالہ جان :۔ اے وہی سامنے والے گھر کا موا ڈھاکمرسٹ۔ باجا بجے گھنٹہ، میرا تو ناک میں دم ہے ۔ جب دیکھو گھگو بجا ہوتا ہے۔ (شرما کر) میرا بس چلے تو دیدے نکال لوں۔ سارے گھر کی کھڑکیاں اسی رخ پر کھلتی ہیں ۔ ذرا سامنا ہوا میرا اور لگا دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے ۔

ڈاکٹر نور :۔ (حیرانی سے) خالہ جان ۔۔۔ یہ سچ ہے ؟

خالہ جان :۔ (پریشان ہو کر) اب جانے دو ۔۔۔ اس لیے تو کہتی نہ تھی کہ تمہیں غصہ آ جائے گا۔ بس کھڑکی بند کر دو ۔ کیا فائدہ کسی سے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

ڈاکٹر نور :۔ (فوراً آرام کرسی پر جیسے گر جاتے ہیں) میرے سر میں سخت درد ہے۔ مجھے چائے دیجئے جلدی سے ۔

(خالہ گھبرا کر چلی جاتی ہیں ڈاکٹر نور ایک لمحے آنکھیں بند کیے بیٹھتے ہیں۔ اور پھر جلدی سے سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں ۔۔۔

نسرین بڑے عزم کے ساتھ الماری میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بستر پر ڈھیر کر رہی ہے ۔ وہ ادھر دیکھتی بھی نہیں)

ڈاکٹر نور :۔ (کھنکھار کر) مس ۔ پی ۔ سنو رینی ۔۔۔

نسرین :۔ میرا نام نسرین بیگم ہے، ڈاکٹر نور اللہ ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ڈی

ڈاکٹر نور :۔ (کھسیانی ہنسی ہنس کر) ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے آگے بریکٹ میں جرمنی بھی ہے۔ وہ تو تم بھول ہی گئیں رینی

نسرین :۔ (بڑی بے رخی سے) میرا نام رینی نہیں

ڈاکٹر نور :۔ (اٹھ کر نسرین کے قریب آتے ہوئے) مجھے معاف کر دو۔ دراصل خط کچھ اس قسم کا تھا ۔ میں نے سمجھا تمہارے نام ہے ۔

نسرین :۔ (خشک لہجے میں) معافی کس بات کی ۔۔۔ (کپڑے تہہ کرنے لگتی ہے)۔

ڈاکٹر نور :۔ (اس کے ہاتھ سے کپڑے لینے کی کوشش کرتے ہوئے) آؤ بیٹھ کر چائے پی لو۔ اب تو تمہیں خالہ جان کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ کتنی نیک دل اور سادہ ہیں ۔ خدا ان کا بھلا کرے کہ ۔۔۔

نسرین :۔ (بات کاٹ کر) کہ انہوں نے انجام بخیر کروا دیا ۔ (تلخی سے ہنستی ہے) ہم خود اپنی ذات کے ساتھ کتنے بے بس اور احمق معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نور :۔ احمق اور بے بس ! ۔۔۔۔۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا رینی ۔۔۔۔۔ دیکھو نا، ساز کے ایک سُر سے نغمہ نہیں بنتا ۔

نسرین :۔ (تلخی سے ہنس کر) تو خالہ جان کو ہم سُر کیجئے اپنے نغمے کا ۔ بیچاری خالہ ۔۔۔ !

(خالہ جان اندر آتی ہیں ان کے پیچھے نوکر چائے کی ٹرے لیے داخل ہوتا ہے اور ٹرے میز پر رکھ کر لوٹ جاتا ہے

خالہ جان :۔ میرا کیا ذکر ہو رہا تھا ۔

ڈاکٹر نور :۔ (شگفتگی سے) ہم آپ کی تعریف کر رہے تھے ۔

خالہ جان :۔ لو بھلا کاہے کی تعریف ؟ میں نے کیا ہی کیا ہے ۔ بس چائے بنوائی ہے ۔

نسرین :۔ اللہ [illegible] ذرا سے قریب آکر) آپ نے تو بہت کچھ کیا ہے۔ یا آپ نہیں جانتیں۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ (نسرین پھر اندر کی طرف چلی جاتی ہے)۔

ڈاکٹر نور :۔ (پریشان ہو کر) ایں واقعی خالہ جان ——
(نسرین گھٹنوں کے بل جھک کر مسہری کے نیچے سے چمڑے کا بڑا سا سوٹ کیس گھسیٹ کر نکالتی ہے۔ ڈاکٹر نور [illegible] رہ جاتے ہیں اور خالہ کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں)

ڈاکٹر نور :۔ اختر میاں گھر آتے ہی نہیں۔ وہ تو رات سے پہلے گھر آتے ہی نہیں —— یہ بات ٹھیک نہیں

خالہ جان :۔ (ادھر توجہ نہ دیتے ہوئے) ہاں گھر بننے سنورنے ہی کی عمر ہے —— (متعجب ہو کر) یہ نسرین دلہن کیا کر رہی ہیں اس وقت؟ ایں ——

ڈاکٹر نور :۔ (گھبرا کر) کپڑے رکھ رہی ہیں۔

خالہ :۔ وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں —— مگر الماری کیوں خالی کر رہی ہیں۔

نسرین :۔ الماری میں جگہ نہیں رہی ہے۔

ڈاکٹر نور :۔ خالہ جان آج انڈے کا سالن پکا دیجئے۔ بہت دن سے آپ کے ہاتھ کا سالن نہیں کھایا
(پریشان ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نسرین ان کی یہ کیفیت دیکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

نسرین :۔ یہ سالن انہیں کبھی پسند نہیں آتا۔ مگر آپ جا کر پکائیے کیونکہ یہ چاہتے ہیں آپ اس وقت یہاں سے چلی جائیں۔

خالہ :۔ کیا کہہ رہی ہے لڑکی —— ہاں میرے ہاتھ کا کھانا کسی کو کیا پسند آئے گا۔ تم تو بڑی پکانے والی ہو نا ——

نسرین :۔ اب آپ پکانے والی کا انتظام بھی کر سکتی ہیں

خالہ جان :۔ (بگڑ کر) آئیں۔ دیکھ رہے ہو نور میاں —— میرا تو نصیب ہی بگڑ گیا۔ اختر کسی لائق ہوتا تو کیوں ایسی باتیں سننا پڑتیں۔

ڈاکٹر نور :۔ (باری باری دونوں کی طرف دیکھ کر) خالہ جان آپ تو میرے لیے سالن پکا دیجئے۔ اور یہ نسرین —— ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ (نسرین کے پاس جا کر) خدا کے لیے کپڑے کل ٹھیک کر لینا اس وقت آرام کرو —— خالہ جان ذرا نوکر سے ساریڈان لانے کو بھی کہہ دیجئے

خالہ جان :۔ (برا مان کر) اگلے وقتوں میں کوئی بات کرنا ہوتی تھی تو لوگ بڑوں کو بٹھاتے تھے۔ اب بڑوں کو اٹھاتے ہیں —— لو بھئی میں جا رہی ہوں۔

ڈاکٹر نور :۔ (بجھا پائپ منہ میں دبا کر بوکھلائے ہوئے) ارے خالہ جان —— یہ بات نہیں
(خالہ جان چلی جاتی ہیں ڈاکٹر نور نسرین کی طرف بڑھتے ہیں)

ڈاکٹر نور :۔ (بزرگانہ ملامت سے) خالہ جان کے سامنے اس قسم کی باتیں مناسب نہیں رہیں۔ دیکھو اپنے جھگڑے خود چکانا چاہئیں

نسرین :۔ وہ تو چھپ گئے۔ آپ ہی آپ ——

ڈاکٹر نور :۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی —— میں نے معافی مانگ لی۔

نسرین: (تعجب سے) غلط فہمی کیسی ——— وہ خط میرے ہی نام تھا۔

ڈاکٹر نور: اور خالہ جان جو کہہ رہی تھیں۔

نسرین: (تیزی سے) انہیں بھی غلط فہمی ہوئی ہوگی ——— مرد جتنا زیادہ بڈھا ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ جوان عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ خط میرے ہی نام تھا مجھے یقین ہے۔

ڈاکٹر نور: (یقین کرتے ہوئے) اچھا یوں ہی سہی ——— غرورِ حسن تو قائم رہے۔ گو میں سامنے والے گھر کے بڈھے کو اپنی رقابت کے لائق نہیں سمجھتا۔ آؤ۔ اب چائے پی لو۔ مجھے ایک لکچر بھی تیار کرنا ہے۔ اور تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ آؤ اب۔ قصہ ختم
(چائے پیالیوں میں انڈیلتے ہیں)

نسرین: (کپڑے سوٹ کیس میں جماتے ہوئے) میرا جی نہیں چاہ رہا ہے چائے کو ——— میں اب جانا چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر نور: (ہنس کر) اس خط کے پیچھے جانا چاہتی ہو؟ وہ تو مجھ سے بہت زیادہ بڈھا ہے۔

نسرین: (کھوئے کھوئے انداز سے) نہیں ——— دنیا میں جوان لوگ بھی ہیں ———

(نسرین سوٹ کیس چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور عزم کے ساتھ چل کر ڈاکٹر نور کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر نور اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتے ہیں نسرین آہستگی سے پیچھے ہٹ جاتی ہے)

نسرین: (سنجیدگی سے) میں جا رہی ہوں۔

ڈاکٹر نور: میں تمہیں جانے دوں گا؟ (محبت سے اسے دیکھتے ہیں)

نسرین: (ڈاکٹر نور کی طرف سے پیٹھ موڑ کر) میرے گلے میں کوئی زنجیر تو نہیں ہے۔

ڈاکٹر نور: (اٹھ کر نسرین کے شانے پکڑتے ہوئے) غصے کی باتوں کو دہراتے نہیں۔ یاد کرو چار سال کے ساتھ میں تم نے جب غصہ ہوئیں تو مجھے کیا کچھ نہیں کہا؟ میں نے وہ باتیں کبھی نہیں دہرائیں۔

نسرین: (آہستہ سے خود کو الگ کرتے ہوئے) زبان احساسات کی تابع ہوتی ہے۔ احساسات زبان کے غلام نہیں ہوتے۔ میں نے جو کچھ کہا ہوگا سچ ہی کہا ہوگا۔

ڈاکٹر نور: تم نے ایک بار مجھ سے جھگڑتے ہوئے کہا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ مگر میں نے یقین نہیں کیا۔

نسرین: بات تو کہی جاتی ہے۔ اب یہ تو نہیں کہ بات کوئی کیل ہے جو زبان پر سے اٹھائی اور ہتھوڑے سے کسی کے ذہن میں ٹھونک کر اتار دی۔ آپ نے یقین نہیں کیا تو اس میں میرا کیا قصور ——— میں نے آپ سے کبھی محبت نہیں کی۔

ڈاکٹر نور: کیوں؟ (ٹہلنے لگتے ہیں)

نسرین: اس لیے کہ محبت احساسات کا تبادلہ ہوتا ہے ——— آپ نے بھی مجھ سے کبھی محبت نہیں کی۔

ڈاکٹر نور: تم جو چاہو کہو ——— میں نے تمہیں چاہا بھی ہے ———

نسرین: آپ اپنی لائبریری میں بند ہو کر مجھے چاہتے رہے ——— وہاں بیٹھ کر آپ میرے بارے میں غور و خوض فرماتے تھے۔
(کمر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر ڈاکٹر نور کو گھورتی ہے)

ڈاکٹر نور:۔ (وائن کی طرف سے مڑ کر) میں تمہاری طرح اپنی بات نہیں کہہ سکتا، بلکہ کہنا نہیں چاہتا۔ تم جانتی ہو میں تو ریاضی جیسے خشک مضمون کا اسکالر ہوں۔

نسرین:۔ (تیز ہو کر) کہنا نہیں چاہتے تو سننے کے لیے کیوں مر رہا ہے۔ بس ایک بات کہتی ہوں، شاید آپ کے کام آئے — دیکھیے! (قریب آ کر حقارت سے) عورت مرد کے تعلقات دو اور چار کا فارمولا نہیں۔

ڈاکٹر نور:۔ (جھلا کر) ابھی تو تم نے کہا تھا کہ محبت احساسات کا تبادلہ ہے۔ اب تم دو اور چار کے خلاف ہو گئیں۔ کہیں پاؤں تو ٹکاؤ۔ یہ کیا کہ ہر بات میں بحث —
(نرم پڑ کر) آؤ چائے پی لو۔

نسرین:۔ (اذیت سے سر جھٹک کر) جناب، بات یہ ہے کہ یہ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش جو ہے نا۔ یہ تو بس ننھے بچے کا خواب ہے جس کو وہ خود بیان نہیں کر سکتا —— سمجھے آپ؟ شاید یہ بتانے کے لیے میں نے ہر مثال غلط دی۔

ڈاکٹر نور:۔ (مسکرا کر) چلو تم نے اپنی کوئی بات غلط تو تسلیم کی —— اسی خوشی میں اب چائے پی لو۔
(پیالی اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہیں)

نسرین:۔ ہاں آج میرا جی سچ ہی بولنے کو چاہ رہا ہے۔ — چائے کی پیشکش مسترد
(پیالی ہاتھ مار کر گرا دیتی ہے) مجھے اپنا سارا سامان اکٹھا کرنا ہے۔
(ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھتی ہے)

ڈاکٹر نور:۔ (سختی سے) بس کرو یہ تماشہ — پاگل ہو گئی ہو ——
(نسرین کو شانوں سے پکڑ لیتے ہیں مگر نسرین وحشیانہ طریقے پر خود کو چھڑا لیتی ہے اور سسکیاں لے لے کر رونے لگتی ہے۔)

ڈاکٹر نور:۔ (الجھ کر) کیا جہنم ہے۔ تم کیا چاہتی ہو؟ (نسرین سر اٹھا کر مجروح نظروں سے انہیں دیکھتی ہے اور پھر اوندھے منہ بستر پہ ٹک جاتی ہے)

نسرین:۔ میں جانا چاہتی ہوں —— (دھیرے دھیرے) میں نے یہ چار سال جہنم میں گزارے ہیں۔ جہنم جہاں صرف اذیت ہے۔ کوئی امید نہیں۔ کوئی حسن نہیں —— (سسکتے ہوئے) پہلے میرے پاس کتنے خواب تھے میں نے زندگی کو کیسے کیسے رنگ دیے تھے۔ مگر یہاں صرف سفید کاغذ اور سیاہ حروف ہیں۔ یہ رنگ بھی تو میرے نہ بن سکے — آپ اپنے کمرے میں بند پڑھتے رہتے لیکن وہ جو شادی سے پہلے آپ کہتے تھے کہ تم کتنی قابل ہو، میں تمہاری قابلیت کو اور نکھاروں گا —— شاید میں ایم۔ اے کے سلسلے میں آپ ہی کی تھی نا ——

ڈاکٹر نور:۔ (برا مان کر) تو میں نے تمہیں ایم۔ اے کرنے سے منع کیا؟

نسرین:۔ آپ نے ہمیشہ راتوں کو مجھے اپنے آئندہ پروگرام سے آگاہ کیا۔ آپ نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو۔

ڈاکٹر نور:۔ ہاں واقعی یہ بات تم صحیح کہہ رہی ہو — مگر تم نے بھی تو ہمیشہ میرے کام پر ناک بھوں چڑھائی۔ اب مجھے اتنی فرصت کہاں کہ رات دن تمہارے ساتھ —— کے ہنگاموں میں کھویا رہوں۔

نسرین :۔ (شکوہ کرنے کے انداز سے) آپ کو تو اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ مجھے نظر بھر کر دیکھتے ——— میں کیا کہوں ——— مگر میں کہوں گی ... وہ صاحب جب گھورتا تو میرا جی چاہتا، وہ مجھے دیکھتا رہے.

ڈاکٹر نور :۔ (ٹہلتے ہوئے) ہوں ——— تو گویا عورتیں چاہتی ہیں کہ کوئی انہیں رات دن تکتا رہے.

نسرین :۔ (بھرے گلے کے ساتھ) میں نہیں جانتی ——— شاید ——— شاید

ڈاکٹر نور :۔ (فیصلہ کن انداز سے) مایوس تم ہی نہیں ہوئیں میرا بھی یہی ہوا. تم میرے لیے کبھی مخلص نہ ہو سکیں. میں نے تمہیں اپنی طرف کھنچتے دیکھ کر سمجھا تھا کہ تم ایک سنجیدہ ذہن کی عورت ہو. تم مجھ سے محبت کرو گی. میری دلچسپیوں میں دلچسپی لو گی ـ خیر جانے دو ان باتوں کو مجھے شکایتوں کی عادت نہیں.

(ڈاکٹر نور آرام کرسی پر بیٹھ کر پائپ سلگاتے ہیں)

نسرین :۔ (چڑ کر) جی ہاں میں نے تو رات دن آپ سے شکایتیں ہی کیں ——— (دور تکتے ہوئے) میں نے تو کوئی شکایت نہیں کی کبھی. اختر آ کر بتایا کرتا تھا کہ فلاں پکچر ایسی تھی ——— فلاں ڈرامے کی پروڈکشن خوب تھی ——— پکنکوں، سبزہ زاروں اور آبشاروں کی باتیں. شاعروں کے کامیاب شعر. دنیا جہان کی دلچسپیاں ——— اختر مجھے کتنا بہلاتا کہ میں اس کے ساتھ چلوں. وہ کہتا کہ ———

(ڈاکٹر نور پائپ منہ سے نکال کر ساکت سے ہو جاتے ہیں)

نسرین :۔ (نرم خوابناک آواز میں) وہ کہتا کہ عورت کی زندگی علیحدہ بھی تو ہوتی ہے ـ مگر میں نے ایسا کبھی نہیں سمجھا.

ڈاکٹر نور :۔ (کھڑے ہو کر نسرین کے قریب آتے ہوئے پائپ سے اشارہ کر کے) یہ اختر ـ یہ اختر کہتا تھا تم سے. میں پوچھتا ہوں اسے کیا حق تھا کہ تمہیں ساتھ چلنے کو کہتا.

نسرین :۔ (حقارت سے) آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ کوئی مجھ سے ہمدردی کیوں رکھتا ہے؟

ڈاکٹر نور :۔ (غضبناک ہو کر) ہمدردی ـ یہ ہمدردی ہے. نالائق ہے وہ تو. اس نے آج تک اپنی ماں کے لیے کچھ نہیں کیا ـ آئے تو وہ ——— میں اس سے پوچھوں گا ـ

نسرین :۔ (منہ بنا کر) ہنہ نالائق ہے وہ! ——— آپ سے تو بہت زیادہ سمجھدار ہے ——— بس اب قصہ ختم کیجیے.

ڈاکٹر نور :۔ ہاں قصہ ختم ——— ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے ہیں. میں لکھے دیتا ہوں.

(ڈاکٹر نور زور سے کرسی گھسیٹ کر رائٹنگ ٹیبل کے پاس بیٹھ جاتے ہیں. جیب سے قلم نکال لیتے ہیں. ایک لمحے نسرین کو دیکھتے ہیں جو اب بے حد جوش کے ساتھ اپنے کپڑے سوٹ کیس میں جما رہی ہے. تیزی سے کاغذ پر کچھ لکھتے ہیں اور لمبی سانس لے کر اٹھ جاتے ہیں. دو ایک قدم اضطراری کیفیت میں ٹہلتے ہیں پھر آرام کرسی پر بیٹھ کر دوسری پیالی بنا کر چائے پینے لگتے ہیں.)

ڈاکٹر نور :۔ (اطمینان کے ساتھ آرام کرسی سے ٹیک لگا کر) میں نے لکھ دیا ہے کہ میں تمہاری خوشی سے تمہیں چھوڑ رہا ہوں ——— اپنا کاغذ اٹھا لو. تم آزاد ہو.

نسرین :۔ شکریہ! ——— میں جرمنی کو عمر بھر دعائیں دوں گی. وہاں جانے سے کم از کم ایک فائدہ تو ہوا کہ آپ نے عورت کی مرضی کا احترام

(گویا وہ نچلے ہونٹ کاٹتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ (سنجیدگی کے ساتھ) نسرین بیگم، اب ہمارے تمہارے درمیان سے کانٹوں کی وہ باڑھ ہٹ چکی ہے — اس لیے ذاتیات پر گفتگو مناسب نہیں۔ (پائپ کا ایک طویل کش لے کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ جو فیصلہ میں خود کرنا چاہتا تھا اور اپنی قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تم نے کر دیا۔ میں اس وقت خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں جیسے میرے لیے پہاڑ کی چوٹی پر سے گرنے کی مسلسل کیفیت آج ختم ہو گئی۔

نسرین :۔ (ایک دوپٹہ جھٹک کر تہہ کرتے ہوئے) یہ فیصلہ آپ کب سے کرنا چاہتے تھے؟

ڈاکٹر نور :۔ (اطمینان کے ساتھ) شادی کے تھوڑے دنوں بعد سے — تم سمجھتی تھیں کہ میں تمہاری نفرت کو پہچانتا نہ تھا۔ میں جب کبھی تمہارے قریب آیا تو تم اپنی جھلاہٹ چھپائی لیکن تم نے ہمیشہ مجھے جھڑکیاں دیں — میں بچہ تو نہ تھا۔

نسرین :۔ (زور سے سوٹ کیس کا ڈھکنا گرا کر) میں بھی بچہ نہ تھی — آپ جب اپنے کاموں سے تھک کر چور ہو جاتے تو مجھے یوں سمجھتے جیسے میں ایسپرو کی ایک ٹکیہ ہوں۔ محض اعصاب کو سکون بخشنے والی — کتنا خوفناک تصور ہے یہ ایسپرو کی ایک ٹکیہ ہونا۔

(کپڑے چھوڑ کر اپنا چہرہ گھٹنوں اور بانہوں کے حلقے میں چھپا لیتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ (بے حد شائستگی سے) نسرین بیگم اب مجھے ان باتوں سے دلچسپی نہیں — لوگ اپنے پیاروں کے مردے اکھاڑ کر ان پر ایک نظر ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتے — پھر یہ تو نفرت کے جنازے ہیں — بس میں تمہارا ممنون ہوں۔ تمہارے مہر کے روپے

نسرین :۔ مجھے مہر کے روپے نہیں چاہئیں۔ آپ میری چار سالہ اذیت کی قیمت دیں گے؟

ڈاکٹر نور :۔ تم پھر سمجھ کر نہ دو۔ تمہیں ویسے بھی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ ——

نسرین :۔ (بات کاٹ کر اونچی آواز سے) کیونکہ میرا کوئی قریبی عزیز زندہ نہیں — میں شادی سے پہلے بھی تو اپنوں کے بغیر زندہ تھی — شادی کے بعد بھی اپنوں کے بغیر زندہ رہی ——

ڈاکٹر نور :۔ (چائے کا آخری گھونٹ اتار کر) میں نے ویسے ہی کہا — (چونک کر) ارے تم نے آج شام کی چائے تو پی نہیں — بنا دوں؟

نسرین :۔ شکریہ رہنے دیجئے — مجھے ابھی بہت سی چیزیں باندھنا ہیں — دیکھئے اپنی خالہ جان سے کہہ کر میرے جہیز کے برتن یہاں منگوا دیجئے۔

ڈاکٹر نور :۔ (پیالی میں شکر گھولتے ہوئے) اچھا میں ابھی کہہ دوں گا۔ (نسرین کو چائے دیتے ہیں)

نسرین :۔ دیکھئے وہ آپ کے غسل خانے میں جو مرادآبادی لوٹا اور صابن دانی ہے نا وہ بھی — (چائے کا گھونٹ بھرتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ وہ — اس کا کیا کروں؟ (حیرانی سے نسرین کو دیکھتے ہیں)

نسرین :۔ وہ بھی میرے جہیز کی چیزیں ہیں نا

ڈاکٹر نور :۔ (مستعدی سے) اچھا۔ اچھا۔ میں لئے آتا ہوں (جاتے ہیں)

(اس دوران میں نسرین ہاتھ میں پیالی اٹھا کر چائے کے گھونٹ بھرتی ہے اور کمرے میں ادھر ادھر گھوم کر دیکھتی ہے ——— میز پر سے کچھ کتابیں اٹھا کر اپنے پلنگ پر پھینکتی ہے۔ چائے کی پیالی رکھ کر لکھنے والی میز پر کتابیں سلیقے سے جما دیتی ہے ——— خالہ جب بستر پر بیٹھی تھیں، اس کا تکیہ جھٹک کر دوبارہ رکھتی ہے اور بستر کی سلوٹیں مٹاتی ہے۔)

نسرین :- (بڑبڑاتی ہے) جب بستر پر بیٹھتی ہیں چادر لپیٹ لیتی ہیں اپنے غرارے میں۔ بیٹھنے تک کی تمیز نہیں۔

(ڈاکٹر نور ایک ہاتھ میں لوٹا دوسرے ہاتھ میں صابن دانی اور منہ میں پائپ دبائے اندر آتے ہیں۔ نسرین چونکتی ہے اور پھر پیشینی انداز سے یہ چیزیں ان کے ہاتھ سے لے کر اپنے سوٹ کیس کے قریب رکھ دیتی ہے)

(ڈاکٹر نور بغل سے فریم کی ہوئی ایک تصویر نکال کر نسرین کی طرف بڑھاتے ہیں ——)

نسرین :- (ایک قدم پیچھے ہٹ کر) ارے۔ یہ میری تصویر! (بے دردی سے اپنے پلنگ پر پھینکتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (گھبرا کر) ارے! ٹوٹ نہ جائے۔ (تصویر اٹھا کر دیکھتے ہیں) اچھی تصویر ہے۔ میں ابھی اپنے کمرے میں گیا تو یہ نظر آ گئی میں نے کہا رہ نہ جائے یہاں۔ بڑی اچھی تصویر ہے۔ کب کھنچوائی تم نے؟

نسرین :- (بے پروائی سے) اب دیکھی آپ نے، چار سال سے رکھی ہے آپ کے کمرے میں۔

ڈاکٹر نور :- اچھا۔ خوب۔ میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔ (تصویر کو غور سے دیکھ کر) اس میں تم بہت سیدھی سی لگتی ہو۔

نسرین :- (مجروح انداز سے) ویسے تو میں بہت ٹیڑھی ہوں نا! خیر۔ (تصویر ڈاکٹر نور کے ہاتھ سے لے کر بے پروائی سے مینٹل پیس پر رکھ دیتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (تصویر اٹھا کر) لو ابھی رکھ لو۔ پھر بھول جاؤ گی۔

(نسرین تصویر سوٹ کیس میں پھینک دیتی ہے اور پھر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب جاتی ہے۔ درازیں کھول کھول کر الم غلم چیزیں نکال کر ڈھیر کر دیتی ہے ——— پھر گلدان سے پھول نکال کر ڈال دیتی ہے اور گلدان اٹھا کر سوٹ کیس میں رکھ دیتی ہے۔ دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف جھپٹتی ہے اور کچھ نہ پا کر لوٹ آتی ہے)

نسرین :- میرے برتن!

ڈاکٹر نور :- میں ابھی خالہ جان سے کہہ دوں گا۔

(ڈاکٹر نور میز پر سے گلاس لے کر فرش پر گرے ہوئے پھول اٹھا کر اس میں لگا دیتے ہیں اور اسے ڈریسنگ ٹیبل پر سجا دیتے ہیں)

نسرین :- (الماری کی طرف جا کر) یہ دیکھ لیجیے۔ آپ کی سب چیزیں جوں کی توں ہیں

ڈاکٹر نور :- (دو ایک ساڑھیاں اٹھا کر حیرت سے) یہ ساڑھیاں۔ یہ میری ہیں؟

نسرین :- (بے پروائی کے ساتھ) آپ کی دلائی ہوئی ہیں نا

ڈاکٹر نور :- تو میں پہنوں گا انہیں ——— (ہنستے ہیں)

نسرین :۔ (بحال کر) خالہ جان سے اس سلسلے میں مشورہ لیجیے گا۔ ان کے اپنے گھرانے کی کوئی لڑکی ہو جو شوق سے سرِ شام گھر کی بتیاں جلاتی پھرے گی ——

ڈاکٹر نور :۔ (سنجیدہ ہو کر) ہاں —— اچھا۔ تمہارا مطلب ہے دوسری شادی۔ وہ تو سوچوں گا۔ دراصل مسرت کی تلاش انسان کی قسمت میں ازل سے لکھی ہے۔

(نسرین توجہ نہ دیتے ہوئے الماری میں سے اپنے ڈبے ڈبیاں نکالتی ہے۔ اس میں زیور کے ڈبے بھی ہیں۔ وہ ڈبے کھول کر دیکھنے لگتی ہے)

نسرین :۔ یہ آپ کا دیا ہوا بروچ۔ اور یہ منگنی کی انگوٹھی۔ (یہ دونوں چیزیں اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دیتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ (بروچ اٹھا کر) بروچ۔ کیسا بروچ؟

نسرین :۔ آپ نے دیا تھا مجھے

ڈاکٹر نور :۔ میں نے؟ کب دیا تھا؟

نسرین :۔ ایک بار جب ہم نمائش کی طرف جا نکلے تھے وہاں خریدا تھا آپ نے اور میرے کرتے پر لگا دیا تھا۔ اسی دن تو آپ نے شادی کے لیے کہا تھا۔ بھول گئے۔

ڈاکٹر نور :۔ (بروچ ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال کر) ہوں —— نہیں تو

نسرین (ڈبے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بہت سرسری طریقے پر) ہماری طرف سے منگنی پر جو انگوٹھی آپ کو دی گئی تھی۔ وہ کہاں ہے

ڈاکٹر نور :۔ وہ —— وہ یہ ہے (انگلی میں انگوٹھی دیکھتے ہیں)

نسرین :۔ تو لائیے

(ڈاکٹر نور انگوٹھی اتار کر دے دیتے ہیں۔ اور پھر الماری کے قریب جا کر نچلے خانے سے نسرین کی سنہری سینڈلیں اٹھا لاتے ہیں)

ڈاکٹر نور :۔ (سادگی کے ساتھ) یہ بھول جا رہی ہو۔ پھر چیزیں لینے کے لیے چکر لگاؤ گی۔

نسرین :۔ نہیں آٹھ سو میل سے سینڈلیں لینے آنا تو مشکل ہے۔

ڈاکٹر نور :۔ (فکر مند ہو کر) آٹھ سو میل —— گویا تم کراچی جا رہی ہو۔ وہاں جا کر کیا کرو گی۔ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ وہاں کی آب و ہوا تمہارے لیے مناسب نہیں ہو گی۔

نسرین :۔ (سوٹ کیس دبا کر بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) آب و ہوا ہی تو سب کچھ نہیں وہاں کام کروں گی۔

نسرین :۔ ہٹو —— سوٹ کیس تم سے بند نہیں ہو گا سب چیزیں بے تکے پن سے ٹھونس دی ہیں۔
(زور لگا کر سوٹ کیس بند کر دیتے ہیں)

نسرین :۔ پھر وہاں عرفان ہے

ڈاکٹر نور :۔ عرفان؟ ان حضرات سے اور تمہارے وہاں جانے سے کیا تعلق ہے۔

نسرین :۔ فی الحال تو کوئی نہیں ہے، مگر دیکھیے نا مسرت کی تلاش تو انسان کے نصیب میں ازل سے ہی لکھی ہے۔ عرفان بے چارہ! کالج کے زمانے میں میں اس کا نوٹس تک نہ لیتی تھی۔

ڈاکٹر نور :۔ ہاں وہ میرا شاگرد رہا ہے۔ کافی ڈل (dull) لڑکا تھا۔

نسرین :۔ [illegible] ڈل کبھی بھی نہیں۔ ایسے پیار سے مجھے دیکھتا تھا۔ بھلا ڈل آدمی یوں کسی کو دیکھ سکتا ہے؟

ڈاکٹر نور :۔ خیر تمہارا خیال ہے — مگر کراچی کی آب و ہوا۔

نسرین :۔ (ہاتھ جھٹک کر) جی آب و ہوا کو کیا ہے — پھر اختر بھی کراچی میں رہنا چاہتا ہے

ڈاکٹر نور :۔ (فکر مند ہو کر) تمہیں یقین ہے کہ ——

نسرین :۔ (بات کاٹ کر) میں پکی بات نہیں کہہ سکتی۔ اختر میرا کچھ نہ کچھ خیال ضرور رکھتا ہے۔ دیکھئے نا یہاں وہی تھا جو میری دکھ بھری زندگی پر کڑھتا تھا۔

(ڈاکٹر نور پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹہلتے ہیں۔ نسرین اٹھ کر ایک اور سوٹ کیس پلنگ کے نیچے سے گھسیٹ کر نکالتی ہے۔ اور کتابیں اور بقایا چیزیں اس میں بھرنے لگتی ہے۔)

نسرین :۔ (ڈاکٹر نور کی طرف دیکھے بغیر) خدا جانے میرے برتن کب آ چکیں گے — گاڑی کا وقت ہوا جا رہا ہے (کلائی کی گھڑی دیکھتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ میں خالہ جان سے کہنا بھول گیا — کوئی بات نہیں گر رہ گئے تو ——

نسرین :۔ (بگڑ کر) خوب۔ رہ گئے تو کوئی بات نہیں میں کہاں کی قارون ہوں جو فوراً برتن خرید کر جمع کر لوں گی۔ مجھے بھی تو کھانا پکانا ہے

ڈاکٹر نور :۔ (نرمی سے) ارے میں تمہارے برتنوں پر قبضہ تھوڑا جمانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ خالہ جان کو معلوم ہوا تو آکر خواہ مخواہ باتیں بنائیں گی

نسرین :۔ یہ سب تو معلوم ہونے کے لیے ہی ہے — وہ تو بڑی خوش ہوں گی — ان کے اپنے گھرانے میں لڑکیوں کا کافی اسٹاک ہے نا — پھر ان کی اپنی بیٹی زینب بھی تو ہیں۔ آپ کا انہیں خیال بھی بہت ہے۔ بیچاری ہر خط میں آپ کے لیے فکر مندی کا اظہار کرتی ہے۔

ڈاکٹر نور :۔ (بے دھیانی سے) ہاں بہت محبت دار لڑکی ہے — بے چاری بدنصیب ہے بیوہ ہو گئی۔

نسرین :۔ (منہ بنا کر) یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اب نصیبہ کھل جائیگا زینب بی کا۔

ڈاکٹر نور :۔ (اسی بے دھیانی سے) شاید — شاید

(نسرین مسہری پر چڑھ کر اپنا بستر لپیٹنے کی کوشش کرتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ (اس کی طرف جھپٹ کر) ارے کیا کرتی ہو کہیں جھٹکا ونکا آ جائے گا — ٹھہرو میں باندھتا ہوں۔ (گھٹنو
سے خوب دبا کر بستر لپیٹتے ہیں) دیکھو رسی ہے کہیں؟

نسرین :۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) رسّی کہاں ہے یہاں —— آپ اپنا ہولڈال دے دیجئے۔ میں واپس بھجوا دوں گی (دوسرے بستر پر سے بھی تکیہ اٹھا کر پھینکتی ہے) یہ تکیہ بھی میرا ہے

ڈاکٹر نور :۔ (بستر چھوڑ کر) شوق سے۔ (تکیہ ہاتھ میں اٹھا کر) یہ تکیہ تو میرا ہے ؟

نسرین :۔ (بگڑ کر) تو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ یہ دو تکیے میرے جہیز کے بستر میں آئے تھے۔

ڈاکٹر نور :۔ اچھا رکھ دو یہ بھی ——

(نسرین مسہری کے نیچے سے ہولڈال نکال کر فرش پر بچھاتی ہے۔ ڈاکٹر نور سلیقے کے ساتھ بستر اس میں جماتے ہیں۔ نسرین تھکن سے کمر پکڑ کر جمائی لیتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ (شفقت سے) لمبا سفر ہے جاؤ دو منٹ لیٹ ر ——

(نسرین تھکن سے جمائیاں لیتی بستر کی طرف جاتی ہے اور لیٹ جاتی ہے۔ تکیہ نہ پا کر اٹھ بیٹھتی ہے)

نسرین :۔ ذرا اپنا والا تکیہ دیجئے گا۔

ڈاکٹر نور :۔ پھر بستر میں باندھنے سے رہ جائے گا۔

نسرین :۔ آپ پارسل کر دیجئے گا۔ ویسے بھی آپ کا تکیہ بنتے بنتے کچھ وقت لگے گا اور آپ کو سخت تکیہ رکھنے کی اب عادت نہیں رہی۔

(ڈاکٹر نور تکیہ نکال کر نسرین کی طرف اچھال دیتے ہیں۔ نسرین ایک منٹ کو آنکھیں بند کر کے چپ چاپ پڑی رہتی ہے —— پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

نسرین :۔ میں نے کپڑے تو بدلے ہی نہیں —— میں کپڑے بدل لوں (اٹھ کر ایک گہری نیلی ساڑھی اٹھا کر دوسرے دروازے کی طرف بڑھتی ہے)

نسرین :۔ (ایک دم پلٹ کر ڈاکٹر نور کو دیکھتے ہوئے) ارے ——

ڈاکٹر نور :۔ کیا ہوا!

نسرین :۔ میں نہیں چھوڑ سکتی۔

ڈاکٹر نور :۔ (پریشان ہو کر) کسے نہیں چھوڑ سکتیں —— اب تو

نسرین :۔ میرے جہیز کے نیلے کُشن —— جو آپ کے کمرے میں پڑے ہیں۔ وہ مجھے بے انتہا پسند ہیں۔

ڈاکٹر نور :۔ اچھا کُشن ؟ واقعی بہت آرام دہ کُشن ہیں۔ میں پڑھتے ہوئے انہیں سر کے نیچے رکھا کرتا تھا۔ (مستعدی سے) میں ابھی لاتا ہوں۔ (بستر چھوڑ کر) اٹھتے ہیں اور بانہیں جھٹکتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں)

(نسرین آہستہ آہستہ دائیں ہاتھ کے دروازے میں چلی جاتی ہے —— اختر اندر آتا ہے سامان بندھا دیکھ کر چونکتا ہے)

اختر :۔ ارے بھابی کہاں ہیں بھئی !

نسرین :- (ضد سے) آتی ہوں اختر میاں

اختر :- اچھا —— بھائی صاحب کو خوشی مل ہی گئی آپ کے ساتھ پکچر جانے کی —— مان گیا آپ کو طاقتوں کو کیسے راضی کر لیا انھیں؟

(نسرین چلی ساری پہننے سنجیدگی سے اٹھ جاتی ہے)

اختر :- کتنے دن کا پروگرام ہے؟ آپ کے بغیر گھر بھائیں گا۔ خیر آپ کو کیا۔ (اداس ہونے کی کوشش کرتا ہے) کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟

نسرین :- (نسرین ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر ساری درست کرتے ہوئے) میں اکیلی کراچی جا رہی ہوں۔

اختر :- اکیلی۔ (آنکھیں پھاڑ کر) بھائی صاحب کے بغیر آپ کا ایک قدم تو اٹھتا نہیں۔ خواہ مخواہ بنائیے مت مجھے

نسرین :- (خلا میں تکتے ہوئے) بھئی جانے کا کیا سوال ہے —— سلسلہ ختم ہو گیا۔ میں تمھارے بھائی سے الگ ہو گئی ہوں

اختر :- (حیرانی سے اچھل کر) ارے۔ سچ؟ تو آپ نے —— میرا مطلب یہ ہے اس دقیق کتاب سے آپ کا ناتا ٹوٹ گیا۔
(پریشان ہو کر ہنستا ہے)

نسرین :- (گھور کر) اختر —— تم نے پھر انھیں کتاب کہا؟ میں نے تمھیں کتنی دفعہ منع کیا ہے۔؟

اختر :- بھابی —— آپ بھی آپ؟ —— (ہنستا ہے)

نسرین :- (بات کاٹ کر) تم خوش کیوں ہو رہے ہو؟ —— (غور سے اسے دیکھتی ہے)

اختر :- (اشتیاق سے اسے دیکھتے ہوئے) آپ کو کبھی احساس نہیں ہوا

نسرین :- (بے رخی سے) کس بات کا؟

اختر :- کہ میں اس انجام پر اپنی خوشی نہیں دبا سکتا —— میں کل ہی اپنی جائداد کا منظور شدہ کلیم فروخت کر دوں گا۔
(خوابناک نظروں سے دور تکتے ہوئے) میرے پاس زندگی کے کتنے بہت سے پروگرام ہیں۔ (نسرین کے پاس آ کر)
کیا آپ؟ آپ؟

نسرین :- (بات کاٹ کر) کیا تم مجھے ایک تانگہ منگوا دو گے —— ؟ (بڑی کوشش سے ایک سوٹ کیس اٹھا کر دوسرے سوٹ کیس پر رکھتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (اندر آتے ہیں) سردی میں تانگے پر جانا ٹھیک نہیں۔ موٹر میں چلی جانا (اختر کو دیکھ کر ٹھٹھکتے ہیں اور اسے سخت نظروں سے دیکھتے ہیں) نوکر سے کہو کہ بیگم صاحب کا کھانا ٹفن کیرئیر میں پہنچا دے اختر سے؛ یہاں کھڑے ہو اتنا خیال نہیں کہ یہ شب بھر کی سفر کریں گی
(اختر خوف زدہ ہو کر چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نور کشن بستر پر جا کر نڈھال بیٹھتے ہیں۔ نسرین الماری کے پاس جا کر اپنی باقی ماندہ ساریاں نکالتی ہے اور پھر دوسرے خانوں میں کپڑے الٹتی پلٹتی ہے۔)

نسرین :- (زور سے) آپ کی سب پندرہ قمیصیں ہیں۔ یاد رکھیے گا۔ یہ دھوبی قمیصیں بہت کم کر دیتا ہے خالہ جان کے گھرانے میں پڑھنے لکھنے کا رواج تو ہے ہی نہیں۔ آئندہ آپ ہی اپنے کپڑے لکھ لیا کیجیے گا۔

ڈاکٹر نور: ہاں ہاں — اچھی بات ہے۔

نسرین: ([illegible]) اور یہ آپ کی ساریاں۔ میرا مطلب ہے آپ کی خریدی ہوئی ساریاں۔ زینب بیگم کو تو میں نے خوب دیکھا ہے۔ ذرا تمیز نہیں کپڑے پہننے کی۔

ڈاکٹر نور: ہاں ——— زینب بیگم سیدھی ہوئی ہے بے چاری بالکل دھیان نہیں دیتی ان باتوں کی طرف۔

نسرین: (منہ بنا کر) سیدھی اور تمیز سے کیا تعلق — انہیں تو کسی بات کی تمیز نہیں۔ ایک دن دیکھا ڈریسنگ ٹیبل پر چڑھی بیٹھی کنگھی کر رہی تھیں — انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ سامنے اسٹول پر بیٹھتے ہیں۔

ڈاکٹر نور: اچھا — واقعی — بتا دوں گا۔ (اٹھ کر الماری کے پلّے بند کر کے) تم تیار ہو۔ ارے تم نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا!

(نسرین کوئی جواب نہیں دیتی۔ آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب جاتی ہے)

نسرین: (طنز سے) اب تو کھڑکیاں بند رہا کریں گی جو کچھ سوچ کر مگر آپ سونے سے پہلے کھڑکی کھول لیا کیجیے گا — ایک دن کھڑکی بند رہ گئی تھی تو یاد ہے کیا ہوا تھا! اختلاج ہو گیا تھا آپ کو

ڈاکٹر نور: اچھا۔ (تولیا اٹھا کر سوٹ کیس پر رکھ دیتے ہیں) میں خیال رکھوں گا۔ کھانا نہیں آیا۔

نسرین: میرے خیال میں تو آپ شادی وادی نہ کیجیے گا۔ خواہ مخواہ آپ کو یہ سلسلہ سوٹ نہیں کرے گا — پھر زینب تو مجھے ذرا پسند نہیں — کوئی پڑھی لکھی عورت ہونا چاہیے

(نوکر کھانے کی ٹرے لیے آتا ہے اور رکھ کر لوٹ جاتا ہے)

ڈاکٹر نور: اچھا یہ تو میرے ذاتی معاملات ہیں۔ میں غور کروں گا — اب تم کھانا کھاؤ — اور ہاں میں کراچی تار دے دوں۔ عرفان کہ یا اختر تمہارے ساتھ جائے گا؟

نسرین: (چونک کر) اختر — ؟ عرفان؟ — میں خود سوچوں گی۔ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر نور: ہاں ہاں — ویسے مجھے عرفان بھی کچھ زیادہ پسند نہیں۔ اور اختر تو قطعی نالائق ہے — ویسے یہ تو تمہارے سوچنے کا معاملہ ہے!

نسرین: (دکھے ہوئے انداز سے) اور کیا۔ قطعی میرا معاملہ۔ میں خود سوچوں گی (ایک دم سر جھکا کر آنسو پونچھتی ہے) میرے لیے کون سوچنے والا بیٹھا ہے اس دنیا میں؟ آپا جان ہوتے تو ———

ڈاکٹر نور: (گھبرا کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے) نہیں، نہیں رو مت۔ میں — میں تو۔ تم ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کر لیا کرنا۔

نسرین: (ہٹ کر) آپ میرے کون ہیں جو میں مشورے کروں؟

ڈاکٹر نور: (بے تحاشہ گھبرا کر) میں تو — میں — اخیر میں اپنی رائے تم پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ تم جو چاہو وہی ٹھیک ہے — پھر اب کھانا کھاؤ جلدی سے، ٹرین کا وقت ہو رہا ہے۔

نسرین :۔ (تیز ہو کر پاؤں پٹختے ہوئے) مجھے بھوک نہیں — حرام ہے مجھ پر یہاں کا کھانا۔
(آنسو پونچھتی ہے)

ڈاکٹر نور :۔ (دروازے کے پاس جاکر) اختر — اختر۔
(اختر پریشان سا اندر آتا ہے)

ڈاکٹر نور :۔ (خشک لیکن تحکمانہ انداز سے) اختر؟

اختر :۔ (ہکلا کر) جی۔

ڈاکٹر نور :۔ دیکھو تم نسرین کے ساتھ کراچی تک جاؤ۔ اگر نسرین کراچی جاکر کہے کہ تم واپس جاؤ۔ تو فوراً واپس آجاؤ۔ (انگلی کے اشارے سے زور دیکر) اور اگر نہ کہے تو وہیں رک جانا۔ اور اس کا خیال رکھنا سمجھ گئے؟

اختر :۔ (ہکلا کر) بھائی صاحب،

ڈاکٹر نور :۔ (حتمی انداز سے) میں خالہ جان کو سمجھا دوں گا۔ نسرین اکیلی نہیں جائے گی — جاؤ گیرج سے موٹر نکالو۔

اختر :۔ بھائی صاحب

ڈاکٹر نور :۔ جاؤ۔

(اختر چلا جاتا ہے۔ نسرین کھڑی رہتی ہے۔ ڈاکٹر نور اس کے پاس آکر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھتے ہیں اور پلنگ پر سے اس کا کوٹ اٹھا لیتے ہیں)

ڈاکٹر نور :۔ لو کوٹ پہن لو۔ (نسرین حرکت نہیں کرتی تو وہ کوٹ اس کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں)

ڈاکٹر نور :۔ (اسے تھپک کر) روؤ نہیں ہو۔ تمہیں کسی قسم کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ روپے میں ہر ماہ بھیجتا رہوں گا۔

نسرین :۔ جہنم میں جائیں روپے۔ بڑے آئے بھیجنے والے۔ (ایکدم رک کر) اتنا تو نہ نکالو بروچ اپنے پاس رہنے دو — آپ کو معلوم ہے کہ یہ بروچ مجھے کتنا پسند ہے
(منہ پر [illegible] رکھ کر روتے ہوئے) بڑے آئے سخی داتا — اب وہ زینب اگر اس کا ستیاناس کرے گی — خدا جانے بالوں میں لگائے گی کہ کان میں پہنے گی۔

ڈاکٹر نور :۔ (غصے سے بڑبڑاتے ہوئے) لاحول ولا — خود ہی تو پھینک دیا بروچ۔ (بروچ اٹھا لیتے ہیں)
(نرم پڑ کر) دیکھو ایک بات کہوں۔ آئندہ زندگی میں اس چڑچڑے پن کو چھوڑ دینا۔ دوسروں کو ہمیشہ بدنیت نہ سمجھا کرو۔ (بروچ اس کے کوٹ پر لگا دیتے ہیں)

(نیچے سے موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ نسرین چیل کی طرح جھپٹا مار کر اپنا چھوٹا سوٹ کیس اٹھا لیتی ہے اور بوجھ کے مارے لڑکھڑاتی دروازے سے نکل جاتی ہے۔ ڈاکٹر نور اس کے پیچھے بڑا سوٹ کیس اور بستر اٹھا کر چلتے ہیں۔ اسٹیج خالی رہ جاتا ہے — چند لمحوں بعد نسرین اپنا سوٹ کیس اٹھائے بمشکل اندر آتی ہے اور اسے پٹک کر خالی مسہری پر گر کر زور زور سے سسکنے لگتی ہے — اس کے چند لمحوں بعد ڈاکٹر نور خالی ہاتھ واپس آتے ہیں اور حیران کھڑے رہ جاتے ہیں)

ڈاکٹر نور ۔۔ میں سمجھا تم لوٹا لینے آئی ہو ——— کیا ہوا بھئی؟

نسرین ۔۔ (معصومیت سے ڈاکٹر نور کی طرف دیکھ کر سسکیاں لیتے ہوئے) اتنا بدتہذیب ہے اختر ——— دیکھ رہا ہے کہ میں اتنا بڑا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے ہوں۔ یہ نہیں کہ دوڑ کے آ کر میرے ہاتھ سے لے لے۔ بدتمیز کہیں کا۔

ڈاکٹر نور ۔۔ اچھا۔ میں اسے ڈانٹتا ہوں ——— تم چلو بیٹھو۔

نسرین ۔۔ (اسی طرح) کیا فائدہ ——— ہے نا زینب کا سگا بھائی۔ ذرا تہذیب نہیں۔ میرا جی چاہا اسے تھپڑ لگاؤں۔ بدتمیز کہیں کا یہی تربیت ہے تمہاری خالہ جان کی۔ میں ایک منٹ کے لیے ایسے بدتہذیبوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی ——— (اٹھ جاتی ہے)

ڈاکٹر نور ۔۔ چلو تم اس کے ساتھ نہ جاؤ۔ اکیلی چلی جاؤ۔ (سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں)

نسرین ۔۔ (اور زور سے روتے ہوئے) اکیلی؟ اتنے دن ہو گئے باہر گئے۔ اور اب اکیلی جاؤں (سر گھٹنوں پر رکھ کر) آپ کو میرے لیے فرصت کہاں۔

ڈاکٹر نور گھبرا کر اس کے قریب مسہری پر بیٹھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور نسرین ان کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگتی ہے۔ خالہ جان کی آواز باہر سے آتی ہے)

خالہ جان ۔۔ اے میں نے کہا وہ انڈوں کا سالن تیار ہے ——— (اندر آ کر پیچھے ہٹتے ہوئے) اللہ توبہ کھڑکی پاٹوں پاٹ کھلی ہے۔

(ایک دم پردہ گر جاتا ہے)

سامع

کنہیا لال کپور

جس دن سے وہ ایک کم نام جزیرے کی سیاحت سے واپس آیا تھا۔ بہت اُداس رہتا تھا۔ یہ بات تو نہیں تھی کہ اُسے اُس جزیرے کی یاد رہ رہ کر آتی تھی۔ کیونکہ وہ جزیرہ اس قابل ہی کب تھا کہ اس کی زیارت دوبارہ کی جائے۔ کوئی بڑا فضول سا جزیرہ تھا "کانا باناکاٹا" اور واقع تھا وہ بحرالکاہل میں۔ وہ ایک کلچرل وفد کے ساتھ اس جزیرے میں گیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ اُس جزیرے میں رہنے والوں کے طور طریقے عجیب و غریب تھے۔ مثال کے طور پر وہ چائے یا کافی کی بجائے سونف کا عرق پیتے تھے۔ مصافحہ کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے کان اینٹھتے تھے۔ کوٹ کے اوپر قمیض پہنتے تھے۔ ناچتے وقت روتے اور عبادت کرتے وقت زور زور سے ہنستے تھے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنہیں دلچسپ کہا جا سکتا ہے اور جنہیں سننے کے لیے لوگوں کو بیتاب ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جب بھی اُس نے "کانا باناکاٹا" کا ذکر کسی مجلس میں کیا۔ اُسے سخت مایوسی ہوئی۔ اوّل تو "کانا باناکاٹا" کا نام سن کر ہی سامعین قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ نہیں تو کسی نے ذرا چمک کر کہا "ہٹاؤ یار اس کو اس کو تم وہاں کیا گئے ایک دم BORE بور بن کر لوٹے جب دیکھو کانا باناکاٹا۔ کوئی کام کی بات کرو"

کئی بار اُس نے موقع محل سمجھ کر کانا باناکاٹا کا ذکر چھیڑا۔ لیکن لوگوں نے تو جیسے اس میں دلچسپی لینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ایک دفعہ چند شاعروں کے درمیان بیٹھے ہوئے اُس نے کہا "آپ شاید نہیں جانتے کہ کانا باناکاٹا میں تمام شاعر نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ اور وہ بھی چند گنے چنے موضوعات پر مثلاً گیدڑ، کھٹمل، چمگادڑ۔ سب سے بڑا شاعر اُس شخص کو سمجھا جاتا ہے جس نے گیدڑ پر سب سے زیادہ نظمیں لکھی ہوں۔ میں آپ کو گوگولاگولا کی ایک نظم سناتا ہوں۔ گیدڑ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

—— اے گیدڑ۔ اگر تجھے شب بھر نیند نہیں آتی۔ تو تو مارفیا کا ٹیکہ کیوں نہیں لگا لیتا۔ اے گیدڑ۔ اتنے زور سے مت
چلّا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا اڑا سا پھیپھڑا پھٹ جائے
اور اے گیدڑ ——"

اور کسی شاعر نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ "خدا کے لیے رحم کرو ہمارے حال پر۔ کیوں بور کرنے پر تُلے ہو" اور اُس کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی تھی۔ کہ گیدڑ والی ساری نظم وہ شاعروں کو سنا نہ سکا۔

اسی طرح ایک دفعہ اُس نے وکیلوں کی ایک محفل میں کہا "آپ شاید نہیں جانتے۔ کہ کانا باناکاٹا میں وکیل کو "ماپا" کہا جاتا ہے

جس کے معنی ہیں " دلچسپ مجرم شہادت دینے والا " اور جج کو " گوپا " کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے غلط فیصلہ کرنے والا " اور گواہ کو کہتے ہیں " بابا " جس کے معنی . . . . . . "

اس پر ایک وکیل نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا " اور آپ کو " بابا " کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے فضول بکواس کرنے والا "

اُس دن کے بعد اُس نے معمول بنا لیا تھا کہ کسی مجلس میں کانا باٹا کا ذکر نہیں کرے گا۔ بلکہ اکیلے دکیلے آدمی کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایک دن سڑک پر چلتے ہوئے ایک فقیر نے اُس سے پیسے کا سوال کیا۔ اُس نے فقیر کی ہتھیلی پر ایک مکڑی کا سکہ جو وہ کانا باٹا سے لایا تھا۔ رکھتے ہوئے بولا۔

" جانتے ہو یہ کس ملک کا سکہ ہے "

" نہیں جانتا "

" کانا باٹا کا سکہ ہے۔ جانتے ہو یہ ملک کہاں واقع ہے "

" نہیں جانتا "

" بحرالکاہل میں۔ جاپان سے تین ہزار . . . . . "

" جی ہوگا۔ لیکن غریب پرور میں نے تو پیسے کا سوال کیا تھا "

ایک دوکاندار سے صابن خریدتے وقت اُس نے کہا " کانا باٹا میں صابن نہیں ہوتا۔ دراصل میں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ عام طور پر لوگ ایک سال کے بعد نہاتے ہیں۔ عجیب ملک ہے۔ وہاں دوکاندار کو " چمیوٹو " کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہوتے . . . . . . "

دوکاندار نے اُس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا " اچھا تو آپ کو کون سا صابن چاہیے "

ایک بار باغ میں سیر کرتے ہوئے اُس کی ملاقات ایک ضعیف آدمی سے ہوئی۔ اُس نے سوچا۔ موقعہ اچھا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا جائے۔ آداب بجا لانے کے بعد اُس نے کہا۔ " بڑے میاں آپ کی کیا عمر ہوگی "

" پینسٹھ سال "

" کانا باٹا میں کسی شخص کو ساٹھ سال کے بعد زندہ رہنے کی اجازت نہیں "

" کانا باٹا کیا بلا ہے "

" بلا نہیں صاحب۔ ایک بڑا عجیب جزیرہ ہے۔ بحرالکاہل میں جاپان سے . . . . "

" اچھا ہوگا "

" لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ وہاں ساٹھ سال کے بعد کسی کو زندہ . . . . . . "

" تو کیا اُسے پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا جاتا ہے "

" جی ہاں "

"وہ بڑا بے ہودہ ملک ہے"

"جی نہیں۔ بے ہودہ نہیں۔ دیکھئے نا۔ اس قانون کا یہ فائدہ ہے۔ کہ ...."

"ابھی رہنے دیجئے۔ بزرگوں کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک!"

"سُنیئے تو۔ آپ نے پوری بات تو سُنی نہیں"

"معاف کیجئے۔ میں ایسی فضول باتیں نہیں سُنا کرتا"

آخر جب یہ حربہ بھی کوئی خاص کامیاب نہ رہا۔ تو اُس نے ایک اور تدبیر سوچی۔ کانابانا کاٹا سے وہ اپنے ساتھ چند سنگتراشی کے نمونے لایا تھا۔ وہ اُس نے اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیئے۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ جب کوئی ملاقاتی اُس سے ملنے آئے گا۔ تو ضرور ان پر نظر دوڑانے کے بعد اُن سے متعلق سوال کریگا اور بات چل نکلے گی۔ لیکن اُس کے سب اندازے غلط ثابت ہوئے۔ اکثر ملاقاتیوں نے ان کی جانب دیکھا تک نہیں۔ ایک آدھ نے دیکھنے کے بعد فرض کر لیا کہ کسی کباڑی سے اونے پونے چند فضول مجسمے خرید لیے گئے ہیں۔ ایک دن اُس نے ایک ملاقاتی کی توجہ ایک مجسمے کی طرف مبذول کراتے ہوئے۔ "جانتے ہو۔ یہ کس کا مجسمہ ہے"

"کسی بندر کا معلوم ہوتا ہے"

"ارے نہیں بندر کا نہیں۔ یہ کانابانا کاٹا کے مشہور فلسفی "مومو کوکو" کا ہے"

"ہُنھ"

مومو کوکو بڑا پہنچا ہوا فلسفی تھا۔ اس کے خیال میں انسان کی سب سے بڑی کمزوری عورت نہیں۔ افیون ہے۔ خود "مومو کوکو" ہر روز تین سے چھ ماشے افیون کھایا کرتا تھا۔ ایک دن جب اُسے افیون نہ ملی۔ تو جانتے ہو اُس نے کیا کیا"

"شاید خودکشی کر لی"

"نہیں خودکشی نہیں کی۔ وہ ایک پوست کا پودا جڑ اور پتوں سمیت کھا گیا۔ لیکن جب اُسے ....."

"اچھا یار کوئی اور بات کرو۔ یہ کس کا ذکر لے بیٹھے"

اُسے سب سے زیادہ افسوس تب ہوتا تھا جب بات چل نکلنے کے بعد درمیان میں رُک جاتی تھی۔ مثلاً ایک۔ اتوار کو اُس کا ایک اخبار نویس دوست اُس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "آپ شاید نہیں جانتے۔ کہ کانابانا کاٹا میں لوگ اخبار پڑھنے کے لیے نہیں آگ جلانے کے لیے خریدتے ہیں"

"لیکن وہ اخبار پڑھتے کیوں نہیں"

"اُن کا خیال ہے کہ اخباروں میں سکینڈل کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا"

"یہ تو کوئی معقول دلیل نہیں"

اپنا اپنا خیال ہے۔ اور ہاں وہاں سب اخباروں کا نام ایک سا ہوتا ہے یعنی "رگڑ رگڑ" جس کے معنی ہوئے...."

"کچھ بھی ہوئے۔ کوئی کام کی بات کرو"

اور ایک دن تو اُس کے ساتھ ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ اُس کا ایک دوست جو پیرس سے تین سال کے بعد واپس آیا تھا۔ اُسے ملنے

سے پیسے کیا اُس نے سوچا کہ وہ ضرور کانا باناکاٹا کے کچھ حالات سننے پر رضامند ہو گا۔ اُس نے ابھی تمہید ہی باندھی تھی۔ کہ اُس کے دوست نے مسکرا کر کہا: "لیکن یار کیا بات ہے فرانس کی۔ بڑا دلچسپ ملک ہے۔ اور پیرس! پیرس زندہ دلوں کا شہر ہے۔ ہر رات شب برات کا درجہ رکھتی ہے۔ آرٹسٹ بڑے خوابی طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ گلیاں بڑی پُراسرار، ہوٹل دُلہنوں کی طرح سجائے جاتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں پر پرستان کا دھوکا ہوتا ہے۔ شہر میں اتنی صاف شفاف کہ ہاتھ لگے میلی ہو جائیں۔ سیاست داں معاملہ فہم اور نکتہ داں۔ شراب۔ آہ ظالم گویا شراب نہیں ایک تیز چھری ہے کہ اُترتی چلی جائے" وغیرہ وغیرہ

آخر دو گھنٹے کے بعد جب اُس کے دوست نے پیرس کا تذکرہ ختم کیا۔ تو اُس نے محسوس کیا۔ کہ ایسے شخص سے کانا باناکاٹا کا ذکر کرنا بے وجہ کی حماقت تھی۔

جب اُس کا ہر حربہ بیکار ثابت ہوا۔ تو وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ اُسے انسانوں سے وحشت سی ہونے لگی۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ انہیں اپنے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔ صرف روٹی کمانے کا دھندا ان کے دل و دماغ پر سوار ہے۔ کانا باناکاٹا کا ذکر نہ سن کر یہ اپنے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔ وہ جتنا ان باتوں کے متعلق سوچتا اُس کی اُداسی میں اُتنا ہی اضافہ ہوتا۔

ایک دن اُس نے اپنے کو ضرورت سے زیادہ اُداس پایا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر کی دکان کا رُخ کیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر کے پاس ایک مریض بیٹھا ہوا تھا جب وہ دوا لے کر رخصت ہوا۔ تو ڈاکٹر نے کہا: "فرمائیے۔ آپ کو کیا شکایت ہے؟"

"ہر وقت اُداس رہتا ہوں"

"وجہ؟"

"بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی"

"یہ شکایت کب سے ہے"

"جب سے کانا باناکاٹا سے لوٹا ہوں"

"کانا باناکاٹا۔ یہ کسی ملک کا نام ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ ایک جزیرہ ہے۔ بحرالکاہل میں"

"جاپان سے کتنا دور ہے"

"کوئی تین ہزار میل"

"آپ وہاں کس سلسلے میں تشریف لے گئے تھے"

"ایک کلچرل وفد کے ساتھ گیا تھا"

"آپ فن کار ہیں"

"مصور ہوں"

"تو خوب سیر کی"

"جی ہاں۔ ایک مہینہ رہا۔"

"تو کیا کیا دیکھا وہاں آپ نے"

"بہت کچھ۔ بڑا عجیب جزیرہ ہے"

"ہمیں بھی کچھ بتائیے"

"وہاں ڈاکٹر نہیں ہوتے"

"ڈاکٹر نہیں ہوتے۔ تو پھر تو لوگ بیمار پڑتے ہیں۔ وہ علاج کس سے کراتے ہیں"

"چونکہ انہیں معلوم ہے کہ علاج کرنے والا کوئی نہیں۔ اس لیے وہ بیمار ہی نہیں پڑتے"

"اچھا کوئی اور بات بتائیے"

"وہاں مکانوں کے دروازے نہیں ہوتے"

"تو لوگ اندر کس طرح آتے ہیں"

"کھڑکیاں جو ہوتی ہیں"

"اچھا اور کیا دیکھا"

"وہاں بچے کی پیدائش پر ماتم منایا جاتا ہے"

"وہ کیوں"

"وہ کہتے ہیں کہ ہر نیا کہ اپنے ساتھ نئی مصیبتیں لاتا ہے"

"بہت خوب۔ اچھا میں آپ کے لیے دوا تیار کر دوں۔ باقی باتیں۔۔۔"

"دوا جانے دیجئے۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔"

"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ ہر وقت اداس رہتے ہیں"

"جس شے کی کمی مجھے اداس رکھتی تھی۔ وہ مجھے مل گئی"

"وہ کون سی شے ہے"

سامع!"

ڈاکٹر اس کا منہ تکنے لگا۔ لیکن وہ چپکے سے آداب عرض ہے کہہ کر دوکان سے باہر چلا گیا۔

برائے وزن بیت

امجد حسین

میری طرح بے شمار لوگ ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شخصیت بھی سکتہ پذیر ہے اور اپنی شخصیت کا وزن درست رکھنے کے لئے وہ حسب ضرورت اور بقدر ہمت مختلف تدابیر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض حضرات کو یقین ہوتا ہے کہ جب تک وہ جلی قسم کی مونچھیں نہ بڑھائیں گے ان کی ہوائی شخصیت وزن سے خارج رہے گی۔ چنانچہ اپنی شخصیت کی اس ضرورت شعری کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی مونچھوں کی نوک پلک درست کرنے میں اس حد تک دلچسپی لیتے ہیں گویا یہی مونچھیں ان کا سرمایہ حیات ہیں اور ان کے اعمال کے ساتھ ساتھ اگر کوئی چیز ان تک جائے گی تو وہ یہی مونچھیں ہیں۔ وہ نہایت یکسوئی سے ان کی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں، انہیں سہلاتے ہیں، مکھن لگاتے ہیں، معطر کرتے ہیں، سربلند رکھتے ہیں ——— انہیں یہ خطرہ رہتا ہے کہ اگر ان کی مونچھوں کا ایک بال بھی ادھر سے ادھر ہو گیا یا میلا ہو گیا تو ان کا وزن قائم نہ رہے گا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں سکتہ پڑ جائے گا جو آسانی سے دور نہیں ہو سکے گا۔ جب میں کسی کی ترشی ترشائی قسم کی مونچھیں دیکھتا ہوں، تو فوراً مجھے خیال آتا ہے کہ اگر کوئی حضرت شرارت ہی سے ان کی مونچھیں مونڈ دے یا بال صفا پوڈر سے اڑا دے تو ان کی شخصیت کا وزن کیسے متزلزل ہو جائے۔ ایسے ہی جس طرح کوئی کسی گرتی شے کا محور نکال لے یا پٹ سے غبارے میں سوئی چبھو دے۔ مجھے اسمبلی کے اس رکن کا اعتراض کس قدر بجا معلوم ہوتا ہے جس نے ایک اجلاس میں شور مچایا تھا کہ ایوان میں ایک اجنبی بیٹھا ہے۔ صدر ایوان کے پوچھنے پر اس نے اس اجنبی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ہے اجنبی، اسے فوراً نکالا جائے۔ صدر ایوان نے معترض کو بٹھا دیا اور ڈانٹ دیا کہ وہ شخص فلاں رکن ہے اور آپ ایوان کا وقت ضائع نہ کریں۔ لیکن وہ رکن اپنے اعتراض پر مُصر رہا اور اس نے کہا کہ میں مان نہیں سکتا کہ یہ شخص وہ رکن ایوان ہے جس کا نام جناب صدر نے لیا ہے۔ گزشتہ اجلاس کے آخری روز اس رکن کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں لیکن اب وہ غائب ہیں ——— اور میں اس رکن کو بغیر مخصوص مونچھوں کے تصدیق نہیں کر سکتا۔ لہذا ایوان میں اجنبی ہے۔ بات ہنسی میں ٹل گئی لیکن ٹھیک تھی۔

بعض حضرات کو اپنی شخصیت کے سکتہ کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا اور وہ اسے دور کرنے کے جوش میں اپنی مونچھوں کے بالوں کو ضرورت سے زیادہ بڑھا دیتے ہیں جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نہ صرف مونچھوں کا اپنا وزن غیر حقیقی ہو جاتا ہے بلکہ ان کی تمام تر شخصیت بھی مروجہ بحر سے خارج نظر آتی ہے ——— یہی حال سر کے بالوں کا بھی ہے۔ بعض حضرات انہیں بڑھا کر طویل بحر رکھنے کے قائل ہوتے ہیں اور ان سے ان کی شخصیت کی معنویت کو دھچکا لگتا ہے اور اگر ان کے ساتھ چھوٹی بڑی مونچھیں اور داڑھی بھی ہو تو ان کا حلیہ آزاد نظم کا پہلا بند معلوم ہوتا ہے۔

کچھ لوگ آپ کے مشاہدے میں ایسے بھی آئے ہوں گے جنہیں اپنی شخصیت کو موزوں بنانے کے لیے اپنے حلیے کے چند ارکان گھٹانے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض حضرات اپنے سر کے بالوں کو حشو و زائد گردان کر حذف کر دیتے ہیں اور سارا سر گھٹا لیتے ہیں۔ واضح رہے کہ سر کے بالوں کو حذف کرنے اور سر کو گھٹانے میں تکرار نہیں ہے۔ میرے نزدیک ضروری نہیں کہ سر کے بالوں کو حذف کر دینے کا لازمی نتیجہ گھٹے ہوئے سر کی صورت میں نمودار ہو۔ میں بالوں کو حذف کرنے اور بالوں کے اڑ جانے میں بھی فرق کرتا ہوں کیونکہ بالوں کے اڑ جانے کا لازمی نتیجہ گھٹا ہوا سر ہی ہوتا ہے —— یہ فقط لفظی موشگافی نہیں۔ گنجے سر اور گھٹے ہوئے سر میں جو فرق ہے وہ نابینا بھی ہاتھ پھیر کے محسوس کر سکتا ہے۔ سر کو گھٹانا بھی مونچھوں کی پرورش کی طرح سراسر ارادی فعل ہے۔ سر کے بال حذف کر دینے سے بیشک سر پر یکسانیت تو آ جاتی ہے لیکن مکمل ہمواری پیدا نہیں ہوتی اور سر صحیح معنوں میں "فرسٹ کلاس" نہیں ہوتا۔ حشو و زائد کا نشان پورے طور پر ختم کرنے کے لیے عملِ ثانی کی ضرورت پیش آتی ہے جو مطلوبہ صفاچٹ کیفیت پیدا کرے۔ بس یہ سمجھئے کہ سر کے بالوں کا حذف کرنا سوشلزم کی مثال ہے اور گھٹا ہوا سر کمیونزم کی۔

میری بیوی مجھ سے محض اپنے جماعتی تعصب کی وجہ سے اتفاق نہیں کرتی ورنہ میں بات موزوں کہتا ہوں کہ میری جان! تمہاری یہ لپ سٹک، یہ غازہ، سرمئی بھنویں اور ان کا یہ غیر معمولی تناؤ گویا کہ میکس فیکٹر کی تمام کرامات جن سے کہ تم بدرجۂ اتم استفادہ کرتی ہو بجائے خود موزوں ہیں اور تم اپنی نسوانی شخصیت کا سکتہ دور کرتی ہو۔ اس اظہارِ خیال سے ہر چند کہ حقائق پر مبنی ہے وہ مجھ سے چڑ جاتی ہے اور مجھے ذوقِ سلیم سے عاری گردانتی ہے اور کچھ ایسے کلمات استعمال کرتی ہے جو مکالمہ مابین میاں بیوی کے عنوان کے تحت آتے ہیں اور جن کی حیثیت ذاتی ہے۔ بہرحال آخر کار وہ کہتی ہے کہ میں ایسی ہی بدصورت تھی تو مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ جو ہوا سو ہوا اسے چھوڑو۔ میں تمہیں بطور اپنی بیوی کے خطاب نہیں کر رہا تھا بلکہ تم سے عام عورت کی حیثیت سے مخاطب تھا۔ لفظِ تم سے مراد تم یعنی کہ میری بیوی نہیں بلکہ تم یعنی کہ عام عورت تھی —— اسم معرفہ والی خاص بیوی نہیں بلکہ اسم نکرہ والی عام عورت۔ قواعد کے اس چکر نے بیوی کو اور بھی برہم کر دیا۔ چونکہ میری نیت اسے پریشان کرنے کی نہ تھی میں نے اسے سمجھایا کہ میں نے اسے نمائندہ حیثیت دی ہے لیکن اس حیثیت سے گفتگو کرنے سے اس میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہو گیا اور تنازعہ جماعتی رنگ اختیار کر گیا —— چنانچہ اس صورت میں دونوں جانب سے آوازِ حق بلند ہوئی اور وہ اتنی بلند ہوئی کہ ناخوشگوار نتائج پیدا ہونے لگے۔ بہرحال اس وقت یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ بعض صورتوں میں میکس فیکٹر کی کرامات ایسا رنگ بھرتی ہیں کہ ان سے اکثر خواتین کی شخصیت موزوں ہو جاتی ہے اور دیکھنے والوں کو وہ صورتیں وزنِ حقیقی کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بدقسمتی سے بعض صورتوں میں ان کرامات کی مدد سے سکتہ دور نہیں بھی ہوتا اور ان کی شخصیت کا وزن کسی بھی مروجہ بحر میں نہیں سماتا —— اس کی حیثیت تجربہ کی ہوتی ہے اور تجربہ کا کام بھی ہو سکتا ہے۔ کسی خاتونِ محترم کا رنگ کالا ہونا جس کیفیت کو فصحائے ملاحت کے نام سے یاد کیا ہے، یا ان کی ناک کا چپٹا ہونا، بھنوؤں کا ماچس سا خمیدہ ہونا یا مژگاں کا کوتاہ ہونا یہ ایسے عناصر ہیں جن سے شخصیت کا وزن متزلزل نہیں ہونا چاہئے بلکہ میرے نزدیک تو کیفیات یہ ظاہر کرتی ہیں جیسے شخصیت کے وزن میں زحاف سے کام لیا ہو اور ماہرین کا خیال ہے کہ زحاف کا استعمال کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مشاق لوگوں ہی کا حصہ ہے اگر کسی مصرعے میں الف گرتا ہو یا یائے دبتی ہو یا نون نونِ غنہ میں تحلیل ہو تو اس سے مصرعہ وزن سے خارج نہیں ہوگا، تو چپٹی ناک، کوتاہ مژگاں، سیدھی سی بھنویں ایسے ہی حروف کے دبنے کی شکلیں ہیں —— البتہ یہ ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کے ساتھ ناک بھی

پیچیدگی رہ جائے تو تنافر پیدا ہو سکتا ہے لیکن بعض ماہرین فن نے اسے بھی نظر انداز کیا ہے اور میرے پاس کوئی سند تو نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ تنافر سے کبھی کبھار موسیقی بڑھ جاتی ہے اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چینی جاپانی حسن میں، ایسا عنصر تو پایا ہی جاتا ہے ——

"لہٰذا تمہارا یہ خیال (میں نے اپنی بیوی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا) درست نہیں کہ اس تنافر سے تمہاری شخصیت کے وزن میں ——"

بیوی نے لپ اسٹک کے لیپ کو دونوں ہونٹوں کے دباؤ سے ہموار کئے بغیر چیں ناک کے میری طرف دیکھا اور میرے فقرے کا وزن وہیں ساقط ہو گیا۔ میں نے پیار بھرے انداز میں نادم ہو کر کہا کہ تم سے مراد میری پیاری اسم معرفہ والی خاص بیوی نہیں بلکہ اسم نکرہ والی کوئی ایسی عورت جو اپنی ظاہرہ شخصیت کا سکتہ دور کرتی ہو —— تمہاری شخصیت تو کئی اعتبار سے موزوں سمجھی جا سکتی ہے۔ میں تو ان خواتین کی بات کر رہا تھا جنہیں اپنی نسوانی شخصیت کو موزوں رکھنے کے لئے بالوں کے ارکان گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں، قمیصوں کی بحریں بدلنی پڑتی ہیں۔ پھر کوئی گھڑ سواری کرتی ہے، کوئی موٹر چلاتی ہے، کوئی ہوائی جہاز اڑاتی ہے —— واضح رہے کہ میں یہاں فقط ضرورت شعری کی بات کر رہا ہوں، پیشے کی ضرورت کی بات نہیں کر رہا۔ پیشے میں شخصیت کا کیا کام۔

کبھی آپ نے غور فرمایا کہ شخصیت کا سکتہ دور کرنے کے لئے کیا کیا مصیبتیں بھی اٹھانی پڑتی ہیں؟ —— اپنی روحانی شخصیت کو موزوں بنانے کے لئے لوگوں کو جنگلوں میں بسیرا کرنا پڑتا ہے اور وہاں سر کے بل یا ایک ٹانگ پر سالوں کھڑے رہ کر اپنے بالوں کو لٹوں میں تبدیل کرنا پڑتا ہے اور تب جا کے روحانی شخصیت کے مصرعہ تر کی صورت نظر آتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ جب تک وہ ننگے دھڑنگے نہ گھر میں پھریں ان کی شخصیت کا سکتہ دور نہ ہوگا اور بیچاروں کو کڑکڑاتے جاڑے میں بھی ننگے دھڑنگے ہی رہنا پڑتا ہے۔ جسمانی شخصیت کو موزوں کرنے والوں کو دیکھئے۔ خوراک کی قلت اور اشیائے خوردنی میں ملاوٹ اور ان کی گرانی کے باوجود انہیں منوں دودھ، گھی، بادام وغیرہ کھانے پڑتے ہیں، ان کے جسم کو اکھاڑے کی بے شمار مکعب فٹ مٹی اور لاتعداد تیل کی بوتلیں ہضم کرنی پڑتی ہیں۔ وہ اپنے اوپر صبح سویرے کی میٹھی نیند حرام کرتے ہیں اور اس وقت جب ہم ایسے سست الوجود خراٹے لیتے ہیں وہ اپنے جسم کو بحر رجز میں ڈھالتے ہیں اور اس طرح سالوں کی محنت اور ریاض کے بعد کہیں ان کی جسمانی شخصیت کا سکتہ دور ہوتا ہے۔

میرے بے شمار بزرگ ایسی شخصیت کے مالک ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں لوگ ان کے ہاتھوں کو چومتے ہیں اور ان ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ ان کی طرف پیٹھ کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کے برابر بیٹھنا گستاخی خیال کرتے ہیں۔ ہمارے ایک ایسے ہی عزیز کو واقعات سے ظاہر ہونے لگا کہ ان کی شخصیت میں سکتہ وارد ہوا چاہتا ہے اور انہیں خدشہ ہو چلا کہ شاید بہ وزن ہی سے خارج ہو جائے۔ یہ ان کے لئے بجا طور پر زندگی اور موت کا سوال تھا اس لئے کہ ان کے پاس کوئی معقول الاٹمنٹ بھی نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس فرضی سکتے کو دور کرنے کے لئے ٹارچ کا استعمال شروع کر دیا۔ وہ صبح سویرے وظیفہ کے وقت اپنی چادر کی بغل میں اسے روشن کرنے لگے۔ اور اس دوران میں کچھ غیر معمولی آوازیں پیدا کرنے لگے —— البتہ ایک روز ذرا مشکل پیدا ہوئی تھی جس روز ان کی ٹارچ کا بلب اڑ گیا تھا لیکن وہ اسی روز اس گاؤں سے کوچ کر آئے تھے جہاں ان کا ڈیرہ تھا۔ ایک اور صاحب بھی تھے جنہیں ایسا ہی خطرہ لاحق ہوا تھا اور وہ چند ماہ کے لئے زیر زمین چلے گئے تھے اور جب نمودار ہوئے تو ہر عقیدتمند کو کھجور کا ایک چوتھائی حصہ خود پہنچا گئے اور ہر عقیدتمند نے کہا کہ بیت اللہ شریف کی زیارت کے بعد آپ کے چہرے پر زیادہ نور آ گیا ہے۔ جب تک روپوش رہے تھے ملٹی وٹامن گولیوں کا استعمال باقاعدگی سے کیا تھا۔

آپ ایسے حضرات سے تو آشنا ہوں گے جن کی سیاسی شخصیت کا وزن اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک وہ وزیر نہ بن جائیں اور جب کبھی ان سے وزارت چھنتی ہے تو وہ اپنی شخصیت کو مروجہ بحر سے خارج تصور کرتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جس طرح ریل گاڑی کے ڈبے سے وہ چلتی پٹڑی سے اتر جائیں یا جیسے پورٹر کا اخبار بند ہو جائے یا لفافہ [illegible] ہو جائے یا غبارے میں سے ہوا نکل جائے۔ یہ حضرات اپنے عوام کو یقین دلانے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ سیاسی شخصیت کے عالم میں اور ان کی شخصیت اس وقت تک وزن سے خارج رہے گی جب تک لوگ انہیں اپنے قیمتی ووٹ کا حقدار نہ سمجھیں گے۔ چنانچہ وہ یہ اپیل کرتے ہیں کہ اے لوگو تم کو یہ اختیار حاصل ہے کہ میری سیاسی شخصیت میں شکستہ پیدا کر دو یا اسے موزوں رہنے دو۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اپنی عوامی شخصیت وزن سے خارج معلوم ہوتی ہے اور اس وقت تک خارج رہتی ہے جب تک وہ کالے قانون کے تحت نظربند نہ کئے جائیں، ان پر عوامی اسٹیجوں میں داخل ہونے کی پابندی نہ عائد کی جائے۔ ان کی زبان بندی نہ کی جائے، گویا ان کی شہری آزادی پہ حملہ نہ کیا جائے۔ جونہی ان پر یہ حملہ ہوا ان کی شخصیت کا وزن درست ہو گیا۔ میں نے بیچارے ایسے عوامی شخصیت کے مالکوں کو سکتے کے عالم میں بیقرار اور پریشان حال پایا ہے جو محض حکام کے عدم تعاون کی وجہ سے اپنی شخصیت کو موزوں نہیں کر پاتے۔ یہ حضرات اس غم کو برسوں اپنے سینے میں دبائے رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں حفاظتی اقدامات کی بھی مشق کرتے رہے اور کچھ عرصہ زیر زمین بھی رہے مشق کے عرصے کے دوران وہ دن میں ایک بار کافی ہاؤس آتے اور فقط دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد فوراً رخصت ہو جاتے کوئی دوست کہتا —— صاحب ابھی جلدی کیا ہے کچھ دیر رکئے تو معذرت چاہتے اور رازدارانہ انداز میں کہتے — بھئی سمجھو۔ ان دنوں زیر زمین ہوں" گویا یار زندہ صحبت باقی۔ ان دنوں انہوں نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا تھا خفی قسم کی مونچھیں رکھ لی تھیں، اور رنگ نکھار لیا تھا۔ ہر وقت دھوپ کا چشمہ لگائے رکھتے تھے مطلب یہ کہ ان کی تیز گرم تقریریں۔ ان کی پوشیدہ سرگرمیاں، خفیہ رابطے، زیر زمین چلے جانے، مستقیم چھپنے کا رد و بدل۔ تمام کی تمام کاوش رائیگاں گئی اور کسی نے یہ شکستہ دور کرنے میں ان کی مدد نہ کی۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے اپنی شخصیت کی یہ بحر ہی ترک کر ڈالی اور نئی بحر کی تلاش میں ادبی دنیا میں چلے گئے جہاں وہ بغیر سکتے کے سکھ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جن کو یہ خیال ہوا کہ ان کی شخصیت اس وقت موزوں نہیں ہو گی جب تک وہ ادب میں نام پیدا نہ کریں۔ نام کے سلسلے میں ان کی کوئی خاص شرط بھی نہ تھی۔ معزز نام پیدا ہو یا بازاری نام۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ دلچسپی فقط اس بات میں تھی کہ نام ہو سہی کیسا بھی ہو۔ ادب میں سب چل جاتا ہے۔ وہ شیکسپئر کے حوالے سے کہا کرتے تھے "نام میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہم نے ادب میں لوگوں کو بدنام بھی پایا ہے —— بدنام بھی ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا —— یہ بھی تو کسی ادیب ہی نے تو کہا ہے ——" اس سلسلے میں ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ ادب میں اپنے نام کو کسی نئے قسم کے ادب سے وابستہ کر لیں۔ وہ چاہتے تھے کہ گھوڑا مارکہ مٹی کا تیل، ریکٹ مارکہ بیڑی، زنجیر مارکہ دھاگہ کی طرح ان کے نام کے مارکہ کا ادب بھی چل نکلے جو ان کے اٹھ جانے کے بعد ان کی یادگار رہے۔ نام ان کے پس ماندگان کے کام آ سکے۔ بقول شخصے وہ ادب کی تخلیق میں کمی کے باعث ادب میں "زیادہ اناج اگاؤ" قسم کی مہم کا آغاز کرنا چاہتے تھے تاکہ ادب کی درآمد میں کمی ہو سکے۔ چنانچہ اسی کوشش میں انہوں نے ادب کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا اور اس سلسلے میں انہیں ادب میں کئی ایک شکلیں نظر آئیں۔ کہیں انہوں نے ادب برائے ادب کا ڈھیر پایا۔ کہیں انہیں ادب برائے زندگی گرا پڑا ملا، کہیں نیا ادب،

کہیں پرانا ادب، عوامی ادب، تجریدی ادب، مصور ادب، اسلامی ادب، پاکستانی ادب، ادب برائے روس، ادب برائے امریکہ اور جانے انہیں کتنی قسمیں نظر آئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہ پائی جو ان کے نام کے بیج کے لئے زرخیز ہو اور جس میں ان کے نام کا پودا اگ سکے جو کبھی درخت بن سکے جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر ان کے نواسے نبیرے ادبی چوسر کھیل سکیں ——— بالآخر وہ اپنی شخصیت کا سکتہ دور کرنے کے لئے ادب کی نئی قسم کی طرح ڈالنے میں کامیاب ہو گئے جسے ادب برائے نام سے موسوم کیا گیا جو مصاحب کثرتِ استعمال سے برائے نام ادب بن گئی۔ اسی ادبی قسم کی رعایت سے وہ اپنے ادبی حلقے میں پہلے برائے نام ادیب مشہور ہوئے اور برائے نام ادب والے کہلانے لگے۔ دروغ برگردنِ راوی ان کی شخصیت کی بحر کافی رواج پا چکی ہے اور ان کا نام تاریخی ناول مارکہ ادب سے منسوب ہے جو فی زمانہ سکہ بند ادب تصور ہوتا ہے اور کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔

ایسے لوگ جن کی شخصیت غیر موزوں ہوتی ہے آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں مل جائیں گے۔ سرکاری افسر اپنی حاکمانہ شخصیت کو اکثر اپنی مخصوص بحر سے خارج ہی پاتے ہیں۔ بعض افسروں کا خیال ہے کہ جونہی ان کے اور ان کے ماتحتوں کا درمیانی فاصلہ کم ہوا ان کی شخصیت کا وزن بگڑنے لگا۔ جوں جوں یہ فاصلہ بڑھے گا ان کی شخصیت کا وزن درست ہوتا جائیگا۔ مجھے ایک افسر سے ملاقات کا موقع ملا۔ بقول ان کے انہوں نے اوزانِ حقیقی اختیار کر رکھے ہیں اور اس معاملے میں کسی قسم کے تصرف کے قائل نہیں۔ انہوں نے سکتہ کی بدعت سے نجات پانے کے لئے چند اصول وضع کر رکھے ہیں جن پر عمل کرنے سے وزن میں خلل آنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ میں عادتاً سب ماتحتوں سے انگریزی میں بات چیت کرتا ہوں۔ چپڑاسی سے اردو میں گفتگو کرتا ہوں اور گھر پہنچ کر پنجابی بولتا ہوں ——— دفتر کے اوقات میں مسکرانا، خندہ پیشانی سے پیش آنا، ایسے زحاف استعمال نہیں کرتا ——— ہمیشہ کھرج میں بولتا ہوں اور مدھم سروں میں بات کرتا ہوں تاکہ ماتحت پوری بات نہ سمجھ سکے۔ میں نے اپنی میز اور بیرونی دروازے کا فاصلہ زیادہ کر رکھا ہے تاکہ ملاقاتی کو اپنے اور میرے درمیانی فاصلہ کا احساس رہے۔ اور میز تک آتے آتے اس فاصلے سے آگاہ ہو جائے اور حواس باختہ بھی ہو جائے ——— جب کوئی میرے کمرے میں داخل ہوتا ہے میں بغیر نظریں ملائے کہتا ہوں "چلے آؤ ——— ہوں؟ ——— اوں ——— تم جا سکتے ہو ———" یہ فراخدلانہ گفتگو کا نمونہ ہے۔ ورنہ خاموشی عاقل ماتحت کے لئے اشارے کا کام دیتی ہے ——— یہ بھی انہی صاحب کا اصول ہے کہ ماتحت کے روبرو مت مسکراؤ مبادا وہ سمجھے افسر مہربان ہو گیا ہے۔ ان کے خیال میں ایک بار سہواً مسکرا دینے سے ایسا سکتہ پڑتا ہے جو سال بھر کے لئے پیشانی پر شکنیں ڈالنے سے بھی دور نہیں ہوتا۔ ان کے استعمال شدہ نسخے کے مطابق حاکمانہ شخصیت کے وزن کے بنیادی ارکان میں گردن کا تناؤ بھی ہے۔ گردن کی سختی کا یہ عالم ہونا چاہئے کہ وہ کبھی دائیں بائیں مڑ سکے نہ جھک سکے۔ دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت ہو تو پورے جسم کو گھمایا جائے تاکہ گردن میں لچک ہونے کا شائبہ تک نہ ہو۔ وہ فرمایا کرتے ہیں کہ حاکمانہ شخصیت کے اوزان کو سقم سے پاک رکھنا جان جوکھوں کا کام ہے۔

کاروباری لوگوں کو اپنی شخصیت کا سکتہ دور کرنے کے لئے کچھ ایسا ہی جتن کرنا پڑتا ہے جسے نثر پسندوں نے بلیک مارکیٹ کا نام دیا ہے حالانکہ ان کا تمام کاروبار اب دن کے وقت ہوتا ہے۔ یہ کاروباری لوگ اپنے اوزان میں بڑے بڑے اچھوتے زحاف استعمال کرتے ہیں۔ مجھے ایک صاحب کے بارے میں علم ہے جو شہر سے کپڑا خرید کر لاتے

اور آتے ہی اپنی بیوی کے ہاتھ وہی کپڑا ایک آنہ فی روپیہ کے منافع پر فروخت کر دیتے۔ بیوی اپنے بیٹے کو وہی کپڑا دو آنے فی روپیہ کے منافع پر بیچ دیتی۔ بیٹا وہی کپڑا اپنی بیوی کو چار آنے فی روپیہ کے منافع پر دے دیتا۔ گھنٹہ بھر کے بعد وہی صاحب جو شہر سے یہ کپڑا خرید کر لاتے تھے اپنی بہو سے پوچھتے "بیٹی منّا تم نے کپڑے کا سودا کیا ہے بیچو گی؟" بہو کہتی "ضرور بیچوں گی۔" وہ آٹھ آنے فی روپیہ کے منافع پر اپنے سسر کے ہاتھ فروخت کر دیتی۔ بس سیٹھ جی دکان میں جب وہ کپڑا فروخت کرنے لگتے تو فخریہ بیان دیتے کہ ایک روپیہ آٹھ آنے گز گھر کی خرید ہے حلف اٹھانے سے کون مرعوب نہ ہوتا اور دو تین آنے فی گز کا منافع دے کر کپڑا خرید لے جاتا ———

کیا یاد آیا ——— بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لوگوں کی شخصیتوں کے اوزان درست کرتے ہیں یا ان کے ذہنی سکتے دور کرتے ہیں۔ ان شخصیہ سکتوں کی نشان دہی وہ ایسے ہی کرتے ہیں جیسے کان میں سے میل نکالنے والا ہتھیلی پر میل کی گولی جما دے اور کان کھل جاتے ذہنی سکتے دور کرنے والا میری شخصیت کا وزن درست کرنے کے درپے ہے حالانکہ میں اس سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ اپنی کوئی شخصیت ہی نہیں، اس کا وزن کیا معنی؟

"تو شب آفریدی چراغ آفریدم!"

(ایک فینٹسی)

سلام (مچھلی شہری)

(ایک ایسی موسیقی سے غنائیہ کا آغاز ہوتا ہے جس سے عالمِ محویت کی نمایندگی ہوتی ہے۔
پس منظر میں واضح اور گمبھیر قدموں کی آہٹ)

اِنسان : (گویا چونک کر) :

نقابِ فکر و تخیل اُٹھا رہا ہے کون ؟
بہ زعمِ خاص میری سمت آ رہا ہے کون ؟

(موسیقی کی ایک پُر ہیجان لہر تیزی سے اُبھر کر فوراً ہی ختم بھی ہو جاتی ہے)

اِنسان : (حیرت مگر اشتیاق کے ساتھ) :-

کس نے چھیڑا مرے احساس میں یہ سازِ حیات ،
فکر کو کس نے کیا مائلِ پروازِ حیات ؟

(پھر ایک متلاطم موسیقی جو سمندر کی موجوں کی طرح اُبھرتی ہے اور فوراً ڈوب بھی جاتی ہے)

کس نے محسوس کی میرے دلِ سوزاں کی تڑپ ،
کس سمندر کو مری پیاس کا احساس ہُوا ؟
وہی تخلیق کا جذبہ ، وہی عزمِ پرواز
کون یہ میرے خیالات کا عکاس ہُوا ؟

(اب قدموں کی آہٹ قریب تر ہو جاتی ہے)

نیچر :
کچھ پریشان ہے، اُلجھا سا ہے، افسُردہ ہے،
ذرا ہم بھی تو سُنیں اس کا سبب اے انساں!
تنگیٔ دامنِ افکار کے باوصف تجھے،
اس قدر خواہشِ پرواز ہے اب اے انساں!؟

انسان : (بے تاب ہو کر) : —
کون ہے — کون ہے — کس روح کی آواز ہے یہ؟
کون ہے — کون مرا ناقدِ پرواز ہے یہ؟؟
کون ہے — کون ہے — کس روح کی آواز ہے یہ؟

نیچر :
ہاوراں شعلۂ آواز ہوں میں،
خالقِ جذبۂ پرواز ہوں میں،
اے میرے شیشۂ تخلیق کے عکسِ بیتاب!
ہمہ نغمہ ہوں، ہمہ ساز ہوں میں — !!!

انسان :
اور اس ساز کو آہنگ دیا ہے میں نے،
تجھ کو انداز دیا، ڈھنگ دیا ہے میں نے،
اپنے سانسوں کے حسیں تار کبھی نذر کیے
کبھی انگشت کی مضراب سے چھیڑا ہے تجھے
جب بھی اُٹھی ہے میرے دل میں کوئی موج بہار
خود ہی توڑا ہے تجھے، خود ہی بنایا ہے تجھے۔
دامنِ ارض پہ بجز نقشِ ازل، کیا ہوتا۔؟
میں نہ ہوتا تو ترا نورِ ازل کیا ہوتا

نیچر :
جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم،
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس، ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان :
تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ، آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر، نوشینہ سازم

نیچر : باش اے خود سر، خود بین و خود آرا انسان
انسان : (نرمی سے) مادرِ گیتی! تو ہے آنکھ کا تارا انسان
نیچر : تیرے تیور، تیرا لہجہ، تیری آواز ہے اور
انسان : یہ تو سچ ہے کہ میرے ہاتھ میں اب ساز ہے اور
نیچر : تیرے نغمے کا تصور، تیرا یہ حسنِ خیال
کچھ نہ ہوتا اگر چھیڑتے ہم اپنا رباب
انسان : اے مغنیِ ازل! خالقِ بزمِ عالم
تیرے بربط کو بھی درکار تھی میری مضراب
اَن سُنا گیت ہی رہتا ترا حُسنِ تخلیق
میں اگر اس کو نہ دیتا کوئی رنگِ بیتاب
نیچر : تجھ کو معلوم ہے، دنیا بھی تخیل تھی مرا
انسان : اس تخیل کو دیا رنگِ حقیقت میں نے
نیچر : تجھ کو معلوم ہے، پابندِ اجل ہے دُنیا
انسان : میرے نزدیک تو جاوید کنول ہے دُنیا
نیچر : ہم اسے آج بھی ویرانہ بنا سکتے ہیں
انسان : اور ویرانے کو ہم پھر سے سجا سکتے ہیں
نیچر : (پس منظر سے) خیر دیکھیں گے ترا عزم، ترا جوشِ عمل
انسان : عزمِ آدم ہی سے روشن ہے بقا کی مشعل
نیچر : (پس منظر سے، ذرا فاصلہ کے ساتھ) :-
اپنی موہوم تمناؤں پہ اتنا نہ مچل
(اور بھی دور سے جاتے جاتے)
جا بجھائیں گے نہیں ہم ترے خوابوں کا کنول

(اسی وقت روحِ ارتقا کا نغمہ اُبھرتا ہے)

نغمہ

مرے پھول کی مہک لے، مرے ساز کی صدا سُن
جو ازل سے نغمہ زن ہے، ہوں وہ روحِ ارتقا سُن

تو ہی دورِ نو کا رہبر، تو ہی اس کا قافلہ ہے ؟
تری منزلیں ہیں آگے، ذرا بڑھ یہ سوچ کیا ہے؟
میری شمع کی ضیا لے، مرے دل کی یہ دُعا سُن،
میرے پھول کی مہک لے، مرے ساز کی صدا سُن
جو ازل سے نغمہ زن ہے، ہوں وہ روحِ ارتقا سُن
(نغمہ ختم کرتے ہی روحِ ارتقا، ہم کلام ہوتی ہے)

روحِ ارتقا: تو خود خدائے وقت ہے اے آدمِ حسیں!
جو کچھ سُنا ہے تو نے نہ کر اس کا کچھ یقیں
تو خود حسین، تیرے خیالات بھی حسیں
افکار بھی لطیف ہیں، جذبات بھی حسیں
ہے تیرے دم سے رشکِ ارم محفلِ زمیں
تو خود خدائے وقت ہے اے آدمِ حسیں
(وہی نغمہ پس منظر سے پھر اُبھرتا ہے)

نغمہ

میرے پھول کی مہک لے، مرے ساز کی صدا سُن
جو ازل سے نغمہ زن ہے، ہوں وہ روحِ ارتقا سُن
میرے شمع کی ضیا لے، مرے دل کی یہ دعا سُن
مرے پھول کی مہک لے، مرے ساز کی صدا سُن
(نغمہ ختم ہوتا ہے)

روحِ ارتقا: (انسان سے پھر ہم کلام ہوتی ہے) :-
کیوں ہو غریقِ فکر، کہو کیا ملال ہے؟
انسان : آواز جو سُنی تھی، اُسی کا خیال ہے
روحِ ارتقا: تعجب ہے کہ تم، اور فکرِ مستقبل میں ڈوبے ہو
تلاطم سے اُبھر کر دامنِ ساحل میں ڈوبے ہو
انسان : میں یہ سوچتا ہوں .... (جملہ پورا نہیں کرتا)
روحِ ارتقا: (جملہ پورا کرتی ہے): ...... کہ فردوسِ گیتی
اُسی طرح ویراں کہیں ہو نہ جائے

یہ تاریخِ آدم کا تابندہ حاصل
اُفق کے دھندلکے میں پھر کھو نہ جائے
(پھر حوصلہ افزا اور نرم ہنسی کے)
نظر تو اُٹھاؤ، مری سمت دیکھو،
مری روئے تاباں کے اس آئینے میں
تم اپنی حقیقت کو پہچان لوگے،
مری بات مانو، مجھے اپنا جانو،
تو پھر اپنی عظمت کو بھی جان لوگے!!
انسان: بتا ارتقا! تیرا پیغام کیا ہے؟
روحِ ارتقا: یہی —— یعنی تو عہدِ نو کا خدا ہے!
(پھر رُک کر وقار کے ساتھ)
تم ہمیشہ ہی قدرت سے لڑتے رہے،
فتح پاتے رہے
آگے بڑھتے رہے
تم نے افلاک کی چال کو ٹوک کر
جائزہ انجم و مہر و مہ کا لیا
صبح کو یہ بتایا کہ وہ صبح ہے
رات کو یہ بتایا کہ وہ رات ہے
زلزلے آئے —— (ذرا سا رکتی ہے اور پھر)
اور یہ زمیں ہل گئی،
آسماں کانپ اُٹھا
بام و در خود سے مسمار ہونے لگے
لوگ مجبور و لاچار ہونے لگے
کھیتیاں،
وادیاں سب لرزنے لگیں،
پیڑ اپنی جڑوں سے اُکھڑنے لگے
اور کہسار آپس میں ٹکرا گئے ——

اور اتنے میں پھوٹا جو آتش فشاں
بجلیاں تڑپ گئیں،
بادلوں کی گرج ہانپنے سی لگی
اور سمندر سے لاوے اُبلنے لگے
سیلِ آتش میں انسان بہنے لگے
کوہ و صحرا تو کیا،
مسکراتے ہوئے باغ جلنے لگے

(ذرا رُک کر)

یہ تمھاری تھی ہمت کہ ہر حال میں
ہر مصیبت پہ تم فتح پاتے رہے

(ذرا رُک کر)

دل میں تخلیق کی موج اگر آ گئی
تم نے دھرتی کے نیچے سجائے محل
اور چٹانوں کے مغرور سینوں میں بھی
تم نے تعمیر ایوان و مندر کیے
سرنگوں تم نے کہسار کو بھی کیا،
قلزموں کی بغاوت پہ فاتح ہوئے
اور صحرا کو گلشن بداماں کیا
موج ہائے بہاراں کو رقصاں کیا
قحط آیا تو تم سینۂ ارض پر
کھیتیوں کی بہارِ جواں بن گئے۔
تم وباؤں پہ بھی فتح پاتے رہے
اور تیماردارِ جہاں بن گئے
تم بہرحال آگے ہی بڑھتے رہے،
ہر مصیبت کے طوفاں میں گلتے رہے
جبرِ قدرت کو نیچا دکھاتے رہے

(ذرا رک کر نرمی سے)
آج دل میں یہ کیا موجِ غم آگئی،
کیوں اچانک یہ افسردگی چھا گئی؟

انسان: (فلسفیانہ عزم کے ساتھ رک رک کر) :-
میں فسردہ نہیں
میں تو جوشِ تجسس سے بے تاب ہوں
میرے دل میں ہے اک شعلۂ جستجو
اب ستاروں کی دنیا کی ہے آرزو
آج مجھ میں نیا جوشِ پرواز ہے
جاننا چاہتا ہوں کہ ہے "چاند" کیا
کہکشاں کیا ہے،
اور اس کا کیا راز ہے؟
میں فسردہ نہیں
ہاں مگر کچھ کمی خود میں پاتا ہوں میں
سوچتا ہوں کہ وہ کون سا راز ہے
جو ابھی بس میں انساں کے آیا نہیں
فکر مضطر ہے پرواز کرنے کو پھر
فاش قدرت کا ہر راز کرنے کو پھر

روحِ ارتقا: (چلتے ہوئے) :-
آ مرے ساتھ آ،
آدمِ مضطرب! آ مرے ساتھ آ
قابلِ فخر ہے تیرا یہ حوصلہ
آ مرے ساتھ آ

(آواز ڈوب جاتی ہے منظر ختم ہوتا ہے)

دوسری کڑی

شیطان کا کورس

شیطان : اہاہاہا —— ہا
میں شیطاں ہوں
عدوئے نسلِ انساں ہوں
میں شیطاں ہوں
اہاہا —— ہا
اہاہا —— ہا
لقب شیطان ہے میرا
فریب ایمان ہے میرا
گنہ ایقان ہے میرا
میں دوں گا اس کو پھر دھوکہ
اہاہا —— ہا
اہاہا —— ہا
میں شیطاں ہوں
عدوئے نسلِ انساں ہوں
میں شیطاں ہوں
ابھی معصوم ہے آدم
وہی بچپن کا ہے عالم
میں شعلہ ہوں، وہ ہے شبنم
میں شیطاں ہوں
عدوئے نسلِ انساں ہوں
میں شیطاں ہوں

اہاہا —— ہا
اہاہا —— ہا

(شیطان کے رکتے ہی فوراً روحِ ارتقا بول پڑتی ہے)

روحِ ارتقاء: دیکھنا، آج نہ انسان کو سمجھنا معصوم
شیطان: (خاص تیور سے): یہ تو ہو جائے گا کچھ روز میں تم کو معلوم
(ذرا رُک کر)
میں اس کو زیورِ تخریب سے سجاؤں گا
اور اس کی قوّت و عظمت کے گیت گاؤں گا
میں آج نامِ خدا خود زباں پہ لاؤں گا،
اور اس کو اس کے "خداوند" سے ڈراؤں گا
یہ جوش و عزم کی آواز روک دوں اس کی
میں چاہتا ہوں کہ پرواز روک دوں اس کی
(پھر انسان کے قدموں کی آہٹ سُن کر)
ادھر ہی آتا ہے دیکھو وہ پیکرِ خاکی

(روحِ ارتقاء شیطان کو جلدی جواب دیتی ہوئی انسان کی طرف مڑ جاتی ہے)

روحِ ارتقاء (شیطان سے): اسی کے دم سے ہے فردوس، بزمِ دنیا کی
روحِ ارتقاء (انسان سے): تمھارے دم سے ہے فردوس، بزمِ دنیا کی
انسان: (گویا چونک کر): کون تم —— ارتقا!
تم کہاں کھینچ لائیں مجھے
دل میرا اس جگہ سخت بے چین ہے
روحِ ارتقاء (ادا سے): پا سکو گے یہاں اپنے گیتوں کی لَے
(ذرا سا وقفہ پھر ٹینک کی آواز اُبھرتی ہے)

روحِ ارتقاء: دیکھو یہ ٹینک ہیں،
خود تمھاری ہی قوت کا اک معجزہ
(ہوائی جہاز کی آواز)
اور دیکھو یہ "بمبار طیّارے" ہیں
خود تمھارا ہی اک جوہرِ نغمہ زا!

(راکٹوں کی آواز)

اور راکٹ ہیں یہ !
اب تو باور کرو،
تم ہی عالم کی کشتی کے ہو ناخدا !
(آوازیں بند ہو جاتی ہیں)

انسان : (جوش میں) : فہمِ کل بارود دل شعلہ فشاں بخشا ہے
واقعی تم نے مجھے عزمِ جواں بخشا ہے

روحِ گیتی : (بڑی نرمی سے) : روحِ تخریب کی ساتھی ہے یہ ... اک دھوکا ہے

انسان : (اپنے آپ) : کس کی آواز ہے یہ دل جو مرا دھڑکا ہے؟

روحِ گیتی : (ذرا پاس آکر) : روحِ گیتی ہوں میں، تیری ہی امیدوں کا جہاں

روحِ ارتقا : (چلتے ہوئے) : اس کی باتوں میں نہ آ اے انساں !
میں حقیقت ہوں، ترا عزمِ جواں !

روحِ گیتی : (اور بھی آگے قدم بڑھا کر) :-
تو جو عاقل ہے تو دیوانہ کسے کہتے ہیں ؟
تو حقیقت ہے تو افسانہ کسے کہتے ہیں؟

(پھر انسان سے متانت کے ساتھ)
میرے پاس آؤ، دکھاؤں تمھیں تصویریں چند،
کن اندھیروں میں ہیں ڈوبی ہوئی تنویریں چند،
(ذرا رُک کر) تم نے جب ہوش سنبھالا تو زمیں ویراں تھی
ٹھیک ہے تم نے اُسے حسن دیا، رنگ دیا
بڑی خاموش سی تھی، چپ سی تھی ناہید زمیں
تم نے بے شک اسے اک ساز دیا چنگ دیا
(ذرا رُک کر) اور وہ دَور بھی آئے کہ زمیں مسکائی،
تم نے سجنے کا اسے طَور دیا، ڈھنگ دیا۔
(ذرا رُک کر) تم نے جب پیار سے گلشن پہ اُٹھائیں نظریں،
پھول مُسکانے لگے ——
تم نے جب پیار سے کھیتوں کی بہاریں دیکھیں،

کھیت خود گانے لگے —
(اس وقت ایک نغمہ ابھرتا ہے)

نغمہ

مرد عورت مل کر،
ہم مُسکاتے کھیتوں میں ہے دھرتی کی مُسکان ،
دیکھ کے یہ گیہوں کی بالیں تارے بھی حیران ،
ہم مسکاتے کھیتوں میں ہے دھرتی کی مسکان ۔
عورت : گھن گھن کرتے بادل آئیں، چھم چھم بولے پائل
مرد : ہو جاتا ہے ان کھیتوں میں پت جھڑ کا من گھائل
خوش ہو کر آکاش بھی دیکھے انسانوں کی شان
مرد عورت مل کر،
ہم مسکاتے کھیتوں میں ہے دھرتی کی مُسکان ،
دیکھ کے یہ گیہوں کی بالیں تارے بھی حیران

(کورس ڈوب جاتا ہے روحِ گیتی کی آواز پھر ابھرتی ہے)

روحِ گیتی : (بات جاری رکھتے ہوئے) :۔
تم نے جب رقص کی دیوی کی طرف دیکھ لیا
پائلیں گونج اٹھیں —
(رقص کا تاثر)
بات جب عظمتِ تعمیر کی سوچی تم نے ،
"تاج" اُبھرنے لگے ،
"اہرام" فلک بوس ہوئے
"ایلورا" اور "اجنتا" کی بھی تشکیل ہوئی ۔
(ذرا رُک کر)
جلوۂ حُسنِ خرد کے یہ حسیں تر پہلو ،
یہ سمن پوش ، ضیا بار ، مُعطّر پہلو
نازشِ عظمتِ ادراک ہیں تم ناز کرو
ہاں ، مگر عہدِ جنوں کا نہ اب آغاز کرو
(پھر پیار سے)
اس طرح فطرتِ چالاک کی باتیں نہ کرو
یہ زمیں خوب ہے افلاک کی باتیں نہ کرو

(رُک جاتی ہے)

اِنسان: صوتِ دلکش! تُو مرا عزمِ چمن ساز نہ چھین

روحِ گیتی: سر پھرے! زہرۂ گیتی کی یہ آواز نہ چھین

روحِ ارتقا: (اچانک پاس آکر): تم میری بات مانو میں روحِ ارتقا ہوں

روحِ گیتی: (وقار سے): میں مادرِ زمیں کی آوازِ دل رُبا ہوں۔

ارتقا: پھر کہہ رہی ہوں انساں! میں روحِ ارتقا ہوں
تم میری بات مانو ——

روحِ گیتی: (اب نرمی سے): اے جانِ ہر دو عالم!
تم میری بات مانو،

ارتقا: (اصرار کرتی ہوئی):۔ تم میری بات مانو،
تم میری بات مانو ——،

روحِ ارتقا: (ذرا رُک کر حوصلہ دلاتے ہوئے):
چلو اب چاند کی دنیا کی ہم تم سیر کر آئیں

اِنسان: (جوش میں):۔ ہمارے راکٹوں کو حکم دو، گردش میں آجائیں۔
اگر قدرت بھی حائل ہو تو ہم خاطر میں کیوں لائیں
نشانِ عظمتِ انساں فلک والوں میں لہرائیں

(اس وقت ایک راکٹ فضا میں اُڑتا ہے)

(وقفہ، جسے انتشار کی نمائندگی کرنے والے ساز سے پورا کیا جائے)

تیسری کڑی

(ادھر دھرتی پہ پہلا مکالمہ اُبھرتا ہے)

(ایک بچی رو رہی ہے)

سائنس داں۔ (اپنی بیوی سے): بات کیا ہے؟
اِسے کیوں نیند نہیں آتی ہے؟

بیوی: یہ تو چپ کرنے پہ کچھ اور بھی چلاتی ہے
بچی: (روندھی آواز میں): ماں مجھے لوریاں دو
چاند کا اک گیت سناؤ
روز کی طرح اسے
پھر ذرا دھرتی پہ بلاؤ
اور پھر مجھ سے کہو
"تم بھی اک چاند ہو،
اب سو جاؤ ——؟"
ماں مجھے لوریاں دو
چاند کا اک گیت سناؤ ——!
بیوی: (میاں سے): بڑے سائنس کے ماہر ہو تم ہی اس کو سلاؤ!
سائنس داں: (بیٹی کو چپ کراتے ہوئے):
چاند اب راز نہیں رہ سکتا
چاند اب راز نہیں رہ سکتا
وہ بھی دنیا ہے، ذرا صبح تو ہو لینے دو
ہم تمھیں سیر کو لے جائیں گے
اور کیا کچھ ہے وہاں چاند میں،
دکھلائیں گے ——!
بچی: چاند کی سیر کو لے جائیں گے
سائنس داں: ہاں، مگر پہلے ذرا سو جاؤ
بچی: اور ہم چاند کے گیت
اب نہ کبھی گائیں گے
سائنس داں: (جھلا کر) چپ رہو، یوں نہ مرا سر کھاؤ
بیوی: خوب، بچی کو تسلی تو نہیں دے پاتے
اور اتنی بڑی دنیا کو یہ سمجھاتے ہیں
"چاند اب راز نہیں رہ سکتا؟

(وقفہ، جیسے کسی مناسب ساز سے پورا کیا جائے، پھر دوسرا مکالمہ ابھرتا ہے)

محبوبہ : تم تو کل بار فضاؤں میں کہا کرتے تھے
زندگی سازِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم تو ان زلفوں کی چھاؤں میں کہا کرتے تھے
زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں
(ذرا رک کر)
چاند تو آج بھی روشن ہے سناؤ اک گیت
میں ہمہ ساز ہوں، تم جھوم کے گاؤ اک گیت

شاعر: جانے کیا بات ہے کس دور کی آمد ہے کہ اب
حسن و الفت کے وہ انداز نہیں ملتے ہیں
گیت ملتے ہیں مگر شوخ تریں، تیز تریں،
ایسے گیتوں سے مرے ساز نہیں ملتے ہیں
(ٹھنڈی سانس بھر کر)
ساتھ شاعر کا حسیں چاند نے بھی چھوڑ دیا
عہدِ سائنس نے رومان کا دل توڑ دیا
(وقفے کی موسیقی کے بعد تیسرا مکالمہ)

بیوی : (چھیڑتے ہوئے) : اک شانِ بے نیازی سے کہئے تا پھر حضور!
"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔!!"

فلسفی : (انداز سے) : ذہنِ لطیف میں کوئی نازک سوال ہے ؟

بیوی : دیکھا، جناب آپ نے سائنس کا شباب؟

فلسفی : آنے کو ہے جہان میں اک تازہ انقلاب؟

بیوی : بندہ نواز تھوڑی وضاحت تو کیجئے

فلسفی : مضطر ہے روح، جائزہ اس کا بھی لیجئے
(پھر مفکرانہ انداز میں)
اس عہدِ ارتقائی میں انتشار ہے خیال،
یہ انتشارِ وقت بھی ہے ایک نیک فال
ایسا بھی ایک دورِ سکوں بخش آئے گا
جب عقل جیت جائے گی، دل مسکرائے گا

(دھرتی کے مناظر ختم ہوتے ہیں، اُدھر فضا میں اُسی راکٹ کا شور پھر ابھرتا ہے)

چوتھی کڑی

انسان: (”مصنوعی سیارے“ پر اُڑتے اُڑتے اچانک گھبرا کر)
جادۂ ماہ یہی ہے، میں کروں کیسے یقیں؟
جادۂ ماہ یہی ہے، میں کروں کیسے یقیں؟
یہ تو اک عالمِ ویران کے سوا کچھ بھی نہیں،
نہ وہ محفل، نہ وہ نغمے، نہ وہ گلہائے حسیں
آخرش، تم کہاں لے آئی ہو؟
یاد آتی ہے مجھے وہ مری جنت، وہ زمیں
تم تو دیوانی ہو، سودائی ہو
آخرش تم کہاں لے آئی ہو؟

روحِ ارتقا: یوں ہی بڑھتے رہو، بڑھتے جاؤ
ابھی آجاتی ہے، ہاں، چاند کی محفل ہے قریب

شیطان: (پس منظر سے بہ آوازِ بلند):
نہیں، یہ جائے ادب ہے انساں!
جس کا تو عکس ہے وہ جلوۂ کامل ہے قریب

ارتقا: اس کی باتوں میں نہ آ اے آدم!
میں یہ کہتی ہوں کہ اب شوق کی منزل ہے قریب

اِنسان: (روحِ ارتقا سے): چھوڑ دو، چھوڑ دو، میں لوٹ کے جاتا ہوں وہیں،
وہ مرا خلدِ بریں، ہاں وہ مرا خلدِ بریں
وہ زمیں، ہائے وہ گلبار زمیں —!!

روحِ ارتقا: (سوالیہ انداز میں): یہ تیرے حوصلہ و عزم کی توہین نہیں؟

انسان: اپنی دھرتی سے محبت تو کوئی جرم نہیں
اس محبت سے تو پرواز نہیں رُک سکتی —!

روحِ ارتقا: (ترنم کے ساتھ) تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا

تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
انسان : ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
روحِ گیتی : (قریب آکر) یہی میں بھی کہتی تھی اے جانِ عالم!
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
انھیں بھی سنوارو، انھیں بھی کھلاؤ
زمیں پر ابھی گلستاں اور بھی ہیں۔
انسان : مرے واسطے، مری دنیا میں شاید
ابھی منتظر کارواں اور بھی ہیں۔
روحِ گیتی : ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

(فضا میں راکٹ کا اُڑنا اچانک بند ہو جاتا ہے —— ادھر دھرتی پر پھر پرندوں اور سمندر کی لہروں کی آوازیں، پس منظر میں ایک نغمے کی دُھن دور سے سنائی دیتی ہے، گویا ذرا فاصلے پر ایک جشنِ خیر مقدم ہو رہا ہو۔ اور پھر یکایک نغمہ اُبھرتا ہے)

نغمہ

ملی جلی آوازیں : اختر و انجم بدوش،
رقص کرو، رقص کرو
کاہکشاں در کنار،
لالہ و گل! رنگ بھرو
کون ہوا جلوہ بار
ایک آواز : پھر اُٹھتا ہوا دھرتی کا نشاں آتا ہے
دیکھ کر اب وہ ستاروں کا جہاں آتا ہے
کئی آوازیں : اختر و انجم بدوش
رقص کرو، رقص کرو
کاہکشاں در کنار،
لالہ و گل! رنگ بھرو
کون ہوا جلوہ بار
ایک آواز : مادرِ ارض کے ہاتھوں نے ہو پالا جس کو
چاند تاروں میں اُسے چین کہاں آتا ہے

کئی آوازیں :
اختر و انجم بدوش،
کاہکشاں درکنار،
کون ہوا جلوہ بار

رقص کرو، رقص کرو
لالہ و گل! رنگ بھرو

ایک آواز :
خیر مقدم کو اُٹھو، لالہ و گل! رنگ بھرو
آدمِ نو زرہِ کاہکشاں آتا ہے —

کئی آوازیں :
اختر و انجم بدوش،
کاہکشاں درکنار،
کون ہوا جلوہ بار

رقص کرو، رقص کرو
لالہ و گل! رنگ بھرو

(ایک شاندار موسیقی)

خاکِ مُسلّح

جوش ملیح آبادی

مجھے خبر ہے، نہ گھبرا شریکِ راہِ دراز
کہ زیرِ سطحِ مُسطّح ہے کیا نشیب و فراز
برہمنوں نے بغاوت پہ باندھ لی ہے کمر
لرز رہے ہیں بُتانِ دُرونِ پردۂ راز
ہزار شکر کہ تعمیرِ نو میں ہے سرگرم
وہ آدمی، کہ جو تھا کعبہ ساز و دیر نواز
دھڑک رہا ہے دلِ حامیانِ سدرہ نشیں
اُٹھا رہی ہے زمیں دیدۂ قدر انداز
اُڑی ہوئی ہے تب و تابِ چہرۂ خورشید
ہُوا ہے ذرّہ کچھ اس طرح مائلِ پرواز
زمیں پہ خشت و خزف نے دُل اٹھایا ہے
فضاؤں پر مہ و انجم ہیں گوش بر آواز
وہ پا چکا ہے رُخِ انکسارِ عشق فروغ
کہ حُسن، بھول گیا ہے غرور کے انداز
لبِ نیاز پہ روشن ہوا ہے ناز کا حرف
دیارِ ناز میں لَو دے رہی ہے شمعِ نیاز

ہر ایک لے میں پَر افشاں ہیں سیکڑوں جبریل
بجا رہا ہے تخیُّل، حریمِ دل میں وہ ساز
زہے جلالتِ خُدّامِ عارفانِ جدید
بہر نگاہ کرامت، بہر نفس اعجاز
نہیں یہ منزلِ تمکیں، بڑھے چلو یارو
ابھی تو ہیں فقط افلاک، فرشِ پا انداز
عنانِ قافلہ موڑو سُوئے حریمِ دماغ
کہ دِل نہیں ہے رفیقو، محلِّ سوز و گداز
بہت غرور نہ فرمائیں ثابت و سیّار
کہ خاک پر حرکت کا ہُوا ہے اب آغاز
بقصدِ شکوہ چلے گا جو آبِ حیواں میں
بنا رہی ہے تمنائے زندگی وہ جہاز
مری رہِ اَبدیّت پہ چل نہ پائے گا
مسیح و خضر کا یہ اختصارِ عمرِ دراز

ندیم، جوش کو لے چل کسی بیاباں میں
کہ تا سکوت کے خرمن سے چن سکے آواز

جگرؔ مراد آبادی

محبت، زندگی ہی، زندگی ہے — مگر تجھ بن، مرے کس کام کی ہے
وہی ساقی، وہی دریا دلی ہے — وہی میں ہوں، وہی لب تشنگی ہے
بہت جانکاہ ہے بربادیٔ دل — مگر کیا حسن ہے کیا دلکشی ہے
غریقِ بحرِ حسن و عشق ہو جا — یہاں ہر موج، موجِ زندگی ہے
شہیدانِ محبت سو رہے ہیں — مگر روحِ صداقت جاگتی ہے
بایں جرمِ جنوں، کفرِ محبت — نگاہِ حسن بھی مشتاق سی ہے
ہُوا جاتا ہے ربطِ شوق عریاں — تکلف برطرف، کیا برہمی ہے
یہ میخانہ، یہ میخانہ ہے واعظ — یہاں اخلاص بھی ایثار بھی ہے
ہٹو رستے سے اے شیخ و برہمن — مرے دل نے مجھے آواز دی ہے
زمانہ چاہتا ہے زندگی کو — مگر خود، زندگی کیا چاہتی ہے

جگرؔ کی زندگی ہے اور ترا غم
جگرؔ کی زندگی کیا زندگی ہے

مشرق و مغرب

احمد ندیم قاسمی

(یہ اشعار میری ایک طویل نظم کا ابتدائیہ ہیں۔ مشرق و مغرب کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں یہ ابتدائیہ مشرق کے فوری اور اوّلین ردِ عمل پر مشتمل ہے اس لئے بجائے خود مکمل ہے۔ آخری حصے کا گریز اس موضوع کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتا ہے جو میری اس طویل نظم کی بنیاد ہے۔ ندیم)

گرم ملکوں کا رہنے والا ہوں
برف زاروں سے کتنے ساگر دور
ایک چھالے کی طرح، صحرا میں
میرا خاکستری گھروندا ہے
جس کے چٹخے ہوئے کواڑوں میں
جس کی دہلیز کے نشیب کے پاس
فنِ تعمیر کا پرانا پن،
ایک ویرانہ بن کے بیٹھا ہے

چاندنی رات سرد ملکوں کی
نیلی برفوں میں منعکس ہو کر
اپنی کرنوں کی جھالروں میں چھپی
ایک رومان بن کے آتی ہے،
چاندنی رات گرم ملکوں کی
محنتوں کی تھکن کے سناٹے
اپنی ننگی کمر پہ لادے ہوئے
ایک طوفان بن کے آتی ہے

سرد ملکوں کی دوپہر کا لباس
ایک ایسی مہین چادر ہے
جس کی پرتوں میں جسم کا سونا
قمقمے بن کے مسکراتا ہے
— اور اپنا لباس عریانی
جس پہ سورج، شعاعوں کے کوڑے
اس قدر طیش سے لگاتا ہے
راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتا ہے

گرم ملکوں میں حسن کی قدریں
کتنی اندھی قدیم صدیوں سے
آگ بھڑکا کے اپنے پیکر کی
اپنے ہی گیسوؤں کا بن کے دھواں
زندگی کے اداس آنگن میں
اِک الاؤ لگائے بیٹھی ہیں
اور اس گردبارِ آتش میں
جل رہی ہیں گلاب کی کلیاں

گرم ملکوں کے عشق پیشہ جواں
دھوپ کی چلچلاتی نگری میں
ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں
اور پھر عاقبت کو روتے ہیں،
ان کی محنت پہ وجد کرتے ہوئے
موتیوں کے لدے ہوئے خوشے
جتنے بھرپور ہوتے جاتے ہیں
اتنے ہی دُور ہوتے جاتے ہیں

سرد ملکوں میں حسن و عشق کی رو
زندگی سے قدم ملائے ہوئے
آسماں کی طرح، فضا کی طرح
روز و شب پر محیط رہتی ہے
گھر میں، معبد میں، یا سرِ راہے
ہر طرف، ہر مقام پر، ہر وقت
جب بھی حسن اور عشق ملتے ہیں
گرم بوسوں کے پھول کھلتے ہیں

سرد ملکوں میں کتنی گرمی ہے
جسم کی، روح کی، خیالوں کی
گرم ملکوں پہ سرد و مُردہ سکوت
ایک آسیب بن کے طاری ہے
سرد ملکوں میں زندگی کا شعور
ایک ذرّے کو بھی سنوارتا ہے
گرم ملکوں میں موت کا احساس
ٹھوکریں زندگی کو مارتا ہے

سرد ملکوں کے رہنے والے دوست
میں کھنڈر کے ستون کی مانند
سوچتا ہوں — کہ اس خرابے میں
میں اگر بس وہی ہوں جو کچھ ہوں
میں اگر ولولوں کا ملبہ ہوں
میں اگر حوصلوں کا مرقد ہوں
میرے جینے کا پھر جواز ہے کیا
آخر اس بے بسی کا راز ہے کیا

سوچتا ہوں — (میں سوچ لیتا ہوں)
چاند جو میرے شہر میں نکلا ہے
تیرے ایوانوں میں بھی جھانکے گا
جس زمیں پر میں ایستادہ ہوں
نیلے نیلے سمندروں کے تلے
دبتی، اٹھتی، پگھلتی جاتی ہے
اور یہ، کہ ترے وطن کی زمیں
تیرے قدموں کو تھپتھپاتی ہے

سوچتا ہوں — کہ میری حالتِ زار
کیا فقط رنگ کی شرارت ہے
کیا فقط اس لئے حقیر ہوں میں
کہ یہاں دھوپ چلچلاتی ہے
کیا فقط اس لئے عظیم ہے تو
کہ تری کھڑکیوں کے شیشوں سے
جب کرن آفتاب کی جھانکے
برف اس کی ہنسی اڑاتی ہے؟

رنگ اور رت نہیں مدارِ حیات
رنگ سورج کا ایک زاویہ ہے
رت فقط ایک رخ ہے دھرتی کا
میرے چہرے کا رنگ میری دھوپ
تیرے چہرے کا رنگ برف تری
تو مری دھوپ کو ترستا ہے
میں تری برف کے لئے بے چین
دو مسافر ہیں — ایک رستہ ہے

○

اثرؔ لکھنوی

فقط یہی نہیں حالِ بلاکشاں نہ کہو
یہ حکم ہے کہ محبت کی داستاں نہ کہو

کسی غریب کا پرسانِ حال کوئی نہیں
نہ بدگماں کو ہو اپنی طرف گماں نہ کہو

جبینِ سجدہ نے گلزار سج دیے کتنے
نیازِ عشق کو محرومِ آستاں نہ کہو

خیالِ دوست کی رنگینیاں بھی شامل ہیں
بہارِ عمرِ دوروزہ کو رائگاں نہ کہو

یہ کہہ کے شکووں کا ظالم نے سدِّباب کیا
کہ مہرباں نہیں جب ہم تو "مہرباں" نہ کہو

جمالِ دوست نے خود کی ہے اپنی پردہ دری
تو پھر یہ کیا کہ نہاں تو کہو عیاں نہ کہو

کبھی چمن کا تصور تھا جس سے وابستہ
وہ اب ہے برق کی تعمیرِ آشیاں نہ کہو

تبسمِ لبِ جاناں کا ان میں پرتو ہے
دکاں ہے پھولوں کی اشکوں کا کارواں نہ کہو

کسی کی چشمِ سخن ساز کا کرشمہ ہے
اثرؔ اسے مری رنگینیٔ بیاں نہ کہو

ایک مفلوج دوست سے

تلوک چند محروم

زندگی تیری گُلِ تر سے سوا شاداب تھی — وہ بہارِ عمر گویا اک پریشاں خواب تھی
آہ کتنی دل شکن اس خواب کی تعبیر ہے — بے بسی کی آج تو حسرت بھری تصویر ہے
تجھ کو دیکھا ہے انہی آنکھوں نے مانندِ غزال — آج پاتا ہوں سرِ بستر تجھے کتنا نڈھال
ساتھ تیرے سیرِ دریا، سیرِ گلشن یاد ہے — وہ سماں، جب آرزو تھی گل بدامن یاد ہے
ناز و نعمت کا پلا تن، ورزشوں سے اُستوار — جائے حیرت ہے کہ ہو جائے وہ یوں زار و نزار
چھین لی تجھ سے قضا نے طاقتِ گفتار بھی — آ نہیں سکتا زباں پر شکوۂ آزار بھی
تیری مجبوری کا یہ خاموش عالم دیکھ کر — کیا کہوں گزری ہے کیا میرے دلِ غمناک پر
کیا غضب ڈھایا ہے تُو نے گردشِ لیل و نہار — ہو گیا شامِ غریباں جلوۂ صبحِ بہار
چارہ گر لاچار ہیں ہمدرد ہیں بے اختیار — دم بخود اہلِ عیادت، سرنگوں تیماردار
کوئی کر سکتا ہے اس حالت میں کیا تیرے لئے — پاس سب کے رہ گئی ہے یہ دعا تیرے لئے
روح کو تیری بہ لطفِ حق توانائی ملے — جسم سے چھینی ہوئی شانِ دل آرائی ملے
جھیل جائے تاکہ اس افتاد کو مردانہ تُو — پیکرِ خاکی کو سمجھے روح کا کاشانہ تُو

آدمی تقدیر کے ہاتھوں بہت مجبور ہے
جانتا کوئی نہیں قدرت کو کیا منظور ہے

افقر موہانی

خرد ہے مجبور، عقل حیراں، پتہ کہیں ہوش کا نہیں ہے
ابھی سے عالم ہے بیخودی کا ابھی تو پردہ اٹھا نہیں ہے
نفس نفس اک نئی ہے دنیا، نظر نظر اک نیا ہے جلوہ
نگاہ کی پھر بھی انتہا ہے جمال کی انتہا نہیں ہے
ہے وہ بھی کوئی جبینِ سجدہ اٹھے تمہارے جو نقشِ پا سے
نہ جذب کرلے اگر جبیں کو تمہارا وہ نقشِ پا نہیں ہے
ہوا یہ معلوم بعدِ مدت کسی کی نیرنگیٔ ستم سے
ستم باندازۂ ادا ہے، ادا بقدرِ جفا نہیں ہے
ازل سے ہے آسماں خمیدہ، نہ کرسکا پھر بھی ایک سجدہ
وہ ڈھونڈھتا ہے جس آستاں کو وہ آستانہ ملا نہیں ہے
ہزار رنگِ زمانہ بدلے، ہزار دورِ نشاط آئے
جو بجھ چکا ہے ہوائے غم سے چراغ پھر وہ جلا نہیں ہے
مرے نظامِ حیات میں کچھ کمی سی محسوس ہو رہی ہے
مگر ہو تم کس لئے پریشاں سوال دل کا اٹھا نہیں ہے
بہار آنے کی آرزو کیا، بہار خود ہے نظر کا دھوکا
ابھی چمن جنتِ نظر ہے، ابھی چمن کا پتا نہیں ہے
خوشی ہے زاہد کی ورنہ ساقی خیالِ توبہ رہے گا کب تک
کہ تیرا رندِ خراب افقرؔ ولی نہیں پارسا نہیں ہے

جذبی

ہر داغِ دل میں عکسِ رُخِ گلبدن لئے
بیٹھے ہیں اہلِ عشق چمن در چمن لئے

جب ذکر اُن کے شہدِ لب و رُخ کا چھڑ گیا
ہم چپ رہے ہیں تلخیٔ کام و دہن لئے

ہر خارزارِ غم سے گزرتے ہیں اہلِ غم
پر نرمیٔ خرامِ نسیمِ چمن لئے

اب کیا بتائیں کیسے بنی کیوں اُجڑ گئی
اپنے خیال میں تھے جو ہم انجمن لئے

بنتی نہیں ہے بات مگر صاحبانِ عقل
پھرتے ہیں ہم سے اہلِ جنوں کا چلن لئے

قطعات

اختر انصاری

عالمِ فردا

جنونِ شوق نہ زنہار بے عمل ہوگا
جو عیش آج نہیں ہو سکا وہ کل ہوگا
خوشا کہ عالمِ فردا، مراد ہے جس سے
ہماری خاک سے تعمیر وہ محل ہوگا

عشرتِ غم

دلِ خراب ہے اب تک اسیرِ بہجتِ غم
نفس نفس ہے ابھی تک غریقِ لذتِ غم
ہماری عیش پسندی بھی کیا قیامت ہے
تمام عمر رہے وقفِ عیش و عشرتِ غم

ایک یاد

فلک پہ جیسے ستاروں کی گوہریں جنبش
زمیں پہ چاند کی کرنوں کی مرمریں جنبش
مجھے ہے یاد ابھی تک وہ اپنے بازو پہ
تمھاری پلکوں کی نازک سی نشتریں جنبش

افسانہ و افسوں

خدا کو پیارے ہوئے جن کو مدتیں گزریں
وہ پیاری راتیں نہ لوٹیں، وہ پیارے دن نہ پھرے
فسوں ہے گردشِ دوراں، فسانہ گردشِ چرخ
ہمارے بخت نہ پلٹے، ہمارے دن نہ پھرے!

تھکن

سرورِ تلخیِ دوشینہ کے امانت دار
خمارِ حسرتِ پارینہ کے امانت دار
تھکن سے چُور یہ بازو، تھکن سے چُور یہ پاؤں
مری مشقتِ دیرینہ کے امانت دار!

وقت

پرانے اور نئے کو سمونے والا وقت!
جبینِ دہر کے داغوں کو دھونے والا وقت!
اسی کے سلسلۂ جبر کے اسیر ہیں ہم
تغیرات کی لڑیاں پرونے والا وقت!

عبدالحمید عدمؔ

جس سمت بھی چمن میں وہ غنچہ دہن گیا
ہر ہر قدم پہ ایک خرابات بن گیا

تھا اس قدر اُسے مری کم گوئی کا خیال
محشر میں میرے ساتھ مرا ہم سخن گیا

ویسے تو بے شمار تھے شیریں کے مُدّعی
لانے کو جُوئے شیر فقط کوہکن گیا

رنگ اُڑ گیا گُلوں کا تو کوئی کمی نہیں
خوشبو چلی گئی تو وقارِ چمن گیا

ایسے جوان دل سے تمنّا اُڑی عدمؔ
گلشن سے جس طرح کوئی وحشی ہرن گیا

یہ دور

اختر الایمان

ہیں اسی طور سے گرداں ہوں زمانے میں وہی
صبح ہے شام ہے گہنائی ہوئی راتیں ہیں
کوئی آغاز نہ انجام نہ منزل نہ سفر
سب وہی دوست ہیں دہرائی ہوئی باتیں ہیں
چہرے اُترے ہوئے دن رات کی محنت کے سبب
سب وہی قصے شکایات، مداراتیں ہیں،
سب وہی بغض، حسد، رشک، رقابت، شکوے
دامِ تزویر ہے الجھاؤ کی سو گھاتیں ہیں،
سب گلی کوچے وہی لوگ وہی موڑ وہی
یہ وہی سردی ہے یہ گرمی یہ برساتیں ہیں

زلف کی بات ہے یا زہر کہ سب ڈرتے ہیں
کوئی دلدار نہ دلبر نہ ملاقاتیں ہیں
کوئی بشاشت ہنسی جینے کی نوخیز امنگ
کچھ نہیں بس غم و اندوہ کی باراتیں ہیں
تنگ دامانی کا شکوہ ہے خدا سے ہر وقت
ہر مرض کے لئے نسخہ یہی مناجاتیں ہیں
جی الٹ جاتا ہے اس حبسِ مسلسل سے مرا
ذہن جاتا ہے کسی نازشِ خوبی کی طرف
یعنی وہ پرتوِ گل جانانہ براندازِ چمن،
ایک پروائی کا جھونکا سا گھنی بدلی سی کیفیتِ خواب
شاہدِ نکہت و انوارِ سحر، راحتِ من،
رسمِ دلداری ہے اس سیم بدن کے دم سے
اور مرے دم سے ہے عشاق کا بے داغ چلن!

کس کے قدموں کی ہے یہ چاپ یقیناً ہے وہی
یہ یقیناً ہے وہی سروِ چمن، بنتِ بہار
کوئی رُت آئے زمانہ نہیں بدلے گا اسے
جانِ من تم ہو؟ نہیں! وہ لب وہ عارض وہ نکھار
نغمگیِ جسم کی، وہ لوچ سا، نشہ سا مدام
ایک چلتا ہوا جادو سا نگاہوں کا قرار؟
سچ کہو تم ہی ہو؟ آتا نہیں آنکھوں کو یقیں!

رسمِ شبستانِ طرب

قتیل شفائی

کون یہ ان کے شبستاں میں چھپا بیٹھا ہے
کوئی فاتح ہے مگر دل میں ہے گھبرایا ہوا
اس نے جس لشکرِ جرار پہ کی تھی یلغار
اس نے پھر پرچمِ زرکار ہے لہرایا ہوا

دور تا حدِ نظر کوئی بھی اپنا تو نہیں
ایک پرچم کے تلے جمع ہیں سارے اغیار
مقصدِ جنگ یہاں سب کا جدا ہے لیکن
سب کے ہاتھوں میں چمکتی ہے سنہری تلوار

وسوسے دل میں لیے سوچ رہا ہے فاتح
کس طرح مملکتِ حسن رہے زیرِ نگیں
چند راتوں کی حکومت کا یہ بیکار غرور
چھینتی روح کی تسکین کا ضامن تو نہیں

اس سے پہلے بھی تو آئے ہیں کئی لوگ یہاں
حسن اور حسن کی سرکار پہ قابو پانے
فتح کے بعد بھی لیکن انھیں تسکیں نہ ملی
آخر کار تہِ تیغ ہوئے دیوانے

فاتحِ حسن کئی دن سے اسی سوچ میں ہے
اس کی بھی موت کا پیغام نہ آ پہنچا ہو
کسی قارون کی دولت کے خزانوں کے عوض
اس کی تذلیل کا ہنگام نہ آ پہنچا ہو۔

آہٹیں تیز ہوئیں، خوف نے گھیرے ڈالے
تھرتھراتے ہیں شبستاں کے پُراسرار دیے
سر پہ آ پہنچا ہے شاید کوئی خونخوار غنیم
ہاتھ میں زر کی چمکتی ہوئی تلوار لیے

دو خبر مملکتِ حسن کے دربانوں کو
اب اجالوں کے بھی چہروں پہ سیاہی ہوگی
دفن ہو جائے گا یادوں میں پرانا فاتح،
اب یہاں اور کسی اور کی شاہی ہوگی

قتیل شفائی

ہم ان کے تغافل کو ادا جان رہے ہیں
اس بات پہ کچھ لوگ بُرا مان رہے ہیں

اے حضرتِ ناصح ہمیں الزام نہ دیجے
اس عمر میں کچھ آپ بھی نادان رہے ہیں

رہزن کئی ملتے ہیں رہِ دیر و حرم میں
اس خوف سے ہم بے سر و سامان رہے ہیں

احسان بہاروں کا اٹھایا نہ خزاں کا
دیوانے سدا چاک گریبان رہے ہیں

دیکھا تھا کبھی کوچۂ جاناں میں بھی تجھ کو
ہم اے غمِ دوراں تجھے پہچان رہے ہیں

اُڑتے ہوئے دیکھے نہیں کیا آپ نے لمحے؟
اک رات مرے آپ بھی مہمان رہے ہیں

شادؔ عارفی

وہ جو دعویٰ کریں۔ وہ جو پروا کریں   آپ سُنتے رہیں۔ آپ دیکھا کریں
کھا کے قسمیں مُکر جائیں۔ دھوکا کریں   شوق سے آپ اُن کا بھروسہ کریں
جارہے ہیں کہ عرض تمنّا کریں   وہ کہیں یہ نہ کہدیں کہ ہم کیا کریں
اب یہ حالات ہیں ہم سے وہ کچھ دُوں   دشمنوں کے دکھانے کو پروا کریں
وہ اگر انجمن سے اُٹھا دیں ہمیں   ہم سے یہ بھی نہ ہوگا کہ شکوہ کریں
کون تسلیم کر لے گا۔ فرمائیے   ہم جو اُن کی جفاؤں کا چرچا کریں
شیخ صاحب دکھاوے کے عادی ہیں   ورنہ قطرہ کو چاہیں تو دریا کریں
آئیے آج ہم رہزنوں کی طرح   دُور تک رہنماؤں کا پیچھا کریں
اب یہاں آگئے ہو کے مایوس ہم   کیا تقاضا کریں۔ کیوں تقاضا کریں
ان بتانِ ستمگر کو۔ جو کچھ بھی ہو   ہم نے سجدہ کیا ہے نہ سجدہ کریں

شادؔ صاحب یہ نقّاد بر خود غلط
فنِ شعر و ادب کو نہ رسوا کریں

جاروب کش

مجید امجد

آسمانوں کے تلے، سبز و خنک گوشوں میں،
کوئی ہوگا جسے اک ساعتِ راحت مل جائے
یہ گھڑی تیرے مقدر میں نہیں ہے، نہ سہی

آسمانوں کے تلے، تلخ و سیہ راہوں پر،
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں، کہ اگر تو چن لے
کوئی اک غم تری قسمت کو بدل سکتا ہے

آسمانوں کے تلے، تلخ و سیہ راہوں پر،
تو اگر دیکھے تو خوشیوں کی گریزاں سرحد
سوزِ یک غم سے شکیبِ غمِ دیگر تک ہے

زندگی قہر سہی، زہر سہی، کچھ بھی سہی،
آسمانوں کے تلے، تلخ و سیہ لمحوں میں،
جرعۂ سم کے لئے عفتِ لب لازم ہے
اور تو ہے کہ ترے جسم کا سایہ بھی نجس

تو اگر چاہے تو ان تلخ و سیہ راہوں پہ
جا بجا، اتنی تڑپتی ہوئی دنیاؤں میں
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ جنھیں تیری حیات
قوتِ یک شب کے تقدس میں سمو سکتی ہے
کاش، تو حیلۂ جاروب کے پر نوچ سکے،
کاش تو سوچ سکے!..... سوچ سکے!

ساقی کے حضور

پروفیسر شورؔ

ترے ماحول کی صہبا بھی کتنی خام ہے ساقی
کہ ہم پر مستیوں کا بے سبب الزام ہے ساقی
مسلّم احترامِ حافظ و خیام ہے ساقی
مگر یاں تو فریبِ جام و مینا عام ہے ساقی
یہ رُت، یہ سبزہ و گل، یہ ہوا، یہ ابر، یہ سایہ!
یہاں تو ہر قدم پر دام زیرِ دام ہے ساقی
اُٹھا دوں گر حجابِ جام و مینا تیری نظروں سے
تو آہنگِ مے و مینا بھی اک کہرام ہے ساقی
تری چشمِ کرم اس بزم میں رسوا نہ ہو جائے
خراشِ دل چھپا کر مسکرانا عام ہے ساقی
کسی کا قلب ٹوٹے خون اپنی آنکھ سے ٹپکے
شعورِ آدمیت کا یہی انجام ہے ساقی
سوادِ دیر و کعبہ میں بھی مشکل ہی سے ملتی ہے
وہ اک جنسِ گرانِ انسان جس کا نام ہے ساقی
بہ ظرفِ بیخودی نظروں کو دے تکلیفِ آزادی
حرم سے بتکدے تک لغزش اک گام ہے ساقی
تری محفل میں اپنے ہونٹ سی کر ہم تو بیٹھے ہیں
مگر پھر بھی ہماری خامشی بدنام ہے ساقی
وطن سے دور غربت میں یہ اکثر میں نے سوچا ہے
یہ سورج کی کرن ہے یا سوادِ شام ہے ساقی
بہ جبرِ مصلحت چپ ہوں، مگر چپ سے بھی کیا ہوگا
سوادِ شب سے کرنوں تک مرا پیغام ہے ساقی

○

پروفیسر شورؔ

آنکھ نم ہو تو کس بہانے سے
بات بنتی نہیں بنانے سے
کتنی نظریں ہوئیں خراب نہ پوچھ
ایک تیرے نظر جھکانے سے
بجھ گیا ہر چراغِ دیر و حرم
عشق کا اک دیا جلانے سے
وہ حرم میں بھی سرنگوں نہ ہوا
جو اٹھا تیرے آستانے سے
ذرہ ذرہ ہے آفتاب بدوش
تیرے رخ سے نقاب اٹھانے سے
باتوں باتوں میں روٹھنا اُس کا
اس بہانے سے اُس بہلنے سے
کوئی اپنا نظر نہیں آتا
کیا وفا اُٹھ گئی زمانے سے
ہر حقیقت کی ہم نے رکھ لی لاج
اک فریبِ مجاز کھانے سے
جو گزرتی ہے وہ گزرتی ہے
کون شکوہ کرے زمانے سے
جو ٹپک جائے آنکھ سے اے شورؔ
وہ چھپے راز کیا چھپانے سے

غلام ربانی تاباںؔ

اک حادثۂ شوق کہ دل بھول چلا تھا
آیا ہے کبھی یاد تو ہر زخم ہرا تھا

تسلیم کہ وہ شوخ پشیمانِ جفا تھا
کیا جانیے کیا عشق کی غیرت کو ہوا تھا

وہ سحر اشارات وہ افسون کنایات
اک وہم تمنّا تھا مگر ہوش ربا تھا

بربادیٔ نکہت بہ تقاضائے نمو تھی
پھولوں کو مگر بادِ بہاری سے گلا تھا

شعلہ سا تہِ زلف لپک جائے تھا تاباںؔ
ہر لمس نظر سلسلہ جنبانِ حیا تھا

عبدالمجید حیرتؔ

ورائے قیاس و گماں جا رہی ہے — الٰہی یہ دنیا کہاں جا رہی ہے
منادر سے آوازۂ ناقوس رخصت — مساجد سے رسمِ اذاں جا رہی ہے
کہیں دین و ایماں پہ بھی بن نہ جائے — ابھی تو فقط اک زباں جا رہی ہے
وہاں آ رہی ہے زبانوں میں طاقت — یہاں ہم سے تابِ بیاں جا رہی ہے
جو بیدرد ہے، آ رہی ہے وہ دنیا — وہ دنیا کہ تھی مہرباں، جا رہی ہے
وہ دنیا جو دم بھر رہی تھی ہمارا — ہمیں سے وہ دامن کشاں جا رہی ہے
خبر بھی ہے، اے قصّہ آرائے الفت — کہاں سے کہاں داستاں جا رہی ہے
بہت دن سے نبضِ مریضِ محبّت — توانا تو کیا، ناتواں جا رہی ہے
نہ سرکی چمن سے، مقدّر چمن کا — سنا تو یہی تھا، خزاں جا رہی ہے
گماں ہی غلط تھا کہ پیرِ مغاں تک — ہماری بھی آہ و فغاں جا رہی ہے
زمیں کی رفاقت سے مایوس ہو کر — نظر جانبِ آسماں جا رہی ہے
غضب ہے کہ جن سے امیدِ کرم تھی — اُنھیں کی روش دلستاں جا رہی ہے

تمھیں ناز تھا اس قدر جس پہ حیرتؔ
وہ جنسِ وفا رائگاں جا رہی ہے

شراب

منیر نیازی

جب رات کا پہلا گجر بجے
تب اس گوری کی سیج سجے
آشا کا دہکتا پھول کھلے
بچھڑا ہوا پریمی آن ملے
میٹھی باتوں کی دھوم مچے
جلتی سانسوں کی راس رچے
پھر کام کا زہری بان چلے
گوری رو، رو کر ہاتھ ملے

ایک مُلاقات

ظہور نظر

کس لیے اتنی پشیمان ہو تم!
عمر بھر دامنِ توقیرِ وفا
کس وفا پیشہ کے ہاتھوں میں رہا؟

چاند ڈھل جاتا ہے، مرجھاتے ہیں پھول
ہے یہی فطرتِ مضطر کا اصول
وقت کی لہر پہ جا ہو بھی تو جمتی نہیں دھول

راگ اور رقص کی اس محفل میں
ہم ہیں کچھ دیر کے مہمان، کوئی بات کرو!
جان پہچان، رکاوٹ ہو اگر
بن کے انجان کوئی بات کرو!!
میری محبوب، مری جان کوئی بات کرو!!!

کس طرح بھولا مرا خیال کہو!
کس طرح ٹوٹا لگن جال کہو!
ہجر کا وصل کا احوال کہو!!
قصۂ روز و مہ و سال کہو!!

پھر وہی کرب وہی خاموشی،
پھر وہی نگہ پشیمان و حزیں!
کچھ تو بولو — ! کہ بھری محفل میں
گفتگو میری پُراسرار نہ بن جائے کہیں!!
اب مجھے دعویٰ توقیرِ وفا بھی تو نہیں — !!

بجھ گئی ہے میرے سینے میں بھی آگ
میں بھی ہوں اب کسی پہلو کا سہاگ
اے رفیقہ کسی آغوش کی، اب مجھ سے نہ بھاگ!!

عمر بھر دامنِ توقیرِ وفا
کس وفا پیشہ کے ہاتھوں میں رہا؟
تم سے اک شب جو شبستانِ وفا میں نہ کٹی!
زندگی مجھ سے بھی زندانِ وفا میں نہ کٹی!!
دوش ہے اس میں تمہارا ہی نہ میری کوئی بھول
وقت کی لہر پہ جا ہو بھی تو جمتی نہیں دھول
اب تو کچھ بات کرو!!

اقبال صفی پوری

محبت مجھ کو لے آئی کہاں تک
ترے غم سے غمِ کون و مکاں تک
کہیں بجلی گرے ہوتا ہے محسوس
کہ جیسے آنچ آئی آشیاں تک
حضورِ دوست کچھ کہنا ہے مشکل
بدل جاتا ہے اندازِ بیاں تک
مرے دم سے دلوں کی زندگی ہے
قیامِ کارواں ہے کارواں تک
نگاہِ برق کا احساں نہ پوچھو
اجالا ہے چمن سے آشیاں تک
تمنا رہ گئی دل ہی میں گھٹ کر
نہ اُٹھا شمعِ محفل سے دھواں تک
اُٹھو دیوار کے سائے سے اقبال
یہ دیکھو دھوپ آ پہنچی کہاں تک

آغا صادق

روئے چمن پہ نکھار آج نہیں کل سہی!
جشنِ عروسِ بہار آج نہیں کل سہی،
وہ بھی گھڑی آئے گی رُوحِ سکوں پائے گی
قلبِ تپاں کو قرار آج نہیں کل سہی!
کشمکشِ انقلاب ہوگی کبھی کامیاب
خاک نشیں تاجدار آج نہیں کل سہی!
ماتمِ مرگِ وفا آج اگر ہے تو کیا
عہدِ وفا استوار آج نہیں کل سہی
سینے میں دل تھام لے صبر سے کچھ کام لے
دردِ نہاں آشکار آج نہیں کل سہی
اہلِ خرد شادکام آج ہوئے ہوں تو ہوں
اہلِ جنوں کامگار آج نہیں کل سہی
غمزدگانِ حیات کل سے نہیں ناامید
اہلِ ستم شرمسار آج نہیں کل سہی
قطرۂ شبنم سے بھی لالہ و گل کا خطاب
زندگیِ پائدار آج نہیں کل سہی
اور سہی کوئی دن بارشِ سنگِ ستم
ابرِ کرم کا پھوار آج نہیں کل سہی
صادقِ مہجور کو اتنی تسلّی تو ہے
محفلِ عشرت میں بار آج نہیں کل سہی

ماضی، حال، مستقبل

فارغ بخاری

جو لمحے ماضی کی گرد میں کھوئے ہیں
پہروں ان کی یادوں میں ہم روتے ہیں
جانے کہاں وہ سوئے ہیں

آنے والے لمحے بھی کیا پیارے ہیں
گویا جنّت کے دلکش نظارے ہیں
ہر ایک آنکھ کے تارے ہیں

حال جو ایک سچا ساتھی ہے ہمدم ہے
ہر لحظہ دکھ درد میں اپنا محرم ہے
اس سے ہمیں رغبت کم ہے

دوست ہوں یا دشمن ہوں
جن کا رشتہ ہم سے ٹوٹ چکا
یا جن سے کوئی رشتہ ہی نہیں
ہم ان کے گن گاتے ہیں

جو ساتھ رہیں
ہمراز بنیں، دمساز بنیں
ہم ان کو سدا ٹھکراتے ہیں

حال جسے ہم کہتے ہیں اک دھوکا ہے
بیتنے والا ہر لمحہ ہے مستقبل کا سرما
بیت گیا جو ماضی کی جاگیر بنا

ماضی ہی ماضی ہے
مستقبل ہی مستقبل ہے
آخر حال کہاں ہے ؟

آنچل کی چھاؤں میں

خلیل الرحمٰن اعظمی

چوڑیاں بجتی ہیں، آنچل کی ہوا آتی ہے
اب کے جاڑوں میں یہ کس طرح کا آیا موسم
ملہے ملہے کی زباں پر ہے نئی فصل کا گیت
میری بستی، مرے کھیتوں کا عجب ہے عالم
ہنس رہے ہیں مرے معصوم سے ننھے پودے
جن کو ملتی رہی اب تک مرے غم کی شبنم
کوئی گوری لئے آتی ہے چھلکتی گاگر
جس طرح پہلے برستی تھیں یہ آنکھیں چھم چھم
رس بھرے ہونٹوں سے آنگن کے اندھیرے مہکے
اس اندھیرے میں کوئی چھیڑ دے جیسے سرگم
منزلیں اب مرے پانوؤں میں بچھی جاتی ہیں
جانے کس سمت لئے جاتا ہے ایک ایک قدم
مجھ سے کہتی ہے مری پیاس یہ جیون بھر کی
اور کچھ اور کہ یہ نشہ ابھی ہے کم کم
رکھ کے سینے پہ مرے ہاتھ کوئی کہتا ہے
آ ننھے پاگل نہ بنو ہوش میں آؤ بالم
دیکھو اب جاگ اٹھو، رات کٹی بھور ہوئی
سیج کے گجروں میں باقی نہ رہی کوئی نم
چل کے پھلواری میں سورج کو نکلتے دیکھیں
چل کے دیکھیں کہ کلی کھلتی ہے کیسے تھم تھم

میرے بالوں میں سجا دو کوئی ہنستا ہوا پھول
چل کے ہاتھوں پہ مرے کھاؤ محبت کی قسم

فضا ابن فیضی

کون ترسے مذاقِ خوشی کے لیے
یہ بھی کافی نہیں زندگی کے لیے
ذوقِ غم کا ہو عرفان حاصل اگر
غم بڑی چیز ہے آدمی کے لیے
ورنہ ہم اور تہمت کشِ آگہی
ہوش میں آئے تھے بیخودی کے لیے
رنجِ ہستی کے عنوان یاد آگئے
ہم نے کوشش تو کی تھی ہنسی کے لیے
کون شائستۂ رہ گزر چل پڑا
منزلیں خود بڑھیں رہبری کے لیے
پھونک دے اے تپِ عصرِ حاضر مجھے
لوگ بیتاب ہیں روشنی کے لیے
زندہ رہنے کی ہمت نہ ہو تو فضاؔ
زندگی موت ہے آدمی کے لیے

سرگم نغمہ

شاذ تمکنت

شگوفۂ شب کی گل رنگ یہ میٹھا گُھنسرا
چاندنی کے سینے میں لو دیتا ہے سنگیت کنول
اس میں ڈوبا ہوا، سُرتال سے بوجھل بوجھل

منتظر خواب فزا ہے کہ رہِ سلمیٰ کھلے
پھر سرِ بزم مرا بھید مرا راز کھلے
یہ مرا نغمۂ تر کس لئے ہے تو پر شفا
ساز کے سینۂ پرخوں میں ڈلی ہیں چوٹیں
سُر کے زخموں پہ کوئی نور کا پھاہا رکھ دے
باندھ دے ساز کے اطراف اُجالے کا حصار
مُرکی مُرکی کے چڑھے چھوٹے کلیجہ رکھ دے
آنکھ کو حسرتِ خونابہ فشانی نہ رہے
حیطۂ فریاد کی حد کھول کے رسوائی کر
ساز یوں چھیڑ کہ اشکوں کو بہانہ مل جائے
یوں دُکھا دل کہ تسلی کا گماں ہو جس پر
تیری آواز ہے دیپک کی سانسوں میں ملہار
نغمگی گھل سی گئی ہے تری شریانوں میں
جیسے کلیوں میں ہو ساون کی جھڑی میں جگنو
رات اس طرح جھلکتی ہے مضرابوں میں
سُرخ کہ گلنارِ سکوں، جلوہ در جلوہ نشاط
لبِ ساکت پہ بھی استغاثے کے چھڑنے کا گماں
دیکھ کر آنکھوں کا یہ جاگتا سوتا اسرار
آنکھ میں بس گئیں یہ مست سجیلی راگنیاں

تجھ کو سنگیت کی دیوی نے دعائیں دے کر
مسکراتے ہوئے گاؤں کی فضاؤں میں
نور کے تختوں سے بھیجا ہے کرن کے مانند
راگ کے پیالے ہیں سرگم کی کٹھالی میں

بار ہا خواب کے ہنگام یہ محسوس ہوا
میرے انفاس میں پڑتے ہیں اجالے کے بھنور
راگنی پیالہ سے ٹپکی ہے سرہانے آ کر

جب بھی بہکے ہوئے سرشار، دوانے بادل
پیار سے ٹوٹ کے بدمست چلے آتے ہیں
پل میں ہو جاتی ہیں شرمیلی ہوائیں پاگل
لبِ احساس پہ جم جاتی ہے لہجے کی مٹھاس
نیند بن جاتی ہے آنکھوں میں دھندلکے کا غبار
رگ سے اٹھتی ہے جب بوند کی پائل جھنکار
پوچھتا ہے کوئی چپکے سے مسیحا بن کر
تو کسی ساز کا بچھڑا ہوا نغمہ تو نہیں
کسی مضراب کے سینے کا شرارہ تو نہیں

آن بستی ہے راگنی پچھلے کو سُناتا ہے یہ کون
جب فضاؤں کے سینے پہ برستے ہیں گلہائے طرب
ڈوبتا ہے سرِ دریا قمرِ عنبرِ شب
موجیں منقش ہو کے ستاروں میں بدل جاتی ہیں

چرخ پر لگتا ہے جب اشرفیوں کا انبار
چوٹیاں کوہ کی سونے سے نکھل جاتی ہیں
کھلنے لگتے ہیں سرِ آب رواں نیل کنول
صف بہ صف بھونرے چلے آتے ہیں بیکل بیکل
خود بخود جیسے کہیں بھیرویں چھڑ جاتی ہے
چاند کی آخری کرنوں کی صدا آتی ہے

کنجِ سر سبز میں آئینِ خزاں کے ہاتھوں
منہ چھپائے ہوئے دامانِ مزارِ گل میں
سسکیاں بھرتی ہے جس وقت پپیہے کی پکار
کیسے تھم تھم کے سسکتی ہے ہوائے گلزار
پیکرِ شاخ سے جب زیورِ گل اُترا ہے
شیونِ برگِ چکیدہ سے چمن گونجا ہے
پو پھٹے موجِ نسیمِ سحری کے ہمراہ
تتلیاں ست رنگی سوغات لئے آتی ہیں
دیکھ کر خیمۂ نسرین و سمن کا انجام
خس و خاشاک سے گھبرا کے پلٹ جاتی ہیں
ایسے ہنگام کہیں باغ کی دیوار کے پاس
زرد سی راگنی آ آ کے کھڑی رہتی ہے
ایک اک پھول کے لٹنے کی کتھا کہتی ہے

میں نے کس کس طرح سنگیت کی پوجا کی ہے
آسرا کس کا تھا نغمات کے دامن کے سوا
سوچتا ہوں کہ اگر سُر نہ سہارا دیتا
دوش پر وہ غمِ دنیا کی گراں باری تھی
سانس تو اکھڑ جاتی مری، تھک کے کہیں سو جاتا
ریزۂ آسیۂ شام و سحر ہو جاتا

نسبت درد سے کچھ جنبشِ مضراب کے ساتھ
کوئی چھپ چھپ کے بلاتا ہے پسِ پردۂ ساز
مجھ سے یہ کس نے کیا سات سُروں کا پردہ
میرے دکھ درد کا یہ کون شناسائی ہے
کون غمخوار ہے یہ، کس کی مسیحائی ہے

ساز پر انگلیاں جس وقت رواں ہوتی ہیں
دل کی دیوار سے سر پھوڑتا پھرتا ہے کوئی
ایسا لگتا ہے بدلنے کو ہیں میرے دن رات
جیسے مٹی مری اکسیر میں ڈھل جائے گی
قند ہے جیسے مرے حق میں مرا زہرِ حیات
زندگی گردشِ دوراں سے نکل جائے گی

اُف یہ مرمر کے جئے جانے کی بے سود لگن
محبسِ دہر میں کیا قہر ہے سانسوں کا جتن
بے سبب دل کو گماں ہوتا ہے جیسے تو نے
میرے اشکوں مری آہوں کا سماں دیکھا ہے
تو نے دیکھی ہے مری رات کی گم گشتہ سحر
میری بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں دیکھا ہے
تجھ پہ آئینہ ہے جیسے مرا مجروح شباب
تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے مرے زخموں کا حساب

مرہمِ نغمہ تری لے میں ہے تنویرِ شفا
تو مری خاک کو سودائے پر افشانی دے
رختِ ہستی کو تمنائے گریبانی دے
سم سے بھٹکا ہوں کہاں جاؤں بتا دے مجھ کو
سینۂ ساز میں چپ چاپ سلا دے مجھ کو
اپنی آواز کے شعلوں میں جلا دے مجھ کو
جی میں ہے کھوئے ہوئے خوابوں کی تعبیر ملے
راگ کی آگ میں جل بجھنے کی تقدیر ملے

خاطر غزنوی

فریاد بھی ہے سوءِ ادب اپنے شہر میں
ہم پھر رہے ہیں مہر بلب اپنے شہر میں

ہاں اب دیارِ غیر میں ڈھونڈیں گے آشنا
اپنے تو غیر ہو گئے سب اپنے شہر میں

اب امتیازِ دشمنی و دوستی کسے
حالات ہو گئے ہیں عجب اپنے شہر میں

جو پھول آیا سبز قدم ہو کے رہ گیا
کب فصلِ گل ہے فصلِ طرب اپنے شہر میں

جو راندۂ زمانہ تھے اب شہریار ہیں
کس کو خیالِ نام و نسب اپنے شہر میں

اک آپ ہیں کہ سارا زمانہ ہے آپ کا
کہ ہم کہ اجنبی ہوئے اب اپنے شہر میں

خاطرؔ اب اہلِ دل بھی بنے ہیں زمانہ ساز
کس سے کریں وفا کی طلب اپنے شہر میں

ذکرِ ستم سے کیا ہوگا؟

احمد ریاض

چٹیل صحراؤں میں کب تک پیار کا افسانہ دہرائیں
کہساروں میں بہتی جوئے شیر کے غمگیں نغمے گائیں
لیلاؤں کے آنسو رو لیں عذراؤں کے زخم دکھائیں
کوہکنوں کے نوحے لکھیں رانجھوں کی فریاد سنائیں
کب تک بوالہوسوں کے بڑھتے کاروبار کا رونا روئیں
بجھتے چاند سے چہروں اور لب و رخسار کا رونا روئیں

ذکرِ ستم سے دل والوں کا صرف قضا نے ساتھ دیا ہے
فکر و نظر پہ برق گری ہے فہم و خرد نے زہر پیا ہے
دیوانوں نے اپنے سر نا کردہ گنہ کا ہر الزام لیا ہے
عشق و وفا پر اہلِ ہوس نے ہر اک ڈھب سے وار کیا ہے
ذکرِ ستم سے اب تک ہم نے دار و رسن کا مان بڑھایا
تاجوروں نے پیاس بجھائی دل والوں نے خون لٹایا

ذکرِ ستم سے دیکھا انسانوں کے صدمے دور نہ ہوں گے
جب تک ہم آگے نہ بڑھیں گے راہ کے کانٹے دور نہ ہوں گے
صیادوں اور گلچینوں کے بڑھتے فتنے دور نہ ہوں گے
چنگیزوں اور پرویزوں کے خونیں دھندے دور نہ ہوں گے
آؤ ذکرِ ستم سے آگے چارۂ جبر و ستم کی سوچیں
آؤ مل کر صدیوں کی ظلمت کا پھیلا دامن نوچیں

آؤ سلگتے انمٹ صحراؤں میں جانیں کھونے والو
عشق کی عظمت کے رکھوالو بزمِ وفا کے تند اُجالو
حسن و محبت کے متوالو نجد کی تپتی گود کے پالو
بستی بستی رسوا رسوا مظلومو آشفتہ حالو
آؤ دنیا میں زندہ رہنے کا سب کو ڈھب سکھلائیں
چند خداؤں کو للکاریں لاکھوں انسانوں کو جگائیں

شعاعِ فردا کے راز دانو!

مظہر امام

حیات کا قافلہ بھٹک کر یہ کیسی منزل پہ آگیا ہے
نہ کوئی رہبر، نہ کوئی ہمدم
بس ایک لاانتہا خموشی
جو تیرگی کی مہیب پلکوں پہ منجمد ہو کے رہ گئی ہے

شکستہ پا، خستہ حال راہی
اُداس، گُم سُم
خود اپنی ہی سانس گِن رہا ہے

شعاعِ فردا کے راز دانو!
جو تم زمان و مکاں کی پہنائیوں سے آگے
کوئی نئی رہگذار پاؤ
تو کاروانِ حیاتِ خستہ کا نام لینا
شکستہ پا کا سلام لینا

ابھی وفا معتبر نہیں ہے
جنوں ابھی دیدہ ور نہیں ہے
ابھی تو ختم سفر نہیں ہے!
ابھی تو ختم سفر نہیں ہے!!

کوثر نیازی

○

کب زمانے کی اداؤں کا گلہ کرتے ہیں
ہم فقط اپنی خطاؤں کا گلہ کرتے ہیں

پرِ پرواز نہیں ہے تو بنامِ تقدیر!
آج شہباز فضاؤں کا گلہ کرتے ہیں،

آگ لگ جائے نہ ان سے کہیں گلشن گلشن
باغباں میری نواؤں کا گلہ کرتے ہیں

نہ ہوئی اِن سے کبھی غیر کی دریوزہ گری
بادشہ تیرے گداؤں کا گلہ کرتے ہیں

ہم وہ گستاخ ہیں جو تیری وفا کے باوصف
چند معصوم جفاؤں کا گلہ کرتے ہیں

پہلے پیدا تو کریں ذوقِ سفر اے کوثرؔ!
لوگ کیوں راہنماؤں کا گلہ کرتے ہیں

○

فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے
فریاد کہ دنیا کو خدا یاد نہیں ہے
کیا چیز ہے اللہ رے وہ شوخ تبسم
اب ایک بھی ظالم کی جفا یاد نہیں ہے
اب عشق بھلا بیٹھا ہے اخلاص کا انداز
اب حسن کو پہلی سی ادا یاد نہیں ہے
کیا مجھ سے ہوئی عرضِ تمنا میں جسارت
کیوں ہو گئے وہ مجھ سے خفا یاد نہیں ہے
صیاد! نہ کر نغمہ سرائی کے تقاضے
اب مجھ کو گلستاں کی فضا یاد نہیں ہے
بیمارِ غمِ عشق کا اللہ نگہبان!
اس آنکھ کو پیغامِ شفا یاد نہیں ہے
اس "انجمنِ ناز" کو فردائے قیامت
اے کوثرِ افسردہ نوا! یاد نہیں ہے

جلیل حشمی

ہاتھوں میں خونِ دل سے چھلکنے لگا قلم
حالاتِ نو بہار کئے جب کبھی رقم
پہلے کسی کے ہاتھ سے ساغر تو چھین لو
پھر اہلِ میکدہ تمہیں کہنے لگیں گے جم
اس رُت کو کس زباں سے بہاراں کا نام دیں
ہم روشنی کے پھول کھلا کر ہوئے بھسم
جانے کدھر سے اُتری ہے یہ جنتِ رنگ و بُو
ہو ہو گیا خیال کا صحرا ارم ارم
جب تک نہ خونِ دل میں ڈبو لی ہوں انگلیاں
موضوعِ روزگار کو چھوتے نہیں ہیں ہم
ہم جادۂ نگارِ سحر کے قریب ہیں!
کیا مُڑ کے دیکھتے ہو، بڑھاؤ ذرا قدم
کیوں سرنگوں ہو جادۂ دار و رسن میں تم
یارو تمہارے دم سے آفاق کا بھرم
حشمی ہمارے آگے بایں ذوقِ آذری
خلوت میں کس نیاز سے جھکتے رہے صنم

جمیلؔ ملک

ہم تو مرتے رہے بقا کے لئے   لوگ جیتے ہیں کیوں قضا کے لئے!
اپنا ہونا بھی کیا قیامت ہے   دردِ سر ہی رہے خدا کے لئے
شاخِ دل بے ثمر رہی برسوں   نوشگفتہ سی اک ادا کے لئے
دل نے کیا کیا نہ پیرہن بدلے!   ایک چھوٹی سی التجا کے لئے
شاہزادوں کی جھولیاں بھر دیں   کچھ رہا بھی ہے اس گدا کے لئے
کس نے کی تھی تری زباں بندی!   ہم تو چُپ تھے تری رضا کے لئے
دل ہے کم سن، بھٹک بھی جاتا ہے   روح بھی چاہیے وفا کے لئے
سر پٹختی ہے شاخ شاخ کے ساتھ   تیز کانٹے ہیں اب صبا کے لئے
برق ہے، آندھیاں ہیں، طوفاں ہیں   اپنی عمرِ گریز پا کے لئے

عمر کھوئی جمیلؔ کیوں ہم نے
نگہِ زود آشنا کے لئے

احمد ظفر

رات کے سینے میں یہ چاند کا جادو کیا ہے
دور تک پھیلی ہوئی زلف کی خوشبو کیا ہے
تم ستاروں میں مسرت کے تمنائی ہو
چشمِ افسردہ سے ٹپکا ہوا آنسو کیا ہے
ہم کسی نغمۂ بے نام پہ جاں دیتے ہیں
ایک ہی راگ کی تصویر یہ ہر سُو کیا ہے
پھر وہی شامِ گزشتہ کا سا عالم ہے یہاں
ہر نئی صبح یہ آرائشِ گیسو کیا ہے
ہم تو ہر پھول کو اک زخم سمجھ لیتے ہیں
آپ کہیے کہ سرِ شام لبِ جو کیا ہے
زندگی جشنِ مسرت کا ہی پیغام سہی
درد ہی درد مگر پہلو بہ پہلو کیا ہے
ہم نے برسوں دلِ بیتاب کو دیکھا ہے ظفر
کیا کہیں دشت میں بھٹکا ہوا آہو کیا ہے

ظفر اقبال

دل میں جو زہر تھا آنکھوں سے ہویدا نہ ہوا
ریگِ ساحل سے بھی اندازۂ دریا نہ ہوا
ہائے وہ دل کہ ترے عشق میں اُجڑا ہی نہیں
آہ وہ گھر کہ ترے شوق میں صحرا نہ ہوا
جس سے تو پیار کرے، وصل کا اقرار کرے
آسماں اُس کے جہاں میں کبھی پیدا نہ ہوا
میں بھی دل میں ترے تھوڑی سی جگہ مانگتا ہوں
مجھ سے پہلے بھی تو اس بزم میں کیا کیا نہ ہوا
آنکھ اک زخم ہے، اور زخم بھی ایسا یارو،
مرہمِ دید سے بھی جس کا مداوا نہ ہوا
کبھی تنہائی میں ملتا وہ ستم گر ہم سے
زندگی ختم ہوئی پہ کبھی ایسا نہ ہوا
دل تو گرتی ہوئی دیوار ہے، رُکنے والو!
اِس کا سایہ کوئی سایہ ہے، ہوا یا نہ ہوا
آنکھ بھی گنگ ہوئی، ہونٹ بھی خاموش رہے
درد پھر اس میں عجب کیا ہے جو رُسوا نہ ہوا
دل کے خوں ہونے کی اُس بت کو خبر ہی کرتے
مر چلے ہم مگر احباب سے اِتنا نہ ہوا

آتش لدھیانوی

آرزو کا صلا ہے کیا کیا کچھ
دل ملا، تو ملا ہے کیا کیا کچھ

زحمتِ انتظار، دردِ فراق
عاشقی کی سزا ہے کیا کیا کچھ

عشق میں احتیاط کیا کیا کی
اور تماشہ ہوا ہے کیا کیا کچھ

حرفِ دل لب پہ لا کے پچھتائے
ہر کسی سے سُنا ہے کیا کیا کچھ

رونقِ بزم، زینتِ در و بام
وہ گئے، تو گیا ہے کیا کیا کچھ

دل کی آتش ذرا سی لغزش سے
حشر اپنا ہُوا ہے کیا کیا کچھ

پانچ چینی نظمیں

مترجمہ:- ابن انشا

کیسے کیسے لوگ

'بنگ تانگ ہُو ہُو' — کی ہانک لگا کر پھیری والا ٹھہرا
گرد کے اک لٹتے کو نگل کر چل نکلا پھر چپکے چپکے
نیلے آسمان کے نیچے، چھوٹے چھوٹے بھورے پنچھی
یونہی چکر کاٹ رہے ہیں، آگے پیچھے آگے پیچھے

پنجرہ اک پنچھی کا تھامے، ایک بچارا سودائی سا
دم لینے کو پل بھر ٹھہرا، ریتیلی سی راہگزر پر
اور ادھر ویران گلی میں — ایک البیلا الھڑ لڑکا
کیا جانیں کیا سوچ رہا ہے، راہ کے بیچوں بیچ ٹھٹک کر

ایک طرف اک مُولیوں والا، خوانچے میں دُکّان سجائے
ایک جہاں سے غافل بیٹھا، کھُلا ہُوا چاقو لہرائے
پیلے سورج کی کرنوں میں چمکیں کیا کیا چیزیں اس کی
اور اُدھر ویران گلی میں، الھڑ لڑکا سوچے جائے

ایک جنم کے بَونے نے بھی اپنا لمبا سایا دیکھا
ترچھی کرنوں کے جادو پر جی کو یوں بہلانے لگا ہے
"میں اتنا ٹھنگنا تو نہیں ہوں — دنیا کیوں مجھ پر ہنستی ہے"
— جانے وہ البیلا لڑکا کیسی باتیں سوچ رہا ہے

بھات کا ایک پیالا بیچ میں رکھے چند کمیرے بیٹھے
ٹھنڈی آہیں بھرتے جائیں "جینا راس نہ آئے سائیں"
نیند میں کوئی بے سُدھ لیٹا ہذیانی بنکار رہا ہے
(جانے اس نے کیا دیکھا ہے سپنوں میں کیا شکلیں آئیں)
کسی نے اس کے بالوں میں اک پھول گلابی ٹانک دیا ہے
جیسے برفیلے میداں میں ڈوبتے سورج کی پرچھائیں

(پائن چہ لن (جدید)

۲

جگنو سے

بارش میں ترا یہ دیپ جلے
کبھی بجھ نہ سکے
جھک کر جو چلے
تری جرأت دبے نہیں —— اور بڑھے

اے جگنو جا!
اور نیل گگن کو جا کے بنا کہیں اپنا وطن
اے جگنو جا!
اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تارا بن

(ٹی پو ۷۶۲ — ۷۰۵ ء)

۳

کوچ

لو سرد اور تیکھی بہنے لگی پورب کی ہوا
لو برف زمیں پر گرنے لگی گالا گالا
تم دل اپنا مجھے سونپ چکے، کیا سوچتے ہو
اب کوچ کریں گے، لاؤ ہات میں ہات تو دو
یہ وقت نہ یونہی بیت چکے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دور چلیں کہیں دور چلیں

اُتر کی ہوائیں پل پل چھن چھن تیز ہوئیں
لو چیخیں دھاڑیں، برف کے طوفاں چھیڑ گئیں
جب دل اپنا مجھے سونپ چکے، کیا سوچتے ہو
اب کوچ کریں گے، لاؤ ہات میں ہات تو دو
یہ وقت نہ یونہی بیت چکے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دُور چلیں، کہیں دُور چلیں

ہاں لو مٹر نے کچھ صورت لال نکالی ہے
پر ڈار تو اُڑتے کوّوں کی وہی کالی ہے
تم دل اپنا مجھے سونپ چکے، کیا سوچتے ہو
لو چرخ چوں رفتہ بڑھ بھی چلا، اب آ بھی چکو
یہ وقت نہ یونہی بیت چکے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دُور چلیں، کہیں دور چلیں

(کنفیوشس)

۴

سرخ رنگ دھوؤ نہیں!

ٹھنڈے پانی کے جوہڑ میں
دھوبی کپڑے دھوئیں
چھُوا چھو چلّائیں
نرمل پانی، اُجلا پانی کانپے اور تھرّائے
کسی کے کوڑے کھائے

میں ڈھیلے بازو لٹکائے
کب تک کھڑا رہوں گا
نیلے جل کے پھولوں میں سے
کتنے توڑ سکوں گا

کومل رنگ رنگیلے کپڑے
دھوپ[1] میں اور برکھا میں دُھل کر
پھیکے پڑتے جائیں
ان کے ساتھ بہاروں کے دن
اور خوشیوں کے سائے
ختم ہوئے مرجھائے
کیا اپنے سندر سپنے بھی
یونہی دھوکا دیں گے؟
خالی خواب رہیں گے؟

پتھرو! دھوبی کی موگریو!!
پت جھڑ کا موسم آیا ہے
لکڑی کے پل پر سے گزرتے
پلے کی پتلی تہ میں سے
میرا سایہ کانپ رہا ہے

ہوچی فینگ (جدید)

---

[1] دھوپ اور بارش زندگی کی تلخ حقیقتوں کے مظاہر ہیں

۵

برف کا گالا

برف کا میں اک گالا ہوتا
موج اُڑانے والا ہوتا
ہر اک منزل، ہر اک رستا
میرا دیکھا بھالا ہوتا

رپ رپ رپ رپ — خیر برادر
میں تو چلا نیچے دھرتی پر

میں نہ کسی وادی میں جاتا
اور نہ کسی ویراں گھاٹی پر
میں نہ کہیں گلیوں میں بھٹکتا
آوارہ سا — ادھر اُدھر

رپ رپ رپ رپ — دیکھ نہ بھائی
میری بھی اک منزل ٹھہری

اونچی زنگار رنگ فضا میں
آن بان سے گھوما کرتا
سجنی کی بگیا میں جا کر
سجنی کی رہ دیکھا کرتا

رپ رپ رپ رپ — اُس کے تو ہر سو
ناچ رہی ہے بھینی خوشبو،

تب میں یونہی اُڑتا اُڑتا
اُس کی چولی کو سہلاتا
اُس کے سینے کی لہروں میں
اپنے من کا منشا پاتا
اُن کومل لہروں میں آخر
گھل جاتا — بس گھل ہی جاتا

سوچہ مو (جدید)

تنقیدِ شعر اور حالی

عبدالقادر سروری

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اردو میں کم سے کم شاعری کی حد تک حالی کے تنقیدی کارنامے جدید عہد کے نقیب کہلا سکتے ہیں۔ حالی سے پہلے اردو تنقید زیادہ تر صوری اور اسلوبی تنقید تھی۔ تذکروں میں شعر کے صوری محاسن یعنی زبان اور اسلوب کی نزاکتوں کے بارے میں اشارے مل جاتے ہیں اور بدیع معانی اور عروض وغیرہ پر کھل کر بحث کی جاتی ہے۔ نثر عام طور پر ہمارے اہل تذکرہ ادیبوں کی چنداں توجہ کا سبب نہ بنی اور شعر کی اہمیت کے مدنظر صاحبان ذوق کی توجہ زیادہ تر شاعری پر مرکوز رہی۔ جدید عہد سے پہلے اردو نثر کی اصناف بھی گنی چنی تھیں اور اگر کسی کسی نے نثر کے بارے میں اظہار خیال کرنا چاہا ہے تو توجہ صرف روزمرہ، محاورہ اور صحت الفاظ ہی تک محدود رہی۔ بعض وقت شعرا نے یا مستند ادیبوں نے تقریظیں لکھی ہیں اسی طرح کی تحریروں کا اچھا خاصا ذخیرہ اردو میں مہیا ہے۔ لیکن تقریظیں معلق باتیں ہوتی ہیں۔ نثر کی تنقید سے متعلق کچھ اشارے بعض تحریروں میں ایسے بھی ملتے ہیں جن میں کسی ادبی کارنامہ کی زبان یا محاورہ پر تعریض کی گئی ہے۔ ایسی تحریروں میں رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" کا دیباچہ قابل ذکر ہے جس میں سرور نے میر امن کی "باغ و بہار" کی زبان پر تعریض کی ہے کہ:

> "میر امن صاحب نے کچھ اس درویش میں بکھیڑا اٹھایا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن حصے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک نام بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعوی کب سزاوار ہے، کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار رہا [illegible] ہے۔ مثل مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔ یہ وہی مثل ہے آپ [illegible] کر اپنے منہ سے دھنا [illegible]"

ایسی تحریریں بہت مجمل ہیں اور اکثر اوقات تعریض اور کبھی کبھی طنز و استہزا کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی تنقیدوں کو ہم ذوقی تنقید بھی نہیں کہہ سکتے وہ گھٹیا جذباتی تنقید کی مثالیں ہو سکتی ہیں۔

عہد جدید سے پہلے ہمارے یہاں ذوقی تنقید کے کچھ اشارے بعض وقت ہمارے سنجیدہ فکر تذکرہ نگاروں اور قدیم دور کے چند شعرا کے کارنامے مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر شعر سے تعلق رکھتے ہیں اور صوری تنقید کی مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔ اس نوع کی تنقید کی اچھی مثال گولکنڈہ کے قدیم شعرا میں وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" میں ملتی ہے۔ "در شرح شعر گوید" کے عنوان سے اس نے جو چند شعر لکھے ہیں ان میں وجہی نے شعر کو جانچنے کے معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہتا ہے:

کہتا ہوں تجھے پند کی ایک بات
کہ ہوتے [illegible] مینے و [illegible] بات

[illegible]

جو ہے ربط بستہ تو بیاں چست ! بھلا ہے جو یک بیت ہوے سلیس
نکو کر ترین تی تو لینے کا ہوس اگر خوب بولے تو یک بیت بس
اسی لفظ کوں شعر میں لاسے تو ن کہ لایا ہے استاد جس لفظ کوں ان
اگر فام ہے شعر کا بوجھ کرن جیب [illegible] چنے لفظ [illegible]

گویا وجہی شعر میں ربط معانی و سلاست کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں شعر کی خوبی کمیت پر نہیں بلکہ کیفیت پر ہے۔ شعر میں مستند و منتخب الفاظ اور بلندی معانی کی اہمیت پر بھی وہ زور دیتا ہے۔

گولکنڈہ کا ایک اور شاعر ابن نشاطی بھی اپنی مثنوی "پھول بن" کے آخری حصے میں شعر کے فن کے بارے میں کچھ اصولی باتیں بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اگرچہ شاعری کا فن ہے عالی ولے کیا کام آوے بات خالی
کہے ہیں شعر کوں جز ویست حکمت کہ جیسے بات بن کچھ ہونا نصیحت
اول بارے نصیحت اس میں اچھنا [illegible]

یہ شعر کا بڑا اخلاقی نظریہ ہے۔ ابن نشاطی معنوی اعتبار سے شعر کی اخلاقی قدروں پر زور دیتا ہے اور صوری اعتبار سے صنعت پر۔ صنعت نگاری کا وہ دلدادہ تھا چنانچہ "پھول بن" میں اس نے جو صنائع بدائع استعمال کیے ہیں ان کے بارے میں کہتا ہے۔

ہنر کوئی دکھاتے سو دکھایا صنائع ایک کم چالیس لایا !
بندھا ہر حرف سیتی یوں قرینہ تو جیسے بیچ میں صنعت کا نگینہ[12]

غواصی نے کوئی عام معیار شعر کے نہیں پیش کیے لیکن خود اپنی شاعری کے بارے میں اس نے جو اشعار کہے ہیں ان سے بھی فن شعر کے کچھ معیار قائم ہوتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری میں غواصی ملک الشعرا کی حیثیت سے مانا جاتا تھا اور اپنی اہمیت کا احساس بھی اسے تھا چنانچہ مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" میں "در صفت حال خود گوید" کے عنوان سے لکھا ہے[13]

دکھایا ہنر سو کمال کسب سلاست کے سیتی سو صافی دیا
نزاکت کوں میں آپنے خیال سے دکھایا ہوا بار یک کر بال سے[14]
دیا تازگی شعر کی وصف کوں سحر کر دکھایا ہر ایک بات کوں[15]

"طوطی نامہ" میں بھی "در صفت نظم ایں داستان گوید" کے عنوان کے تحت قدیم استاد شعرا کے [illegible] کی [illegible] پر اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے۔

جو یک بیت اوس کی اگر کوئی پڑھے[16] اثر [illegible] [illegible] چڑھے[17]
کہے شعر کوں [illegible] سے کر [illegible] [illegible] اپنا [illegible] [illegible] !!

[illegible] [12] [illegible] [13] [illegible] [14] [illegible] [15] [illegible] [16] [illegible] [17] [illegible] [18] [illegible] [19] [illegible] [20] [illegible]

ان اشعار سے شعر کے جو معیار ہاتھ آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ شعر میں سلاست اور صفائی نزاکت اور تازگی ضروری ہے اور اثر شعر کا بنیادی وصف ہے۔

بیجاپور کے شعرا میں صنعتی ہیں جنہوں نے (۱۰۵۵ھ) نے اپنی مثنوی "قصۂ بے نظیر" کے آغاز میں سخن اور شعر کی تعریف میں کئی شعر لکھے ہیں قدیم شعرا سخن، کلام اور شعر وزن کے لیے استعمال کرتے تھے صنعتی شعر کی روحانی قدروں کا زیادہ قائل نظر آتا ہے۔ کہتا ہے

سخن گنج ہے عالم الغیب کا　　سخن موج زن ملک لاریب کا

آگے وہ شعر کی حلاوت اور اس کی جاں بخش خصوصیت کے بارے میں کہتا ہے

سخن اَت شہد آئی میں حلوا اتھے　　سخن معجزۂ من و سلوا اہے
رکھن ہار سرسبز دل کا چمن !!　　سخن ہے سخن ہے سخن ہے سخن

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ غبی اور کند ذہن عمدہ شعر سرانجام نہیں کر سکتا

کہاں ہوئے کودن تے شعر سلیم　　کرے کاٹ، کاں آن ادرہ برگ نیم !

صنعتی، سخن سنجی پر سخن فہمی کو فوقیت دیتا ہے۔[1]

زیادہ ہے نزدیک اہل قیاس　　سخن بولنے تے سخن کا شناس

شعر کے حسن و قبیح کو جانچنے کے یہ معیار قدیم ہیں۔ مشرق میں یہی معیار پرانے زمانے سے مسلم رہے ہیں۔ مغرب میں یونانیوں کے یہاں بھی کچھ اسی طرح کے معیار ملتے ہیں۔ عموماً یہ ہوا ہے کہ ہر زبان کے علما اپنی معیاری اور مسلمہ ادبی اصناف کی بنا پر ادبی اور تنقید شعر کے اصول مرتب کرتے رہے ہیں۔ عربوں میں ابن رشیق اور دوسرے علما نے تنقید شعر کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر قصیدہ کو معیار مان کر لکھا۔ اصناف ادب کے ارتقا میں قومی مزاج اور طبیعت کو بہت دخل ہوتا ہے علما نے اکثر یہ کیا ہے کہ اپنی مانوس ادبی اصناف کی بنا پر جو تنقیدی اصول مرتب ہو سکتے تھے انہیں عمومیت کی شکل دے دی۔ یونانی علما نے عموماً یہی کیا ہے۔ مثلاً قواعد زبان مرتب کرتے ہوئے انہوں نے اپنی زبان کے جو قاعدے ہو سکتے تھے انہیں معیار مان کر دنیا کی دوسری ساری زبانوں پر انہیں کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ زبان کی طرح شعری تنقید میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ اپنی ادبی اصناف کے مطالعے سے جو اصول مستخرج ہوتے تھے، انہیں عمومی شکل دے دی، یونانی شاعری میں رزمیہ، لیرک (غنائی) اور ٹریجڈی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس اعتبار سے جو اصول، تنقید شعر کے ان کے یہاں مرتب ہوئے ان کی بنیاد بھی اصناف تھیں، اور جس طرح انہوں نے زبان کے قاعدوں میں تعمیم کر کے انہیں ساری دنیا کی زبانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اپنے شعری تنقید کے اصولوں کو شعر پر عام طور پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ یونان کے بہت کم علما ایسے تھے جو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتے ہوں۔

یونان کی قدیم ترین شعری تنقید کے جو آثار ملتے ہیں ان سے تنقید کے بارے میں دو تصورات واضح ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شعر میں اثر یا دلکشی ہونی چاہیے اور دوسرے یہ کہ شعر صداقت کا مظہر ہوتا ہے۔

جہاں تک شعر کے اثر اور دلکشی کے اصول کا تعلق ہے مغرب اور مشرق میں ہم آہنگی ہے صداقت شعری کے سلسلے میں تصورات بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہیں، شعری صداقت کا سائنٹیفک اور واضح تصور ابھرتے ابھرتے بہت عرصہ لگ گیا حالی سے پہلے شعرا کے کلام کے علاوہ تنقید شعر کے کچھ اشارے ہم کو بعض تذکروں میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہ اشارے

---

[1] ہے ۲ کہاں ۳۵ ہے

اصول کی ضرورت میں بہت کم ہیں مگر کچھ اصول عملی تنقیدوں سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس تلاش اور تحقیق سے جو اصول تنقید شعر کے بارے میں دستیاب ہو سکتے ہیں وہ یقیناً نامکمل ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر عربی اور فارسی شاعری میں مروج اور مقبول اصناف کی بنا پر مدون اور مرتب ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان اصول کو ساری دنیا کی شاعری پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح کسی اور زبان کے مخصوص اصناف شعر کے اصول پر اردو شاعری کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ تنقید شعر کے مجرد اور مطلق اصولوں کو ترقی کرتے اور نشو و نما پاتے پاتے کافی عرصہ لگ گیا۔ یہ اصول رفتہ رفتہ ہی نشو و نما اور تحقیق اور چھان بین کے طریقوں کے ترقی پانے کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتے ہیں۔ سائنسی انداز تحقیق کے طریقوں سے مشرق اور ہندوستان عام طور پر انیسویں صدی عیسوی سے پہلے مانوس نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے جب یورپ اور خاص طور پر انگریزی ادب ایک برتر اور فاتحین کے ادب کی حیثیت سے اردو کے علما سے روشناس ہوا تو اس سے ہمارے علما کی اثر پذیری ایک فطری بات تھی۔ آزاد اور حالی کو لاہور میں کچھ تو بعض انگریزوں کی ترغیب دلانے پر خاص طور پر حالی کو ترجمے کے محکمے میں کام کرتے ہوئے مغربی ادبی کارناموں اور ان کے دیباچوں اور مقدمات سے آگاہی کی وجہ سے اپنے ادبی کارناموں کو بھی مغربی اصول تنقید پر جانچنے کی خواہش فطرتاً پیدا ہوئی۔ اس میں کچھ ضرورت کو دخل تھا اور کچھ تقاضائے جدت۔

حالی جب شعر و شاعری کا جائزہ لینے بیٹھے تو ان کے سامنے شعری تنقید کے کچھ عمومی اور مجرد اصول تھے، جن پر انہوں نے اپنے کارنامے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے ابتدائی حصے میں بحث کی ہے۔ اس کے آخری حصے میں، ان اصولوں پر اردو شاعری کی مختلف اصناف کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقدمۂ شعر و شاعری ہندوستان کی جدید زبانوں میں شعری تنقید کے مغربی اصولوں پر لکھی ہوئی اولین کتاب ہے۔ اردو میں بلاشبہ یہ اولین مستقل کتاب ہے جس میں شعر کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مروجہ شعری اصناف اور اسالیب پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے شعر کو پرکھنے کے جو معیار ہمارے انشاپردازوں کے سامنے تھے، وہ بہت کچھ مختلف تھے۔ عام طور پر منظوم اور مقفیٰ کلام کو شعر سمجھا جاتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شعر کا مضمون اور اسلوب بھی پیش نظر ہوتا تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کم دیکھا جاتا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ بلکہ توجہ اس بات پر زیادہ رہتی تھی کہ کس طرح کہا جا رہا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہمیت زیادہ تر اس بات کو دی جاتی تھی کہ کوئی شاعر بحر اور قافیہ کی اصول کی کہاں تک پابندی کرتا ہے اور زبان روزمرہ اور محاورے کی صحت کا کس حد تک خیال رکھتا ہے۔

حالی سے پہلے کی تنقید کے نمونے ہمارے شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ تذکروں کا آغاز کسی شاعر کے کلام کی پسند سے ہوتا تھا۔ اچھے شعر بیاض میں یادداشت کے لیے لکھ لیے جاتے تھے اور شاعر کے بارے میں بھی کچھ معلومات قلمبند کر لی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ تذکرہ نگاری کے کچھ اصول بھی نشو و نما پائے اور یہ شاعری کی تاریخ کی شکل اختیار کرتے گئے۔ لیکن شعرا کی یہ تاریخ دراصل مطالعے کے لیے خام مواد اکٹھا کر دیتی تھی کیونکہ شاعر کی زندگی اور حالات کے بارے میں بہت کم چھان بین کی جاتی تھی۔ شعر کی پسند یا ناپسند کی بنیاد محض انفرادی ذوق ہوتا تھا۔ شعری تنقید جیسا کہ محترمہ صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے شعر کو عروض کی کسوٹی پر کسنا، اس کے لفظوں اور ترکیبوں پر اساتذہ کی سند لانا اور تذکیر و تانیث کی بحثوں میں الجھنا سمجھا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ حالی سے پہلے آزاد نے انجمن پنجاب کے نئے مشاعروں کی طرح ڈالتے ہوئے جو تمہیدی لکچر ۱۸۷۴ء میں دیا تھا اس میں جدید تنقید کے کچھ اشارے ملتے ہیں۔ آزاد نے نظم اور کلام موزوں کے بارے میں خیالات ظاہر کرتے ہوئے شعر کی حیرت انگیز تاثیر پر بہت زور دیا تھا اور فلسفۂ زبان کے کچھ خیالات کی ترجمانی بھی کی تھی۔ آزاد کو فارسی شاعری سے جو لگاؤ تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے رومی اور سعدی کی شاعری کو نمونہ سمجھا اور شعر کا اہم مقصد پند نصیحت اور ہدایت ظاہر یا مضمر قرار دیا تھا۔ آزاد کا یہ نظریہ دراصل شعر کی اخلاقی قدروں والا پرانا نظریہ تھا جو شعر کے موجودہ نقادوں کے پاس تمام و کمال قابل قبول نہیں۔ اخلاقی قدر حقیقت میں حیاتی قدروں میں سے صرف ایک قدر ہے۔ شعر کی قدریں اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اسی لکچر میں آزاد نے اردو شاعری کے مروجہ انداز پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان کا تعلق ہے ہمارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ اس معاملے میں ہماری زبان کسی سے کم نہیں۔ لیکن انہیں افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر اس زور اور جوش کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ وہ چند غیر ضروری احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "کیسی حسرت آتی ہے جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈال دیتے ہیں۔ وہ جوش میں آکر اپنے اہل وطن کو ابھارتے ہیں کہ:

"تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں تو تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گئی"

آزاد کی تقریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کچھ تو غالباً میجر فلر یا کرنل ہالرائڈ کے ایما پر اور کچھ انگریزی شاعری کے نمونوں کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اردو شاعری کچھ غیر ضروری حدود میں گھر گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس اوکھٹ گھاٹی سے باہر نکلنے کی کیا سبیل انھوں نے بتائی تھی؟ اور شاعروں کے لیے کیا متعین نظام تجویز کیا تھا؟ اس بارے میں آزاد کی تقریر اور لکچر سے کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔ صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ منزل کا انہیں کچھ شعور تھا لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی معین راہ وہ نہ بتا سکے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ آزاد ایک انشا پرداز تھے تجزیہ اور تحلیل سے ان کی طبیعت کو لگاؤ نہ تھا، وجہ کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ آزاد مرض کی تشخیص تو کر سکے لیکن علاج تجویز نہ کر سکے۔ اس لیے آزاد کی تقریر اور لکچر شعری تنقید کا کوئی نظام مرتب نہیں کرتا۔ ان سے محض شاعر کے مطالعے میں نئے معیار کی تلاش کا پتہ چلتا ہے اور موجودہ شاعری کے منہج سے اکتاہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بات کو آزاد نے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے کہ ہمارے شعر نے اپنی فضا کو غیر ضروری طور پر محدود کر لیا ہے حالانکہ وہ چاہتے تو فضا کی وسعتوں سے کام لے سکتے تھے۔

آزاد کے شاگرد غلام حیدر نثار کے ایک بیان سے جو نظم آزاد کے آخر میں چھپا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی تقریروں نے کافی ہل چل برپا کر دی تھی اور آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر بتاتے ہیں کہ آزاد کے "وہ قدم راہ غلط" کرنے پر ہر طرف سے ملامت کے نرغے میں تھے۔

اس پس منظر میں جب ہم "مقدمہ شعر و شاعری" پر نظر ڈالتے ہیں تو ان اوراق میں پہلی دفعہ ہم کو شعر اور مطالعہ شعر کے سارے پہلوؤں پر ایک نئے انداز سے روشنی پڑتی دکھائی دیتی ہے حالی کی بحث اور تحقیق کا انداز اور ان کے اکثر مباحث وہی ہیں جو جدید تنقید کے موضوع ہیں۔

حالی کو شعر و شاعری پر قلم اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے شعر کی ضرورت کا جواز دریافت کرنا تھا۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی کہ یونان کے سب سے بڑے مفکر افلاطون نے اپنے جمہوریہ کے خیالی ڈھانچے سے شاعر کو سے خارج کر دیا تھا۔ افلاطون کے ذہن سے صحیح یا غلط طور پر سوچنے والے اور بھی کئی علما کے پاس سماجی نظام میں شاعر کی ضرورت مسلّم ہی نہیں۔ بعض اہل رائے ایسے بھی ہیں۔ جو شعر کو جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں اس لیے آج کی سائنسی دنیا میں انہیں شعر کا کوئی مقام نظر نہیں آتا۔ حالی کے لیے اس نقطۂ خیال کو رد کرنا آسان کام نہیں تھا، لیکن انہوں نے دائم طبیعت اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی صلاحیت کی مدد سے اس نقطۂ خیال کی بڑی خوبی سے اصلاح کی ہے۔ حالی نے شعر کے جواز میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ حکیم علی الاطلاق نے اس ویرانہ آباد نما یعنی کارخانہ دنیا کی رونق اور انتظام کے لیے انسان کے مختلف گروہوں میں مختلف صلاحیتیں پیدا کی ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چنداں سودمند نہیں معلوم ہوتے مگر چونکہ قسّام ازل سے ان کو بھی حصہ پہنچا ہے اس لیے وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ جو شخص اس عطیہ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے کا ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔

حالی کا یہ استدلال اس انداز کا ہے کہ منکر بھی سوچنے پر مائل ہو جائے گا۔ حالی نے سماج میں شعر کی ضرورت کے مسئلے کو اور آگے بڑھانے کے لیے شعر کی تاثیر کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ استدلال کا یہ طریقہ جدید یہی طریقہ ہے جو کسی مسئلے کو ثابت کرنے میں بہت وزنی ہوتا ہے۔

حالی نے ان لوگوں کے خیال کی بھی بڑے سلیقے سے اصلاح کی ہے جو شعر کو زمانہ جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری شائستگی میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔

شعر کی اخلاقی قدروں کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ کچھ علما تو شعر کے ساتھ کسی افادی یا تربیتی مقصد کے وابستہ کیے جانے کے خیال ہی سے جز بز ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر زور دیتے ہیں کہ شعر کا مقصد محض شعر ہے۔ شعر سے ورا شعر کا کوئی مقصد قرار دینا ان کے خیال میں بدذوقی ہے۔ کچھ اور علما اس خیال کو رد کیے بغیر شعر کی اخلاقی قدروں کو سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ آزاد کا خیال اس بارے میں اوپر بتایا جا چکا ہے۔ حالی بھی اس مسلک کے حامی ہیں۔ چنانچہ "مقدمہ" میں یہ بحث انہوں نے بڑی خوبی سے کی ہے کہ شعر انسان کی روحانی خوشیوں کو اکساتا ہے۔ انسان کی روحانی خوشیوں کے ساتھ اخلاق کا تعلق بدیہی ہے۔ پھر انہوں نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ شعر علم اخلاق کی طرح براہ راست تلقین اور تربیت نہیں کرتا۔ لیکن از روئے انصاف اس کو عام اخلاق کا نائب مناب کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تائید میں ان صوفیا کے مسلک کو پیش کیا ہے جو سماع کو قرب الٰہی اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ مانتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کہ سماع کا رکن شعر ہی ہے۔

شعر کی ضرورت، اور اہمیت کے مسئلے کو زینہ بزینہ اٹھانے کے بعد حالی ذہن کو شعر کی عظمت کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ شعر کی تاثیر کو مسلّم اور اس کی اخلاقی قدر کو بدیہی ماننے کے بعد حالی اپنے پیش رو علما کی ہمقدمی پر قناعت نہیں کر لیتے۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری سب کچھ ہونے کے باوجود سوسائٹی کے تابع ہے اس مسئلے پر حالی نے طویل اور مدلل بحث کی ہے۔ اور شعر کو عالم تخیل سے مینائے آب و گل میں اتار دیا ہے۔ حالی کی بحث سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شاعری میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجوہات کی تلاش ہم کو سماج میں کرنا چاہیے۔ لیکن اس اصول کو مان لینے کے بعد یہیں پر رکا نہیں جا سکتا، استقرا کی مدد سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شاعری کا مبدا بھی سماج ہے۔ شاعری سماج سے اٹھتی ہے سماج میں پلتی ہے، سماج حیات ملی ہے اور حیات ملی

یہی حالت ہے جو شاعری سماج سے اپنے رشتے توڑ لیتی ہے۔ وہ حیات سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے اور اپنے مبدا سے کٹ جاتی ہے۔ حالی نے شاعری کو سوسائٹی کے تابع بنا کر حقیقت میں اردو شاعروں اور نقادوں کے ذہن کو نہایت ترقی پذیر تصور سے روشناس کرایا تھا۔

شعر کی ماہیت، اور شعر کے عناصر یا لوازم سے بھی حالی نے بحث کی ہے یہ بحث بھی چند دھماکو عناصر سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً قافیہ اور ردیف کی جھنکار اور سہارے پر قدم اٹھانے والے شاعروں سے حالی کا یہ کہنا کہ قافیہ اور ردیف شعر کے لوازم سے نہیں بلکہ نظم کے لوازمات سے ہیں۔ ان کی ساری ذہنی بنیادوں کو ڈھا دینے کے مترادف تھا۔

اپنے تجزیہ پسند ذہن کی مدد سے حالی نے شعر اور نظم یعنی "پوئٹری" اور "ورس" کے درمیان پہلی دفعہ فرق کیا، شاعری کی شرطوں میں سب سے اہم شرط انہوں نے مطالعہ کائنات کی مقرر کی ہے۔ یہی در اصل وہ پہلو ہے جہاں ہمارے پرانے شاعر بیٹھے نظر آتے ہیں، اپنے الہام کے پیچھے، صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنے کی بجائے، انہوں نے اساتذہ کے دیوان رٹ لینے کو زیادہ پسند کیا۔ دوسروں کی زمین غزل پر صرف کرنا، بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی، مضمون پر مضمون باندھنے کی عادت بھی، دراصل اسی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔

حالی نے یہ بھی تفصیل لکھی ہے کہ شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں۔ یہ مواد ان کو انگریزی کے مشہور شاعر، ملٹن سے حاصل ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں تاریخ تنقید میں، ملٹن کے تنقیدی خیالات کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں ملٹن کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شعر میں قافیہ کے التزام کی مخالفت اور بے قافیہ نظم کی وکالت کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ بڑا شاعر تھا، اور حالی کے زمانہ میں وہ مقبول انگریزی شاعر تھا۔ اس لیے حالی نے اس کے بعینہ اصول کو تنقید شعر کے بنیادی اصول سمجھ لیا اور اسی سے انہوں نے جہاں تک شعر کی معنوی تنقید کا تعلق تھا، کام لیا۔ سادگی اصلیت اور جوش، جو ملٹن کی نظر میں، شعر کے لازمی اجزا ہیں ان میں دو اجزا، یعنی سادگی اور اصلیت سے، حالی سے عین پہلے کی شاعری، بیگانہ ہو رہی تھی۔ جوش، یا ایک اور نقاد کے الفاظ میں، جذبات کا از خود چھلکاؤ، یا تو سرے سے پایا ہی نہیں جاتا تھا، اور شعر ذہنی کاوش کا نمونہ بن گیا تھا، یا پھر بے موقع اور حد سے بڑھا ہوا تھا۔

حالی نے منطقی حیثیت سے، سادگی اور اصلیت کا جس احتیاط سے تجزیہ کیا ہے، وہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ شاعری میں جوش کے مفہوم کو سمجھاتے ہوئے انہوں نے مروجہ اردو شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے، اور اس میں وہ سارے امور گنائے ہیں جن کی وجہ سے، ہماری شاعری، سادگی، اصلیت اور جوش، سب سے دور ہو رہی تھی۔ یہ تبصرہ حقیقت میں، حالی کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا نچوڑ ہے انہوں نے ملٹن کے اصولوں کی روشنی میں، اردو غزل اور قصیدہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔ حالی کی صحت پسند طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ "خدائے سخن" میر کی شاعری میں ساری خوبیاں ہی خوبیاں دیکھے۔ چنانچہ سادگی بیان کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے بعض شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے سادگی بیان کو سب چیزوں پر مقدم سمجھا ہے جیسے میر، درد، اثر اور مصحفی وغیرہ لیکن چونکہ انہوں نے قدما کے خیالات سے بہت کم تجاوز کیا ہے، اس لیے ان کے دیوان زیادہ تر بھرتی اور پر تکلف اشعار سے بھرے ہوئے ہیں۔

سرسید اور حالی کے زمانے میں ایک اصطلاح "نیچرل شاعری" کی چل پڑی تھی جسے ادبی حلقوں میں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نیچرل شاعری کردہ یہ مفہوم پہناتے تھے کہ، وہ شاعری ہے، جو نیچریوں سے منسوب ہے اور جس میں نیچرل خیالات اور تصورات پیش کئے جاتے ہیں۔ سرسید اور حالی "نیچری" کہلاتے تھے، چنانچہ سرسید کی اصلاحی مساعی کے مخالفین اور ادیبوں کا وہ گروہ جو

"اودھ پنچ" سے وابستہ تھا۔ انہیں "نیچری" کے لقب سے موسوم کرتا تھا، اور سرسید اور ان کے رفقائے کار کی خوب ہنسی اڑائی جاتی تھی۔ حالی نے نیچرل شاعری کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں یا دانستہ پھیلائی گئی تھیں، ان کا تذکرہ کیا ہے اور نیچرل شاعری کے حقیقی مفہوم کو، جو ان کے ذہن میں تھا، واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالی نے شعر میں سادگی کے لوازم یعنی زبان اور اس کی درستی کی اہمیت پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کو خاص طور پر نیچرل شاعری کے جس کے وہ سرگرم وکیل تھے، اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے، اردو کے مروجہ ذخیرۂ الفاظ اور اسالیب کی تنگ دامانی کا احساس تھا اسی لیے وہ ہندی بھاشا سے استفادہ اور ہندی کے الفاظ کو اردو میں داخل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اس موقع پر حالی بعض ایسی لسانی بحثوں میں بھی الجھ گئے ہیں جن کی یہاں قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ یہ زبان کے مستند مرکزوں کی بحث ہے۔ یہ بحث دراصل حالی سے پہلے کے عہد کی ایک نہایت نزاعی بحث تھی۔ حالی کی بحث میں ایک کھلا تضاد یہ ہے کہ وہ اردو کو ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع اور عام زبان مانتے ہوئے بھی اسے لکھنؤ اور دہلی کے مرکزوں میں مقید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل میں یہاں حالی اپنے آپ کو ان ٹکسالوں سے وابستہ رکھنا اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اہل دہلی اور اہل لکھنؤ میں سے کوئی بھی حالی کو اہل زبان نہیں مانتا تھا اور یہ روایت آج تک برابر چلی آ رہی ہے۔ حالانکہ خود حالی کو اردو دنیا نے ایک ایسی سند کے طور پر مان لیا ہے جس کی زبان نے اردو کو دہلی اور لکھنؤ کی شخصی اور جغرافی قیود سے آزاد کر دیا ہے۔

صحیح ہے کہ حالی زبان کے سلسلے میں کوئی تعمیری اور منظم تجویز پیش نہ کر سکے۔ ہاں انہوں نے اردو زبان کو وسعت دینے اور اس کی سند کے شخصی اور جغرافی معیاروں کو معروضی اور عملی بنانے کے لیے اردو کی مستند لغات اور قواعد زبان کی تدوین کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

• مقدمہ شعر و شاعری" کا بڑا حصہ تنقید شعر کی نظری بحثوں پر مشتمل ہے اس حصے میں عملی تنقید کے بھی چند نمونے اس سلسلے میں مل جاتے ہیں۔ جہاں انہوں نے اپنے تنقیدی اصولوں پر اردو شاعری کو جستہ جستہ طور پر جانچا ہے۔ "مقدمہ" کا آخری حصہ اردو شاعری کی عملی تنقید سے متعلق ہے۔ اس حصے میں انہوں نے اردو کی مختلف اصناف شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ میں، غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی اور دوسری اہم یا غیر اہم اصناف کو حالی نے تنقید شعر کے نئے اصولوں پر جانچنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی حالت فی زمانہ ابتر ہے، اور وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف ہو کر رہ گئی ہے۔ قصیدہ کی حالت کو بھی وہ ناگفتہ بہ بتاتے ہیں اور مثنوی کے محض عشقیہ قصوں تک محدود ہو کر رہ جانے کی انہیں شکایت ہے۔ مرثیہ قصائد ہی کے ذیل میں آ جاتا ہے۔ یہی تین اصناف ایسی ہیں جنہیں حالی، اردو شاعری کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ ان کا محاسبہ کیا ہے اور ان کی اصلاح اور انہیں مقتضائے زمانہ کے مطابق بنانے کی تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔۔

حالی کا یہ جائزہ ان لوگوں کے لیے جو اردو شاعری اور اس کی اصناف کو مثالی اور خطا سے بالاتر مانتے تھے۔ بڑا ہی ناگوار ثابت ہوا۔ حالی نے خاص طور پر غزل میں جو باتیں بنیادی مانی جاتی تھیں، ان پر حملہ کر کے، شعرا کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اس لیے جیسا کہ محترمہ صالحہ عابد حسین نے کہا ہے۔ "مقدمہ" حالی کی سب سے زیادہ مشہور، سب سے زیادہ معتوب اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ثابت ہوئی۔

حالی نے محض اصول اور ضابطے مدوّن کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان اصناف کو اپنے بیان کیے ہوئے اصولوں کے مطابق برتا بھی۔ حالی کی عظمت کا حقیقت میں بہت بڑا یہ پہلو ہے۔ اصول سازی ہمیشہ آسان کام ہے۔ لیکن عملاً ان اصولوں کو اختیار کرنا، اتنا آسان نہیں۔

عملی شعری تنقید کے کارناموں میں حالی کی تصانیف "حیات سعدی" اور "یادگار غالب" حالی کے مضبوط کارنامے ہیں۔ "حیات سعدی" میں، سعدی کے کلام اور تصانیف پر حالی کی تنقید کا ایک حصہ ان کی تصانیف کی مقبولیت سے متعلق ہے جو حصہ کلام اور تصانیف کی براہ راست تنقید سے متعلق ہے۔ اس میں نچلا حصہ حالی نے "مقدمہ" کے مبینہ اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی، بلکہ بعض جگہ تنقید کے روایتی انداز سے بھی کام لیا ہے۔ اس حصے میں وہ تقابلی تنقید کے طریقے سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے ما فی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں۔

اُردو شاعری کی عملی تنقید میں "یادگار غالب" کا وہ حصہ اہمیت رکھتا ہے جس میں حالی نے مرزا کے کلام پر "ریویو" کیا ہے۔ یہ حقیقت میں وہ مقام تھا، جہاں حالی، اپنے مقررہ اصولوں سے زیادہ سے زیادہ وابستہ رہ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے بعض اور علما کی طرح اپنے آپ کو اصولوں سے سختی کے ساتھ بندھا ہوا رکھنے کی بجائے، کسی قدر آزادہ روی سے بھی کام لیا ہے اور خیالات کے بہاؤ کے رُخ پر نکل گئے ہیں۔ اصل میں اچھی تنقید بھی تخلیق ہوتی ہے اور تخلیق کے تحت شعور میں اصول کارفرما ہو سکتے ہیں، لیکن مصنف کا ان کے ساتھ بندھ جانا، اکثر عمدہ تخلیق کا باعث نہیں ہوتا۔ حالی کی تنقید کا اصل موضوع تو مرزا غالب کی غزل گوئی ہے۔ لیکن ان کے قطعات اور رُباعیوں کی جانب بھی مجمل اشارے ملتے ہیں۔

مرزا کی غزل پر حالی کی تنقید کا اسلوب کچھ روایتی سا بن گیا ہے۔ وہ غزل گوئی کا بہ حیثیت مجموعی جائزہ نہیں لے سکے ہیں بلکہ اپنے جائزہ کو انھوں نے خانوں میں بانٹ لیا ہے۔ مختلف عنوانات قائم کر کے ان کے ماتحت غالب کے اشعار پیش کرنے اور ان کی شرح کرنے کے طریقے کو حالی نے پسند کیا ہے۔ ایک بات ضرور قابل توجہ ہے کہ حالی نے تنقید محض عصری اور اسلوبی تنقید تک محدود نہیں رکھا۔ اس تنقید میں یہ بات واضح ہے کہ حالی کی معلومات کا دائرہ محدود تھا۔ اس لیے وہ مغرب کے غنائی شعرا سے غالب کی غزل کا تقابلی مطالعہ نہیں کر سکے۔ انھوں نے عام طور پر فارسی کے غزل گو شعرا سے بھی غالب کا مقابلہ نہیں کیا اور یہ ضروری بھی نہیں تھا۔ بلکہ بعض وقت ایسا مقابلہ خطرناک بن جاتا ہے جہاں تک غالب کے کلام کی شرح اور تفہیم کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالی کی تشریحوں نے، اس کے محاسن اور معنویت کی جانب لوگوں کی توجہ منعطف کرانے میں بنیادی خدمت انجام دی

"یادگار" میں حالی نے مرزا کی اُردو نثر پر بھی نظر ڈالی ہے۔ لیکن حالی کی نثری تنقید، اس انشائیے کے موضوع سے خارج ہے۔

دارا شکوہ کا دیوان

پروفیسر محمد علم الدین سالک

شہزادہ دارا شکوہ، شاہ جہان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ماں باپ دونوں اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ممتاز محل کی پہلی دو اولادیں لڑکیاں تھیں۔ شاہ جہان کو لڑکے کی خواہش تھی۔ وہ اس غرض کے لیے اکثر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ؒ کے آستانہ مبارک پر حاضر ہوا کرتا تھا۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور دارا ۲۹ صفر المظفر ۱۰۲۴ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو اجمیر کے مقام پر پیدا ہوا اور غرہ محرم ۱۰۶۹ھ کو بمقام دہلی قتل کیا گیا۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کی عجیب وغریب تاریخ لکھی ہے۔

عقل پائے ادب گرفت و گفت — قتل دارا شکوہ شد تاریخ
۲ + ۱۰۶۷ = ۱۰۶۹ھ

دارا کی تعلیم وتربیت عام مغل شہزادوں کی طرح بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ اس زمانے کے مشہور اساتذہ اور علما اس کی تعلیم وتربیت پر مقرر ہوئے۔ ان میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، ملا میرک اور شیخ ہروی کا ذکر دارا کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے۔

خطاطی اس زمانے میں ایک شاہانہ وصف سمجھا جاتا تھا۔ دارا کو نستعلیق کا مشہور عالم استاد ملا عبدالرشید دیلمی میسر آیا اور اس نے اس فن میں خوب مہارت حاصل کی۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں دارا کی لکھی کتابیں اور وصلیاں آج بھی ملتی ہیں جن سے اس کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے۔

فنون سپہ گری کے بغیر شہزادوں کی تعلیم مکمل نہ سمجھی جاتی تھی۔ دارا نے اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ سامو گڑھ کا معرکہ دارا کی سپاہیانہ مہارت کا آئینہ دار ہے۔

بہرحال دارا نے اپنے دادا شہنشاہ جہانگیر اور اپنے باپ شاہ جہان کی سرپرستی میں رہ کر گوناگوں کمالات حاصل کیے اور اسے "شاہ بلند اقبال" کا خطاب ملا۔ طبیعت میں تصوف کا مذاق موجود تھا۔ اس پر تلاش حق کا جنون دماغ میں سما گیا۔ اس لیے اس کی تصانیف میں ایسی ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو اسلام کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہیں۔ گو بعض ارباب تصوف نے انہیں مختلف پہنے پہنا کر عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دارا کی آزاد روی، تلاش حق کا سودا اور ریاضت وعبادت سے کنارہ کشی کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔

دارا جب جوان ہوا تو تصنیف کا قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۹ھ میں جب وہ عمر کی پچیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس نے

پہلی تصنیف دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ سفینۃ الاولیا تھی جس میں اس نے چار سو گیارہ ۴۱۱ بزرگانِ دین کے حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب میں اپنے آپ کو حنفی اور قادری کہتا ہے۔ یہ کتاب ۲۷ رمضان سنہ ۱۰۴۹ھ کو مکمل ہوئی جس کے تھوڑا عرصہ بعد وہ ملا شاہ بدخشانی کے مریدوں میں شامل ہوا۔

اس کے تین برس بعد سنہ ۱۰۵۲ھ میں اس نے اپنی دوسری کتاب سکینۃ الاولیا لکھی جس میں دارا نے بڑے مزے لے لے کر حضرت میاں میر کے حالات بیان کیے ہیں۔ وہ اکثر انہیں حضرت باری تعالیٰ کہتا ہے اور حسنات العارفین میں اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے۔

"چوں ایشاں در کوہ ہائے نزدیک قصبہ باری عزلت گزیں بودند من ایشاں را باری تعالیٰ می گفتم"

دارا کو صوفیا سے والہانہ عقیدت تھی۔ وہ اکثر صوفیا سے ہمہ اوست اور فنا کے مسائل پر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ یہ خط و کتابت بے حد دلچسپ ہے۔ اس سے دارا کی ادیبانہ شان ظاہر ہوتی ہے۔ فنا کے مسئلے پر وہ سرمد کو لکھتا ہے۔

"پیر و مرشد من" ہر روز قصد ملازمت دارد۔ میسر نمی شود۔ اگر منم ارادۂ من معطل چرا؟ و اگر من نیستم چہ تقصیر مرا؟ قتل امام حسین اگر چہ مشیت ایزد است پس یزید درمیان چیست؟ و اگر غیر مشیت است پس معنی "یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید" چیست؟ نبی مختار بہ جنگ کفار می رفت۔ شکست در اسلام می افتاد۔ علمائے ظاہر می گویند تعلیم صبر است۔ منتہی را تعلیم چہ در کار؟"

سرمد نے اس کا جواب ایک نہایت بلیغ شعر میں دیا۔

اے عزیز ؎

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم!
الّا حدیث دوست کہ تکرار می کنم!

غرض دارا نے اپنے اشعار میں بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ شاعر تھا، قادری تخلص کرتا تھا۔ ہر مغل شہزادے کی طرح وہ شعر و سخن کا دلدادہ اور شعرا کا قدردان و مربی تھا۔ اچھے شعر کی داد دل کھول کر دیتا اور شاعر کو انعام سے مالامال کر دیتا تھا۔ رضی مشہدی نے ایک دفعہ ایک غزل کہی۔ اس میں یہ شعر دارا کو بہت پسند آیا ؎

"تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود!

دارا نے اس پر اسے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا اور خود اس شعر کے جواب میں یوں کہا ؎

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن
قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود!

یہ موقع نہیں کہ دارا کی تمام تصانیف پر مفصل بحث کی جائے۔ سردست ہم اس کے دیوان کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ دارا کا دیوان نہایت مختصر ہے اور بہت کمیاب۔ اس وقت تک اس کے بہت کم نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو نسخے نامکمل اور دو نسخے جو بظاہر مکمل ہیں دیمک خوردہ ہیں۔ ایک دفعہ نگار کے فاضل مدیر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دارا کا کلام ان کے پاس موجود ہے اور وہ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر تقریباً چوتھائی صدی گزر چکی ہے مگر دیوان ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوان دارا کا نہیں کسی اور کا ہے۔ گو سرخوش کلمات الشعرا میں اور طاہر نصیرآبادی اپنے تذکرہ میں اس

اس بات کو تسلیم کرنے میں کہ دارا صاحب دیوان تھا۔ اس کی تائید رضا قلی ہدایت ریاض العارفین میں کرتا ہے۔ خود دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان دارا شکوہ کا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک مقطع ہے ؎

چوں بدارائے خویش دل بسپرد　　قادری نیز عین دارا شد

اس کے علاوہ دیوان میں بہت سے ایسے تاریخی شواہد ملتے ہیں اور ایسی تاریخی شخصیتوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے جو دارا سے متعلق تھیں۔ ان پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

دیوان قادری اپنے دور کی فارسی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ زبان صاف، شستہ اور سادہ ہے۔ خیالات صوفیانہ ہیں جنہیں دارا بڑی آسانی سے بیان کرتا ہے۔ انداز میں سرمستی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ انہیں بڑی بے تکلفی کے ساتھ نظم و نثر میں ادا کرتا ہے۔ یہ خیالات زیادہ تر تصوف کے نہایت اہم ترین مسائل ہمہ اوست اور فنا کے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کے متعلق کہتا ہے ؎

ہر سو کہ نظر کنی ہمہ اوست　　وجہ اللہ عیان ست روبرو را

پھر اسی مضمون کو یوں ادا کرتا ہے ؎

گفت انا الحق وہ او خود فوتی　　دار گفت و کشید و خود را خود
در پس پردہ گفتگو می کرد　　پردہ برداشت دید خود را خود

وہ اس مضمون کو بار بار بیان کرتا ہے۔ مگر سیر نہیں ہوتا۔ وہ ہر بار ایک نیا انداز اختیار کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

خویشتن را جدا نمی دانم　　لیک خود را خدا نمی دانم
قطرہ را نسبتے کہ با بحر است　　بیشتر زیں روا نمی دانم

فنا کے متعلق اس کی یہ غزل دیکھئے۔ کس سرمستی سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے ؎

ہمہ موجود در وجود ما　　گنج مخفی ست ایں نمود ما
گرچہ در پردہ داشتم آواز　　شد زنے ظاہر ایں سرود ما
ماند دیدیم ہیچ غیر خود　　غیر نمود در شہود ما
وہم فانی شود نہ ما فانی　　ہست باقی ہمہ وجود ما
سر ما خم کرشد بجانب ما　　از پئے خویش شد سجود ما
خویشتن را گرفتہ بنشستیم　　اے خوشا ہم چنیں قعود ما
فرق در قادری و قادر نیست
عین اخلاق شد قیود ما

ایک اور غزل میں وہ ہمہ اوست اور فنا کے مقامات پر بحث کرتا ہوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں کہتا ہے ؎

یک وجود ہوست لا محدود　　کہ بردل بود تو ز حد حدود

کرد خواہش بدیدن رُخ خویش چوں کہ بر حسن کنج مخفی بود
پس ز بُو عاشقی ہویدا شد از ہمی خواست جملہ شد موجود
حسن خود بر سبیل تجلی دید نام آں گل محمد مرفرد
از محمد ہزار گل بشگفت یک دو نام احمد و محمود
گفت معشوق خویش بود ایں نام شد کلید در خزانۂ جود
بعد ازاں غیرتش خدائی خواست شد احد او رسول گفت و شنود
خامش با دوست حرف ناگوید گشت قرآن خویش را بہ ستود
چوں نظر کرد در صفاتِ خویش شد حبیب کریم در رب ودود
آسمان و زمیں بشد پیدا چوں حباب از میانِ دریا زود
گفت زآماز خویش آں دریا از ہماں موج و نقش ہائے نمود
گرمی و شور عشق چوں اُفتاد نام خود کرد شاہد و مشہود
آخر از عشق جملہ پیدا شد ایں کہ دیما تمام عشق کشود
نقطۂ مہر چوں تمام بشد عبد در نام گشتہ شد معبود
قادری جملہ از تو پیدا شد
آنچہ بود است و ہست و خواہد بود

ملاؤں کی تنگ نظری سے مخلوق ہمیشہ نالاں رہی ہے۔ دارا کے مذہبی اعتقادات پر بھی اکثر لے دے ہوتی رہی ہے اور اس میں ملا ہمیشہ سب سے آگے ہوتا تھا۔ دارا اس کا زخم خوردہ تھا۔ اس واسطے وہ ملا کے متعلق اپنے دلی جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے۔ ؎

بہشت آنجا کہ ملاّئے نباشد ز ملاّ بحث و غوغائے نباشد
جہاں خالی شود از شور ملاّ ز فتویٰ ہاش پروائے نباشد
در آں شہرے کہ ملاّ خانہ دارد در آنجا ہیچ دانائے نباشد
مبیں اے قادری نور وئے ملاّ
مرو آنجا کہ شیدائے نباشد

پیری مریدی اور بیعت کے جواز و عدم جواز پر ہمیشہ بحثیں چلتی آرہی ہیں۔ دارا نے اس کے جواب میں ایک غزل لکھی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

طعن کردی تو بر ارادت من من ز طعن تو کے شوم دلگیر
من ہیچگونہ مرید کس نشدیم از ارادت مرا سرشت خمیر
من مریدم بحضرت میراں ہست دشنام پیش من بے پیر
کے ارادت کنی تو با پیرے نگذارد ترا چو نفس شریر

مردم شہر ما چو بے پیر اند
قادری ماند فاش از تقدیر

دیوان میں اس زمانے کے مشہور روحانی بزرگوں کی منقبت بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ دارا کا پیر طریقت کبھی لاہور اور کبھی کشمیر میں رہتا تھا اس لیے پنجاب، لاہور اور کشمیر اس کی ارادت کے خاص مرکز تھے۔ وہ پنجاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوتا ہے ؎

باز چوں جان و دلم بے تاب ہست   باز چوں چشمان من بے خواب ہست
عشق پنجابم نمودہ بے قرار   زاں کہ نقش دوست در پنجاب ہست
کعبۂ من حضرت لاہور داں   سجدۂ من سوئے آں محراب ہست

قادری را کعبہ دارا پور شد

کاندراں بسیار فتح الباب ہست

دارا پور لاہور کا ایک مشہور محلہ تھا یہاں حضرت میاں میرؒ قیام پذیر تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل آپ کا مزار اور نادرہ بانو بیگم کی قبر واقع ہے۔ دارا نے یہ محلہ اپنے دادا پیر کے نام سے پر آباد کیا تھا۔ ایک اور غزل میں وہ حضرت میاں میرؒ کی منقبت کرتا ہوا کہتا ہے ؎

دل شدہ فارغ از ہمہ تدبیر   می شود آنچہ ہست در تقدیر

خطرہ اندر دلم نمی آید   خطرہ ہا دور کرد میاں میرؒ

داراشکوہ کی عقیدت کا دوسرا بڑا مرکز ملا محمد شاہ عرف ملا شاہ بدخشی ہے۔ جب تک حضرت میاں میرؒ بقید حیات رہے ملا شاہ گرمیاں کشمیر میں اور سردیاں لاہور میں بسر کیا کرتے تھے۔ مگر جب حضرت میاں میرؒ سنہ ۱۰۴۵ء میں فوت ہو گئے تو انہوں نے مستقل طور پر لاہور میں رہنا شروع کر دیا۔ جہاں آرا بیگم نے ان کے لیے ایک نہایت خوبصورت خانقاہ سرینگر میں تیار کرائی جہاں دارا اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ یہ خانقاہ کوہ ماراں کے دامن میں واقع تھی۔ اب بھی اس کے کھنڈرات وہاں پائے جاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے دارا یہ شعر ان کی منقبت میں اکثر پڑھا کرتا تھا ؎

کوہ ماراں، بکمر لعل بدخشاں دارد   ایں چنیں بخت کجا تخت سلیماں دارد

ملا شاہ کی منقبت میں بھی دارا کے دیوان میں کئی غزلیں ملتی ہیں۔ ایک غزل ہے ؎

مرا بخشیدۂ ملک ہدایت   کہ آں ملک مرا بود نہایت
دلم پروائے صد دشمن ندارم   مرا چوں شاہ دارد در حمایت
تو کردی بخشش شاہانہ اے شاہ   نہ کرد از اولیا دیگر نوابت

تو کردی قادری را خانہ آباد

سلامت بر سرش دارد خدایت

ایک اور غزل میں آپ کی منقبت کرتے ہوئے دارا کہتا ہے ؎

ذات او ہست شیخ اہل اللہ   اہل توحید را اماں باشد
صورت جامع حقیقت شرح   شرح او را نگہباں باشد

ایک نہایت عمدہ غزل حضرت پیران پیر شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں بھی ہے جس کے لفظ لفظ سے عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ بیان نہایت سادہ، انداز نہایت دلنشیں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

حضرت پیر آں خداوند جہاں   غوث جن و انس و شاہ عارفاں
محی دین شیخ عبد القادر ست   آں کہ او را عرش باشد آستاں
سید سادات محمد اولیاء   شیر دیں شہباز اوج لامکاں
رہنمائے شاہراہِ احمدی   دستگیر جملۂ درماندگاں!
ہر کجا پائے نہادی بر زمیں   فخر کردے آسماں زیں بر کتاں

خواجہ بہاؤ الدین نقشبند، سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ دارا کو ان سے بھی عقیدت تھی۔ دیوان میں دو غزلیں ان کی مدح میں بھی موجود ہیں۔ ایک کا مطلع ہے ؎

قطب دنیا و دین بہاؤ الدین   نقشبند یقین بہاؤ الدین

شاہ جہانی دور کی ایک مشہور شخصیت حضرت ایشاں بھی تھی۔ ان کا نام محمد اور عرف خواجہ خاوند محمود تھا۔ کشمیر میں سلسلہ نقشبندیہ کو انہیں کی وجہ سے فروغ ہوا۔ بعض سیاسی حالات کی بنا پر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا مستقل قیام لاہور میں رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے لاہور کے سب سے امیر اور دولت مند محلہ مغل پورہ میں اقامت اختیار کی اور یہیں اپنی مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور مفسر تھے ۱۰۵۲ھ میں فوت ہو کر یہیں دفن ہوئے۔ دارا نے آپ کا مرثیہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا کے تعلقات آپ سے نہایت مخلصانہ تھے۔ مرثیے کے چند شعر یہ ہیں ؎

چوں نباشد آسماں با چشم تر   چوں سفر فرمود شیخ بحر و بر
شیخ ہفت اقلیم طاؤس خرام   پیشوائے اولیائے معتبر
آں محمد کز نمی آمد برون   اہل شرق و غرب را گردیدہ سر
روز و شب می گرد بر گرد حرم   کاں چناں گردش نیاید از بشر
اولیا را مرگ، می باشد حرام   لا یموز اہست چوں اندر خبر
در ہزار و پنج و دو چوں رفت او   روز سہ شنبہ و پنج از صفر
قادری گریاں بماند از ہجر او
گرد از دارے بدارے چوں سفر

دیوان سے دارا کے مذہبی اعتقادات خاص کر توحید، رسالت، ختم نبوت، حبِّ اہل بیت اور خلفائے راشدین سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ توحید کے بارے میں اس کا خیال ہے ؎

ترک زنار کردہ ام زاں رُو   تار وحدت نبود در زنار
قادری نیست ہیچ جز قادر   وحدہٗ لا الٰہ الا ہوٗ!

متوجہ مشو بغیر خدا   رشتۂ بست سبحہ و زنار

رسالت کے بارے میں اس کے خیالات ملاحظہ ہوں ؎

چند بازی تو بہ شریعت خود   احمد مرسل از خداست سوا

ختم نبوت کے متعلق کہتا ہے ؎

تو ہمنشین من شدہ گر بدار دائم   چوں ختم النبیین باید ز صحبت

خلفائے راشدین کے بارے میں کہتا ہے ؎

نیست بیچارہ ہیچ کار درست   نیست چیزے چو چار یار درست
بہر تخت نبی ہمیں باید   پایۂ چار استوار درست

پنجتن ؎

ذاتِ او ہست پنج اهل اللہ   اہل توحید را اماں باشد

دارا کو جس لاڈ پیار سے ماں باپ نے پالا، جس طرح اسے عزیز رکھا اور ہر بات میں اس کی ناز برداری کی، اس سے اسے یہ وہم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز ہے۔ چنانچہ دیوان میں اس کے متعلق جا بجا اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان اشعار سے پورا پورا استفادہ اٹھانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہم یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ شاہ جہان اپنی جگہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کا جانشین دارا ہو گا۔ اس نے اسے "شاہ بلند اقبال" کا خطاب بھی عطا کیا۔ اسے چتر شاہی اور دیگر لوازمات شاہی استعمال کرنے کی اجازت بھی دیدی۔ اس واسطے دارا اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے ؎

قرنہا ہم چو قادری باید   قادری صاحبِ قرآں گشتہ

ہر چند کہ نیست سایہ از ذاتِ خدا   لیکن بود سایۂ شہ غیر نما

دانم چوں بگویند مرا سایۂ حق   ترسم کہ ازیں دوری آید حق را

بعض اشعار سے دارا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ حُبِ زر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس واسطے کہتا ہے ؎

دستِ زر آلود بدبو می‌شود   جانِ زر آلود را احوال چیست

دارا کے خیال میں بنیادی سچائیاں ہر مذہب میں موجود ہیں۔ اس لیے وہ ہر مشرب کے لوگوں سے راہ و رسم رکھتا اور ان سے میل ملاپ بڑھاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ دنیا پر ظاہر کرتا تھا کہ اس کا مسلک صلح کل ہے اور اسے کسی مذہب اور کسی فرقے سے عداوت نہیں۔ اس کی وجہ فلسفہ ہمہ اوست ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

قادری دید تا ترا در کل!   صلح کل کرد از عناد گذشت

داراؔ رازداری پر بہت زور دیتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ روحانی اور مادی دنیا میں کامیابی کا راز یہی ہے کہ اپنے اسرار کو چھپاؤ اور اگر کوئی رازدار بنانا چاہتے ہو تو اپنے دل کے سوا کسی کو رازدار نہ بناؤ ؎

رازِ خود را بغیر دل تو مگو   رازداری بغیر دل نہ بود

بعض بعض اشعار شریعت کے نقطۂ نظر سے کھٹکتے ہیں جن پر فقہا خوردہ گیری بھی کرتے رہے ہیں اور جو آخر میں اس کی تباہی کے باعث بنے مثلاً

کفر و دیں در رہش پویاں   وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

قادری گشت قادر مطلق   از پئے ہر فنا کہ آں بقاست

قادری زود عین قادر شد   چوں مدد کرد قادر بغداد

ہم محمد توئی و ہم اللہ   ایں عنایت تراست . . .

قادری راز قدرت کامل   قادر ذوالجلال سازدمے

یہ داراؔ کے دیوان کا ایک نہایت سرسری مطالعہ ہے۔ افسوس ہے کہ دیوان کا کوئی اچھا نسخہ میسر نہ آنے کی وجہ سے بعض اشعار نہ پڑھے جا سکے۔ بہرحال جو کچھ مل سکا اس سے داراؔ کی اُفتاد طبیعت، اس کے احوال اور اس کے اعتقادات کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے اس سے داراؔ کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے اور وہ اسباب بھی سامنے آجاتے ہیں جن کی بنا پر اسے ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر دیوان کے ساتھ ساتھ داراؔ کی دیگر تصانیف کو بھی سامنے رکھا جائے تو دارا اور اس کے دور کی بڑی دلچسپ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ایسی تاریخ جس کے سمجھنے میں اس دور کے مسلمانوں کی خوبیوں اور کمزوریوں کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور ان عوامل کا سراغ بھی مل سکتا ہے جو مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے "آناً فاناً" زوال کا باعث بنے۔

گُل بکاؤلی

محمد عبداللہ قریشی

اردو کے قدیم نثری قصوں اور منظوم افسانوں میں قصہ گل بکاؤلی بہت مشہور ہے جس میں تاج الملوک اور بکاؤلی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ اصل کہانی کی تاریخ کا علم تو خود تاریخ کو بھی نہیں۔ البتہ ہندوؤں کی بعض قدیم کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں جن سے مستنبط ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس کے متعلق کوئی کتاب سنسکرت وغیرہ میں لکھی گئی ہوگی مگر اس کا کوئی ثبوت آج تک نہیں مل سکا۔

فارسی زبان میں یہ قصہ پہلے پہل عزت اللہ بنگالی نے ۱۷۲۲ء (۱۱۳۴ھ) میں اپنے ایک دوست نذر محمد کی فرمائش پر لکھا اور اس دوست کی وفات کے بعد اس کی یادگار کے طور پر اسے شائع کیا۔

اس فارسی قصے کی مقبولیت دیکھ کر فورٹ ولیم کالج کے مشہور پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کے عہد میں نہال چند لاہوری سے اسے اردو نثر میں ترجمہ کرایا۔ اس ترجمہ کا نام "مذہبِ عشق" ہے۔ کتاب کے آخر میں ہجری اور عیسوی تاریخیں اس طرح نکالی گئی ہیں[1]:۔

غرض جس طرح سے کیا اس کو شاد — ہماری بھی دے یا الٰہی مراد
یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام — تو پھر فکرِ تاریخ تھی صبح و شام
یکایک سنی میں نے آوازِ غیب — کہ ہے "مذہبِ عشق" تاریخ و نام

۱۲۱۷ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلک و زباں — کریں عیسوی سال کو بھی عیاں
تو پھر ہاتفِ غیب نے دی ندا — کہ اس "مذہبِ عشق" میں کوئی آ
کرے "مشربِ جام" اگر اختیار — تو رازِ نہاں اس پہ ہو آشکار

۵۸۶

یعنی "مذہبِ عشق" کے ۱۲۱۷ اعداد میں "مشربِ جام" کے ۵۸۶ عدد ملانے سے ۱۸۰۳ء حاصل ہو جائیں گے۔

لالہ نہال چند کے آباؤ اجداد شاہجہان آباد دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد ترکِ وطن کرکے لاہور آ گئے اور آگے چل کر لاہوری کہلائے۔ اس قصے میں انہوں نے نہایت صحیح، بامحاورہ اور باقاعدہ زبان لکھی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ قصہ ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا۔

---

[1] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۴۲

دوبارہ اشاعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے نظرثانی کی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف مطابع میں کئی مرتبہ طبع ہوا اور ہمیشہ شوق سے پڑھا جاتا رہا۔ سر ابراہیم گریرسن نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی فہرست دی ہے جو نہایت طویل ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین ایم۔ اے ڈی فل صدر شعبۂ اردو حمیدیہ کالج بھوپال نے اس قصے کے مختلف نسخوں اور ترجموں کی کیفیت یوں بیان کی ہے[1]:

فارسی۔ گل بکاؤلی از عزت اللہ بنگالی ۱۷۲۲ء (۱۱۳۴ھ)
مثنوی از فرحت اٹھارویں صدی کے آخر میں۔
اُردو۔ دکنی نسخہ ۱۱۳۵ھ بارود خانہ اودھ کے کتب خانے میں (اسپرنگر)
مثنوی تحفۂ مجالس سلاطین بقول دتاسی یہ تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۷۳۸-۹ء (۱۱۵۱ھ) نکلتا ہے لیکن دراصل ۱۱۵۹ھ نکلتا ہے۔ رام بابو سکسینہ "تحفۃ المجالس" نام دیتے ہیں اور اس سے ۱۰۵۲ھ برآمد کرتے ہیں۔
گلگشت منظوم یا خیابانِ ریحان از ریحان الدین ریحان لکھنوی ۱۲۱۱ھ (انجمن ترقی اُردو)
مذہبِ عشق از نہال چند ۱۸۰۳ء (۱۲۱۷ھ) عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ کا ترجمہ۔
مثنوی گلزارِ نسیم از دیا شنکر نسیم ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ)
گل بکاؤلی قلمی منظوم ۱۲۹۱ھ از محمد داؤد علی ۲۶ داستان اور پانچ لطیفے۔ مصنف حیدرآباد سے کلکتہ گیا اور ٹیپو سلطان کے خاندان کی سرپرستی میں رہا (کتب خانہ مسعود حسن رضوی)
ہندی۔ بکاؤ سمن از بیج سنگھ ورما ۱۸۷۶ء لکھنؤ۔ مذہبِ عشق کا ترجمہ۔
فرانسیسی۔ از گارساں دتاسی ۱۸۳۵ء
انگریزی۔ از ٹی۔ پی مینول۔ مذہبِ عشق کا ترجمہ۔
از لفٹیننٹ آر۔ پی اینڈرسن ۱۸۵۱ء دلی۔
کلوسٹن نے دتاسی اور مینول سے لے کر ۱۸۸۹ء میں اے گروپ ایسٹرن رومانسس (A GROUP
EAST RN ROMANCES) میں شامل کیا۔
از باوا جھجو سنگھ ۱۹۰۳ء۔

مذہبِ عشق کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ پورب کے کسی بادشاہ زین الملوک کے چار بیٹے پہلے سے موجود ہیں۔ پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے جو بادشاہ کو بہت محبوب ہوتا ہے مگر نجومی اسے بادشاہ کے لئے نحوست آثار قرار دیتے ہیں بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اگر بادشاہ نے کبھی اسے دیکھ لیا تو اندھا ہو جائے گا۔ زین الملوک نے شیر خوار بچے کے لئے شہر سے باہر ایک مکان بنوا دیا مگر تقدیر کے سامنے کیا چارہ۔ ایک روز بادشاہ شکار سے واپس آ رہا تھا کہ نورِ چشم پر نظر جا پڑی۔ اسی وقت آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ علاج کے لئے

---

[1] اُردو کی نثری داستانیں مطبوعہ کراچی ۱۹۵۴ء صفحہ ۵۸۶ و ۵۸۷۔

ہزاروں تدبیریں کیں مگر ایک نہ چلی۔ آخر ایک بزرگ نے کہا کہ شفا صرف اس پھول سے ممکن ہے جو بکاولی پری کے چمن میں ہے۔ بادشاہ کے چاروں بڑے بیٹے اس گلِ نایاب کی تلاش میں نکلتے ہیں اور سفر کرتے کرتے ایک شہر میں پہنچتے ہیں جہاں ایک بیسوا دلبر نامی رہتی ہے۔ وہ بازاری عورت چوسر کھیلنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور ایک بلی اور چوہے کی مدد سے ہمیشہ بازی جیت لیتی ہے۔ چاروں شہزادے اس کے ہاں جاتے ہیں اور اپنی تمام دولت بلکہ آزادی تک ہار کر اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ وہ انہیں قید کر لیتی ہے۔ بالآخر پانچواں شہزادہ تاج الملوک اپنے بھائیوں کی تلاش میں وہاں پہنچتا ہے اور اس عیارہ کے مکر و فریب کو تاڑ کر ایک نیولے کی مدد سے اسے کھیل میں شکست دیتا، اسے اپنی لونڈی بناتا اور تمام شہزادوں کو اس کی غلامی اور قید سے نجات دلاتا ہے۔ پھر کئی قسم کی مصیبتیں جھیل کر گلِ بکاؤلی کی تلاش میں باغِ ارم کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ راہ میں ایک ہیبت ناک دیو اسے ملتا ہے جسے دیکھتے ہی شہزادے کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ دیو خوش ہوتا ہے کہ آج مدت کے بعد لذیذ شکار نصیب ہوا ہے۔ اتنے میں دیو کو چند اونٹ آٹا، روغن اور شکر وغیرہ سے لدے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ غرّاتا ہوا جاتا ہے اور ان سب کو اٹھا لاتا ہے۔ چونکہ بوجھ زیادہ ہوتا ہے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ تاج الملوک موقع غنیمت جان کر نہایت لذیذ حلوہ تیار کرتا ہے جو دیو کے ہوش میں آنے تک بالکل تیار ہوتا ہے۔ دیو شیرینی کھا کر بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ اے آدمی زاد! مانگ کیا مانگتا ہے۔ شہزادہ گلِ بکاؤلی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ دیو وہاں کے بہت سے خوفناک نظارے بیان کرنے کے بعد آخر اپنی بہن حمالہ دیونی کے نام ایک خط دیتا ہے کہ اس آدمی زادے کی مدد کی جائے۔ حمالہ کے پاس ایک آدم زاد لڑکی محمودہ عرصہ سے مقید تھی جسے وہ جان و دل سے عزیز رکھتی تھی۔ اس نے تاج الملوک اور محمودہ کے تعلقات میں ایسی مضبوط گرہ ڈال دی جسے جیتے جی کوئی نہ توڑ سکا۔ محمودہ کی سفارش سے حمالہ نے بہت سے دیوؤں کو جمع ہے بنا کر باغِ بکاؤلی تک ایک سرنگ کھدوائی۔ تاج الملوک اس سرنگ کی راہ اس حوض تک پہنچا جس میں وہ پھول تھا۔ پھول اٹھا لیا اور خوابگاہِ بکاؤلی میں جا کر اپنی انگشتری نشانی کے طور پر اس سے بدل لی۔ بکاؤلی نے جب آنکھ کھولی اور وہ پھول وہاں نہ پایا تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بہت روئی، بہت پیٹی، کسی پر غصے ہوئی، کسی کو ڈرایا دھمکایا، کسی پر چوری کا الزام لگایا۔ مگر جو اصل گلچیں تھا اس کا پتہ نہ چلا۔

تاج الملوک وہ پھول لے کر دلبر بیسوا کے ملک میں پہنچا۔ تمام قیدیوں اور اپنے بھائیوں کو غلامی کا نشان لگا کر رہائی دلائی۔ مگر راستے میں چاروں بھائیوں نے وہ پھول اس سے چھین لیا اور باپ کے پاس لے گئے جس سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

ادھر بکاؤلی گل کے فراق میں دیوانی سی ہو گئی۔ اسے پھول چرانے والے سے غائبانہ عشق ہو گیا۔ وہ اپنے پھول اور دل کے چور کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ ماری ماری پھرتی رہی اور بےشمار تکلیفیں اٹھانے کے بعد جب وہ زین الملوک کے ملک میں پہنچی تو اس نے بادشاہ کے اندھا ہونے اور اپنے پھول کی کرامت سے دوبارہ بینائی حاصل کرنے کا چرچا سنا۔ وہ فوراً ایک خوبرو آدمی کا روپ دھار کر بادشاہ کے دربار میں پہنچی۔ بادشاہ اس کی باتوں سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنا وزیر بنا لیا۔

تاج الملوک نے اپنے دیس پہنچ کر حمالہ دیونی کا ایک بال جو اس نے مشکل کے وقت کے لئے دیا تھا آگ پر رکھا۔ حمالہ فوراً حاضر ہو گئی۔ اس نے پوچھا محمودہ کہاں ہے؟ کہا اس کے رہنے کے لئے نہ مکان ہے نہ باغ نہ حوض، اس لئے ان سب چیزوں کی ضرورت ہے۔ حمالہ نے دیووں کی مدد سے تاج الملوک اور محمودہ کی خاطر قلعہ بکاؤلی کے نمونہ پر ایک عالیشان محل گلشنِ نگارین تعمیر کرایا جس کی دھوم بادشاہ زین الملوک تک پہنچی۔ بادشاہ اس سے ملنے کے لئے آیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ کا وزیر فرخ یعنی بکاؤلی بھی ہمراہ تھا۔ تاج الملوک نے باتوں ہی باتوں میں بادشاہ سے پوچھا، آپ کے کتنے شہزادے ہیں؟ بادشاہ نے چاروں بیٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ایک اور بھی تھا مگر اس کمبخت نے تو مجھے

دھوکا دیا۔ یہ چاروں شہزادے بکاؤلی کا پھول لائے جس سے مجھے پھر بینائی نصیب ہوئی۔ تاج الملوک نے ہیرا دلبر کی زبانی چاروں شہزادوں کی کرتوت سے بادشاہ کو آگاہ کیا اور جان جوکھوں میں ڈال کر بکاؤلی کے پھول تک پہنچنے اور سُرنگ لگانے کا تمام ماجرا کہہ سنایا۔ باپ نے بیٹے کو گلے لگایا اور فرطِ محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

بکاؤلی نے جب اپنے تاراج ہونے کی کہانی سنی تو بیتاب ہو کر اپنے وطن گلزارِ ارم چلی گئی۔ وہاں سے تاج الملوک کو ایک فراقیہ خط لکھا اور ہمن پری کے ذریعے اپنے محبوب کو اپنے پاس ہی بلا لیا۔ بکاؤلی کی ماں کو جب بیٹی کی نگاہ بازیوں اور لگاوٹوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے تاج الملوک کو دریائے طلسم میں ڈال کر بیٹی کو قید کر دیا۔ تاج الملوک عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتا رہا۔ آخر اسے ایک عصا اور ٹوپی دستیاب ہوئی جس کی مدد سے وہ جہاں چاہتا پہنچ جاتا۔ اس طرح وہ ایک ایسے لق و دق صحرا میں پہنچا جہاں دیووں اور پریوں کی حکومت تھی۔ وہاں روح افزا نام ایک پری نے جو بکاؤلی کی چچازاد بہن تھی، تاج الملوک کو اپنا دکھڑا سنایا کہ کس طرح یہاں کے دیو نے اسے والدین سے جدا کر کے قید کر رکھا ہے۔ غرض لاٹھی اور ٹوپی کی مدد سے دونوں یہاں سے اڑ کر روح افزا کے وطن میں جا پہنچے۔ روح افزا کے واپس آ جانے پر گھر گھر خوشیاں ہونے لگیں۔ یہ خبر سن کر جمیلہ بھی اپنی بیٹی بکاؤلی کے ہمراہ مبارک سلامت کے لئے آئی۔ یہاں تاج الملوک اور بکاؤلی کی ملاقات بھی ہو گئی۔ روح افزا کی ماں حسن آرا اور خود روح افزا نے جمیلہ سے کہہ سن کر بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کرا دی اور دونوں ہنسی خوشی باغِ ارم میں رہنے لگے۔

شہزادہ کو جب وطن کی یاد آئی تو بکاؤلی کو ہمراہ لے کر گلشن نگارین آیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد بکاؤلی کو راجہ اندر نے یاد کیا۔ تاج الملوک بھی سایہ کی طرح تختِ رواں کے ساتھ تھا اور راجہ اندر کی محفل میں جہاں بکاؤلی ناچتی گاتی تھی برابر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ بکاؤلی ڈرتی تھی کہ راجہ کو خبر ہو گئی تو دونوں کو ہلاک کرا دے گا مگر شہزادہ کی ضد سے مجبور تھی۔ جب راجہ بکاؤلی کے گانے سے خوش ہوا تو اس نے کہا کہ آج مانگ جو مانگنا ہے۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ بکاؤلی نے تاج الملوک کو دکھا کر اس کی فرمائش کی۔ راجہ اندر ایک آدم زاد کو اپنی محفل میں دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے بکاؤلی کو بد دعا دی جس سے اس کا نصف بدن پتھر کا ہو گیا جو بارہ برس تک رہا۔ شہزادہ بھی در بدر پھرتا رہا۔ جب سنگلدیپ میں آیا تو بکاؤلی کے نصف انسانی جسم سے درد فراق کی باتیں کیں۔ اس اثنا میں راجہ چتر سین والئے سنگلدیپ کی لڑکی چتراوت شہزادے پر عاشق ہو گئی مگر وہ نہ مانا۔ آخر جب اس کو چوری کے الزام میں بے گناہ قید کر دیا گیا تو اس نے شادی کا اقرار کر لیا۔ شادی ہو گئی اور ایک عرصہ تک باہم ملتے رہے۔

بارہ برس گزرنے کے بعد جب بکاؤلی نے ایک کسان کے گھر نیا جنم لیا تو تاج الملوک بھی اس دہقان زادی کے حسن کا شہرہ سن کر وہاں پہنچا۔ چونکہ دل پہلے ہی سے ملے ہوئے تھے بغیر کسی تکلیف و تردد کے شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد دونوں چتراوت کے محل میں آ گئے۔ اس کو ساتھ لے کر تاج الملوک اپنے وطن گلشن نگارین میں پہنچا جہاں دلبر اور محمودہ پہلے ہی سے بال بندھی موجود تھیں۔ تاج الملوک کا وزیر بہرام روح افزا پر عاشق ہو گیا اور آخر بکاؤلی کی سعی سے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ غرض ؎

حاصل ہوئی ان گلوں کو بے خار　　سیرِ شبِ زلف صبحِ رخسار
جس طرح انہیں بہم ملایا　　بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

اس قصے کے اجزائے ترکیبی کچھ ایسے ہیں کہ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ تاج الملوک اور بکاؤلی کی شادی پر ختم ہوتا ہے۔ ایک حیثیت سے قصہ یہیں ختم ہو گیا ہے۔ وصل کی راہ میں جو مزاحمتیں تھیں وہ عبور کر لی گئی ہیں۔ تمام مشکلات اور مسئلے حل ہو چکے

ہیں۔ ہمارے جذبۂ استفہام کو کسی بات کا انتظار نہیں رہتا۔ یہاں تک قصے پر فارسی رنگ ہے۔ اس کے بعد دوسرا جزو شروع ہوتا ہے۔ مصنف قصے کو طول دینے کے لئے شاخسانہ نکالتا ہے۔ یہ حصہ راجا اندر اور رام نگر کے بیان سے شروع ہوتا ہے اور بکاؤلی کے دوسرے جنم کے تکمیلی حالت میں آنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ خالص ہندوستانی ہے۔ اس کے بعد کہانی کو آگے بڑھانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ تیسرا حصہ بہت مختصر ہے۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن ہی بدل جاتے ہیں۔ یہاں تاج الملوک اور بکاؤلی کی بجائے بہرام وزیرزادہ اور روح افزا منظر پر آجاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے قصے کو دوسرے حصے کے بعد اور بڑھانا چاہا مگر اس سے آسانی ممکن نہ ہوا کہ بکاؤلی و تاج الملوک کو لے کر ہی کچھ اختراع کر سکے۔ اس لئے بہرام اور روح افزا کو قصے کے درمیان لایا گیا۔ یہ حصہ ایک ضمنی کہانی کی حیثیت رکھتا ہے اور اصل کتاب سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کا خیال[1] ہے کہ اس قصے کے بعض حصے قدیم داستانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً دلبر بیسوا شہزادے کو گل بکاؤلی کی مہم سے روکنے کے لئے برہمن اور شیر کی حکایت سناتی ہے۔ یہ پنچ تنتر کے دکنی نسخے میں موجود ہے۔ شمالی ہند کے نسخوں میں کچھ اختلاف سے ہے۔

تاج الملوک اپنے بھائیوں کو زندان سے رہا کراتا ہے لیکن وہ اس سے دغا کرتے ہیں۔ یہی الف لیلہ میں شہزادہ خداداد کی کہانی میں ہے۔

پھول یا کسی اور چیز کے آنکھوں سے چھوانے سے بینائی کا عود کر آنا بھی نیا خیال نہیں۔ اس کی ابتدائی مثال حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ ہے۔

دیووں کے ذریعے محل تیار کرانا الہ دین چراغ عرب ہی میں نہیں ہندوستانی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

گل بکاؤلی میں ایک لڑکی دیو سے جنس تبدیل کر کے مرد ہو جاتی ہے۔ یہ مہابھارت کے ادھیوگ پرو سے لیا گیا ہے۔ شکھنڈی عورت تھی لیکن مرد کی طرح پرورش کی گئی۔ شادی کے موقع پر وہ جنگل میں گئی اور ایک یکش سے جنس بدل کر مرد ہو گئی۔ طلسمی جنگل کے ایک حوض میں غوطہ لگا کر تاج الملوک عورت ہو جاتا ہے۔ جنس بدلنے کی مثالیں بیتال پچیسی کی چودھویں کہانی میں بھی ملتی ہیں۔ سند باد کی کہانی میں جنس بدلنے کے کنوئیں کا ذکر ہے۔ الف لیلہ کی دوسری کہانیوں میں چشمہ کا پانی پینے سے یا چشمہ میں غوطہ لگانے سے جنس بدلنے کا ذکر پایا جاتا ہے۔

قصہ گل بکاؤلی میں جو طلسم ہے اس کی مثالیں داستان امیر حمزہ یا بوستان خیال میں بھری پڑی ہیں۔

اندر سبھا کا ذکر سنسکرت ادب میں تفصیل سے ملتا ہے اور ہر شخص اس سے واقف ہے۔

بہار دانش میں چھٹے وزیر کی کہانی میں ایک شخص چھپ کر پری کے ساتھ پریوں کے ملک میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے شادی کر کے لوٹتا ہے۔ تاج الملوک کا اندر سبھا میں پہنچ جانا کوئی مشکل نہ تھا۔

قصے کے خاتمے میں بہرام کو خانہ آباد کیا جاتا ہے۔ کامروپ میں اس کا رواج گل بکاؤلی سے پہلے بھی تھا۔

داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ گل بکاؤلی ہندوستان ہی میں لکھا گیا۔ پنچ تنتر کی کہانی، شکھنڈی کا قصہ اور اندر سبھا کا ذکر کافی ثبوت ہیں۔ دلبر بیسوا کا چوسر کھیلنا ہندوستانی بات ہے۔ بکاؤلی ایک مٹھ میں قید ہوتی ہے۔ مٹھ کے انہدام کے بعد وہاں سرسوں اُگتی ہے۔

---

[1] اُردو کی نثری داستانیں صفحہ ۴۱۴۔

[2] اُردو کی نثری داستانیں صفحہ ۱۶۲-۱۶۴۔

اس کے تیل سے کسان کی بیوی کے حمل ٹھہرتا ہے اور بکاؤلی نیا جنم لیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف آواگون یعنی تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ قصے کی ہندوستانی اصل کا قوی ثبوت ہے۔ قصے کی عام فضا فارسی داستانوں کی سی ہے۔ تمام نام فارسی ہیں۔ قصے کا مرکزی نام بکاؤلی بھی ہندی یا سنسکرت کا نہیں۔ اس کے علاوہ مرغ اور صیاد کی حکایت ہے جن حضرت سلیمانؑ کے دربار میں انصاف کیا جاتا ہے۔ یہ کسی اسلامی روایت سے لیا گیا ہوگا۔

"مذہب عشق" کے چھبیس باب ہیں اور چونکہ ساری کتاب میں ایک ہی طویل قصہ ہے اور ہر باب میں اس کا ایک حصہ یا داستان بیان ہوئی ہے اس لئے ہر باب کو داستان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اکثر داستانیں "کہتے ہیں" سے شروع ہوتی ہیں۔ اُردو ترجمہ میں اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے گئے ہیں اور زینتِ کلام کے لئے جو تکرارِ لفظی ہوتی تھی اس کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ترجمہ اصل سے بہت کم ہٹنے پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طرزِ بیان ٹھیٹ اُردو کی کتابوں کی طرح زیادہ سادہ اور سلیس نہیں۔ جا بجا شاندار الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے ترجمے پائے جاتے ہیں۔ ترجمہ میں آزادی کو مطلق کام میں نہیں لایا گیا۔ ساری کتاب پر فارسیت سوار ہے۔ بعض جگہ ہندی کے الفاظ بھی ہیں لیکن جس زمانے کی یہ کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہیں۔ ان کے معاصرین میر امن، شیر علی افسوس اور مظہر علی وِلا وغیرہ کی کتابوں میں ہندی الفاظ کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے اس کے مقابلے میں ان کی تحریر کو ہندی الفاظ سے بالکل خالی سمجھنا چاہیے۔ عبارت کا نمونہ دیکھیے۔ جب بکاؤلی نیند سے جاگی اور اس نے گلاب کے حوض میں گل کو نہ دیکھا تو اس کے چور کی تلاش میں نکلی۔ دیکھیے کیا نقشہ کھینچا ہے:

> "جب بکاؤلی نے جادو بھری آنکھ کھولی اور خواب راحت سے چونکی، پشواز نازسے پہنی، کنگھی سے بالوں کو سنوارا، دوپٹہ اوڑھا، آہستہ آہستہ چھوٹی سہیلیوں سے حوض کی طرف چلی۔ ہر ہر قدم پردہ گل اندام اپنے نقشِ قدم سے زمین کو پائیں باغ بناتی تھی اور گردِ راہ سے چشم بلبل میں سرمہ لگاتی تھی۔ جب حوض کے کنارے پر پہنچی دستِ نگارین سے گلاب اپنے رخسار پر ڈالنے لگی اور چہرے کا غبار کہ عنبر کے مانند تھا دھو دھو کر گلاب میں ملانے اور حوض کو چاروں طرف چشم مست ناز سے دیکھنے بھالنے لگی۔ ناگاہ گل بکاؤلی کی جگہ پر نظر جا پڑی۔ ہر چند بغور و تامل نگاہ کی کچھ اس کا نشان نظر نہ آیا۔"[1]

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

> "کہتے ہیں کہ تاج الملوک فقیروں کے بھیس میں اپنے بھائیوں کے پیچھے چلا جا رہا تھا کہ ان کا ارادہ کما حقہ دریافت کرے۔ الغرض وہ جہاں اُترے ہوئے تھے وہ بھی آن پہنچا اور ایک کونے میں بیٹھ کسان کی لن ترانیاں اور چرلاتیاں جھوٹی جھوٹی سننے لگا۔ آخر رہ نہ سکا۔ سامنے آکر رُو بہ رُو کہنے لگا "آپس میں یہ کیا بیہودہ باتیں کر رہے ہو۔ اپنا منہ دیکھو، گل بکاؤلی میرے پاس ہے" اور اسی وقت اس کو کمر سے کھول کر ان دغابازوں کے سامنے رکھ دیا۔ شہزادے

---

[1] ارباب نثر اردو از سید محمد ایم اے صفحہ ۲۴۵

غصے میں آ کر بولے بھلا اس کو مان، کہ تیری بات سچی نہ ہو تو ہم جو چاہیں تجھ کو سزا دیں
تاج الملوک نے کہا سانچ کو کیا آنچ۔ بہت بہتر!"

"جب تاج الملوک سے ان ناعاقبت اندیشوں نے گل بکاؤلی چھین لیا اور وہ بیچارہ دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ مثل ہے کہ قہر درویش بجان درویش۔ پھر پیچ فہموں کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ ایک جنگل جو درختوں کا مسکن تھا اس میں جا پہنچا اور چقماق سے آگ جھاڑ کر حمالہ کے دیئے ہوئے بال کو اس پر رکھ دیا۔ چوتھائی بھی نہ جلا ہوگا کہ وہ اٹھارہ ہزار دیووں سمیت آ پہنچی اور تاج الملوک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر آگ ہو گئی کہ اے شہزادے میری بیٹی کو کیا کیا اور تو نے اپنا حال کیا بنایا؟ تاج الملوک بولا کہ آپ کی توجہ سے سب خیریت ہے لیکن ایک کام مجھے نہایت ضروری ہے اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے آپ کو تصدیع دی ہے۔ حمالہ نے کہا کہ اے عیار باتیں نہ بنا۔ وہ کون کام ہے جلدی کہہ۔ تاج الملوک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک محل اور باغ کہ ہو بہو بکاؤلی کے قصر اور باغ سا ہو، بناؤں۔ تم جس طرح جانو جلد بنوا دو۔ وہ بولی اے بیٹا! یہ کتنی بڑی بات ہے۔ مگر میں نے اس باغ اور عمارت کو نہیں دیکھا۔ بھلا بن دیکھے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں اور بنوا دوں۔ تاج الملوک بولا جس طرح میں کہوں اسی طرح بنوا دو۔ حمالہ نے اسی وقت کئی سو دیو لعل بدخشانی کے لئے اور سینکڑوں عقیق یمانی کے لئے اور ہزاروں روپے اور جواہر بیش قیمت کے واسطے ہر چہار طرف بھیجے۔ دیوؤں نے تین روز کے عرصہ میں جواہرات وغیرہ کے جابجا تودے لگا دیئے۔ پھر شہزادہ جس طرح بتانے لگا اسی طرح وہ بنانے لگے۔ پہلے تو دو نیزے مٹی کھود کر پھینک دی اور وہاں زر خالص بھر دیا اور اس قطعہ طلائی پر جڑاؤ عمارتوں کی بنا ڈالی۔ غرض تھوڑے دنوں میں ویسا ہی قصر و سا طرح کا باغ جواہر نگار جڑاؤ بہترین درختوں سمیت اور زبرجد اور یاقوت کے۔ دو دالان عالی شان آمنے سامنے بیچ میں ان کے ایک حوض مرصع اسی قطعہ کا گلاب سے معمور بنایا۔ پھر ایک مکان میں فرش اسی رنگ کا بچھوایا۔ حاصل یہ کہ جتنا جواہر سونا روپیہ دیو لائے تھے اس میں سے آدھا مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔ چوتھائی کارخانہ جات کی تیاری کو دے دیا اور باقی خزانے میں داخل کیا۔"

ان مثالوں سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ زبان عام طور پہ ہموار نہیں۔ دو تین سطریں سادہ و صاف ہوتی ہیں پھر فارسی ترکیبیں آنی شروع ہو جاتی ہیں جن سے روانی مجروح ہوتی ہے اور قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا احساس ہوتا ہے۔

اگرچہ اخلاقی حیثیت سے مشرقی ادب میں اس قصے کا کوئی درجہ نہیں۔ پھر بھی جوتے کی خرابیاں جیسی تاج الملوک کے بھائیوں کو پیش آئیں

غیر کفو میں شادی یا محبت کے مصائب جو تاج الملوک اور بکاؤلی پر گزرے۔ جاہلانہ ضد اور نامناسب بے اعتباری کی اذیتیں جو ہمارے ہیرو کے ہاتھوں راجہ اندر کے حکم سے بکاؤلی کو سہنی پڑیں سب بے احتیاطی اور بھید کو محفوظ نہ رکھنے کا نتیجہ جس سے تاج الملوک نے وہ پھول اپنے ہاتھ سے گنوا دیا جس کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کی، اتنے ہاتھ پاؤں مارے —— اور اتنی سختیاں جھیلی تھیں۔ یہ سب اور ان کے علاوہ اور ایسی باتیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں جن کی تفصیل انسانی زندگی میں نہایت سبق آموز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کے پیالے کو شربت کا گلاس کہہ کر پیش کرنے کے آرٹ سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کے چہرے پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا۔ بلکہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے تو ہانک پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے۔ اس کے فریب میں نہ آنا۔ دیکھئے جب بادشاہ کے چاروں شہزادے ایک بازاری عورت کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں اور تاج الملوک انہیں چھڑاتا ہے تو مصنف کا قلم ان واقعات سے یہ نتائج نکالتا ہے:-

> "اے عزیز! تو نے معلوم کیا کہ میں نے کیا کہا؟ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رونق بخش تخت بادشاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرد کا تھا جب اس کی آنکھ اس خلقت ناپاک پر پڑی۔ اس کی بصارت کو زنگ لگا اور دیدۂ روشن تاریک ہو گیا۔ اب اُٹھ اور سرمۂ بینائی ڈھونڈھ یعنی گل مراد کی تلاش میں کوشش کر لیکن راہ میں دنیائے عیّارہ کی بازی میں کہ تختۂ فریب کا دھرا ہوا ہے مشغول نہ ہو جانا۔ مبادا فاحشہ تجھ کو پہلے فریفتہ کر کے جِتا دے اور بعد اس کے مکر کی بلی اور فریب کے چوہے کی مدد سے اچھا پانسہ اپنی حسبِ مرضی پھینکے اور ناگہاں تیرے توکّل کا سرمایہ آخر ہو جائے۔ تب تجھ کو دائم الحبس کر رکھے۔ اگر تو صبر کے نیولے کی اعانت سے اس مکارہ کی بازیٔ طلسم کو درہم کر دے تو وہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہم نشین ہے تیری فرمانبردار لونڈی ہو کر چاہے کہ تجھ کو اپنے حسن و جمال پر لبھائے۔ پھر اگر تو اس کے منہ پر الفت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہے کہ گل مراد کے دامن پر تیرا دسترس ہو۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک مقالہ[1] میں قصۂ گل بکاؤلی سے مسائلِ تصوف ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے ہیں، مثلاً:

تاج الملوک سفر کرتے کرتے سرحد ملک بکاؤلی تک پہنچا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ قلعۂ بکاؤلی جہاں وہ گل مراد پوشیدہ ہے اٹھارہ ہزار دیووں کی حفاظت میں ہے اور سال سال بھر کی مسافت کے مقامات تک ان کی چوکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ بیشمار پریاں ہر وقت نگرانی کرتی رہتی ہیں کہ کوئی پرندہ ہوا کے راستے بھی نہ پہنچ سکے۔ نیز چوہوں کا بادشاہ بے حد و حساب لشکر لئے زمین دوز راستوں کی پاسبانی کرتا رہتا ہے۔ تاج الملوک نے یہاں پہنچ کر ایک قوی ہیکل دیو کو کسی طرح اپنے موافق بنایا اور اس کی بہن حمالہ کو جو سب دیووں کی سردار تھی ملایا۔ یہاں تک

---

[1] مولانا کا یہ مقالہ پہلے پہل رسالہ "معارف" اعظم گڈھ بابت جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہی مضمون مجموعۂ میں "سچ" کے عنوان سے مضامین عبدالماجد دریابادی میں صفحہ ۶۹ تا ۸۰ پر طبع ہوا ہے۔

اس نے اپنی پروردہ ایک حسین لڑکی محمودہ کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ مصنف ان اسرارِ معرفت کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "اے عزیز! روشنی چشمِ ظاہر بیں کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کہ نورِ دیدۂ اولیا ہے ستر ہزار پردوں میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہے کہ وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہبان دیوِ نفس کا حجاب بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر کہ وہ لعین اپنی کجروی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام میں پہنچائے۔ لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اگر دیو سے اٹکا کیجیے تو سیدھا پڑے۔"

تزکیۂ نفس اور عرفانِ حق کی اس سے واضح تر تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟ (معارف، جولائی ۱۹۲۰ء، صفحہ ۱۸)

تاج الملوک مصائب و آفات کا شکار رہتا ہے۔ طلسمی ٹوپی اور عصا الگ رکھ کر سو جاتا ہے۔ سو کر اٹھنے کے بعد ایک حوض میں نہاتا ہے تو مرد سے عورت بن جاتا ہے۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ایک اور حوض میں غوطہ لگا کر پھر اپنی اصلی حالت پر آتا ہے۔ یہ طلسماتی کارخانہ داستان نویس کی زبان سے ایک گنجینۂ حقائق و معارف بن جاتا ہے۔ وہ تاج الملوک کی طلسم سے رہائی پر کہتا ہے:

> "اے یارانِ دہر! حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور عظمت کا عصا ہاتھ میں دے کر طلسم گاہِ دنیا میں کہ مزرعۂ آخرت ہے عاقبت کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے پس انسان کو چاہیے کہ گل اور خار اور آب و سراب خوب پہچانے۔ ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے۔ ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے کہ یہاں کانٹے گل سے رنگین اکثر اور شراب بہ صورتِ آب ادھر ادھر ہے۔ اے عزیز! اگر گوہرِ دنیا کے لیے چشمۂ جہاں میں غوطہ مارے گا مقرر اس کا کلاہ اور عصا کھو دے گا۔ یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالبِ دنیا مؤنث ہیں اور طالبِ مولا مذکر ہیں بہتیرا پیکرِ معانی جو مانندِ مردِ کامل ہے بہ صورتِ زنانِ ناقص العقل ہو جائے گا۔ پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیے کہ دم بخود ہو کر پھر دریائے [illegible] الٰہی میں غوطہ مارے۔ اس کے بعد جو سر اٹھائے گا تو وہی عصا اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا۔"

"اس قسم کی نصائح بہت پاکیزہ اثر رکھتی ہیں اور قصے کو تمثیل کا رنگ عطا کرتی ہیں۔ خرقِ فطرت کے بعد جب یہ بند آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ ایک تمثیل ہے جس کی یہ تفسیر ہے۔ ان نصائح سے قصے کی فضا بلند ہو گئی ہے۔ قصے میں انہماک اور استغراق کے بعد ہم اس طرح چونک پڑتے ہیں جس طرح کسی دنیا میں پھنسے ہوئے آدمی کو یکایک رحمت کا پیغام دیا جائے۔ اسے اس حالت سے خبردار کر کے صحیح راستہ بتایا جائے۔ ان میں وعظ کی خشکی نہیں۔" (اردو کی نثری داستانیں ص۲۲۲)

مشہور فرانسیسی فاضل اور ادبِ اردو کے سرپرست و قدرشناس گارساں دتاسی نے جو انگریزی عملداری کی ابتدا میں مدت تک ہندوستان میں مقیم رہے، اپنے بعض لکچروں پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی جس کے فرانسیسی نام کا ترجمہ "تاج الملوک و بکاؤلی کے افسانۂ عشق کے فلسفیانہ و مذہبی نتائج و نکات" ہے۔

قصۂ گل بکاؤلی ہی گلزارِ نسیم کا ماخذ ہے جو پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں تصنیف کی اور اسی قصے سے امانت لکھنوی نے اپنے مشہور ناٹک اندر سبھا کا پلاٹ تیار کیا جس کی تاریخ تصنیف ۱۸۵۳ء (۱۲۷۰ھ) کے قریب ہے۔ انگریزی میں بھی اس قصے کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس نام سے کتابیں لکھی ہیں جن سے اس قصے کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

اگرچہ اس وقت نہال چند یا ان کی کتاب مذہب عشق کی کما حقہ قدر نہیں کی جاتی کیونکہ نہ تو نہال چند کے طرز بیان میں کوئی ایسی خاص دلکشی ہے کہ اہل ذوق ہمیشہ اس کے گرویدہ بنے رہیں اور نہ مذہب عشق ہی کا قصہ اس زمانے میں لوگوں کی ضیافت طبع کا کچھ سامان بہم پہنچا سکتا ہے۔ اب اردو نے ترقی کے اتنے مدارج طے کر لئے ہیں اور اس میں لٹریچر کا اتنا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے کہ مذہب عشق اور اس کے ساتھ کی دیگر تصانیف سے لوگوں کا دلچسپی لینا ممکن نہیں مگر فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم نے اردو نثر کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اردو نثر نویسی کے ابتدائی اور دشوار گزار مراحل کو جس مستعدی و جانفشانی سے طے کر کے آنے والوں کے لئے راستہ صاف کیا ہے وہ [illegible] اردو کے باکمال نثر نگاروں [illegible] ان میں ایک نہال چند بھی ہیں اور اسی لحاظ سے وہ توجہ اور مطالعہ کے مستحق ہیں۔ ان کی قدامت یہاں ان کی زندگی کے کارنامے کو اہمیت دیتی ہے۔

یہ قصہ یوں تو ایک قسم کا مذہبی ڈھکوسلہ ہے لیکن اس کی تہ میں ایک تاریخی حقیقت بھی ہے جس کی تشریح مولوی رشید احمد علوی مرحوم [illegible] نے تالیف تذکرۂ گلستان سخن میں کی ہے۔ فرہنگ آصفیہ کی اشاعت سے پہلے ہی بعض بزرگوں نے [illegible] امرکنٹک کے سرکاری و [illegible] تصدیق کی ہے اور تحصیل کمنڈ کی ایک قدیم تاریخ میں قلعہ امرکنٹک کے حالات بھی ہیں جس کو گل بکاؤلی سے خاص تعلق ہے اس کی بہت کچھ اہمیت معلوم ہو جاتی ہے۔ ممالک متوسط میں جبل پور وغیرہ میں اب بھی ایک جڑی بوٹی پایا جاتا ہے جو اکثر پانی کے کنارے اگتا ہے۔ اس کے پھول کا عرق آنکھوں میں ڈالنے سے آشوب چشم وغیرہ قسم کی کئی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس کا نام بکاؤلی ہے جس کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آج سے نصف صدی قبل ایک جماعت قائم ہوئی تھی جس کا نام طلسم بکاؤلی ایکسپلورنگ اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن تھا [illegible] چھان بین کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچائی تھی کہ یہ قصہ محض فرضی افسانہ نہیں بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔ مگر اس کے مصنف نے [illegible] رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لے کر اس کو بعید از قیاس بنا دیا ہے حالانکہ اس واقعہ کے نقش پا اب تک موجود ہیں [illegible] جس کو قصے میں باغ ارم لکھا ہے اب تک موجود ہے یعنی حضرت بکاؤلی والا باغ [illegible] تک کوئی شبہ نہیں رہ سکتا [illegible] عین وسط میں اس وقت تک قائم ہے۔ بکاؤلی کا تالاب [illegible] مرور ایام سے شکستہ اور ریختہ حالت میں [illegible] سے اپنی قدامت اور اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لئے [illegible] کے مکان کے کھنڈرات جنہیں [illegible] کہتے ہیں زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ اپنی محبوبہ [illegible] امرکنٹک کے چاروں طرف [illegible] نشانات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ؎

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

(کشمیری میگزین جنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۴۴)

امرکنٹک ہندوؤں کا ایک بہت بڑا تیرتھ ہے۔ یہاں سے دریائے نربدا نکلا ہے۔ اس سے ایک میل مشرق میں ضلع منڈلہ کمشنری

---

[1] ارباب نثر اردو از سید محمد ایم۔ اے صفحہ ۲۴۸۔

ناگپور (ممالک متوسط) کا علاقہ اور جنوب میں سو میل کے فاصلے پر ضلع بلاس پور کا علاقہ ہے۔ مغرب اور شمال میں ریاست ریواں کی حدیں ملتی ہیں۔ خاص موضع امرکنٹک میں جو خوبصورت قلعہ واقع ہے اس میں پانچ چھ سو پنڈت اور پجاری آباد ہیں۔ امرکنٹک دراصل ایک جنگل ہے جس کے نام پر یہ موضع مشہور ہے۔ اس موضع کے ایک گوشے میں ایک مندر راجہ کرن کے زمانہ کا اب تک موجود ہے جو سمت ۶۵۲ بکرمی میں ریواں کا راجہ تھا۔ ایک دھرم سالہ مہاراجہ اندور نے بنوائی ہے جو آج سے پچاس ساٹھ سال قبل راج پاٹ چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس سے مسافروں اور یاتریوں کو بہت آرام ملتا ہے۔

نربدا کے دہانہ پر ایک پختہ تالاب ہے جس کے ایک طرف ایک مندر بھی ہے۔ اس مندر کے نیچے ایک قدرتی چشمہ جاری ہے جس سے تالاب ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ تالاب کے مغرب کی طرف ایک اور حوض ہے جس میں پانی قطرہ قطرہ ہو کر داخل ہوتا ہے۔ نربدا کی دھار سے جو حوض سے قریباً چالیس گز کے فاصلہ پر گرتی ہے یہ گھاٹ قدرتی آبشار کا کام دیتی ہے اور نہایت دلفریب سماں پیدا کرتی ہے۔ اس گھاٹ میں قریباً دو میل پہاڑ کی بلندی سے پانی گرتا ہے۔ اس کو کپل دھارا کہتے ہیں۔ اشنان کرنے والے یاتری اس کی دھار اپنے سر پر لیتے ہیں مگر بڈھے اور کمزور آدمیوں کے لئے اس کی ممانعت ہے۔ تالاب کے چاروں طرف بیراگی اور پجاری بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں کاتک چیت اور ماگھ کے مہینوں میں میلہ لگتا ہے جو کئی ہفتے رہتا ہے۔ اس میں فقیروں اور محتاجوں کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔

سون ندی دریائے نربدا کے دہانے سے دو میل مشرق کی جانب بھارت کے علاقے میں جا نکلتی ہے۔ وہاں سے چکر کاٹ کر ریاست ریواں میں داخل ہوتی اور پھر دریائے گنگا میں جا ملتی ہے۔ اسی سون وادی میں ہونڈا کے قریب ایک بہت بڑا سرسبز و شاداب اور مختلف قسم کے خوشبودار پھولوں سے آباد ایک جنگل ہے۔ اس جنگل کو بکاؤلی کا باغ کہتے ہیں۔ اسی جنگل میں ایک درخت ہے جس کے پھول ہلدی کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسے بکاؤلی کا درخت کہتے ہیں۔ گل بکاؤلی نربدا جی پر بطور چڑھاوا چڑھتا ہے۔ پنڈتوں کا کہنا ہے کہ گلہ نچوڑ (جسے پنجابی میں گمگا منکا کہتے ہیں) کے ساتھ گل بکاؤلی پیس کر اگر آنکھوں میں لگایا جائے تو آنکھوں کا جالا دور ہو جاتا ہے۔

کتاب تحفہ خان بہادر میں لکھا ہے اور منشی محمد الدین فوق مرحوم مدیر اخبار کشمیری لاہور نے آج سے پچاس سال قبل اپنے سفر بگھیل کھنڈ میں لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ مولوی سید بدر علی تحصیلدار رام نگر (علاقہ ریواں) جہاں تک پہنچ سکے انہوں نے اس مقام کی سیر و پیمائش کی مگر دلدل اور خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے وہ جنگل میں دور تک نہ جا سکے۔ اگرچہ امرکنٹک ان کی تحصیل میں تھا، ان کو آرام و آسائش، راہداری اور واقفیت کے تمام ذرائع حاصل تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ پیپرمنٹ اور بکاؤلی کے کچھ پودے وہاں سے لے آئے جو امتحاناً لگائے گئے۔ پیپرمنٹ کے درخت تو کچھ عرصہ بعد خشک ہو گئے مگر بکاؤلی کے چند درخت ۱۹۰۵ء تک رام نگر میں موجود تھے۔ شاید اب بھی ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصلی بکاؤلی کے درخت نہیں بلکہ وہ درخت ہیں جو جمال ہمنشیں کے اثر یعنی اصلی درخت کی خوشبو سے ایسے ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے پنجاب میں قصور کی میتھی بہت مشہور ہے جو اصل تو بہت کم اور صرف ایک آدھ کھیت ہی میں ہوتی ہے لیکن اس کی خوشبو سے دوسری قسم کی میتھی کے کھیت بھی اسی طرح خوشبودار ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے بکاؤلی کے یہ درخت بھی ایسے ہی ہوں۔

خان بہادر مولوی رحمان علی وکیل دربار ریواں مقیم ستنا نے منشی محمد الدین صاحب فوق کو بتایا تھا کہ سید بدر علی تحصیلدار نے بکاؤلی کے بیس پچیس پھول بطور تحفہ میرے پاس بھی بھیجے تھے جن کو میں نے دوستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ پھول زردی مائل اور خوشبودار تھے۔ تجربہ کیا گیا کہ جب کسی کی آنکھ آشوب کرتی تو اس پھول کا عرق ڈالنے سے آرام ہو جاتا۔

گل بکاؤلی کے حالات میں ایک کتاب تاریخ طلسم بکاؤلی بھی مشہور ہے جس میں لکھا ہے کہ امرکنٹک ایک جنگل کا نام ہے جو ایسا وسیع، پرخار، وحشت ناک اور اتنی دور ہے کہ وہاں کوئی جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ امرکنٹک ریواں سے بارہ منزل بیان کیا جاتا ہے۔ اس جنگل کی آج تک پیمائش نہیں ہوئی۔ اس کی حدود اضلاع سنبھل، بلاس پور اور منڈلا سے ملتی ہیں یہ اضلاع جنگل سے بارہ بارہ اور تیرہ تیرہ منزل کے فاصلے پر ہیں اس جنگل میں بے شمار چشمے، درندے، اژدہے، شیر، چیتے، ریچھ، بندر اور ہاتھی رہتے ہیں۔ اس سے باغ بکاؤلی تک تو لوگ بہ دقت پہنچ جاتے ہیں مگر قلعہ بکاؤلی تک کوئی نہیں جا سکتا اور یہ ایک طلسم معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعہ سے ہر وقت دھواں اٹھتا رہتا ہے اور دن رات ہیبت ناک آوازیں آتی ہیں۔

قصر بکاؤلی کس نے بنایا؟ کب بنا؟ اس کے متعلق لکھا ہے کہ سمت ۶۵۲ بکرمی سے پہلے دکن کے ایک راجہ نے اپنے چھوٹے بیٹے بھوج سے ناراض ہو کر اسے کوہستانی جنگل اور غیر آباد ملک دے کر الگ کر دیا۔ جب راجہ کے گرو کو خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ سخت ناانصافی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے بیٹے شاستر جگ کا ملک ہرگز سرسبز نہ ہوگا اور چھوٹے کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

غرض راجہ بھوج تن بہ تقدیر اپنے حصہ ملک میں جو اس کی فوج کی تنخواہ کے لیے بھی کافی نہ تھا، آیا۔ جب اس جنگل میں پہنچا تو اسے رہنے کے لیے کوئی موزوں مقام نہ مل سکا۔ آخر ایک دن وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جن میں اکثر ریاضی دان اور نجومی تھے امرکنٹک میں پہنچا۔ وہاں اسے ایک بہت بڑا تالاب نظر آیا جس کی وسعت اور گہرائی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بھوج نے یہ مقام پسند کیا۔ اس کے مشیروں نے اپنے علم اور تدبر کے زور سے تالاب کے وسط میں ایک قلعہ بنوایا جس میں واقف کار لوگوں کے سوا کوئی جا نہ سکتا تھا۔ قلعہ کے علاوہ مکان اور طلسم آمیز باغات بھی تیار کرائے جو بظاہر انسانی طاقت سے بعید معلوم ہوتے تھے۔

بھوج راج کے گھر اسی قلعہ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بہت حسین تھی اور جس کی جنم پتری بنا کر نجومیوں نے اس کے نیک اختر ہونے کی بشارت دی تھی۔ اس لڑکی کے دو نام رکھے گئے۔ ایک ٹاٹیب یعنی پرمیشر کی امانت اور دوسرا نربدال جس کے نام پر نربدا مشہور ہے۔ مگر یہ دونوں نام زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ ایک بیراگی نے اس لڑکی کا حسن و جمال دیکھ کر اس کا نام بکاؤلی رکھا جو آج تک مشہور ہے۔

معلوم نہیں تاج الملوک اور بکاؤلی کے عشق و محبت کی داستان فرضی ہے یا اس میں کچھ اصلیت بھی ہے۔ بہرحال بکاؤلی میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔

حضرت سید احمد بریلوی کی داستانِ جہاد

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

سید احمد بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو ولادت ہوئی۔ والد کا اسم گرامی سید محمد عرفان تھا۔ سلسلۂ نسب چھتیسویں پشت پر حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ سید عرفان لکھنؤ میں ملازم تھے۔ ۱۷۹۳ء میں بیمار پڑ گئے اور بیماری ہی کی حالت میں وطن کو چل دیے لیکن راہ میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت سید احمد کی عمر چھ برس تھی۔ بریلی کے مکتب میں فارسی عربی کی کتابیں پڑھتے اور ساتھ ساتھ استعمالِ اسلحہ کی مشق بھی کیا کرتے تھے۔

اسی اثنا میں دہلی کے شاہ ولی اللہ خاندان کا شہرہ سنا تو بغرضِ استفادہ بریلی سے پیدل چل نکلے۔ چودہ دن کا سفر تھا اور آپ کی جیب میں صرف تین پیسے تھے۔ آپ ہر چوتھی منزل (چوتھے روز) پر ایک پیسے کے ستو اور ذرا سا گڑ کھا کر گزارہ کر لیتے اور پھر تین دن بھوکے رہتے۔ چودہ دن کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے سید احمد کو اکبرآبادی مسجد میں شاہ عبدالقادر (قرآن کا مشہور ترجمہ انہی کا ہے) کے ہاں بھیج دیا۔ وہاں نحو کی چند کتابیں پڑھیں۔ رفتہ رفتہ اس خاندان کے علم و تقویٰ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کچھ مدت بعد وطن چلے گئے اور ۱۸۰۴ء میں نصیرآباد کی ایک سیدزادی سیدہ زہرہ سے شادی کر لی۔

وہ زمانہ مغلوں کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ کئی صوبے مرکز سے کٹ چکے تھے۔ مرہٹوں کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ پنجاب پر رنجیت سنگھ کا قبضہ تھا اور جنوب و مشرق سے انگریزی تسلط کی آندھی بڑھ رہی تھی۔ سید احمد ایک حساس دل و دماغ رکھتے تھے۔ آپ نے مستقبل کے پردوں سے اسلامی زوال و انحطاط کا منظر دیکھا تو تاریخ کے دھارے کو موڑنے کے وسائل سوچنے لگے۔

اس زمانے میں وسطِ ہند کا نواب امیر خان انگریزوں کا سخت مخالف تھا۔ اس کے پاس چالیس ہزار جانبازوں پر مشتمل ایک شاندار لشکر بھی تھا۔ سید احمد اس نواب کے ہاں چلے گئے اور ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۷ء تک اسی کے ہاں رہے۔ مسلمانوں کی حیاتِ نو کے منصوبے سوچ رہے تھے کہ نواب امیر خان انگریزوں سے مل گیا اور سید صاحب مجبوراً دہلی آ گئے۔

دہلی میں ہزارہا مسلمانوں نے شاہ اسمٰعیل سمیت آپ کی بیعت کی۔ پھر دیہات و قصبات کا دورہ کیا۔ مئی ۱۸۱۹ء میں بریلی کی طرف چل دیے۔ راہ میں ہزارہا مسلمانوں نے بیعت کی۔ دو برس اور دو ماہ بریلی میں قیام کیا۔ پھر بنارس اور کانپور سے ہوتے ہوئے کلکتہ میں پہنچے اور وہاں سات ہفتے قیام کیا۔

جب آپ نے دیکھا کہ لوگوں میں جہاد کی تڑپ پائی جاتی ہے تو آپ نے اس عظیم کام کو شروع کرنے سے پہلے حرمین کی زیارت کا

فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۲۰ر جولائی ۱۸۲۱ء کو چار سو عقیدت مندوں کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ بنارس سے کشتیوں کے ذریعے کلکتہ پہنچے۔ گھر سے خالی ہاتھ نکلے تھے لیکن راہ میں قدردانوں نے اس قدر نذرانے پیش کئے کہ کلکتہ میں دس جہازوں کا کرایہ جو تقریباً چودہ ہزار روپے بنتا تھا اپنی جیب سے ادا کیا۔ جہاز چل دیئے اور پورے دس ماہ کے بعد ۱۵ر مئی ۱۸۲۲ء کو یہ قافلہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔ حج کیا۔ ڈیڑھ ماہ تک بیت اللہ ہی میں رہے اور پھر مدینہ طیبہ میں پہنچے۔ ایک ماہ وہاں رہے۔ دوبارہ مکہ کو لوٹے اور یہاں کل چھ ماہ تک قیام کرنے کے بعد واپس چل دئے اور ۲۹ر اپریل ۱۸۲۴ء کو بریلی جا پہنچے۔ حج میں سارے قافلے کا خرچ اسی ہزار روپیہ سے زائد ہوا تھا جو آپ نے اپنی جیب سے ادا فرمایا اور اس کے بعد بھی آپ کے بیت المال میں دس ہزار روپیہ موجود تھا۔

وطن پہنچتے ہی آپ جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ بائیس ماہ تک تبلیغ و ترغیب نیز جمع وسائل کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد آپ جنوری ۱۸۲۶ء میں سات سو جانبازوں کے ساتھ گھر سے نکل پڑے۔ راجپوتانہ، سندھ اور کوئٹہ سے ہوتے ہوئے پہلے قندھار پہنچے اور وہاں سے ۲ر اکتوبر ۱۸۲۶ء کو کابل میں وارد ہوئے۔ ڈیڑھ ماہ کابل میں رہے۔ غالباً سید صاحب امیر کابل اور اس کی رعایا سے مدد لینا چاہتے تھے لیکن کامیابی نہ ہوئی اور ۱۶ر نومبر ۱۸۲۶ء کو وہاں سے چل دئے۔ صرف پانچ روز کے سفر کے بعد پشاور آ گئے۔ تین روز کے بعد چارسدہ چلے گئے اور گرد و نواح میں جہاد کی تبلیغ شروع کر دی۔ آپ نے اس علاقے کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ صوبۂ سرحد کے لوگ سکھوں کے مظالم سے تنگ تھے۔ نیز یہ لوگ بہادر اور فنِ کارزار سے آگاہ تھے اور پھر اس علاقے میں قدرتی مورچے بھی بہت زیادہ تھے۔

جب سکھوں کو آپ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو دس ہزار سکھوں کی ایک فوج سردار بدھ سنگھ کی کمان میں روانہ ہوئی اور اکوڑہ خٹک میں پہنچ کر جنگ کی تیاریاں کرنے لگی۔ سید صاحب پندرہ سو مجاہدوں کے ہمراہ چارسدہ سے نکل کر نوشہرہ میں آ گئے۔ ۱۹ر دسمبر ۱۸۲۶ء کی شام کو نو سو مجاہدوں کا ایک دستہ روانہ ہوا اور آدھی رات کو سکھوں پر اچانک جا پڑا۔ سکھوں میں گھبراہٹ اور ابتری پھیل گئی۔ اس جھڑپ میں پچاس غازی اور ایک ہزار سکھ ہلاک ہوئے اور سکھ تین میل پسپا ہو کر شیدو میں آ گئے۔ چند روز بعد سید صاحب نے حضرو پر ایسا ہی ایک چھاپہ مارا۔ وہاں بھی سکھوں کا کافی نقصان ہوا۔ چار سو کے قریب ہلاک ہو گئے۔ لیکن اس مرتبہ سکھ پسپا نہ ہوئے بلکہ تعاقب کیا اور غازیوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔

حضرو کی جھڑپ کے بعد سارے علاقہ کے علماء و خوانین نے سید صاحب کو اپنا امام بنا لیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بیعت سے دو ماہ بعد سید صاحب کے لشکر میں اسی ہزار جانباز شامل ہو گئے اور پشاور کے سردار یار محمد خان کے بیس ہزار جوان ان کے علاوہ تھے۔

کافی تیاریوں کے بعد سید صاحب کی فوج شیدو کی طرف جہاں بدھ سنگھ کی فوج (اندازاً ۳۵ ہزار) خیمہ آرا تھی، بڑھی۔ پشاور سے یار محمد خان بھی اپنے لشکر کے ہمراہ شامل ہوا۔ صبح کا ناشتہ کھاتے ہی سید صاحب اسہال و قے میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن پھر بھی میدانِ جنگ میں موجود رہے۔ لڑائی شروع ہوئی، گھمسان کا رن پڑا۔ سکھوں کو زبردست شکست ہوئی۔ میدانِ جنگ سکھ مقتولوں سے پٹ گیا اور باقیماندہ بھاگ نکلے۔ عین اس موقع پر پہلے سے طے شدہ سکیم کے تحت یار محمد خان کے آدمی سرپٹ میدان سے بھاگ نکلے اور شور مچا دیا "بھاگو، دوڑو، شکست شکست شکست۔" گھبراہٹ میں چند دیگر مسلمان بھی دوڑ پڑے جس سے باقیماندہ سکھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پلٹ کر وہ حملہ کیا کہ مکمل فتح کو ایک خوفناک شکست میں بدل کر رکھ دیا۔ چھ ہزار غازی ہلاک ہو گئے اور باقی بھاگ گئے۔ یہ وہ شکست تھی جس پر سکھوں نے ساری سلطنت میں چراغاں کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس روز یار محمد خان ہی کے کسی آدمی نے سید صاحب کے ناشتے میں زہر ملا دیا تھا۔ گو سید صاحب بچ گئے لیکن [illegible]

زہر کا اثر رہا۔ غازیوں کی جمعیت منتشر ہونے کے بعد آپ کئی ہفتے تک بیماری کی حالت میں قریہ بہ قریہ گھومتے رہے اور پھر سوات کی طرف نکل گئے۔ وہاں چند ایک قبائل کو جہاد کے لیے بے تاب پایا۔ چنانچہ انہیں جمع کیا اور ایک مختصر سا لشکر شاہ اسمٰعیل کی کمان میں ہزارہ کی طرف بھیجا جہاں سکھوں سے ایک دو غیر فیصلہ کن سی جھڑپیں ہوئیں۔

سوات سے لوٹ کر سید صاحب ایک مقام پنجتار میں آ گئے جہاں دو ہزار علماء نے آپ کو امیر شریعت منتخب کر کے آپ سے بیعت کر لی۔ لیکن ہنڈ کے رئیس خادے خاں نے بیعت کے باوجود علم بغاوت بلند کر دیا۔ چند ماہ پہلے یعنی مئی ۱۸۲۸ء میں درانی سرداروں نے ایک لشکر سید صاحب کے خلاف بھیجا تھا۔ اتمان زئی میں تصادم ہوا۔ پہلے سید صاحب کو کامیابی ہوئی۔ لیکن آپ کے چند ہمراہی سردار دھوکہ دے کر درانیوں سے جا ملے اور یہ فتح شکست میں بدل گئی۔ انہی دنوں سید صاحب نے ایک فوج سکھوں پر حملہ کرنے کے لیے قلعۂ اٹک کی طرف روانہ کی اور تمام معاملات کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ یہ فوج نہایت ہوشیاری سے چپکے چپکے جا رہی تھی کہ خادے خاں نے سکھوں کو اطلاع دے دی اور غازیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس کے بعد سکھوں نے سید صاحب کے ہیڈ کوارٹرز پنجتار پر حملہ کیا لیکن مسلمانوں کے دفاعی انتظامات اس قدر مضبوط تھے کہ سکھ ناکام لوٹ گئے۔ اس نواح میں ٹنگی ایک اہم مقام تھا جس پر درانیوں کا قبضہ تھا۔ سید صاحب نے اسے آزاد کرانے کے لیے فوج بھیجی جس کا ایک حصہ غازیوں کو چھوڑ کر درانیوں سے جا ملا اور غازیوں کو پھر شکست ہوئی۔

چونکہ خادے خان مسلسل پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا اس لیے سید صاحب نے پانچ سو سواروں کا دستہ شاہ اسمٰعیل کی کمان میں خادے خاں سے نپٹنے کے لیے روانہ کیا۔ معمولی سی جھڑپ کے بعد ہنڈ پر قبضہ ہو گیا اور خادے خاں میدان جنگ میں مارا گیا۔ یہ قضیہ ختم ہی ہوا تھا کہ پشاور کے درانی سردار یار محمد خان نے غازیوں کے خلاف حملوں کا ایک تانتا باندھ دیا۔ آخر ۵ ستمبر ۱۸۲۹ء کو سید صاحب نے ایک منظم فوج یار محمد کے خلاف بھیجی۔ زیدہ کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ یار محمد مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ نکلی۔ اس معرکے میں صرف دو غازی شہید ہوئے تھے۔

یار محمد کے بعد امب کے امیر پائندہ خان نے شرارت شروع کر دی۔ مجبوراً اس سے بھی لڑنا پڑا۔ امب فتح ہو گیا اور پائندہ خان نے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد پشاور کے امیر سلطان محمد خان نے یار محمد کا انتقام لینے کے لیے بارہ ہزار کی ایک فوج روانہ کی۔ سید صاحب نے صرف ساڑھے تین ہزار سپاہی بھیجے۔ مردان کے قریب گھمسان کا رن پڑا۔ سلطان محمد بھاگ نکلا اور پشاور میں جا دم لیا۔ سید صاحب نے اسے پشاور واپس دیا اور اس نے اطاعت قبول کر لی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ تمام علاقہ دشمنوں سے صاف ہو چکا تھا۔ امب سے لے کر خیبر تک غازیوں کا علم آزادانہ لہرا رہا تھا اور وقت آ گیا تھا کہ تمام تر طاقت سکھوں کے خلاف صرف کی جائے۔

اس سلسلے میں انتظامات ہو ہی رہے تھے کہ سرحد کے تمام علماء نے سید صاحب کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ ان پر مختلف قسم کے فتوے لگائے۔ پشاور کے گورنر نے اس مہم میں خاصہ حصہ لیا اور جب لوگوں کی عقیدت متزلزل ہونے لگی تو سلطان محمد نے پشاور کے قاضی مولوی مظہر علی کو جسے سید صاحب نے مقرر کیا تھا قتل کر ڈالا اور ساتھ ہی چند غازیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ حادثہ صرف پشاور ہی میں نہیں ہوا تھا بلکہ سلطان محمد کی دعوت اور علماء کے فتووں نے سارے علاقے میں آگ لگا رکھی تھی۔ چنانچہ مقامی ملکوں نے

بیسیوں مقامات پر سید صاحب کے انتظامی افسروں اور سپاہیوں کو ایک روز منہ اندھیرے مار ڈالا اور اس طرح وہ تعمیر دھڑام سے زمین پر آ رہی جس کی بنیاد سید صاحب نے ہزارہا جانبازوں کے سروں سے ڈالی تھی۔

امراء و علما کی اس غداری سے سید صاحب کو انتہائی دکھ ہوا۔ آپ کے تمام ولولوں پر اوس پڑ گئی اور جب آپ نے دیکھا کہ خود مسلمان ہی اسلام کا سر مکر و غدر کے پتھر سے کچل رہے ہیں تو آپ نے پنجتار سے ہجرت کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ رخت سفر باندھا اور چند عقیدت مندوں کو ہمراہ لے کر ۳۰ ردسمبر ۱۸۳۰ء کو شمالی پہاڑوں کا رخ کر لیا۔ پہلے راج دواری میں قیام کیا۔ یہ جگہ وادی کاغان کے نقطہ آغاز کے قریب ہے۔ تین ماہ بعد اپریل ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ جا پہنچے۔ یہاں سید صاحب کے گرد پھر کچھ پروانے جمع ہو گئے آپ نے ان سے کام لیا اور آگے بڑھ کر مظفر آباد (آجکل آزاد کشمیر کا دار الحکومت) پر قبضہ کر لیا۔ مظفر آباد کا ایک ذی اثر رئیس زبردست خان پہلے سید صاحب کے ساتھ تھا۔ لیکن حملہ کے دن سکھوں کے ساتھ مل گیا۔ بایں ہمہ سکھوں کو شکست ہوئی۔ اس شکست کا انتقام لینے کے لئے بڑی تعداد میں سکھ فوجیں جمع ہوئیں اور بالاکوٹ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت سید صاحب ایک مسجد میں تھے جو اونچی جگہ واقع تھی۔ سکھ فوجیں سامنے مغربی پہاڑوں سے اتر کر بالاکوٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور مسلمان انہیں روکنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ نیچے میدان میں اور سامنے پہاڑ کے دامن میں ہر طرف تلواریں چل رہی تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب خود سید صاحب غازیوں کے ایک دستے کے ساتھ میدان میں اتر آئے۔ اکے دکے سکھ کو کاٹتے ہوئے سامنے پہاڑ کے دامن تک نکل گئے۔ وہاں سکھ فوج کافی تعداد میں تھی۔ مسلسل گولی چلاتے رہے۔ آخر ایک گولی آپ کی ران میں لگی لیکن آپ آگ برساتے ہی رہے۔ پھر ایک وزنی سل آپ کے سر پر آ پڑی۔ آپ گر گئے اور اس طرح ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو دن کے بارہ بجے یہ شعلہ جوالہ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کو وہیں ایک جگہ دفن کر دیا گیا۔ لیکن سکھوں نے دو دن بعد قبر کھود کر آپ کی نعش دریا میں بہا دی اور اس وقت بالاکوٹ میں جو قبر سید صاحب سے منسوب ہے وہ مورخ کے نزدیک محض ایک نشان ہے جس میں کچھ بھی دفن نہیں اور اگر ہے تو وہ سید صاحب کی نعش یقیناً نہیں۔

اسی روز میدان جنگ کے شمالی نقطہ میں حضرت شاہ اسمٰعیل بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے تھے۔ ان کی قبر مقام شہادت کے قریب ہی واقع ہے۔

۱۔ سید صاحب کی تاریخ ولادت	۲۹ رنومبر ۱۷۸۶ء
۲۔ دہلی میں شاہ ولی اللّٰہی خاندان سے تعلیم	۱۸۰۲ء تا ۱۸۰۷ء
۳۔ شادی	۱۸۰۹ء
۴۔ اودے پور کے نواب امیر خان کے پاس	۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۸ء
۵۔ سفر حج	۳۰ رجولائی ۱۸۲۱ء
۶۔ حج سے واپسی	۲۹ راپریل ۱۸۲۳ء

۷۔ ارادۂ جہاد سے آغازِ سفر	جنوری ۱۸۲۶ء
۸۔ کابل پہنچے	۲ر اکتوبر ۱۸۲۶ء
۹۔ کابل سے کوچ	۱۶ر نومبر ۱۸۲۶ء
۱۰۔ پشاور میں پہنچے	۲۱ر نومبر ۱۸۲۶ء
۱۱۔ نوشہرہ میں ورود	۱۹ر دسمبر ۱۸۲۶ء
۱۲۔ سکھوں سے پہلی جھڑپ اکوڑہ میں	۱۹ر دسمبر ۱۸۲۶ء کی رات
۱۳۔ شیدو، حضرو اور ہنڈ کی جنگیں	تاریخ نامعلوم
۱۴۔ اُتمان زئی میں دُرّانیوں اور غازیوں کی جنگ	مئی ۱۸۲۸ء
۱۵۔ دو ہزار علماء نے آپ کو امیر شریعت بنایا	فروری ۱۸۲۹ء
۱۶۔ غازیوں کا ناکام حملہ اٹک پر اور سکھوں کا پنجتار پر۔ غازیوں کا حملہ ٹنگی پر	تاریخ نامعلوم
۱۷۔ زیدہ کے مقام پر یار محمد خان سے جنگ	۵ر ستمبر ۱۸۲۹ء
۱۸۔ اس کے سردار پائندہ خاں سے جنگ۔ مردان کے قریب سلطان محمد خاں سے تصادم پشاور فتح۔ عام بغاوت	نامعلوم
۱۹۔ پنجتار سے ہجرت	۳۰ر دسمبر ۱۸۳۰ء
۲۰۔ بالاکوٹ میں ورود	اپریل ۱۸۳۱ء
۲۱۔ شہادت	۶ر مئی ۱۸۳۱ء

عمر : ۴۴ سال ۵ ماہ ۷ یوم

عرصۂ جہاد : ۱۹ر دسمبر ۱۸۲۶ء سے ۶ر مئی ۱۸۳۱ء تک یعنی چار سال چار ماہ سترہ یوم

آگرہ کی ادبی شخصیتیں

میکش اکبر آبادی

آگرے کے اہل ہنر پہ ضرورت سے زیادہ اپنے حال میں مست رہے۔ شاہجہان کے آگرے سے جانے کے بعد آگرہ ایک گوشہ ہو کر رہ گیا اور آگرے والے گوشہ گیر۔ میاں نظیر کو کسی رئیس نے باہر سے بلایا تو انہوں نے کہدیا کہ میں تو وہاں تک جاتا ہوں جہاں تک تاج محل کے جھنڈے نظر آتے ہیں۔ ساری عمر لڑکے پڑھا کر گزار دی مگر آگرہ نہ چھوڑا۔ میرزا غالب اگر باہر نہ جاتے تو شاید یہ مقام حاصل نہ کر سکتے۔ میاں نظیر کے صاحبزادے میاں گلزار علی اسیر کئی دیوانوں اور کتابوں کے مصنف تھے مگر آج خود آگرے والوں کو بھی ان کا کوئی شعر یاد نہیں۔ کاشی والے راجہ بلوان سنگھ راجہ کا خدا بھلا کرے کہ وہ ساٹھ روپیہ ماہوار انہیں تاحیات دیتے رہے۔ ایک طرحی مشاعرے میں مہر، ماہ اور دوسرے شعرا شریک تھے اسیر کی غزل سب سے اچھی رہی۔ اسیر جب غزل پڑھ چکے تو ایک رئیس نے سر محفل ہتھیلی پر ایک اشرفی رکھ کر پیش کی اسیر نے کہا ایک شعر باقی رہ گیا تھا پہلے وہ اور ملاحظہ فرمائیں۔

سفلے نے زر ہتھیلی پہ رکھ کر دیا تو کیا
چلتی ہے مٹھی اہل کرم کی بندھی ہوئی

میں نے ان اساتذہ کے دیکھنے والوں کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھا لیکن یہ سنتا آیا ہوں کہ اسیر، مہر، ماہ وغیرہ کے بعد آگرے میں شاعری کے چار ستون سمجھے جاتے تھے۔ رئیس، واصف، نثار اور عالی۔ اب ہمارے ہاتھ میں نہ ان حضرات کا کلام ہے نہ سوانح حیات۔ اعجاز صدیقی نے رسالہ "شاعر" کا اور رضا و صبا اکبر آبادی نے "مشورہ" کا آگرہ نمبر شائع کر کے یہ احسان کیا کہ آگرے کے اہل قلم کے مختصر حالات یکجا کر دیئے:

آگرے کی ادبی شخصیتوں پر اگر کچھ لکھنا چاہیے تھا تو منشی خادم علی خاں صاحب اختر کو کیونکہ وہ عمر میں یہاں کے سب ادیبوں اور شاعروں سے بڑے ہیں انہوں نے رئیس، واصف وغیرہ کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ ان کے سامنے مشاعرے بھی پڑھے ہیں اور ان کی صحبتوں میں بیٹھے ہیں مگر اختر صاحب بھی پاکستان کو پیارے ہوئے اور نہ بھی ہوتے تو اب ان کا وہ دل و دماغ کہاں۔ دل تو شاید اب بھی وہی ہو کیونکہ اب بھی جب کوئی قبول صورت انسان ان کے سامنے آجاتا تو ان پر ایک انبساطی کیفیت طاری ہو جاتی تھی خواہ وہ کسی عمر اور کسی طبقے کا ہو۔ مگر وہ دماغ تو اب یقیناً نہیں ملا جب وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ تجارت بھی اور لیڈری بھی۔ الیکشن بھی لڑتے تھے اور مشاعرے بھی۔ خود تو وہ میونسپلٹی کی ممبری سے آگے نہ بڑھے، مگر کونسل اور اسمبلی کے الیکشن انہوں نے خوب لڑائے۔ ہر طبقے اور ہر طرح کے لوگ ان سے مشورہ لینا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی تجارتی سوجھ بوجھ کا کارنامہ آگرے کی شو مارکیٹ کی تعمیر اور اس کی انجمن کی تنظیم ہے جسے آگرے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کا ادبی کارنامہ

---

[1] حال میں ان کا کچھ کلام دستیاب ہوا ہے لیکن شاہنامے کا منظوم ترجمہ اور دوسری کتابیں نایاب ہیں [2] اس مشاعرے کی طرح تھی۔ پڑیا ہمارے ساتھ ہے سم کی بندھی ہوئی۔

یہاں نہ صرف چند تصنیفوں تک محدود ہے۔ یہ تصنیفیں ان کے کلام کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں وہ ایک ایک نشست میں سینکڑوں شعر کہہ ڈالتے۔ آپ جب ان کے مکان پر جائیں گے انہیں شعر لکھتا ہوا پائیں گے مگر خط معمّا تھا کہ خود بھی مشکل سے پڑھتے تھے۔ ہمیشہ ایک ایسے کاتب کی تلاش میں رہے جو ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی غزلیں صاف کر دے۔ دوسروں کو بنانے اور پھبتی اڑانے میں خاں صاحب کا جواب ہی نہیں تھا اس کے لیے نہ وقت اور موقع کی قید تھی اور نہ خلوت و جلوت کی۔ نہ وہ مرعوب ہونا جانتے تھے نہ کسی کو بخشنا۔ ہنسنا ہنسانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک مرتبہ مرزا یاس یگانہ لکھنوی آگرے آئے اور مرزا نجم آفندی کے مہمان رہے۔ نجم صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک مختصر صحبت منعقد کی۔ فانی، اخگر، دلگیر، مانی، محمود صاحبان سب ہی جمع تھے باتیں ہو رہی تھیں یگانہ صاحب لکھنؤ کے شعرا کا ذکر خیر فرما رہے تھے فرمانے لگے کہ ایک مشاعرے میں عزیز لکھنوی نے شعر پڑھا۔

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے
میں نے پردے کو جو الٹا تو قیامت دیکھی!

میں نے اس طرح داد دی کہ عزیز کہنے لگے آپ نے میرا شعر ضائع کر دیا۔ باتیں ختم ہوئیں اور غزل خوانی شروع ہوئی یگانہ صاحب کی باری آئی انہوں نے مطلع پڑھا۔

پیام زیر لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

دلگیر صاحب نے ایک چبھتے ہوئے فقرے سے استقبال کیا ان سے یگانہ صاحب سے پہلے سے تعارف بھی تھا اور بے تکلفی بھی ہم لوگ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ اخگر صاحب کہنے لگے واہ مرزا صاحب سبحان اللہ پورا کوک شاستر ایک شعر میں جمع کر دیا ہے۔ خدا کی شان اب وہی خاں صاحب ایسے ہو گئے تھے کہ ان کے ناخلف شاگرد محفل میں ان پر فقرے کستے تھے۔ ان کے دفتر نے گھوڑے کی شکل اختیار کر لی تھی جھاڑو کے نام سے پھونک مار کر بھی کوئی صفائی نہ کی جاتی میز سے زیادہ کرسیوں پر ضروری اور غیر ضروری کاغذوں اور کپڑوں کے ڈھیر تھے ان کے کوٹ اور شیروانی سال بھر ٹنگے رہتے تھے ان میں مکڑیاں جالے تن لیتیں اور چھپکلیاں انڈے دیتی رہتیں اور جب ضرورت ہوتی وہ یونہی اتار کر زیب تن فرما لیتے۔ محمود صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ اخگر آگرے کے مرزا سودا ہیں۔ ذرا کسی سے ناخوش ہوتے اور ایک نظم سے اس کی تواضع کر دی۔ اور وہ نظم ایسی ہوتی کہ گھنٹوں میں زبان زد عام ہو جاتی ایک سے ایک اس کی نقلیں مانگتا پھرتا اور لوگ انہیں زبانی یاد کر لیتے۔ سنا ہے اب حیدرآباد سندھ میں اپنی ساز و سامان کے ساتھ تشریف رکھتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ موزوں شخصیت جو لکھنے اور لکھے جانے کے لائق ہے وہ ل احمد صاحب اکبرآبادی ہیں وہ ہمارے آگرے کے سب سے بڑے اور اہم نثر نگار ہیں۔ ہیں وہ تو ہندوستانی اور اکبرآبادی اور قریشی برادری کے ایک فرد مگر مزاج، دماغ اور اپنی دوسری خصوصیات کے اعتبار سے ان نسبتوں سے بہت بلند و برتر ہیں جسم کے اعتبار سے مختصر مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں میں نے انہیں شدید سے شدید پریشانیوں میں اتنا مستقل اور متحمل پایا ہے کہ اس کا تصور کرنا مشکل ہے ان کے چہرے سے ان کی گہرائی اور ان کے جذبات کا اندازہ مشکل ہے۔ ل احمد صاحب نے افسانے لکھے ہیں تجارت کی ہے۔ دوستوں کی تواضع ہے، اور سیاست ملکی میں حصہ یا ہے۔ افسانے میں ان کی شخصیت ملتی ہے اور تواضع میں دوستوں میں مسلّم ہے۔ تجارت میں وہ کبھی کامیاب رہے ہیں اور کبھی ناکامیاب لیکن سیاسیات یں وہ ہمیشہ ناکامیاب رہے۔ سیاسیات سے میرا مطلب صرف الیکشن بازی سے ہے اور یہی ان کے اچھے ہونے کی دلیل ہے۔

کیونکہ وہ سب کو اچھا سمجھ لیتے اور سب پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ آگرہ جن شخصیتوں پر ہمیشہ ناز کرے گا ان میں ل احمد کی شخصیت بہت نمایاں رہے گی۔ بقول حضرت سیماب اکبرآبادی

نازش ہے ارضِ تاج کو ذاتِ "لطیف" پر

ان کی تصانیف اور ترجمے بہت ہیں اور ان کے دیکھے بغیر کوئی ان کی قابلیت اور شخصیت کا اندازہ نہیں کر سکتا ملک انہیں صف اول کے افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتا ہے ل احمد صاحب کے ذکر کے ساتھ ہی شاہ دلگیر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کیونکہ ل احمد، مخمور، دلگیر اور امام اکبرآبادی ہم نشین اور ہم مذاق اصحاب میں تھے۔

شاہ دلگیر ایڈیٹر نقاد مرحوم میرے بہت قریب کے عزیز بھی تھے اور ہمسایہ بھی گو عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے اس لیے مجھے ان کی بزرگی کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا وہ اتنے بے تکلف اور خوش باش تھے کہ ان باتوں کی طرف توجہ بھی نہ کرتے۔ خلوت کی طرح محفلوں میں بھی بے تکلف فقرے کستے اور قہقہے لگاتے۔ ان کے پاس بیٹھ کر وقت بڑا اچھا کٹتا تھا وہ خوش ہونا اور خوش کرنا جانتے تھے، شعر اتنا اچھا سمجھتے تھے کہ کوئی کم سمجھے گا اچھے شعر انہیں بہت یاد تھے وہ کسی سے خوش ہوں یا ناخوش مگر اس کے اچھے شعر کی داد بڑی فراخ دلی سے دیتے۔ وہ خفا بھی جلدی ہو جاتے تھے اور معذرت بھی جلدی قبول کر لیتے البتہ اس کے لیے کبھی کبھی معذرت خواہ کو ان کی اور ان کے احباب کی دعوت بھی کرنا پڑتی تھی پھر ان کا دل صاف ہو جاتا تھا۔ ہم لوگ متھرا سے ایک شادی میں شریک ہو کر واپس آ رہے تھے شہر کے ایک اور بزرگ بھی ساتھ تھے انہوں نے متھرا کے مشہور پیڑے خریدے تھے شاہ دلگیر مجھ سے کہنے لگے ان کے پیڑے کھانے چاہیں تم مانگو تم سے انکار نہ کریں گے میرے لیے ایسی جرأت ناممکن تھی آخر خود ہی انہوں نے تمہید اٹھائی متھرا کے پیڑوں کی خصوصیات کا ذکر چھیڑا اپنی ناواقفیت ظاہر کی اور آخر ایک پیڑا چکھنے کو مانگا پھر دوسرا اور پھر تیسرا اور اس طرح کتنے ہی پیڑے کھا گئے اس میں انہوں نے خوشامد بھی کی اور چونکہ وہ صاحب صوفی قسم کے آدمی تھے خدا و رسول کا واسطہ بھی دیا اور غوث پاک کا بھی ہاتھ اور دامن پھیلا کر کھڑے بھی ہوئے اور زبردستی بھی کی اور اسی طرح ایک دوسرے [illegible] چٹنی کھاتے گئے اور قہقہے لگاتے گئے۔ ان کے واقعات اور لطیفے بہت ہیں جو ان کے مخصوص احباب نیاز فتحپوری ل احمد مخمور مانی وغیرہ حضرات کو یاد ہیں اور ان کے بیان کا حق بھی انہی حضرات کو پہنچتا ہے۔ اور وہ کہا کرتے تھے شاعر صرف حسن دیکھتا ہے۔ وہ اپنے ہمعصروں کی طرح شاعرانہ قواعد و ضوابط کے سختی سے پابند تھے ایک دفعہ میں انہیں اپنی غزل سنا رہا تھا جب یہ شعر پڑھا۔

میرے رونے پہ رو دیے وہ بھی
بدگمانی نکل گئی دل کی!

تو انھوں نے مجھے ٹوکا فرمانے لگے معشوق کا رونا مسلمات شاعری کے خلاف ہے ایسا ہونا نہیں ہے میں نے کہا میرے ساتھ ایسا ہوا اس لیے مجھے لکھنے کا حق ہے ہنسنے لگے مگر تسلیم نہیں کیا تاریخ اُردو میں نقاد کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔ مولانا سیماب اکبرآبادی ہمارے دور کے وہ تنہا اکبرآبادی شاعر تھے جن کو آگرے سے باہر سب سے زیادہ لوگ بحیثیت شاعر جانتے ہیں ان کے ہم وطن اور ہم عصر شعرا نے ان کی قدر نہ کی مگر انھوں نے آگرے کا نام زندہ بھی کیا اور روشن بھی۔ مولانا خواہ مخواہ کسی سے نہ الجھتے تھے وہ بہت مہذب اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے مگر جو ان سے اُلجھیا اُن کے ادعائے کمال کو چیلنج کرے اسے وہ معاف بھی کرتے تھے۔ وہ سب سے علیحدہ ایک مرکز بنائے ہوئے ادب کی خدمت میں اس طرح مصروف رہتے جس طرح کوئی عبادت کرتا ہے مشاعروں میں شرکت فرماتے اور ہمیشہ طرح پر غزل کہتے وہ فرماتے تھے میں کسی ایسے طرحی مشاعرے میں شریک نہیں ہوا جہاں میں نے طرح میں غزل نہ پڑھی ہو۔ اس بارے میں وہ مجھ سے شکایت فرمایا کرتے تھے کیونکہ میں ہمیشہ سے مشاعروں میں بمجبوری ہی شریک ہوتا ہوں۔

مولانا کے ہنسنے بولنے اور مزاج میں سب میں ایک توازن اور رکھ رکھاؤ تھا جو چھوٹوں سے شفقت سے بڑوں اور برابر والوں سے تہذیب و ادب سے پیش آتے تھے انہوں نے کبھی اپنے چھوٹوں کو آگے بڑھانے اور ان کی کارگزاری کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا اور نہ ہم عصروں کے ساتھ ایسا کیا۔ مولانا مجھ سے عمر میں بہت متفاوت تھے مگر انہوں نے کبھی اپنی بزرگی مجھ پر عاید نہ فرمائی۔ ایک روز مجھ سے فرمانے لگے، آپ اپنا کلام رسائل کو کیوں نہیں بھیجتے کیا یہ کلام عاقبت میں کچھ کام آئیگا۔ کسی زمانے میں آگرے میں عید ملن کے نام سے عید کی شام کو ایک اجتماع ہوتا تھا جس میں شہر کے ہندو مسلم شرفا کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع مل جاتا تھا اور مسلمان بھی آپس میں عید مل لیتے تھے۔ ایک بار میں کچھ دیر سے پہونچا پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ سب حضرات سے ملوں اس لیے گرد و پیش کے دس بیس احباب سے مل کر ایک طرف بیٹھ گیا مولانا سیماب ذرا فاصلے پر تھے میں وہاں تک نہ پہونچ سکا جب میں بیٹھ گیا تو خود آئے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے مجھ سے معانقہ کیا۔

وہ نہ آئے تو تو ہی چل اے داغ
اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

مولانا اس حیثیت سے بھی خوش قسمت تھے کہ انہوں نے سو سے زیادہ تصانیف اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ لاکھوں اشعار اور اس کے علاوہ اعجاز صدیقی (مدیر شاعر بمبئی) منظر صدیقی (مدیر پرچم کراچی) جیسے لائق فائق فرزند اور اپنے صحیح جانشین چھوڑے

فانی صاحب کی آگرہ تشریف آوری میرے لیے بہت بابرکت ثابت ہوئی۔ وہ میرے پاس اکثر تشریف لاتے تھے اور کبھی کبھی میں بھی ان کے یہاں حاضر ہوتا تھا اور ان کی مخصوص اور نجی صحبتوں میں شریک ہوتا تھا فانی صاحب کے احباب کا حلقہ بہت مخصوص اور محدود تھا اس کے معزز فرد مخمور صاحب اکبرآبادی بھی تھے وہ شاعر بھی ہیں ادیب بھی ناقد بھی اور افسانہ نگار بھی اور ان سب کے ساتھ فانی صاحب کے ہم پیشہ یعنی وکیل بھی۔ چنانچہ ان صحبتوں میں شریک ہونے سے مجھے مخمور صاحب ل احمد صاحب، فانی صاحب کی مجالست بھی میسر آگئی نیازمندی تو پہلے سے بھی حاصل تھی۔

مخمور صاحب بڑے ذہین اور ذی علم انسان ہیں ان کی بے تکلفی میں بھی اکثر شائستگی اور مزاح میں بھی متانت ہے۔ ایک روز جوش ملیح آبادی اور مخمور صاحب میرے یہاں بیٹھے تھے صحبت پر لطف بھی تھی اور بے تکلف بھی۔ مخمور صاحب نے جوش صاحب سے کہا آج آپ اپنے دوستوں پر تبصرہ کیجیئے میں نے کہا کیا تبصرہ کریں گے یہ۔ آگرے کے ایک رشتہ دار سے خفا ہو گئے اور نظم لکھ ڈالی سب آگرے والوں پر (اے رفیقانِ اکبرآبادی ... دل دکھا ہے تم سے فریادی) مخمور صاحب نے پھر اصرار کیا اور جوش صاحب بلبل ہزار داستان کی طرح چہک اٹھے سب سے پہلے فانی مرحوم کی شامت آئی پھر مانی صاحب اور دوسرے احباب کو ایصالِ ثواب کہا گیا اور آخر میں ل احمد صاحب پر تان ٹوٹی۔ مخمور صاحب کہنے لگے مجھے اور میکش صاحب کو کیوں چھوڑ دیا آخر ہم دونوں پر بھی تبصرہ شروع ہو گیا مگر بہت نرم اور پرلطف ایسے لطیفے مخمور صاحب اکثر برپا رکھتے تھے میں نے ایک مرتبہ ایک چھوٹی الماری ان کی تصانیف سے بھری ہوئی دیکھی تھی "روح نظیر" ان کا ایک غیر فانی کارنامہ ہے وہ خود پورا آگرہ ہیں۔ آگرے کی کسی وجیہ ذی علم اور خاندانی شخصیت کو دیکھنا ہو تو مخمور صاحب کو دیکھ لیجئے۔ آگرے والے ان کی وجہ سے بھی محروم ہو گئے۔ سنا ہے آج کل کراچی میں مجسٹریٹی کے فرائض انجام دے رہے ہیں زمانے کی یہ قدرشناسی بھی کیا کم ہے۔ جب ان کے عالی شان مکان کی طرف گزر ہوتا ہے تو دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہے۔

ان حضرات کے دور سے پہلے بزرگوں کے میں نے تذکرے ہی سنے ہیں اور ان میں سے چند کو دیکھا بھی تو بچپن ہی میں دیکھا ہے۔ مرزا رئیس یہاں کی بڑی اہم شخصیت تھے ان کا تو صرف جنازہ ہی دیکھا میں بہت کم عمر تھا مگر خاندانی تعلقات کی وجہ سے اور اس لیے کہ میرے خاندان میں کوئی اور بزرگ زندہ نہ تھا مجھے ان کے جنازے میں تھوڑی دور شرکت کرنا پڑی تھی۔ جنازے پر شامیانہ تنا ہوا تھا اور شہدے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ طریقہ پرانے شیعہ شرفا و رؤسا کے یہاں رائج تھا۔ خوش وضع رنگین طبع اور نازک مزاج تھے۔ مرزا صاحب میں جذبۂ

اعتراف کم تھا اور دوسرے شعرا کو شاعر بہت کم مانتے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

اغلاط ہیں کہیں کہیں اغلاق اے رئیس
دیکھے کلام داغ و امیر و جلال کے

جب مشاعرے میں پاؤں پہ پاؤں رکھ کر اور تن کر بیٹھ جاتے تھے تو کسی کو آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہوتی تھی اپنا حقہ کسی کو نہ پلاتے تھے، مشاعرے میں مشک کا حقہ پیتے تھے۔ دراز قد سفید رنگ ڈاڑھی صاف مونچھیں بڑی بڑی انگرکھا اور دوپلڑی ٹوپی پہننے کا شوق تھا پاجامہ اکثر بڑے پائینچوں کا پہنتے تھے۔ ظرافت مزاج میں حد سے زیادہ تھی بات بات پر منہ سے گالی نکل جاتی تھی مگر غیر دل شکن بے حد ملنسار زندہ دل اور نیک طبیعت انسان تھے عمر بھر شعر کہے اور چھپوانے کے لیے جب کسی نے کہا تو صاف انکار کر دیا ۲۵ جنوری ۱۹۱۴ء بعارضہ سل انتقال کیا۔

(اقتباس از شاعر آگرہ نمبر جون ۳۶ء)

سنا ہے اگلے ہی کسی زمانے میں ایک مشاعرے میں مرزا داغ دہلوی تشریف لائے تھے داغ صاحب نے شعر پڑھا۔

بڑا مزا ہو جو محشر میں میں کروں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے

مرزا رئیس نے کہا حضرت محشر میں شکوے شکایتوں کا کیا موقع ہوگا یوں ہوتا تو مناسب تھا۔

بڑا مزا ہو جو محشر میں یوں کروں فریاد

کچھ روز اس سلسلے میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا آخر مرزا داغ نے رئیس صاحب کو لکھا "چپ رہو خدا کے لیے" اور یہ معرکہ ختم ہوا۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک مشاعرے میں طرح ہوئی

پھر رہے ہیں آئینہ میں سانپ لہراتے ہوئے

دہلی سے آغا تشریف لائے تھے انہوں نے ایک شعر پڑھا جس کا مصرع ثانی تھا

کاسۂ فغفور دیکھے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

مرزا رئیس نے سر مشاعرہ ٹوکا کاسۂ فغفور کیا

کاسۂ سر ان کے دیکھے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

یہ قصے میں نے پرانے لوگوں سے سنے ہیں ایک واقعہ خود اپنا بابو برجھو دیال صاحب شام اکبر آبادی سناتے تھے کہ ایک مشاعرے میں میں نے یہ شعر پڑھا۔

ہر بن مو شکر کرنے کو بنا گویا زبان
تیری نعمت کا ادا پھر بھی نہ شکرانہ ہوا

مرزا صاحب نے فرمایا کہ کیا مولانا (نثار) کو غزل نہیں دکھائی تھی۔ مولانا نثار بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا مجھ سے فروگذاشت ہو گئی ہوگی آپ درست فرمائیں رئیس صاحب نے کہا اس طرح کہو۔

ہر بن مو شکر کرنے کو بنا گویا دہان

اور اگر زبان ہی کہنا چاہتے ہو تو پھر یوں کہو

ہر ہر مو شکر کرنے کو بنا گویا زباں

اس دور کی ایک اور اہم شخصیت ماسٹر سید تصوف حسین صاحب واصف کی تھی۔ بات مشہور ہے کہ وہ آگرے کے سب سے زیادہ نازک خیال شاعر تھے اور وہ خود بھی بہت ہی نازک اندام تھے۔ دبلے پتلے کشیدہ قامت اودی مخمل کی گول ٹوپی خشخشی داڑھی سر پہ پٹے چشمہ لگائے ہوئے زکام کے سدا مریض۔ باتیں بھی جلدی جلدی کرتے اور نماز بھی جلدی جلدی پڑھتے چھوٹے بڑے سب سے بجائے آداب یا دعا کے بندگی کہتے وہ مجھے اس لیے یاد ہیں کہ ہمارے یہاں روزانہ شام کو آتے تھے اور مغرب کی نماز پڑھ کر چلے جاتے تھے حضرت والد ماجد کے مخصوص احباب میں تھے اور وضع کے ایسے پابند تھے کہ ان کے وصال کے بعد بھی روزانہ مقررہ وقت پر تشریف لاتے تھے کوئی اور ہو یا نہ ہو ہم نہ بھائی سمجھتے تھے اگر کوئی ان سے بات کرنے والا بھی نہ ہوتا مگر انہیں اپنا معمول پورا کرنا تھا۔ ان کے بیٹھنے کی ایک جگہ مقرر تھی وہاں غلطی سے اگر کوئی اور بیٹھا ہوتا تو واپس ہو جاتے ایک پان سے زیادہ اس نشست میں نہ کھاتے۔ ان کی وضع داری کے سلسلے میں ان کے احباب سے ایک واقعہ سنا ہے کہ کسی روز ان کے کچھ آزاد منش احباب دھوکے سے ایک طوائف کے مکان پر لے گئے ماسٹر صاحب کو علم نہ تھا کہ یہ مکان کس کا ہے اس زمانے کی ڈیرہ دار طوائفیں شرفا کی طرح اندر زنان خانوں میں رہتی تھیں، ماسٹر صاحب احباب کے ساتھ بیٹھے رہے اور پانوں کی تھالی میں ایک روپیہ ڈال آئے۔ اس واقعہ کے بعد سے ماسٹر [illegible] سال میں ایک بار اس طوائف کے یہاں جاتے اور اسی طرح ایک روپیہ دے کر چلے آتے۔ ان کا کلام بھی آگرے کے اور شعرا کے کلام کی طرح ضائع ہو گیا۔ ان کی ایک نظم "المعراج" اور ایک تضمین "تربت شہید ناز" کے نام سے کسی نے چھپوائی تھی میرے بچپن میں یہ تضمین بہت مشہور تھی اور بہت لوگ اس پر سر دھنتے تھے ایک ابتدائی بند مجھے اب بھی یاد ہے

اک دن جو سوئے گورِ غریباں ہوا گزر　　کچھ ڈھیر ٹوٹی قبروں کے آئے مجھے نظر
چادر چڑھائی اشکوں کی میں نے بچشمِ تر　　آئی ندا کسی کی کہ اے میرے نوحہ گر
آہستہ برگِ گل بفشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

مولانا نثار علی بیگ صاحب نثار کو میں نے اچھی طرح دیکھا ہے چوگوشیہ کڑھی ہوئی گول ٹوپی چشمہ لگائے ہوئے نیچا کرتا اور اس پر صدری گندمی رنگ شرعی داڑھی آنکھوں میں آشوب کی قسم کا کوئی مرض۔ یہ ان کی وضع قطع تھی۔ میرے پھوپھی زاد بھائیوں نے ایک انجمن بنائی تھی جس میں ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا مشاعرہ کیا تھا چار پانچ ہم چچا زاد پھوپھی زاد بھائی اور چار پانچ ہمارے کلاس فیلو مل بیٹھ جاتے اور الٹی سیدھی غزلیں پڑھتے اور خوش ہو لیتے ہم میں سے ایک لڑکا مولوی نثار علی صاحب کا شاگرد ہو گیا وہ کبھی کبھی مولانا کو ان صحبتوں میں لے آتا مولانا نہایت شائستگی سے شریک ہوتے اچھے شعروں کی داد دیتے اور آخر میں اپنی غزل سناتے۔ کبھی کسی کے شعر پر اعتراض نہ کرتے نہ اصلاح دیتے نہ شاگرد بنانے کی کوشش کرتے بڑے درویش صفت انسان تھے۔ پہلے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو غزل دکھاتے تھے ان کے بعد جب شاہ محمد اکبر صاحب اکبر دانا پوری سے بیعت ہو گئے تو غزل بھی شاہ صاحب ہی کو دکھانا شروع کر دی حالانکہ بعض اہل نظر کی رائے ہے کہ نثار کا مرتبہ شاعری میں شاہ اکبر سے بلند ہے آگرے اور آگرے سے باہر مولانا کے شاگرد بہت تھے جن میں سے بیدم شاہ وارثی، مضطر اکبر آبادی اور بابو برجموہن لال شام اکبر آبادی نے مولانا کا نام خوب روشن کیا ان میں شام صاحب بحمد اللہ بقید حیات ہیں اور ان کے دم سے مولانا کے نام کے ساتھ اگلی شرافت اور علم مجلسی بھی

زندہ ہے شعر بہت خوب کہتے ہیں اور تحت اللفظ پڑھنے میں آگرے میں اپنا جواب نہیں رکھتے ان کے والد ماسٹر شنکر دیال صاحب آگرے کے بڑے نامی وکیل تھے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ میرے بچپن میں مشاعرے مولانا نثار صاحب کی سرپرستی میں ہوا کرتے تھے مولانا سیماب شاہ دلگیر، اور شائق، مظہر، فلک صاحبان کا طوطی بولتا تھا دلگیر شاہ کے سوا ان سب شاعروں کے شاگردوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے جو مشاعروں کو سر پر اٹھا لیتے تھے خصوصاً فلک صاحب مرحوم کے شاگرد بہت زیادہ تھے وہ خود ان کی تعداد سو سے اوپر بتلایا کرتے تھے مشاعروں میں جاتے تو دولہا بنے ہوئے شاگردوں کی فوج ساتھ لیے جاتے ان کی زبان سے مصرع نکلا اور جیسے کہرام مچ گیا فلک صاحب کا گشت روزانہ شام کو سی بجے سنتری بازار سے مال کے بازار تک لگتا تھا دن کو تو اپنے معمولی لباس میں رہتے لیکن شام کو ہاتھ کی پہاڑی لکڑی کے سوا سارا لباس بدل جاتا، گلابی، زردہ، نیلی، ریشم کی شیروانی کلابتوں کی دریں گول ٹوپی۔ گلے میں ہار منہ میں پان، پاؤں میں دلی کا کامدار سلیم شاہی ایک ہاتھ میں پہاڑی موٹا ڈنڈا، دوسرے ہاتھ کو مومن خان کی طرح جنبش دیتے ہوئے گنگناتے ہوئے بازار کے اس سرے سے اس سرے تک ٹہل لگایا کرتے پیچھے پیچھے چار مخصوص شاگرد حلیم، وصی حسن صاحب شہاب، حکیم بال کشن صاحب باغ، شمس اور کاشف صاحب وغیرہ مودب چلتے اور اپنی اپنی غزلوں پر اصلاح کراتے جاتے یہ سماں دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا فلک صاحب مرزا رئیس کے شاگرد اور یار غار تھے اب ان کی یادگار صرف حلیم بال کشن صاحب باغ باقی ہیں اور آگرے کی قدیم روایاتِ شعر و سخن کی خوبی کو بڑی خوبی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ نثار اور واصف کے دور کے شعرا میں سب سے زیادہ عمر مرزا عاشق حسین صاحب بزم اکبرآبادی نے پائی ان کا انتقال ابھی چند سال ہوئے حیدرآباد میں ہوا انہے ان کا تعلق دربار رام پور سے تھا اس لیے اب اپنے آخر زمانے میں آگرے آئے اور چند سال رہ کر پھر باہر تشریف لے گئے مرزا صاحب کو میر شکوہ آبادی سے تلمذ تھا ان کی شخصیت بڑی دل آویز تھی۔ جارج پنجم کی جوبلی کے سلسلے میں ریاست دتیا میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا آگرے سے بزم صاحب ہمارے میر کارواں تھے۔ شام صاحب اور میں بزم صاحب کے ساتھ دتیا میں تین چار روز رہا وہاں تمام ہی قسم کی دلچسپیاں موجود تھیں مگر ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ بزم صاحب کی باتیں تھیں وہ بچوں میں بچے جوانوں میں جوان تھے لیکن بوڑھوں میں بھی بوڑھے نہ تھے۔ سن ۱۹۴۲ء میں جے پور میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا آگرے سے سیماب اور بزم صاحبان تشریف لے جا رہے تھے اتفاق سے جوش ملیح آبادی بھی آگرے ہی سے جے پور کے لیے ریل میں سوار ہوئے بزرگوں کے لیے میں نے الگ انتظام کر دیا تھا جوش صاحب اور میں علیحدہ بیٹھے۔ گیارہ بارہ بجے رات کو جوش صاحب ایک اسٹیشن پر اترنے لگے میں نے پوچھا خیریت تو ہے اس وقت کہاں؟ کہنے لگے ذرا بزم صاحب سے ایک مخصوص قسم کے شعر سننے جا رہا ہوں نیند نہیں آ رہی ہے اس موضوع پر ہندوستان میں اس وقت ان کا جواب نہیں ہے۔ بزم صاحب کے صاحبزادے مرزا انجم آفندی ان کے صحیح جانشین اور سچی یادگار ہیں شعر و ادب میں بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح ان کا مقام بہت بلند ہے۔

آگرے کے ادیبوں شاعروں اور مصنفوں کا جب بھی کوئی تذکرہ لکھا جائے گا اس میں حافظ امام الدین اکبرآبادی، مفتی انتظام اللہ شہابی، رضا اکبرآبادی اور صبا اکبرآبادی کا ذکر ضروری ہوگا اور ان حضرات کے علاوہ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی ذات ایسی نہیں ہے جس کا ذکر نہ کیا جائے۔ مرزا چغتائی تحریریں جتنی شگفتہ اور زندہ دل معلوم ہوتے ہیں بظاہر ایسے نہ تھے وہ کچھ خاموش اور جھلائے ہوئے سے رہتے تھے ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کے ابا مرزا ابراہیم بیگ صاحب چغتائی مجھ پر اتنے مہربان تھے کہ جب میں ان لوگوں سے ملنے جاتا وہ اپنے سوا کسی سے بات ہی نہ کرنے دیتے ان کی باتیں ختم نہ ہوتی تھیں مرزا ابراہیم بیگ صاحب شاعر بھی تھے اور مختلف قسم کی کتابوں کے مصنف بھی ان کی جوانی کی خبر نہیں ہے مگر ان کا ساتھ کی

بڑھاپا کم دیکھا بارہ گھنٹے کی نمازیں اور بارہ مہینے کے روزے رکھتے انہیں کو دیکھا ان کے واقعات لطیفوں سے کم نہیں مگر سب سے بڑا مجسم لطیفہ ان کے خلف اکبر نواب تسلیم بیگ چغتائی تھے وہ اکثر باہر رہتے تھے۔ دو چار دس پندرہ دن کے لیے آگرے آجاتے تھے جتنی دیر بیٹھتے لطیفے سناتے ہنستے اور خود نہ ہنستے۔ یہ حضرات آگرے کے تھے مگر بعض حضرات یہاں ایسے بھی تھے جو تھے تو باہر کے مگر ساری عمر ان کی آگرے میں گزری اور آگرے والوں کو انہوں نے بہت کچھ دیا۔ مفتی محمد سعادت اللہ صاحب اسرائیلی ساری عمر مدرسہ عالیہ آگرہ میں مدرس اول رہے۔ عربی ادب اور حدیث میں ان کا جواب نا ممکن ہے فارسی اردو میں سعدی تخلص فرماتے تھے اور مخصوص طالب علموں کے سوا کسی کو شعر نہ سناتے نہ اشعار نقل کرنے دیتے۔ میں نے جو کچھ دینیات اور معقول پڑھا اس کا بیشتر حصہ مفتی صاحبؒ سے ہی پڑھا۔ آل احمد صاحب اکبر آبادی نواب فیاض خاں صاحب امام اکبرآباد کا پنڈت راج ناتھ صاحب کنزرو اور ان جیسے بہت سے اصحاب مفتی صاحب کے شاگرد رہے ہیں مفتی صاحب کی خصوصیات لکھنے کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے اسی طرح مولانا حامد حسن صاحب قادری اور پروفیسر طاہر فاروقی صاحب کے دم سے آگرے کی علمی ادبی محفلیں روشن تھیں یہ دونوں حضرات بھی پاکستانی ہو گئے اور اب بھی آگرہ تو ہے مگر وہ آگرہ معلوم نہیں ہوتا، مکین و مکان بدل گئے زمین و آسمان بدل گئے تہذیب و اخلاق بدل گئے اور اب تو زبان بھی بدلتی معلوم ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا ماتم کرنے والے بھی کچھ روز میں نہ ہوں گے اور داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع خاموش کا بھی ذکر ہی رہ جائے گا۔

غالب کی شاعری

عطا محمد شعلہ

غالب کے متعلق ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اردو کے پہلے فلسفی شاعر تھے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں اور اس دعوے کا کھوکھلا پن جتنا بھی غور کیا جاتا ہے اتنا ہی ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے ایسے اشعار سے کچھ لوگوں نے ایک غلط نتیجہ مرتب کر لیا اور پھر وہ سکۂ رواں کی طرح چل نکلا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ان اشعار میں ایک فلسفیانہ طبیعت کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ غالب ان اشعار کی وجہ سے ایک فلسفی شاعر مانے جائیں نہایت ہی گمراہ کن طرزِ استدلال ہے۔ غالب اس لئے زندہ نہیں ہیں کہ وہ ان یا ان جیسے دیگر اشعار کے خالق ہیں بلکہ یہ اشعار اس لئے زندہ ہیں کہ غالب کے چند کمزور جذباتی لمحات ہیں جو ان کے دماغ میں شعر بنے اور بے اختیار الفاظ کی صورت میں ضبطِ تحریر میں آ گئے۔ غالب چونکہ ایک عظیم اور جاوداں فنکار تھا۔ اس کی نسبت سے ان اشعار کی تقدیر میں بھی زندگی لکھ دی گئی۔ یہ ہمارے ناقدین اور شارحینِ غالب کی کم عقلی اور بے بصیرتی ہے کہ وہ ان اشعار پر صفحے کے صفحے سیاہ کرتے ہیں اور ان کی طرح طرح کی ترجمانی کر کے ایک خیالی محفل سجاتے رہے ہیں اور اس طرح ہمارے ادبی مزاج کی صحیح رہنمائی سے قاصر رہے ہیں۔

ان یا ان جیسے اشعار میں غالب نے کوئی عظیم فلسفہ پیش نہیں کیا۔ ان میں وہی پٹا ہوا فلسفہ ہے جو اس زمانے کے زہاد کی محفلوں میں عام موضوعِ گفتگو رہتا تھا اور اس طرح وہ تھوڑی دیر کے لئے ان بھول بھلیوں میں پھنس کر زندگی اور حقائق کی تلخیوں سے منہ چھپانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ہمہ اوست، ہمہ از اوست، خدا کا وجود اور اس کی ہستی کے سلسلے میں استدلال اور اس سلسلے میں

فلسفیانہ موشگافیاں، جبر و اختیار کا فلسفہ اور جزو کل کا تعلق اور اس کے خلاف و موافق دلائل و براہین۔ یہ سب صورتیں اسی وقت وجود میں آتی ہیں جب انسان عمل سے گھبرا کر خیالات اور تخیل کی باریکیوں میں پناہ ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل کے طے ہونے یا الجھے رہنے سے زندگی کی ماہیت اور خارجی حقائق کی سنگلاخی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان تخیلات کے اس جال میں اسیر ہو کر زندگی سے زیادہ دور اور عمل کے لحاظ سے زیادہ ناکارہ ہوتا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ غالب کا عہد ایسے ناکارہ پن کے ایک عظیم اجتماع کا دور تھا جس میں مادۂ فاسد کی زیادتی نے صحت مندی کی رمق بھی باقی نہ چھوڑی تھی اور چونکہ اپنے عہد کی چھاپ اور اس کے اثرات سے انسان کا بچ کر جانا مشکل ہے، غالبؔ کے یہاں کہیں کہیں ایسے اشعار کی موجودگی ہماری سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ پھر بھی غالبؔ کے موجودہ دیوان میں ایسے اشعار جن میں محض ذہنی قلابازیوں اور شعبدہ بازیوں کا اظہار ہو کم ہیں اور گنتی کے ایک دو فی صدی اشعار کی بنا پر کوئی ایسا نتیجہ نکال لینا کہ جس کی بنیاد پر شاعر کے کل ذہنی سرمایہ کو غلط پس منظر میں پیش کیا جا سکے، میرے نزدیک کوئی مستحسن کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے ایک ادبی بے راہ روی کی بنیاد پڑتی ہے اور ذوقِ ادب کی صحیح نشوونما نہیں ہو پاتی۔

غالبؔ، شاعری میں روایت پرستی کے پہلے اور سب سے بڑے باغی ہیں۔ وہ پہلے بت شکن ہیں جن سے ادب کی تاریخ میں ہمارا واسطہ پڑتا ہے اور یہی ان کی عظمت کا سنگِ بنیاد ہے۔ میرؔ اور غالبؔ کے درمیان شاعروں کا ایک عظیم قافلہ ہے جس کے یہاں وصل و فراق کی ایک ہی سے ملتی جلتی اور حسن و عشق کا ایک ہی انداز، بلکہ زیادہ صحیح طور پر یوں کہنا چاہیے کہ فارسی شاعری اور اس کے اثر سے اردو شاعری از اول تا آخر نغمۂ عشق کی ایک ہی دھن سنائی دکھائی دیتی ہے۔ ہاں آواز کے زیر و بم سے مختلف سُر پیدا کئے گئے ہیں۔ مثلاً میرؔ کے یہاں سوز اور مردانگی ہے تو دردؔ کے یہاں گداز اور سپردگی۔ آتشؔ کے یہاں گرمی اور قوت ملتی ہے تو مصحفیؔ کے یہاں دھیما پن۔ ظفرؔ کے یہاں وہی آواز زیادہ مایوس کن اور دردناک ہوتی نظر آتی ہے تو ذوقؔ کے یہاں اس میں ایک ٹھہراؤ ہے اور وہ اپنے زوال آمادگی کے لئے ایک اخلاقی اساس کا بہانہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن غالبؔ ان سب سے الگ ہیں۔ غالبؔ کے یہاں اردو غزل کی دھن بدلتی صاف سنائی دیتی ہے اور اسی لئے وہ اردو کے شعری ادب کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عشق جو اب تک سراپا جذبات و دیوانگی تھا پہلی مرتبہ عقلِ انسانی سے مصروفِ آویزش نظر آتا ہے اور اس آویزش کے نتیجے میں عقل و عشق دونوں ہی کچھ اس طور پر سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ بات اب تک دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ عشق کے متعلق فرسودہ روایتی خیالات غالبؔ کے یہاں بالکل نئے انداز میں ایسے بدلے ہیں کہ وہ ایک دفعہ تو چونکا دیتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نئی ہی بات پیش کی گئی ہے جس کی طرف عام انسانی ذہن جا ہی نہیں سکتا۔ یقین نہ آئے تو لیجئے سنئے ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

ان اشعار میں ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی حقیقت کے اس پہلو پر غالبؔ سے پہلے

کسی کی نگاہ نہیں گئی تھی اور اب معلوم ہوتا ہے کہ بدیہی مسلمات کے پردے میں حقیقت نہ دیدنہ مستور تھی جن کو غالب نے [illegible] کر پیش کیا ہے کہ گویا حقیقت اپنے اصل روپ میں سامنے آگئی ہے۔ لیکن چیزوں کو اس طرح دیکھنے کا ڈھنگ اتفاقی طور پر ہاتھ نہیں آجاتا۔ نہ یہ کوئی ایسا حادثہ ہے کہ غالب کے ساتھ اچانک پیش آگیا ہو۔ جب تک حقیقت کے متعلق اس طرزِ خیال کو اپنے مزاج میں رچا بسا کر ہستی کا جزو نہ بنا لیا جائے، رائج الوقت خیالات اور ان کی فرسودہ شکل سے دامن بچا کر نبھانا ناممکن اگر نہ بھی ہو تو حد درجہ مشکل ضرور ہے۔

عشق کو دماغ کا خلل کہہ دینا محض قافیہ کی مجبوری نہیں ہے۔ میر بھی بہت بڑھے تو یہاں تک پہنچ کر رک گئے ؎

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

میر سے غالب تک عشق کا مثالی تصور اتنا غیر مناسب حدود میں پھیل چکا تھا کہ وہ کوئی ارضی چیز رہ ہی نہ گئی تھی اور زندگی جس کا ایک خانہ عشق ہے سرتاسر عشق بن کر رہ گئی تھی۔ گویا ایک طرح عشق زندگی اور زندگی عشق بن چکی تھی۔ غالب نے عشق کو زندگی کا ایک جزو بنا کر جذبۂ عشق کی نو آباد کاری کی اور اس طرح عشق کو روزانہ کی زندگی میں قابلِ قبول بنایا۔ انھوں نے غمِ جاناں اور غمِ روزگار میں ایک ایسا حلول و امتزاج پیدا کیا کہ دونوں میں ایک تناسب اور ایک حسن آگیا اور اس طرح فرسودہ خیالات کو ختم کر کے عشق اور شاعری دونوں کے لئے حسین تر، متناسب اور سازگار ماحول پیدا کیا اور ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی جو آج تک ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ غالب اگر نہ ہوئے ہوتے تو جدید غزل آج جس رنگ میں پیشِ نظر ہے نہ ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ غزل میں اس لوچ کا وجود ہی نہ ہوتا جس نے غزل کو آج بھی ہماری سب سے زیادہ مقبول صنفِ سخن بنا رکھا ہے اور ہم غزل کا مرثیہ اب سے بہت پہلے پڑھ چکے ہوتے آیئے اس دعویٰ کو ان کی شاعری کی روشنی میں پرکھیں ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

تاب لانے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
رنجِ طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر
ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی
گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ان اشعار میں نہ میر کا سوز ہے نہ درد کی سپردگی، نہ ظفر کی برشتگی و مایوسی نہ مومن کی شوخی و پینترے بازی۔ نہ ذوق کی معاملہ جنہیں فراق روایتی و پنچایتی باتوں کا نام دیتے ہیں۔ نہ آتش کی گرمی و تہذیبِ نفس ان میں ہے نہ مصحفی کا گداز اور ملائمت۔ لیکن پھر بھی یہ وہ اشعار ہیں جن سے اُردو ادب کی آبرو ہے، جن کی وجہ سے غالب اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کا نام ادب سے لیا جاتا رہے گا۔ ظاہر ہے کہ غالب سے پہلے شعری ادب کے جتنے اسالیب اور سانچے تھے ان سے یہ آواز اور یہ طرزِ اظہار اپنی ایک علیحدہ نوعیت رکھتا ہے۔ زندگی ایک نئی نوعیت سے یہاں نظر آتی ہے اور اس کے مطالعہ کا ایک ایسا زاویہ ملتا ہے جو سراسر مادی ہے جس میں زندگی اتنی عزیز ہے کہ واقعہ کتنا ہی سخت ہو تاب لائے بغیر کوئی صورت نظر نہیں آتی جس میں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ لطافت بے کثافت نظارگیٔ جلوہ سے محروم رہتی ہے۔ جس میں ایک بدلتے ہوئے معاشری نظام کی اخلاقی قدریں پہلی دفعہ نظر آ رہی ہیں۔ جاگیرداری ادب پر سرمایہ داری کے عہد کی چھاپ لگتی دکھائی دیتی ہے اور اس حقیقت کا اعلان ہے کہ بے ننگ و نام عاشق کی معشوق کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رہتی۔ تو وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے" حالانکہ غالب سے پہلے عشق و عاشقی کا نظریہ اس کے برعکس تھا۔ وہاں بے ننگ و نام ہونا ہی عشق میں پختہ کاری کا ثبوت تھا۔ فارسی شاعری عشق کے اسی پہلو پر زور دیتی تھی۔ میر نے پہلی دفعہ کوشش کی تو صرف اتنا کہا کہ "اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی" گویا حسب و نسب کی برتری کا احساس انہیں کچھ ہوا۔ اگرچہ جامی کہتا ہے "بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی!"

جاگیرداری نظام میں رؤسا کو فرصتِ عشق تھی لیکن غالب کے زمانہ میں "فرصتِ کاروبارِ شوق" محال ہو چکی تھی۔ گویا سرمایہ دارانہ نظام نے معاشرے میں جو تبدیلی پیدا کی تھی اس کا اثر پہلی دفعہ غالب کے ذہن نے محسوس کیا اور پہلی دفعہ حقیقت پسندانہ نظر سے عشق و عاشقی کی قدروں کو نئے ماحول میں انہی نے پرکھا۔ اسی سے ان کے یہاں ہم کو مروجہ جذباتی اور روایتی شاعری سے ایک ایسا انحراف ملتا ہے جس میں عقل پرستی اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہنگامہ آرا ہے اور اسی عقل پرستی کی دین ہے کہ غالب کو ہم اُردو کے شعری ادب کی تاریخ میں پہلا بت شکن مانتے ہیں۔ غالب نے حقیقت کا تجزیہ اس قدر بے رحمانہ انداز سے کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن اس کا اظہار اس قدر فن کارانہ پہلو سے کیا ہے کہ ان کے اشعار گفتگو میں بے تکلف استعمال کرنے کے لئے موزوں ترین نظر آتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ان سے پہلے یا بعد کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کے اکثر اشعار گفتگو میں اس طرح استعمال کئے جا سکیں۔ غالب کے علاوہ کس کو ہمت ہو سکتی تھی کہ کہے "آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے" یہ بے تکلفی کاروبارِ شوق میں محبوب

کے ساتھ سراپا سپردگی ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اس کو حقیقت کا آئینہ دکھا کر یہ احساس دلاتا کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اس کا نازِ محبوبانہ بھی تک ہے کہ جب تک عاشق اسے ایک خاص زاویہ سے دیکھ رہا ہے اگرچہ وہ زاویہ بھی خود عملِ داخلی کی پیداوار ہے، یہ سب باتیں اُردو میں نئی بھی تھیں اور انوکھی بھی لیکن بدلتے ہوئے ماحول میں نگارِ حقیقت کا صحیح روپ بھی یہی تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے غالب عظیم سے عظیم تر ہوتے جاتے ہیں۔

لوگوں نے کہا ہے کہ غالب اپنے زمانے سے قبل پیدا ہو گئے تھے۔ میں اس کو نہیں مانتا۔ ایسا کہنا تاریخی حقیقت سے روگردانی کرنا ہے۔ غالب ٹھیک اپنے زمانے میں پیدا ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تاریخی عمل بعض اوقات اس طرح ظہور میں آتا ہے کہ شروع میں اس کی رفتار نہایت سست دکھائی دیتی ہے اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی تبدیلی بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے چند ذہین لوگ ہی اس کا احساس کر پاتے ہیں اور باقی لوگ جو پرانے نظام کی روایتوں میں پلے بڑھے ہوتے ہیں اگر اس نئے نظام کو آتا ہوا محسوس بھی کرتے ہیں تو اپنی روایتی عینک کی وجہ سے انہیں اس نئے نظام میں سابقہ نظام کی خوبیوں کے خلاف ایک بغاوت نظر آتی ہے اور نئے نظام کو وہ سراپا عیب ہی سمجھتے ہیں اور اس طرح نئے اور پرانے کی آویزش جنم لیتی ہے۔ کچھ دنوں تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدیم تہذیب کے علمبردار جیت رہے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ نیا نظام جو ایک تاریخی ضرورت ہوتا ہے، سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو تسلیم کرنا بھی زندگی کے لئے ضروری ہی ہو جاتا ہے اور وہی چند لوگ جو شروع میں نئے نظام کو خوش آمدید کہنے کی وجہ سے سرپھرے اور پاگل قرار دیئے جاتے تھے، نئے ماحول میں پیامبرِ جدید کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے سے قبل پیدا ہو گئے تھے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک اپنے زمانے میں تاریخی عمل کی پیداوار ہوتے ہیں اور اگر وہ پیدا نہ ہوتے ہوتے تو تاریخی عمل میں وہ تنظیم اور تیزی نہ آتی جس کی وجہ سے آج وہ پیامبرِ دورِ جدید کہے جا رہے ہیں۔ غالب بھی بالکل اسی طرح اردو کے شعری ادب میں پیامبرِ دورِ جدید تھے۔ غالب نہ ہوتے تو چکبست، اقبال، فانی، عزیز، حسرت، اصغر بھی نہ ہوتے۔ غالب نے جن اطراف میں اپنی ذہانت اور طبعِ رسا کی روشنی چمکائی ہے ان سب نے ان میں سے ایک ایک میدان کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس میں ریسرچ کا کام کر کے ان گوشوں کو اور زیادہ اُجاگر کیا۔ لیکن یہ غالب ہی تھے جنہوں نے اُردو غزل کے امکانات کی طرف پہلے اشارے کئے اور جدید غزل کے تصور کو اُبھارا اور بجا طور پر یہ کہہ کر ناز کیا ؎

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

غالب کا مطالعہ کرتے وقت جو بات ہمیں نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلی بار انہوں نے غمِ عشق پر غمِ روزگار کو فضیلت دی ہے اور غمِ عشق کو غمِ روزگار کے بھلانے کے لئے ایک وسیلہ مانا ہے۔ غمِ عشق بذاتِ خود اتنا اہم نہیں ہے

"غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا"

اس کے ساتھ ساتھ اک حسرتِ تعمیر بھی ملتی ہے ؎

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

اس حسرتِ تعمیر کو غمِ محبوب بھی نہ مٹا سکا۔ یہی حسرتِ تعمیر ہے جو ان کی پوری شاعری پر چھائی ہوئی ہے اور اسی حسرتِ تعمیر سے وہ فضا پیدا ہوئی ہے جس میں سے قوت و ضبط کے سوتے پھوٹے ہیں اور جس نے جدید غزل کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان سے پہلے یہ حسرتِ تعمیر کہیں نظر نہیں آتی۔

یہی نہیں بلکہ جدید دور کے علومِ جدیدہ سے جو مسائل پیدا ہوئے ان پر غالب نے کافی غور و خوض کیا ہے اور یہ بالکل منطقی و بدیہی بات تھی۔ اس لئے کہ جب عشق کو اس کے اصل ارضی و جسمانی پس منظر میں دیکھا جائے گا اور اس پر اب تک روحانیت یا مثالیت کی جو ایک دبیز تہہ تھی وہ اتار پھینکی جائے گی تو ظاہر ہے کہ عشق کی نفسیات بھی معرضِ بحث میں آنے لگے گی۔ اسی لئے غالب کے یہاں قدم قدم پر نفسیاتِ انسانی و نفسیاتِ محبت کے بنیادی نکات ملتے ہیں جن پر ان سے پہلے کے شعرا نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔ (اور اگر کسی کے یہاں اس طرف اشارہ کہیں ملتا بھی ہے تو اس لئے کہ شاعر خواہ کسی قدر بڑا روحانی لبادہ چڑھائے ہوئے ہو بہرکیف وہ پھر بھی انسان تھا اور کسی نہ کسی چور دروازے سے بنیادی انسانی جذبات و نفسیات کے گھس آنے کا خطرہ لاحق ہو ہی سکتا تھا) یہی وہ نکتہ ہے کہ جس کی وجہ سے غالب کی مقبولیت کی باڑھ روکے سے نہ رک سکی۔ اس لئے کہ شاعر کے مخاطب بہرحال انسان ہیں اور ان کی طبیعت کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی دلچسپی کی بات کا مطالبہ کریں۔ یہ بات غالب ہی کے یہاں ملتی ہے۔ انہوں نے غزل میں پہلی بار ایسی فضا کو داخل کیا جس میں انسان کی بنیادی نفسیات و جذبات کا مطالعہ ممکن ہو سکا اور اسی لئے انہیں وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ شہرتِ دوام کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا۔ آئیے اس بات کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں ؎

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک —— ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح —— کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا —— کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام —— ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے —— یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب —— یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں —— روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں —— روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ —— ہر چند برسبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال —— ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید —— مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب —— ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری —— تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ —— شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ ——— گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ——— مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق ——— وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ——— کاش کہ تم مرے لئے ہوتے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی ——— منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

اب تک ہماری شاعری میں ناز محبوبی کو مرکزی جگہ حاصل تھی۔ مندرجہ بالا اشعار بتا رہے ہیں کہ عاشق کو غالب نے ناز محبوب کے مقابل لا کھڑا کیا ہے اور اس طرح عشق کے مزاج میں عاشق کی اہمیت کو باقاعدہ طور پر انہوں نے سمجھا اور پیش کیا۔ یہاں تک کہ بے صبر ہو کر کہہ بیٹھے "کہاں تک اسے سراپا ناز کہا جائے"؟ عشق کو سراپا سپردگی کی حد سے نکال کر اس میں باقاعدہ مساوات کا عنصر لانے اور عاشق و معشوق کی اہمیت کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کرنے کے لئے غالب ہی نے پہلی بار باقاعدہ کوشش کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مایوسی اور مجبوریت جو غدر کے اثرات سے اور زیادہ تیز ہو گئی تھی، غالب کے مزاج کو زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور انہوں نے بدلتے ہوئے نظام میں انسانی طاقت کی افضلیت کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا جس سے آنے والی زندگی کے امکانات روشن ہونے اور ایک طرح کا احساس خودی اور اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا جس کے بغیر انسان میں فعالیت پیدا نہیں ہو پاتی اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ہندوستان کی سیاسی و معاشی غلامی کبھی دور نہ ہو پاتی۔ اس امنگ کا پہلا نشان غالب ہے جس نے تناور درخت ہو کر برطانوی سامراج کی خس و خاشاک کو اس طرح سایہ میں لیا کہ وہ پنپ ہی نہ سکا۔ ہاں کہیں کہیں [illegible] اور ان کے یہاں ایک دو اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر یاسیت کبھی کبھی غالب آ جاتی تھی اور تنہائی میں ایک محشر خیال کا تجربہ انہیں انجمن کا لطف دے جاتا تھا لیکن ایسے اشعار کم ہیں اور ان کا ہونا اس لئے ناگزیر بھی ہے کہ غالب تاریخ کے جس دور میں پیدا ہوئے وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا۔ اس عہد میں اس امنگ اور ولولہ تازہ کا احساس ہی پایا جانا بھی جو غالب کی شاعری میں ملتا ہے ایک عجیب و غریب معجزہ ہے اور بتاتا ہے کہ غالب کے اعصاب کتنے قوی تھے جو باوجود تشدد اور مصائب کے پہاڑوں کے سامنے ہنستے ہنستے زندگی کی تاریکی میں آمد صبح کا احساس کر سکتے تھے۔ اس احساس ہی نے ان کی زبان، لہجے اور طرز ادا میں وہ طرفگی پیدا کی کہ آج ہم غالب کی عظمت کا احساس کرنے پر مجبور ہیں۔ انہی نے سوسائٹی میں باقاعدہ طور پر آنے والے نظام کو خوش آمدید کہنے اور سمجھنے کا جذبہ پیدا کیا اور اس بات کا احساس دلایا کہ اب زندگی کی نہج بدل رہی ہے۔ انہوں نے زندگی کی روانی کا احساس اور اس میں سماجی عنصر کے در آنے کا اندازہ کیا۔ فرد کی اہمیت زائل ہو رہی تھی، سماجی کشمکش بڑھ رہی تھی، نئی طبقہ وارانہ تقسیم ہونے جا رہی تھی کہ غالب آئے اور انہوں نے اعلان کیا "غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟ ...." یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ انفرادی شکستوں کے ماتم کا زمانہ گزر چکا۔ اب انسان کو ان انفرادی غموں کے جنون سے باہر آ کر ایک نئے زاویۂ نظر سے سوچنا ہے اور آنے والی تہذیب کے لئے تیار رہنا ہے۔ غالب سے پہلے منزل لیلیٰ کے لئے "شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی" کا رواج عام تھا۔ غالب کی نظروں نے پہچانا کہ وہ زمانہ ہوا ہو چکا۔ آج کی لیلیٰ

سکے لئے بے ننگ و نام ہونا ہی سب سے بڑا عیب ہے۔ آج عاشق کے لئے سماج میں باحیثیت ہونا شرطِ اوّل قرار پا گیا ہے اور اسی لئے اپنے بے ننگ و نام ہونے پر انہوں نے یوں اظہارِ تاسف کیا:

”یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں“

اسی کے ساتھ انہوں نے حسن کو بھی متنبہ کیا کہ:

”گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر“

عاشقی کا معیار بدل رہا تھا۔ حسن کے لئے حسنِ محض کے علاوہ کچھ عشوہ و ادا اور بھی ضروری بن گئے تھے۔ غالب کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کے پہلے نقیب تھے اور سماج میں آنے والی تبدیلیوں کو ان کی دوربین نگاہوں نے سب سے پہلے پڑھا اور سمجھا اور ان کی قوتوں اور ان تبدیلیوں کو ایک تاریخی حقیقت مان کر سب سے پہلے خوش آمدید کہا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کی شاعری آنے والے نئے ذہن کی طرف وقت کا پہلا اشارہ تھی جس نے باضابطہ طور پر زندگی کے عمل میں آنے والی تبدیلیوں کا احساس دلایا۔ ہمارے اندازِ فکر میں ایک انقلاب پیدا کیا اور تاریخ کے مادی نظریہ کو باضابطہ طور پر قبول کرنے اور کرانے کی مہم کو تیز تر کیا۔ اگر ہم غالب کا مطالعہ غور سے کریں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ادراکِ حقیقت میں محسوسات اور حواسِ خمسہ کو بنیادی مرتبہ دیا ہے اور ہر ایسی چیز کو رد کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ادراک حواسِ خمسہ کی مدد سے نہ کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے غالب کی شاعری ہمارے اندازِ فکر میں ایک انقلابی موڑ کا پہلا نشان بن جاتی ہے۔ اس دعوے کو ان کی شاعری کی روشنی میں پرکھیں تو شاید یہ بات اور زیادہ واضح ہو سکے۔ لیجئے سنئے اور لطف لیجئے ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

تھی وہ اک شخص کے تصور سے　　اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز　　سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا　　ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

نہ صرف زندگی کی اخلاقی سطح بدل رہی ہے بلکہ ان اشعار میں معتقدات بدلتے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ آنے والے انسان کا مادی نقطۂ نظر ان اشعار پر سایہ فگن ہے۔ اب صرف وہی معتقدات باقی رہ سکتے ہیں جن کی وجہ سے تعمیم اور تائید حسیاتی تجربات سے براہِ راست ہو سکے۔ محض خوش فہمی عقلی بصیرت کے سامنے سپر انداز ہوتی ہوئی یہاں صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہی نقطۂ نظر آگے پھیل کر پورے نظام کو اپنی گرفت میں لانے والا تھا۔ رعنائیِ خیال کسی شخصِ حسین کے تصور ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور وہ شخصِ حسین چاہے ابنِ مریم ہی

کیوں نہ ہو اگر اپنے کام کا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر اپنے دکھ درد کی دوا اس کے پاس نہیں تو گویا وہ کسی کام کا نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اخلاق بھی تجارتی بنیادوں پر استوار ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور اب چیزوں کے حسن سے ہٹ کر ان کی افادیت پر نگاہ جاتی ہے اسی لیے جامِ جم سے جامِ سفال کہیں بہتر نظر آرہا ہے۔ عقیدۂ جنت کا یہ بے رحمانہ تجزیہ کہ :

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

اسی نقطۂ نظر کے طفیل ہے اور اگر یہ چیز شعر سے ہٹ کر کہیں نثر میں ادا ہوئی ہوتی تو شاید غالب شہادت سے ہمکنار ہو چکے ہوتے۔

غالب کے معتقدین اور سوانح نگاروں نے غالب کے ساتھ ایک ظلم یہ کیا ہے کہ انہیں ناک چڑھا ثابت کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ عوام سے عمر بھر نفور رہے اور بعض خواص کے ساتھ ربط و ضبط کے قائل رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسد تخلص محض اس بناء پر چھوڑ دیا کہ یہی تخلص کسی ستّے کا بھی تھا اور غالب تخلص اختیار کیا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ وہ عوام سے زیادہ ربط و ضبط کے قائل نہ تھے اور ان کا سماجی مرتبہ اور خاندانی رکھ رکھاؤ دونوں ہی اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ خواص سے صحبت رکھیں لیکن پھر بھی اس کا یہ مطلب نکالنا کہ وہ عوامی جذبات سے بے نیاز رہے، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ غالب اس حقیقت کو سمجھ گئے تھے کہ عوام سے رابطہ توڑ کر نہ شاعر ہی زندہ رہے گا نہ شاعری ہی۔ یہی وجہ ہے کہ طرزِ بیدل کی چیستاں گوئی چھوڑ کر انہوں نے یک دم سادہ نگاری کو اپنایا۔ عوام کی زبان کو محبوب سمجھا اور اس بے تکلفی سے اس کا استعمال کیا کہ نثر و نظم دونوں میں اسلوب کی وہ سدا بہار یادگار چھوڑی کہ پھر کسی کو یہ بات نصیب نہ ہوئی۔ جس طرح ان کے خطوط میں اردو نثر اپنے امکانات کی جھلک دکھاتی ہے اور پہلی بار ایک ڈرامائی کیفیت و اثر سے روشناس ہو کر مکالمے کا لطف دیتی ہے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی زبان اپنی سادگی کے باوجود ایک آن بان اور توانائی کا احساس لئے نظر آتی ہے اور ایک ایسی قوت اور اسلوب سے روشناس ہوتی ہے جس نے غزل کو ایک نئی زبان اور نیا لہجہ عطا کیا ہے اور اس میں جذبہ و عقلیت کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے جو اس سے پہلے کمیاب ہی نہیں نایاب تھا۔ یہ بات اسی لئے آسکی کہ غالب کا تعلق زندگی سے کبھی نہ چھوٹا۔ وہ ذوق اور مومن کی طرح اپنی ذات اور معتقدات کے خول میں محدود ہو کر نہیں رہ گئے۔ مومن نے محض جذبات کے ساتھ عقد پڑھا لیا تھا اور ذوق نے جاتی ہوئی جاگیردارانہ قدروں اور فرسودہ ماحول کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق اکثر اخلاقی مسلمات کے تکیہ بند نظر آتے ہیں تو مومن محض جذبات کے مرید۔ مومن کے عشق میں اسی سے ایک بازاری پن ملتا ہے اور ذوق کی شاعری میں اخلاقیات کی خشک اور متواتر گردان۔ غالب ان سے علیحدہ ایک جاندار صناع کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی چھاپ اردو ادب و شاعری پر کچھ اس انداز سے لگی ہے کہ مٹائے نہ مٹ سکے گی اور اس طرح ایک ہی زمانے میں غالب، مومن اور ذوق طبقاتی شعور کی تین مختلف منازل کے تین مختلف مظہر ہیں۔ مومن میں اگرچہ شگفتگی ہے مگر وہ جذبات کے ننگے ناچ کے مظہر ہیں اور اس طرح فراری ذہنیت کے لئے ایک آڑ کا کام دیتے ہیں۔ ذوق ایک مؤرخ کی طرح مٹتے ہوئے نظام کے اخلاق کے آخری نقیب ہیں اور غالب آئندہ طلوع ہونے والے نظام کے نقیبِ اوّل۔

اسی کے ساتھ ساتھ جب ہم تینوں شاعروں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب باوجود اپنی

آزادہ روی، قلندری اور مستی کے اجتماعی اخلاق کی گرفت سے آزاد نہیں رہے اور باوجود اپنی مستی کے انہوں نے اپنی بری باتوں کو بُرا ہی سمجھا اور کبھی بے جا فخر و مباہات کا اظہار نہیں کیا۔ ریاض، خیام، جوش اور جگر کی طرح یا دوسرے شعرا کی طرح انہوں نے مے نوشی کو کبھی اپنے لئے باعث فخر نہیں گنا اور مے کی لذت لینے کے باوجود اس کے غیر اخلاقی اور غیر افادی عنصر سے وہ کبھی غافل نہیں رہے ورنہ وہ نہ کہتے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

رو سیاہ کا لفظ ان کے اس احساس کا پوری طرح غماز ہے کہ وہ شراب نوشی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ یوں شراب کے متعلق ان کے دیوان میں کافی اشعار ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ شراب کے والہ و شیدا ہیں لیکن ان میں وہ لذت پرستی نہیں ہے جو جوش یا خیام کے یہاں ملتی ہے بلکہ ان کی شراب نوشی میں ایک بصیرت ہے اور وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ شراب نوشی حسن نہیں عیب ہے اور یہ محض اس لیے ہے کہ اس سے غرض نشاط نہیں بلکہ بیخودی کی جستجو ہے تاکہ انسان اپنے رنج و غم کو پیالۂ مے میں غرق کر دے اور انہیں یہ بھی احساس ہے کہ اس کے نشے میں بہت سے وہ کام بھی ہو سکتے ہیں جو سوسائٹی میں بہ ثبات عقل و ہوش جائز نہیں ہیں۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ان میں اجتماعی اور معاشرتی اخلاق کا ایک ایسا تصور پایا جاتا ہے کہ وہ ان کے احساس کو ہمیشہ راہ راست پر رکھتا ہے اور وہ بہک نہیں پاتے۔ یہاں تک کہ جس غم کو بھلانے کے لئے وہ اس کا استعمال کرتے تھے وہ غم بھی ان کے سامنے برابر رہتا تھا اور وہ اس کے اثباتی پہلو سے غافل نہیں ہو پاتے تھے۔

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہی وہ پہلو تھا جس نے غالب کو زندگی کے تعمیری اور اثباتی پہلوؤں سے آشنا رکھا اور وہ کسی حال میں بھی عروسِ زندگی کے رخ سے غافل نہیں ہوئے اور ان کی مے نوشی سرمستی کی جگہ بصیرت سے ہمکنار رہی۔ برخلاف اس کے مومن کے یہاں زندگی الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی ملتی ہے۔ وہ عیاشی کے وقت مکمل عیاش ہیں اور ضرورت کے وقت سرفروش مجاہد۔ جب عیاشی کا وقت آتا ہے تو وہ اسلامی تعلیم کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو وہ اسلام کے مجاہد بن جاتے ہیں۔ غالب کے یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ نہ ان کے یہاں کوئی مذہبی تصور ملتا ہے اور نہ روحانی جیسا کہ ذوق کے یہاں ملتا ہے ؎

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بلکہ غالب کے یہاں خالص انسانی تصور ملتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی قسم کا مذہبی خول بیکار تھا۔ وہ محض انسانی لبادہ ہی کو انسان

کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور اس حیثیت سے ان کے وہ اشعار بھی جو خالص اخلاقی نقطۂ نظر کے حامل ہیں محض زندگی کے اسی رخ سے متعلق ہیں جن کو ہر انسان تجربہ کرتا ہے اور جو ہر انسانی سوسائٹی کے لیے قابلِ عمل ہو سکتے ہیں مثلاً:

نہ سنو گر برا کہے کوئی　　نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخش دو گر خطا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا　　غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے　　ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ان اشعار میں وہ اخلاقی نکات اور زندگی سے سمجھوتہ کرنے کا وہ جذبہ ملتا ہے کہ جو ہر سماج اور ہر انسانی طبقہ کے لیے باعثِ فخر ہو سکتا ہے۔ اس پر کوئی مذہبی یا فرقہ وارانہ پابندی عائد نہیں ہو سکتی۔

غالب کا زمانہ ہندوستانی تاریخ کا ایک بہت ہی پُر آشوب زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں دو مختلف نظاموں کی جنگ ہوئی ہے۔ بالآخر جاگیردارانہ نظام نے ہتھیار ڈال دیئے اور سرمایہ دارانہ نظام کی فتح ہوئی۔ اس جسمانی فتح کے بعد ایک اور جنگ لڑی گئی جس میں جاگیردارانہ سماج اور اخلاق نے سرمایہ دارانہ نظام و اخلاق سے باقاعدہ جنگ کی اور آہستہ آہستہ سوسائٹی کے اخلاق و آداب بالآخر سرمایہ دارانہ اور تجارتی رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ یہ جنگ ہر محاذ پر لڑی گئی۔ یہاں تک مذاہب کی بھی نئی توجیہہ و تشریح عمل میں آئی ورنہ ان کے بھی مٹ جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ سوسائٹی میں نئے مصلح و رفارمر پیدا ہوئے۔ راجہ رام موہن رائے، گاندھی جی، سرسید احمد خاں اور دیگر چھوٹے بڑے مصلح سب اسی دور کی ضرورتوں سے متاثر تھے اور ان لوگوں نے اپنے اپنے دائرے میں مذاہب کی نئی تشریح و تفسیر کر کے وقت سے مصالحت کرنے کا ایک نیا اندازِ نظر پیش کیا۔ یہ جنگ اتنی شدید تھی کہ اس کے نتائج دور رس ہوئے اور خیر و شر کے تصورات میں بھی ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ غالب کا دماغ ایک زندہ دماغ تھا۔ انہوں نے اس لڑائی کو محسوس کیا اور اس ذہنی کشمکش کی طرف جو ان کی آنکھوں کے سامنے تھی انہوں نے واضح اشارے بھی کیے ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

یہ لڑائی کلیسا کے پیروؤں کی ہی بدولت معرضِ ظہور میں آئی تھی۔ وہی ایک ایسا نیا نظامِ حیات لے کر ہندوستان پر مسلط ہوئے کہ جس نے کعبہ کو پیچھے اور کلیسا کو آگے لا کھڑا کیا تھا اور جس کے نتیجے میں بالآخر کعبہ کے ماننے والوں کو زندگی سے سمجھوتہ کرنے کے لیے اور تقدیسِ کعبہ کو بچانے کے لیے کلیسائی اصولوں پر اسلام کی نئی توجیہہ و تشریح کرنی پڑی۔ محض معنوی کفر سے اس لڑائی میں اس نظامِ حیات کا بچنا مشکل تھا جو اب تک سوسائٹی پر حاوی تھا۔ علومِ جدیدہ کے بغیر اب اس نظام کو محض الٰہی نظام مان کر تسلیم کرنے والے بھی اپنے ایمان میں شگاف پڑتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ غالب نے اس کشمکش کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا اور اس کا صحیح نقشہ پیش کیا اور ساتھ

کی روشنی میں عقلِ انسانی کی برتری کا نغمہ گایا۔

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

اسی کے ساتھ ساتھ انسانی امنگ اور امید میں ایک جاودانی یقین کا معترف ہم غالب ہی کو پاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں قدم قدم پر نیک و بد کی آویزش ملتی ہے لیکن وہ انسانی عزم و حوصلہ میں ایک اعتماد رکھتے تھے اور اسی لئے ان کے یہاں مایوسی کی سی ذہنیت کمزور اور کہیں کہیں ملتی ہے۔ شروع سے آخر تک غالب کے یہاں ایک تعمیری احساس کا سراغ ملتا ہے اور ناقابلِ شکست عزم و حوصلہ سے پُر شاعری نظر آتی ہے جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ غالب میں ایک خود تنقیدی کیفیت ہے اور اسی بناء پر آج ان کا دیوان مختصر ترین دیوان ہے ورنہ میر تقی میر کے دیوان کی طرح رطب و یابس کا ایک انبار رہتا۔ یہی خود تنقیدی شعور آج غالب کی عظمت کا ضامن ہے۔ یہ خود تنقیدی شعور کس قدر مشکل اور نایاب چیز ہے اس کا اندازہ صاحبِ تصنیف حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جب انتخاب کرنے کا وقت آتا ہے تو اپنا کمزور سے کمزور شعر یا گھٹیا سے گھٹیا نثر کی ایک لائن بھی کاٹتے ہوئے دل دکھتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیز بڑے سے بڑے مصنف کی بہترین سے بہترین تحریر سے بھی افضل ہے۔ لیکن غالب نے جو انتخاب اپنے کلام کا پیش کیا ہے وہ صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ اس میں سے چند اشعار کو بھی نکال پھینکنا کسی بھی شخص کے لئے ناممکن ہے۔ برخلاف اس کے بڑے سے بڑے شاعر کا کلام فی زمانہ رطب و یابس سے پاک نہیں ہے سوائے غالب کے ہر شاعر و مصنف کا انتخاب پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب کی ایک یہی خصوصیت ان کے ذہنِ رسا کے کمال کا اعتراف کرانے کے لئے کافی ہے۔

اس تمام بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی حیثیت غزل کے لئے ایک مجتہد کی سی تھی۔ انہوں نے غزل میں نئی وسعتیں پیدا کیں اور غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار کو باقاعدہ طور پر غزل میں لانے والے وہی تھے اور اس طرح وہ ہمارے غزل گویوں میں معروضی حقیقت کے پہلے پارکھ ہیں۔ اس لئے کہ شعوری طور پر غزل کو زندگی کی شش جہتی کا آئینہ انہی نے بنایا اور پھر اس بات کا اعلان بھی کیا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے زندگی میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

یہ اس بات کی توضیح تھی کہ ان کی غزل غمِ جاناں کے علاوہ بھی کسی اور چیز کی آئینہ دار ہے اور یہ کہ غزل سے کچھ اور بھی کام لئے جا سکتے ہیں۔ غالب کا یہ اشارہ مستقبل کے شاعروں کے لئے قطب نما بن گیا اور غزل کے لئے حیاتِ جاوید کا پیام۔ اقبال، حسرت، فانی، اصغر اور جدید نسل کے لوگ جن میں اختر انصاری، اختر شیرانی، فراق اور پھر ان سے جدید تر جن میں ندیم، فیض، جذبی اور مجاز وغیرہ آتے ہیں۔ ان سب نے اس اشارہ کو ایک حقیقت بنا دیا اور ایک ایسے زمانے میں جب زبان پر تعزیریں تھیں۔ غزل کی آہٹیں

سیاسی و سماجی زندگی کا ہر رُخ سمٹ کر آگیا۔ اس لئے کہ یہاں بادہ و ساغر اور دشنہ و خنجر کے پیرایے میں ہر مضمون ادا ہو سکتا تھا۔ اگرچہ غالب ہی نے یہ بھی کہا کہ ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اور بیان کی اس وسعت کے لئے قدرت نے ان کے شاگرد حالی اور حالی کے ہم عصر آزاد کا انتخاب کیا۔ تنگنائے غزل کو بقدرِ شوق وسیع نہ پانے کا احساس شاید پہلے پہل غالب ہی نے کیا۔ یہ احساس ان کے دماغ کے زندہ ہونے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے بڑے سے بڑے صاحبِ نظر کی نگاہ غزل کے احاطہ میں محصور ہو کر رہ جاتی تھی۔

غزل کے دامن کی اس تنگی کے احساس کے باوجود قافیہ و ردیف کی پابندی نے زبان کو نکھارنے اور الفاظ میں معانی کی وسعت پیدا کرنے اور لوچ و لچک بخشنے کا غیر معمولی کام انجام دیا ہے۔ اس کے اس رُخ کو اجاگر کرنے اور زبان کے صحیح لطف اور چٹخارہ کو سامنے لانے میں بعد میں داغ نے ایک گرانقدر کارنامہ انجام دیا۔ لیکن غالب کے یہاں بھی قصیدوں میں زبان کا یہ حسن اپنے پورے شباب پر ہے۔ ان کے قصائد میں زیادہ تر صرف قوافی ہیں اور ردیف ندارد ہے۔ ان کے ایسے ہی قصیدوں میں قوافی کے برمحل استعمال ان کے قوافی کو ہشت پہلو معانی سے آشنا کرتا ہوا صاف نظر آتا ہے اور زبان کا لطف دیتا ہے۔ اس سلسلے میں بالخصوص ان کا قصیدہ "صبحدم دروازۂ خاور کھلا" ان کی ذہانت کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور میرے اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ مثالیں دے کر میں اس مضمون کو بیجا طول نہیں دینا چاہتا۔

غالب کے ایسے اشعار سے جن میں انہوں نے جنت یا شرابِ طہور کا مذاق اڑایا ہے اور دوسرے اشعار سے کچھ لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کا مذہب تشکیک تھا۔ یہ ان کے ساتھ کھلی ناانصافی ہے۔ غالب عقل پرستی کے پہلے پیامبر شاعر ہیں اور اس لحاظ سے ان کو تشکیک کا پیرو بنانا ان کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہے اور ناقد کی کم عقلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دراصل ہر بڑے شاعر اور ادیب کی طرح غالب میں بھی ایک احساسِ تحیر تھا (SENSE OF WANDER) احساسِ تحیر احساسِ تشکیک سے بالکل الگ ایک چیز ہے۔ اگر غالب تشکیک پسند ہوتے تو وہ اتنے بڑے انسانِ ظریف نہ ہوتے۔ ان کی ظرافت پر صدہا مقالے اور تصنیفیں ملتی ہیں اور ان کے خطوط ظرافت نگاری کا اعلیٰ ترین معیار پیش کرتے ہیں۔ ان کے وہ لطیفے جو نقل کئے جاتے ہیں اور ان سے منسوب ہیں ان کی اعلیٰ ترین ظرافت کے آئینہ دار ہیں اور ان کی تازگی سدا بہار ہے۔ یہ ظرافت تشکیک سے نہیں یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ ناقدین ایک ہی سانس میں انہیں ظریف بھی کہتے ہیں اور ان کی عقل پرستی کے بھی قائل ہیں اور پھر اسی سانس میں ان کو تشکیک پسند بھی بتاتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نقد نگار زیادہ تر نقل کرتے ہیں اور ان میں کوئی ایسی قوتِ اختراع یا تنقیدی ذہانت نہیں ہے کہ جس سے وہ کسی ادیب یا شاعر پر ایک صحیح رائے پیش کر سکیں۔ تشکیک پسندی سے بڑا بہتان غالب پر کوئی نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے برخلاف وہ مذہبِ تشکیک کے پہلے باغی ہیں جنہوں نے عزم و یقین کے ساتھ نئے راستوں کی طرف کاروانِ شاعری کی رہنمائی کی ہے۔

ان کے احساسِ تحیر کو احساسِ تشکیک ماننے کی وجہ یہ ہوئی کہ غالب روایتی اخلاق و مسلمات کے باغی ہیں اور نئی زندگی اور نئے نظامِ اخلاق کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ وہ ایسے عقائد کا جن کی توجیہہ حواسِ خمسہ کی رو سے نہ ہو سکے مذاق اڑاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ جب وہ عظیم فنکارانہ احساسِ تحیر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور روایتی انداز میں سوال کرتے ہیں کہ — "پھر یہ ہنگامہ

اے خدا کیا ہے؟" تو لوگ انہیں غلطی سے نشاطیہ یا سہل پسند سمجھ لیتے ہیں اور اس طرح ناقدین کو ایک بہت بڑا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ احساسِ تحیر عظیم فن کاری کا لازمہ ہے۔ غالب ایک عظیم فن کار ہو کر اس احساسِ تحیر سے ناآشنا کیسے رہ سکتے تھے۔ یہ احساسِ تحیر نہ ہوتا تو غالب کبھی ان مضمونوں میں کامران نہ ہو سکتے اور نہ ان کی وہ اہمیت ہی ہوتی جو آج انہیں حاصل ہے۔

اس کے علاوہ غالب کی ایک اہمیت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غالب نے غزل کو ایک نیا DICTION دیا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح فی زمانہ فیض نے غزل کو ایک نیا DICTION دیا ہے۔ لیکن فیض کے DICTION میں غرابت ہے۔ غالب کے DICTION میں غرابت محسوس نہیں ہوتی۔ فیض کا DICTION بے انتہا رومانیت لئے ہوئے ہے اور غالب کا DICTION زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ فیض نے فکر کو دانستہ غزل میں داخل کیا ہے اور اس لئے اس میں سیاسی رنگ محسوس ہوتا ہے۔ غالب نے زندگی کے تجربوں کو کچھ اس طرح بچایا ہے کہ غزل کا فکری عنصر غزل کے مزاج سے یوں ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اس میں کوئی عجیب یا اوپرا پن محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے مشہور شعر ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

کے متعلق ایک زمانے میں یہ بحث شروع ہو گئی تھی کہ یہ ظفر (بہادر شاہ) کے لئے کہا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف تھا اور انہوں نے تاریخ و سنین کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ یہ بہادر شاہ ظفر سے تخت چھن جانے یا ان کے مر جانے کے بعد کا شعر نہیں بلکہ یہ اس سے پہلے کا شعر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ یہ کس زمانے میں کہا گیا ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ یہ کن حالات میں کہا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی بھی فی الاصل کوئی بادشاہت کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ ان کی بادشاہت کا زمانہ بھی گویا مغل زمانے کا ایک تتمہ سمجھئے بلکہ وہ بادشاہت نہ تھی، بادشاہت کا ایک مذاق تھا۔ سیاسی حیثیت سے وہ انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے اور بادشاہت کے جملہ اختیارات سے کنارہ کش۔ ان حالات میں یہ شعر کہا گیا ہے اور یقیناً یہ سیاستِ وقت کا مظہر ہے لیکن غزل کے مزاج سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ بادی النظر میں یہ سیاسی شعر نہیں کہا جا سکتا۔ یہی غالب کا کمال ہے۔ غزل کے شاعروں نے یہ کمال اس سے پہلے بھی ظاہر کیا ہے مثلاً آتش کا مشہور شعر:

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

تیغ پر آب چڑھتی ہے۔ غزل کی یہی خصوصیت کہ وہ مخصوص تجربات اور جذبات کو اس رنگ میں رنگ دیتی ہے کہ وہ عمومی جذبات اور عمومی تجربات پر حاوی ہو کر وقت کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں، اس کو زندہ رکھنے کی ضامن ہے۔ یہاں تک یاد رہے کہ غالب کسی خاص DICTION پر چل رہا تھا۔ لیجئے ان کے کچھ اشعار سنئے جن میں انہوں نے غزل کی مروجہ زبان سے ہٹ کر اشعار کہے ہیں اور اس طرح غزل میں زبان کے نئے تجربے کئے ہیں جن سے ان تجربوں کی بنیاد پڑی جن پر آج کے استاد نازاں ہیں ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد   ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر — ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی
پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم — اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے
پُر ہوں یوں درد سے جوں راگ سے کوئی باجہ — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

غزل کی بندھی ٹکی زبان اور محاورہ کی اُلٹ پھیر سے باہر آنے میں غالب نے نمایاں کام کیا اور اس طرح غزل کی فضا کو وسیع و عریض بنایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ احساس دلا کر کہ ناز و غمزہ کو دشنہ و خنجر کہے بغیر اور مشاہدۂ حق کو بادہ و ساغر کی تلمیحات کے اسیر کئے بغیر اس دنیا میں کام نہیں چلتا۔ انہوں نے غزل کی تلمیحات و تشبیہات کو ایک نئی وسعت دی۔ شمع و پروانہ، گل و بلبل، غمزہ و ادا، وصل و فراق، جنون وغیرہ۔ ان ساری تلمیحات کو ایک نئے معنی پہنائے اور اس طرح زبان کے خزانے میں الفاظ کا اضافہ کئے، معانی کے دریا بہا دئے۔ اس کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

اور اس طرح انہوں نے غزل کی زبان کو سکونی STATIC سے حرکی (DYNAMIC) بنا دیا۔ یہی وہ بات ہے جسے میں DICTION کا نیا پن کہتا ہوں۔ وہ الفاظ کے ایک بے بدل صناع تھے اور انہوں نے زبان کو اس کمال اور مہارت سے استعمال کیا ہے کہ اس کی دوسری مثال ڈھونڈھے نہیں ملتی۔ الفاظ و معانی پر ایسی قدرت ہونے ہی کی وجہ ہے کہ ان کی متعدد تشریحیں ملتی ہیں اور ہر شرح نگار ان کے اشعار سے علیحدہ نتائج اور معانی کا استنباط کرتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نگار خانے میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ مختصر مضمون اس طوالت کا حامل نہیں ہو سکتا کہ ان کی قدرت زبان پر مکمل روشنی ڈال سکے۔

غالب پر ایک اعتراض اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اتنے خوددار اور بڑے انسان نہیں تھے جس قدر ان کو بتایا گیا ہے۔ بلکہ وہ وظیفے کی بھیک مانگنے کلکتہ تک پہنچے اور ان کے دیوان میں بھی کچھ ایسے شعر ملتے ہیں جن سے ان کی خودداری کی نفی ہوتی ہے مثلاً "یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں" وغیرہ وغیرہ۔ تو اس کے متعلق میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے لوگوں نے غالب کو سمجھا ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں میر کی سی خود پسندی اور بے لچک خودداری نہیں تھی لیکن یہ کہنا کہ وہ خودداری کے جوہر سے محروم تھے ناقدین کی ناسمجھی پر دلالت کرتا ہے۔ غالب کے حالات و واقعات اور سرشتِ مزاج سے جن کو دلچسپی ہے اور جنہوں نے ان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ باوجود دلی خواہش اور ضرورت کے دلی کالج کے دروازے سے ایک معقول نوکری کو محض اس لئے ٹھکرا کر چلے آنے والے کہ ان کے استقبال کو کالج کا سب سے بڑا عہدہ دار کیوں نہیں آیا، غالب ہی ہو سکتے تھے۔ رہا یہ کہ پنشن کے لئے انہوں نے کیا کیا جتن کئے اور قصائد لکھے، محض ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا ناانصافی ہے۔ ان غالب زندگی سے سمجھوتے کے قائل تھے۔ وہ بہادر شاہ کے وظیفہ خوار تھے اس لئے قصائد لکھتے تھے۔ لیکن اس سے آگے وہ اپنے مرتبے کے خلاف کوئی بات بادشاہ سے بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ یہی زندگی سے سمجھوتہ ہے۔ یہی صورت ان کی انگریزوں کے ساتھ رہی اور یہی بات دیگر امرا و عمائد کے ساتھ تھی۔ اسی لئے انہوں نے کہا ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
خلد کا دروازہ پائیں گر کھلا

بندگی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ خودبینی کہ درِ کعبہ اگر وا نہ ملے تو اُلٹے پھر آئیں اور اس دنایت کا شکار نہ ہوں کہ اسے وا کرنے کے لئے درخواست کرنا پڑے، یہی غالب کے مزاج کی کلید ہے اور یہ پھر ایک مرتبہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ غالب عملے کے مزاج داں سمجھے، ان کا مزاج جاگیردارانہ تھا اور عقل سرمایہ داری کی فتحیابی میں یقین رکھتی تھی اور ایک سرمایہ دارانہ عہد کی آمد کا استقبال کرنے کو تیار تھی۔ اسی لئے عقل میں سپردگی اور مزاج میں انانیت تھی۔ اسی باعث ایک طرف وہ بے انتہا رکھ رکھاؤ اور جاگیردارانہ فرقِ مراتب پر مرے مٹتے تھے تو دوسری طرف عملاً پنشن کی جستجو اور وظائف کے خواستگار رہتے تھے۔ گویا زندگی کو برتنے کے لئے جس مادی نقطۂ نظر اور حقیقت پسندانہ آگہی کی ضرورت تھی غالب کے عمل اور اشعار میں اس کے پہلے نشانات ملتے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس تھا کہ خودداری و خودبینی کا یہ خول کسی نہ کسی دن اتار پھینکنا ہی پڑے گا ؂

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

اسی سے میں کہتا ہوں کہ ہمارے شعری ورثہ میں غالب معروضی حقیقت کے پہلے پارکھ ہیں۔ غالب کی انا میں مادی حقائق کے لئے لچک ہے۔ میر کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ ان کی انا سخت لکڑی تھی جو ٹوٹ سکتی تھی مڑ نہیں سکتی تھی۔ غالب کی انا ایک زندہ شاخ ہے جو بقدرِ ضرورت لچک بھی سکتی ہے اور مڑ بھی جا سکتی ہے۔ لیکن انشؔا کی بھنڈیتی سے غالب کے عقائد ایک بالکل الگ چیز ہیں اور وہ اس لئے کہ انشؔا اپنا توازن کھو چکے تھے۔ غالب ایک لمحہ کے لئے اپنا توازن نہیں کھوتے اور اسی لئے وہ زندگی میں صرف اسی قدر سمجھوتے کے قائل ہیں جس میں انسان اپنی ذات کا توازن قائم رکھ سکے اور حسنِ زیست میں اضافہ کر سکے یا بہ الفاظِ دیگر جتنا سمجھوتہ انسانیت کی نشوونما کے لئے ضروری ہو اس سے آگے جانا شکست کھانا ہے۔ غالب اس شکست کی ذلت کو بھگتنے کے لئے کبھی تیار نہ تھے۔

واجد علی شاہ اور اُن کی بیگمات کے خطوط

تمکین کاظمی

واجد علی شاہ ان بدنصیبوں میں سے تھے جو صاحب ذوق و وجدان اور صاحب جدت و طرز ہونے کے باوجود گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان پر الزام یہ لگائے جاتے ہیں کہ وہ اپنی سلطنت سنبھال نہ سکے اور انہوں نے خاموشی کے ساتھ سلطنت اودھ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ عشرت پسند، عیش کوش اور راگ و رنگ کے رسیا تھے، لہو و لعب میں زندگی گزار دی، انگریزوں سے مقابلہ نہ کر سکے بلکہ انگریزی قیدی بنے ہوئے رہے۔

بظاہر یہ الزام بہت سنگین ہیں مگر غور کیجئے تو نہایت طفلانہ اور حد درجہ مضحکہ خیز، کیونکہ سلطنت تھی ہی کونسی جس کو وہ سنبھال نہ سکے خود سلطنت دہلی کا حال یہ تھا کہ

سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم

کہاوت مشہور تھی۔ جب سلطنت دہلی کا یہ حال ہو تو غور کیجئے لکھنؤ کا کیا حال ہوگا۔ بیچارہ شاہ شطرنج تھا کر کیا سکتا تھا، اپنی چہار دیواری میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ اتنا ہے کہ دوسرے لوگ کئی پشت میں بھی نہ کر سکے تھے، نہ صرف لکھنؤ میں بلکہ کلکتہ کی نظربندی میں بھی بڑی بڑی جدتیں واجد علی شاہ نے کیں اور فنون لطیفہ کی خدمت آخر تک کرتے رہے، لکھنؤ تو خیر کلکتہ کو بھی انہوں نے رشک لکھنؤ بنا دیا اور مٹیا برج میں اودھ کی ٹکسال بنا کر اپنا گز و سکہ جاری کر دیا جو آج تک چالو ہے۔

جیسا کہ عام طور پر شاہان مشرق کا طریقہ رہا ہے واجد علی شاہ نے بھی سینکڑوں خواصیں اور محل رکھے تھے جن کی تعلیم و تربیت باقاعدہ اور باضابطہ ہوتی تھی، اپنی آپ بیتی "پری خانہ" میں (جس کا اردو ترجمہ مرزا فدا علی خنجر نے محل خانۂ شاہی کے نام سے شائع کیا ہے) واجد علی شاہ لکھتے ہیں:

> "اسی زمانہ میں مرزا احسن نامی مولوی کو جو غلام رضا خاں کی معرفت ملازم ہوا تھا، بیگموں اور پریوں کے سبق دینے کے واسطے مقرر فرمایا اور ایک قطعہ مکان علیحدہ مکتب خانہ کے واسطے تجویز فرمایا، چنانچہ ہر ایک نے اپنی لیاقت کے موافق علوم شرعیہ کی تحصیل کی اور میرے تخت آبائی پر جلوس فرمانے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔" (ص۱۰۲)

واجد علی شاہ نے اپنی خواصوں، بیگموں اور محلوں کو نہ صرف موسیقی و رقص میں طاق کر دیا تھا بلکہ وہ ادب و شعر میں بھی شہرہ آفاق تھیں چنانچہ تقریباً

دور جن بیگمات بہترین شعر کہتی تھیں جن میں سے کئی ایک کے دیوان، مثنویاں اور مجموعے چھپ چکے ہیں اور تیس چالیس بیگمات نہایت ہی اچھی نثر نگار تھیں جن کے رقعات بڑی خصوصیت رکھتے ہیں، ان رقعات کی تعریف عبدالحلیم شرؔر نے مثنوی "حزنِ اختر" کے مقدمہ میں یوں کی ہے :

> "واجد علی شاہ کے کورٹ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بادشاہ اور ان کے محلات کے درمیان میں جو خط و کتابت ہوتی وہ "نوِدّ و نامہ" کے لفظ سے یاد کئے جاتے اور رنگین و پُرافشاں کاغذ پر ہوا کرتے۔ محلات کی طرف سے جتنے نوِدّ و نامے جاتے کاغذ کی طرح نہایت ہی رنگین اور مقفیٰ عبارت میں ہوتے اور ان میں زبان کی پاکیزگی کے ساتھ نہایت ہی شستہ و رفتہ بامحاورہ زبان کا لحاظ رکھا جاتا اور عاشقانہ رنگین بیانی ہوتی۔ افسوس ہے وہ ذخیرہ فنا ہو گیا ورنہ میرے خیال میں اس سے اچھا ادبی ذخیرہ اُردو زبان کو پھر نصیب نہ ہو سکے گا۔ اتفاق سے ایسے نوِدّ و نامجات کثرت سے میری نظر سے گذرے ہیں اور میں انہیں نہایت ہی شوق سے پڑھتا رہا ہوں اور اصل حقیقت یہ ہے کہ مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا یہ انہی نوِدّ و ناموں کے پڑھنے کی برکت ہے۔" ص ۱۶۶۵،

دس سال پہلے مجھے ایک مختصر رسالہ ملا تھا جس میں واجد علی شاہ کی ایک بیگم بدرِ عالم بدؔر کے چند رقعات تھے جن کا اقتباس میں نے ادبی دنیا لاہور بابت جنوری ۱۹۳۵ء میں چھپوایا تھا مگر اب تراب علی خاں صاحب بازؔ نے اپنے نایاب ذخیرے میں سے دو بڑے اہم مجموعے مجھے دیئے ہیں۔ ایک کتاب ہے "مخزنِ اسرارِ سلطانی" "رقعاتِ بیگمات" جو رائل سائز کے ایک سو بیس صفحات کی ہے جس کا نام تاریخی ہے یعنی تاریخِ ترتیب ۱۳۱۹ھ نکلتا ہے جس کے مرتب امتیاز علی خاں نجیب ساکن فرخ آباد نے ۱۱ر اپریل ۱۹۰۲ء کو چھپوایا ہے اس میں واجد علی شاہ کی تیرہ بیگمات کے ۷۲ بہتر رقعات ہیں اور چند رقعات واجد علی شاہ کے انہی بیگمات کے نام ہیں۔

یہ رقعے ۱۲۷۳ھ سے ۱۲۷۴ھ تک کے ہیں اور زیادہ تر ۱۲۷۳ھ ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بالکل محلاتی زبان ہے، روزمرہ نہایت فصیح، محاورے ٹھیٹ ٹکسالی اور اسلوبِ بیان حد درجہ سادہ اور دلفریب ہے چونکہ فراق زدہ بیگمات کے لکھے ہوئے رقعے ہیں اس لئے نہایت دردانگیز ہیں۔ بیشتر بیگمات نے منظوم رقعے بھی لکھے ہیں یا جابجا اپنے شعر نقل کئے ہیں۔

دوسرا مجموعہ واجد علی شاہ کے رقعات کا ہے جو "خطوطِ آخری شاہِ اودھ" کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپا ہے۔ یہ واجد علی شاہ کے منظوم بیس ۲۰ مکتوبات کا مجموعہ ہے جو رائل سائز کے پینتالیس صفحات پر مجلہ "لسان العصر" کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوا ہے جسے خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ نے ۱۹۱۱ء میں مرتب کیا ہے۔ یہ واجد علی شاہ کے کلکتہ سے لکھے ہوئے رقعات بھی اتفاق سے تیرہ بیگمات کے نام ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے تیرہ خطوط مختلف بیگمات کے واجد علی شاہ کے نام اور تیرہ ہی خطوط واجد علی شاہ کے مختلف بیگمات کے نام ہیں۔ ان دونوں مجموعوں سے واجد علی شاہ کی ۲۶ چھبیس بیگمات کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

لیجئے اب بیگماتِ اودھ کے خطوط پڑھئے۔ ۲۶ر جمادی الآخر ۱۲۷۳ھ کو شیدا بیگم نے واجد علی شاہ کو لکھا ہے :

> "حامیٔ رعایا، ناصرِ برایا، تم پر خدا کا سایا!
>
> اشتیاق نامہ تمہارا سترھویں کا لکھا ہوا عین انتظار میں آیا، ہم نے دیکھتے ہی آنکھوں سے لگایا، عسیر کو پڑھ کر سُنایا،

ہر فقرہ رنگین بھایا، غنچہ طبیعت کو کھلایا، تمہاری جدائی نے وہ صدمہ دکھایا کہ منہ کو کلیجہ آیا: ہم کو تم نے ایسا رُلایا کہ خون آنکھوں سے برسایا۔ پیرِ فلک نے عجب نیرنگ دکھایا، تم کو ہم سے عین جوانی میں چھڑایا۔"

مرا حال یہ ہے بقولِ عسیر

ترے دامِ کاکل میں دل ہے اسیر
کسی وقت آرام آتا نہیں
تصوّر ترا دل سے جاتا نہیں

"اب جلد خدا یہ امید بر لائے، تمہاری صورت رشکِ خورشید دکھائے، یعنی تم کو ہم سے ملائے، سب تردد جائے، دل کو تسکین آئے اور اس زمانۂ ناکام میں کم آرام ہے بسبب اختلاف آب و ہوا برخوردار رقیہ بانو بیگم کو زکام ہے:

خدا تم کو صحت سے رکھے سدا
کرے ملک جلدی تمہارا عطا"

یہ شیدا بیگم واجد علی شاہ کی بڑی چہیتی محل تھیں۔ واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی حزنِ اختر میں شیدا بیگم اور ان کی بیٹی نگینہ آرا معروف بہ رقیہ بانو بیگم کا ذکر یوں کیا ہے:

نگیں آرا چوتھی جو شہزادی تھی — حقیقت میں گھر بھر کی آبادی تھی
رقیہ ملائیں جو بانو سے ہم — لکھیں نام اس مہ کا لے ذی کرم
جو نواب پہلے تو بیگم ہے بعد — کھلا اس طرح مہر کا نام سعد
یہ شیدا کی خالق نے امداد کی — یہ تھی والدہ اس پری زاد کی
خدا نے یہ کی شیدا بیگم پہ مہر — عنایت جو کی اس کو یہ حور چہر
برس تین کی یہ بھی تھی نیک ذات — ابھی منہ سے کرتی نہ تھی ایک بات
سنا یہ عدم کو گئی رشکِ ماہ — خبر یہ ملی ہے مجھے آہ! آہ!

۱؍ شوال ۱۲۷۳ھ کے رقعہ میں شیدا بیگم نے نگین آرا کی علالت اور کھیر چٹائی کی رسم کا ذکر کیا ہے۔

۱۰؍ شوال ۱۲۷۳ھ کے رقعہ میں شیدا بیگم نے بڑے مزے مزے کی باتیں لکھی ہیں، آپ بھی لطف اٹھائیے:

"اخترِ آسمان دلربائی! گوہرِ دریائے آشنائی! بلبلِ شاخسارِ یکجہتی! خسرو خو، شیریں گفتگو! سلیمان حشم! بلقیس شیم! یوسف جمال، زلیخا خصال! ماہ صورت، چکور سیرت! لیلیٰ کی سج، مجنوں کی دھج! دمن کے دل کا گھاؤ، نل کی صورت کا بناؤ! عذرا کا ناز، وامق کا انداز! شاہد کی راحت، عزیز کی عزت! شمع کا رنگ، پروانہ کا ڈھنگ! شہر کی آرائش، پہلو کی زیبائش! بند کھولنے والے، لپٹ کے سونے والے! زخمِ فراق کے مرہم، مرزا جانِ عالم! بلکہ جانِ جہاں سے بہتر سلطانِ عالم اختر! .... الخ"

۱۴؍ رمضان ۱۲۷۳ھ کے رقعہ میں شیدا بیگم نے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں کسی نے ان پر تہمت اٹھائی تھی جس کے جواب میں خوب خوب صلواتیں سنائی ہیں، رقعہ لمبا ہے مگر ہے مزیدار، آپ بھی سنئے:

"تم نے جو دشمن کے کہنے پر تحریر کیا تھا کہ ۲۳؍ شعبان کو نثار علی حسینیا ہاتھی پر چڑھ کے چینی بازار میں تمہارے

محل کے کوٹھے کے سامنے چار گھڑی تک کھڑا رہا اور تمہارے یہاں کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور عورتیں بیٹھی تھیں۔ نہ تو کھڑکیاں بند ہوئیں نہ عورتیں ہٹیں، اس کے کیا معنی؟" ——— جانی! اس کے ہیں دو معنی ایک تو لغوی دوسرے اصطلاحی، پہلے تو لغوی سے ہو آگاہ پھر اصطلاحی سمجھنا خاطر خواہ۔ لغوی تو یہ ہے نہ اس میں کچھ شبہ ہے اور نہ خلاف، ہر چند اس حالِ صدق مآل کا حرف بحرف ہے صاف صاف کہ تین کھڑکیاں دروازہ نما ہمارے محل کے کوٹھے پر جانب چینی بازار کرٹھے پڑی ہوئی آدھی آدھی چنی ہوئی ابتدا سے ہیں، فی الحقیقت بھلا بغیر بیلچہ وغیرہ کے ان کے کھلنے کی کونسی صورت؟ جس طرح چاہو اس کی پہنچا لو سند کہ قول حاسدوں کا ہو جائے زور۔ لغوی تو ہو چکے مرقوم اب اصطلاحی کرو معلوم کہ جب سے تم ادھر سدھارے ہو ہم نے چینی بازار کی طرف اپنے کوٹھے پر دو کمرے بنوائے ہیں اور جھاڑ شیشہ آلات سے سجوائے ہیں، پردے کمامی کے بندھوائے ہیں، چاندی سونے کے پلنگ بچھوائے ہیں اور عورتوں کا کیا ذکر ہے خود ہمارا یہ حال ہے کہ ہم تو ایک تتہ بھی نہیں تمہارا خیال ہے۔ جب دو تین گھڑی دن رہتا ہے تو ہم ہر روز وہاں بیٹھنے کو جاتے ہیں، دیدہ و دانستہ ہر مردم سے آنکھیں لڑاتے ہیں اور وقتِ شب جس کو چاہتے ہیں اس کو بلاتے ہیں، تمام رات خوب مزے اٹھاتے ہیں۔ ہمارا کام بیٹھنا سرِ راہ ہے، یہاں سے کلکتہ تک ہر شخص اس پر گواہ ہے۔ جو طرز و لنا ہمارا ہے تم پر بھی سب آشکارا ہے۔ ہم کو ہرگز کچھ نہیں ہے باک، جھوٹوں حاسدوں کے منہ میں ہے خاک، اور ہاں اس وقت مجھ کو خوب یاد آیا، ایک نیا مضمون ذہن میں سمایا۔ میں تم سے پوچھتی ہوں خلاصہ اس کا بتانا، جلد تر لکھ کر بھجوانا۔ تم نے جو لکھا تھا اسندیا تمہارے محل کے سامنے کھڑا تھا، اس بات کو تصور کرو اور بغور دیکھو کہ لہسن پیاز کا یہاں کیا کام ہے، اس کا تو باورچی خانہ مقام ہے۔ اگر کوئی باورچی ہوگا جہاں مسالہ بھی ہر ایک ہوگا وہاں ہوگا۔ یہاں کا حال تو تم کو بخوبی معلوم ہے اور ظاہر و باطن سب مفہوم ہے کہ باورچی ہے نہ درزی نہ حجام ہے، ان میں سے ایک کا بھی یہاں نہیں کام ہے، ہم فقط آپ ہیں یا آپ ہی کے کارکن ہمارے باپ ہیں اور عورتیں بھی ہمارے یہاں جتنی ہیں ان میں سب ضعیف اور ادھیڑ ہیں کوئی جوان نہیں۔ ان پر فعلِ بد کا کسی کو گمان نہیں۔ ہاں مگر ایک مغلانی ہے سو وہ بھی مستانی نہیں دیوانی ہے۔ کوئی نمک حرام عیار اپنے اڑھائی چاول پکایا کرے ہزار لیکن یہاں دال گلنے کی نہیں زینہار، بلکہ بعض پختہ کاروں نے ابتدا میں کچھ بھیجے ہم کو اکثر دم دیا، خدا شاہد ہے ہم نے بجز تمہارے کسی کو قبول نہ کیا۔ فقط!"

ایک خط میں شیدا بیگم نے غدر کی پریشانیاں بھی تفصیل سے لکھی ہیں مگر اس پر تاریخ اور سنہ نہیں ہے۔ یہ خط شیدا بیگم کے سنہ ۱۲۷۳ھ کے دو خطوط کے بعد ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط محرم یا صفر سنہ ۱۲۷۴ھ کا لکھا ہوا ہے، یہ بیگمات اودھ کی نثر کا مکمل نمونہ ہے۔ اس کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے جب آپ سنہ ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۴ء) میں انہیں پڑھتے ہیں۔ پورے ایک سو سال پیشتر کی نثر کا مقابلہ آج کل کی نثر سے کرتے ہیں:

"انیس و ہمدم، جانِ عالم! بقاکم اللہ تعالیٰ! بعد اشتیاقِ وصال نواب شیدا بیگم کا ظاہر ہو تم پر حال، مدت سے

کو خیریت اثر نہیں پاتی، پریشانی بے شمار ہے اور روز روشن ہماری نظروں میں شب تار ہے۔ حافظ حقیقی صحت و عافیت سے تم کو اپنی حفظ میں مدام رکھے اور یہ جدائی درمیان سے جدا علی الدوام رکھے۔ حال میرا یہ ہے جس سے واقف ہر کوئی ہے کہ تمام زیور اسباب نقد و جنس جس قدر ہمارے پاس تھا وہ سب حضرت باغ میں چھٹ گیا اور جو بچا وہ سب مسافرت میں لٹ گیا۔ اب صورت یہ حال پہنچا ہے کہ جب کسی سے نہیں کچھ قرضہ بہم پہنچتا ہے تو نوبت فاقہ کشی کی آتی ہے۔ دیکھیے قسمت کیا دکھاتی ہے۔ جن لوگوں سے چار مہینے قرض لے کر کھانے اور پینے میں بسر کیا، اب جو ان سے اور طلب کیا ایک حبہ نہ دیا۔ خدا کے واسطے جس صورت سے بنے ہم کو اپنے پاس بلاؤ اور اگر نہیں تو جس طرح ہوگا میں خود چلی آؤں گی۔ یہ صدمہ کہاں تک اٹھاؤں گی اور اے جان عالم! حال میرے والدین کا بھی سب تم پر ہویدا ہے، ان کو بھی کہیں سے ایک حبہ تک بھی نہیں پہنچا ہے۔ نہ وہ وثیقہ رکھتے ہیں نہ نوشت، یہ دل پر ہے اور چوٹ۔ جب میں ان کو کچھ دیتی ہوں تب بسر ہوتی ہے ورنہ فاقوں میں ان کی گزر ہوتی ہے اور موسم گرما کا کچھ ہیضے کا ہوا کہ جب شہر کے لوگ بھاگ گئے میں بھی اپنے والدین اور ہمشیروں کے ساتھ پیدل ننگے سر گئی اور گرمی میں جا کر رہی۔ وہاں نگین آرا بیگم کو بخار آیا، تین روز وہاں پر مقام ٹھہرایا، چلتے رہی وہاں سے سب بھاگتے ہیں بھی برہی آ گئے۔ آخر رفتہ رفتہ تقدیر ہم کو مصیبت کی جگہ لے گئی اور یہ صدمہ غم ہم کو دے گئی کہ وہاں نہ دوا میسر ہوئی نہ طبیب، سو گئے ہمارے نصیب۔ کچھ نہ اس کو افاقہ ہوا، گرمی سے ترافہ ہوا۔ جو جس نے بتایا وہ اس کو پلایا۔ سترھویں رمضان کو اس نے انتقال کیا، ہمارا غیر حال کیا۔ اب تک جب صورت یاد آتی ہے کلیجے پھاتی ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے اپنے تئیں ہلاک کروں، گریبان اور کسوت حیات چاک کروں۔ ناچار ہوں، اگر اس طرح کی موت نہ ہوتی حرام، تو میں کرتی اپنا کام تمام۔ اب تم کو بھی دیتی ہوں سوگند خدا و رسولؐ کی کہ تم اس کو صبر کرنا، نہ ہونا ملول، کس واسطے کہ تم بھی بڑے بڑے صدموں میں مبتلا ہو، مورد آفات و بلا ہو۔ اور دوسرا یہ صدمہ جانگداز ہوا کہ سلطان بیگم نے بھی کی قضا۔ اگر وہ بھی ہوتی تو میں اپنے پاس رکھتی اور دل بہلاتی، کچھ تو بے چینی جاتی۔ ہر چند دل پارہ پارہ ہے مگر مرضی خدا سے کیا چارہ ہے۔ اگر اب حال اپنا مفصل لکھوں تو ایک بار ہو اور تم کو اس کے پڑھنے سے ملال بے شمار ہو۔ اور سترھویں تاریخ کو ماہ محرم کی سید علی واحد کو ہم نے طلب کر کے حال تمہارا استفسار کیا، انہوں نے خیریت کا اظہار کیا۔ گونا دل کو چین ہوا، کچھ دیر موقوف شور و شین ہوا۔ اطلاعاً لکھا ہے، اب قسم تم کو ہمارے سر کی جواب اس کا جلد بھیجو، اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ فقط!"

اختر پیا کی بڑی چہیتی منظور نظر تھی۔ اس کا ایک خط بھی بہت طویل ہے کچھ حصہ نقل کرتا ہوں :

"جہاندار کشور خوبروئی، شہریار اقلیم نکوئی، سلطان ملک حسن و جمال، خسرو ماہ طلعتان شیریں مقال، ضیا افروز چہرۂ خورشید پری، زیب افزائے رخسار دلبری، شہنشاہ گیتی ستاں، خاقان ابن خاقان، مشتاقوں کے حال سے بے غم جان عالم سلامت رہو! اب ہمارا وہ حال ہے کہ قلم کو لکھنے میں انفعال ہے۔ دامن کاغذ سے منہ چھپاتا ہے، سر اٹھانے میں شرماتا ہے۔ تمہاری یاد نے ایسی صورت دکھائی ہے کہ قابل دیکھنے کے صورت بنائی ہے۔ ہر روز مانند رکن مزاحف جو مسلسل کا جو دھیان

اکثر ہے رکن بستر کی طرح صورتِ حال ابتر ہے۔ اصلاح کا مقام نہیں کیفیتِ اصلی ہی کلام نہیں۔ دردِ صدمۂ آغازِ فراق سے حاصل ہوتا ہے ابتدائے سخن دشوار ہے، تخیل کو اظہارِ مضامین عشق کی شکل حجاب ناگوار ہے۔ ہر چند تحریر میں قلم رکن عروض کی صورت قدم جاتا ہے مگر ضربِ مضامین سے کہ عجب طرح کی چوٹ ہے سینہ شق ہو جاتا ہے....

چند دم بیقراری سے فرصت پائی بے اختیار یہ غزل زبان پر آئی ؎

اے جانِ جان صورتِ تجاہل اعتبار کیا
تم آؤ یا نہ آؤ ہمیں اختیار کیا
نے اپنے گُل کے سیرِ گلستاں خراب ہے
کیفیتیں دکھائے گی فصلِ بہار کیا
برہم ہوئے ہیں گیسوئے پرخم کی یاد سے
اب پوچھتے ہو تم سببِ انتشار کیا
ممکن نہیں جو کوچۂ جاناں میں رہ سکے
میرے غبار سے ہے صبا کو غبار کیا
بگڑی ہوئی ہے ہجر سے کیفیتِ مزاج
تم ہم سے پوچھتے ہو مزاج بار بار کیا
لاکھوں حسیں ہیں صورتِ جاناں کے شیفتہ
ہم کس قطار میں ہیں ہمارا شمار کیا
کب ہے یقیں کہ زینتِ آغوش ہو حصول
اے حوران کے دل پہ ہمیں اختیار کیا"

۲ ر ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ کا ایک رقعہ ملاحظہ کیجئے :

"انیس و ہمدم جانِ عالم زاد محبتہ! بہت عرصہ ہوا کہ خیر خیریت تمہاری نہیں پائی، طبیعت بہت گھبرائی۔ حافظِ حقیقی تم کو صحت و عافیت سے رکھے۔ حال ہمارا گردشِ لیل و نہار سے بہت پریشان ہے، لبوں پر جان ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب سے سب محلات تمہارے بھاگ گئے تھے میں بھی شہزادی کو لے کے ان کے ساتھ روانہ ہوئی۔ اثنائے راہ میں ہر ایک کا ساتھ چھٹ گیا، تمام مال و اسباب لٹ گیا۔ جب سب ہی لوگ آباد ہونے لگے میں بھی آئی، گھر میں آتے ہی یہ مصیبت اٹھائی کہ شہزادی دہیم آرا بیگم بیمار ہوئی، ہماری حالت زار ہوئی۔ آخر کو ماہِ رمضان میں اس راحتِ جان نے قضا کی میں واسطے رونے کے رہ گئی۔ اے جانِ عالم! خدا کی قسم سب سے میری حالت زیادہ تباہ ہے، بہت دشوار کرنا نباہ ہے، اس وقت میں کوئی پرسانِ حال نہیں، کسی کو ہمارا خیال نہیں۔ ہم کو تباہ اور پریشان دیکھ کر عزیز و اقارب اور ملازموں نے ساتھ چھوڑا ہے، سب نے ہم سے منہ موڑا ہے . . . . . "

فاطمہ بیگم بھی اختر پیا کی ایک محل تھی اس کا ایک رقعہ بھی پڑھ لیجئے :

"غواصِ دریائے ہمہ دانی مصلحِ کلیم و ہمدانی! اخترِ اوجِ حشم، حضرت سلطانِ عالم! زید اللہ جودۂ طبعہ! تمہاری فرقت سے دل بیتاب ہے اور چشم پُرآب ہے۔ گردشِ آسمانِ کہن عجب نیرنگ دکھاتی ہے۔ پاؤں کے تلے سے زمین سرکی جاتی ہے۔ بے تمہارے سارے شہر میں پڑا سنسان ہے، ویران ہر ایک مکان ہے۔ تقدیر کام بناتی نہیں، کوئی تدبیر بن آتی نہیں۔ آج کل دریائے غم کا اٹھا طوفان ہے، بحرِ جہاں سے مثلِ حباب مٹنے کا سامان ہے۔ آتشِ فراق کے بھڑکنے سے شعلۂ آہ سوزاں بلند ہے، بحر ہجر بہانۂ سودائے دل پسند ہے۔ تمہاری صرصرِ جدائی سے گریبانِ زندگی

چاک ہے، سینے جینے پر خاک ہے۔ اب طاقت بارِ جدائی اٹھانے کی نہیں رہی ہے آٹھوں پہر دعا یہی ہے کہ خدا جلد تم کو یہاں لائے، چاند سی شکل ہم کو دکھائے ؎

پھر وہ چرچے ہوں پھر وہی باتیں   دن ہوں عشرت کے عیش کی راتیں"

(۲۲ رجب ۱۲۷۳ھ)

دلپذیر بیگم نامی کوئی ممتوعہ دلپذیر تھی جس کا کوئی حال نہیں مل سکا مگر ایک رقعہ ملا ہے اسے بھی دیکھ لیجئے:

"زمیں ہمدم مونسِ محرم حضرت جانِ عالم زید اللہ عشقہ! محبت نامہ مروت شمامہ تمہارے نے ۲۱ ماہ رجب کو منزلِ تسکین دلِ غمگین نزول کیا اور صورت روح جسمِ بے جان میں حلول کیا۔ ہماری طبیعت شاد ہوئی، دیدہ غم سے آزاد ہوئی۔ رنج دور ہوا، دل مسرور ہوا۔ مگر صدمۂ فرقت ہے اس قدر تمہارا تصور ہے آٹھ پہر کبھی تمہارے دُرِ دنداں کے تصور میں اشک بہاتی ہوں اور کبھی لبِ یاقوت گوں کے دھیان میں ریزہ ہائے خوں بارے لختِ جگر مثلِ عقیقِ احمر ٹپکاتی ہوں، کبھی تمہارے سبزہ رنگ زمرد رمانی کے خیال میں دست وحشت غیرتِ مرجان سے اپنے عارضِ گلفام کو مارے طمانچوں کے لال کرتی ہوں اور کبھی بشب خیالِ وصل کی تختی واسطے دفعِ خفقان کے سینہ پر دھرتی ہوں۔ تری کاکلِ مشکیں کی یاد میں نیلم کی طرح آنکھوں میں ایسی تیرگی چھاتی ہے کہ ہر ایک آنکھ پتھرا کے نگینۂ سلیمانی بن جاتی ہے۔ غرض ایسا رنجِ جدائی ہے کہ جان لبوں پر آئی ہے۔ اب خدا کامیاب جلد تم کو لائے اور عیش و عشرت کا دن دکھائے۔ فقط!

"بست و دوم شہرِ رجب محبوبۂ سلطانِ عالم دلپذیر بیگم"

مہدی بیگم بھی اختر پیا کی ایک چہیتی تھی اس کا بھی ایک رقعہ جو دلچسپ ہے مطالعہ کیجئے:

"قمریِ سروستانِ محبت، طوطیِ شکرستانِ مودت، آفتابِ آسمانِ کرم حضرت جانِ عالم زید اللہ حسن الجانہ! آنکھیں روتے روتے سفید ہوئیں، تمہارے فراق میں رخسارے گھل گئے۔ اشکباری سے فراق سے میں چین کسی وقت پاتی نہیں، بے قراری دم بھر جاتی نہیں۔ سامنا ہے مصیبت کا ہر گھڑی، اجل سر پہ رہتی ہے کھڑی۔ تمہاری فرقت میں بیمار ہوں، زندگی سے بیزار ہوں۔ کچھ بس نہیں تقدیر سے ناچار ہوں تدبیر سے۔ سینہ غم سے پارہ ہے، ہر لحظہ دھیان تمہارا ہے ؎

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا   ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا

عجب طرح کا انقلاب آیا کہ مرغِ دل کو سیخِ غم پر کباب پایا۔ ہمارے طائرِ ہوش کو تمہارے صیادِ محبت نے قید کیا اور شہبازِ عشق نے کبوترِ ہوش کو صید کیا۔ ماہیِ زبان آبِ چشم و دہن میں بیتاب ہے، گوہرِ عیش و عشرت نایاب ہے۔ خونِ جگر ہر دم پیتی ہوں، فقط تمہارے شربتِ وصل کی پیاسی ہوں۔ اب جلد جلد بامراد تمہیں یہاں لائے اور صبح و شام ہم سے ملائے۔ فقط! بست و ہفتم رجب ۱۲۷۳ھ دلربائے جانِ عالم نواب مہدی بیگم"

منو بیگم بھی کوئی محبوبہ تھی جس نے کئی رقعے اختر پیا کو لکھے ہیں آپ بھی پڑھ لیجئے۔

"چراغِ دودمانِ خیر و سعادت، شمعِ شبستانِ محبت و صداقت، آفتابِ آسمانِ کرم جانِ عالم زید اللہ جمالہ! محبت نامہ

مہر نامہ مرقومہ ہم ماہ رجب کا معرفت منشی صفدر جلوہ گر ہوا، روشن سارا گھر ہوا۔ خورشید مضمون نے گردون صفحۂ کاغذ سے طلوع کیا، دیدۂ غم دیدہ منور ہونے لگا جب دیکھنا شروع کیا، کیا عبارت تھی، ماشاء اللہ کیا فصاحت تھی۔ ہر فقرہ گوہر شاہوار تھا، تسکین بخش دل بے قرار تھا۔ تمہاری تحریر کیا خوب ہے، تقریر تمہاری دل کو مرغوب ہے۔ جدائی سے حال بہت غیر ہے، ناچار روز و شب ملکِ عدم کی سیر ہے۔ جب خط تمہارا آتا ہے، دل تھوڑی دیر آرام پاتا ہے۔ پھر بدستور رہتی ہے بے قراری، چشمۂ چشم رہتا ہے جاری۔ اب جامع المتفرقین وہ دن لائے کہ تم کو ہم سے جلد ملائے۔ فقط!

بست و ہشتم شہر رجب سنہ ۱۲۷۳ھ مبتلا بجان عالم سرور بیگم”

فرخندہ محل بھی اختر پیا کی ایک محل تھی مگر یہ اوروں سے ذری ہوشیار تھی۔ چار پانچ رقعے اس کے بھی ہیں جن میں سے ایک رقعہ میں غدر کی تفصیل ہے۔ یہ پہلی خاتون ہے جس نے کام کی بات جانِ عالم کو لکھی ہے ورنہ سب خرافات لفاظی کرتی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

…… اٹھائیس تاریخ اس مہینے کی روز یک شنبہ دوپہر سے فوج انگریزی تقسیم پر کارتوسوں کی بگڑ گئی، جنگ و جدل کی ٹھہر گئی۔ سب فوج موسیٰ باغ میں عیسائیوں کے قتل کو ایک جا ہوئی، اوّل ہیبتوں پر ہیبت غالب سوا ہوئی کہ کماندران فوج کو سمجھایا، ان لوگوں کے خیال میں نہ آیا۔ آخر ان گدھوں نے کئی سو گورے نکالے اور قریب شام اس سمت کو روانہ کیا لیکن کسی نے علاج کو روا نہ کیا۔ وقتِ تحریر تک وہی مجمع کثیر ہے، دیکھئے کیا ہوتی اس کی اخیر ہے — بے ڈھب ہوا یہ بگاڑ ہے، اب تو عیسائیوں کو موسیٰ باغ جانا پہاڑ ہے۔ اطلاعاً لکھا ہے آگاہ تم کو کیا ہے، اور اسے جانِ عالم معلوم نہیں یہاں کے اخبار ہر روز تم کو گذارتے ہیں یا اہلکار پوشیدہ کرتے ہیں، جیسا چاہو لکھو کہ ہم یہاں سے تحریر کیا کریں اخبار اور حال مفصل کیا کریں اظہار۔ فقط!

شہر سوم سنہ ۱۲۷۳ھ”

کنیز فاطمہ بھی جانِ عالم کی ایک محل تھی اس کا بھی ایک مزے دار رقعہ نظر آتا ہے:

”نازگی بخشِ گلہائے محبت، رونق افزائے بوستانِ مودت۔ دافع درد و الم حضرت جانِ عالم زید اللہ عشقہ! محبت نامہ تمہارا دلوں سے پیارا مانند فصلِ بہار کے آیا، خانۂ ویران ہمارا رشکِ گلزار فرخار بنایا۔ دور سارا غم و ملال کیا، ہم کو اس نے نہال کیا۔ باعثِ آرام دلِ آشفتہ ہوا، غنچۂ طبیعت شگفتہ ہوا۔ سبحان اللہ کیا خوب مضامین رنگین لکھے کہ گلہائے مضامین کی خوشبو سے معطر دماغ ہوا، سینہ خوشی سے باغ باغ ہوا۔ گھڑی دو گھڑی تو بے کلی دور ہوئی، پھر وہی حالت بدستور ہوئی۔ حال ہمارا یہ ہے کہ تمہارے غم سے دل مضطر ہے، جان آئی لب پر ہے۔ نرگسِ چشم حیراں ہے، سنبلِ زلف پریشان ہے۔ رنج و محن میں چمن چمن ہوں، صورت بلبل نعرہ زن ہوں۔ ہر چند قصۂ ہجر طولانی ہے، لیکن مختصر یہ کہانی ہے۔ اے یوسفِ دوراں! زلیخا وار تمہارے بیابانِ محبت میں ہوں سرگرداں،

سر مو نہیں اس میں کچھ فرق ہے
مرا دل تری چاہ میں غرق ہے

اب بحر سے آنسوؤں کا رواں، روانہ ہوا صبر کا کارواں۔ تمہاری فرقت میں یہ عالم ہے، دل مضطرب ہے، تڑپتا ہے

گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چوں مجنوں در ہوا است
سر بصحرا می زنم لیکن حیا زنجیرِ پا است

راقمہ مطلوبۂ جانِ عالم کنیز فاطمہ بیگم"

وزیر بیگم بھی جانِ عالم کی ایک محل تھی۔ اس کی نظم و نثر بھی ایک رقعہ میں ملتی ہے، خوب لکھتی تھی ملاحظہ فرمائیے:

"سرورِ خوبانِ جہاں، داورِ محبوبانِ دوراں! اخترِ آسمانِ کرم حضرتِ جانِ عالم زید اللہ نورِ حسنہ!

بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم　　تنگ آمدہ ام چند انتظار کشم

داستان تمہارے فراق کی طولانی ہے، دریائے اشک کی بار بار طغیانی ہے، عجب طرح کی پریشانی ہے۔ چھٹا کھانا پینا ہے غم کی ایسی اٹھی گھٹا کہ زورِ بدن کا سب گھٹا۔ زمانے کی کیسی ہوا بدلی کہ آفت کی چھائی بدلی۔ سر پر تیغِ الم دم بدم چمکتی ہے، بجلی بلا کی خرمنِ ہستی پر کڑکتی ہے۔ آتشِ شوق دل میں بھڑکتی ہے، جان تن میں پھڑکتی ہے۔ بغیر تمہارے نہیں کل، اشتیاق میں لکھتی ہوں یہ غزل ؎

مرے گل پیرہن سلطانِ عالم　　مرے غنچہ دہن سلطانِ عالم

....

۱۸ رجب وزیر بیگم"

اس غزل کے ۹ شعر ہیں جو مطلع ہی کے سے ہیں۔

امراؤ بیگم حضور السلطان بھی جانِ عالم کی ایک ممتوعہ تھی جو اپنے رقعے میں نظم و نثر دونوں سے کام لیتی تھی۔ پڑھیے:

"طوطیِ رنگیں بیان بلبلِ ہزار داستان! مرہمِ زخمِ دردِ الم جانِ عالم! ہمیشہ رہے محبت تمہاری۔ مدت مدید اور عرصہ بعید ہوا کہ تحریر تمہاری نہیں آئی، خیر خیریت کی نہیں پائی۔ ہم نے کئی خط تم کو بھجوائے جواب ایک کا بھی نہ ملا، غنچۂ دل نسیمِ عشرت سے نہ کھلا۔ بیس روز گذرے کہ ایک خط منشی سرور کے ذریعہ ہم نے بھجوایا اس کا بھی جواب اب تک نہیں آیا۔

معلوم نہیں یہ کیا سبب ہے　　تشویش زیادہ مجھ کو اب ہے

..............."

بنّا جان بھی جانِ عالم کی ایک چہیتی تھی اس کے دو رقعے بھی ملتے ہیں۔ وہی لفاظی ہے اور کچھ نہیں، کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیے:

"مہرِ سپہرِ دلبری، غیرتِ ماہ و مشتری، سرورِ دلہائے پُرغم سلطانِ عالم بلکہ جانِ عالم دام اللہ بقاءکم! انیقۂ انیقہ صحیفۂ شریفہ مرقوم بست و ششم ماہِ رمضان بھیجا ہوا تمہارا ہمارے دل و جان سے زیادہ پیارا ۱۸؍ شہرِ حال یعنی ماہِ شوال کو آیا اور آتشِ عشق کو بھڑکایا، حال تمہاری صحت کا سن کے ہمارے دل نے بڑا حظ اٹھایا۔ سینہ خوشی سے رشکِ گلشن ہوا، گھر سارا روشن ہوا۔ یہ حال سن کے گھڑی دو گھڑی تو خوشی کی رہی صورت، پھر زیادہ ہونے لگا غمِ فرقت۔ اب خنجرِ غم دل پر چلتا ہے، جان جاتی ہے دم نکلتا ہے اور خدا سے ہر وقت یہ دعا ہے کہ تا صد و سی سال تم کو سلامت

رکھے کیونکہ تمہاری صحت سے ہماری صحت ہے۔ جس طرح حکیمِ مطلق نے عارضۂ تپ تم سے کیا دور، ہمارا دل ہوا مسرور، اب جامع المتفرقین حجاب ہمارے تمہارے درمیان سے اٹھائے اور ہم کو تم سے ملائے کہ دفع ہو یہ رنج و الم، پھر ہم تم ہوں باہم۔ فقط!

مرقومہ یازدہم شوال ۱۲۷۳ھ "

امراؤ محل ایک بیگم امراؤ بیگم کے سوا تھی جو جانِ عالم کی چہیتی تھی اس کا ایک رقعہ بھی ملاحظہ کیجئے:

"جانِ جہان سلیمانِ زمان، سلطانِ انسان، عیسیٔ امراضِ الم جانِ عالم! ہمیشہ رکھے اللہ کمال تمہارا، گلستانِ عشق کا پھول، راحتِ دل ہائے ملول، اخترِ درخشندۂ برجِ محبت، گوہرِ تابندۂ درجِ مروت! ہم کو لاکھ جان سے مرغوب یعنی تمہارا مکتوب الفت اسلوب بستم شعبان کا لکھا ہوا یوسف علی خاں بہادر کی معرفت ہمارے خانۂ امید کا روشن کرنے والا ہوا، تمام گھر میں اُجالا ہوا۔ احوال شوقیہ ظاہر ہوا، دل ہمارا اس کے مضامینِ رنگیں سے ماہر ہوا......"

نوروزی بیگم بھی جانِ عالم کی ایک محل تھی اور بڑی ہی دیدہ دلیر تھی۔ ایک رقعہ کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے کتنی بے تکلفانہ عبارت ہے:

"...... عرصہ ہوا کہ دُرجِ وفا کا گوہر اور بُرجِ وفا کا اختر، باغِ محبت کا شجر، نخلِ مودت کا ثمر یعنی نامۂ نامی الفت ختام گرامی تمہارا، شوقِ وصال سے مملو سارا، راحتِ روح ہمارا، محبت کا کرنا اشارہ نہ آیا، ہمارے خانۂ دل کو کلبۂ احزان بنایا۔ — اور بھی کسی سے خبر تمہاری خیریت کی نہیں پائی، طبیعت نہایت ہی گھبرائی، بدلی غم کی ہے دل پر چھائی، جان لب پر آئی۔

دل بہت بے قرار ہے صاحب　　رات دن انتظار ہے صاحب"

یہ نمونے تھے جانِ عالم کی محلات کی نثر نویسی کے، جانِ عالم کی ستر محلات تھیں جن میں سے چند ان کے ساتھ کلکتہ گئیں بقیہ لکھنؤ ہی میں رہیں۔ ان سے جانِ عالم مسلسل مراسلت کرتے رہے۔ ایک خصوصیت ان محلات کی یہ تھی کہ ان میں سے بیشتر لکھی پڑھی موسیقی میں طاق رقص میں شہرۂ آفاق ہونے کے علاوہ شعر و شاعری کا مذاق بھی رکھتی تھیں۔ چنانچہ مجھے ان میں سے بیشتر محلات کے رقعات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور دو ایک مضامین بھی میں نے لکھے ہیں۔

جہاں تک میرا خیال ہے واجد علی شاہ ایک ہی بادشاہ (اگر انہیں بادشاہ کہا جا سکتا ہے تو) ایسے گزرے ہیں جن کے محلات میں وقتِ واحد میں تین درجن سے زیادہ لکھی پڑھی شاعرہ عورتیں رہی ہوں۔ یوں اصطبل بہت سے بادشاہوں نے بھر لئے تھے مگر ان میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

اس مضمون میں اب تک ہم نے تیرہ محلات کے رقعات کا اقتباس دیا ہے۔ "مخزن اسرار سلطانی یعنی رقعات بیگمات اودھ" کے ساتھ واجد علی شاہ کے بیس رقعات مختلف بیگمات کے نام ہیں جو زیادہ تر نثر ہیں ان میں سے چند کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

شیدا بیگم کو لکھا ہے:

"جانِ جانِ عالم نواب شیدا بیگم صاحبہ! نازِ حسنہا دجانہا دو تشفی نامے تمہارے ایک سب موزوں ایک نثر میں مشرح احوال

گوناگوں آئے، انجم الدولہ بہادر نے نویں رجب کو لاکر دکھائے۔ دل شاد ہوا، طبیعت میں قوت جان تازہ تن بےجان میں آئی۔ سراپا خوب تھا، دل کو ہمارے نہایت مرغوب تھا...."

مرقوم دہم رجب ۱۲۷۳ھ

زخندہ محل کو لکھتے ہیں:

"زیب بخش چار بالش محبت رونق افزائے بساط الفت نواب زخندہ محل صاحبہ جمال باکمال ہمیشہ روز افزوں رہے۔ محبت نامہ تمہارا پنج تاریخ ۲۳ رجب کے معرفت منشی صفدر آیا کاشف حالات مندرجہ ہوا، خبر صحت اشرار دو خاطر مضطر ہوئی۔ اس نامے سے جو محبت کی آئی تسکین خاطر پریشان نے پائی......."

مرقوم بست و پنجم رجب ۱۲۷۳ھ

فاطمہ بیگم کو تحریر کیا ہے:

"رشک بدر مشتری قدر، زہرہ جمال مہر مثال، حور نژاد پری نہاد، گل روسمن بو انیس و ہمدم خوبی مجسم نواب فاطمہ بیگم صاحبہ! اسم بامسمیٰ رہو۔ مکتوب محبت اسلوب غرہ شعبان کو منشی صفدر کی معرفت نشاط بخش غرہ شوال ہوا، دل غمزدہ دوست خرمی سے مالامال ہوا۔ شوق وصال دوچند ہوا، ذوق بوس و کنار بڑھا، ہے دل دردمند ہوا......"

مرقوم چہارم شہر شعبان ۱۲۷۳ھ

امراؤ محل کو رقم طراز ہیں:

"سمان جان عالم بانی جور و ستم، گل رخان عالم کے کعبۂ اعلیٰ نواب امراؤ محل صاحبہ! بادۂ حسن لازوال سے سرشار اور عنبر گیسوئے مشکیں تمہارا غیرت دہ چین و تاتار رہے، کاہش تن سے غیرت ہلال ہوں، صدمۂ مفارقت سے غمگین بدرجۂ کمال ہوں۔ آمد فصل بہار نے نیا رنگ واللہ دکھایا ہے۔ باد صرصر آہ آتشیں سے غنچۂ دشت کھلایا ہے۔ تمہارا بلبل گل رخسار یعنی اختر جگر افگار ہوش و حواس سب بھولا ہے......."

۲۰ شعبان ۱۲۷۳ھ

مناجان کو مخاطب کرتے ہیں:

"جان من راحت جان و دل صندل درد سر مضمحل باعث آبادی شہر عاشقاں بہار ریاض و چمنستان مناجان! تفریح بخش غنچۂ خاطر اختر مضطر رہو۔ خط تمہارا دل سے عزیز جان سے پیارا بست و یکم شہر حال معرفت کنز الدولہ بہادر کے کلید قفل مسرت ہوا، منظومات مندرجۂ بالا سے دریافت ہر ایک حال ہوا........"

مرقوم ۲۳ رجب ۱۲۷۳ھ

یہ تھا جان عالم کے نثر کے رقعات کا نمونہ، اب ذرا ان کے منظوم رقعات کے چند نمونے بھی دیکھ لیجئے۔ ملکۂ سیمتن کے نام چار رقعے ہیں جن میں سے تین مثنوی کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ ایک رقعہ البتہ بقید قافیہ ہے ملاحظہ کیجئے:

مجمع حسن و جوانی لطف دل — راز دار خاطر آشفتہ جاں
طالب جام وصال بادشاہ — سیم تن ملکہ تمہیں ہو میری جاں

نامۂ نامی جو پہنچا آپ کا   کیا اٹھایا قلب نے لطفِ بیاں
.. ..
اے مری بلقیس تاجِ تختِ ہند   تیرا مفتوں ہے سلیمانِ جہاں
جان و دل تو ہے تجھی سے کام ہے   باغباں میں اور تو ہے گلستاں
فرقِ فرقِ حسن تو میں پائے عشق   تو ہے معشوق اور میں عاشق بجاں
غیرتِ زہرہ ہے تو ناہید خصال   نام میرا اخترِ ہندوستاں
ماشاء اللہ تم پری رو نازنیں   پیر میں ہوں اور جواں ہیں تم جواں

سہاگن بیگم کے نام بھی تین رقعے ہیں جن میں سے یہ ایک بڑا لطیف ہے ؎

شمعِ مہر و وفا، مخزنِ زر، ابرِ کرم   میری جانی مری مہرو، مری پیاری ہمدم
یوں جواب اس کا قلم سے لکھے جانِ عالم   گوشِ دل سے سنو نواب سہاگن بیگم
نامۂ نامی مجھے پہنچا سُن اے مہ جبیں   ہوا مضمونِ نہاں سارا عیاں خوش آئیں
ملتفت اب جو مرے حال پہ تم دل سے ہو   میں بیاں کرتا ہوں تم گوشِ اطاعت سے سنو
سادہ اقرار سند کب ہوا بے مہر و گواہ   نہ کوئی اس میں قسم اور نہ حلف عند اللہ
ہاں ضمانت ہو رقم بارہ اماموں کی اگر   وہ لکھا سمجھے گا سچ جانِ جہاں یہ اختر
بے قسم ہووے جو اقرار وہ اقرار نہیں   جو لگاوٹ سے بری ہو وہ طرحدار نہیں
تم کو منظور اگر وصلتِ اختر ہو گی   تو گواہی بھی رقم نامہ کے اوپر ہو گی
ہو چکا سنِ تمیز آپ کا ماشاء اللہ   قول و اقرار کے اب چاہیئے حاضر ہوں گواہ
بعد اس قول کے البتہ محبت ہو گی   اتنی ہووے گی خوشی جتنی اطاعت ہو گی
گیارھویں کو نہیں اس چاند کی بلواؤں گا   مہِ رخ سے زرِ خورشید کو شرماؤں گا

کیسۂ حسن پُر از سیمِ محبت بادا
دہد اللہ ز بطنِ تو یکے شہزادہ

معصومہ بیگم اختر پیاری کو بڑا لمبا رقعہ لکھا ہے جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

مہِ مصر خوش رُو عزیزِ جہاں   چراغِ چمن بلبلِ بوستاں
بہارِ گلستانِ عشوہ گری   جبینہ جلیسہ حسینہ پری
تو محبوبہ سلطاں کی ہے اے پری   ملی بحر کر تجھ سے اک برتری
وہ نواب اختر پیاری ہے تو   یہ ثابت ہوا بس ہماری ہے تو
جو معصومہ بیگم ہوا نامِ نیک   نظر آیا سو نامداروں میں ایک

ارے اے پری زاد بہر خدا　　بھلانا نہ دل سے مجھے تو ذرا
یہ کلکتہ ہے بے وفاؤں کی کان　　کہا مان شکوہ نہ کر میری جان
ہمیں تجھ سے الفت ہے اے ماہ خو　　کہیں گے اگر ہوں گئے ہم روبرو

سر زلف یار سیہ تاب باد
دل دشمناں در نظر آب باد

اکلیل محل کے نام بھی دو رقعے ہیں، ایک تو طولانی اور لایعنی ہے مگر دوسرا غنیمت ہے جس کے چند شعر نقل ہیں ؎

پری رو نیک طینت مہ لقا خوش مرتبہ جانی　　جو ممتاز جہاں اکلیل فرق جان عالم ہے
رہے وہ تا قیامت یا الٰہی باغ دنیا میں　　گل خوبی ہے سردار ہے عطر مجسم ہے
صلاح نیک جو دی تھی محبت نامہ کی تم نے　　وہ لکھ بھیجا ہے اب ان کو ہمارے کچھ نہیں غم ہے
جواب آئیگا جس دن جو بوجھوں گا وہ تم کو　　الٰہی تب تو دلِ ناشاد میرا شاد و خرم ہے

شباب محل کے نام پانچ شعر کا منظوم رقعہ بڑا مزے دار ہے ؎

آج ہم نے یہ سنا مجھ کو بلاتی ہو تم　　نہیں معلوم کہ کیوں عشق جتاتی ہو تم
میں وہی ہوں کہ مری باتوں سے نفرت تھی تمہیں　　صاف ظاہر ہے جواب بھی محبت سے نہیں
ورنہ فرمائشِ خلوت کو نہ یوں ٹالتیں تم　　اپنے عاشق کی محبت کو نہ یوں ٹالتیں تم
کیا کہیں کیسی ہے شرمندگی تجھ سے ہم کو　　سر پھرا لرزہ چڑھا بھول گئے سب غم کو
آنکھیں اب چار نہیں ہوتیں ترے سر کی قسم　　تیرے دانتوں کی دہن کی ترے گھر بھر کی قسم

ملکۂ ملک کے نام کے رقعے میں چند شعر بڑے مزے کے لکھے ہیں ؎

جوانی کی باتیں ہمیں یاد ہیں　　ہمیں صید ہیں آپ صیاد ہیں
مکر اپنے منہ سے ہوئی تھیں جو تم　　قسم کھائی تھی جب سے ہیں ہوش گم
نہیں کچھ بھی اپنے کئے کا علاج　　زمانہ ہوا طول بدلا مزاج
مداوائے دردِ جگر اب کہاں　　وہ اگلا سا نفع و ضرر اب کہاں
جو سودائے الفت ہے اب خام ہے　　ترا پختہ کاری میں بھی نام ہے

دل آباد بیگم کو ایک رقعہ میں اپنی بواسیر کی تکلیف بڑی تفصیل سے لکھی ہے ؎

جو استادہ ہوں تو نہیں ہے قرار　　جو بیٹھا تو دل کو تڑپ اے نگار
جو بیٹھوں تو بے چین اس سے سوا　　جو تڑپوں تو طاقت نہیں ہے ذرا
جو خاموش ہوں تو الجھتا ہے جی　　جو سیدھا چلا ہر روی میں کجی
جو چلاؤں الفاظ ہوں مہملات　　جو چپ ہوں تو کہتا ہوں کر کوئی بات

دل آباد بیگم خدا کی قسم   ہے سبے شاہِ مرتضیٰ کی قسم
ہو ویرانے میں جاؤں بر آئے یاد   جو ہوا بجز [illegible] من بر نہ آئے مراد

جہانگیر بیگم کو بھی بواسیر ہی کا دکھڑا سنایا ہے۔

جہانگیر بیگم سرِ تخت و تاج   نہیں اچھا رہتا ہمارا مزاج
بواسیر نے کی ہے شدت بہت   ہے مسّوں سے مجھ کو مصیبت بہت
کسی وقت راحت نہیں جان کو   سمجھتا ہوں جنگل گلستان کو
دوا و دعا رات دن صبح شام   نہیں کرتا دو دو پہر میں کلام
وہ ہے اشتدادِ مرض میری جاں   زبانِ دوا سے سنا الاماں
جلاتا ہے شعلہ بواسیر کا   یک کام کرتی ہے شمشیر کا

خاقان محل کے نام بھی ایک رقعہ بڑا دلچسپ ہے۔

اے سروِ ریاضِ نیک نامی   اے رونقِ باغِ خوش کلامی
اے گلبنِ نو بہارِ عالم   اے مونس پاکباز ہمدم
خاقان محل ہے نام نامی   دل سے بھی ہے بڑھ کے تو گرامی
اللہ تجھے رکھے سلامت   برسے ہر روز آبِ وصلت
پہنچا جو نمیقۂ خوش آئیں   خوش ہو گئی پڑھ کے جانِ غمگیں
منظور ہوئی تمہیں جو قربت   معلوم ہوئی وہ ہم کو صورت
اے جانِ جہاں برب اعلا   بر آئی ہماری سب تمنا
دوری نے تری تھا مار ڈالا   ہر داغِ جگر تھا میرا آلا

انشاء اللہ اے سمن بر
بلواتا ہے جلد تم کو اختر

شہزادہ بیگم کو بھی بڑا لطیف رقعہ لکھا ہے۔

اے جانِ جہان و جانِ سلطان   اے مہر قد و نگارِ جاناں
تہمت ہے مجھ پہ جھوٹ پیارے   بے جا ہیں تمہارے وہم سارے
ہاں شکوۂ عشق میں کروں گا   الزام تمہارے سر دھروں گا
جب آتا ہوں تم نہیں ہو آتی   اور دور سے باتیں ہو جاتی
آغوش میں جب کہ آئیے گا   کیا تحفۂ عشق لائیے گا
تحقیق کرو بلا کے جانی   کس نے تمہاری قدر جانی

آگاہ نہ ہوئے جس سے انساں   تہمت نہ رکھو تم اس پہ ہر آن
اب ختم ہے اے نگار نامہ   ہر شعر ہے ایک کارنامہ
تم راضی ہو جب تو ہم بھی ہوں شاد
اللہ ہمیشہ رکھے آباد

تصویر محل کے نام ایک طویل رقعہ لکھا ہے جس سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

یہ سب اہلِ کلکتہ دیوانے ہیں   تو ہے شمع سب تجھ پہ پروانے ہیں
ترا دل دکھایا ہے کس ماہ نے   رُخ داغ پایا ہے کس ماہ نے
کہا میں نے تصویر ہے اس کا نام   کہ پریوں کی افسر ہے وہ مہ مقام
اسے اس قدر مجھ سے نفرت ہے یار   ہٹاتی ہے منہ میں جو کرتا ہوں پیار
جو ہمراہ لیٹوں تو کرتی ہے پشت   جو میں نرم ہوتا ہوں وہ ہے درشت
مرا وصل ہے سنگ سے بھی فزوں   جو چمٹوں تو ہوتا ہے اس کو جنوں
جو روؤں تو ہنستی ہے ہر بات پر
وہیں طعن کرتی ہے ہر بات پر

کیکاؤس بیگم کو حسینی خانم نے مچل دے کر برافروختہ کر دیا تھا اس کی صفائی میں ایک رقعہ لکھا ہے ؎

بہارِ عشق کیکاؤس بیگم   حسین و خوش قد و ہم راز و ہمدم
پس از بوس و کنارِ عشقبازی   عیاں ہو تم پہ ساری جعلسازی
کیا آنے کو تم کو منع کس دن   کٹیں گھڑیاں تمہارے غم میں گن گن
عجب ہے اے گلِ تر اے پری زاد
ز دستِ جعلسازاں ہست فریاد

منصور محل کو بھی بڑا اچھا رقعہ لکھا ہے ؎

منصور محل ہماری پریا   اللہ رکھے تمہارا جبلوا
من بعد مذاقِ ہمکناری   گوشِ دل سے سنو ہماری
تحریر تمہاری اے گلِ تر   پہنچی ہے حضورِ شاہ اختر
احوال جو تھا کھلا وہ ہم پر   چوروں کا یہ غلغلہ تھا یکسر
تم زوجۂ شاہ اے پری زاد   وہ چور ہیں تم ہو رشکِ شمشاد
ہوگا وہ جہان بھر میں رسوا   دیوے گا خدا تمہیں پھر اتنا
انشاء اللہ بعد چہلم   چوروں کے بھی ہوش ہو جائیں گے گم

اے نامۂ شوق اُڑ کے جانا   جلدی سے جوابِ نامہ لانا
اے جذبۂ عشق چپل ہوا ہو   اے خنگِ تلاش سیخ پا ہو
چل چپل ہوس تلاش اختر
پہنچا دے یہ نامہ یار کے گھر

یہ مجھے واجد علی شاہ کے رقعات مخدرات کے نام ایک رقعہ حکیم شفاء الدولہ کے نام بھی اتفاق سے مل گیا جسے لسانِ اودھ سے نقل کر کے سید محمد فاروق شاہ پوری نے "زمانہ" بابت ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۰۸ء میں چھپوایا تھا۔ یہ رقعہ اکتیس شعر کا ہے، اس میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

بحث کے قابل نہیں میرا دماغ   درد زنداں سے نہیں حاصل فراغ
رمز اک شوخی سے ہے موقع پر مجھے   بلبلِ غم نے دیئے ہیں پر مجھے
گوشِ دل سے سُن اسے نوابِ طبیب   پھر سمجھنا شاہ کو اپنا حبیب
بخت نصر کے قریب تھا دانیال   کافر و مرتد وہ تھا یہ خوش خصال
تا بہ مرگ اس نے نباہا اس کا ساتھ   دستِ صادق سے نہ چھوٹا اُس کا ہاتھ
مذہبِ اثنا عشر کے شاہ کو   تو نے چھوڑا قید میں اس ماہ کو
کب فلاطوں سے سکندر چھٹ گیا   کون سی لیلیٰ سے مجنوں چھٹ گیا
کون سے مالک کا بھاگا ہے غلام   بھاگ کر پایا ہے کس نے نیک نام
حق کے ہمراہ رہنا گو بیمار تھا   بحرِ ناچاقی سے بیڑا پار تھا
دن مصیبت کے اگر پر پڑے   کس طرح اصحاب ہیں دل سے لٹے
یہ تو زنداں تھا فقط اے مہرباں   اس میں تو ہرگز نہ تھا جاں کا زیاں
بلکہ حق یہ ہے کہ حق کی بات تھی   جو نفی حق کی تھی سب اثبات تھی
جاں سے پیارا جان کر اے قدرداں   لکھنؤ تم ہو گئے دم میں رواں
ہم کو چھوڑا قید خانے کے لئے   آپ جا پہنچے زمانے کے لئے
گر یہی طرزِ رفاقت ہے تو واہ   آپ کا مالک نہیں ہے بادشاہ
جو ہو مملوک اس کو پیاری جان ہو   دعوئ مسلک کی پھر ہر آن ہو
[illegible] عالیجناب   کب بھلا دیں گے اس کو شیخ و شاب
[illegible] تم کو   میں نے تو بخشا مگر صاحب سنو
[illegible] خدا فرمائے گا   [illegible]

اس سے بہتر ہے زیارت کیجئے　　　روضۂ شہ سے محبت کیجئے

یہ طومار اسی قسم کے لایعنی اشعار سے بھرا ہوا ہے جس سے اختر پیا کی موزونیٔ طبیعت کا پتہ تو چلتا ہے مگر لطافت و فن دانی کی قلعی بھی کھل جاتی ہے ۔

واجد علی شاہ اگرچہ برائے نام شاہِ اودھ رہے اور پھر ساری عمر قیدِ فرنگ میں گذاری مگر کشورِ اردو میں اپنا گز و سکہ جاری کر دیا۔ بنگال، رنگون، برما میں آج جتنے اردو بولنے والے ہیں وہ اسی واجد علی شاہ کی رعایا ہیں اور جو فروغ ان مقامات پر اردو کو ہوا اسی قیدی بادشاہ کی وجہ سے ہوا۔ علامہ علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا عبد الحلیم شرر، عابد مرزا بیگم (ریختی گو) واجد علی شاہ ہی کے تربیت کردہ اور مٹیا برج کے ساختہ پرداختہ تھے جنہوں نے ساری عمر اردو کی خدمت میں گذاری ۔

قطب شاہی دور میں اردو ادب کی رفتار

نصیر الدین ہاشمی

آندھرا پردیش میں قطب شاہی بادشاہ ۹۲۴ھ (۱۵۱۸ء) سے ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) تک شان و شوکت اور عدل و انصاف اور رواداری کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔ ان کے زمانہ کی مختلف ترقیوں کا تذکرہ اس موقع پر ہو رہا ہے۔ دوسری ترقیوں کے قطع نظر علم و ادب کو بھی خاص ترقی ہوئی۔ ہر کسی کو یہ معلوم ہے کہ قلمرو قطب شاہی کی عام زبان تلنگی اور اُردو تھی۔ عربی، فارسی میں بھی اصحاب علم و فن کی جولانیاں ہوتی تھیں۔ اگر قطب شاہی دور کو تلگو زبان کا سنہرا دور کہا جائے تو غلط نہیں ہو سکتا۔ اس طرح عربی و فارسی ادب کی بھی ترقی ہوئی۔ میں مختصر طور پر اُردو کی ترقی کا حال گوش گذار کرتا ہوں۔

اگرچہ دکن میں اُردو کا آغاز قطب شاہی دور سے پہلے ہو چکا تھا مگر ادبی حیثیت سے قطب شاہی دور میں جو ترقی ہوئی وہ بڑی تابناک اور درخشاں ہے۔ قطب شاہی بادشاہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے باعث اُردو نظم اور نثر کے شاہکار مرتب ہوئے جو آج تک باقی ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

قطب شاہی بادشاہوں میں سے آخری چار بادشاہ یعنی سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد عبداللہ اور تانا شاہ نہ صرف شعراء اور ادیبوں کے سرپرست تھے بلکہ خود بھی صاحب کمال شاعر تھے خصوصاً سلطان محمد قلی قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کی شاعری کا حال آپ اس جلسہ میں سماعت فرمائیں گے۔

قطب شاہی دور کے جن شعراء اور نثر نگاروں کا اب تک پتہ چلا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

شمار	نام	تصانیف	سنہ تصنیف
۱	ملا خیالی		
۲	فیروز	مثنوی توصیف نامہ	قبل ۱۰۰۰ھ
۳	محمود		
۴	وجہی	مثنوی قطب مشتری	۱۰۱۸ھ
		سب رس	۱۰۴۵ھ
		تاج الحقائق	
۵	محمد قلی قطب شاہ	کلیات	۱۰۲۵ھ

شمار	نام	تصانیف	سنہ تصنیف
۶	احمد	لیلیٰ مجنوں	قبل ۱۰۰۰ھ
		مثنوی مصیبت اہل بیت	
۷	محمد قطب شاہ	کلیات	مابعد ۱۰۲۵ھ
۸	غواصی	سیف الملوک و بدیع الجمال	۱۰۳۵ھ
		طوطی نامہ	۱۰۴۹ھ
		چنداو لورک	
		کلیات	مالبعد ۱۰۵۰ھ
۹	حسن شوقی	قصائد و غزل	مابعد ۱۰۳۵ھ
۱۰	عبداللہ قطب شاہ	کلیات	۱۰۷۵ھ
۱۱	قطبی رازی	تحفۃ النصائح	۱۰۴۴ھ
۱۲	عاجز	لیلیٰ مجنوں	۱۰۴۰ھ
۱۳	سلطان	کلیات	۱۰۵۰ھ
۱۴	بلاقی	نور نامہ، معراج نامہ	۱۰۶۵ھ
۱۵	جنیدی	ماہ پیکر	۱۰۶۴ھ
۱۶	ابن نشاطی	پھول بن	۱۰۶۶ھ
۱۷	طبعی	قصہ بہرام و گل اندام	۱۰۸۱ھ
۱۸	اولیا	قصہ ابوشحمہ	۱۰۹۰ھ
۱۹	یادگار علی	گلشن عزا	۱۰۸۰ھ
۲۰	ابوالحسن تانا شاہ	دیوان	
۲۱	محب	معجزہ فاطمہ	
۲۲	خواص	قصۂ حسینی	۱۰۹۰ھ
۲۳	غلام علی	پدماوت	۱۰۹۱ھ
۲۴	مبارک	جنگ نامہ	۱۰۹۲ھ
۲۵	فائز	قصہ رضوان شاہ	۱۰۹۴ھ
۲۶	لطیف	ظفر نامہ	۱۰۹۵ھ
۲۷	افضل	محی الدین نامہ	

شمار	نام	تصانیف	سنہ تصنیف
۲۸	شاہ راجو	سہاگن نامہ وغیرہ	؟
۲۹	جلیل	مجموعہ مراثی	؟
۳۰	کاظم	مرثیہ	؟
۳۱	شاہی	مرثیہ	؟
۳۲	مرزا	مرثیہ	؟
۳۳	نوری	مرثیہ	؟
۳۴	مولانا عبداللہ	احکام صلوٰۃ	۱۰۳۲ھ
۳۵	میراں جی خدا نما	شرح شرح تمہید	۱۰۷۰ھ
۳۶	میراں یعقوب	شمائل التقیا	۱۰۷۸ھ
۳۷	عابد شاہ	فخر السالکین، مراۃ السالکین	
۳۸	فتاحی	مفید الیقین	

تقریباً چالیس شعراء اور نثر نگاروں نے مختلف موضوعات پر اپنی تصانیف چھوڑی ہیں۔

قطب شاہی شعراء نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی وغیرہ کے میدان کو انہوں نے اپنی خیال آرائی کی جولاں گاہ بنایا ہے اور گلستانِ شعر و سخن کو اپنے سدا بہار پھولوں سے آراستہ کیا جس کی مہک آج تک اُردو شاعری کی فضا کو معطر کئے ہوئے ہے۔

قطب شاہی دور کی مثنویوں کو ان دو اقسام پر منقسم کر سکتے ہیں یعنی فارسی سے ترجمہ کی ہوئی مثنویاں اور دوسری اپجی مثنویاں۔ اوّل الذکر کا زیادہ ذخیرہ ہے۔ فیروز کا توصیف نامہ، احمد کی لیلیٰ مجنوں، غواصی کی سیف الملوک بدیع الجمال، طوطی نامہ، چندا اور لورک، ابن نشاطی کی پھول بن، طبعی کی بہرام و گل اندام، جنیدی کی ماہ پیکر، عاجز کی لیلیٰ مجنوں، سیوک کا جنگ نامہ، لطیف کا ظفر نامہ، بلاقی کا معراج نامہ، افضل کا محی الدین نامہ، غلام علی کی پدماوت، فائز کی قصہ رضوان شاہ، رازی کی تحفۃ النصائح وغیرہ سب کی سب فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ مگر ان شعراء نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ کمی و بیشی کر کے اپنایا ہے۔ ان کا ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ذاتی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

دوسری اپجی مثنویاں ان میں وجہی کی قطب مشتری خصوصیت سے قابلِ تذکرہ ہے۔ وجہی نے اپنے زمانے کے ولی عہد یعنی ہونے والے بادشاہ سلطان محمد قلی کو ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور قطب مشتری کی عشقیہ داستان لکھی ہے۔ شاہ راجہ کی سہاگن نامہ اور دوسری تصوف کی مثنویاں بھی اپجی مثنویاں ہیں۔

قطب شاہی مثنویوں کو مضامین کے لحاظ سے تاریخ و سوانح، رزمیہ، عشقیہ و محبت، تصوف، پند و نصائح اور اخلاق پر منقسم کر سکتے ہیں۔

تاریخی یا سوانحی مثنویوں میں فیروز کی مثنوی توصیف نامہ اور افضل کی مثنوی محی الدین نامہ قابلِ تذکرہ ہیں۔ ان دونوں میں قادریہ خاندان کے پیر طریقت حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے حالات و مناقب اور کرامات وغیرہ نظم کئے گئے ہیں۔ شمالی ہند میں جس طرح خواجہ معین الدین اجمیری کے معتقدین کی تعداد

یادہ ملتی ہے اسی طرح دکن میں حضرت جیلانی کے معتقدین زیادہ ہیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آغاز اُردو ادب ہی سے حضرت جیلانی کے حالات مناقب کرامات لکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اگرچہ توصیف نامہ اور محی الدین نامہ مکمل سوانح عمریاں نہیں ہیں مگر پھر بھی ان کو اسی موضوع کے تحت پیش کرنا ضروری ہے۔

تصوف، پند و نصائح، فقہ اور عقائد اور اخلاقی مثنویوں تحفۃ النصائح، سہاگن نامہ، معجزہ فاطمہ، نور نامہ، معراج نامہ وغیرہ قابلِ تذکرہ ہیں۔ ان مثنویوں میں مذہبی پیرایہ میں حسنِ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور اچھے کردار اختیار کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔

جنگ نامہ، ظفر نامہ، رزمیہ مثنویاں ہیں۔ ان میں محمد بن حنیفہ کو ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان مثنویوں کے علاوہ جو مثنویاں عشق و محبت کی داستانوں پر مشتمل ہیں ان میں جنگ کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ واقعات فرضی ہیں مگر جنگ و جدل اور معرکہ کی خوں چکاں حکایت بڑی چابک دستی سے نظم کی گئی ہے۔ ان مثنویوں میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ مقابلہ کی روداد، معرکہ کا طریقہ، لڑائی کا نقشہ، قلعہ پر دھاوا، شبخون حملہ کی کیفیت، ابتری جنگ کے ساتھ بحری جنگ وغیرہ کا حال سلیقہ سے لکھا گیا ہے۔

عشق و محبت کی جو مثنویاں ہیں ان میں قطب مشتری بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس میں قطب شاہ اور مشتری کا افسانہ نظم کیا گیا ہے۔ وجہی نے اپنے تخیل کی پرواز بڑے اچھے انداز میں ظاہر کی ہے، شاعر کے کمالِ فن کا اعتراف کرنا لازمی ہے۔ دوسری مثنویوں میں بزم کی رنگین محفل آرائی، عیش و طرب کی پُرلطف داستان، شاہد و ساقی کی دلکشی، ہجر و فراق کی المناکی، وصال کی دلچسپ روداد سامنے آتی ہے۔ ان مثنویوں میں مناظرِ قدرت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ صبح و شام، طلوع و غروب، جنگل و بیابان، گل و گلزار، بہار و خزاں، سمندر اور ریگستان کی عکاسی بڑے اچھے ڈھنگ سے کی ہے۔ گویا اصلی منظر کا فوٹو آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ان کی مثنویوں میں تسلسلِ بیان کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ مربوط ہیں۔ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ ملا ہوا ہے۔ کیرکٹر اور ارتقاءِ کیرکٹر کے لحاظ سے ان کو کامیاب کہا جاسکتا ہے۔

عشقیہ مثنویوں کے قصے اکثر ایسے ہیں کہ عاشق، معشوق سے کہیں خواب میں یا تصویر یا کسی نقد میں دوچار ہوتا ہے اور پھر اس کی تلاش میں نکل جاتا ہے، مصیبتوں کو جھیلتا، پریشانیاں سہتا، دشت و بیابان کی خاک پیمائی کرتا، ملکوں ملکوں کی سیر و سیاحت کرتا، سحر اور جادو میں پھنستا، دیووں اور پریوں سے معرکے کرتا، طلسم کشائی کرتا ہوا منزلِ مقصود پر پہنچ کر کامیاب ہوتا اور اپنے دیس کو واپس لوٹتا ہے۔

ان عشقیہ مثنویوں میں جہاں جنگ و جدل کی روداد ہے وہاں روزمرہ معاشرت کا حال بھی درج ہے۔ ان سے اس زمانے کے رسم و رواج اور کلچر کا پتہ چلتا ہے۔ اس وقت کی تہذیب، شائستگی اور معاشرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مثنویوں کے دوسرے لوازم کے لحاظ سے ان کو جانچا جاتے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نقص بہت کم ہے۔ انہوں نے کسی جز کو مبہم نہیں چھوڑا۔ جزئیات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ حسنِ ترتیب کے معیار سے پرکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مسالہ کو عمدگی سے ترتیب دیا ہے اور قابلیت کے ساتھ واقعات کو مربوط کیا ہے۔ ان سے ان کی نکتہ سنجی کا ثبوت ملتا ہے۔

بہرحال دورِ قطب شاہیہ میں مثنویوں کو بڑی ترقی ہوئی اور آج تک ان مثنویوں کو اُردو کے ذخیرہ میں بلند مرتبہ دیا جاتا ہے۔

تاریخوں سے اس امر کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ دکنی شعراء نے قصیدوں کا بڑا ذخیرہ مرتب کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ کی دستبرد سے قصیدوں کا بڑا حصہ تلف ہوگیا ہے۔ ہم کو صرف سلطان محمد قلی قطب شاہ اور غواصی کے قصیدے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں قصیدوں کے پورے لوازم ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے قصیدوں میں نعت، منقبت، مدحِ حضرت علی، ماتمِ حضرت امام حسین علیہ السلام اور بادشاہ کی مدح میں

پروازِ تخیل دکھائی ہے۔ قصیدوں میں تمہید کی خوبی، گریز کا حسن، مدح اور ستائش میں خیالات کی بلندی قابلِ داد ہے، دعا پر یہ ختم ہوتے ہیں۔ قصیدوں میں تشبیہوں کی ندرت، استعاروں کی جدت، خیالات کی بلندی، مضامین کا طمطراق، الفاظ کی شان و شوکت موجود ہے۔

جس زمانہ میں دکنی شعرا نے غزل گوئی کا آغاز کیا تھا اس وقت فارسی شعرا کے تین طبقے گذر چکے تھے۔ رودکی، اسدطوسی، فردوسی، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی اور حافظ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ان کی غزلیں ایران سے نکل کر ہندوستان اور دکن تک پہنچ گئی تھیں اور خود ہندوستان میں خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم کی زمزمہ خوانی فضا میں گونج رہی تھی۔ ان لوگوں کے کلام نے جو حسن و عشق کی روئداد سے لبریز اور محبت و الفت کی داستان سے مملو تھے دکن کے غزل گو شعراء کے لئے نمونہ کا کام دیا۔

قطب شاہی دور کے جن شعراء کی غزلیں اب تک ہمدست ہوئی ہیں ان میں سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، غواصی اور شاہ سلطان کی غزلیات شامل ہیں۔

غزل اپنی ساخت کے لحاظ سے بہت سارے موضوع قلمبند کرنے کی اجازت دیتی رہی ہے۔ مذہب، اخلاق، سیاست، معاشرت سب کچھ غزل کے موضوع ہوتے ہیں مگر اس کا غالب رجحان عشق و محبت ہے، اس لئے غزل کو تغزل کا دوسرا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ولی کے بعد شمالی ہند میں جو غزل گوئی ہوئی وہ اصلیت سے دور ہوتی گئی۔ ان کا معشوق اکثر و بیشتر فرضی ہوتا تھا یا پھر بازاری، لیکن دکنی شعراء نے جو غزل سرائی کی ہے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اصلیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ خصوصاً سلطان محمد قلی اور سلطان عبداللہ نے جو رنگین مزاج اور عاشقانہ طبیعت کے مالک تھے۔ چونکہ شاہی قصر اور ایوان بلکہ خود گولکنڈہ اور شہر حیدرآباد حسن اور رعنائی کے مرکز تھے اس لئے فرضی معشوق کی ضرورت نہیں تھی۔

سلطان محمد قلی اپنے بچپن سے ایک عاشق مزاج اور رندِ مشرب شاہزادہ تھا جس کی ابتدائی زندگی سے لے کر مرنے تک معشوقوں میں بسر ہوئی۔ سلطانی محل میں ہر ایک ملک اور ہر مذہب کی عورتیں جمع تھیں، اگر ان میں دکن اور گجرات کی نازک بدن اور گل اندام رانیوں کی فراوانی تھی تو وہیں ایران اور ترکستان کی گل رخسار اور گل رخ حرموں کا بھی جمگھٹ تھا۔ ہر وقت عیش و نشاط کی محفل گرم رہا کرتی، دلکش نغمہ نوازی دماغ کو مسرور کرتی، قلب کو سرور پہنچاتی، مئے ناب کے دور مدہوش کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر زور اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں خوبی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں اور کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنین آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش اور زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کا مظاہرہ کرتی رہتی تھیں۔ سلطان محمد قلی کی غزلوں میں نہ صرف عشق و محبت کی روئداد معشوق کے سراپا یعنی حسن و عشق کی تصویریں اور پر تکلف رنگین داستان کے ساتھ اس نے وصال کے پر کیف و سرور مرقع ایسے عریاں الفاظ میں پیش کئے ہیں کہ کسی مصور کو بھی ایسی عریاں نوڈ پیش کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

راز و نیاز کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو سلطان محمد قلی کی جولانی قلم سے چھوٹ گیا ہو۔

اسی طرح اس کے نواسے سلطان عبداللہ کا دورِ حکومت بھی اس کے نانا کی یاد تازہ کرتا تھا۔ جب بادشاہ اس قسم کے شاہد رعنائی پسند ہوں تو ظاہر ہے کہ اہلِ ملک بھی حسن و عشق کے میدان میں جولانیاں پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ چالیس ہزار رقاصہ اور ماہرِ موسیقی اس زمانہ میں حیدرآباد و گولکنڈہ میں موجود تھے۔ بہر حال غزل گو شعراء کے لئے خیالی اور فرضی معشوق کی ضرورت نہیں تھی ——— بلکہ وہ

حقیقت نگاری کرتے ہیں۔

غزل کی نشو و نما اور ارتقا اور مقبولیت کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ غزل اس وقت مقبولِ عام ہوتی اور پسند کی جاتی ہے جبکہ وہ عاشقانہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہو۔ جن اشعار میں محبت کا عنصر غالب ہوتا ہے وہ بہت پسند کئے جاتے ہیں۔

قطب شاہی غزلوں میں یہی پہلو نمایاں رہا ہے کہ اس عہد کی غزلیں غمِ جاناں کی تفسیر کرتی ہیں۔ غمِ دوراں کا نام ان کی غزلوں میں نہیں ملتا۔ جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے غزلوں کا جو ذخیرہ بہم دست ہوا ہے وہ سلطان محمد قلی، غواصی، سلطان عبداللہ اور حضرت شاہ سلطان کا ہے۔ ان میں ایک طرف عشقِ مجازی کی داستان سنائی گئی ہے تو وہاں عشقِ حقیقی کا بھی رجحان ملتا ہے۔ خود سلطان محمد قلی کا بیان ڈاکٹر زور کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے:

> ”میرے عشقِ مجازی کو دیکھ کر نقاشِ ازل نے مجھ پر رحم کیا۔ مجھے استاد نے ایک اور ہی تعلیم دی اور میں نے کچھ دیکھ کر ہی زنّار باندھا ہے۔ میرے دل میں جو درد ہے اس کو اغیار نہیں سمجھ سکتے۔ میں اپنے عشق کو کب تک چھپاؤں جب کہ منصور سا عاشق بھی اس کو چھپا نہ سکا۔“

خواجہ حافظ اور عمر خیام کو بعض اصحاب رندِ خراباتی تصور کرتے ہیں اور بعض صوفی صافی تسلیم کرتے ہیں اسی طرح سلطان محمد قلی کو بھی وہی درجہ اور مرتبہ دیا جا سکتا ہے جو حافظ یا عمر خیام کو دیا جا سکتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ نے بھی خواجہ حافظ کی غزلوں کا ترجمہ کیا ہے اور اپنے نانا کے نقشِ قدم کی پیروی کی ہے۔ شاہ سلطان ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کا دیوان تصوف سے مملو ہے۔ غواصی نے بھی اپنے عہد کی پیروی کی ہے۔

قطب شاہی دور کے شعراء نے اصنافِ شاعری کی دوسری شاخوں یعنی رباعیات، مخمس، شمسی وغیرہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کی صراحت یہاں متروک کی جاتی ہے۔

قطب شاہی دور میں مرثیہ کو بھی ترقی ہوئی ہے۔ چونکہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اہلِ بیتِ رسالت سے بڑی محبت تھی اور وہ دل و جان سے ان پر فدا تھا نہ صرف اس کے پایۂ تخت حیدرآباد بلکہ اضلاع اور دیہات میں عاشور خانے بنائے گئے تھے جہاں ماہِ محرم میں مجالسِ عزا منعقد ہوتی تھیں۔ مرثیے پڑھے جاتے اور واقعاتِ شہادت سنائے جاتے۔ اس زمانہ کے اکثر شعراء نے مرثیے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ خاص مرثیہ گویوں کی ایک جماعت تھی جو صرف مرثیے لکھا کرتی اور سناتی تھی۔

سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، غواصی، کاظم، مرزا وغیرہ کے مرثیے بہم دست ہو چکے تھے۔ اب نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ سے عبدالجلیل جلیل کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بہم دست ہوا ہے جو ۳۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مرثیے، سلام، نوحے وغیرہ درج ہیں۔

بیجاپور کے مرثیہ گو شعرا نے عنوانات کے تحت مرثیے لکھتے تھے مگر گولکنڈہ کے شعراء نے اس کی پیروی نہیں کی ہے۔ ان کے مرثیے اکثر بلا عنوان ہیں لیکن ان میں اصغر کا ماتم، قاسم کی شادی، شہربانو کا الم، بے کس و بے بس زینب، ظلمِ دشتِ کربلا کے مضامین ملتے ہیں جو اپنے سوز و گداز، رنج و الم کے لحاظ سے اردو مرثیوں میں خصوصیت رکھتے ہیں ان کے مرثیوں میں صفائی کے ساتھ ترنم اور تسلسل بھی موجود ہے اسلوبِ بیان کی شگفتگی کے ساتھ ان میں نہ صرف مرثیہ پن ملے گا بلکہ ادبیت بھی موجود ہے۔ بعض میں مکالمہ کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ابتداءً

میں لکھنؤ میں مرثیوں کو جو ترقی ہوئی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر دکھنی شعرا نے اپنے مرثیوں میں مرثیہ پن کی جو بات رکھی ہے وہ نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ مرثیوں کی تاریخ میں ان کو بلند مقام دیا جانا چاہیے۔

شاعری کے بعد جب ہم نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ اس قطب شاہی دور میں نہ صرف تصوف، فقہ اور عقاید کے مسائل اُردو نثر میں لکھے گئے بلکہ طویل افسانہ بھی نثر میں لکھا گیا۔ وجہی وہ خوش نصیب اور خوش قسمت شخص ہے، جہاں اس کی نظم قطب مشتری دونوں رسم الخط میں طبع ہوئی ہے وہاں اس کی نثر کی داستان "سب رس" بھی شائع ہو کر قدردانِ اُردو سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔

قطب شاہی دور کو اُردو کی تاریخ میں اس لئے زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے کہ نہ صرف شاعری کے میدان میں ترقی اور وسعت ہوئی بلکہ نثر نگاری میں بھی ترقی ہوئی اور پہلی نثر کی داستان اسی دور میں لکھی گئی۔

قطب شاہی دور کا اُردو ادب اپنی گوناگوں ترقیوں کے لحاظ سے تاریخِ اُردو میں آبِ زر سے لکھا جائے گا جس کو زمانہ مٹا نہیں سکتا۔ نہ صرف آندھرا دیش میں بلکہ جہاں جہاں اُردو مروج ہے قطب شاہیوں کی اُردو نوازی درخشاں رہے گی۔

شیوۂ جوانمردی[1] کا آغاز و ارتقا

سید علی عباس جلالپوری

چھٹی صدی بعد از مسیح میں یورپ کے وحشی قبائل کی بے پناہ تاخت و تاراج نے رومۃ الکبریٰ کی بساطِ عظمت اُلٹ کر رکھ دی۔ تسخیرِ روم کے بعد اطالیہ کے علاوہ ہسپانیہ۔ گال۔ المانیہ۔ برطانیہ وغیرہ کے ملکوں میں بھی ونڈل۔ فرینک۔ گاتھ۔ کلٹ۔ اور برٹنی کے اُجڈ قبیلوں نے اپنی اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان قبائل نے مذہب عیسوی قبول کر لیا لیکن اس کے باوجود صدیوں تک وہ تہذیب و تمدن کی برکتوں سے ناآشنا رہے یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے تاریخِ یورپ کے اس دور کو ازمنۂ تاریک کا نام دیا ہے۔ یہ گویا یورپ کا زمانۂ جاہلیت ہے۔ گیارھویں صدی میں یورپ کے ان اکھڑ قبائل میں ایک تحریک اشاعت پذیر ہوئی جس نے اُنھیں شائستگی کے اصول و آداب سے روشناس کرایا۔ یہ chivalry یا Knighthood کی تحریک تھی۔ اس کے آغاز و ارتقا پر بحث کرتے ہوئے اُنیسویں صدی کے مغربی مؤرخین نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ شیوۂ جوانمردی کی تاسیس و تشکیل ابتداً المانوی قبائل میں ہوئی تھی۔ بیسویں صدی کے مشاہیر محققین نے اس نظریہ کی تردید کی ہے۔ اور متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ جوانمردی کی روایت کا سلسلۂ زرّیں عہدِ اسلام کے جوانمردوں اور ماقبل اسلام کے عرب شہسواروں پر منتہی ہوتا ہے۔ عہدِ اسلام میں اس نے مرتّب و مدوّن ہو کر باقاعدہ ایک ادارہ کی صورت اختیار کی اور مسلمانانِ شام و ہسپانیہ کی وساطت سے مغربی ممالک میں اس کا شیوع ہوا۔

پروفیسر نکلسن[2] لکھتے ہیں:۔

---

[1] عربی میں اس کا نام فروسیت اور فتوت ہے اور انگریزی میں chivalry۔ جوانمرد کو عربی میں فتیٰ۔ الفارس یا اخی کہتے ہیں اور انگریزی میں Knight۔

[2] Literary History of the Arehs

"ازمنۂ وسطیٰ کی chivalry کی بنیاد غالباً قبل اسلام کے عربوں نے رکھی تھی۔ جوانمردوں کا خطرناک مہمات پر روانہ ہونا، شہسواری اور یکہ تازی۔ قیدی حسیناؤں کی مدد کرنا اور انھیں مصائب سے نجات دلانا۔ یہ تمام خیالات عربی معاشرہ کے اجزا ہیں اور chivalry کے نام کی طرح جس کے معنی ہیں شہسواری۔ شریف النفس، عالی نسبی اسی سے ماخوذ ہیں۔"

جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے لفظ chivalry عربی الاصل ہے۔ عربی میں شاول[1] تشاول کے لغوی معنی ہیں نیزہ سے حملہ کرنا۔ رجل شول مردِ تنومند اور نیزہ باز کو کہتے ہیں۔ بعد میں نیزہ بازی شیوۂ جوانمردی کا لازمہ بن گئی تھی۔ انگریزی کے لفظ chivalrous کا لغوی معنی "شہسوار" ہے۔ زمانہ قبل اسلام کے شجاعانِ[2] عرب نے جوانمردی کے تین لوازم قرار دیئے تھے۔ ۱۔ حماست (مصیبت کے وقت ثابت قدم رہنا)۔ ۲۔ مروّت (شجاعت اور مردانگی) ۳۔ ضیافت[3] (مہمان نوازی)۔ جو شخص ان اوصاف میں کسی ایک سے بھی عاری ہوتا تھا اس کو جوانمرد تسلیم کرنے میں تامل کیا جاتا تھا۔ عورتوں کی حفاظت میں جان لڑا دینا لازمۂ مروّت سمجھا جاتا تھا۔ عنتر بن شداد کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دن وہ اپنے قبیلے کی چند عورتوں کے ساتھ کہیں سفر پر جا رہا تھا کہ اچانک دشمن قبیلے کے چند سواروں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ عنتر نے عورتوں کو ایک گھاٹی میں چھپا دیا اور پلٹ کر مدافعت پر کمربستہ ہو گیا، وہ دیر تک تن تنہا رستمانہ جنگ کرتا رہا حتیٰ کہ چند ایک کو اس نے مار گرایا باقی حملہ آور خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلے۔ اس لڑائی میں عنتر کو کاری زخم لگے تھے لیکن وہ نیزے کی ٹیک لگائے اپنے گھوڑے پر بیٹھا رہا تاکہ دشمن پر اس کی زبوں حالی کا راز آشکار نہ ہو پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے قبیلے کی ایک عورت قریب آئی اور اُسے مخاطب کیا لیکن عنتر اپنے گھوڑے پر بُت بنا بیٹھا تھا۔ عورت نے اس کے نیزے کی ڈانڈ ہلا کر اُسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اُس کی روح پرواز کر چکی تھی۔

اِسی بنا پر Oclsner نے عنتر کو تحریکِ جوانمردی کا بانی کہا ہے۔

اس عہد کے نامور شجاع بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ مثلاً مہلہل تغلبی (عربی قصیدہ کا بانی) عنتر بن شداد اور عمرو بن معدیکرب (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے)

آنحضرتؐ کی بعثت کے بعد جب جاہلی شجاع مشرف بہ اسلام ہو گئے تو اُن کے شیوۂ مردانگی کو مزید تقویت پہنچی۔ صحابۂ کرام[4]

---

[1] حماسہ کے باب الہجاء میں عبدالرحمٰن بن الحکم کہتا ہے۔

فَشَاوِل بقیسٍ فی الطّعان ولاتکن۔ اَخَاها اذا ما المشرفیۃ سُلّت

[2] ان میں ربیعہ بن مکدم۔ عتیبہ بن حارث۔ عامر بن مالک۔ بسطام بن قیس۔ عامر بن طفیل اور عمرو بن عبدود (جو جناب علیؑ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا) خاص طور پر مشہور ہیں۔

[3] جنگ ذوقار میں جس میں عربوں نے ایرانی فوج کو شکست فاش دی عربوں کا نعرۂ جنگ یہ تھا "ہر شخص اپنی بیوی کی حفاظت کرنے کے لئے لڑے" (عقد الفرید)

[4] ترجمہ خدا بخش۔ عربک سولیزیشن۔

لکھتے ہیں:-

"اسلام نے عربوں کی زندگی کو پاکیزگی بخشی۔ انھیں راست باز اور وسیع المشرب بنایا۔ اُن کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیا اور انھیں ہمہ گیر مروّت سے روشناس کرایا۔ اُن میں نیکی اور شجاعت کی وہ رُوح پھونکی جس کے طفیل وہ فاتحِ عالم کہلاتے اور knigthood (جوانمردی) کے مثالی نمونے بن گئے۔"

صدرِ اسلام میں جناب علی مرتضیٰ شیوۂ مردانگی کے مثالی پیکر تھے۔ فلپ[1] حتی لکھتے ہیں:-

"مشورہ کے وقت صائب الرائے۔ فصیح و بلیغ۔ دوستوں کے وفادار۔ دشمنوں سے درگذر کرنے والے علیؑ اسلامی شرافت اور chivalry کا مثالی نمونہ تھے بعد میں جب تحریکِ فتیان نے مختلف رسوم و نشانات اختیار کیے جو ازمنۂ تاریک کی تحریکِ جوانمردی اور جدید سکاؤٹ تحریک سے ملتے جلتے تھے تو علیؑ کو اس تحریک نے اپنا پہلا فتیٰ اور جوانمردی کا مثالی نمونہ تسلیم کیا۔"

جنابِ علی مرتضیٰ نے عمر بھر کبھی کسی زخمی یا کمزور پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ وہ بڑے بڑے نامی شجاعانِ عرب سے نبرد آزما ہوئے لیکن پہلے وار کا اختیار ہمیشہ حریف کو دیا۔ دشمن کی عورتوں بچوں اور قیدیوں سے نہایت رفق و ملائمت سے پیش آتے تھے۔ آپ عموماً خچر پر سوار ہو کر میدانِ جنگ میں نکلتے تھے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو ارشاد فرمایا اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ مجھے جنگ سے بھاگ نکلنے کا کبھی خیال نہیں آیا کہ تیز رفتار گھوڑا رکھوں اور دوسری یہ کہ میں بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب نہیں کرنا چاہتا۔

آپ عورتوں پر ہاتھ اُٹھانے یا انھیں تلخ و ترش لہجہ میں مخاطب کرنے کو نہایت معیوب جانتے تھے۔ شامی فوج کے ایک سردار سفیان بن عوف نے عراق کے دیہات پر چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ نہتّے مردوں کو تہ تیغ کیا اور عورتوں کی بے حرمتی کی۔ آپ نے یہ سُنا تو بہت افسوس کیا اور فرمایا "مجھے تو یہاں تک خبر ملی ہے کہ اس لشکر کا ایک آدمی مسلمان عورت کے گھر میں اور دوسرا ذمی عورت کے یہاں گھس جاتا تھا اور اس کے خلخال۔ دست بند۔ گلوبند۔ بُندے گوشوارے چھین لیتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی مرد مسلمان اس غم سے ہلاک ہو جائے تو اس پر تعجب نہیں کیا جا سکتا۔"[2]

آپ کی عالی حوصلگی اور شہامت کی یہ کیفیت تھی کہ جانی دشمنوں پر قابو پا کر انھیں معاف کر دیتے تھے۔ جنگِ جمل کے موقع پر مروان بن الحکم اور جنگِ صفین میں عمرو بن العاص کو شکست دے کر اُن کی جان بخشی کر دی۔ ان کے قتل سے وہ پوری تاریخ اسلام کے رُخ کو موڑ سکتے تھے لیکن آپ نے کبھی سیاسی مصالح پر شجاعانہ حوصلہ مندی اور وسعتِ قلب کو قربان نہیں کیا۔ انہی وجوہ کی بنا پر Oshorne. نے آپ کو اسلام کا Bayard. قرار دیا ہے اور مسلمانوں میں آپ کا شجاعانہ کردار ضرب المثل بن چکا ہے لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

ایران و روم کی فتوحات کے بعد اگرچہ مسلمان سلاطین عیش کوشی کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن انھوں نے شیوۂ جوانمردی کے آداب و شعائر کو فراموش نہیں کیا۔ منصور اور ہارون الرشید کے دنوں میں عورت کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ حریمِ خلافت کی شہزادیاں سر سے پاؤں تک غرقِ آہن ہو کر جہاد میں حصّہ لیا کرتی تھیں۔ عباسی خلفاء میں معتصم کی مثال نمائندہ حیثیت کی مالک ہے۔

---

[1] ہسٹری آف دی عربس۔ [2] نہج البلاغہ۔ [3] یورپ کی شجاعانہ رومانی داستانوں کا ایک ہیرو۔

ایک دن سرِ دربار کسی نے ذکر کیا کہ جب رومی سپاہی ایک سرحدی قصبہ پر حملہ آور ہوئے اور تاخت و تاراج شروع کی تو ایک مسلمان دوشیزہ کو زمین پہ گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ اُس مظلومہ نے بآوازِ بلند پکار کر کہا وامعتصما۔ یہ سن کر معتصم کا چہرہ جوشِ غضب سے تمتما اُٹھا اور وہ فی الفور گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے سرپٹ دوڑاتا ہوا دشمن سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اُس نے اُس دوشیزہ کی بے حرمتی کا کس قدر خوفناک انتقام لیا۔

الناصر عباسی نے نئے سرے سے تحریکِ جوانمردی کی تدوین کی۔ فلپ حتّی[1]، فخری اور ابن الاثیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "الناصر نے آخری اضطراری کوشش کی کہ خلافت کی عظمتِ رفتہ کو بحال کیا جائے …… وہ تحریکِ فتیان کا سرپرست و مُربی تھا جو chivalry کی قسم کی تحریک تھی۔ اُس نے اِسے از سرِ نو منظم کیا۔ اس جماعت کے ارکان علیؓ کو اس تحریک کا مؤسس سمجھتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے معززین شامل تھے اور ان میں آلِ علیؓ کی اکثریت تھی۔ اِس کے ارکان کو شمولیت کے وقت ایک خاص رسم ادا کرنا پڑتی تھی اور مخصوص قسم کا لباس زیب تن کرنا پڑتا تھا۔"

یورپ کے نیم وحشی قبائل صلیبی جنگوں میں مسلمان فتیان اور جوانمردوں کے اخلاقِ حسنہ سے روشناس ہوئے تھے۔ ول ڈیورنٹ نے ایک آرٹیکل میں اور لی بان نے تمدنِ عرب میں بڑی فراخدلی سے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ تحریکِ جوانمردی حروبِ صلیبیہ کے دوران میں ہی یورپ میں پھیلی تھی۔ لی بان[2] لکھتے ہیں۔

> "مسلمانوں ہی سے ملنے جلنے کی بدولت یورپ کے عیسائیوں نے اپنی وحشیانہ معاشرت چھوڑی اور پہلوانہ اخلاق اور اس کے کل فرائض یعنی عورتوں، بڈھوں، بچوں کا پاس، قسم کی پابندی وغیرہ کو انہی سے اخذ کیا۔ ایک بہت بڑے مذہبی مصنف بارتھلیمی سینٹ ہلیر اپنی کتاب متعلقہ قرآن میں لکھتے ہیں 'عربوں کی معاشرت اور اُن کی تقلید نے ہمارے زمانہ متوسط کے اُمرا کی زبوں عادتوں کو درست کیا اور یہ سردار بلا اس کے کہ اُن کی بہادری میں کچھ فرق آتا ایسے اخلاق سیکھ گئے جو انسان میں اعلیٰ درجہ کی وقعت اور قدر رکھتے ہیں۔ یہ امر نہایت مشکوک ہے کہ صرف عیسوی مذہب، وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو اُن میں ایسے اخلاق کیسے پیدا کر سکتا تھا۔"

اِن انقلاب آور جنگوں میں دُنیائے اسلام نے فتوت اور جوانمردی کے دو نہایت اعلیٰ اور ارفع نمونے پیش کئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور مملوک سلطان بیبرس۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کا کردار نہ صرف تاریخِ اسلام میں بلکہ تاریخِ عالم میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان مورخین سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مغربی اہلِ قلم نے اُسے خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا ہے حتیٰ کہ دانتے نے بھی جو مذہبی معاملات میں سخت متعصب[3] تھا اپنی مشہور نظم نغمۂ خداوندی میں صلاح الدین کو جنت میں جگہ دی ہے۔

---

[1] ہسٹری آف دی عربس۔ [2] تمدنِ عرب ترجمہ سید علی بلگرامی۔

[3] یاد رہے کہ دانتے نے جنابِ رسالت مآبؐ کو Inferns میں جگہ دی ہے۔

بیت المقدس کی فتح کا واقعہ اُس زمانے کے مغربی اور مشرقی آئینِ جوانمردی کا تقابلی موازنہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ جب عیسائی افواج نے بیت المقدس فتح کیا تو مسلمان جنگجوؤں کے ساتھ ان کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو بھی انتہائی سفاکی سے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ بقول ول ڈیورنٹ[1] ساٹھ ہزار سے زیادہ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ مریم عذرا کے نام لیواؤں نے ہزاروں مسلمان خواتین کی بے حرمتی کر کے اُنھیں قتل کر دیا۔ ہزاروں بچوں کو بازاروں کی دیواروں کے ساتھ کیلوں سے ٹھونک کر لٹکا دیا۔ خود مسیحی مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قدر خون بہایا گیا کہ بازاروں سے گذرتے وقت گھوڑوں کے سُم خون میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ اس کے برعکس جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کیا تو کئی دن فوج کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ شہر کے اندر ہزاروں عیسائی اہلِ سیف تھے۔ اُنھیں امان دی گئی اور اجازت بخشی گئی کہ اپنی عورتوں، بچوں اور ساز و سامان کے ساتھ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کئی روز تک قطار اندر قطار اپنا قیمتی مال و متاع لے کر رخصت ہوتے رہے اور سلطان کے کسی سپاہی نے آنکھ اُٹھا کر اُن کی طرف نہ دیکھا۔ آخر میں جب ملکہ سبیلا اپنی خواصوں کے ساتھ باہر نکلی تو سلطان نے بنفسِ نفیس آگے بڑھ کر اس کی مزاج پرسی کی اور افسوس کا اظہار کیا کہ ملکہ کو بڑی زحمت اُٹھانا پڑی۔ مورخین کا خیال ہے کہ سلطان نے ہزاروں جنگجو عیسائیوں کو آزاد چھوڑ کر فاحش عسکری غلطی کی تھی مگر یاد رہے کہ مسلمان شجاعوں نے کبھی دنیوی مصلحتوں کو اپنی فطری عالی ظرفی اور شہامت پر غالب نہیں آنے دیا۔ جب سلطان نے نابیرا کا قلعہ فتح کیا تو ریمنڈ طرابلسی جیسے خطرناک اور ظالم دشمن کی بیوی کو نہایت عزت و توقیر کے ساتھ خاوند کے پاس بھیج دیا۔ یہ ریمنڈ وہی شخص ہے جس کے ہاتھ بے شمار مسلمان مردوں اور عورتوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

صلیبی جنگجو دغابازی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کو آدابِ جنگ میں شمار کرتے تھے اور مسلمانوں کے قول و قرار کی پاسداری کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فتح عکہ کے موقع پر مشہور انگریز بادشاہ رچرڈ شیر دل نے امان دینے کے بعد ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی فتوحات کو ملک الظاہر بیبرس[2] نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ بیبرس اپنی شجاعت و بسالت کے لیے شہرۂ آفاق تھا۔ اس نے عین جالوت کی خونریز جنگ میں تاتاریوں کو شکست فاش دی تھی۔ بیبرس نے ساحلِ شام کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے جتنے قلعے تھے سب یکے بعد دیگرے تسخیر کیے۔ اس کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ میں شیر ببر کی طرح خوفناک اور عقابِ زریں کی طرح بیباک تھا لیکن لڑائی کے بعد دشمن کے زخمی سپاہیوں اور قیدیوں کے ساتھ نہایت رحم و کرم کا سلوک روا رکھتا تھا۔ عورتوں کو وہ بالخصوص بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُسے عربی ممالک کا کنگ آرتھر سمجھنا چاہیے۔ آج بھی مصر و شام کے قصبات میں داستان گو اُس کے کارنامے[3] گا گا کر سناتے ہیں۔ اور جھوم جھوم جاتے ہیں۔ سب سے پہلے مصر کے ممالیک نے ہی اپنی ڈھالوں اور وردیوں پر وہ نشانات نقش کیے تھے جو یورپ میں جا کر علامات خانوادگی (Heraldic signs) کے نام سے مشہور ہوئے۔ فلپ حتی لکھتے ہیں :۔

" درحقیقت ادارۂ جوانمردی (chivalry) کا ارتقا شام کے میدانوں میں عمل میں آیا۔ ہتھیاروں پر

---

[1] ایچ آر گب۔ [2] بیبرس ترکی میں شیر کو کہتے ہیں۔ [3] بیبرس کے رومان کو سیرت الظاہر کہتے ہیں۔

مسلمانوں نے علامات خانوادگی کنہ کرائے جوان سے میل جول کے باعث منقول ہوئے۔ دو گردن والا عقاب fleur-des-bis (گل زنبق) اور دو چابیوں کا نشان اس زمانے کے مسلمان جنگجوؤں کے ہتھیاروں کے نشانات تھے۔ ممالیک سلاطین کی فوجوں میں مختلف دستے ہوتے تھے جن میں امتیاز کرنے کے لئے ڈھالوں جھنڈوں اور زرہ بکتروں پر مخصوص نشانات نقش کئے جاتے تھے۔ سلطان بیبرس کا ذاتی نشان ابنِ طولون کی طرح شیر ببر تھا۔"

لی بان تمدن عرب میں لکھتے ہیں:-

"ممالیک کے لباس نہایت پر تکلف تھے اور ان کے ہتھیار بہت چمکیلے تھے اور ان پر وہ نشانات کھدے ہوئے تھے جن کی تقلید جنگ صلیبی کے عیسائیوں نے اپنے ہتھیاروں پر کی تھی۔"

ارنسٹ بارکر[1] لکھتے ہیں:-

"جنگ صلیبی کے طفیل علاماتِ خانوادگی کے اصول تمام مغربی ممالک میں ایک جیسے رواج پذیر ہوئے۔"

ممالیک مصر کے علاوہ دوسرے ترکی قبائل بھی مشرف بہ اسلام ہو کر عربوں کی تحریک فتوت سے بہت متاثر ہوئے۔ ترکان غز کے دو قبائل بہت مشہور ہیں سلجوقی اور عثمانی۔ ابتدا میں یہ قبائل نہایت خونخوار اور وحشی تھے لیکن قبولِ اسلام کے بعد ان کی قلب ماہیت ہو گئی۔ ترکوں میں فتیان کو اخوان کہتے تھے۔ اخوان نے ملک بھر میں جا بجا اقامت گاہیں تعمیر کر رکھی تھیں جو مسافروں کے لئے ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔ ابن بطوطہ نے دورانِ سفر میں بارہا اِن اقامت گاہوں میں شب باشی کی تھی۔ وہ اپنے مشہور سفرنامے عجائب الاسفار[2] میں لکھتا ہے۔

"اخوان تمام بلاد ترکمانیہ اور رومیہ کے ہیں۔ ہر بلد۔ شہر اور موضع میں ان کی اقامت گاہیں ہیں۔ تمام دنیا میں اِن جیسا کوئی بھی اس قدر مسافروں کی خاطر مدارات کرنے والا نہیں پایا جاتا۔ یہ لوگ مہمان نوازی۔ حاجات پورا کرنے۔ ظالموں سے بدلہ لینے۔ ایذا رسانوں اور شریروں کو قتل کرنے میں نہایت عجلت کرنے والے اور تیز دست ہیں۔ اخی اِن کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو اپنے ہم پیشہ[3] نوجوانوں اور مجرد لوگوں کو جمع کر کے ایک جتھا قائم کرتا ہے اور خود اُن کا پیشوا بن جاتا ہے۔ اس دستور کو فتوت بھی کہتے ہیں۔ اخی خانقاہ بنا کر اس میں فرش کرتا ہے۔ چراغ جلاتا ہے اور تمام مایحتاج فراہم کرتا ہے۔ دن میں وہ اپنے ساتھیوں سے معیشت میں مدد لیتا ہے۔ عصر کے وقت یہ لوگ جو کچھ کسی کے پاس جمع ہو جائے ساتھ لے آتے ہیں۔ اس سے پھل اور کھانا خریدتے ہیں جس کا زاد خانقاہ میں صرف ہوتا ہے۔ اگر اس دن کوئی مسافر نہ آتا ہو تو وہ سب اپنا کھانا جمع کر کے کھاتے ہیں پھر رقص و سرود سے تفریح کرتے ہیں اور دوسرے دن پھر کام پر چلے جاتے ہیں۔"

---

[1] Legacy of Islam

[2] جلد اول۔

[3] یورپ کا guild system اسی طریقہ سے مستعار لیا گیا ہے۔

دورِ غزنویہ کے اواخر اور عہدِ سلاجقہ کے اوائل میں یہ تحریک تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیل چکی تھی۔ آدابِ جوانمردی کے زیرِ عنوان اس عہد کا مشہور اہلِ قلم شہزادہ کیکاؤس بن اسکندر اپنی کتاب قابوس نامہ میں لکھتا ہے :۔

> "اصلِ جوانمردی سہ چیز است۔ اوّل آنکہ ہرچہ بگوئی بکنی۔ دوم آنکہ راستی خلاف نہ کنی۔ سیوم آنکہ شکیب را کار بندی۔۔۔ جوانمرد آں بود کہ او را از چند گونہ ہنر بود۔ یکی آنکہ دلیر و مردانہ بود و شکیبا بہر کاری و صادق الوعدہ و پاک عورت و پاک دل و بکس زیاں نکند و زبانِ خویش از بہرِ سود دوستانِ خویش روا دارد و از اسیراں دست بکشد و بر بے چارگی بہ بخشاید و بداں از بد کردن باز دارد و راست گوید و راست شنود و داد از تنِ خود بدہد۔ و بر آں سفرہ کہ نان خوردہ باشد بد نکند و نیکی را بدی مکافات نکند و زبان نیک دارد و بلا را راحت بیند۔"

ترکوں میں بالعموم اور ممالیک مصر میں بالخصوص ایک سپاہیانہ کھیل دوران مروّج تھا جو تحریکِ جوانمردی کے شعائر میں بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ اہلِ مغرب میں یہ کھیل Tourney یا Tournament کے نام سے رائج ہوا۔ یہ الفاظ بقول لی بان[1] لفظ دوران کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ اس کھیل میں دو شہسوار مقابلے پر نکلتے تھے اور میدان کا چکر (دوران) کاٹتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور جرید پھینکتے۔ ممالیکِ مصر کے عہد میں دو گروہ ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوتے تھے۔ دوران یا جرید کا کھیل انیسویں صدی کے اواخر تک مصر میں بہت مقبول رہا۔ ای۔ ڈبلیو لین پول لکھتے ہیں۔

> "جرید کا کھیل ترک اور مملوک جنگجو کھیلتے تھے۔ مصرِ صعید میں یہ کسی معزز شخص کی شادی کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑی دو جماعتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو مختلف دیہات یا قبیلوں سے انتخاب کئے جاتے ہیں۔ فریقین کی تعداد بارہ۔ بیس یا زیادہ بھی ہوتی ہے۔ سب کھلاڑی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ فریقین ایک دوسرے سے ہٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ درمیان میں کم و بیش پانچ سو فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایک فریق کا کوئی سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا دوسرے فریق کے پاس جاتا ہے اور مبارز طلبی کرتا ہے۔ دوسرے فریق کا ایک سوار اپنے ہاتھ میں چار۔ پانچ یا چھ جرید لے کر (کھجوروں کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی چھڑیاں جن کے سرے کند ہوتے ہیں اور ایک طویل قامت کے آدمی جتنی لمبی ہوتی ہیں) مبارزت کی دعوت دینے والے کے تعاقب میں گھوڑا ڈال دیتا ہے۔ اور اس سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر وہ اس سے ہاتھ بھر کے فاصلے تک قریب ہو جاتا ہے اور یکے بعد دیگرے اس پر جرید پھینکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ جرید دونوں طرف سے کند ہوتی ہیں اور ہاتھ اٹھا کر باریک حصے کی طرف سے پھینکی جاتی ہیں۔ ان سے اکثر گھناؤنے بلکہ ہلاک زخم بھی لگ جاتے ہیں۔ جس شخص پر جرید پھینکی جاتی ہے وہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے یا نیام میں بند تلوار سے وار بچاتا ہے یا اس کے گھوڑے کی عیار رفتاری اسے بچائے جاتی ہے۔ جب وہ اپنے ہمراہیوں کے پاس پہنچتا ہے تو جرید لے کر اپنا تعاقب کرنے والے کے درپے

---

[1] تمدنِ عرب

ہو جاتا ہے۔ یہ کھیل جو گذشتہ زمانے کے Tournament کی یاد دلاتا ہے اور جو قدیم بدوؤں کا کھیل تھا گھنٹوں تک جاری رہتا ہے[1]۔"

ان اقتباسات سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ تحریک جوانمردی مغرب میں رواج پانے سے پہلے ہر طرح اور ہر پہلو سے دنیائے اسلام میں مکمل و مرتب ہو چکی تھی۔ اور اس کی شرائط و لوازم۔ رسوم و شعائر۔ مخصوص ملبوسات۔ ذاتی نشانات۔ سپاہیانہ کھیل وغیرہ منضبط صورت اختیار کر چکے تھے۔ اس ادارہ کو مغربی ممالک نے شام، سپین اور صقلیہ سے مستعار لیا اور گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں اس کی اشاعت تمام یورپ میں ہو گئی۔ تاریخ تمدن کا یہ باب بڑا دلکش ہے کہ کس طرح شیوۂ جوانمردی نے یورپ کے اکھڑ وحشیوں کو تہذیب و شائستگی کی لطافتوں سے روشناس کرایا۔ ایسے وحشی جنھیں مہذب بنانے میں کلیسائے روم کی ایک ہزار سالہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔ صلیبی جنگجوؤں نے شام اور فلسطین کے میدانوں سے اس تحریک کے خد و خال کو مستعار لیا تھا۔ ہسپانوی عربوں کے میل جول نے انھیں اس کی برکتوں سے استفادہ کرنے کے بیش از بیش مواقع بہم پہنچائے۔

ہسپانیہ کی اسلامی تہذیب اگرچہ بنیادی طور پر مشرقی تہذیب کی ہی ایک شاخ تھی لیکن بعض معاملات میں اس میں چند ممتاز خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ تحریک جوانمردی نے ایک ملک گیر قومی ادارے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ قرطبہ۔ اشبیلیہ اور غرناطہ علم و عرفان۔ فلسفہ اور فنون لطیفہ کے علاوہ شیوۂ جوانمردی کے بھی مشہور مرکز تھے جہاں بقول ول ڈیورنٹ شمال کی عیسائی مملکتوں کے رؤسا اپنے بچوں کو آئین جوانمردی کی تحصیل کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ مورخ Viardot لکھتا ہے "chivalry کا ادارہ اپنی[2] تمام شرائط اور خصوصیات کے ساتھ حکم اور منصور حاجب کے عہد میں ترقی پذیر ہوا۔ بعد میں عیسائی ممالک نے اسے اپنا لیا۔"

ابن الخطیب نے بالتفصیل لکھا ہے کہ اس زمانے کی ادبی مجالس اور عسکری کھیلوں میں مسلمان خواتین نمایاں حصہ لیتی تھیں۔ عرب شہسوار اپنے بازوؤں اور ڈھالوں پر اپنے مخصوص نشانات لگا کر اور اپنی محبوبہ کا دیا ہوا رومال خود سے لہرا کر نیزہ بازی کے مقابلوں میں شریک ہوتے تھے۔ فرساں[3] اپنی محبوب خواتین کے حسن و جمال اور اپنے واردات عشق و شیفتگی پر پُرجوش نظمیں لکھتے تھے جن کا جواب خواتین شعر بہ شعر دیتی تھیں۔ اس عہد کی شاعر خواتین اور ادب نواز دلرباؤں کے تذکرے تاریخ کی کتب میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ ولادہ قرطبہ کی شہزادی اور مہجہ اس کی سہیلی شیدا بیاں شاعر تھیں۔ ان کی مجالس میں اس عہد کے مشاہیر شعرا بار پاتے تھے۔ اُن کے اشعار میں ایسے پرسوز جذبات اور والہانہ دل برشتگی کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ سیفو کے لیے بھی باعث رشک ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ زہرون بنت ابوبکر غسانی۔ حسانہ التمیمیہ بنت ابو الحسین۔ ام العلا شریفہ۔ اعتماد الرمیکیہ۔ الغسانیہ۔

---

[1] Manner and Customs of Modern Egyptions جرید کے بجائے بعض اوقات بغیر پھل کی برچھی کی ڈانڈ بھی استعمال کرتے ہیں۔

[2] ہسپانوی عرب شہسوار اور جوانمرد knight کو الفارس کہتے تھے۔ یہی نام شطرنج کے اس مہرے کا تھا جسے فارسی میں اسپ کہتے ہیں۔ شطرنج کے اس مہرے کا انگریزی نام knight ہے جو صحیحاً الفارس کا لفظی ترجمہ ہے۔ دوسرے مہروں کے ترجمے غلط ہیں جیسے فیل کا بشپ اور رخ کا کاسل وغیرہ۔

ام الحنا ۔ بجہ بنت المستکفی اپنے زمانے کی نغز گو شاعرہ تھیں ۔ وہ شعر و شاعری کی مجالس میں بے نقاب شرکت کرتی تھیں اور شعر سنا کر معاصرین سے داد پاتی تھیں ۔ اِن کے کلام کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عشقِ بے حاصل کی غمناک اور حسرت آگیں کیفیات کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

داستان گو قرطبہ اور غرناطہ کے کوچہ و بازار میں بہادروں کے قصے اور اُن کے معاشقے رباب کے ساتھ گا کر سُناتے تھے ۔ عہدِ وسطیٰ کے مغربی Trouvier-Troubadour اور Trobar اِنہی قصاص کے مقلد تھے ۔

فلپ حتی کہتے ہیں " Troubadour کا لفظ عربی لفظ طَرَب سے بنا ہے جس کے معنی ہیں گانا بجانا "[1] وِل ڈیورنٹ لکھتے ہیں " Troubadours کی موسیقی اور شاعری مسلم ہسپانیہ سے پروونس میں اور مسلم صقلیہ سے اطالیہ میں آئی تھی "[2]

یورپ اور امریکہ میں ایچ ۔ جی ۔ فارمر کو عربی موسیقی کے موضوع پر سند کا درجہ حاصل ہے ۔ اُن کے خیال میں بھی Troubadour کے لفظ کا اشتقاق عربی کے لفظ طَرَب سے ہوا ہے ۔ اِسی خیال کا اظہار جے ۔ بی ۔ ٹرنڈ نے کیا ہے ۔[3] یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کی رومانی ادبی تحریک کا منبع و مبدا ہسپانیہ کی عربی شاعری ہے مغربی شاعری میں rhythm کا عنصر موشح اور زجل کی تقلید میں داخل ہوا تھا جو عربی شاعری کی مشہور اصناف تھیں ۔[4] فلپ حتی نے صاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ قسطلیہ اور جنوبی فرانس کے گویوں ، مطربوں اور شاعروں نے پہلے پہل ہسپانوی عربوں کے زجل کی تقلید و نقالی میں رومانی نظمیں لکھنا شروع کی تھیں ۔ چنانچہ ادبیات یورپ کی عہد آفریں رومانی نظم Chauson de Rolaud موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے زجل کی ہی صدائے بازگشت ہے ۔ رومانی شاعری کا مرکزی موضوع جوانمردی تھا ۔ رومانوں میں ایسے جلیل القدر فرسان (knights) کے کارنامے پیش کئے جاتے تھے جو شجاعت ، فیاضی ، عالی حوصلگی اور عشقِ بے حاصل یا افلاطونی محبت کے مثالی پیکر ہوتے تھے ۔ افلاطونی محبت کا تصور بھی ہسپانیہ کی عربی شاعری سے ماخوذ ہے ۔ جنوبی فرانس کے گوّیے ان رومانی نظموں کو رؤسا کی محفلوں میں گا کر سُناتے تھے ۔

ارنسٹ بارکر لکھتے ہیں " نغمۂ رولاں اس شاعرانہ تخیّل کی تخلیق ہے جس کی تحریک اُن لڑائیوں سے ہوئی جو ہسپانیہ کے شمال میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئیں "[5]

وِل ڈیورنٹ ایج آف فیتھ میں لکھتے ہیں :-

" الفانسو دہم قسطیلی کے مسودات میں کئی تصاویر ہیں جن میں گوّیے عربی لباس پہن کر عربی ساز بجا رہے ہیں ۔ اِن گیتوں میں سے اکثر کی ہیئت عربی ہے ۔ ممکن ہے کہ Troubadours کی موسیقی و شاعری کے ابتدائی موضوعات اور اسالیب کے ماخذ موزوں کے وہ گیت ہوں جو عیسائی مہاجرین کے راستے جنوبی فرانس میں داخل ہوئے تھے "

---

[1] ہسٹری آف دی عربس ۔ [2] ایج آف فیتھ ۔ [3-4-5] Legacy of Islam

قسطیلیہ کا قومی رزمیہ نظم 'سِڈ' ہے۔ سِڈ کا لفظ وہی ہے جو عربی میں سیّد بمعنی سردار ہے۔ سِڈ ایک عیسائی جنگجو اور مقدر آزما تھا جو اپنے جتھے کے ساتھ کبھی عیسائی اور کبھی مسلمان حکومتوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ اس کے سپاہی اسے Ya-mio-cid کہہ کر پکارتے تھے جو اصل میں 'یا سیّدی' ہے۔ اس نظم میں عربی اصنافِ شعر کے اسالیب نمایاں طور پر موجود ہیں۔

ہسپانوی زبان کی سب سے پہلی کتاب جو آئینِ جوانمردی پر لکھی گئی Historia del Cavellero Cifar ہے جو ۱۲۹۹ء اور ۱۳۲۵ء کے درمیان لکھی گئی تھی۔ Cifar دراصل عربی لفظ سفر ہے۔ اور Cavellerio Cifar کا ترجمہ انگریزی میں Knight Erraut سے کیا گیا ہے۔ اس کی بیوی کا نام Garema ہے جو صریحاً کریمہ ہے[1]۔

ایچ[2] اے۔ آر۔ گب کے خیال میں فرانس کے جنوبی صوبوں میں گیارھویں صدی کے اواخر میں شاعری کی ایک نئی صنف کا ظہور ہوا تھا۔ اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے اس عہد کی ملکی شاعری یا قدیم یونان و روم کی شاعری میں اس قسم کی روایت ناپید ہے۔ اور یہ صریحاً ہسپانیہ کے عربی زجل سے متاثر ہوئی ہے۔ اس میں ایک قسم کے مسلکِ نسائیت (cult of the dame) کے آثار ملتے ہیں جن میں عورت کو نہایت ارفع اور رفیع مقام دیا گیا ہے۔ اس صنف میں عشقِ ناکام کے جذبات نہایت اچھوتے اور شگفتہ اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں اور محبوبہ سے ایسی جنون آمیز شیفتگی کا اظہار کیا گیا ہے کہ مجازی محبت میں عارفانہ اور متصوفانہ وارفتگی کی کیفیات رچ بس گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے نیم وحشی اور اجڈ اہلِ مغرب عورت کو محض کنیز سمجھتے تھے۔ مہذب مقتدایانِ مذہبِ عیسوی کے نزدیک وہ معصیت و ابلیسیت کا پیکرِ مجسم تھی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اس عہد کی مغربی رومانی شاعری میں مسلکِ نسائیت بغیر کسی بیرونی تحریک کے بار نہیں پا سکتا تھا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ابنِ قزمان کے زجل نے ہی پرووِنس کے عیسائی گویوں اور شعرا کو اس نئی صنف پر طبع آزمائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ پروفیسر میکیل نے صاف لکھا ہے "جس طرح یورپ نے مذہب صیہون سے لیا تھا اسی طرح رومان عربوں سے مستعار لیا ہے[3]"۔

دانتے کی شہرۂ آفاق نظم ڈیوائن کامیڈی کے عربی مآخذ پر مشہور ہسپانوی مصنف میگوئیل آسین[4] نے محققانہ بحث کی اور شواہدِ قاطع سے ثابت کیا ہے کہ اس کے جنت و جہنم کے اسفار و مناظر عربی کتب سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اس کے خیال میں دانتے شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی کی تصنیفات اور ملفوظات سے خاص طور پر متاثر ہوا ہے۔ نظرِ غور سے دیکھا جائے تو ڈیوائن کامیڈی کا مرکز و محور بھی مسلکِ نسائیت (cult of the dame) ہے جس نے ازمنۂ وسطیٰ کے اکھڑ عیسائیوں کو عورت کا احترام کرنے کے آداب سکھائے تھے۔ اس نظم میں دانتے کا عشق جسمانی تقاضوں سے برتر ہو کر منزہ شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس کی محبوبہ بیطریچے ایک پیکرِ نورانی بلکہ ایک متصوفانہ نصب العین بن جاتی ہے۔ یاد رہے کہ

[1-2] جے۔ بی۔ ٹرنڈ لیگیسی آف اسلام۔

[3] Lectures on Poetry

[4] Islam and the Divine comedy

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے بھی عالمِ شباب میں سکین الدین کی حسین و جمیل بیٹی نظام سے عشقِ ناکام کیا تھا۔ یاس و حرماں کی حالت میں انھوں نے نظام کے فراق میں پُرسوز نظمیں لکھیں جو آج بھی قاری پر وارفتگی کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ دوسری خصوصیات کے توارد کے پیشِ نظر یہ سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا اطالوی حسینہ عربی ناطمودہ کا ہی نقشِ ثانی تھی ؟ ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج تاریخِ عالم کا ایک المناک باب ہے۔ اس اخراج سے سپین اور جنوبی فرانس کا معاشرہ اس لطافت اور شائستگی سے یکسر محروم ہو گیا جس کی اِن آوارگانِ دشتِ غربت نے صدیوں تک پاسبانی کی تھی۔ چنانچہ اِسی زمانے سے ادارۂ جوانمردی بھی روبہ تنزل ہو گیا۔ اور بالآخر ختم ہو گیا لیکن مغربی ممالک میں آج بھی احترامِ نسواں کی صورت میں اس کے لطیف اثرات باقی ہیں۔ رہا اسلامی ممالک کا حال تو یہاں مسلمان عورت کی موجودہ زبوں حالی کو دیکھ کر ڈبلیو۔ سی۔ سمتھ سے ہمنوا ہو کر کہنا پڑتا ہے

" وہ **chivalry** جو عربوں نے یورپ کو دی اور جسے خود فراموش کر دیا "[1]

---

[1] Modern Islam in India

قرۃ العین طاہرہ

منظور الٰہی

زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہو کر میں نے کئی بار محبت کی اب وہ چھٹپنے کی محبت ہو یا عنفوانِ شباب کی، شمالی برما کے دلآویز مرغزار و چکیبری کی پُر اسرار گھاٹیاں ہسپانوی مور سبھی پر اُس محبت کا سایہ پڑا تھا، وہ والہانہ شیفتگی کبھی کلامِ اقبال کے ساتھ ہوئی تو کبھی عفت و عصمت کی دیوی سیتا کے ساتھ، میں نے کئی بار سوچا وہ آتش نوا جسے زمانہ قرۃ العین کے نام سے جانتا ہے جسمانی ہیولیٰ میں کیسی ہوگی، وہ مقہور و معتوب راندۂ درگاہ جو قزاقوں اور چوروں کی طرح بھاگی بھاگی پھرتی تھی جس کے لیے کوئی کنجِ عافیت نہ تھا اور وہ یارانِ صادق الوفا کیسے تھے جنہوں نے اُسے پناہ دی یہ تڑپ رہی کہ عالمِ رؤیا ہی میں اُس روحِ جلیلہ کا دیدار کر سکوں جو جسدِ خاکی میں سیماب گرگ اور لعل در آتش تھی، اگر انسان کبھی ماضی کی طرف لوٹ سکا اور سرودِ رفتہ کے ساتھ اُن نظاروں کو بھی آواز دے سکا جو اب تاریخ کے سینے میں آسودہ ہیں اور جن کی حیثیت اساطیر کی ہے تو میں وہ جانسوز نظارہ دیکھنے کی تمنا کروں گا جب طاہرہ کو پا بجولاں سلطانِ وقت کے سامنے لایا گیا اس حال میں کہ نو اختیار مسلک کے دفورِ عشق میں وہ آپے سے باہر تھی، فرطِ غضب سے اُس پر جنونی کیفیت طاری تھی زلفیں پریشان ہو کے اڑ رہی تھیں آنکھیں شعلہ بار تھیں اور منہ سے کف جاری تھا، ناصر الدین شاہ قاچار ہزار سنگدل سہی لیکن

تعارف: منظور الٰہی صاحب ٹرپل ایم اے ہیں، ایک ایم اے فارسی میں کیا، دوسرا تاریخ میں اور تیسرا اخلاق و شرافت میں۔ سی۔ ایس۔ پی ہیں، مگر ایسے افسر نہیں جنہیں ملنے سے پہلے اپنا آدھ پاؤ خون خشک کرنا پڑے۔ بلکہ ایسے جیسے آپ اپنے کسی ہمدرد اور دیرینہ دوست سے ملے ہوں۔ انہیں اپنا کم قوم کا زیادہ غم رہتا ہے۔ اسی شوق میں اپنے ہمنواؤں، امیروں اور وزیروں سے ناخوش رہتے ہیں اور اُن پر ملائم مگر معناً تند و تیز تنقید کرتے رہتے ہیں اور اتنے درد کے ساتھ باتیں کرتے ہیں جیسے ان کی مرضی کے مطابق سب کچھ ٹھیک نہ ہو گیا تو اچھا نہ ہوگا۔ آجکل یہ ایڈمنسٹریٹر دیہی ایڈ ہیں یہ منصب ان کی مرضی کے عین مطابق ہے اس منصب میں افسرانہ ٹھاٹھ تو کچھ نہیں ہیں۔ مگر اس میں رہ کر کچھ نہ کچھ تعمیری کام ضرور کیا جا سکتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ مزے میں ہیں اور مثال دیا کرتے ہیں کہ پہلے ہندوستان میں اس عہدہ پر ایس کے ڈے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے لیے اتنا کام کیا کہ آج وہاں کے دیہات وہ دیہات نہیں رہے بلکہ ان میں زندگی کی تمام مسرتیں اور شادمانیاں جاگ اٹھی ہیں —— یہ مُلاؤں کے بنائے ہوئے اسلام کے دشمن، فارسی ادب کے دلدادہ، اقبال کے حافظ، اور ادب کے طالب علم ہیں!

مدیر

من نظر کی تاب نہ لا سکا اور کہہ اٹھا

بگذارید کہ صورتِ زیبا دارد

کہاں کا فرمانِ موت اور کہاں کا فتویٰ، علما ہزار کہیں کہ کُشتنی و گردن زدنی ہے ناصرالدین پہ اُس ساحرہ کا جادو چل چکا تھا، جب اُس کو زندہ جلایا جا رہا تھا تو شعلے زرک زبان سے اُس کی بوٹیاں نوچتے رہے اور بایِّ ذنب قتلتی بایِّ ذنب قتلتی کی صدا بلند ہوتی رہی۔ کبھی رات کی گہری خاموشی میں ذہن کے گوشے گوشے میں یہ آتشیں نغمہ گونج اٹھتا ہے۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رُو برُو

شہاب نے آکسفورڈ کے ایک فارغ التحصیل عرب کا قصہ سنایا تھا جن کا برسوں سے مدینہ میں قیام تھا، ایک عام مزدور کی طرح مشقت کرتے اور عشقِ مصطفیٰؐ میں غرق رہتے۔ ان سے جب کسی نے کہا کہ گنبدِ خضریٰ کا رنگ روغن مدھم پڑ گیا ہے تو انہوں نے کہا اچھا مدھم پڑ گیا ہے؟ نچلے حصے کے نظارے میں اتنے محو تھے کہ چھت پر نظر ڈالنے کی نہ فرصت ملی نہ جسارت کر سکے۔ "عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا۔ گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب"۔ اور یہاں یہ خود اعتمادی۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رُو برُو   شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو

حضرت موسیٰ اُس چرواہے پر خشمگین ہوئے تھے جو اپنے محبوب کی زلفوں میں شانہ کرنے اور جُوتے سینے کی تمنا کرتا تھا اور کہتا تھا اے خدا تو کہیں مل جائے تو خود لا کے تجھے مزے مزے کے کھانے کھلاؤں اور سامنے بیٹھے دیکھا کروں۔

اے خدائے من فدایت جانِ من   جملہ فرزندان و خان و مانِ من
تو کجائی تا سرت شانہ کنم   چارقت را دوزم و بخیہ زنم
سازم و آرم بپیشت صبح و شام   از من آوردن ز تو خوردن طعام
اے فدائے تو ہمہ بزہائے من   اے بیادت ہی ہی و ہیہائے من

چرواہے کے بلاواسطہ تخاطب میں ایک دہقان کی سادگی ہے۔ اور ہزاروں تمنائیں اور تشنہ آرزوئیں اس شعر میں دست و گریبان ہیں۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رُو برُو   شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مُو بمُو

اس کے باوجود خطاب میں بلند حوصلگی اور بے باکی ہے۔ زہے قسمت اگر کبھی رُو برو آ جاؤ۔

گر شبے دست دہد وصلِ تو از غایتِ شوق
گھر اُڈیں ستے سارے دکھ دساں

کہاں عینِ وصال میں تشنگیٔ آرزو اور حسرتِ قرب
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بکنارِ ما

اور کہاں شرحِ دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو۔

محبت کی اس ہمہ گیری کے سامنے وہ عاجز تھی، محبت اُس کی رگ رگ نس نس میں سرایت کر گئی تھی۔ اُس نے سپر ڈال دی تھی اور شوق سپردگی میں اقرار کر لیا تھا۔

مہرِ تُرا دلِ حزیں بافتہ بر قماشِ جاں ؛ رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بتار پو بہ پو !

کتنی بلندی اور کتنی عظمت تھی اُس کے عشق میں، یہ نظم آج بھی دردمندوں کے لیے تازیانہ ہے۔ کتنے بدبخت تھے وہ لوگ جنہوں نے اُسے زندہ جلا دیا، وہ جو خود اپنی آگ میں شبانہ روز جلتی تھی اس کے لیے چتا تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی اُسے تو چناروں کے سائے تلے دفن کر دیا تھا جہاں برف آہستہ آہستہ گرتی ہے، جہاں گہرے نیلے آکاش پر پورنماشی کا چاند مہربان ماں کی طرح سارے منظر کو ٹھنڈک بخشتا ہے جہاں طاغوتی قوتوں کا گذر نہیں جو ساری عمر اس کی جان کے درپے رہیں

آج بھی طاہرہ کی روح بیتابانہ منڈلاتی ہوگی۔ اُس شے کی تلاش میں جو اُسے اُس دنیا میں نہ مل سکی۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نرسد ! کفر آوردم و در عشقِ تو ایمان کردم

وہ ایک عظیم شاعرہ ہی نہیں تھی ایک عظیم انسان بھی تھی۔

(۲)

تم میری روح کے دیدار سے کیا لو گے میری یاد مختلف آلائشوں سے ملوث ہے، دنیا کی کمزوری معاف نہیں کیا کرتی لاکھ نیکیوں کو بھلا کر ایک عیب کو لے لیتی ہے۔

میں نے ناز و نعم کے گہوارے میں آنکھ کھولی، قدرت کا کوئی انعام ایسا نہ تھا جو مجھے ودیعت نہ ہوا ہو، جاہ و حشم محلات، دینی و دنیوی علوم حسنِ خداداد، ذہانت و فطانت، شعر کہنے کے لیے موزوں طبیعت، والد نے مجھے اُمِ سلمٰی پکارا، میرے اُستاد کاظم رشتی نے قرۃ العین کا نام دیا اور بہاء اللہ نے طاہرہ کے لقب سے نوازا، میرا والد جو صدر بہ قزوین کا مجتہدِ اعظم تھا بڑا علم دوست انسان تھا، اُس نے مجھے علومِ متداولہ سے روشناس کرانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، قزوین سے کچھ دُور ایک گاؤں اُس نے مجھے بطور تحفہ دیا تھا جس کا نام میں نے بہجت آباد رکھا جب شہری جھمیلوں سے طبیعت گھبراتی ہے اس گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈتی اور مطالعہ میں گم ہو جاتی۔

سید کاظم رشتی ایک جیّد عالم تھے ایک مدت میری اُن سے خط و کتابت رہی، اُن کی بدولت بہت سے مسائل روشن ہوئے لیکن کربلا جا کر اُن کے درس میں شامل ہونے کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ میرے وہاں پہنچنے سے دس روز قبل اُن کا انتقال ہو چکا تھا کربلا میں اُن کے جانشین کی حیثیت سے میں نے پس نقاب درس دیا۔ جب میں نے سنا کہ میری بہن مرضیّہ کا خاوند ایک طویل سفر پر جا رہا ہے تو میں نے اُسے ایک سربمہر خط دیا کہ اُس موعودہ ہستی کو پہنچا دے جس کی مجھے مدت سے جستجو تھی، مجھے یقین تھا کہ مرزا محمد علی اُس مردِ کامل کو ضرور ملے گا۔ جب باب کو میرا خط ملا تو اُس نے مجھے اٹھارہ مُریدانِ خاص کے حلقہ میں داخل کر لیا، باب ہمیں "حروفاتِ حیّ" کہتا تھا اور اپنے آپ کو نقطہ" گو عالمِ رؤیا میں متعدد بار دیدارِ دوست سے شاد کام ہوئی اور میری چشمِ بصیرت نے سب سے پہلے اُسے پہچانا لیکن محرومی قسمت دیکھیے، "حروفِ حیّ" میں سے ایک میں ہی تھی جو عالمِ آب و گل میں اُس کے دیدار سے محروم رہی۔ باب کے فراق میں میں نے متعدد نظمیں لکھیں، میرے شوق کا اندازہ اس شعر سے کرو۔

لمعاتُ وجهِكَ أشرقت وشعاعُ طلعتِكَ اعتلىٰ
زچہ رو الستُ بربکم نزنی بزن کہ بلیٰ بلیٰ !!

جب باب نے ایک نئے مسلک کی داغ بیل ڈالی تو ایران برائے نام مذہبی ریاست تھی، دراصل حکومت کی اساس ظلم، تشدد اور جباریت پر تھی جس سے مذہب کو دور کا واسطہ نہ تھا لاقانونی کا دور دورہ تھا، شاہ ایک مطلق العنان حکمران تھا، وزیر اور صوبائی گورنر ایک طرف قریہ کے نمبردار تک میں شاہانہ آمریت کی جھلک دکھائی دیتی تھی کوئی عدالت ایسی نہ تھی جو شاہ کے احکام میں مداخلت کر سکے، سزائے موت کے لیے نت نئے طریقے ایجاد کر رکھے تھے، صلیب پر لٹکا دینا، توپ کے دہانے سے باندھ دینا، زندہ درگور کر دینا، انسانی جسم کی مشعل بنانا، تیل میں تل دینا، دو درختوں کے سرے جھکا کر انسان کو جکڑ دینا پھر گرفت ڈھیلی کر دینا، ان کربناک حالات میں جب قدریں مٹ رہی تھیں اور انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ باب نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا، وہ دعویٰ جس کے لیے ملت اسلامیہ مدت سے گوش بر آواز تھی، اس نے کہا کہ وہ ایک 'باب' تھا اور ایک مظہر برتر کو اس باب میں سے گزر کر عالم ایجاد میں ظاہر ہونا تھا۔ جن بدعتوں کا باب نے اعلان کیا گو ان کا تعلق صرف مذہب سے تھا لیکن ان کے نتائج برسر اقتدار طبقہ کے لیے دور رس بلکہ ہولناک ہو سکتے تھے، یہ کہہ دینا کہ شرعی قانون میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے، خود شریعت پر ایک ضرب کاری تھی۔ باب کی شدید مخالفت لازمی تھی خصوصاً اس طبقہ کی طرف سے جو اس طرز حکومت سے فیض یاب تھا، بابیوں کا شیرازہ منتشر کر دیا گیا، باب کو سزائے موت ہوئی، اس کے ساتھی چن چن کر قتل کر دیے گئے۔ ماسوا بہاء اللہ کے جسے جلاوطن کر کے ایک دوسرے ملک میں محبوس کر لیا گیا۔

جب میں نے تبلیغ شروع کی ایران خود بین ملاؤں سے بھرا ہوا تھا جو جاہل مطلق ہوتے ہوئے ارسطوئے زمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، زندگی ایک خاص ڈگر پر چل رہی تھی۔ لوگ انسان کو انسانیت کی کسوٹی پر پرکھنا نہ چاہتے تھے۔ تمہارے زمانے کی طرح ظواہر کی ادائی کو کمال معراج سمجھ لیا گیا تھا، منبر سے گلا پھاڑ پھاڑ کر اخوت کی تعلیم دینے والے مسجد سے باہر مساوات کی تعلیم کیسے معاف کر دیتے۔ جب اہل زر کو اپنی ناجائز املاک اور غاصبانہ تصرفات کی فکر پڑ جائے تو وہ مذہب کی آڑ سے ڈھال ہی نہیں بناتے بلکہ اسے پگھلا کر برچھیاں اور سنانیں بھی تیار کر ڈالتے ہیں، میری تقریروں کی روانی سنگدلوں کو رام کرتی رہی، مکر و فریب کی آہنی زنجیریں پگھلتی رہیں، اس سیال سے ایک انی تیار ہوتی رہی جسے بالآخر میرے سینے میں پیوست ہونا تھا۔ جب میں ماضی بعید کی جھلستی راتوں کا نظارہ کرتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں کہ نئے مذہب نے میری نس نس میں چنگاریاں بھر دی تھیں میں نے سوچا تھا کہ سفاکوں کی چیرہ دستیوں کا، کم ظرف بوالہوس ملاؤں کا، پسے ہوئے عوام کی بیکسیوں کا یہ مشرب واحد علاج ہے۔ شاید ہر وہ شخص جسے اپنے مذہب سے اک گونہ عقیدت ہو یوں ہی سوچتا ہے، مسیح موعود اور مہدی آخر الزمان آتے رہے، چند لوگ انہیں مانتے اور بیشتر جھٹلاتے رہے، عقائد کی چتا جلتی رہی اور اس کی راکھ سے نئے دعاوی اٹھتے رہے پھر تمہاری دنیا میں "ازم" کا دور شروع ہوا جو چل رہا ہے۔ ایک "ازم" دوسری "ازم" کو مات دیتی رہی اور عوام شطرنج اس کھیل میں محض پیادے رہے، اشارے کے منتظر بے جان بے روح

جب کربلا میں علما میری بڑھتی ہوئی مقبولیت برداشت نہ کر سکے تو درپے آزار ہوئے، میں نے بغداد کی طرف ہجرت کی یہاں بھی آتش نوائی نے دلوں کو موہ لیا اور میرے خطبات جو علما کی اجارہ داری کو کھلا چیلنج تھے انہیں ایک آنکھ نہ بھائے۔ جب میں نے انہیں مناظرے کی دعوت دی تو انہوں نے پہلو تہی کی اور لوگوں کو ورغلا کر حفظ امن کا مسئلہ بنا ڈالا حتیٰ کہ مجھے مفتی بغداد کے ہاں پناہ لینی پڑی۔

میں نے ان چند برسوں میں کیا کھویا کیا پایا یہ تو شاید کبھی نہ سمجھا سکوں لیکن جب میں قزوین لوٹی تو میری شخصیت یکسر بدل چکی تھی، میں بہت دور نکل آئی تھی۔ لوٹ آنا میرے بس کی بات نہ تھی، میرا عم زاد و میرا شوہر بیچارہ ملا محمد ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں" نہ سہی عقل و ذہانت میں مفلس و قلاش ضرور تھا۔ وہ میرے برق تاب خیالات کا ساتھ کہاں دے سکتا تھا، پھر وہ باب کا منکر تھا، ہماری علیحدگی ناگزیر تھی، انہی

مظلوم ملا تقی قتل ہوا۔ ملا محمد نے اپنے والد کا خون میرے سر تھوپا اور سازش میں شریک ہونے کا بہتان لگایا۔ چند روز بعد اصلی قاتل نے اپنے آپ کو حکام کے حوالے کر دیا لیکن پھر بھی ملا محمد کا دل ٹھنڈا نہ ہوا اُس کی آتشِ انتقام بھڑکتی رہی۔ ایک روز گریبان چاک کر کے محمد شاہ کے حضور حاضر ہوا تو یوں فریاد کی "ملا تقی قتل کر دیا گیا۔ کیا اس کا خون رائیگاں جائے گا؟ محمد شاہ نے کہا "اصل قاتل بھاگ گیا ہے، شریعت کا کوئی قاضی اُس کی بجائے کسی معصوم کو سزائے موت نہیں دیگا۔ اگر تمہیں غیر قانونی طور پر آتشِ انتقام بجھانی ہے تو شریعت کو بیچ میں کیوں لاتے ہو" یہ تھی کہانی میرے جیون ساتھی ملا محمد کی۔

اب میں مخفی طور پر بہاء اللہ کی مہمان تھی، بہاء اللہ وزیر زادہ تھا، امیر کبیر تھا، وہ بھی میری طرح بہاء اللہ کے عشق میں اسیر تھا اور اُس کے دیدار سے محروم، میں باب سے ملنے کے لیے بیتاب تھی اور ماکو جانا چاہتی تھی لیکن یہ ناممکن العمل تھا، بہاء اللہ نے مجھے اِس ارادے سے باز رکھا۔

بدشت کے مقام پر باب کے متبعین نے اُس کے "قائم" اور امام موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس موقع پر چند اہم روایات سے منکر ہونے کا اعلان بھی کیا گیا، بدشت سے لوٹتے ہوئے مجھے راستے میں گرفتار کر لیا گیا۔ اب میں محمود خاں کلانتر کے گھر میں نظر بند تھی، میں وہاں تین سال رہی۔ قید کچھ ایسی سخت بھی نہ تھی۔ میں صاحبِ خانہ کی مستورات سے بے تکلف مل لیتی تھی بلکہ انہیں وعظ و نصیحت بھی کرتی، کلانتر کی بیوی نے میرا تعارف اونچے طبقے کی بیگمات سے کروا دیا تھا، وہ جوق جوق میری باتیں سننے کے لیے آتیں اور بکمال تلطف پیش آتیں۔ سچ تو یہ ہے قیامِ طہران کے دوران میں میری شہرت کا آفتاب نصف النہار پہ تھا۔

دن شبنم آسا گزر رہے تھے کہ ایک عاقبت نااندیش بابی نے باب کی شہادت کا بدلہ لینا چاہا اور غم و غصہ سے پاگل ہو کر ناصرالدین پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ شاہ بچ گیا لیکن گورنمنٹ نے سب بابیوں کو اس سازش کا ذمہ دار گردانا، بابی چن چن کے گرفتار کیے گئے اور اُن میں سے بیشتر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ محمود خان کلانتر نے حقِ وفاداری ادا کیا اور شاہ اور وزیر اعظم کو یاد دلایا کہ میں اُس کے گھر میں نظر بند ہوں، شاہ اور وزیر میری بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی سے خائف تھے اور بغیر مقدمہ چلائے سزائے موت دینے سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ طہران کے دو مجتہد اس کام پر مامور کیے گئے کہ وہ میرے ساتھ بحث و تمحیص کے بعد طے کریں کہ میں کس حد تک قصوروار ہوں لیکن کہاں کی بحث اور کہاں کی دلیل مآل معلوم تھا، انہوں نے فیصلہ دیا کہ یہ عورت خود گمراہ ہے، دوسروں کو گمراہ کرتی ہے، مفادِ عامہ اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے سزائے موت دی جائے۔ گورنمنٹ نے یہ فیصلہ منظور کر لیا اور اُس کی تشہیر بھی کر دی، شہادت سے ایک روز قبل ناصرالدین شاہ نے مجھے اپنے حضور طلب کیا اور پوچھا "تم باب کی کیوں معتقد ہو" میں نے جواب دیا

ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین

وہ بھی کیا دن تھا۔ مجھے خبر مل چکی تھی کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے، اُس روز میں نے عرقِ گلاب سے غسل کیا، بہترین سفید جامہ زیب تن کیا، فرداً فرداً اہلِ خانہ کو الوداع کہا اور انہیں بتا دیا کہ اُس رات میں ایک طویل سفر پہ جانے والی تھی جب میرے قاتل مجھے لینے آئے تو میری تیاری مکمل تھی۔

اے اجل اے ساعتِ عشرت قریں — زندگی کی اے وفائے آخریں
آ میری جاں تجھ پہ جاں قربان ہے — ایک مدت سے تیرا ارمان ہے
آ گئی ایک بار تو میرے لیے — پھول ہیں گوندھے گئے تیرے لیے
آ میری آنکھوں میں آنسو بن کے آ — چادرِ گل میں میری بو بن کے آ
اپنا بیگانہ نہ ہوگا جب کہ پاس — لوگ جسکو کہتے ہیں جلوے کی رات

یوں کنول بن کے کھلوں گی رات میں ! اپنے مالک سے ملوں گی رات میں

ڈی گرینوں نے میرے جلائے جانے کا قصہ درست نہیں لکھا قدرت کو یہی منظور تھا کہ ایک عظیم شاعرہ جس کی روح اُس کے جسم سے زیادہ خوبصورت تھی ایک مست شراب بدکار حبشی کی ہولناک دست درازی کا شکار ہو اور اُس کی نیم جان لاش ایک اندھے کنوئیں میں دھکیل کر پتھروں اور کوڑے کرکٹ سے کنواں پاٹ دیا جائے ۔

بیخود ز لذتِ ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست ،

میرے ہمعصر سوچتے ہوں گے میں پاگل تھی ، عزت ، دولت خاوند اولاد جاہ و حشم تج کے میں نے کیا پایا ؟ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ زندگی وقف کر دینے ہی میں حقیقی مسرت کا راز پنہاں ہے ، کسی میں کھو کر ہم اپنے آپ کو پا لیتے ہیں

در دلِ ما غمِ دُنیا غمِ معشوق شود بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما ،

لیکن جب غمِ دنیا اپنے سے ماسوا ہو تو خامی کہاں رہی ، میرا رنج و غم تنگ نظر مُلاؤں کی کوتاہ بینی اور عوام فریبی کے خلاف جذبۂ حقارت ایک ناقابلِ برداشت سوشل سسٹم کے خلاف بغاوت یہ سب باب کے عشق میں بدل گئے ، میرے شوق کی ہمہ گیری اُس پیغام کی ترویج کے لیے وقف ہو گئی جس کا باب مظہرِ اتم تھا ، باب ایک مہاپرش کی صحیح عکاسی کرتا تھا اُس کے کردار میں میں نے وہ آدرش پا لیا تھا جس کی جستجو برسوں سے تھی ۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی دُنیا کوئی کمزوری معاف نہیں کرتی ، لاکھ خوبیوں کو بھلا کر ایک عیب پکڑ لیتی ہے جسم روح کی جنت کے لیے "زینۂ نور" سہی لیکن کہیں جسم کی تطہیر کو بے جا اہمیت تو نہیں دی گئی ، جسم کی تطہیر کے داعی روح کی تطہیر سے نا آشنا ہیں ، محض رسمی عبادات کے پجاری تزکیۂ قلب اور علوئے نفس کی لذات سے نا آشنا ہیں ، تسبیح کے دانوں کی گردش ہمیشہ رقتِ قلب کا ساتھ نہیں دیتی ، ایک ایک دانہ گرتا ہے ، ڈھلکتا ہے ، عادت سے مجبور ،

خدا کے نیک بندے کون ہیں ؟ کسی کے دل میں خلفشار ہو یا نہ ہو میرے ذہن میں تو نہ تھا ، خدا کو اس سے زیادہ محبوب چیز کیا ہو گی کہ انسان مردم آزاری سے احتراز کرے اور اُس کی مخلوق کے لیے جو کچھ بن پڑے کر ڈالے ، خود غرضی اور ہوسناکی سے بالاتر ہو کر ، اگر مجھے محمد علی بارفروش سے محبت ہوئی تو کسی کو اس سے کیا غرض ؟ اپنی ذاتی کمزوریوں کے لیے میں باری تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں اور شانِ کریمی سے معافی کیا بعید ہے لیکن حقوق العباد غصب کرنے والے ، اپنے بھائی کا خون چوسنے والے ، اوقاف کے محاصل میں خیانت کرنے والے ، حکومت کی اساس ظلم و تعدی پر رکھنے والے اصل ظالم وہ تھے یا میں تھی ؟ اُنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا یا میں نے ؟ ان لوگوں نے اپنا ضمیر شیطان کے ہاتھ میں بیچ ڈالا اور سمجھا کیے کہ گھاٹے میں نہیں رہے دنیا و عقبیٰ دونوں حاصل کر لیے ، میرا خدا ایسے تاجرانہ آداب سے بیگانہ ہے ، اگر نیت پر سارا معاملہ چلتا ہے تو مذہب کی تجارت کرنے والے کہاں جگہ پائیں گے ، محمد علی بارفروش دنیا تجھے بنانا خوب جانتی ہے !

نئی کتابیں

خونِ جگر ہونے تک

فضل احمد کریم فضلی، سیدھے سے انداز کی پُرکار غزلیں کہنے والے تھے، جو دلوں کو بھاتی بھی تھیں اور دلوں میں اترتی بھی تھیں۔ مگر زیرِ نظر کتاب ان کی غزلوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ناول ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

یہ کتاب اگر ان کی غزلوں کا مجموعہ ہوتی تو اچھا ہی ہوتا کہ ہم اس مخمصے میں نہ پھنستے کہ معلوم کریں کہ وہ شاعر اچھے ہیں یا ناول نگار۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ فضلی صاحب شاعر کی حیثیت سے اتنے بڑے نظر نہیں آتے، جتنے ناول نگار، تو آپ ہماری بات کو مانیں گے ہی کب۔ اس لیے کہ شاعر کی حیثیت سے انہیں سب جانتے ہیں اور ناول نگار کی حیثیت سے اب سامنے آئے ہیں۔

یہ ناول بنگال کے بارے میں ہے، جہاں کی زندگی میں معصومیت، سادگی، مٹھاس، رچ اور ترنم ہے۔ ناول پڑھتے جائیے یوں محسوس ہوتا ہے گا جیسے ہم مشرقی پاکستان کے کسی دیہات میں رہ رہے ہوں اور اس ناول کے مرکزی کردار پنیر میاں، جمعدار رضا اور پھول محمد ہمارے سامنے اٹھتے بیٹھتے لڑتے جھگڑتے اور حالات کی رو میں ابھرتے ڈوبتے چلے آ رہے ہوں۔

اس ناول میں چھوٹے موٹے کئی تجربے کیے گئے ہیں۔ جو اپنی جگہ قابلِ توجہ ہیں۔ اس میں روایتی ناولوں کی طرح داستانِ حسن و عشق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ورنہ مصنف کو خواہ مخواہ ایک لڑکی کو دنیا جہان کی لڑکیوں سے خوبصورت بنا کر پیش کرنا پڑتا اور پھر ایک ہیرو کی تلاش ہوتی تاکہ دونوں مل کر قاری کی توجہ کو اپنی جانب کھینچے رہیں۔ اس "خامی" کے باوجود یہ ناول دلچسپ ہے اتنا دلچسپ کہ قاری اس میں گم ہی رہتا ہے۔ مصنف کے نزدیک حسن، حسنِ صورت تک ہی محدود نہیں ہے ان کے نزدیک کردار میں بھی حسن ہوتا ہے۔ مناظر میں بھی حسن ہے، حتیٰ کہ بلاؤں میں بھی — اسی طرح عشق، صرف عشقِ زلیخا ہی نہیں بلکہ عشقِ یعقوبؑ بھی ہے۔

یہ ناول دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا سے خاتمے تک کی تفسیر ہے، اس عرصہ میں بنگال میں قحط آتا ہے۔ اس میں لوگوں پر جو کچھ گزرتی ہے وہ سب کچھ بڑا دردناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔

یہ ناول بنگال اور بنگال کے لوگوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ وہاں کی معاشرت اور وہاں کے ماحول کی حقیقی جاندار عکاسی اس ناول میں ملتی ہے، وہ شاید ہی کسی ناول میں ملے۔ مصنف نے اپنی زندگی کے بیس برس بنگال اور بنگال کے دیہاتوں میں گزارے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ یہ ناول مشاہدہ کی گہرائی کی وجہ سے جاندار اور کرداروں کے تجزیے کی وجہ سے زندہ نظر آتا ہے۔ اس پر انشاء کی خوبیاں مستزاد۔

اس ناول میں مجیب صاحب (جو غالباً مصنف خود ہیں) کا کردار بعض جگہ مدح خود کی وجہ سے ذرا کھلتا ہے اور بس، شاید مصنف کے نزدیک ایسا کرنا ہی مناسب ہو، اگر وہ اس سے کسی طرح بچ نکلتے تو اور اچھا ہوتا۔

یہ پہلی اُردو کتاب ہے جسے کیسل اینڈ کمپنی لندن نے فوٹو آفسٹ پر بڑے خوبصورت انداز میں چھاپا ہے۔ پاکستان میں تقسیم کنندہ ہیں۔ کراچی ایجوکیشن سوسائٹی ہاردن چیمبرس ساؤتھ نیپیئر روڈ کراچی ۲

(م۔ ط)

داغ داغ اُجالا

مصنف: پروفیسر احمد سعید۔ سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ ضخامت ۴۸۶ صفحات کتابت، طباعت، معیاری جلد پختہ مع رنگین گرد پوش قیمت چھ روپے
ناشر: بک لینڈ۔ وائی ایم سی اے بلڈنگ۔ دی مال۔ لاہور

چھپنے کو تو کتنے ہی بے ہنگم ناول روزانہ چھپتے رہتے ہیں مگر سچ مچ کا اچھا ناول کبھی کبھی نظر آتا ہے۔ داغ داغ اُجالا اسی قسم کے ناولوں میں سے ایک ہے جو اندھیرے میں روشنی کی جھلک دکھاتے ہیں۔

اس ناول کے مصنف پروفیسر احمد سعید ہیں جن کے افسانے اور نفسیاتی مضامین اُردو رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ناول نگار کی حیثیت سے وہ شاید پہلی مرتبہ سامنے آئے ہیں مگر ان کی گرفت مضبوط معلوم ہوتی ہے۔ پلاٹ کا تانا بانا ایسا ہے کہ واقعات کی کڑیاں خود بخود ملتی چلی جاتی ہیں اور زمان و مکان کے گہرے شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ دلفریب فضا میں تمام کردار جیتے جاگتے، چلتے پھرتے ہنستے بولتے، محبت کرتے اور سسکیاں بھرتے نظر آتے ہیں۔ دراصل کہانی کو آگے بڑھانے اور پلاٹ کو تکمیل تک پہنچانے کا سارا کام یہ کردار ہی ادا کرتے ہیں اور ناول کی پوری کہانی ان کرداروں ہی کے بل پر چلتی ہے۔ اس کی یہی خوبی اسے اردو کے اچھے ناولوں کی صف میں جگہ دینے کے لیے کافی ہے۔ البتہ زبان کہیں کہیں مصنف کے خیالات کا ساتھ نہیں دیتی۔ بعض جگہ روزمرہ اور محاورہ کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو امید ہے۔ نظر ثانی میں دور ہو جائیں گی۔

(ع۔ ق)

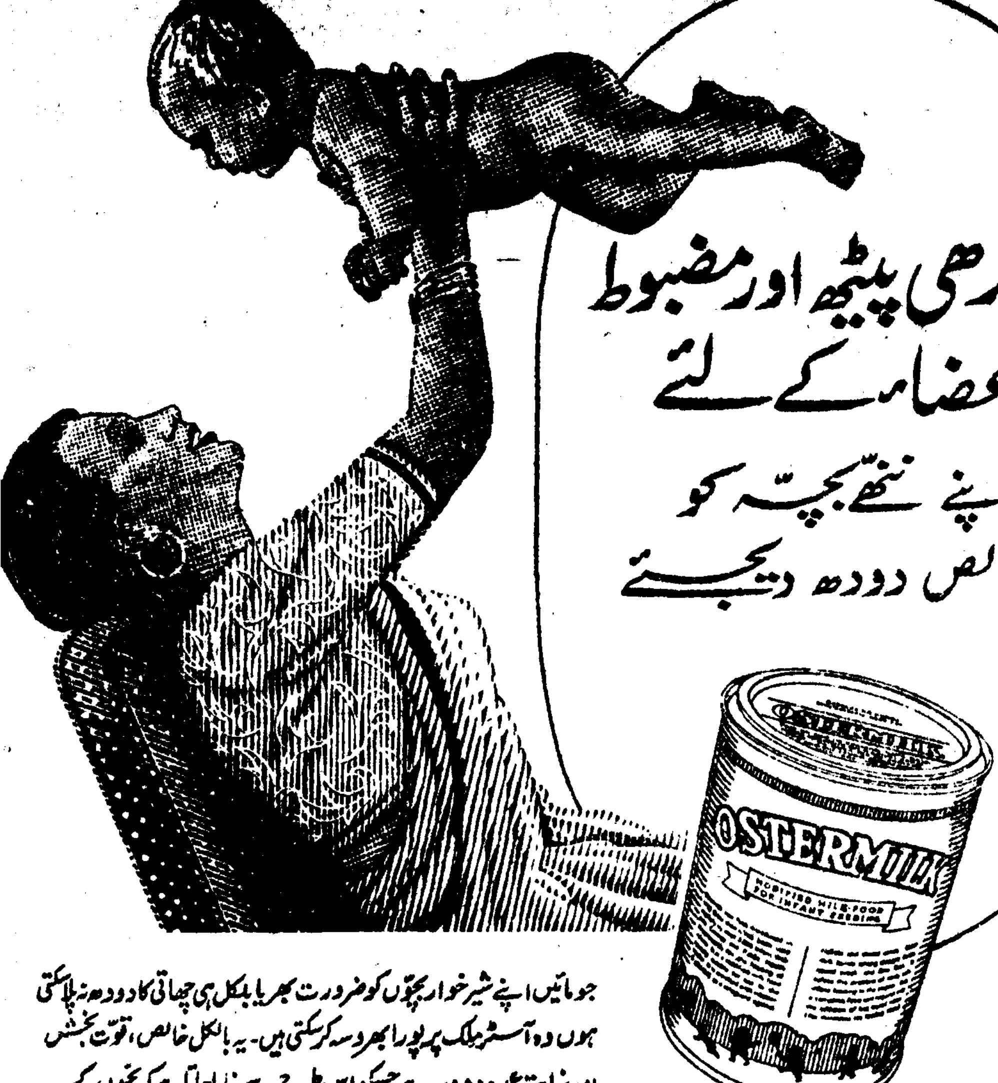
OSTERMILK
FORTIFIED MILK-FOOD FOR INFANT FEEDING

سیدھی پیٹھ اور مضبوط اعضاء کے لئے

اپنے ننھے بچّہ کو یہ خالص دودھ دیجئے

جو مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو ضرورت بھر یا بالکل ہی چھاتی کا دودھ نہ پلا سکتی ہوں وہ آسٹر ملک پر پورا بھروسہ کر سکتی ہیں۔ یہ بالکل خالص، قوّت بخش اور نہایت عمدہ دودھ ہے جسکو اس طرح سے بنایا جاتا ہے کہ بچوں کے ہاضمہ کے موافق ہو۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لیۓ اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ آپ اپنے بچے کی نشو و نما سیدھی پیٹھ اور بازوؤں کی مضبوطی کے لئے آسٹر ملک پر پورا اعتماد کر سکتی ہیں۔ یہ خاص کر پاکستان میں شیر خوار بچوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔

آسٹر ملک

ماں کے دودھ سے قریب تر

ہر ماں کے لئے مفید مشورہ

بچہ کی دودھ پینے والی بوتل کو صاف اور جراثیم سے پاک رکھنے کے لئے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لیجئے اسمیں خالی بوتل ڈال کر اتنا گرم کیجئے کہ اُبلنے لگے۔ پھر بوتل نکال لیجئے لیکن اُس کے اندرونی حصہ کو صاف کرتے وقت خشک نہ کیجئے۔

گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

R. (J

ادارہ فروغ اُردو ۔ لاہور

(ایبک روڈ ۔ انارکلی)

یہ ادارہ آپ کا ہے ۔ اس لئے کہ اس نے مقدور بھر اُردو ادب کی خدمت کی ہے --- اور آپ کے تعاون سے کی ہے ۔

ہم نے ایسی ہی کتابیں چھاپی ہیں ۔ جن کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے اور کاروباری اعتبار سے بھی منفعت بخش ہیں ۔

آپ اس ادارہ سے زیادہ سے زیادہ تعاون کریں ۔ یہ آپ کے لئے کاروباری طور پر زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوگا ۔ اس ادارہ سے تعاون اپنی ذات سے تعاون کے مترادف ثابت ہوگا ۔ انشاءاللہ !

خدمت گزار
مینجر ادارہ

ہماری نامور کتابیں

نیلوفر **شوکت تھانوی** کا نیا ناول، جو ان کے مشہور و معروف ناول غزالہ ہی کے انداز کا ہے۔ یوں تو شوکت تھانوی کی تمام تصانیف کو ہر دلعزیزی میں جو مقام حاصل ہے وہ اُردو کے کسی مصنف کو حاصل نہیں ہے۔ غزالہ شوکت صاحب کی سب سے دلچسپ اور مقبول کتاب ہے — "نیلوفر" کا انداز تو غزالہ والا ہی ہے۔ مگر یہ دلچسپی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے — وہی عشق و محبت کی حکایت ہے۔ وہی سراغ رسانی کے تانے بانے ہیں وہی دلچسپ چھیڑ چھاڑ ہے۔ جو دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

قیمت چھ روپے

نبی اُمیؐ سیرت رسولؐ پر سب سے مستند اور کارآمد کتاب، جسے سوانح نگاری کے امام عمر ابو النصر نے پیش کر کے عربی دان طبقہ میں فضیلت کی منزلیں طے کر لیں۔ اور اب اسے شیخ محمد احمد پانی پتی نے اُردو کے قالب میں ڈھال کر اُردو ادب کو ایک غیر فانی کتاب دے دی۔ اس کا ہر ہر فقرہ عشق رسولؐ میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ مگر واقعیت اور حقیقت نگاری کو کہیں بھی ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اس کا اندازِ بیان بے حد دلکش ہے۔ اس کے باوجود یہ ضعیف روایتوں کی داستان نہیں مستند تاریخ ہے۔ جسے ہم پورے فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

قیمت پانچ روپے

روزن اس دور کے جن بہت کم شاعروں کو بھرپور کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ان میں قتیل شفائی کا نام قابلِ رشک حیثیت کا مالک ہے معلوم ہوتا ہے مترنم اور موثر نغموں کے زیر و بم قتیل شفائی کے لہو کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں شاید ہی کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہوگا جہاں بہت بڑی تعداد میں لوگ قتیل شفائی کے نغمے نہ گنگناتے ہوں۔ حالانکہ ان نغموں میں سستی عمومیت کہیں بھی نہیں ہے یہ سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری ان کو امر بنا دیتی ہے۔ ان نغموں میں حیات بٹ رہی ہے (فراق گورکھپوری)

قتیل شفائی کے زندہ و تابندہ کلام کا نیا مرقع **روزن** جس کے حسنِ طباعت کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں۔ قیمت تین روپے

خلفائے محمدؐ **ابو النصر** شام کا سب سے بڑا مورخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جتنی بھی سوانحی کتابیں لکھیں اُن کا ساری دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ خلفائے محمدؐ میں اس نے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ پر دنیا جہان کی کتابیں پڑھ کر ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے، جو اِن خلفا پر سب سے معیاری اور مستند کتاب ہے۔

ترجمہ بے حد سلیس قیمت دس روپے

صاحب یہ کتاب اُن اسکیچوں کا مجموعہ ہے جو **محمد طفیل** مدیر "نقوش" نے وقتاً فوقتاً لکھے۔ ان اسکیچوں میں پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تمام اچھی اور بری باتوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اُس میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی شوکت تھانوی جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، عابد علی عابد اور احسان دانش کے اسکیچ شامل ہیں۔

قیمت تین روپے

شعلۂ طور یہ جگر مراد آبادی کا وہ مقبولِ عام مجموعہ ہے جسے اُردو شاعری میں سب سے زیادہ قدر و منزلت حاصل ہوئی ہے ہمارے اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسے از سرِ نو مرتب کیا اور کئی کمزور اشعار کو حذف کر کے کئی ایک غیر فانی اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے

بازارِ حیات یہ احمد ندیم قاسمی کے خوبصورت افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جتنے معیاری افسانے ندیم نے لکھے ہیں۔ اتنے اور کسی فسانہ نگار نے نہیں لکھے۔ اس مجموعے میں ان کے وہ تمام تازہ افسانے شامل ہیں۔ جن پر ندیم کو اور اردو افسانے کو فخر ہونا چاہیے۔ افسانوی ادب میں یہ مجموعہ ناقابلِ فراموش ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

اُردو غزل گوئی اردو تنقید میں غزل پر اتنی کام کی کتاب اور نہ ملے گی۔ اس لئے کہ اس کا مصنف فراق گورکھپوری غزل کا بہت بڑا شاعر ہے۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ مغربی تنقید اور مشرقی تنقید کا جتنا رچا ہوا مذاق فراق کا ہے اتنا اُردو کے نہ کسی شاعر کو نصیب ہوا اور نہ کسی نقاد کو۔ قیمت دو روپے

اندازے مصنفہ فراق گورکھپوری۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ اندازے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے پچھلے بیس برسوں میں اُردو کے تنقیدی سرمائے میں اس سے بہتر کتاب پیش نہیں کی جا سکی۔ اب اس مجموعہ کو بڑی اہم تبدیلیوں اور کئی نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت پانچ روپے

امراؤ جان ادا اُردو ادب میں سب سے دلچسپ اور سب سے معیاری ناول اگر کوئی ہے تو وہ صرف امراؤ جان ادا ہی ہے۔ یہ ایک بیسوا کی داستانِ حیات ہے جسے مرزا رسوا نے لکھ کر خود بھی دائمی شہرت حاصل کر لی اور ادا کے کردار کو بھی لافانی کرداروں میں شامل کر دیا۔ اس ناول کو اگر زبان کے اعتبار سے ہی پڑھ لیا جائے تو بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ناول اپنی تمامتر دلچسپیوں کے ساتھ لکھنوی معاشرت کا مرقع بھی ہے۔ خورشید الاسلام کا معرکۃ الآرا دیباچہ بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ قیمت چار روپے

منٹو یہ سعادت حسن منٹو کی افسانوی رنگ میں سوانح ہے۔ جسے منٹو کے بچپن کے دوست ابو سعید قریشی نے لکھا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سوانح میں بڑا توازن اور بڑی کام کی باتیں ہیں۔ اس میں منٹو کی نہ تو بے جا تعریف ہے اور نہ ہی خدا واسطے کی دشمنی، منٹو جو کچھ اور جیسا کچھ تھا، اُسے ہو بہو ابو سعید قریشی نے پیش کر دیا ہے قیمت چار روپے چار آنے

قول و قرار یہ عدم کا مجموعۂ کلام ہے۔ عدم اردو کا ایک ایسا غزل گو شاعر ہے جو بڑے سادے سے انداز میں عشق و محبت کے معاملات کو پانی کر کے رکھ دیتا ہے۔ بھاری بھرکم ترکیبوں اور استعاروں سے ان کا ذہن اور قلم بغاوت پر آمادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر غزل میں بناوٹ نہیں ہے۔ بلکہ فن کی تمام لطافتوں کے ساتھ ایک حقیقت ہے۔ قیمت تین روپے

پیچ و خم یہ بھی عدم کی ایک سو سے زائد مترنم، دلآویز اور پیاری پیاری سی غزلوں کا ایک سادہ سا مجموعہ ہے جسے اب پچاس نئی غزلوں کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی ہر ہر غزل اور ہر ہر شعر پر جھوم جھوم اُٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ داغ کے بعد جتنی روانی اور سلاست ان کے حصے میں آئی وہ اور کسی کو میسر نہیں ہے۔ قیمت تین روپے

سرکنڈوں کے پیچھے یہ منٹو کی آخری کتاب ہے جو مرحوم کی زندگی میں چھپی تھی۔ منٹو ہی وہ بے باک اور نڈر افسانہ نگار ہے جس نے بڑی سے بڑی حقیقت کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر مقدمے چلے اور "زیادہ سنجیدہ" حضرات نے

ناک بھوں چڑھائی مگر وہ لکھتا رہا۔ ادب کی بقا کی خاطر لکھتا رہا۔ اس کتاب میں بھی ان کے کئی زندہ رہنے والے افسانے شامل ہیں قیمت تین روپے

تاملاتِ نیاز اس مجموعے میں نیاز فتحپوری کے ایسے ایسے نادر مضامین ہیں۔ جو ان کے پرچے "نگار" میں چھپ کر دنیائے ادب میں تہلکہ برپا کر چکے ہیں۔ نیاز نے ہمیشہ کھو کھلے رسم و رواج اور نظریات کی وہ دو دھجیاں بکھیری ہیں کہ جھوٹے تقدس مآب اور رسم و رواج کے سہارے زندہ رہنے والے بوکھلا اٹھے۔ قیمت ڈھائی روپے

اصحابِ کہف نیاز فتحپوری نے مصر کے ایک بڑے مشہور ڈرامہ نگار توفیق الحکیم کے ایک نادر ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ڈرامہ قرآن کے ایک مشہور واقعہ سے متعلق ہے جو قرآن سے قدرے مختلف ہے۔ لیکن جو کچھ اس میں ہے اور اسے جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ وہ بعید از عقل نہیں ہے۔ یہ ڈرامہ مصر میں بے حد مقبول ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اردو میں بھی بڑی مقبولیت ہوئی۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

آبلے یہ احمد ندیم قاسمی کے چار طویل افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اگر ان افسانوں کو معیار کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو سوائے کرشن چندر کے طویل افسانوں کے ان کا پورے ادب میں کوئی جواب نہیں ہے۔ ان افسانوں میں رومان کی دبی دبی چنگاریوں کے ساتھ فن اور زندگی کے وہ رموز پنہاں ہیں جنھیں ایک بڑے فن کار کا قلم ہی چھو سکتا ہے۔ قیمت تین روپے

آنچل یہ بھی احمد ندیم قاسمی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پریم چند کے بعد جس انداز سے دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کو احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ وہ اردو کے کسی اور ادیب کو نصیب نہ ہو سکا۔ ندیم خود دیہات کا رہنے والا ہے۔ اس لئے وہ دیہاتیوں کی زندگی اور ان کے تمام مسائل کو بہ خوبی جانتا ہے اور ان کے اٹوٹ اور بھولے رومانس سے بھی آشنا ہے۔ قیمت ۳/-

جانِ عالم انگریزوں نے اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو جب معزول کر دیا تو انھوں نے اپنے آخری چند سال مٹیا برج میں گزارے وہ دن کس طرح کاٹے اور وہاں وہ کس حالت میں رہے اور ان کا وہاں کیا شغل رہا۔ ان تمام باتوں کا آنکھوں دیکھا حال اردو کے مشہور مورخ عبد الحلیم شرر نے اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے

عزیزم کے نام یہ خطوط کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر تاثیر نے اپنے ایک شاگرد کے نام کیمبرج سے لکھے تھے۔ خطوط بہ ذاتِ خود ایک دلچسپ چیز ہیں۔ اور اگر کوئی صاحبِ طرز لکھنے والا ہو۔ تو ان کی افادیت کے ساتھ ان کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ خطوط کا مجموعہ بے حد دلچسپ، بڑا معلومات افزا، بڑا ہی کار آمد اور حد درجہ نازک اور علمی مسائل پر تبصرہ بھی ہے۔ قیمت ۳/-

یدِ بیضا سید عابد علی عابد کے دل نشین ڈراموں کا مجموعہ۔ آغا حشر فنِ ڈرامہ نگاری کے امام تھے۔ ان کے ڈراموں میں الفاظ کی شان و شوکت اور قافیہ پیمائی کی معجزانہ کرامات تو تھیں مگر نرم و نازک احساسات کا فقدان تھا۔ عابد صاحب نے اپنے ڈراموں میں اس خامی کو نہ صرف دور کیا ہے بلکہ اردو ڈرامے کے فن کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اگر آغا حشر کے ڈرامے ماضی کی دلکش یادگار ہیں تو عابد صاحب کے ڈرامے حال اور مستقبل کا سرمایہ ہیں۔ اردو ادب میں ان سے بہتر ڈرامے آج تک پیش نہیں کئے جا سکے قیمت ۵/-

سیاستِ الٰہیہ امام ابنِ تیمیہ کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف اس سے پہلے بھی ایک بار اس ادارہ نے ہی پیش کی تھی اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی تھی کہ صرف دو مہینے کے اندر اندر پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ اس کتاب میں قرآن اور احادیث کی روشنی میں

زندگی کے ہر شعبہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حاکمانِ وقت کے فرائض رعایا پر اور رعایا کے فرائض حاکمانِ وقت سے، پوری تفصیل سے درج ہیں۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ہماری داستانیں اُردو ادب کی سب سے دلچسپ صنف ہماری قدیم داستانیں ہی ہیں جو ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان داستانوں سے ہر شخص لطف اندوز ہوا ہے۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک نے اگر کوئی داستان شروع کر لی ہے تو دن رات لگا کر اُسے ختم ہی کیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نے اُسے بیچ میں چھوڑ دیا ہو۔ اتنی دلچسپ صنفِ ادب کے بارے میں اب تک کوئی کام کی تنقیدی کتاب نہ تھی۔ اس تصنیف سے نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں داستان کا خلاصہ کیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کا ادب میں کیا مقام ہے اور کیوں۔ تصنیف، سید وقار عظیم

قیمت پانچ روپے۔

نقوشِ لطیف مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔ یہ کتاب زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں اُردو کی تمام نمائندہ افسانہ نگار خواتین کے منتخب افسانے ہیں۔ ہر خاتون افسانہ نگار نے اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھے ہیں اور ادب کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار بھی کیا ہے۔ قریباً تمام افسانہ نگار خواتین کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

قیمت چھ روپے

مضامین جمال الدین افغانی جمال الدین افغانی ایسا نڈر اور بے باک رہنما تھا جس سے انگریزوں کی سلطنت کانپ اٹھی تھی۔ مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے انھوں نے عربی میں ایک اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس میں جتنے آتشیں مضامین نکلے تھے وہ سب اس کتاب کی زینت ہیں۔

قیمت چار روپے

اِنتقاد سیّد عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ عابد صاحب نامور شاعر، بہترین انشا پرداز اور بے مثل نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں روائتی نقادوں کی طرح ثقالت اور یاوہ گوئی نہیں ہوتی۔ یہ جو بات بھی کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈھتے ہیں اور بچی تلی بات کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں شعروں کی سی مٹھاس اور فیصلوں میں تلوار کی سی کاٹ موجود ہے۔ ان کے نزدیک کسی لفظ کا غلط استعمال گناہ ہے اور یہ بھی گناہ ہے کہ نقاد اپنے ساتھ قاری کو بھی الجھا دے۔ قیمت تین روپے

بارِ خاطر شوکت تھانوی کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف جس کا عرصے سے انتظار تھا، چھپ گئی۔ خطوط کا یہ مجموعہ ابوالکلام آزاد کے خطوط غبارِ خاطر کی دل نشیں پیروڈی ہے۔ توقع ہے کہ شوکت صاحب کی یہ تصنیف، اردو ادب کی زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہوگی۔ جس میں ادبی، سیاسی، فلمی اور دیگر معروف شخصیتوں کے نام خطوط درج ہیں

قیمت چار روپے

بے قاعدہ شوکت تھانوی کی یہ نئے انداز کی تصنیف، اردو ادب میں بالکل انوکھی چیز ہوگی۔ اس قاعدے سے بچے بھی لطف اندوز ہوں گے اور بڑے بھی، بچے اسے دلچسپ تصنیف سمجھ کر پڑھیں گے اور بڑے اس سے زندگی کا شعور حاصل کریں گے۔ اس قاعدے کے حرف، آپ کے تمام پسندیدہ ادیب ہیں۔ مثلاً اس قاعدہ میں آپ کو الف سے آلو نہیں پڑھایا گیا۔ بلکہ الف سے امتیاز علی تاج پڑھایا گیا ہے۔

مصور — قیمت دو روپے

ادارہ فروغِ اُردو —— لاہور

ہماری مقبولِ عام کتابیں

تصانیف شوکت تھانوی

مولانا یہ شوکت تھانوی کا نیا ناول ہے۔ یہ واحد لکھنے والے ہیں۔ جن کے قلم نے کبھی بھی اپنے معیار سے نیچے اُترنا گوارا نہیں کیا۔ یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ اس ناول میں شوکت تھانوی نے ہم اور آپ ایسے ایک صاحب کو خواہ مخواہ مولانا بنا کر جو اس کی گت بنوائی ہے وہ خدا کسی کی نہ بنائے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

غزالہ اس ناول میں مزاح تو ہے ہی اس لئے کہ اس کا مصنف شوکت ہے مگر مزاح کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، کچھ کشمکش کچھ جد و جہد، کچھ سراغ رسانی اور کچھ مقاماتِ حیرت و استعجاب، شوکت تھانوی اپنے اس ناول میں کچھ نئے نئے سے کچھ بدلے ہوئے سے اور کچھ اپنے محور سے ہٹے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ یہ انوکھا پن ہی اس ناول کی جان ہے قیمت چھ روپے

خدانخواستہ ذرا تصور تو کیجیے، اگر آپ وہ ہو جائیں جو آپ کی بیگم صاحبہ ہیں۔ اور بیگم صاحبہ وہ ہو جائیں جو آپ ہیں، تو کیا ہو؟ اس کا جواب شوکت تھانوی سے سنئے جو انھوں نے اپنے مبسوط ناول "خدانخواستہ" میں دیا ہے۔ دنیا ہی اُلٹی نظر آتی ہے۔ قیمت تین روپے

سودیشی ریل شوکت تھانوی نے اپنی تمام مزاحیہ کائنات کا نچوڑ اس مجموعہ میں یکجا کر دیا ہے، پرانے مضامین سے اپنے شاہکار خود منتخب کئے ہیں اور نئے مضامین بھی اپنے ہی انتخاب سے شریک کئے ہیں مصنف کا خود اپنا انتخاب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کی آئینہ دار یہ کتاب ہے، قیمت تین روپے

کُتیا پالتو ہو یا جنگلی، بھونکتی ضرور ہے اور اگر کاٹ لے تو دماغ پر خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ اس کتیا نے ہمارے دماغ پر یہ اثر کیا کہ ہم مسلسل ہنس رہے ہیں۔ اس لئے کہ نہ یہ پالتو کتیا ہے نہ جنگلی۔ بلکہ یہ دراصل شوکت تھانوی کے ایک مزاحیہ ناول کا نام ہے جس میں شوکت صاحب کا آرٹ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پڑھنے والے کے لمحات کو قہقہوں سے پُر کر دینے کی قسم کھا کر پیش کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

سانچ کو آنچ یہ ناول اُن مہاجرین پر ہے جو ہندوستان میں روٹی تک کو عاجز تھے اور پاکستان پہنچ کر اپنے آپ کو نواب کہنے اور کہلوانے لگے۔ یہ ناول ایسی ہی دلفریب حکایتوں پر اس انداز میں لکھا گیا ہے کہ پڑھ کر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں قیمت ۲/۸

سُسرال یہ شوکت تھانوی کا نیا ناول ہے۔ اس ناول کا کچھ حصہ ماہنامہ "نقوش" لاہور میں چھپ چکا ہے جسے سب نے اتنا پسند کیا تھا کہ ہم اسے جلد سے جلد مکمل طور پر کتابی صورت میں شائع کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ناول اتنا دلچسپ اور لطیف ہے کہ اسے پڑھ کر ذہن جھوم جھوم اُٹھتا ہے اور خواہش پیدا ہوتی ہے کہ خدا سب کو ایسی ہی سُسرال بخشے، قیمت دو روپے چار آنے

کارٹون شوکت تھانوی کارٹونسٹ ہیں اس لئے کہ ان کے ایک لاجواب مزاحیہ ناول کا نام "کارٹون" ہے۔ اس ناول میں شوکت کا قلم کہیں بھی آورد کا شکار نہیں ہوا ہے، وہی رواں اور سبک، وہی بے ساختہ اور بے تکلف مزاح شروع سے آخر تک تبسم کی موجوں کا جال بچھاتا چلا گیا ہے۔ جو اس منفرد مزاح نگار کا طرۂ امتیاز ہے۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے

ما بدولت شوکت کی زور پر شوکت، شوکت تھانوی نے اپنے کو بھی نہیں بخشا، اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے "ما بدولت" میں ایک نہایت نازک موقع پر خود اپنے متعلق لکھتے ہیں، "اُدھر سے پسندیدہ نظریں۔ اِدھر سے اُن کی پذیرائی آخر شیطان نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ ہم دونوں ایک ہو گئے۔"

قیمت تین روپے

بقراط یہ یونانی حکیم بقراط کا تذکرہ یا سوانح نہیں بلکہ شوکت تھانوی نے اپنے اس مزاحیہ ناول میں ایک ایسے کردار کو نمایاں کیا ہے۔ جو ہر فن مولا کی حیثیت رکھتا ہے۔ شوکت تھانوی کا مزاح اپنے اندر تبسموں اور کبھی کبھی قہقہوں میں کیسے تعمیری نکتے رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اس ناول کو پڑھ کر ہو سکتا ہے۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے

جوڑ توڑ جوڑنا ایک مستقل کام ہے، توڑنا ایک دوسرا مستقل کام ہے پھر توڑ کر جوڑنا اور جوڑ کر پھر توڑنا، یا اللہ یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے شوکت تھانوی کا تازہ مزاحیہ ناول "جوڑ توڑ" ملاحظہ فرمائیے۔ جب تک یہ ناول آپ کے مطالعہ میں رہے گا۔ آپ سوائے اس کے پلاٹ میں گم رہنے اور اس کے تبسموں میں ہچکولے کھانے کے اور ہر فکر دنیا اور غم روزگار سے آزاد رہیں گے۔

قیمت چار روپے

مضامینِ شوکت اگر کوئی شخص صرف شوکت تھانوی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے تو وہ بلاشبہ اور کچھ بنے یا نہ بنے، زبان دان تو بن جاتا ہے آب کوثر میں دھلی ہوئی مصفا زبان، پلاٹ کی دلآویزی، شگفتہ و لطیف پیرایۂ بیان —— یہ ہیں وہ خصوصیات، جو شوکت تھانوی کے آرٹ کو زندۂ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے

قاضی جی (تین حصے) مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج کی رائے یہ ہے کہ "قاضی جی" پاکستان کا پہلا مزاحیہ کردار ہے جسے شوکت تھانوی نے پیش کیا ہے۔ ریڈیو سننے والے "قاضی جی" سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ریڈیو پر ہر ہفتے قاضی جی ایک نئے روپ میں ایک نیا مسئلہ لے کر آتے ہیں۔ اور پھر سننے والے ان کے فقرے یاد کرتے رہ جاتے ہیں۔

قیمت فی حصہ ۳/۸

غالب کے ڈرامے آپ حیران ہوں گے کہ غالب کا ڈرامے سے کیا تعلق، غالب کی نظم اور غالب کی نثر کا علم کس کو نہیں مگر شوکت تھانوی نے غالب کے ڈرامے بھی پیش کر دیئے۔ شوکت کا خیال ہے کہ غالب کے بے شمار اشعار میں تمثیلی موضوع چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ شوکت نے یہ تمثیلی موضوع غالب کے کلام سے نچوڑے ہیں اور دنیا کو حیران کر دیا ہے کہ اس کو مرزا غالب کا کمال سمجھا جائے یا شوکت تھانوی کا۔ قیمت ۲/۸

وغیرہ وغیرہ سودیشی ریل کے مصنف شوکت تھانوی نے پھر اس صنفِ ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ جو اب سے برسوں پہلے اس کی بے مثال اور غیر فانی شہرت کا سبب بنی، ان مزاح پاروں میں شوکت کا فن نکھرا اور سنورا ہوا ہے اور انھوں نے جہاندیدگی اور گہرے مشاہدے سے کام لے کر ہنسی کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں، جن سے قہقہوں کی چنگاریاں رہتی دنیا تک برستی اور انسانی ذہن کو اُجالتی رہیں گی۔

قیمت تین روپے

ادارہ فروغ اردو —— لاہور

پندرہ اگست

رشید اختر ندوی کا مقبول عام ناول۔ یہ ناول اس دور کی تاریخ ہے۔ جب انسان آزادی ایسی نعمت ملتے ہی حیوان بن گیا تھا آزادی ملتے ہی مسلمانوں پر جو کچھ بیتی یہ ناول اس کی تفسیر ہے۔ جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنی زبردست قربانیوں کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں آج بھی بند ہیں۔ نہ جانے یہ ان کی کن تباہیوں کا پیش خیمہ ہے۔ قیمت تین روپے

پانچ ناولٹ

مرتبہ سید وقار عظیم۔ اس مجموعہ میں منٹو، شوکت تھانوی، اشفاق احمد، اے حمید اور انتظار حسین کے بہترین ناولٹ شامل ہیں۔ یہ مجموعہ بے حد مقبول ہوا ہے — اس ایک مجموعے میں پانچ بہترین ناولٹوں کے علاوہ تین چار بہترین مقالے اور دو تین بہترین منظوم کہانیاں بھی شامل ہیں۔ قیمت تین روپے

تذکرہ شعرائے متغزلین

مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔ یہ تذکرہ نقوش کے غزل نمبر کے شعرا کے حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ ہے۔ یہ مختصر سا جائزہ پہلے نقوش کے غزل نمبر میں شامل تھا۔ اب اسے الگ صورت میں بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۸ر

نقوش

کے چند غیر فانی نمبر جو کئی کتابوں پر بھاری ہیں

مکاتیب نمبر	مجلد بارہ روپے	شخصیات نمبر۱	۸/۷ روپے
افسانہ نمبر	مجلد بارہ روپے	شخصیات نمبر۲	دس روپے
غزل نمبر	مجلد ۸/۷ روپے	منٹو نمبر	چھ روپے

ادارہ فروغ اردو — لاہور

U/Ref 891.43909 NUQ 24691

یہ کتاب اس تاریخ کو جو سب سے آخر میں
ثبت ہے کتب خانہ سے مستعار لی گئی تھی اگر
اس کتاب کو معیاد مقررہ پر واپس نہیں کیا گیا تو
دو پیسے روز کے حساب سے ہرجانہ وصول کیا جائیگا۔

~~11 AUG 1971~~

~~[illegible]~~

Xerox

15/9/2001

جاری نہ کیا جائے۔

کتب خانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

اساتذہ جامعہ کے نام ایک وق
پندرہ کتابیں جاری کی جائینگی جنکو
وہ ایک مہینے تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔
طلبائے جامعہ کے نام (بشرطیکہ وہ کتب
خانہ کے رکن ہوں) صرف دو کتابیں
جاری کیجائینگی جنکو زیادہ سے زیادہ
۱۵ روز تک رکھا جا سکیگا۔
عام اراکین ایک وقت میں صرف دو
کتابیں لے سکینگے جنکا پندرہ روز کے
اندر اندر واپس کر دینا ضروری ہوگی۔
اگر اراکین سے کتابوں کو کچھ نقصان
پہنچا تو انکی ذمہ داری انہیں پر ہوگی
اگر کتابیں وقت پر واپس نہیں کی
گئیں تو ہر کتاب کیلئے دو پیسے
روزانہ جرمانہ وصول کیا
جائیگا۔

11/Ref

3909

594